جنوری 2021
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
بانی
معراج رسول

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز

عذرا رسول

اظہارِ تشکر

الحمدللہ سسپنس کا سفر 1971ء سے شروع ہوکر کئی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے آج بھی کامیابی سے جاری ہے اور انشاءاللہ لمبے عرصے تک جاری رہے گا۔ اکثر اداریے کی سطور میں ملکی مسائل اور عوام کی مشکلات کا ذکر کثرت سے ہوتا رہا جن پر بات کرنا ایڈیٹر کا فرض بھی تھا۔ بعض اوقات تو ان پر مثبت ردعمل بھی دیکھنے میں آیا۔ بہرحال ہم تو اپنی ذمے داریاں احسن طریقے سے نبھاتے رہیں گے اور بند دروازوں پر دستک دیتے رہیں گے۔ جناب معراج رسول صاحب کی علالت کے بعد اگرچہ چاروں پرچوں جاسوسی، سسپنس، سرگزشت اور پاکیزہ کو چلانا میرے لیے بہت مشکل امر تھا۔ تمام امور کی نگرانی کرنا بھی یقیناً ایک دقت طلب کام تھا مگر معراج صاحب کی سنگت میں، میں نے جو بھی سیکھا ان کے بعد وہ سب میرے بہت کام آیا۔

معراج صاحب کہا کرتے تھے کہ تمام قلم کار میرے ادارے کے دماغ ہیں اور سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ میرے دست و بازو ہیں۔ ایک بار مجھے معراج صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ایک رائٹر نے ٹیلی پیتھی پر مشتمل ایک چھوٹی سی کہانی لکھی تھی جس پر میں نے بہت غور کیا اور پھر محی الدین نواب سے ڈسکس کیا اور پھر خیالات کی ایک لڑی بنتی چلی گئی اور فروری 1977ء میں نواب صاحب کے قلم سے دیوتا تخلیق ہوتا چلا گیا جس نے آگے چل کر نہ صرف شہرت کی بلندیوں کو چھوا بلکہ سسپنس کی شناخت بھی بنتا چلا گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ معراج رسول صاحب ملک کے مختلف جرائد میں چھپنے والی ہر چیز پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے وہ اپنے پاس تقریباً 10 سال کا مواد جمع کر لینے کے قائل تھے اور قدرداں ہی اتنے تھے کہ اپنے رائٹرز سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر آپ بھی بے خیالی میں بھی کسی کاغذ پر چند لائنیں بھی بنا دیں تو اسے بھی پھینکیے گا مت، میں اس کی بھی قیمت ادا کروں گا۔ جہاں مالکان اتنے قدردانے ہوں وہاں مصنفین مطمئن اور رسالے کامیاب کیسے نہ ہوں گے۔ اصلاحی، تعمیری اور مثبت سوچ کو اجاگر کرنے والا مواد ہی ہمارے پرچوں کی بنیاد ہے۔ عالمی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ تخیلاتی طبع زاد کہانیوں کے موضوع بھی بدل گئے ہیں۔ جس طرح کا معاشرہ ہوتا ہے ویسی ہی فکر بھی جنم لیتی ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ سسپنس نے پڑھنے والوں کا ذہن بنایا ہے۔ نو وارد مصنفین کو بھی نئی سوچ، نئی راہ سجھائی ہے۔ ہر دور کے الگ تقاضے ہوتے ہیں۔ زمانے کے عروج و زوال، پیچ و خم، گرد و پیش کے حالات، آئیڈیاز دے کر مصنفین کی بھی ذہن سازی کرنا پڑتی ہے۔ سسپنس کے آخری صفحات نے معاشرتی کہانیوں کو تیز تیور کے ساتھ پیش کیا۔ لوگ ان کہانیوں کے اسیر ہو گئے اور یہی سسپنس ڈائجسٹ کی فتح مندی اور کامیابی کی دلیل بھی ہے۔ معراج رسول صاحب کی بیماری مسلسل تیرہ برس رہی۔ ان کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ادارہ سنبھالنا خاصا مشکل امر تھا مگر ان کے ساتھ جو سیکھا بہت کام آیا۔ معراج صاحب کے بعد اپنے رفقا اور اسٹاف کا بھرپور ساتھ رہا۔ اللہ نے ہمت دی اور الحمدللہ آج ہم سب مل کر سسپنس کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں۔ اللہ پاک نے انسان کو بہت طاقت و ہمت عطا کی ہے۔ بس اس کا درست اور بروقت استعمال ہی اس کی بیش بہا نعمتوں کا شکرانہ ہے۔ اس وقت میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے آج مجھے کامیابی کی اس منزل پر بھی سرخروئی عطا کی۔ آپ تمام قارئین کا بھی بے حد شکریہ جن کی محبتوں نے اس سفر کو آسان بنایا اور اپنے قلمکار، تمام اسٹاف اور ایجنٹ حضرات کے لیے بھی ممنون ہوں کہ اتنی بڑی کامیابی اور خوشی تنہا حاصل کرنا شاید ممکن نہیں، مجھے معراج صاحب کی سسپنس سے محبت آج بھی یاد ہے۔ آخر میں امید ہے کہ آپ سب کی محبتیں بھی سسپنس کے ساتھ ہمیشہ یونہی قائم دائم رہیں گی اور ادارہ شاد و آباد رہے گا۔ (انشاءاللہ)۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

جلد 50 • شمارہ 01 جنوری 2021 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
کے پچاس سال
1971
2021
گولڈن جوبلی

عبدالغفار شیخ (مرحوم)

معراج رسول (مرحوم)

رفعتوں کی پرواز

عزیزان من!
السلام علیکم!

جنوری 2021ء کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ سال نو کی آمد کے ساتھ ساتھ سسپنس کی گولڈن جوبلی کی بھی مبارک باد قبول کیجیے۔ یہ ایک دو دن کی بات نہیں ہے بلکہ نصف صدی کا قصہ ہے۔۔۔ جس میں ایک نسل کا ساتھ نہیں بلکہ کئی نسلوں کا حصہ ہے۔۔۔ احساس بھی نہ ہوا وقت کی تیز رفتاری نے کام دکھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے پچاس سال گزر گئے۔ بالآخر سسپنس ڈائجسٹ اپنی گولڈن جوبلی کی منزل تک آن پہنچا۔ ادارے کی ابتدا ایک بلڈنگ کے چھوٹے سے کمرے سے ہوئی جسے دفتر کے قالب میں ڈھالا گیا تھا اور پھر یہیں سے سسپنس کا آغاز 1971ء میں ہوا جس کے سب سے پہلے مدیر اقبال پاریکھ تھے اور اس کے بعد مدیران کے اس دائرے میں مرحلہ وار کئی بڑے نام آئے اور محنت، توجہ سے اپنی ذمے داریاں ادا کرتے ہوئے چلے گئے۔ جناب معراج رسول صاحب نے اپنے والد محترم عبدالغفار شیخ جو ادبی دنیا میں ع۔غ۔شیخ کے نام سے معروف تھے، بہت کچھ سیکھا۔ ابتدا میں تو کسی خاص پیٹرن پر کام نہیں کیا گیا مگر جب ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری کے قلم سے تاریخی کہانی جلوہ گر ہوئی تو تب سے آج تک یہ صفحات تاریخ کے لیے مختص ہو گئے۔ سسپنس پر بہت سے تجربات کیے جاتے رہے جیسے کہ شروع میں رسالہ 160 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ کتابت اور تصاویر کے معیار میں بھی اب کافی تبدیلی آچکی ہے۔ دیگر ڈائجسٹ اور سسپنس کے معاوضے میں بھی ہمیشہ زمین و آسمان کا فرق رہا۔ معراج صاحب نے اپنے تمام رائٹرز کا قیمتی آبگینوں کے مانند خیال رکھا اور اس حسن سلوک کے بعد کوئی رائٹر پھر بھی معراج صاحب کو چھوڑ کر نہیں جاسکا۔ جون ایلیا کے نادر خیالات پر مشتمل انشائیے۔۔۔ آخری صفحات کے لیے لکھی گئی ناہید سلطانہ اختر، محی الدین نواب، علیم الحق حقی، اے کے اقبال، طاہر جاوید مغل، ایم اے راحت، ڈاکٹر ساجد امجد، انوار صدیقی اور محمود احمد مودی کی سماجی کہانیوں پر مشتمل کاوشیں اور کاشف زبیر کا لکھا ہوا، بے حد پسند کیا جانے والا احمد اقبال اور مظہر امام کی مزاحیہ کہانیوں اور عبدالقیوم شاد کے دو جاندار کرداروں مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ اور ڈی ایس پی ملک مسعود حیات کی کہانیاں اور دیگر متنوع تجربات کو قارئین میں بھرپور مقبولیت حاصل ہوئی۔ سسپنس کو خوش قسمتی سے ملک کے نامور مصور اقبال مہدی کا تعاون بھی حاصل رہا۔ ان کے ساتھ ساتھ جناب ذاکر اور شاہد صاحب نے بھی ٹائٹل اور اسکیچز بنا کر اپنے فن کا اظہار کیا۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ مختلف تبدیلیوں کے ساتھ سسپنس کی اشاعت بھی تیزی سے بڑھتی چلی گئی اور چار پانچ برس میں ہی اسے ملک کا سب سے بڑا ماہنامہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جس میں ہر زبان کی منتخب ادبی کہانیاں بھی شائع ہوتی رہیں۔ مختلف تراجم بھی اس کی زینت بنتے رہے اور اللہ کا شکر ہے کہ سسپنس آج بھی پاکستان کا ایک بڑا معتبر ماہنامہ ہے۔ اگرچہ اس کی اشاعت کے دوران مہنگائی اور کاغذ کے بحران نے اس کی بنیادوں کو ہلایا ضرور مگر جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے عزم و حوصلے میں بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کے مقبول سلسلے دیوتا، موت کے سوداگر، جہنم کدہ، فرعون، طالوت، مقدر، چاندنی سسپنس کی شان اور پہچان بن کر ہمیشہ قارئین کے ذہنوں میں محفوظ رہیں گے۔ جب سسپنس کی اشاعت اپنے مقبول سلسلوں کے بدولت ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تو اتفاق سے انہی دنوں معراج صاحب باہر ملک سے واپس پاکستان آرہے تھے تو آپ نے دیکھا کہ پورے ملک میں سسپنس کے حوالے سے بینرز لگائے گئے ہیں۔ یہ اعزاز کسی اور ڈائجسٹ کو نصیب نہیں ہوا۔ دعا ہے کہ جناب معراج رسول صاحب نے اپنے ہاتھوں سے سسپنس کی اشاعت کا جو سلسلہ جاری کیا ہمیشہ یہ یونہی ترقیوں کے ساتھ چلتا رہے، الٰہی آمین۔ محترم قارئین اس بار آپ خطوط کی محفل میں خطوط کے نہ ہونے پر کچھ حیران بھی ہوں گے۔۔۔ مگر جگہ کی قلت کے باعث آپ کے محبت نامے اس ماہ محفل میں شامل نہ ہوسکے البتہ ان شاء اللہ اگلے ماہ آپ کے تمام نامے ضرور شامل محفل ہوں گے۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اب اجازت۔

مدیرہ
عینی احمد

تعلیم یافتہ اور قابلیت کا تمغا سجانے والے ایک فرضی مسیحا کی داستان عبرت
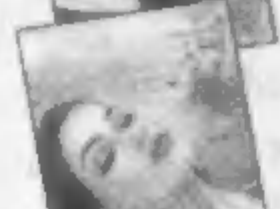
گھائل

پروین زبیر

اجنبی فضاؤں میں محوِ پرواز پرندے اکثر حادثات کا شکار ہوجاتے ہیں مگر اپنی حدود میں رہنے بسنے والے بھی بعض اوقات نہ تو فطرت کو پہچان پاتے ہیں اور نہ ہی مزاج کو پرکھ پاتے ہیں۔ یہی حال اس معصوم پرندے کا بھی ہوا جو بڑے بھروسے سے اپنے آشیانے سے اُڑا تھا لیکن ... اپنوں کے دامِ فریب میں الجھ کر ایسا گھائل ہوکر پستی میں گرا کہ آسمان کی بلندی تو بہت دور وہ پیروں تلے زمین کو بھی اپنے برابر محسوس نہ کرسکا... اس کے خوابوں کا شیش محل کچھ ایسے ٹوٹا کہ کرچی کرچی خواہشوں نے روح تک کو زخمی کرڈالا۔

یونیورسٹی کا طویل برآمدہ خاموش تھا۔ سارا دن کے شور ہنگامے کے بعد یہ خاموشی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس وہ اسمارٹ سا شخص آہستہ آہستہ اپنے آپ میں کھویا ہوا چلتا جا رہا تھا۔ طویل کوریڈور کے اختتام پر اس کا آفس تھا اور وہ وہیں جا رہا تھا۔

آفس کے دروازے پر ایک خوبصورت سا کارڈ لگا ہوا تھا۔

''ہمارے ہردلعزیز پروفیسر ڈاکٹر مراد موسیٰ کو دل کی گہرائیوں سے۔''

اس نے کارڈ ہاتھ میں تھام کر دیکھا تو ایک پُروقار سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اسے اپنے اسٹوڈنٹس پر بڑا پیار آیا۔ یہ یقیناً ان کی طرف سے ہی تھا۔ ہینڈل گھما کر شیشے کا دروازہ کھولا تو ٹھٹک کر رک گئے۔ پورا کمرا پھولوں اور موم بتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ موم بتیاں جل رہی تھیں اور پھول مہک رہے تھے۔

'ارے! انتخاب کچھ اور ہے کوئی بھی نہیں۔ کہاں گئے یہ سب کچھ رکھ کر؟' وہ وسط میں کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور ان کے بہت سے طلبہ تالیاں بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور کمرا مبارکباد کی آوازوں سے جیسے بھر سا گیا۔

''سر! ہمیں آپ پر بہت فخر ہے۔ آپ نے یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ پورے ملک کو سربلند کر دیا ہے۔ آپ کی قابلیت اور مہارت کو تو اب اقوام متحدہ جیسے ادارے نے بھی قبول کر لیا۔ آپ کو ملنے والا ایوارڈ بہت بڑا اعزاز ہے سر! ہم سب کی طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔''

یہ اور ایسے ہی بہت سے جملے وہ سب بول رہے تھے پھر ایک نے آگے بڑھ کر ٹیبل پر رکھے ان کے ایوارڈ کے اوپر نفتی اور گولڈن جوبلی کا اسٹیکر لگا دیا۔

''سر! آپ کو ملنے والا یہ ایوارڈ پچاسواں ہے اس لیے یہ ایوارڈز کی گولڈن جوبلی ہوگئی۔ ہے نا گائیز؟'' ایک نے وضاحت کی تو سب نے شور مچا کر اس کی تائید کر دی۔

''ارے یہ بات تو مجھے خود بھی پتا نہیں تھی۔ اسے آپ لوگوں نے دریافت کیا ہے۔'' ڈاکٹر مراد مسکرائے۔

''ایک اور بات بھی ہے جو آپ کو پتا نہیں ہے سر! چیری آن دا کیک۔ آج ہی آپ کا گولڈن جوبلی برتھ ڈے بھی ہے۔'' دوسرے نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تو ڈاکٹر مراد واقعی حیران ہوگئے۔

''اوہ واقعی۔ مجھے سچ مچ اس کا احساس نہیں تھا۔''

''ہمیں معلوم تھا سر کہ آپ کو کچھ بھی یاد نہیں ہوگا۔ اپنی ذات سے متعلق آپ کبھی سوچتے ہی نہیں۔ صرف اپنے کام کو یاد رکھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ذہن میں اب بھی پورا پلان ہوگا کہ کل آپ ہمیں کیا لیکچر دینے والے ہیں۔''

''اور سر! جب آپ ہمارے بارے میں اتنا سوچتے ہیں تو پھر ہمیں بھی آپ کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ سو ہیپی برتھ ڈے سر! آیئے کیک کاٹتے ہیں۔'' دو لڑکوں نے ایک بڑا خوبصورت کیک لا کر ٹیبل پر رکھا۔ سنہرے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی تھیم والا کیک اور اس پر موم بتیاں، جنہیں ایک لڑکے نے لائٹر سے جلدی جلدی جلا دیا۔

وہ سب منتظر تھے کہ سر آگے آئیں گے اور کیک کاٹیں گے لیکن وہ وہیں کھڑے اداس نظروں سے کیک کو دیکھتے رہے اور دیکھنے والوں کو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کا احساس ہوا تو وہ سب حیران ہوگئے۔

''آئی ایم سوری! آپ کے جذبات میرے لیے قابل تحسین ہیں لیکن میری برتھ ڈے سے میری کچھ بہت زیادہ تکلیف دہ یادیں جڑی ہیں اس لیے میں اپنا برتھ ڈے بھول جانا چاہتا ہوں۔ کبھی اسے یاد نہیں رکھتا۔'' انہوں نے بھرے بھرے لہجے میں کہا تو ان کے اسٹوڈنٹس حیران سے رہ گئے۔

''سوری سر! آپ پلیز بیٹھ جائیں۔'' ایک دو نے ان کی دگرگوں حالت دیکھتے ہوئے انہیں پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔

کچھ دیر میں وہ اپنے آپ کو سنبھال کر مسکرائے۔

''سوری! میں نے آپ لوگوں کی خوشی کو ہرد کر دیا۔ یہ غلط ہو گیا۔''

''جی سر! غلط تو بہت ہو گیا لیکن اس کی تلافی ہو سکتی ہے اگر آپ ہم سے اپنا دکھ شیئر کریں۔ سر! ہم آپ کے دکھ میں آپ کے ساتھ ہونا چاہتے ہیں۔ پلیز سر! ہمیں اجنبی سمجھ کر ٹالیے گا نہیں۔ آپ نہیں جانتے سر... کہ آپ ہمارے دلوں کے کتنے قریب ہیں۔ آپ کو اداس دیکھ کر ہم بھی اداس ہو جاتے ہیں۔ سر! بتایئے نا...... بتایئے نا سر!'' انہوں نے اتنا اصرار کیا تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے پھر ہلکے سے سر ہلایا تو وہ سب وہیں زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے اور پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''آج نہ جانے کیوں میرا بھی دل کہہ رہا ہے کہ آج اس ہستی کی باتیں کروں جس نے میری زندگی کو ایک نئی جہت دی، ایک مقصد عطا کیا۔ میری سالگرہ کا دن ہی دراصل میری ایک عزیز ترین ہستی کی حادثاتی موت کا دن ہے۔ ان کی موت میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے جو اتنا وقت گزر جانے کے باوجود میرے اندر زخم کی طرح ٹیسیں دیتا ہے لیکن آج ذکر نکل ہی آیا ہے تو آج کا دن میں انہی کے نام کرتا ہوں۔''

"سر! پوری تفصیل سے بتائیں..... پلیز!" ایک نے ملتجیانہ انداز میں کہا تو وہ بھی سر ہلا کر اس بات کے لیے آمادہ ہو گئے۔

"ہاں۔ آج کے دن میں انہیں پوری شدت کے ساتھ یاد کرنا چاہتا ہوں۔ بات پرانی ہے لیکن میرے اندر آج بھی تازہ ہے۔

"ہماری یونیورسٹی کا نام کیا ہے۔ رِٹل یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز۔ یہی نام تھا ان کا "رِٹل" اور یہ ہے ان کی کہانی۔"

ریسرچ سینٹر کی مائیکروبیالوجی لیب میں اس وقت بڑی خاموشی تھی۔ وہ اکیلا مائیکروسکوپ پر آنکھوں کے سلائڈ پر موجود کسی آرگنزم کی جزئیات دیکھ کر کچھ نوٹس بنا رہا تھا۔ ٹھنڈی، سرد اور بے مہری اس فضا میں کوئی تحرک نہ تھا۔ اچانک اس خاموشی کو گھوں گھوں کی آواز نے توڑا۔ فون سائلنٹ پر ہونے کے باوجود وہ آواز نمایاں طور پر سنائی دی تو اس نے گردن موڑ کر ناگواری سے فون کی طرف دیکھا۔ اس کے اکلوتے ماموں کی کال تھی۔ اس بے وقت کی کال کو اس نے ناگواری سے ریسیو کیا۔

"جی فرمائیے؟"

"تم سے ملنا ضروری ہے۔ کب آسکتے ہو؟" دوسری جانب سے آواز آئی۔

"شام کو آجاتا ہوں۔" اس نے فون رکھ دیا اور دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شام تک وہ لیب میں ہی مصروف رہا۔ ایم فل کرنے کے لیے وہ مائیکروبیالوجی کے کسی تھیسس پر کام کر رہا تھا اور پوری جی جان کی محنت کے ساتھ اپنا مستقبل بہت اونچے مقام تک لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔

شام کو ماموں کے ساتھ لان میں چائے پیتے ہوئے اس نے رِٹل کے چہرے کی طرف ایک نظر ڈالی تو کافی کشیدہ خاطر نظر آرہی تھی۔

ماموں کی انگلیاں بری طرح مروڑتے ہوئے اس کے اندر کا اضطراب صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

"خیریت تو ہے ماموں جان! سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؟" اس نے دزدیدہ نظروں سے رِٹل کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو ماموں کا غصہ سامنے آگیا۔

"خیریت؟ خیریت کیسی میاں؟ اس لڑکی نے جو گل کھلایا ہے اس نے میرا دماغ گھما کر رکھ دیا ہے۔ کیسی کیسی پلاننگ کر رکھی تھی میں نے۔ یہ ڈاکٹر بن جائے گی تو ایک بہت بڑا اسپتال بنوا کر دوں گا اسے اور نہ جانے کیا کیا۔ اس نے کیا کیا جانتے ہو؟"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار کو وضاحت پیش کی۔

"نالائق اتنے کم نمبر لائی ہے کہ میڈیکل میں ایڈمیشن ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سب سے بڑی میڈیکل یونیورسٹی تو کیا، کسی گھٹیا میڈیکل کالج میں بھی نہیں ہوگا۔ اس نے میرے مستقبل کے سارے خوابوں پر اپنی نالائقی کا پانی پھیر کر رکھ دیا۔ ماں اور باپ دونوں ڈاکٹرز۔ اس نے کسی کے جینز بھی ایڈاپٹ نہیں کیے۔ اپنا اور میرا، دونوں کا مستقبل ستیاناس کر دیا ہے اس نے۔ بتاؤ کیا کروں؟"

شہریار نے ایک نظر رِٹل پر ڈالی۔ کچھ سوچتا رہا پھر ماموں کو مخاطب کیا۔

"شاید میڈیکل اسے پسند نہ ہو۔ کچھ اور پڑھنا چاہتی ہو۔"

"ناممکن!" ڈاکٹر ایاز نے زور سے دہاڑتے ہوئے ٹیبل پر ہاتھ مارا تو رِٹل کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹ کر گرا اور وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی اور تیزی سے اندر کی طرف دوڑتی چلی گئی۔

"پھر اب کیا کریں گے؟ دوبارہ امتحان دلوائیں گے؟" شہریار نے آہستگی سے پوچھا۔

"ارے چھوڑو میاں۔ پہلے ہی نمبر کٹ جائیں گے۔ کیا فائدہ؟ میرا دل چاہ رہا ہے گولی ماردوں اس کو۔" ڈاکٹر شاہ صاحب غصے سے دانت پیستے ہوئے بولے تو شہریار نے خاموشی اختیار کی اور انہوں نے بھی اپنے غصے کو کنٹرول کیا۔

"اچھے بھلے یہاں رہ رہے تھے۔ خوامخواہ وہاں یونیورسٹی کے ہاسٹل میں چلے گئے۔ اسے چیک کرنے والا کوئی نہیں رہا تو اس نے نکما پن دکھا دیا۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"ماموں! میرا کام بہت محنت طلب ہے اور بہت وقت بھی مانگتا ہے۔ ایم فل کے ساتھ ساتھ میں پی ایچ ڈی کی تیاری بھی ممکنہ حد تک کر رہا ہوں۔ اکثر رات کو دیر تک لیب میں ہوتا ہوں۔ یہاں سے یونیورسٹی آنے جانے میں بہت وقت لگتا ہے۔ میں اتنا وقت ضائع کرنا افورڈ نہیں کر سکتا اس لیے مجبور ہو گیا۔ ساری زندگی تو آپ کے ساتھ ہی رہا ہوں۔ ابو اور امی کے بعد آپ ہی نے مجھے سہارا دیا اور یہاں تک پہنچایا ہے۔ اب میں اپنے مستقبل کے لیے اپنی ساری کوششیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے آپ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ جہاں تک رِٹل کا مسئلہ ہے تو لڑکی ہے۔ ڈاکٹر بنے نہ بنے۔ اسے شادی کر کے جانا ہی ہے۔ کسی بھی سبجیکٹ میں ماسٹرز کروا دیجیے اور شادی کر دیجیے۔ خوامخواہ کی ٹینشن نہ پالیں۔ یہ آپ کی صحت کے لیے بہتر نہیں ہوگا۔"

”وہ بھی تو ایک مسئلہ ہے۔ یونیورسٹی کے انٹری ٹیسٹ بھی ہو چکے ہیں۔ اب تو اگلے سال ہی کچھ ہو سکے گا۔ سال تو برباد ہو گیا نا۔“

”میں ایسا کرتا ہوں، اس کا ایڈمیشن کروا دیتا ہوں۔ ماسٹرز مائکروبیالوجی میں کر لے گی۔ میرے ساتھ ریسرچ میں شامل ہو کر۔ چاہے گی تو اچھا مستقبل بنا لے گی۔“ شہریار نے تجویز دی۔

”ٹھیک ہے میاں! فی الوقت تو اس سے بہتر کوئی آپشن ہو نہیں سکتا۔ جاتے ہوئے اسے بتاتے جانا کہ اسے کب تمہارے پاس آنا ہے۔“

شہریار سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اجازت مانگی اور گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اوپر نظر ڈالی تو وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس نے تسلی دینے کے انداز میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ جانے کیا کیا سوچیں اس کے ذہن کو مصروف کیے ہوئے تھیں۔ اسے نہ صرف پی ایچ ڈی کے دوران، بلکہ بعد میں بھی ایک قابل اعتماد اسسٹنٹ کی ضرورت تو تھی تو اگر رمل اس کو اسسٹ کرے تو بہت اچھا نہیں ہو جائے گا۔

”لانگ ٹرم پلان۔“ یہ سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔

☆☆☆

”اتنی اداس، خاموش اور پریشان تو تم پہلے کبھی مجھے نظر نہیں آئیں۔ آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟“ مراد موسن نے اس کے ہاتھ پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو اس کا دل بھر آیا۔ آنسو تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے بند توڑ کر بہنے کو۔ وہ گالوں پر بہہ کر آئے تو وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔

”رمل...... میری جان! میں تمہیں اس طرح آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ کیا یہ میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہونے کا غم ہے یا کوئی اور بات ہے؟ پلیز! مجھے بتاؤ۔ دیکھو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ تمہارا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے بشرطیکہ تم بتاؤ۔“

اس نے رمل کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے جھک کر پوچھا تو وہ آنسو بھری آنکھوں سے اپنے ہاتھ پر رکھا اس کا ہاتھ دیکھنے لگی۔ اس کے لمس سے محسوس ہو رہا تھا جیسے محبت، اپنائیت اور نرم اور مہربان جذبوں کا ایک آبشار سے بہتا ہوا جھرنا اس کے جلتے سلگتے وجود میں اتر رہا ہو۔

وہ دونوں ایک فوڈ کورٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”تمہارا ساتھ چھوٹ جائے گا، مراد۔ تم میڈیکل کالج میں ہو گے اور میں یونیورسٹی میں۔ ہم کیسے ملیں گے۔ تم جانتے ہو تمہیں دیکھے بغیر مجھے چین نہیں آتا۔ تمہارے ہاتھوں کا یہ لمس مجھے جینے کے لیے آکسیجن دیتا ہے۔ تمہارے بغیر میں کیسے جیوں گی؟“ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پھر سے لبریز ہونے لگیں تو مراد زور سے ہنس پڑا۔

”پاگل! ہم کہیں بھی ہوں۔ روز مل تو سکتے ہیں۔ اس کا کالج سے کیا تعلق ہے۔ یہ فوڈ کورٹ ہر روز کھلا ہوتا ہے۔ ہم روزانہ لنچ ساتھ کیا کریں گے۔“

”نہیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے دور ہونے والے ہیں۔ جب بھی تمہارا خیال آتا ہے تو میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے تم مجھ سے دور جا رہے ہو اور میرا سانس رک رہا ہے۔“ اس نے بڑی یاس انگیز کیفیت میں کہا تو مراد کا دل بھی انجانے وسوسوں کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔

”تم مجھے ڈرا رہی ہو رمل! تم میری زندگی میں نہ ہو، ایسا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ پلیز! ایسا سوچ کر نہ تو خود پریشان ہو اور نہ ہی مجھ کو وقت سے پہلے خوفزدہ کرو۔ او کے! اب ریلیکس ہو جاؤ اور ذرا سا مسکرا کر دکھاؤ ورنہ میں اپنا میڈیکل کالج چھوڑ کر تمہارے ساتھ تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لوں گا۔“ اس نے رمل کو تسلی دی۔

”نہیں میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹر بننا تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ سب خوابوں کے پورے ہونے کا وقت آیا ہے تو تم پٹری بدلنا چاہتے ہو۔ کبھی بھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ اس طرح کی حرکت آئندہ بالکل نہیں کرو گی ورنہ میں اگلے دن کالج... چھوڑ کر تمہارے ساتھ پڑھنے آ جاؤں گا۔ وعدہ؟“ اس نے پھر اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”گڈ گرل!“

☆☆☆

وہ دونوں اسٹڈی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”یہ دیکھیں ماموں! یہ پانچ مختلف ملکوں کی یونیورسٹیز اور ریسرچ لیبارٹریز کی آفرز ہیں۔ میں کچھ طے نہیں کر پا رہا ہوں کہ کس کی آفر قبول کروں۔“ شہریار نے کچھ پیپرز ایاز صاحب کے سامنے ڈالے۔

”بھئی! یہ تو تم ہی فیصلہ کرو گے کہ کس کی آفر سب سے اچھی ہے۔“

”پیسوں کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ ایک امریکن یونیورسٹی سب سے زیادہ پیسے دے گی۔ باقی سب اس سے

بیچتے ہیں لیکن مجھے صرف پیسے ہی نہیں کمانے چاہئیں۔ میں اپنے ہوم کے حوالے سے اگر دیکھتا ہوں تو چائنا مجھے بیسٹ لگ رہا ہے۔ ایک تو انہوں نے مجھے کسی قسم کی شرائط کا پابند نہیں کیا ہے، کوئی بانڈ وغیرہ نہیں بھرنا ہے مجھے۔ ان کے جو پروجیکٹس وہاں چل رہے ہیں میں انہیں جوائن کرنے کے ساتھ اپنا کچھ ذاتی کام بھی کرنا چاہوں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور یہ میرے لیے آئیڈیل صورت حال ہوگی۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ بسم اللہ کرو۔ اصل میں بندے کو کام وہی کرنا چاہیے جس میں پیسے بھی اچھے ملیں اور پھر کچھ نہ کچھ سیکھنے اور کچھ غیر معمولی کام کرنے کا موقع بھی ملتا رہے اور قسمت نے تمہیں یہ موقع دیا ہے تو اسے ضائع نہ کرو۔ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے اچین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ گڈ لک۔"

"جی! بس میرا تھیسس ہو چکا بلکہ جمع بھی کروا دیا ہے میں نے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں نے تو او کے بھی کر دیا ہے۔ باہر کی ان تمام یونیورسٹی سے بات چیت چل رہی ہے۔ اب صرف فائنل کرنا ہے تو اب آپ کے مشورے سے چائنا یونیورسٹی کی آفر قبول کرلوں؟" شہریار نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو انہوں نے بھی سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے میاں۔ بسم اللہ کرو۔"

پھر چند دنوں کے بعد وہ دوبارہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"ماموں! اجازت لینے آیا ہوں۔ کل میری فلائٹ ہے۔ سوچا آپ کی دعائیں لے لوں۔"

"جیتے رہو میاں۔ رابطے میں رہنا اور اس نالائق رل کا بھی خیال رکھنا۔ اس کی پروگریس رپورٹ لیتے رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو تمہارے جاتے ہی وہ بے پروا ہو جائے۔"

"نہیں ماموں! ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں میں نے پروفیسر اقبال چودھری کو بتا دیا ہے۔ وہ اس کا خیال رکھیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

پھر وہ چلا گیا۔

☆☆☆

وہ بہت بڑے شاپنگ مال کا فوڈ کورٹ تھا اور بھرا ہوا تھا۔ طرح طرح کی آوازوں سے ماحول پرشور تھا لیکن وہ دونوں اس طرح ایک دوسرے سے باتوں میں گم تھے جیسے آس پاس کوئی نہ ہو۔

"تمہارا ایم فل مکمل ہونے میں اب کتنا عرصہ رہ گیا ہے رل؟" مراد نے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"بس۔ تھیسس مکمل ہو گیا ہے۔ جلد ہی جمع کروا دوں گی لیکن پھر بھی ابھی کم از کم ایک سال تو لگے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی تو میرے بھی ایم بی بی ایس کے دو سال اور ایک سال کا ہاؤس جاب رہتا ہے۔"

"تین سال۔ بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے تین سال۔ پتا نہیں کیوں مراد! میرے دل کو وسوسے گھیرے رہتے ہیں کہ میرے ہاتھ سے تمہارا ہاتھ چھوٹنے والا ہے۔ کچھ ایسا ہونے والا ہے جو میرے دل کو ڈرا رہا ہے۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں میرے اوپر بھروسا نہیں ہے؟"

"تم پر ہے۔ اپنے آپ پر نہیں ہے، بابا کی وجہ سے۔ وہ نہ جانے کیا فیصلہ کریں اور میں ان کے سامنے کچھ بولنے کی ہمت ہی نہیں رکھتی۔"

"فکر نہ کرو۔ وہ اگر کسی اور سے تمہاری شادی طے کر بھی دیں تو میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر لے آؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا نہیں پاؤ گی۔ میرے ساتھ چلتی چلی آؤ گی۔"

"سچ کہتے ہو۔ تمہارے ہاتھ کے لمس سے میرے اندر زندگی کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔ میں زندہ ہو جاتی ہوں اور اپنی زندگی سے کون ہاتھ چھڑا سکتا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"وٹس لائک آ گڈ گرل۔" وہ بھی ہنسا۔

"چلیں اب۔ تمہیں تمہاری یونیورسٹی چھوڑتا ہوں اور میں اپنے کالج۔ پھر دو منٹ بعد لیب شروع ہو جائے گی۔ کل ملتے ہیں۔ ہاں اسی موڑ پر اسی جگہ جیسے کہ تم نے وعدہ کیا تھا۔ ہم ملا کریں گے۔" اس نے مسخرے پن سے کوئی پرانا فلمی گیت گنگنانے کی کوشش کی تو وہ بھی ہنس پڑی۔

☆☆☆

وہ ایک بہت بڑی ریسرچ لیبارٹری تھی۔ اتنی طویل و عریض کہ ہر موضوع کی ریسرچ کے لیے الگ الگ بلاک تھے۔ اس میں بھی سب سے بڑا بلاک وائرس پر ریسرچ کا تھا۔ وائرس، جو معمولی بیماریاں، جیسے فلو اور انفلوئنزا وغیرہ پھیلانے کا سبب ہوتا ہے۔ یہ بیماریاں اگرچہ اتنی مہلک نہیں ہوتیں لیکن ان کا تیز پھیلاؤ بڑے مسائل کا سبب بنتا ہے۔

اس نے چند ماہ پہلے ہی چائنا کی اس مشہور لیب کو جوائن کیا تھا اور اس مختصر عرصے میں ہی اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے بہت ہی سازگار مواقع فراہم کرنے والی جگہ ہے۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھا اور پوری تندہی کے ساتھ اپنے کام کو سمجھ کر اس میں مصروف ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ ایک سلائڈ کو مائکرو اسکوپ کے نیچے رکھ کر اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ

سنائی دی۔ سر کر دیکھا تو اس کا پروجیکٹ انچارج ژوانگ ہو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"لنچ بریک تھا تو میں نے سوچا کہ تمہارے ساتھ کھانا کھایا جائے اور کچھ باتیں بھی ہو جائیں۔" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"شیور مسٹر ہو!"

"میں نے کچھ یہیں منگوا لیا ہے۔ وہ دیکھیں، آ گیا ہے۔"

شہریار نے دیکھا تو اس کا لیب انچارج دو چھوٹی ٹرے اٹھائے انہی کی طرف آ رہا تھا۔ چاول اور سبزی پر مشتمل سادہ سا کھانا۔

"آپ کا کام کیسا چل رہا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ مطمئن ہیں۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟" ژوانگ ہو نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا کام میری پسند کے مطابق ہے۔ میں خوش ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپ پورے اطمینان اور سکون سے کام کریں۔ آپ کی اہلیت ہم اچھی طرح جانتے ہیں اسی لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم آپ پر پورا بھروسا کرتے ہوئے اس پروجیکٹ کے کچھ خاص مقاصد آپ سے ڈسکس کریں۔ کیا آپ ایسا چاہیں گے، مسٹر شہریار؟"

"خاص مقاصد؟ کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہم جس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں اس کے مقاصد کچھ اور بھی ہیں جنہیں میں نہیں جانتا؟"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم بہت عرصے سے فلو کے وائرس پر تحقیقات کر رہے ہیں کہ انہیں کس طرح زیادہ سے زیادہ کمزور بنایا جائے کہ دنیا کے لوگوں کو وہ زیادہ نقصان پہنچانے کے قابل ہی نہ رہیں۔ آپ ان کے آر این اے میں جا کر یہ کام کر رہے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"ہنڈریڈ پرسنٹ۔ بالکل یہی کام ہو رہا ہے۔ اب اس میں نیا کیا کرنا ہے؟"

"یہی تو ملین ڈالر کا سوال ہے۔ آپ کے خیال میں اس میں کیا تبدیلی ہو سکتی ہے؟"

"کوئی نئی ریسرچ، کوئی نیا خیال؟" شہریار نے کہا تو ژوانگ ہو نے سر ہلاتے ہوئے اثبات میں جواب دیا جس پر شہریار نے کھانا چھوڑا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کوئی ایسی نئی چیز، جس سے میں اب تک واقف نہیں ہوں حالانکہ میں تو سارے تازہ ترین سائنس جرنلز اور پیپرز کو گھول کر پی لیا کرتا ہوں۔ خصوصاً اپنے سبجیکٹ سے متعلق معلومات تو بہت ہی اپ ڈیٹ ہوتی ہیں۔ دو چار اچھے گروپس بھی جوائن کیے ہوئے ہیں۔ ان سے ڈسکشنز بھی چلتے رہتے ہیں پھر وہ نیا کیا ہے جو اب تک مجھے نہیں معلوم؟" شہریار کافی حیران تھا۔

اس کی بات سن کر ژوانگ ہنس پڑا۔

"کوئی نئی چیز یا خیال یا تحقیق نہیں، صرف مقاصد نئے ہیں اور ان تبدیل شدہ مقاصد پر ہمیں تفصیلی بات چیت کی ضرورت ہے۔ آپ اگر کل رات کو ایک دو گھنٹے نکال سکیں تو ہم ایک اچھی گفتگو کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے مسٹر شہریار! کل ملتے ہیں۔" ژوانگ نے اٹھتے ہوئے شہریار کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"سوری! اس کھانے کا بل آپ کے کھاتے میں لکھا جائے گا لیکن کل کے ڈنر کا بل میں ادا کروں گا۔ ہیو آ نائس ڈے مسٹر شہریار!" وہ چلا گیا۔

☆☆☆

"تم ایک سال بعد ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ پاپا کے لیے یہ ایک اچھی اٹریکشن ہو سکتی ہے۔ وہ خود ڈاکٹر ہیں اور مجھے بھی ڈاکٹر دیکھنا چاہتے تھے لیکن میں ان کی امیدوں پر پوری نہیں اتر سکی۔ شاید اس خیال سے وہ تمہاری پذیرائی کریں۔ تم اپنے گھر والوں سے بات کر کے اپنا رشتہ تو بھیجو۔"

رل اور مراد حسبِ معمول فوڈ کورٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"یار! میری ماں تعلیم کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ وہ ایم بی بی ایس پورا کیے بغیر کبھی بھی ایسا کوئی سلسلہ نہیں چلائیں گی۔ انہوں نے پہلے ہی مجھے کہہ دیا تھا کہ دورانِ تعلیم میں ایسی کوئی احمقانہ فرمائش نہیں کروں گا کہ میری شادی کر دو۔ ہاں اس کے بعد جہاں کہو گے تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گی اور تمہاری پسند کی شادی کر دوں گی۔ اس لیے اب صرف ایک سال اور ہے۔ اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ یوں گزر جائے گا۔"

مراد نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ابھی ایک سال اور ہے۔ پورا ایک سال۔ بارہ ماہ یعنی تین سو پینسٹھ دن۔ کیا خبر اتنے دنوں میں کیا سے کیا ہو جائے۔"

"رل! ایسا کیا ہو جائے گا اس ایک سال میں۔ تم اس قدر مایوس کیوں ہو۔ ہم دونوں کے درمیان ایک وعدہ

ہے۔ پکا والا وعدہ۔ ہم اسے ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ یہ وعدہ وفا ہوگا۔ میری طرف سے بھی اور تمہاری طرف سے بھی جب یہ طے ہو گیا ہے تو پھر یہ پریشانی کیسی؟''

''مجھے اپنی قسمت پر بھروسا نہیں ہے مراد! میں ہمیشہ سے ایک لوزر رہی ہوں۔ اس لیے ڈرتی ہوں۔''

''ہمیشہ سب کچھ ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔ جب ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو تم خود ہنسا کرو گی اپنے ان بے بنیاد وسوسوں پر۔ اس لیے اس بارے میں سوچنا چھوڑو اور کھانا کھاؤ۔''

☆☆☆

''تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم جس وائرس پر کام کر رہے ہیں اس کے آر این اے میں مزید کیا تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے مثبت تبدیلیاں..... مسٹر شہریار!'' آج ژو ڈانگ اپنے ساتھ ایک اور ماہر کو لے کر آیا تھا۔ بڑی عمر کا وہ سنجیدہ سا آدمی چشمے کے شفاف شیشوں سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ ژو ڈانگ نے اس کا تعارف ایک ماہر اور سینئر مائکرو بیالوجسٹ کی حیثیت سے کروایا تھا۔ یہ سوال اسی نے کیا تھا۔

''تبدیلیاں لانا ایک مسلسل عمل ہے اور ہم اپنی ترجیحات کے حساب سے اس کی کافی زیادہ گنجائش رکھتے ہیں۔ سوال تبدیلیوں کا نہیں، ہماری ترجیحات کا ہے کہ ہم دراصل چاہتے کیا ہیں۔'' شہریار نے شاید سوال کے لفظوں سے زیادہ ان الفاظ میں چھپے مقصد کو بھانپ لیا تھا۔

''زبردست، شہریار صاحب! مجھے لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں۔ مجھے آپ کی ذہانت سے یہی امید تھی۔ ڈاکٹر لی وان ہمارے بڑے قابل اور سینئر بیالوجسٹ ہیں۔ ہمارے ہاں مائکرو آرگینزم پر جو بھی تحقیقات ہو رہی ہیں وہ زیادہ تر جناب لی کی مرہون منت ہیں۔ آج کی گفتگو میں آپ اور مسٹر لی بات کریں گے اور یہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم نے اس فیلڈ میں اپنی ترجیحات کا تعین کیسے کیا ہے اور ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔ اب کھانا ہو گیا ہے۔ مجھے اجازت دیں۔ آپ دونوں بات چیت کیجیے۔ ہم پھر ملیں گے۔'' ژو ڈانگ نے لی کے سامنے تھوڑا سا خم ہوتے ہوئے کہا اور اس چھوٹے سے آفس سے باہر نکل گیا۔

''مسٹر شہریار! آپ کو یہاں کام کرنے میں کوئی مسئلہ یا کوئی تکلیف یا شکایت تو نہیں ہے؟'' لی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوال کیا تو شہریار نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بالکل نہیں بلکہ میں تو بہت خوش ہوں۔ یہاں نہ صرف میرے مالی حالات بہت بہتری کی طرف جا رہے ہیں بلکہ مجھے آزادی سے کام کرنے کا ماحول دیا گیا ہے۔ میرے جیسے آدمی کے لیے یہ دونوں چیزیں بہت خوشی کا باعث ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دراصل ہم نے کافی عرصے پہلے اس چیز کو محسوس کر لیا تھا کہ ہمارے ایشیائی لوگ بہترین ٹیلنٹ رکھنے کے باوجود اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے مغربی ملکوں میں جانا پسند کرتے ہیں۔ ساری ذہانت ان ملکوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور ہم جو اس کے اصل حقدار ہیں یعنی ایشیائی ممالک، وہ اس سے محروم رہ جاتے ہیں، تو کیوں نہ ہم اپنے اس قیمتی جوہر سے استفادہ کریں۔ اس لیے ہم نے اس میں کافی زیادہ سہولیات رکھی ہیں تاکہ قابل لوگ بجائے مغرب میں جانے کے یہاں آئیں۔ آپ کو بھی یقیناً ان ممالک کی طرف سے بہترین آفرز ہوئی ہوں گی لیکن آپ انہیں چھوڑ کر ہمارے پاس آئے۔ یقیناً کچھ بہتر سوچ کر۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، مسٹر لی!'' شہریار نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو لہجہ پُرخیال تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب کچھ ایسا سامنے آنے والا ہے جو اس کی توقع سے کہیں آگے کی بات ہے۔

''نیو ورلڈ آرڈر کے بارے میں کیا جانتے ہیں آپ؟'' لی نے اچانک ہی موضوع سے ہٹ کر ایک سوال کیا تو شہریار نے غور سے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

''اتنا ہی جتنا ایک عام آدمی جان سکتا ہے۔ دنیا کے تمام ریسورسز پر قبضہ کرنے کا خواب۔ صیہونیت کی دنیا پر مضبوط گرفت اور دنیا کے تمام لوگوں کے ذہنوں کو اپنا غلام بنانے کا خواب۔ مختصراً تو یہی کہا جا سکتا ہے۔''

''بہت خوب۔ مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی شہریار! اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں کہ کوئی آپ کی تمام دولت، جائداد، آپ کے ملک، آپ کی قوم، یہاں تک کہ آپ کے اپنے بچوں تک کو اپنی مرضی اور اختیار کا تابع کرنے اور آپ اور وہ سب ان کے لیے محض روبوٹ بن کر رہ جائیں؟''

''ایسا کون چاہے گا، مسٹر لی! مگر یہاں تو پسند ناپسند کا کوئی آپشن ہی نہیں ہوگا تو ایک عام آدمی کیا کر سکے گا۔''

''یہی تو بات ہے شہریار! عام آدمی کا یہ پیدائشی حق ہے۔ کوئی کون ہوتا ہے اسے چھیننے والا۔ ہم سب کو اپنی ذات پر پورا اختیار دیا گیا ہے اور اس اختیار کے لیے ہمیں

آپشن حاصل کرنا ہوگا۔ یہ آپشن ہم صرف اسی صورت میں حاصل کر پائیں گے جب ہم انہیں انکی کی زبان میں جواب دینے کے قابل ہوں گے۔" لی نے ٹیبل پر ہاتھ مارتے ہوئے اپنی بات میں وزن پیدا کیا۔

"میں سمجھا نہیں مسٹر لی!"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا دنیا میں اب اس طرح کی جنگیں ہوں گی جیسی پہلے ہو چکی ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔" شہریار ان کا مقصد سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس کی وجہ کا بھی تمہیں اندازہ ہوگا۔ ایسی جنگوں میں بہت زیادہ لوگ مرتے نہیں ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ایشیائی ملکوں میں انسانوں کی آبادی بہت زیادہ بڑھ رہی ہے اور وہ دنیا کے زیادہ تر وسائل کھا جاتے ہیں اور وہ کیونکہ اپنے آپ کو سپر اقوام سمجھتے ہیں تو یہ حق بھی سمجھتے ہیں کہ یہ زیادہ تر ان کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ سب آبادی کم کرنے کے طریقے ہیں تاکہ بچے کھچے لوگ اس دہشت کا شکار ہو کر مکمل طور پر ان کے قابو میں آ جائیں۔"

"اور یہ کس طرح ممکن ہوگا، مسٹر لی؟" شہریار نے سوال کیا۔

"بایولوجیکل ہتھیار۔ یعنی جراثیم، بیکٹیریا اور وائرس وغیرہ۔ مستقبل کی جنگوں کے یہی ہتھیار ہوں گے، مسٹر شہریار! اور ہماری اطلاعات کے مطابق امریکا اور یورپ کی بڑی لیبارٹریز میں اس وقت یہ کام بھرپور طریقے سے چل رہا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے پی ایچ ڈی کے دوران ہی مجھے ان ممالک کی جانب سے کافی پرکشش آفرز ہوئی تھیں اور میرے ہچکچانے پر انہوں نے ان آفرز کو بڑھانا شروع کر دیا۔ آپ یقین کریں گے کہ یہاں کے مقابلے میں کہیں سے تین گنا اور کہیں سے چار گنا آفرز آ گئی تھیں۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔"

"کیوں؟ کیوں جواب نہیں دیا۔ کیا آپ کو بہت سارے پیسے نہیں چاہیے تھے؟"

"پیسے کسے نہیں چاہیے ہوتے لیکن وہاں کام کرنے کی آزادی نہیں تھی۔ پہلے تو وہ ایک بونڈ بھروا رہے تھے۔ پانچ سال کی مدت کے لیے۔ اس دوران میں نہ تو ان کا کام چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی کچھ اپنا کام کر سکتا تھا۔ صرف ان کی ملازمت کرنا تھی مجھے اور کسی کا پابند رہ کر کام کرنا شاید میری فطرت میں ہے ہی نہیں۔ میری زندگی کا مقصد ملازمت کر کے پیسا کمانا نہیں ہے۔ میں ریسرچ سائنٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ اپنی فیلڈ میں نئی جہتیں تلاش کرنا چاہتا تھا۔"

"پھر آپ یہاں مطمئن ہیں؟"

"بالکل۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میں یہاں پابند نہیں ہوں۔ مجھے اپنی مرضی سے کام کرنے کی آزادی دی گئی ہے اور اس کے لیے میں ذمے داران کا شکر گزار بھی ہوں۔"

"ہم بھی آپ کا کام دیکھ کر بہت خوش ہیں۔ آپ اپنی فیلڈ میں جینئس ہیں، شہریار! آپ کو اگر کسی سہولت یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیے۔"

"ہوں، آپ نے پوچھ ہی لیا ہے، مسٹر لی! تو بتا دیتا ہوں۔ پیسے بہت کم ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید میں اس سے زیادہ ڈیزرو کرتا ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں یہ بات اوپر پہنچا دوں گا۔ امید ہے کہ آپ کا مسئلہ حل کر دیا جائے گا۔"

"بہت شکریہ۔ مجھے کچھ پیسے پاکستان اپنے گھر بھی بھیجنے ہوتے ہیں۔ وہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اوہ! لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق تو آپ کا وہاں کوئی بھی قریبی رشتے دار نہیں ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ۔ صرف آپ کے ایک ماموں ہیں اور وہ ایک بہت اچھے پریکٹیشنر ہیں۔ اپنا اسپتال چلاتے ہیں تو پھر وہاں کس کو آپ کے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے؟"

شہریار، لی کی بات سن کر حیران ہو گیا۔ اس کے بارے میں اتنی معلومات ان لوگوں کے پاس تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک لمحے کو وہ جھٹکا کھا کر سنبھلا۔

"میری پرورش انہی ماموں نے کی ہے۔ میری زندگی پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ ان کے مالی حالات جیسے نظر آتے ہیں، ایسے ہیں نہیں۔ وہ بڑا اسپتال بنانے کے چکر میں کافی بڑے بڑے قرضوں میں اپنے آپ کو پھنسا چکے ہیں۔ اب ان قرضوں کی ادائیگی ان کے لیے مصیبت بن چکی ہے۔ ایسے میں ان کی مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے۔"

"اوہ! آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا مسئلہ حل کر دیا جائے گا۔ اوکے آپ سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک میٹنگ اور کریں۔"

"ضرور مسٹر لی! مجھے بھی بہت اچھا لگا۔ آپ جب چاہیں، میں حاضر ہوں۔" لی اٹھ کھڑا ہوا اور شہریار کی جانب ہلکا سا جھکتے ہوئے... آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"رکو! کہاں جا رہی ہو؟" وہ نکل رہی تھی کہ لاؤنج میں بیٹھے پاپا کی نظر اس پر پڑی اور انہوں نے اسے پکار لیا۔

"جی! وہ... یونیورسٹی..." وہ ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"نشو! مجھے تم سے بات کرنا ہے۔ تمہارا ایم فل کب تک ہو جائے گا؟" انہوں نے جس انداز میں پوچھا، اس سے رل پر ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ بیٹھنے کے بجائے وہیں کھڑی اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔

"جی... تقریباً ایک سال اور ہے۔" اس کا اضطراب اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے تمہارا رشتہ دیکھ لیا ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے اور ہارٹ ڈیزیز میں اسپیشلائزیشن کر رہا ہے۔ اچھی فیملی ہے اور سب باہر سیٹل ہیں۔ ابھی دسمبر میں وہ لوگ آ رہے ہیں۔ ابھی صرف نکاح ہوگا۔ شادی ایک سال کے بعد ہوگی۔ یہ اس کی کچھ تصویریں ہیں۔ دیکھ لینا۔"

انہوں نے ایک لفافہ ٹیبل پر ڈالا اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے مگر رل کے تو پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی۔ سناٹوں نے تو جیسے اس کے وجود کو یخ بستہ سا کر دیا اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کچھ بولنا چاہ رہی تھی لیکن آواز ہی گھٹ کر رہ گئی۔

خلافِ معمول آج وہ ان کے سامنے سے ہٹ جانے کے بجائے کھڑی ہوئی نظر آئی تو انہوں نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ کچھ کہنا ہے کیا؟" اس کی آنسو بھری آنکھیں اور سفید پڑتا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ذرا سا چونکے۔ جواب میں اس نے بمشکل سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

"کیا کہنا ہے؟ بولو!" ان کے سرد سے لہجے کو سن کر پھر اس کی ہمت جواب دے گئی لیکن جب آنکھوں کے سامنے مومن آ کر کھڑا ہو گیا تو تھوڑی ہمت بھی آ گئی۔

"وہ... پاپا... مجھے ابھی شادی نہیں کرنا ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیوں؟ کیا کوئی اور پسند ہے؟" انہوں نے اس طرح ڈپٹ کر پوچھا کہ اس نے گھبرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"وہ... مجھے... اپنا کیریئر بنانا ہے۔ اپنی فیلڈ میں۔" اس نے ساری ہمت جتا کر کہہ ہی دیا۔

"کیریئر بنانا اچھی بات ہے لیکن اس کا شادی سے کیا تعلق ہے؟ ڈاکٹر سے شادی کر رہا ہوں تمہاری۔ وہ ایک پڑھا لکھا روشن خیال آدمی ہے۔ وہ تمہیں کیریئر بنانے سے روکے گا تو نہیں بلکہ شاید تمہاری حوصلہ افزائی ہی کرے گا۔"

ان کی اس صراحت پر وہ آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہی۔ آنسوؤں سے بند ہو جانے والے گلے کو اس نے صاف کر کے دوبارہ ہمت کی۔

"لیکن پاپا! مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔" اس کی بات سن کر وہ اسے سرد نظروں سے گھورتے رہے پھر گویا ہوئے۔

"اس قسم کی احمقانہ سوچ تمہاری ہو سکتی ہے لیکن میرا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے اس لیے یہ تصویریں اٹھا کر لے جاؤ اور تیاری کرو۔ شاپنگ کرنا ہو تو کریڈٹ کارڈ لے لینا۔ جاؤ۔" انہوں نے ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بات ختم کر دی اور وہ ٹوٹے بکھرے انداز میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

آج کی میٹنگ میں ژوانگ، لی اور شہریار تینوں شامل تھے۔ گفتگو کا موضوع وہی تھا کہ اپنی اس ریسرچ کی نئی ترجیحات کا تعین۔

شہریار نے محسوس کیا کہ وہ اس سے معاملات ڈسکس کر کے یہ تعین نہیں کریں گے بلکہ وہ اپنے مقاصد کا تعین کر چکے ہیں۔ اسے صرف [illegible] طرف [illegible] نے کے لیے [illegible] [illegible] [illegible]

"[illegible] مسٹر لی! اب ہم اس بارے میں کھل کر بات کر سکتے ہیں کیونکہ میں آپ کا مقصد پوری طرح سمجھ چکا ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے مسٹر شہریار! ہم آپ سے آپ کی آسانی کے مطابق بات کریں گے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایک ٹاپ سیکرٹ ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو ہمیں آپ اس بات کا یقین دلائیں گے کہ آپ اس پروگرام کو اگر شروع کریں گے تو اختتام تک آپ ہی اس کے ذمے دار رہیں گے اور یہ بھی کہ ازم آپ کی طرف سے لیک آؤٹ نہیں ہوگا، کسی بھی ترغیب پر، کسی بھی قیمت پر۔"

ژوانگ کی یہ بات سن کر شہریار مسکرایا۔

"یعنی آپ کے مطابق مجھے بکاؤ نہیں ہونا ہے، کسی بھی ترغیب پر، کسی بھی قیمت پر لیکن فرض کریں میرے ساتھ کام کرنے والے لوگوں میں سے کسی نے یہ کام کیا تو؟"

"تو اس کے ذمے دار بھی آپ ہی ہوں گے کیونکہ جب کسی ٹاپ لیول کے کام کی ذمے داری آپ کو سونپی جا رہی ہے تو اس کے ہر ہر پہلو کو محفوظ رکھنا بھی آپ ہی کے ذمے ہوگا۔ آپ کا کام ایسا ہے کہ مدد کے لیے آپ کو زیادہ

مددگاروں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کم سے کم لوگوں کو رکھیں اور خود دیکھیں کہ وہ قابلِ بھروسا ہوں۔ اگر نہ مل سکیں تو ہم سے کہیے ہم انتظام کریں گے۔"

"یعنی آپ مجھے بالکل فری ہینڈ دے رہے ہیں؟"

"بالکل۔ شروع سے آخر تک۔ سب کچھ آپ ہی کریں گے۔ کوئی آپ کے کام میں مداخلت کرے گا اور نہ ہی کوئی ڈکٹیشن دے گا۔ صرف مہینے میں ایک مرتبہ آپ مسٹر لی کو اپنے اس وقت تک کے کام پر ایک مختصر رپورٹ دے دیجیے گا یا اگر کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہو تو اس پر بات کر لیجیے گا اور کچھ بھی نہیں۔" ژوانگ نے بات ختم کی تو شہریار کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اسے یہ سب کچھ پسند آیا تھا۔

"تھینک یو! یہ آفر میرے لیے آئیڈیل ہے کیونکہ میری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی تھی کہ میں کسی اپنے پسندیدہ پروجیکٹ پر کام کروں، آزادی سے۔ کسی کی مداخلت کے بغیر۔ صرف اور صرف اپنی مرضی اور پسند کے مطابق۔ آج آپ کے توسط سے یہ موقع مل گیا۔ میں بہت خوش ہوں۔"

"ہماری پوری کوشش ہوگی کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں۔" ژوانگ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن ایک سوال ہے مسٹر شہریار! لیبن ڈاکٹر کا۔" لی جو خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا، اچانک بولا تو وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ یہاں ایک خفیہ منصوبے پر کام کر رہے ہیں لیکن باقی لوگوں کے لیے آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یعنی آپ یہاں کیوں موجود ہیں؟ آپ اس کی وضاحت کریں گے؟"

شہریار اس کا سوال سن کر ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بے خیالی میں لی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔

"یہاں میں اپنا جو روزمرہ والا کام کر رہا ہوں وہ تو کانفیڈینشل نہیں ہے نا؟ تو بس آپ کی دی ہوئی وہی نوکری کر رہا ہوں۔"

اس کے جواب پر وہ دونوں مسکرائے۔

"بہت خوب شہریار! لیکن مسئلہ یہ ہوگا کہ اگر آپ روزمرہ والا کام کریں گے تو دن تو سارا اسی کام میں نکل جائے گا پھر اپنا کام کس وقت کریں گے؟"

"اس کے لیے مجھے اپنی رات کی نیند قربان کرنا پڑے گی۔ سلیپ مینجمنٹ دن کے اوقات میں کرنا پڑے گی۔ دوپہر کے وقفے میں اور شام کے اوقات میں۔ میرے لیے پانچ گھنٹے کی نیند کافی ہو جاتی ہے۔ اس کا بھی بندوبست میں کر لوں گا۔"

"بہت خوب۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے کام ایک انتہائی ذمے دار اور قابلِ بھروسا شخص کے حوالے کیا ہے جو انتہائی محنت کے بعد کوئی نہ کوئی ایسی دریافت سامنے لانے والا ہے جو پوری انسانیت کے لیے ایک بہترین انعام ہو گی۔" ژوانگ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ شہریار کی طرف بڑھا دیا۔ شہریار نے اسے تھام کر ایک ہلکے سے جوش کے ساتھ ہلایا تو لی نے بھی اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر شہریار! آپ جو کچھ بھی دریافت کریں گے اس کی مکمل خریدار چائنا گورنمنٹ ہوگی۔ یقیناً آپ کو اپنی محنت کی بہت اچھی قیمت ملے گی۔"

"اوہ شکریہ مسٹر لی! آپ نے اچھی خوشخبری سنائی۔ اب میں پوری توجہ اپنے کام پر مرکوز کر سکوں گا۔" شہریار بہت خوش تھا، جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی توقعات سے بڑھ کر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے خوابوں کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں تو اٹھ کر چلے گئے لیکن وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھا اپنے اس پروگرام کے خدوخال ترتیب دیتا رہا جو اسے اس کے خوابوں کی منزل کی طرف لے جانے والا تھا۔

اس کی محویت ٹوٹ گئی... گھوں گھوں کی اس آواز سے جو فون سے آ رہی تھی۔ فون سائلنٹ پر ہونے کے باوجود لیب کی ٹھنڈی اور خاموش فضا میں یہ آواز بھی خاصی تیز محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چونک کر فون اٹھایا۔

"جی ماموں! کہیے۔" اس نے پوچھا تو دوسری جانب سے اس کے ماموں نے اسے رمل کا رشتہ طے کر دینے کی بات سنائی۔

"ٹھیک ہے ماموں! نکاح پر تو نہیں لیکن اس کی شادی پر ضرور آؤں گا۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے۔"

اس نے بات ختم کر کے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

اسے اچانک صبح ناشتے کی ٹیبل پر دیکھ کر وہ دونوں حیران ہو گئے۔

"ہائیں! تم کب آئے بھئی! اور آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔"

"میں لیٹ نائٹ پہنچا تھا ماموں! اس وقت آپ کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں خود بھی تھک گیا تھا اس

لیے سوچا صبح ہی ملوں گا۔“

”اچانک آنے کا خیال کیسے آ گیا؟ رُل کے نکاح میں آنے کے لیے کہا تھا میں نے تو تم نے بہت زیادہ مصروف ہونے کی خبر دی تھی۔“

”جی۔ ایسا ہی تھا لیکن پھر مجھے اچانک کچھ بریک مل گیا تو میں نے سوچا کہ آپ لوگوں سے مل لوں پھر پتا نہیں کب موقع ملے۔“

”ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟“

”ایک بڑا پروجیکٹ شروع کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے ختم ہونے تک تو میں شاید مل بھی نہ سکوں وہاں سے اس لیے۔“

”اچھا اچھا۔ بہت اچھا کیا۔ نکاح کی تقریب میں بھی شرکت کا موقع مل گیا تمہیں۔ اگلے ہفتے پہنچ رہے ہیں وہ لوگ۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب تم بھی شامل ہو جاؤ گے۔ خیر! میں اب چلتا ہوں۔ شام کو ملاقات ہو گی۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلے گئے تو شہریار نے ایک بھرپور نظر رُل کے چہرے پر ڈالی۔ چہرہ اترا ہوا، آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ہلکی سی نمی... سر جھکائے وہ اپنے آپ سے بھی کچھ بیگانہ سی لگ رہی تھی۔ وہ اس کی کیفیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”رُل! تمہیں کیا ہوا ہے؟ تمہارا نکاح ایک اچھے ڈاکٹر سے ہو رہا ہے۔ اچھی فیملی میں جا رہی ہو۔ ملک سے باہر کی دنیا دیکھو گی۔ یہ سب میرے خیال سے تو خوشی کی باتیں ہیں لیکن تمہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے ماموں تمہیں شیر کی کچھار میں بھیج رہے ہیں۔ اداسی کا مرقع، کیا خوش نہیں ہو اس شادی سے؟“ اس نے حیران ہو کر سوال کیا تو رُل نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ہائیں! تو ماموں سے کہا کیوں نہیں؟“

”آپ کو پتا تو ہے پاپا کا۔ وہ میری بات اول تو سنتے نہیں اور اگر سن بھی لیں تو مانتے نہیں۔ ان کے خیال میں وہ جو بھی کچھ سوچتے ہیں یا کرتے ہیں، بالکل درست ہوتا ہے۔ کسی کو ان سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے، خاص طور پر مجھے۔“

”ہم۔ میں جانتا ہوں لیکن تم مجھے اپنا مسئلہ سمجھاؤ تو شاید میں تمہاری کوئی مدد کر پاؤں۔ تمہیں یہ ڈاکٹر صاحب پسند کیوں نہیں؟“

اس کے سوال پر رُل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”لیکن پسند ناپسند کا فیصلہ تو اس وقت ہوتا ہے جب کسی کو جانا جائے، پرکھا جائے۔ ملے بغیر تو یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا پھر تم نے کیا ماموں کی پسند کو ریجیکٹ کرنے کے لیے اسے ناپسند کر دیا ہے۔“

”نہیں۔ مجھے کوئی اور پسند ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بھی ڈاکٹر ہے۔“

”اوہ! یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ ماموں کی اولین ترجیح کوئی ڈاکٹر ہی ہے۔ بتا دو انہیں۔ وہ کر دیں گے شادی۔“

”نہیں۔ فی الحال نہیں بتا سکتی۔“

”کیوں؟ کیوں بھئی؟“

”اول تو وہ میری پسند ہونے کی وجہ سے پہلے ہی ریجیکٹ کر دیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کا ابھی ایک سمسٹر باقی ہے۔ اس کی امی نے اس سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ اپنا ایم بی بی ایس مکمل کرنے سے پہلے شادی کی کوئی بات نہیں کرے گا اور اگر کی تو وہ بھی اس کا رشتہ لے کر نہیں جائیں گی۔ بہرصورت اسے سمسٹر مکمل کرنا ہے۔ تب ہی یہ بات کی جا سکتی ہے۔“

”پھر... تم نے اسے موجودہ پوزیشن بتائی؟ وہ کیا کہتا ہے؟“

”بتائی تھی۔ وہ کہتا ہے جیسے بھی ہو اس پوزیشن کو چھ ماہ اور ٹالتی رہو۔ اس کے بعد وہ ایک دن بھی نہیں رکے گا۔ اگلے دن اپنی امی کے ساتھ میرے گھر آ جائے گا میرا رشتہ لینے۔“

”اور اگر ماموں نے انکار کر دیا تو پھر؟“ اس کے سوال پر وہ خالی الذہنی کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی پھر اس کے ہونٹوں سے سرسراتے ہوئے الفاظ پھسلے۔

”پھر میرے پاس مرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہے گا۔“

”اوہ! اتنا چاہتی ہو اسے؟ تو کیا وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہے؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اوہ! تو پھر تو اس نے کچھ اور مشورے بھی دیے ہوں گے؟ مثلاً کہیں بھاگ چلتے ہیں۔“

”یہ مشورہ تو میں نے اسے دیا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے اسے میری عزت عزیز ہے اور میں بھی پاپا کی عزت کا تماشا بنانا نہیں چاہتی۔ یہ ساری زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔“

”کیا میں اس سلسلے میں ماموں سے بات کروں؟“

”صرف بات نہ کریں بلکہ ان سے منوائیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو دو زندگیوں کا انجام موت ہو گا اور اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ آپ کو یہ خلش جینے نہیں دے گی۔“

”ارے بھئی! اتنی خوف ناک باتیں تو مت کرو دل دہلا دینے والی۔ میں بات کرتا ہوں ماموں سے۔ پتا نہیں

پرخلوص ساتھ

26 جون کی رات اور رمضان کی شب قدر میں دنیا میں آنکھ کھولی۔ اسکول میں ہی لکھنے کی ابتدا کی۔ ریڈیو کے لیے لکھا ہوا ڈراما شناخت کا سبب بنا۔ طالب علمی کے دور میں کالج میگزین کی ادارت، افسانے، مضامین، کہانیاں اور ریڈیو کے مختلف موضوعاتی پروگرام اور ڈرامے لکھے جن کو بے حد پذیرائی ملی۔ پھر ایک لمبا سفر۔ مختلف اور بڑی سرکولیشن رکھنے والے پرچوں میں کہانیاں، ناول، ناولٹ اور افسانے چھپے، جنھیں عام قارئین سے بے حد پسندیدگی کی سند عطا ہوئی۔ خاص طور پر میں محترمہ عذرا رسول کے تعریفی کلمات کو اپنے لیے سرمایہ تصور کرتی ہوں، جو انہوں نے پاکیزہ میں میری کہانی آخری ہجرت پڑھنے کے بعد کہے اور وہ چھپے۔ تخلیق کار کی کسی تخلیق کو سراہے جانے کا احساس اس کی صلاحیتوں کو اور جلا بخشتا ہے اور پھر ایسی ایسی نادرالوجود تخلیقات سامنے آتی ہیں کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن سے سترہ سال پرانی وابستگی ہے۔ پہلی مرتبہ میری کہانی ”شبیہ“ (سسپنس ڈائجسٹ) کے ذریعے قارئین سے میرا تعارف ہوا اور بہت خوب ہوا۔ بس اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب تو یہ ادارہ اپنے ہی گھر کا ایک حصہ سا لگنے لگا ہے۔ معراج

[illegible] بات کرتے ہیں اس موضوع پر۔ ویسے مجھے کسی اچھائی کا یقین تو نہیں ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے اور تم بھی تھوڑا حوصلہ پکڑو۔ یہ کیا کہ فوراً ہی مرنے مارنے کی باتوں پر آگئیں۔“

”فوراً نہیں، شیری بھائی! پچھلے آٹھ ماہ سے میں اس عذاب کو جھیل رہی ہوں۔ پاپا نے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں پھینک دیا ہے۔ میں زندگی بچانے کی جدوجہد میں نڈھال ہوتی جارہی ہوں۔ کب تک، آخر کب تک میں کوشش کر پاؤں گی؟ اب صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے میری زندگی یا موت کا۔ آپ میری آخری امید ہیں۔“

”او مائی گاڈ! تمہیں تو میں ایک سیدھی سادی گائے [illegible] لڑکی سمجھتا تھا لیکن تمہارے اس انداز کو دیکھ کر تو میرے وہ تمام خیالات دھڑ دھڑا کر گر پڑے ہیں۔ بریو [illegible] ہو آر [illegible] بریو گرل۔ خیر! نہ پریشان ہو اور نہ مایوس۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لوں تاکہ تم زندہ رہ سکو اور بقول تمہارے میری زندگی اس معاملے میں کسی کنک کا شکار نہ ہو۔ اوکے؟“

رمل نے گردن ہلا کر اپنی رضامندی دے دی۔

ان دنوں مراد کے سیکنڈ لاسٹ سمسٹر کے امتحان چل رہے تھے۔ وہ ان میں بہت مصروف تھا۔ عموماً رمل اسے ڈسٹرب نہیں کرتی تھی لیکن اس پروگریس کے بارے میں اس نے اسے میسج کردیا۔ جواب میں اسے بھی فوراً ایک [illegible] سا تسلی مل گئی۔

اگلی شام اس کے لیے ایک بہت بڑے دھماکے والی تھی۔ پاپا نے اسے بتایا کہ انہوں نے اس کا پرانا رشتہ توڑ کر اب اس کی شادی شہریار سے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ نہ جانے کیا کیا وجوہات بتاتے رہے لیکن وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ صرف انہیں دیکھتی رہی۔ اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ جو بات سمجھ میں آئی تھی وہ یہ تھی کہ شیری بھائی نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس کے خوابوں اور مراد کے بارے میں اس کے جذبات کی شدت کے بارے میں جانتے ہوئے بھی وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

”نہیں۔“ وہ زور سے چلائی اور غصے میں کرسی پیچھے گرا کر اٹھنے کی کوشش میں الجھ کر گری۔

”آرام سے...... آرام سے۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی تمہیں اس شادی سے بچانے اور تمہاری خواہش پوری کرنے کا ایک ذرا مشکل سا راستہ ہے۔ کیونکہ ماموں کسی بھی طرح ماننے کو تیار نہیں تھے۔ تم ذرا اپنے آپ کو سنبھالو تو سہی۔“ شہریار نے اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی تو وہ آگ بگولا ہوگئی۔

”ہاتھ مت لگاؤ مجھے یو چیٹر۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں نے تم پر بھروسا کیا تھا اور تم نے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ میں نے بتایا تھا تمہیں کہ مجھے مراد کے سوا کسی سے شادی نہیں کرنا لیکن تم نے [illegible] تم نے پاپا کے سامنے اپنے آپ کو رکھ دیا۔ تم جانتے تھے کہ وہ تمہارے سامنے بھی انکار نہیں کریں گے۔ تم نے فائدہ اٹھایا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا...... دھوکا دیا۔“ وہ غصے سے پھر چلائی۔

”یہ دھوکا نہیں ہے رمل! تمہیں اس فوری شادی سے بچانے کا ایک واحد طریقہ ہے۔“ شہریار نے اسے اٹھا کر

صاحب کا اس دنیا سے چلے جانا ایک بہت بڑا سانحہ محسوس ہوا لیکن عذرا رسول صاحبہ نے بڑی ہمت دکھائی اور اس گھر کو ٹوٹنے بکھرنے سے بچالیا۔ بے شک اس کے لیے وہ ستائش کی مستحق ہیں۔ اگرچہ اس دوران کورونا کے بلیک ہول سے گزرنے کا مشکل مرحلہ بھی آیا اور دو ماہ کے تعطل نے لکھنے اور پڑھنے والوں کو عجیب سے احساس محرومی میں مبتلا کر دیا۔ مشکل آئی لیکن ان کی ثابت قدمی نے اسے بھی پار کرلیا۔

آخر میں اپنی ایڈیٹرز کا بھی بے حد شکریہ جو بڑے پیار اور محبت سے یاد دلاتی رہتی ہیں کہ بہت دن ہو گئے آپ کی کوئی کہانی نہیں آئی۔ ان کی یہ محبت مجھے نئے سرے سے کچھ نیا کام کرنے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ سسپنس کے پہاس ایک طویل مدت اور دلچسپ کہانی......

محبتوں کے ساتھ

پروین زبیر

واپس کرسی پر بٹھایا۔ ماموں تو کب کے جا چکے تھے۔

''تم جانتی ہو میرا اپنا ایک مزاج ہے۔ میرے سامنے بہت سے چیلنجز ہیں۔ شادی وغیرہ اس میں کہیں گنجائش نہیں رکھتی۔ مجھے بہت اہم کام کرنا ہیں جو دنوں یا ہفتوں تک نہیں بلکہ سالوں پر محیط ہیں۔ شادی کا آپشن میں نے صرف تمہاری اس لندن والے ڈاکٹر سے جان چھڑانے کے لیے دیا تھا۔ میں یہاں صرف ایک ہفتے کے لیے ہوں۔ کوشش کروں گا کہ ماموں کو قائل کرسکوں کہ میرے اگلے وزٹ پر شادی رکھ لی جائے۔ بعد میں انکار کردوں گا کوئی بہانہ بنا کر جب تک تمہارا وہ عاشق بھی تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اب بتاؤ اس میں دھوکا کہاں اور کیسے ہے؟''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں شیری بھائی؟'' اس نے شکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنسا اور اثبات میں سر ہلایا لیکن نہ جانے کیوں رل کو اس کی ہنسی بھی کچھ مشکوک سی محسوس ہوئی اور نظروں سے بے اعتباری بھی نہیں ہٹ سکی۔ شہریار نے اس بات کو محسوس کرلیا۔

''دیکھو رل! یہ صرف ایک آپشن ہے۔ تمہارے خیال میں اگر اس سے بہتر کچھ ہوسکتا ہے تو بتاؤ۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ماموں اصرار کریں کہ نہیں تمہارا پھر معلوم نہیں کب آنا ہو اس لیے شادی کر کے جاؤ کیونکہ میں انہیں اپنے مستقبل کے پلان کے بارے میں بتا چکا ہوں۔''

''نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں مرجانا زیادہ پسند کروں گی۔ میں مراد کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ کسی سے نہیں...... مطلب کسی سے بھی نہیں۔'' اس نے تمکین سے لہجے میں کہا تو شہریار نے بے پروائی سے کاندھے اچکائے۔

''ٹھیک ہے۔ اگر مرنا ہی تمہارا پسندیدہ عمل ہے تو تمہارے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ میں ایک خوش امید شخص ہوں اس لیے مایوسی میرے نزدیک بزدلوں اور نکموں کا شیوہ ہے جب کچھ کرنا نہیں چاہتے تو آرام والا کام کرتے ہیں۔ یعنی نیند کی گولیاں کھا کر بستر پر لیٹ کر مرجاتے ہیں۔''

رل پہلے تو اسے خاموش نظروں سے گھورتی رہی پھر مخاطب ہوئی۔

''بزدلی، نکما پن اور آرام کی موت مرنا میرے... جذبات کی توہین ہے یہ شیری بھائی! اپنی جان لینا کوئی آسان کام ہوتا ہے کیا؟''

''ہاں۔ حالات سے شکست کھا کر اپنے آپ کو ختم کر دینا انتہا درجے کی بزدلی ہے اور یہ وہ لوگ کرتے ہیں جو مشکلوں سے لڑ کر جیتنے کو ایک مشکل اور کٹھن کام سمجھتے ہیں۔ کون جو کھم اٹھائے بھئی۔ نہیں ہو رہا کچھ اپنی مرضی کا تو آرام سے بستر پر لیٹ کر مرجاؤ۔ سب مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔''

''تو پھر کیا کروں؟ مرنے کے لیے کوئی مشکل اور کٹھن راستہ اختیار کروں؟ آگ لگالوں اپنے آپ کو؟ سمندر میں چھلانگ لگادوں یا پھر کلائیاں کاٹ کر سارے جسم کو چاقو سے ٹکڑے کر ڈالوں۔ ان میں سب سے بڑی بہادری کا کارنامہ آپ کے نزدیک کیا ہوسکتا ہے...... ہیں؟''

''لاحول ولاقوۃ! کیا بے وقوفانہ بیانات دے رہی ہو۔ زندہ رہ کر حالات کو اپنے حق میں بدلنے کی جدوجہد کیوں نہیں کرسکتیں تم؟''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''اور اگر پاپا نے میری شادی آپ کے ساتھ کردی تو

پھر کیا ہوگا؟"

"اول تو میں پوری کوشش کروں گا کہ پلان اے پر عمل ہو جائے جو میں نے بتایا تھا کہ شادی کی صرف بات کر کے چلا جاؤں اور بعد میں انکار کردوں لیکن ماموں کی ہٹ دھرمی والی فطرت کے باعث اگر یہ نہ ہو سکا تو پھر پلان بی بھی ہے میرے پاس۔ میں تمہیں شادی کر کے لے جاؤں گا اور جیسے ہی تمہارے پسندیدہ ڈاکٹر صاحب تیار ہوں گے، میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور پاکستان بھیج دوں گا۔ ماموں کی دس بیس گالیاں کھالوں گا تمہارے لیے لیکن تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں شیری بھائی؟" اس کے سوال میں اس کے مایوس کن جذبات کی شدت کافی کم محسوس ہوئی تو شہریار بھرپور طریقے سے مسکرایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں مراد سے بات کرتی ہوں۔ اسے یہ ساری سچویشن بتا کر پوچھتی ہوں۔ وہ کیا کہتا ہے؟"

پھر یہ ہوا کہ اگلے تین دنوں میں اس کی شادی سادگی سے شہریار کے ساتھ ہوگئی اور وہ اسے لے کر جاپان چلا گیا۔ نو گھنٹے کی طویل فلائٹ میں وہ صرف امید اور ناامیدی کے درمیان ڈولتی رہی۔ جہاز کی کھڑکی سے وہ بادلوں کے ڈھیر پہاڑوں کی صورت دیکھ کر نہ جانے ان میں کیا تلاش کرتی رہی۔ تمام راستے اس نے نہ تو کوئی بات کی اور نہ ہی مڑ کر شہریار کو مخاطب کیا۔ سفر تمام ہوا اور وہ ایک اجنبی سرزمین پر ایک اجنبی شخصیت کے ہمراہ اتر کر کھو گئی۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی۔ لیب میں ہر طرف گمبھیر خاموشی طاری تھی اور وہ بڑے سے الیکٹرونک مائیکرو اسکوپ پر ایک آنکھ رکھے نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا کہ ایک بہت ہلکی سی آہٹ نے اس کی توجہ منتشر کردی۔ اس نے مائیکرو اسکوپ سے آنکھ ہٹائی ہی تھی کہ ایک سرد آواز سرگوشی کی صورت اس کے کانوں سے ٹکرائی اور سرد لوہے کی ٹھنڈک اسے اپنی کنپٹی پر محسوس ہوئی۔

"کوئی حرکت نہ کرنا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھو اور کھڑے ہو جاؤ۔" انگریزی میں اسے حکم دیا گیا تو اس نے تعمیل کی۔ دوبارہ اسے حکم دیا گیا۔

"وہ سامنے صوفے پر چل کر بیٹھ جاؤ۔" وہ بھی اسی طرح ہاتھ سر پر رکھے کونے پر پڑے صوفہ کم بیڈ پر جا کر بیٹھا تو پہلی مرتبہ اس کی نظر اس نو وارد پر پڑی۔ وہ لیب میں پہنا جانے والا سفید اوور آل پہنے ہوئے تھا اور سر پر مخصوص ٹوپی اور آنکھوں پر ریم لیس چشمہ لگائے وہ لیب سے متعلق ہی کوئی فرد محسوس ہو رہا تھا لیکن تھا نہیں۔ اس کی نیلی آنکھیں اور مخصوص رنگت بتا رہی تھی کہ وہ مشرق کا نہیں مغرب کا باشندہ ہے۔ سب سے خطرناک وہ سائلنسر لگا ہوا مہیب پستول تھا۔ جو اس کے کوٹ کے اندر والے ہاتھ میں تھا۔ اب اسے کچھ حیرت ہوئی کہ اس قدر سخت سیکیورٹی بریک کر کے یہ بندہ یہاں آیا کیسے؟ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات وہ اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔

"اس وقت تمہاری جو ریسرچ چل رہی ہے، مجھے اس کے اوریجنل ڈاکیومنٹس چاہئیں۔" اس کا لہجہ کچھ غرانے والا سا تھا۔

"وہ سامنے چار نمبر والے لاکر میں ہیں۔ نکال لو۔" شہریار نے بتایا۔

"تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری اس سرکاری.... ریسرچ سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے نہ اپنا وقت ضائع کرو، نہ میرا۔ مجھے تمہاری ذاتی ریسرچ کے پیپرز چاہئیں۔" اس کے لہجے کی سرد مہری بڑھ رہی تھی۔

"وہ اندر والٹ روم کے لاکر میں ہیں۔" شہریار نے اسے بتایا۔

"او کے! چلو اس طرف چل کر مجھے نکال کر دو اور کوئی دھوکا نہیں۔ الارم وغیرہ بجانے کی کوشش بھولے سے بھی نہ کرنا۔ ورنہ تمہاری کھوپڑی میں ایک چھوٹا سا... سوراخ ہو جائے گا اور تم یقیناً یہ نہیں چاہو گے۔"

شہریار اٹھ کر ہال کے آخری سرے پر موجود والٹ ڈور کی طرف گیا۔ اس کا ایک مخصوص بٹن دبانے پر ایک اسکرین روشن ہوئی تو اس نے اپنا پورا دایاں ہاتھ اس پر رکھ دیا۔ اس کے اسکین ہوتے ہی کلک کی آواز کے ساتھ ہی ایک نمبر پیڈ ظاہر ہوا۔ کچھ مخصوص نمبرز کے کامبی نیشن نے لوہے کا وہ موٹا اور بھاری دروازہ کھول دیا۔ دونوں اندر داخل ہوئے تو وہاں ایل شیپ میں بے شمار لاکرز تھے۔ اس نے سامنے چار نمبر والے لاکر کو کھولا تو اس میں تین چار پتلی پتلی فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ نو وارد نے آگے بڑھ کر وہ فائلیں اس کے ہاتھ سے لیں اور ان کے کچھ اوراق پلٹ کر دیکھے۔ پھر انہیں اپنے لباس میں کہیں پوشیدہ کرلیا۔ ایک نظر باہر کی طرف ڈالی اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

شہریار صدمے کی کیفیت سے باہر آیا تو اس نے بے دلی سے لاکر اور والٹ کو بند کیا اور باہر نکل آیا۔ مرے مرے قدموں سے واپس اپنی ٹیبل پر آیا اور بیٹھ گیا۔ اس کے سارے بدن پر ایک سنسناہٹ سی طاری تھی۔ وہ کچھ دیر سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ پھر پانی کی بوتل سے منہ لگا کر پانی پیا۔

ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ سیکیورٹی کو اطلاع کرے یا براہِ راست ڈاکٹر ژوانگ کو اطلاع کردے کیونکہ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اسی کشمکش میں تھا کہ اسے اپنے فون پر گھوں گھوں کی سی آواز سنائی دی کیونکہ وہ سائلنٹ پر تھا۔

"ہاں۔کون ہے؟"

"سر! آپ خیریت سے ہیں؟ میں سیکیورٹی سے بات کر رہا ہوں۔" اس سے چینی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کسی نے پوچھا تو شہریار سوچ میں پڑ گیا۔ ایک لمحے کو سوچ کر اس نے کہا۔

"ہاں۔میں ٹھیک ہوں۔کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں سر! معمول کا چیک اپ ہے۔"

بات ختم ہوگئی لیکن شہریار شش و پنج میں پڑ گیا۔ کیا یہاں گھسنے والا صرف دیکھا گیا ہے۔ یا پکڑا بھی گیا ہے؟ یہ سوال اس کے ذہن کے بند دروازوں پر دستک دے رہا تھا کیونکہ وہ اب تک حیران تھا کہ اس قدر سخت سیکیورٹی میں وہ نامعلوم شخص اندر آ کیسے گیا تھا۔

جو بھی ہو صبح دیکھا جائے گا۔ اب اس کا کام کرنے سے دل بالکل اچاٹ ہو گیا تھا۔ بہتر یہ سمجھا کہ جا کر سو جائے یا اس کی کم از کم کوشش شروع کرے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے بیڈروم میں جھانکا تو رل سو رہی تھی۔ سونے سے پہلے وہ یا تو مراد سے اسکائپ پر باتیں کر رہی تھی۔ یا شاید صرف اس کی تصویریں دیکھ رہی تھی کیونکہ اس کا لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا اور اسکرین پر مراد کی ایک تصویر مسکرا رہی تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ مراد کو دیکھا تو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ ایک خوش رو اور خوش ادا شخص لگا پھر ایک نظر سوئی ہوئی رل پر ڈالی تو پہلی مرتبہ اسے ڈاکٹر مراد سے کچھ جلن سی محسوس ہوئی۔ اس نے رل کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے سر ہلایا اور بیڈروم سے نکل گیا۔

☆☆☆

ماحول میں تناؤ تھا اور اس کا سبب شہریار کی کچھ غصے اور کچھ جھنجلاہٹ کی کیفیت تھی۔ وہ اپنے انتشار کو بہت ضبط کر رہا تھا۔

"سوال یہ ہے کہ اس قدر سخت سیکیورٹی کو اس نے بریک کیسے کیا؟ اگر یہاں اتنی کمزور سیکیورٹی ہے تو یہ تو ناقابلِ بھروسا ہے۔ میری اتنے دنوں کی محنت کو وہ اچکا مجھ سے ہی چھین کر لے گیا اور کوئی اسے روک سکا۔ نہ پکڑ سکا۔ میں بہت مایوس ہوا ہوں۔"

اس کی بات سن کر ڈاکٹر ژوانگ مسکرایا اور اپنے بیگ سے اس کی وہ فائلیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں جو رات کو وہ اچکا اس سے لے کر جا چکا تھا۔ شہریار نے حیران ہو کر ان فائلوں کو اٹھایا اور دو چار صفحے پلٹ کر اس بات کا یقین کیا کہ یہ وہی فائلیں ہیں، پھر ڈاکٹر ژوانگ کو دیکھا۔

"وہ جس وقت لیب کی چار دیواری میں گھسا تھا اسی وقت دیکھ لیا گیا تھا لیکن اسے جان بوجھ کر موقع دیا گیا آگے بڑھنے کا تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پوری تیاری سے آیا تھا اور اس کے پاس ایسے ٹولز تھے جن کی مدد سے وہ سیکیورٹی کے حصار کو وقتی طور پر مفلوج کر سکتا تھا اور اس نے ایسا کیا لیکن ہم نے بھی اسے موقع دیا۔ وہ جب آپ کی لیب میں گھسا اور اس نے وہاں جو کچھ بھی کیا..... جو کچھ بھی کہا، ہم سب دیکھ اور سن

تکبر

جارج برنارڈ شا کی ظرافت اور شوخیٔ طبع مشہور ہے۔ اس عظیم ڈراما نگار نے برطانیہ کے امراء کو بھی در خورِ اعتنا نہ سمجھا کہ ان کی نوابی سے مرعوب ہوتا۔ ادھر یہ امراء بھی اس کی خاطر جھکنے کو تیار نہ تھے۔ ایک بار ایک بددماغ اور متکبر لارڈ نے جو ادب دوست بھی تھا مگر اپنی انا کے سبب اس ادیب کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھا، ایک خط برنارڈ شا کو لکھا۔

"لارڈ جارج پیٹر آف سالسبری، جمعرات کو شام چھ بجے سے سات بجے تک گھر پر رہیں گے۔"

برنارڈ شا کو اس متکبرانہ دعوت پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے اسی خط پر یہ جملہ لکھ کر واپس بھیج دیا۔ "جارج برنارڈ شا بھی اسی وقت گھر پر ہوں گے۔"

عربی لباس

ایک مرتبہ مولانا محمد علی جوہر ایک انگریز گورنر کی ضیافت میں عربی لباس پہن کر شریک ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی گورنر نے کہا۔ "مسٹر محمد علی! آپ تو بالکل عرب معلوم ہوتے ہیں۔"

اس پر مولانا نے فرمایا۔ "میں نے انگلستان میں انگریزی تعلیم حاصل کی، انگریزوں جیسی زبان استعمال کی اور آپ کا انگریزی لباس بھی پہنا لیکن آج تک مجھ سے کسی نے یہ نہ کہا کہ محمد علی تم تو بالکل انگریز معلوم ہوتے ہو۔ یہ تو میرے آقا نبی کریم ﷺ کا اعجاز ہے کہ صرف عربی لباس پہننے سے میں بلا حیل و حجت عربوں میں شمار کیا جا رہا ہوں۔"

مرسلہ: شاہانہ سلطان، کراچی

رہے تھے۔'' ڈاکٹر ژوانگ نے تفصیل بتائی۔

'' اور اگر میں اس وقت کچھ مزاحمت کرتا اور وہ مجھے گولی مار دیتا تو پھر تو آپ کی یہ ہم جوئی میرے لیے بیکار ہی تھی نا۔''

'' وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ یہ آپ بھی اندازہ کر سکتے ہیں کیونکہ آپ کی مدد کے بغیر وہ نہ تو والٹ کھول سکتا تھا اور نہ ہی لاکر۔''

'' پھر بھی ..... پھر بھی فرض کیجیے۔ کچھ بھی حادثاتی طور پر ہو جاتا تو؟''

'' شہر یار! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آپ کو گولی نہیں مار سکتا تھا کیونکہ یہاں ہم نے پوری لیب کے علاقے میں جیمرز لگوائے ہوئے ہیں جو چوبیس گھنٹے کام کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہاں کوئی بھی آتشیں ہتھیار کام نہیں کر سکتا اور پھر سب سے بڑھ کر جب ہم نے آپ کی حفاظت کی ذمے داری لی ہے تو اس بات کا یقین رکھیں کہ آپ اس لیب میں ہر طرح سے محفوظ ہیں۔'' ژوانگ مسکرایا تو اس کا بھی حوصلہ تھوڑا بلند ہوا۔

'' کون تھا وہ؟ آپ لوگوں نے اسے پکڑ لیا ہے تو معلوم تو کر لیا ہوگا؟''

'' ہوں ..... معلوم تو ہو گیا کہ کون تھا لیکن وہ بھاگ گیا۔ ہم اسے زیادہ دیر رکھ نہیں پائے۔''

'' کیا؟ کیا مطلب ہے۔ کہ وہ آپ کی گرفت سے نکل کر بھاگ گیا؟ میں یقین نہیں کر سکتا ..... ناممکن۔'' شہر یار نے حیران ہو کر کہا تو ژوانگ ہنسنے لگا۔

'' آپ بالکل ٹھیک حیران ہو رہے ہیں۔ وہ ہماری گرفت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اگر ہم خود یہ نہ چاہتے۔''

'' کیا مطلب ہے ڈاکٹر! کیا آپ لوگوں نے اسے خود فرار کروایا ہے؟''

'' ہاں! اصل میں یہاں کچھ غیر ملکی وفود آئے ہوئے ہیں جو ان وائرس پر تحقیقات میں معلومات ہمارے ساتھ شیئر کرنا چاہتے ہیں جو آج کل وبا کی طرح پوری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ پھر کچھ مغربی ملکوں کے فوجی وفد بھی ہیں جو فوجی معاملات کو ڈسکس کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ یہ شخص بھی لوگوں کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ اسے پکڑ کر گرفتار کر کے اس سے پوچھ گچھ کرنا، بہت ہی پیچیدگیوں کو جنم دینے کا سبب بن سکتا تھا کیونکہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے ارادے تو کچھ اور ہیں لیکن انھیں کیموفلاج کیا گیا ہے اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ جتنی معلومات ہم اس سے لے سکتے تھے لے کر، آپ کی چوری کی ہوئی فائلیں بھی واپس لے لینے کے بعد۔ اس کے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے اس پر ہاتھ ذرا ہلکا کر کے اسے فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ناکام ہی سہی لیکن ان کا بندہ واپس آ گیا ہے اس پر وہ بھی خوش اور ہم بھی خوش کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ امید ہے کہ اب آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے شہر یار! اب آپ سکون اور یکسوئی سے اپنا کام کریں اور جلد کامیابی کی خوشخبری سنائیں۔''

'' ٹھیک ہے ڈاکٹر! بہت شکریہ۔ مجھے تسلی ہو گئی۔ میں آپ کو بہت جلد اچھی خبر سناؤں گا۔ ان شاء اللہ۔'' بڑی دیر بعد اس کا تناؤ کچھ کم ہوا اور وہ مسکرایا تھا۔

☆☆☆

بڑی روشن، چمکیلی اور خوشگوار صبح تھی۔ وہ دونوں ناشتے کی ٹیبل پر تھے۔ رل حسب معمول گم صم سی چائے کا کپ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

شہر یار نے اسے غور سے دیکھا پھر مخاطب کیا۔

'' تمھیں اپنے لیے کچھ کپڑے خریدنے کی ضرورت ہے۔ سردی بڑھ رہی ہے۔ کچھ دنوں میں کافی زیادہ ٹھنڈ ہو جائے گی اس لیے ابھی جا کر کچھ گرم کپڑے خرید لو۔''

'' ہاں۔ کچھ گروسری کی بھی ضرورت ہے۔ کچن میں کئی چیزیں ختم ہوئی ہیں۔'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

'' ٹھیک ہے۔ یہ میرا کریڈٹ کارڈ ہے۔ لے جاؤ اور کچھ زیادہ ہی چیزیں لے لینا۔ سردی زیادہ ہو تو باہر جانا مشکل لگنے لگتا ہے۔''

شہر یار نے اپنا کریڈٹ کارڈ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے لیب جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

رل نے برتن سمیٹے اور کچن میں چلی گئی۔ وہاں کے کاموں سے فراغت میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ تیار ہو کر بال سمیٹے اور گھر سے نکل گئی۔ مارٹ اس کے گھر سے بہت دور تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس الگ تھلگ جگہ پر بنے اس لیب کمپلیکس سے ہر جگہ ہی بہت دور تھی۔ کہیں بھی جانا ہو تو بہت دور ہی جانا پڑتا تھا۔ گاڑی کی عیاشی وہاں ممکن نہیں تھی۔ چائنا میں ہر جگہ گاڑی استعمال کرنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی اس لیے وہ بھی پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے پر مجبور تھی۔ اس سارے بکھیڑے کو نمٹانے میں کئی گھنٹے لگ گئے پھر واپس آ کر مزید وقت کھانا پکانے اور دوسرے کاموں کو نمٹانے میں لگ گیا۔ اب وہ بیزاری اور اکتاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ چار بج رہے تھے جب شہر یار کھانا کھانے کے لیے آیا۔

"سب چیزیں لے آئی ہو؟" اس نے سوال کیا تو رمل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم کہاں ہے؟" اس کے اس سوال پر رمل نے کچھ حیرت سے اس کو دیکھا لیکن وہ خاموشی سے سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر اٹھ کر گئی اور برگر لا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ خاموشی سے ان کا جائزہ لیتا رہا۔

"برگر کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ بلاوجہ کی فضول خرچی۔ گھر تو واپس آنا تھا۔ گھر آ کر کچھ کھا لیتیں۔" اس نے سنجیدگی سے اسے جتایا تو وہ مزید حیران ہوئی۔

"بہت دیر مسلسل پیدل چلنے کے بعد بھوک لگ گئی تھی تو ایک برگر کھانا فضول خرچی کیسے ہو گیا۔ پاکستانی روپوں میں یہ صرف پانچ چھ روپے بنتے ہیں۔ کیا یہ کوئی بڑی رقم ہے؟" اس نے ذرا تندی سے پوچھا تو اس نے سرد مہری سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"روپیا خرچ کرنے میں ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ بہت چھوٹی سی رقم ہے لیکن جب کمانا پڑے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خاصی بڑی رقم ہے۔ تم کیونکہ صرف خرچ کرنے والوں میں سے ہو اسی لیے تمہیں بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ تو بہت چھوٹی سی رقم ہے۔ اگر کمانا پڑے تو معلوم ہو گا۔"

شہریار کی اس بات نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں گھر کے فضول کاموں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے کوئی جاب کر لیتی ہوں تاکہ تمہارے پیسوں کی مجھے کوئی محتاجی نہ رہے اور تمہیں میری فضول خرچی کا غم بھی نہ ہو۔"

"ہاں ضرور۔ تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اس طرح گھر میں پڑے رہ کر اپنے آپ کو ضائع ہی کر رہی ہو۔ بہتر ہے کہ اپنے ٹیلنٹ کو استعمال کرو۔ اس سے تمہارا ذہن بھی بہتر انداز میں سوچنے لگے گا اور تمہارا ٹائم بھی کیش ہو گا۔ آن لائن جابز دیکھو۔ ہو سکتا ہے تمہیں اسی لیب کمپنیز میں کوئی جاب مل جائے۔" اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو رمل پُرخیال انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

اگلے کئی دنوں تک وہ یہی کام کرتی رہی۔ کئی جگہ سی وی بھیجیں۔ کچھ انٹرویوز بھی دیے لیکن کہیں سے کوئی اس کے معیار کی جاب نہیں مل سکی۔

ایک دن شہریار کے پوچھنے پر اس نے صورتِ حال بتائی تو وہ سن کر کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"دیکھو تم جانتی ہو۔ میں ایک تو یہاں کی سرکاری جاب کرتا ہوں جو تین بجے ختم ہو جاتی ہے۔ پانچ بجے کے بعد میں اپنا ذاتی کام کرتا ہوں۔ یہ ایک ریسرچ ورک ہے۔ ابھی تک کام کم تھا۔ میں اکیلا کر رہا تھا لیکن اب بہت بڑھ گیا ہے اور اب مجھے ایک اسسٹنٹ کی سخت ضرورت ہے۔ تم چاہو تو مجھے جوائن کر سکتی ہو۔"

"تنخواہ کتنی ہو گی؟" اس نے بے دھڑک پوچھا تو شہریار نے سر ہلایا۔

"کتنی تنخواہ چاہتی ہو؟"

"آٹھ گھنٹے کام ہے تو پاکستانی تقریباً دس لاکھ روپے۔"

"یہ بہت زیادہ ہیں۔ اس سے آدھے پیسوں میں مجھے کہیں سے کوئی مل جائے گا؟"

"تو ٹھیک ہے۔ کہیں سے کسی کو ڈھونڈ لو۔ ویسے بھی تمہیں پیسے خرچ کرنا ذرا مشکل ہی لگتا ہے۔ میں کوشش کر رہی ہوں، مجھے اپنے مطلب کی جاب مل جائے گی۔"

"کچھ کم پر آؤ تو کل سے ہی جوائن کر سکتی ہو۔ بتاؤ! کتنے کم پر ڈن ہو سکتا ہے؟"

"ناٹ آ سنگل پینی۔" اس نے حتمی جواب دیا۔

"پھر سوچ لو۔ ادھر ادھر خوار ہوتی رہو گی۔ جاب ملنا آسان کام نہیں ہوتا ہے۔"

اس نے بے پروائی سے سر ہلا دیا اور سوچنے لگی کہ کون سا اسے زیادہ عرصہ یہاں رہنا ہے۔ چند ماہ، صرف چند ماہ کے بعد وہ واپس چلی جائے گی۔ وقت گزاری کے لیے کچھ بھی ملے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد یہ ہوا کہ اس نے اپنی شرائط پر شہریار کو اسسٹ کرنے کے لیے جوائن کر لیا۔ اب وہ اس کے ریسرچ پروجیکٹ کا حصہ تھی۔

تھوڑے دن کام کرنے کے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ شہریار اس وقت جو کام کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ کسی بیکٹیریا کے آر این اے کو کسی وائرس کے آر این اے کے ساتھ مکسچر کر کے وائرس کی کوئی نئی اور بہت طاقتور اسپیشی تیار کر رہا ہے اور اس کے بارے میں بہت ایکسائٹڈ ہے۔

"لیکن کیوں؟" یہ سوال جواب طلب ہی رہا۔ بقول شہریار کے۔ اسے اسسٹنس دینے کے لیے رکھا ہے۔ کیوں؟ کیا؟ جیسے سوالات کرنے کے لیے نہیں۔ وہ خاموش ہو گئی۔

"مجھے پاکستان جانا ہے۔ میرے ٹکٹ کا بندوبست کروا دو شہریار!" ایک دن اس نے شہریار سے کہا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''چھ ماہ ہو گئے کیا؟''

''ہونے والے ہیں۔''

''اوہ! تو تمہارے ڈاکٹر صاحب پک کر تیار ہو گئے ہیں۔ بس تم جاؤ گی اور انہیں توڑ لو گی۔ یہ کیا اسٹوپڈٹی ہے، جب وہ پاس آؤٹ ہو جائے اور تم سے رابطہ کرے تو مجھے بتانا۔ میں ٹکٹ منگوا دوں گا۔ ہو سکتا ہے اب بھی اس کے کچھ مسائل ہوں۔ اسے کچھ اور وقت چاہیے ہو۔ تم یونہی جاب چھوڑ کر اپنا بھی نقصان کرو گی۔ ماموں کی صلواتیں بھی سنو گی اور ہو سکتا ہے اس کے لیے بھی ایک مشکل مسئلہ بن جاؤ جسے حل کرنے میں وہ بھی بیزار ہو جائے۔ تم اس کے لیے اپنے آپ کو اس قدر سستا کیوں کر رہی ہو رل۔''

وہ خاموشی سے سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ بات ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے مراد سے رابطہ کر کے صورت حال معلوم کرنا چاہیے۔ وہ سوچ کر اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر لیپ ٹاپ... آن کیا لیکن وہ آن لائن نہیں تھا۔ پھر اس نے واٹس ایپ کال کی کوشش کی لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔ آخر کار فون کیا لیکن پھر بھی اس سے رابطہ نہیں ہوا۔ اس کے ذہن میں کچھ اندیشوں نے سر اٹھایا لیکن اس نے سر جھٹک کر انہیں دور کر دیا۔

کل دوبارہ کوشش کروں گی۔ ہو سکتا ہے اس کے امتحان ہو رہے ہوں۔ اس لیے اس وقت رابطے بند کیے ہوئے ہوں، یہ سوچ کر اس نے اس کے نام ایک مختصر میسج کیا۔

''تم جیسے ہی فارغ ہو۔ پلیز مجھ سے رابطہ کرو۔ میں بے چینی سے منتظر رہوں گی۔''

پھر وہ کئی دن اس کے فون کا انتظار کرتی رہی لیکن اس کا انتظار ختم نہیں ہوا بلکہ کئی اور میسجز کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ پہلے وہ پریشان ہوئی پھر فکرمند ہوئی اور اب مایوسی سے گھیر رہی تھی کیونکہ ہزار کوششوں کے بعد بھی اس طرف مکمل خاموشی اسے ڈرا رہی تھی۔

''شاید اب وہ بھی مجھے قبول کرنا نہیں چاہتا۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔''

پھر وہ چھ ماہ تو کیا، اگلے چھ ماہ بھی گزر گئے۔ وہ دل نے دل اور مایوس جذبوں کے ساتھ ایک روبوٹ کی طرح اپنے کام میں مصروف رہی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے اندر کی گھٹن کیفیت بڑھتی جا رہی تھی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

کچھ ضرورت کی چیزیں ختم ہو گئی تھیں اور وہ خریداری کے لیے مال آئی ہوئی تھی۔ کافی دیر بعد وہ تھک کر اس وقت فوڈ کورٹ میں بیٹھی اپنے آرڈر کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں گم وہ ماحول سے بیگانہ سی تھی کہ اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

''کیا آپ کو کسی نے بتایا ہے کہ آپ اس اداسی کی کیفیت میں، کس قدر خوبصورت لگتی ہیں۔''

وہ ہڑبڑا سی گئی۔ وہ مشرق کے بجائے کوئی مغرب والا تھا۔ نیلی آنکھوں میں ایک دلربا سی کیفیت لیے۔ چشمے کے شفاف شیشوں کے پیچھے سے، وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے متوجہ ہوتے ہی اس نے اجازت مانگی۔

''کیا میں یہاں کچھ دیر بیٹھ سکتا ہوں؟'' اور اس نے اجازت دینے کا انتظار کیے بغیر کرسی کھسکائی اور بیٹھ گیا۔

''آپ بیٹھ چکے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اوہ ہاں۔ مجھے ایسا لگا جیسے آپ نے یس کہا ہے۔ اس لیے......'' وہ کھل کر مسکرایا۔

''میں یہاں کام کرتا ہوں اور اکیلا رہتا ہوں۔ ان چینوں کی زبان بول تو لیتا ہوں لیکن ذرا مشکل سے۔ آپ کو دیکھ کر ایسا لگا کہ مجھے زبانوں کی ذہنی تھکن اتارنے کے لیے کچھ دیر آپ کے ساتھ بات کرنا چاہیے۔ آپ یقیناً انگریزی بول لیتی ہوں گی اور ایسا ہی ہوا۔ آپ کی انگریزی اچھی ہے۔''

''لیکن مجھے اجنبیوں سے بات کرنا زیادہ اچھا نہیں لگتا۔'' رل نے اسے ٹالنے کے لیے کہا تو وہ ہنسا۔

''او کے! میرا نام ڈینئیل ہے۔ میرا تعلق برطانیہ سے ہے اور میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا یہاں پروجیکٹ منیجر ہوں۔ ابھی چند ماہ ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ تنہائی سے بھی اکتاہٹ ہوتی ہے تو یہاں چلا آتا ہوں۔ کوئی مل جاتا ہے تو اس کے ساتھ تھوڑی بہت دیر گپ شپ کرتا ہوں پھر واپس اپنے ویران گھونسلے میں پہنچ جاتا ہوں۔ لیجیے! اب تو میں آپ کے لیے اجنبی نہیں رہا۔ اب تو آپ کو مجھ سے باتیں کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' اس نے اس قدر ہلکے پھلکے انداز میں بات کی کہ وہ بھی ہلکے سے مسکرا دی۔

''تھینکس گاڈ! یو سمائلڈ۔ ہم م م م...... میں نے تو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے آپ بھی اپنے بارے میں کچھ بتا دیں تو ہمارے درمیان سے اجنبیت بالکل ختم ہو جائے گی۔'' وہ مسکراتی نظروں سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''یہ اتنا ضروری نہیں ہے کیونکہ اجنبیوں سے میں بات نہیں کرتی۔ آپ کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ

تکلف نہیں کرتے۔''

''اکثر خوبصورت لوگ اتنے ذہین نہیں ہوتے لیکن آپ کو قدرت نے دونوں خوبیاں دل کھول کر دی ہیں۔ شاہکار۔'' ڈینئیل نے اس کی اتنی تعریف کی تو اس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟''

''ہائیں! یہ خیال آپ کو کیوں کر آیا کہ مجھے آپ سے کوئی کام ہو سکتا ہے؟'' ڈینئیل حیران ہوا۔

''ہماری طرف کچھ ایسا ہی کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی بلاوجہ آپ کی بہت زیادہ تعریف کرے تو سمجھو کہ اسے تم سے کوئی کام آن پڑا ہے۔ اسی لیے پوچھ رہی ہوں۔'' اس کی بات سن کر وہ زور سے ہنسا۔

''بہت سمجھدار لوگ بستے ہیں آپ کی طرف۔ کام تو مجھے یقیناً آپ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ روزانہ نہیں تو کبھی کبھی یہاں آ کر کافی کا ایک کپ میرے ساتھ پی لیا کیجیے۔ دو چار باتیں کر لیا کیجیے۔ میں اپنے احساس تنہائی کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہ میرے لیے بڑا اعزاز ہوگا۔''

''سوری مسٹر ڈینئیل! میں آپ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتی کیونکہ میں جاب کرتی ہوں۔ اس لیے کافی دنوں کے بعد میرا یہاں آنا ہوتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں جب میں یہاں آ رہا تھا تو میں نے آپ کو لیب کمپلیکس کے بڑے گیٹ سے باہر آتا دیکھا تھا۔ آپ وہاں کیا کرتی ہیں؟''

''میں اپنے شوہر کو اسسٹ کرتی ہوں۔ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہیں۔''

''اوہ! آپ کے شوہر... کس چیز پر ریسرچ کر رہے ہیں وہ؟'' اس کے سوال پر اس نے گھور کر ڈینئیل کو دیکھا اور اٹھنے کی تیاری کی۔

''او کے۔ اب میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ نائس میٹنگ۔ بائے!''

''ارے ارے! کافی تو ختم کر لیں۔ میں نہیں پوچھوں گا کوئی سوال۔ بیٹھیں تھوڑی دیر۔'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''بہت شکریہ! مجھے پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔'' وہ جواب دیتی ہوئی اٹھی اور چلی گئی اور وہ اسے دور تک جاتے ہوئے پُرخیال نظروں سے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ وہ بڑی دیر سے ان تمام میسجز اور کالوں کو چیک کر دی تھی جو وہ اب تک مراد کو کر چکی تھی۔ اس کے اعصاب ٹوٹنے لگے تھے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بالکل ہی مایوس ہوتی جا رہی تھی۔

نیند کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ اپنی کنپٹیوں کو مسلتی ہوئی اٹھی۔ شاید ایک کپ کافی اس کے اعصاب کو سکون دے سکے۔ یہ سوچ کر وہ اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی جانب جانے لگی تو کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے ایسا لگا جیسے باہر لان میں کوئی موجود ہے۔ جو بول رہا ہے۔ حیران ہو کر گھڑی پر نظر ڈالی تو سوا گیارہ بجے کا وقت تھا۔

''اس وقت لان میں کون ہے؟'' وہ رک گئی۔ اگلے لمحے اس پر حیرت کا شدید حملہ ہوا۔ باہر سے آنے والی آواز کو اس نے پہچانا۔ وہ ڈینئیل کی آواز تھی تو وہ اپنے تجسس پر قابو نہیں پا سکی۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر اس جھری سے باہر جھانکا تو کھڑکی کے قریب ہی لکڑی کی لان بینچ پر ڈینئیل بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ شہریار بھی موجود تھا۔ وہ دونوں ہلکی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

''یا حیرت! یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' اس نے باہر دیکھتے ہوئے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی۔

''دیکھو! مجھے تمہارے اس پروجیکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو تم سرکاری سرپرستی میں کر رہے ہو۔ میں اس پروجیکٹ کی بات کر رہا ہوں جو تم خفیہ طور پر کر رہے ہو جس کے بارے میں دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ اس کی بات کرو اور یقین کرو کہ اس کا مجھ سے اچھا خریدار تمہیں کوئی اور مل نہیں سکتا۔''

''میرے پاس اس کا خریدار موجود ہے اور وہ مجھے ایک بہت اچھی ڈیل کی آفر کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

''تمہیں جو بھی ڈیل آفر ہوئی ہے اس کا ڈبل ٹرپل بلکہ اس سے بھی زیادہ میں تمہیں آفر کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہیں بعد میں تحفظ اور بہترین مواقع فراہم کرنے کا وعدہ بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک تمہیں اس سے بہتر آفر نہیں ملی ہوگی۔'' ڈینئیل کے لہجے میں ایک دھمکی آمیز تحکم چھپا ہوا تھا، جسے شاید شہریار نے بھی محسوس کیا۔

''اگر میں انکار کر دوں تو کیا تم اپنی تمام آفرز سمیت پیچھے ہٹ جاؤ گے کیونکہ میں ابھی اپنی پوری توجہ اپنے کام پر دینا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی تمام تر محنت کے باوجود وہ نتائج حاصل نہ کر سکوں جو میں چاہتا ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخر میں جو پروڈکٹ مجھے حاصل ہو وہ تمہارے لیے اس قدر اہم ثابت نہ ہو سکے اور تم اپنی تمام تر ڈیلز کے

ساتھ پیچھے ہٹ جاؤ۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تمہاری دلچسپی قبل از وقت ہے۔ مناسب وقت کا انتظار کرنا شاید ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔''

ڈینئیل اس کی بات سن کر تھوڑی دیر خاموشی سے اسے گھورتا رہا پھر سر ہلا کر گویا ہوا۔

''تم جو بھی کہو۔ جیسی بھی تمہاری پروڈکٹ ہو۔ تمہیں پہلا سودا ہم سے ہی کرنا ہوگا۔ ہاں اگر ہم اسے اپنے لیے مناسب نہ سمجھیں تو پھر تمہیں اختیار ہوگا کہ کسی کو بھی اسے فروخت کر دو۔''

اس کے تحکمانہ انداز نے شہریار کو برانگیختہ کر دیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں ایسا کیوں کروں گا؟ تم مجھے اس قسم کا آرڈر کیونکر دے سکتے ہو؟'' اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا تو ڈینئیل نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''تم یہ کام کیوں کر رہے ہو؟ حالانکہ اس کے لیے تمہیں دگنی محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ کوئی مقصد تو ہے نا؟''

''ہاں! لیکن میرے مقصد سے تمہیں کیا لینا دینا ہے؟''

''مسٹر شہریار! ہم پچھلے چھ مہینے سے تم کو واچ کر رہے ہیں۔ صرف تمہارے کام کو نہیں بلکہ تمہاری شخصیت کو بھی۔ تمہیں پیسے سے بہت محبت ہے۔ تم سو چائنیز یو آن بھی بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہو اور خواہش رکھتے ہو کہ تمہارے پاس بے انتہا پیسا ہو حالانکہ ابھی تم نے یہ سوچا بھی نہیں ہے کہ تم اس بہت سارے پیسے کو خرچ کہاں کرو گے۔ اپنا پروجیکٹ بھی تمہاری اس خواہش کی تکمیل کرنے کے لیے ہے۔ کوئی خدمت خلق کے لیے تو نہیں ہے تمہاری یہ محنت تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری کر دیں۔ جتنا زیادہ سے زیادہ پیسا تمہیں چاہیے، وہ ہم تمہیں دیتے ہیں اور ہمارے مطلب کی چیز تم ہمیں دے دو۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ایسا کچھ برا نہیں ہے جس سے تم ناراض ہو۔''

''شاید تمہاری بات ٹھیک ہو لیکن ابھی میں اس بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم بھی مناسب وقت کا انتظار کرو۔''

''شہریار! تم سے اس طرح ملنا کوئی آسان جاب ہے کیا۔ کتنی سیکیورٹی بریک کرنے کے مشکل مرحلے سے گزرنے کے بعد میں یہاں آیا ہوں۔ خفیہ طور پر تاکہ کسی کو اس بارے میں کوئی بھنک بھی نہ مل سکے۔ میرے لیے بار بار اس طرح آنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے آج کم از کم یہ بات تو طے ہو جانا چاہیے کہ معاملہ ہم دونوں کے درمیان طے ہو گیا ہے۔ بعد کے معاملات بعد میں دیکھے جائیں گے۔''

''سوری! میں ابھی تمہیں ایسا کوئی یقین نہیں دلا سکتا۔ میں بہت سے مشکل معاملات میں پھنسا ہوا ہوں۔ کچھ وقت لگے گا۔ اس کے بعد شاید ہم اس بارے میں کوئی حتمی بات کر سکیں۔''

شہریار نے اسے ٹکا سا جواب دیا تو وہ کچھ غصے میں آ گیا۔

''ٹھیک ہے شہریار! شاید تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہوگا۔ او کے! میں چلتا ہوں۔ ہماری پھر ملاقات ہوگی لیکن شاید اتنی دوستانہ نہ ہو۔''

''کیا میں اسے اپنے لیے کوئی دھمکی سمجھوں مسٹر ایجنٹ؟'' شہریار نے لفظ چباتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کچھ بھی سمجھ سکتے ہو کیونکہ ہمیں ہر حال میں اپنے مقاصد پورے کرنے کی تربیت بھی دی جاتی ہے اور حلف بھی لیا جاتا ہے۔ اس لیے ہماری بھی مجبوری ہے۔'' ڈینئیل نے سفاک سے لہجے میں کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رل بھی یکدم کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اس کا دل تھر تھرا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

''آخر شہریار ایسا کیا کام کر رہا ہے جو اسے سب سے چھپا کر کرنا پڑ رہا ہے اور اس کی بھی بھنک ان خفیہ اداروں کو مل گئی ہے اور وہ سودے بازی کرنے پہنچ گئے۔ سب کچھ میری ناک کے عین نیچے ہو رہا ہے اور میں نے کبھی اس بات پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیا ہو رہا ہے جس میں بھی برابر کی شریک ہوتے ہوئے بھی میں لاعلم ہوں۔ میں نے بھی اس پر غور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ میں کر کیا رہی ہوں۔ اب مجھے معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔'' وہ نیند آنے تک انہی خیالات میں الجھتی رہی پھر سو گئی۔

☆☆☆

سامان کے تھیلے ٹرالی میں رکھ کر وہ آگے بڑھی تو بھوک اور تھکن نے ایک ساتھ اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ آہستہ آہستہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی وہ فوڈ کورٹ میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن اب بھی اسی پروجیکٹ کی گتھیوں میں الجھا ہوا تھا جو اس کے نزدیک کافی مشکوک ہو چکا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ بغور اپنے کام کا جائزہ لے رہی تھی۔ شہریار اسے جو بھی کام دیتا تھا، اسے پورا کرنے کے دوران وہ اس کی نوعیت کو بھی جاننے کی کوشش کر رہی تھی اور تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس سرکاری تحقیقاتی کام سے کافی مختلف ہے، جو شہریار صبح کے اوقات میں کرتا ہے۔

''شہریار! یہ کیا کام ہے؟ وائرس کو کلچر کرنے کے دوران اس کے آر این اے میں یہ بیکٹیریا کا آر این اے

کیا کر رہا ہے؟"

ایک دن اس نے چیک کرنے کے لیے شہریار سے پوچھ لیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ شہریار اس پر کتنا بھروسا کرتا ہے۔

"یہ جاننا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ میرا بہت خاص پروجیکٹ ہے۔ تمہیں صرف وہ کام کرنا ہے، جو میں تمہیں کرنے کے لیے کہتا ہوں۔ اس لیے اپنے کام کی طرف توجہ مرکوز کرو اور اس کی رفتار تیز کرو۔ بہت سستی سے کام کر رہی ہو۔" شہریار نے اسے ہی جھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ شہریار اسے بھی اپنے اس راز میں شامل کرنا نہیں چاہتا پھر اس نے کچھ پوچھا نہیں۔ خاموشی سے معاملات کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔

"ہیلو پریٹی گرل! ہاؤ آر یو؟" اس نے اپنے خیالات سے باہر نکل کر دیکھا تو وہ حسب توقع ڈینیئل ہی تھا۔

"آپ پھر یہاں؟ یہ محض اتفاق ہے یا انجینئرنگ۔" اس نے سنجیدگی سے اس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ کھل کے ہنسا۔

"بات یہ ہے ینگ لیڈی کہ میں تو یہاں تقریباً روز ہی آتا ہوں کھانا کھانے کے لیے۔ جس دن آپ آجاتی ہیں تو گویا باؤنٹی مل جاتی ہے کیونکہ روزانہ خاموشی سے کھانا کھا کر واپس چلا جاتا ہوں جس دن آپ مل جاتی ہیں اس دن کچھ دیر آپ سے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے تو میرے اگلے دو تین دن بہت اچھے گزر جاتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ آپ میرے بارے میں مشکوک نہ ہوں۔ میں بڑا بے ضرر سا آدمی ہوں۔"

اس نے صراحت سے کہا تو اس نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ اس رات والے ڈینیئل اور سامنے بیٹھے ہوئے ڈینیئل کا دل ہی دل میں موازنہ کر رہی تھی۔ کہاں وہ سفاک سا لہجہ اور کہاں یہ شہد ٹپکاتے ہوئے الفاظ۔ اس کے دل نے کہا..... کچھ تو ایسا ہے جو مجھے محسوس تو ہو رہا ہے نظر نہیں آرہا ہے۔

"ہیلو لیڈی! میں نے ایسا کوئی مشکل فلسفہ بول دیا ہے کہ آپ اتنی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔" اس نے اسے متوجہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرائی۔

"فل ڈے جاب کے بعد یہ سب کرنا بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے شوہر باہر نہیں نکلتے کیا؟" اس نے اس کی بھری ہوئی ٹرالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میری جاب ہاف ڈے کی ہے۔ اس لیے میں یہ کام کر لیتی ہوں۔ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ اس لیے انہیں ان سب کا وقت نہیں ملتا۔"

"کیا مصروفیات ہیں ان کی؟" ڈینیئل نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"لیب میں ہیں تو ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ ریسرچ ورک ہی ہوتا ہے۔"

"کس قسم کا ریسرچ ورک۔ آپ بھی تو انہیں اسسٹ کرتی ہیں تو آپ کو تو معلوم ہوگا۔"

"نہیں۔ مجھے صرف ان کے دیے ہوئے ٹاسک پورے کرنا ہوتے ہیں۔ ان سے پروجیکٹ کی نوعیت کا اندازہ کہاں ہوتا ہے؟"

رل بھی اسے تھوڑی راہ دے رہی تھی تاکہ سمجھ سکے کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ اس کا یوں بار بار ملنا خالی از علت تو نہیں ہو سکتا۔ اس کے ذہن میں اس رات کی باتیں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ تازہ تھیں۔

"آپ انہیں دن کے پہلے ہاف میں اسسٹ کرتی ہیں یا دوسرے ہاف میں؟"

"آپ کا کیا اندازہ ہے؟" جواب میں رل نے بھی سوال کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ دوسرے ہاف میں کیونکہ اگر پہلا ہاف ہوتا تو آپ اس وقت یہاں نہ ہوتیں۔"

"آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔"

"میں اگر یہ کہوں کہ مجھے آپ سے اس بارے میں بات کرنا ہے تھوڑی تفصیل کے ساتھ تو کیا آپ اجازت دیں گی؟"

"نہیں۔ کیونکہ میرے شوہر کا خیال ہے کہ ہمیں اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارا بے حد ذاتی معاملہ ہے۔ ہم تک ہی رہنا چاہیے۔"

"اوکے! لائک آ گڈ وائف۔ چلیں ہم کسی اور موضوع پر بات کر لیتے ہیں۔ آپ کو یہاں پر اپنی جاب سے کوئی سیلری وغیرہ ملتی ہے یا آپ کی سروسز فری ہیں؟"

"ملتی ہے سیلری۔"

"ایک انتہائی بداخلاقی والا سوال پوچھنے کے لیے، پہلے ہی معذرت لیکن پوچھنا ضروری ہے۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔ کتنی سیلری مل جاتی ہوگی؟"

"یہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتی۔ جتنی بھی ملتی ہے۔ میری چھوٹی موٹی پاکٹ منی نکل آتی ہے۔ باقی میرے اخراجات تو میرے شوہر کے ذمے ہیں اس لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سیلری کتنی ہے۔"

"فرق پڑتا ہے۔ آپ کا قیمتی وقت جو آپ ان کو

دیتی ہیں۔ آپ کی قیمتی صلاحیتیں، جو آپ ان کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ آپ کی بے پناہ جسمانی اور ذہنی تھکن جو ان کی وجہ سے آپ جھیلتی ہیں۔ آپ کو ان کا پورا پورا معاوضہ ملنا چاہیے۔ کم از کم آپ کو ایک بھاری بھرکم قسم کے بینک بیلنس کا مالک تو ہونا چاہیے۔ آپ ڈیزرو کرتی ہیں۔'' اس نے بڑے شدومد سے اس کی وکالت کی تو وہ مسکرائی اور اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ اس کے بارے میں کافی معلومات رکھتا ہے لیکن اس نے جتانا ضروری نہیں سمجھا۔

''کیا آپ مجھے میرے شوہر سے بدگمان کرنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں۔ میں آپ کو آپ کے جائز حقوق کے متعلق آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ مجھے اپنا مخلص سمجھ سکتی ہیں۔''

''شکریہ مسٹر مخلص! میں اس بارے میں سوچوں گی۔''

''میں اس بارے میں اگر آپ کی کوئی مدد کرسکوں تو میرے لیے باعثِ اعزاز ہوگا بلکہ میں آپ کی مدد کرنا چاہوں گا۔ یقینی طور پر۔''

''اچھا۔ آپ بھلا کس طرح میری مدد کرنا چاہتے ہیں؟''

آج رمل بھی شاید وہ جاننا چاہ رہی تھی جو اس کے دل میں تھا۔

''دو تین آپشنز ہیں۔ پہلا یہ کہ اپنے تعلقات استعمال کرکے میں آپ کو اس سے دس گنا بہتر جاب دلوا دوں۔ دوسرا یہ کہ میں آپ کے شوہر سے بات کرکے انہیں راضی کروں کہ آپ کے معاوضے میں اضافہ کریں اور تیسرا آپشن یہ ہے کہ میں اس سے کہوں کہ مجھے آپ کی بیوی سے عشق ہوگیا ہے۔ اس لیے آپ اسے چھوڑ دیں تاکہ میں اپنا سکوں اور دنیا جہان کی ساری نعمتیں لاکر اس کے قدموں میں ڈھیر کرسکوں۔''

''ہاؤ سویٹ؟'' اس نے شرارت سے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا اور ہنس پڑا تو رمل کو بھی ہنسی آگئی۔

''براوو! مسٹر ڈینئل! شاید آپ میرے شوہر کو جانتے نہیں ہیں۔ وہ پہلے تو آپ کو گولی مار دے گا اور اس کے بعد گن میری کنپٹی پر رکھ کر پوچھے گا کہ کیا تم بھی لیڈی پرولس ہو تم تو ایسی نہ تھیں۔ اب ایسی ہوگئی ہو تو جاؤ۔ میں تمہیں بھی اس کے ساتھ ہی بھیج دیتا ہوں۔ ڈھشک... ایک آواز آئے گی اور میں بھی تمہارے... پیچھے روانہ ہو جاؤں گی۔ آسمانوں کے پار...... کیسا؟'' وہ یہ کہہ کر زور سے ہنسی تو ڈینئل نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔

''مائی لیڈی! آپ تو بڑی خوش مزاج ہیں۔ میں نے آپ کے بارے میں بڑے غلط اندازے لگائے تھے کہ آپ ایک بے حد خشک مزاج اور بہت ریزروی خاتون ہیں لیکن آپ کی حسِ مزاح تو بڑے کمال کی ہے۔ واؤ۔''

''آپس کی بات ہے کہ میں خود بھی حیران ہو رہی ہوں۔ نہ جانے کتنے عرصے کے بعد میں اس طرح ہنسی ہوں۔'' اس نے کہا تو ڈینئل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسا کیوں ہے؟ ہنسنے کے لیے تو وقت کی پابندی نہیں کرنا پڑتی پھر......؟''

''جانے دیجیے۔ ہر بات ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی۔ میں اور آپ الگ الگ دنیاؤں کے لوگ ہیں۔ ہماری ترجیحات الگ الگ ہیں۔''

اس نے جلدی سے اپنے ڈرنک کا آخری گھونٹ لے کر چیزیں سمیٹیں اور اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پھر بھی۔ میں آپ کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ بالکل اس طرح جس طرح ایک دوست۔ اچھے کسی دوست کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ آپ نے میرے دل میں اپنے لیے احترام کا ایک مقام بنالیا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اس بارے میں سوچیں ضرور۔''

''میں سوچوں گی لیکن میں سمجھتی ہوں یہ ایک لاحاصل پریکٹس ہوگی۔ اس لیے آپ بھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی کوشش بھی مت کیجیے گا۔ ہاں! لیکن آپ نے جتنا بھی میرے بارے میں سوچا اس کے لیے بے حد شکریہ۔ مجھے ایک اچھا احساس ملا ہے۔ تھینکس اینی ہاؤ۔''

وہ اٹھی اور اپنی ٹرالی دھکیلتی ہوئی کیش کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔ ڈینئل اسے پرُخیال نظروں سے دور جاتا دیکھتا رہا۔

''میں نے تمہاری دیوار میں ایک ہلکی سی دراڑ ڈال دی ہے مسز شہریار! راستہ بھی بنا ہی لوں گا۔ تمہاری بنائی ہوئی قیمتی پروڈکٹ آخرکار ہمارے ہی حصے میں آئے گی۔ یہ چینے منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ تم دیکھ لینا۔'' اس نے بڑبڑاتے ..... ہوئے کرسی پر پھیل کر ٹیک لگالی۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے۔ پاکستان اور مقامی وقت میں آٹھ گھنٹے کا فرق تھا۔ اس نے اندازہ لگایا اور پاکستان میں مراد کو کال کرنے کی کوشش کی۔ حسبِ معمول اس سے رابطہ نہیں ہوا۔ اس کی مایوسی انتہاؤں پر تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے اپنے والد کو کال کرلی۔

روایتی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے پوچھا۔

''پاپا! میری کوئی دوست تو نہیں آئی تھی یونیورسٹی کی۔''

"نہیں۔ کوئی لڑکی تو نہیں' ایک لڑکا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا۔ وہ تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے اور تم اپنے شوہر کے ساتھ باہر جا چکی ہو۔ اس پر ان دونوں نے بڑے عجیب طرز عمل کا اظہار کیا۔ مجھے ان کی باتوں سے ایسا لگا کہ وہ لڑکا شاید تم سے شادی کا خواہشمند تھا۔ یہ بات سن کر اس پر اوس پڑ گئی۔ پھر اس نے بڑی عجیب بات کی۔ کہنے لگا کہ اس کی اور تمہاری ڈیل ہوئی تھی کہ جب وہ ایم بی بی ایس مکمل کرلے گا تو تم اپنے شوہر سے طلاق لے کر اس سے شادی کرلو گی۔ یہ بات سن کر میرا دماغ ہی گھوم گیا۔ میں نے تو اس کی وہ بے عزتی کی کہ اسے دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے لیکن خود اس کی ماں نے بھی اسے ملامت کی اور اس سے کہا کہ ایسی گھٹیا بات سوچی بھی کیسے اس نے۔ مجھ سے معذرت کر کے دونوں ماں بیٹے چلے گئے۔ کیا اس کی اور تمہاری ایسی کوئی بات ہوئی تھی؟"

ان کے اس سوال کے جواب میں اس نے فون بند کر دیا۔ وہ دلخراش منظر اس کے تصور میں کیا آیا کہ آنکھیں بری طرح برس پڑیں۔ مراد نے کیا کچھ سہا اس کی خاطر اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔

اس نے دوبارہ کئی ای میلز بھیجیں اس کے پرانے ایڈریس پر لیکن وہ ریسیو نہیں ہوئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ مراد سوہن اس سے مایوس ہو کر اس کی راہ سے ہٹ گیا ہے۔ اب کوئی رابطہ رکھنا شاید اسے مناسب نہیں لگ رہا ہوگا۔ اس لیے اس نے اپنے سارے پرانے نشان مٹا دیے، کہ میں اس تک پہنچ ہی نہ پاؤں۔ ایک عجیب محرومی کا احساس اسے کاٹتا چلا گیا۔

کافی دیر آنسو بہانے کے بعد اس نے بمشکل اپنے اوپر قابو پایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لائبریری میں اسے روشنی نظر آئی۔ اس کا مطلب ہے شہریار ابھی جاگ رہا ہے۔ اس سے بات کرنا ضروری ہے...... ابھی...... کیونکہ دن بھر تو وہ اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ بات کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

تھوڑی دیر میں وہ شہریار کے سامنے کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟ اتنی رات کو اب تک کیوں جاگ رہی ہو؟ کوئی کام ہے کیا؟"

"ہاں۔ بہت ضروری کام ہے۔ تم سے بات کرنا ہے۔"

"اس وقت؟ خیر کہو۔"

"میں پاکستان جانا چاہتی ہوں۔"

"تم جانتی ہو، میرا کام اس وقت بہت توجہ کا متقاضی ہے۔ تم اگر چلی گئیں تو میں اسے پورا کیسے کروں گا؟"

"یہ میری ذمے داری نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہماری شادی جس ڈیل کا نتیجہ تھی، وہ ڈیل ختم ہو چکی ہے۔ تم اپنے لیے کسی بھی اسسٹنٹ کو ہائر کر سکتے ہو۔ تمہارا کام میرے بغیر رکے گا نہیں اور اگر رکے بھی تو یہ میری ذمے داری نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے۔"

"کیوں؟ کیا اس ڈاکٹر نے پھر تمہیں بہکانے کا ارادہ کرلیا ہے۔"

"یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ میں نے تمہارے جس وعدے پر بھروسا کر کے تم سے شادی کی تھی، اب وقت آ گیا ہے کہ تم اس وعدے کو پورا کرو۔ میں تمہیں تمہارے ارادے بدلنے نہیں دوں گی اور ہاں اب میں لیب میں کام بھی نہیں کروں گی۔"

"تم میرا پروجیکٹ مکمل ہونے تک ایسا کچھ نہیں کرو گی اور اگر تم نے اس وقت ایسا سوچا بھی تو...... میں تمہیں عبرت کا نشان بنا دوں گا۔ تمہیں میرا پروجیکٹ مکمل ہونے تک میرے ساتھ کام کرنا ہے۔ اس وقت کوئی اور بات سوچنا بھی نہیں۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے معاملات کانفیڈنشل ہیں، جو ہر ایک کے ساتھ شیئر نہیں کیے جا سکتے، اس لیے کوئی اور اسسٹنٹ ہائر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہاں میرا یہ پروجیکٹ مکمل ہو جائے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں پاکستان بھیج دوں گا۔"

"میں جانتی ہوں کہ یہ تمہارا ایک اور جھوٹا وعدہ ہے۔ تم بھی کسی کو ہائر نہیں کر سکتے کیونکہ اسے تمہیں جو معقول معاوضہ دینا پڑے گا۔ وہ تم کبھی بھی نہیں دو گے۔ تم جیسے، ایک ایک یوآن کو دانتوں سے پکڑنے والے شخص سے اس بات کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی۔ میں تو تمہیں تقریباً فری میں کام کرنے والی ملی ہوئی ہوں۔ اسی لیے تم مجھے جانے نہیں دو گے۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں معاوضہ نہیں ملتا؟"

"ہوں...... اگر میں کسی سٹور میں سیلز گرل بن جاؤں تو شاید اس سے کہیں زیادہ معاوضہ مل جائے گا۔ تم مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو کیونکہ میں اب تمہاری باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ میں نے وقت گزاری کے لیے تمہارے پاس جاب کرلی تھی۔ وقت گزر گیا۔ اب مجھے جانا ہے۔ مجھے طلاق دو اور اگلے ہفتے میں کسی دن میری فلائٹ کا انتظام کروا دو۔ ویٹس اٹ۔"

اس نے حتمی لہجے میں کہا تو شہریار بھڑک اٹھا۔ اس نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور اس کی طرف مڑ کر شعلہ بار

نظروں سے اسے گھورتے ہوئے مخاطب ہوا۔

''میں تمہارا شوہر ہوں اور تم مجھے بار بار یہ احساس دلا کر شدید غصے میں مبتلا کررہی ہو کہ میری بیوی ہونے کے باوجود تم کسی اور کے عشق میں مبتلا ہو اور مجھے ہر حال میں چھوڑ کر اس کے پاس جانا چاہتی ہو۔ حالانکہ میں نے تمہیں یہاں ہر طرح کا آرام اور آسائش دے رکھی ہے۔ اس کے باوجود......'' وہ غصے کی زیادتی کے سبب آگے بول نہیں پایا تو رل نے بھی اسے سرد نظروں سے گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

''آرام اور آسائش؟ ان الفاظ کا مفہوم اگر سمجھتے ہوتے تو کبھی ایسی بے سروپا بات نہ کرتے لیکن خیر! مجھے اس پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔ تمہاری یادداشت اگر میرے معاملے میں اتنی خراب ہوگئی ہے تو میں یاد دلا دوں کہ میں تم سے کبھی بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ میں نے تمہیں مراد کے بارے میں بھی سب کچھ بتادیا تھا۔ مگر میرے بگڑے ہوئے معاملات سے فائدہ اٹھا کر تم نے مجھے مجبور کردیا۔ میں تمہاری ضرورت تھی کیونکہ تمہیں مجھ سے یہ بیگار لینا تھی اور تم نہ جانے کب سے یہ پلان کررہے تھے۔ شاید جب سے جب تم نے مجھے مائکروبیالوجی میں داخلہ دلوایا۔ مجھے میری مرضی نہ ہونے کے باوجود اسی سبجیکٹ میں ایم فل کروانے کی راہ ہموار کی اور اس کے لیے تم نے پاپا کو شیشے میں لیا۔ پھر شادی کے چکر میں الجھایا اور اب جبکہ میں تمہیں تمہارا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کررہی ہوں تو...... تو تم صاف انکار کررہے ہو۔''

''اوہ وہ! ہماری بے بی تو بڑی اسمارٹ ہوگئی ہے۔ سارے اندازے بالکل ٹھیک ٹھیک لگالیے۔ ویل ڈن سویٹی! سو! اب جب تم جان ہی چکی ہو تو... سمجھ لو کہ تم میری کتنی بڑی ضرورت ہو۔ میں نے تمہیں سالوں کی محنت سے اپنے لیے تیار کیا ہے۔ اب جب وقت آیا ہے کہ میں اپنی اس محنت کا پھل کھا سکوں تو تم نے پرانی راگنی چھیڑ دی ہے۔ میں اس موقع پر ایسی کوئی بیوقوفی برداشت نہیں کرسکتا جس سے میری سالوں کی محنت تباہ ہوجائے۔ اس ڈاکٹر کی ایسی کیا اوقات ہے جو تم اسے مجھ پر ترجیح دے رہی ہو۔''

شہریار کے لہجے میں بے پناہ طنز تھا۔

''اس کی اوقات تمہاری سوچ سے بھی اوپر ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اپنی اوقات میں رہو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، جلد از جلد اس کی تکمیل کرو تاکہ میں اس قید خانے سے نکل سکوں۔'' رل نے انتہائی کڑوے لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟''

''تو پھر اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہے، اس کے بارے میں فیصلہ میں خود ہی کروں گی۔'' اس کی بات سن کر شہریار ہلکے سے ہنسا۔

''اچھا! کیا کروگی بھلا؟ تمہارا پاسپورٹ، ویزا، ٹکٹ اور پاکستان جانے تک کے اخراجات...... یہ سب کہاں سے آئیں گے؟ اس بارے میں بھی سوچ لینا کیونکہ میں تو اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کروں گا تمہاری اور پھر طلاق؟ وہ بھی نہیں دوں گا۔ پھر تم اس سے شادی کیسے کروگی؟ نہیں رل! تمہارے پاس یہاں میرے ساتھ رہ کر کام کرنے کے علاوہ کوئی اور آپشن ہے ہی نہیں۔ یہ سب میں نے تم سے شادی سے بہت پہلے سوچ لیا تھا اور مناسب حالات پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ گراؤنڈ بنایا تھا۔ میں نے تمہارے ڈاکٹر والے قصے کو ماموں کے کانوں تک اس انداز سے پہنچایا تھا کہ انہوں نے تمہاری شادی مجھ سے کرنے کا فیصلہ کرنے میں ایک منٹ نہیں لگایا۔ یہاں تمہیں اتنے کم پیسے میں نے اس لیے دیے کہ تم کبھی بھی اپنے بل بوتے پر جانے کی پلاننگ نہ کرسکو۔ اس لیے جو بھی کرو، اچھی طرح سوچ کر کرنا۔ ہر طرح سے نقصان تمہارا ہی ہوگا۔''

''کم ظرف اور کمینی سوچ کے مالک تو ہو تم لیکن اتنے گرے ہوئے ہوگے، میں نے سوچا نہیں تھا۔ خیر! میں دیکھوں گی کہ کیا کرسکتی ہوں۔''

اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''ضرور سوچو اور اچھی طرح سوچو۔ اگر تم نے پوزیٹو سوچا تو یقین کرو کہ دنیا میں میرے ساتھ ساتھ تمہارا بھی ایک مقام ہوگا۔ لوگ تمہیں تمہارے نام اور تمہارے کام سے جانیں گے۔ کچھ عرصے کی بات ہے۔ یہ پروجیکٹ تقریباً ختم ہوچکا ہے۔ اب صرف اس کے ٹیسٹ کرنا ہیں۔ اگر رزلٹ ہنڈریڈ پرسنٹ آگئے تو سمجھو کہ ہم دنیا کو اپنے کام کے حوالے سے ایک انتہائی خوشگوار حیرت میں ڈال دیں گے۔ نہ صرف شہرت اور نیک نامی بلکہ بے انتہا پیسا اور دولت بھی ہماری ملکیت میں ہوگی۔ تب یہ زندگی اصل زندگی ہوگی۔ اس وقت تمہیں اندازہ ہوگا کہ زندگی اصل میں ہوتی کیا ہے۔ میری طرح تم بھی نئی فضاؤں میں پرواز کروگی۔ کیا یہ بات تمہارے اندر کوئی سنسنی پیدا نہیں کرتی؟ تمہیں یہ سب سوچ کر اپنے اندر ایک نئی خوشی جاگتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی؟ سوچو...... اچھی طرح سوچو۔''

رل کو پہلی مرتبہ اس کے اندر چھپا ہوا ایک نیا شہریار نظر آیا۔ اس وقت اسے وہ اور بھی زیادہ کم ظرف محسوس

ہوا۔ اس کی زندگی کی تمام تر خوشیاں صرف اور صرف دولت اور شہرت سے وابستہ تھیں۔ زندگی کے رشتوں، محبت اور نازک احساسات کی اس کی زندگی میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اسے لگا کہ اس سے ایسی کوئی توقع رکھنا جیسی کہ وہ وابستہ کر رہی تھی سوائے حماقت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے زور سے سر کو جھٹکا اور واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

بستر پر لیٹی وہ ان شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی جو شہریار نے اپنے الفاظ سے بھڑکائے تھے۔ وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ تھک گیا اور جب تھک گئی تو وہ سو گئی۔ آج اس نے حسب معمول مراد کو سرچ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ وہاں مراد کے ساتھ پاپا نے جو کچھ کیا تھا' اس کے بعد تو یہ بنتا تھا کہ وہ اس سے لاتعلق ہو جائے۔ سو وہ ہو گیا۔

☆☆☆

لیب کے آخری کونے پر بنے، اپنے آفس میں وہ داخل ہوا اور اس کے پیچھے شیشے کا خودکار دروازہ بند ہو گیا۔ ڈاکٹر ژوانگ کے ساتھ آج ڈاکٹر لی بھی موجود تھے۔ انہوں نے ایک میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر اسے خوش آمدید کہا تو وہ بھی سر ہلا کر ان کے سامنے ٹیبل کی دوسری جانب بیٹھ گیا۔

"تو مسٹر شہریار! آج ہمارے لیے ایک بڑا خوشگوار دن ہے۔ دو سال کی مسلسل کوششوں کے بعد آخرکار کامیابی نے آپ کے قدم چوم ہی لیے۔"

ڈاکٹر ژوانگ نے مسکراتے ہوئے کہا تو شہریار کے چہرے پر بھی ایک ہلکا سا خوشی کا تاثر ابھرا اور معدوم ہو گیا۔

"ہاں ڈاکٹر ژوانگ! میں نے آخرکار آج وہ مقصد حاصل کر ہی لیا۔ میری اس نئی دریافت کے سبب دنیا میں ایک تہلکہ مچنے والا ہے۔"

"بے شک! آپ کا کچھ کیا ہوا یہ زبردست وائرس، ایک بالکل ہی نئے نظریے اور اچھوتے خیال کا ثبوت ہے۔ اب تک یہ خیال کہیں بھی پیش نہیں ہو سکا تھا۔" ژوانگ کی مسکراتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی بھنچ کر رہ گئی تھیں۔

"شروع میں تو میں بھی یہ خیال محال لگا تھا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ بیکٹیریا اور وائرس کے آر این اے کو بھی کمبائن کیا جا سکتا ہو۔ چاہے وہ بیکٹیریا کی بہت ہی کمیاب نسل سے ہو لیکن پھر بھی یہ دونوں بالکل مختلف اسپشیز ہونے کے سبب، بھلا کیونکر مروائیو کر سکتے ہیں لیکن آفرین ہے شہریار! آپ نے بظاہر ایک بالکل ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا۔ براوو۔" ڈاکٹر لی نے بھی شہریار کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

"آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ یہ ننھا جرثومہ جنریشن وار کا کتنا بڑا ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسا ہتھیار، جس کا کوئی توڑ نہیں ہو گا۔ سوائے اس کی ویکسین کے اور وہ ویکسین بھی آپ ہی کے پاس ہو گی۔ دنیا کو اس کی ماہیت سمجھنے میں بھی ایک عرصہ لگ جائے گا۔"

"آپ اس کی فروخت سے بے اندازہ دولت اور شہرت کے مالک ہو جائیں گے۔ یقیناً یہ چیز آپ کو بہت فیسی نیٹ کر رہی ہو گی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں مسٹر شہریار!" ژوانگ نے اس سے پوچھا۔

"مسٹر شہریار یقیناً بہت خوش ہوں گے، دولت بھی اور شہرت بھی لیکن میں ان سے ایک درخواست کروں گا۔ دولت جتنی چاہے اکٹھی کریں لیکن فی الحال شہرت سے پرہیز کرنا ان کے مستقبل کے لیے کافی اچھا رہے گا۔ جیسا کہ آپ کو بھی اندازہ ہو گا کہ دنیا کوئی دریافت سے دلچسپی اپنے مفاد کے حساب سے ہوتی ہے لیکن اس دریافت کے پیچھے موجود دماغ سے بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اس سے وہ کچھ بھی اپنی مرضی کی پروڈکٹ بنوا سکتے ہیں۔ یعنی انہیں مچھلی نہیں، مچھلی پکڑنے والا چاہیے ہوتا ہے۔" لی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تاکہ وہ اس کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے بہت سی مچھلیاں پکڑ واسکیں۔ یہ ان کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو گا۔ اس لیے شہریار! پردے کے پیچھے رہو گے تو تمہارے لیے زیادہ فائدہ مند ہو گا۔ ڈاکٹر لی نے تمہیں ایک اچھا مشورہ دیا ہے۔ خیر! ویکسین کا مرحلہ کہاں تک پہنچا؟" ژوانگ نے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کہ اس بیکٹیریا اور وائرس کے کمبی نیشن کو تیار کرنا ہی مشکل ترین مرحلہ تھا۔ کیونکہ یہ خیال ہی اچھوتا تھا اور کہیں بھی کسی بھی جگہ اس کے لیے کوئی کا بیڈ نس دستیاب نہیں تھی۔ یہ میرا اپنا ذاتی نظریہ تھا جو میری سالوں کی محنت کے بعد آخرکار تیار شکل میں میرے سامنے آ ہی گیا۔ تو جب وہ مشکل کام ہو گیا تو اس کی ویکسین تیار کرنا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے میرے لیے۔ بس مجھے جو مشکل ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اب مجھے اس کا ہیومن ٹیسٹ کرنا ہے اور اس کے لیے کوئی رضاکار چاہیے۔ جو اس بات کے لیے راضی ہو کہ اس ویکسین کو اس پر ٹیسٹ کر لیا جائے۔ کیا اس

سلسلے میں آپ لوگ میری کوئی مدد کرسکتے ہو؟"

"یہ بڑا مشکل کام ہے شہریار! تم جانتے ہو، چین میں قانونی طور پر اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس طرح کسی انسان کی زندگی کو خطرے میں ڈالا جائے اور ہم کوئی غیر قانونی کام کر نہیں سکتے۔" ژوانگ نے صاف صاف معذرت کرلی۔

"اگر آپ لوگوں نے اس مرحلے پر میری مدد نہ کی تو میرا پروجیکٹ نامکمل رہ جائے گا۔ میں اپنے ملک میں ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا لیکن یہاں رہ کر میں آپ کی مدد کے بغیر اس مسئلے کو کیسے حل کروں گا؟ آخر آپ کو بھی تو میری اس دریافت سے دلچسپی ہے نا۔"

"آپ کا کہنا بالکل ٹھیک ہے لیکن ہم اپنے ملک کے قانون کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ہم نے اگر اس قسم کا غیر قانونی کام کیا تو ایک انسانی زندگی کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے جرم میں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔ اس لیے مجبوری ہے شہریار!"

"اوکے! تو پھر تو انتظار کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ دیکھو کب اس کا ہیومن ٹیسٹ ہوتا ہے۔ کامیاب ہوتا ہے یا ناکام اور کب میں اس قابل ہوتا ہوں کہ اس کو فروخت کے لیے پیش کرسکوں۔ شاید یہ ایک لمبا انتظار ہوگا۔ بہر حال میں بھی سوچتا ہوں کہ کیا کیا جاسکتا ہے اور آپ بھی سوچیں۔ شاید کوئی معقول حل نکل آئے۔" شہریار نے بات ختم کی تو ان دونوں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی کی مسلسل آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے فون کی روشن اسکرین پہ نظر ڈالی تو اس کی مندی مندی سی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"پاپا کا فون؟ رات کو اس وقت۔ خیریت ہے؟" وہ بڑبڑائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہیلو پاپا! آپ اس وقت فون کر رہے ہیں۔ سب خیریت ہے نا؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا تو دوسری جانب سے کچھ توقف کے بعد اسے پاپا کی آواز سنائی دی۔

"ہاں بیٹا! بس کچھ طبیعت بہت بے چین سی تھی۔ اس لیے دل چاہا کہ تم سے باتیں کروں۔" ان کی مضمحل سی آواز رل کو سنائی دی تو اسے کچھ تشویش لاحق ہوئی۔

"خیریت ہے پاپا! آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا۔ مجھے لگ رہا ہے آپ کسی بیماری کی وجہ سے بہت کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں۔ آپ کی آواز سے نقاہت ظاہر ہو رہی ہے۔ کیا بات ہے پاپا؟"

"ہاں! میں پچھلے کئی ماہ سے بیمار ہوں۔ اپنے ہی اسپتال میں داخل ہوں۔ علاج چل رہا ہے۔"

"کئی مہینوں سے آپ اسپتال میں داخل ہیں؟ کیسی بیماری ہے کہ اب تک علاج کے باوجود آپ صحت یاب نہیں ہو سکے۔ کیا ہوا ہے پاپا؟"

"کینسر...... کینسر ہو گیا ہے مجھے اور تم جانتی ہو اس کے بارے میں۔ کتنا بھی علاج ہو جائے، یہ جان لیے بغیر نہیں جاتا۔ اس لیے مجھے لگتا ہے کہ میری بھی مہلت بہت کم رہ گئی ہے۔" وہ اتنا بول کر ہی نڈھال سے ہو گئے تو رل نے بے چین ہو کر انہیں آواز دی۔

"پاپا! آپ کو کینسر ہو گیا۔ آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" رل کی آواز روہانسی ہو گئی۔

"کیا کرتا بتا کر۔ تم کیا کرسکتی تھیں۔ اتنی دور رہ کر زیادہ سے زیادہ میرے لیے دعا کرسکتی تھیں تو وہ اب بھی کرسکتی ہو۔ آج میرا دل بہت چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے تم سے ایک مرتبہ تو بات کر ہی لوں۔ اس لیے بے وقت ہونے کے باوجود۔ میں نے تمہیں فون کر لیا۔ اس کے لیے معذرت۔"

"پاپا! کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مجھ سے بات کرنے کے لیے کیا اس قدر فارمل ہونا ضروری ہے؟" رل کی آواز بھرا سی گئی۔

"ہاں۔ اب زیادہ تر وقت جب بستر پر لیٹے لیٹے گزرتا ہے تو ذہن اپنے پورے گزرے وقت کا احتساب کرتا ہے اور ہر دفعہ جب تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ لگتا ہے کہ ساری زندگی میں تم سے ناانصافی کرتا رہا ہوں۔ تمہاری ماں سے اختلاف اور علیحدگی میں تمہارا بالکل بھی کوئی قصور نہیں تھا لیکن تمہیں بلاوجہ اس ناکردہ گناہ کی سزا ملتی رہی۔ میں نے تمہیں کبھی باپ کی وہ شفقت اور محبت نہیں دی جس کی تم حق دار تھیں بلکہ اس ساری نفرت کا ملبا تم پر ڈال دیا جو تمہاری ماں کے سبب میرے دل میں جمع ہوتا رہتا تھا۔ اس عورت کی بے راہ روی نے ہم دو انسانوں کو تباہ کر دیا......" وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ رل نے ان کی بات کاٹ کر آہستگی سے کہا۔

"پاپا! ماما گمراہ نہیں تھیں۔ ان کے کردار میں کوئی کمی نہیں تھی۔ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے۔ یا یوں کہیں کہ آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا اور آپ نے ماما کو صفائی کا کوئی موقع دیے بغیر ان کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا۔ نہ اس وقت کچھ پوچھا اور نہ بعد میں کبھی کوئی خبر لی۔ اگر لی ہوتی تو

یقیناً آپ کی غلط فہمی دور ہو جاتی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ کیا وہ چھچھورا ڈاکٹر اس کی زندگی میں میری جگہ نہیں آ گیا تھا؟ کیا رملہ نے اس کے ساتھ پینگیں بڑھائی نہیں تھیں۔ کیا اس نے مجھ سے بے وفائی نہیں کی تھی؟ اور تم کہہ رہی ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔"

"پاپا! اس وقت بھی آپ ہمیشہ کی طرح صرف اور صرف غصے میں یک طرفہ طور پر سوچ رہے ہیں۔ آپ نے کبھی اس بارے میں ماما سے پوچھا تھا کیا؟ شاید کبھی نہیں بلکہ اسی ڈاکٹر عرفان کی غلط سلط باتیں سن کر کھڑے کھڑے فیصلہ کر دیا اور وہ تو چاہتا ہی یہ تھا۔ یہ اس کی انتقامی کارروائی تھی کیونکہ آپ نے اس سے اسپتال کے مالی معاملات میں کرپشن کے بارے میں باز پرس کی تھی اور خاصا بے عزت کیا تھا۔ بات آپ کی طرف سے ختم ہو گئی تھی لیکن اس نے آپ کو اس کی سزا دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا۔ آپ کا گھر تباہ کر دیا اور ہم تینوں کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے سزا بنا دیا۔"

"یہ سب تمہیں کیسے معلوم؟ کیا تم رملہ سے ملتی رہی ہو؟" انہوں نے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

"جی پاپا! میں ان سے ملتی رہتی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے اور آپ کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔"

"اوہ! اس نے تمہیں یہ نہیں کہا کہ باپ کو چھوڑ کر میرے پاس آ جاؤ۔ وہ تمہارا ظالم باپ ہے۔ تمہاری زندگی ہمیشہ اس کی وجہ سے پریشان حالی کا شکار رہے گی؟"

"نہیں پاپا! میں یہ بات جب بھی ان سے کہتی بھی تھی تو وہ یہ کہتی تھیں کہ رزل! تمہارے پاپا بہت جذباتی انسان ہیں۔ میرے بعد تم بھی ان کی زندگی سے نکل گئیں تو وہ جی نہیں پائیں گے۔ میرے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی تباہ کر لیں گے۔ اس لیے ان کو جذباتی سہارا دینے کے لیے تمہارا ان کے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے۔ تم جب تک ان کے ساتھ ہو، ان کی نفرت کا رخ میری طرف رہے گا اور وہ خود کو صحیح سمجھتے رہیں گے۔ کیونکہ انہیں لگے گا کہ تم بھی مجھے ہی غلط سمجھتی ہو، انہیں نہیں۔ اس سے ان کا بھرم قائم رہے گا۔ ورنہ وہ ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔"

"یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو رزل؟ وہ میرے بارے میں اتنا سوچتی تھی؟ اتنا تو میں نے خود بھی اپنے بارے میں نہیں سوچا۔"

"پاپا! وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں تھیں، ایک بہترین ماہر نفسیات بھی تھیں۔ ہر انسان ان کے سامنے کھلی کتاب ہوتا تھا پھر آپ تو ان کے سب سے زیادہ قریب تھے۔"

"تم بار بار رملہ کو 'تھیں' کہہ رہی ہو۔ کیا وہ......؟"

شاید اس سے آگے کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں تھا ان میں۔

"جی پاپا! میرے یہاں آنے سے کوئی ایک سال پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ مسیحا کے اپنے ہی دل نے اسے دھوکا دے دیا۔" رزل کی بات سن کر فون پر دوسری جانب ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ پھر پاپا کی ایک کمزور اور بدلے ہوئے لہجے میں آواز سنائی دی۔

"رزل! تم یہاں آ سکتی ہو کیا؟ میرا بہت دل چاہ رہا ہے کہ آخری دنوں میں... تم سے بہت ساری باتیں کروں میں۔ اپنی، تمہاری اور... اور رملہ کی۔"

"پاپا آپ نے جہاں مجھے بھیج دیا ہے اور جس شخص کے حوالے کر کے بھیجا ہے، وہ میرے لیے اس دنیا میں ہی ایک عذاب ہے۔ میں اس کی پہنائی ہوئی زنجیروں کی اسیر ہوں، میں پچھلے تین سالوں سے وہاں آنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن اس نے مجھے وہاں کبھی آنے نہیں دینا ہے اور یہ اس کا آخری فیصلہ ہے۔"

"ایسا کیسے کر سکتا ہے وہ؟ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ اسے بھیجنا پڑے گا تمہیں۔ تم اپنی تیاری کرو۔ وہ بھیجے گا۔"

"مجھے اپنے گھر آنے کے لیے کیا تیاری کرنا ہے۔ ہر وقت، ہر لمحہ تیار ہوں میں۔ مجھے امید تو نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ اسے راضی کر لیں اور میری زنجیریں ٹوٹ جائیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میری بات اسے ماننا پڑے گی۔ تم آؤ گی اور بہت جلد آؤ گی۔ ٹھیک ہے، اب تم آرام کرو۔ میں پھر بات کروں گا۔"

انہوں نے بات ختم کر کے فون بند کیا تو رزل کو صاف محسوس ہوا کہ وہ بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ وہ کچھ دیر فون کو گھورتی رہی۔ اچانک کچھ بے سائباں ہونے کا احساس اسے آزردہ کر گیا۔

☆☆☆

کئی دن ہو چکے تھے۔ لیب کا کام بھی اب اتنا زیادہ تھکا دینے والا نہیں ہوتا تھا۔ صرف ساری ریسرچ کے ڈاکیومنٹس کو کمپائل کرنا تھا۔

کہیں کہیں کسی جگہ ضرورت محسوس ہوتی تو کسی مرحلے کو دوبارہ تجربے سے گزارنا پڑتا تھا اور بالکل درست ریڈنگز لے کر ہارڈ کاپی بنالینا، یہ کوئی بہت زیادہ لمبا یا مشکل کام نہیں تھا لیکن چل رہا تھا۔

اس دن ناشتے کی تیاری کے دوران اسے احساس

ہوا کہ بہت سی چیزیں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ مال تک جانا ہی پڑے گا۔

وہ تیار ہو کر نکلی اور کافی دور پیدل چل کر لیپ کمپلیکس کے بڑے گیٹ تک پہنچی۔ باہر نکل کر وہ دیکھ رہی تھی کہ کوئی ٹیکسی مل جائے۔ ورنہ سائیکل پر جانا پڑتا اور اس کا موڈ بالکل نہیں تھا کہ وہ اس وقت سائیکل پر جائے۔ اس لیے وہ وہاں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگی۔

"ہیلو مائی لیڈی! آپ یقیناً مال تک جا رہی ہوں گی تو میم! ٹیکسی حاضر ہے۔" اس نے کیپ کو چھو کر، تھوڑا جھک کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ! مسٹر ڈینیل! آپ نے ٹیکسی چلانا کب سے شروع کر دی۔" اس نے بھی تھوڑی خوش دلی دکھائی تو وہ ہنسا۔

"آج تو لگ رہا ہے کہ موسم بہت خوشگوار ہے۔" اس نے تیز چبھتی ہوئی دھوپ کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا تو رل کو ہنسی آ گئی۔

"موسم؟ خوشگوار؟"

"اندر کا موسم اچھا ہو تو باہر کا موسم کیسا بھی ہو...... اچھا ہی لگتا ہے۔ آیئے! تشریف لایئے۔ میں آپ کو آپ کی منزل تک لے چلتا ہوں۔"

"شکریہ! میں چلی جاؤں گی۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

"اور آپ تکلف نہ کریں۔ ورنہ مجھے آپ سے اصرار کرنا پڑے گا اور اس اصرار کو سب دیکھیں گے اور یہ آپ کو شاید اچھا نہ لگے۔ اس لیے پلیز! مجھے یہ اعزاز حاصل کر لینے دیں۔ وہیں جا رہا ہوں میں ناشتا کرنے اور اس خوشی میں مجھے اور زیادہ بھوک لگنے لگی ہے کہ آج ناشتا آپ کے ساتھ ہوگا۔" ڈینیل گاڑی کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا تو رل نے کچھ جز بز والی کیفیت میں اسے دیکھا۔ پھر کوئی راہ نہ پا کر بیٹھ گئی۔

"مسٹر ڈینیل! یہ زیادتی ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں آنا تھا۔ میرے شوہر کو یہ بات بالکل پسند نہیں ہے کہ میں کسی اجنبی سے کوئی بھی واسطہ رکھوں اور آپ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اگر پوچھا تو مجھے مثالی وجہ بتانا مشکل ہو جائے گا۔"

"اوہ رئیلی! آج کے دور میں بھی اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں؟"

"آپ کی طرف شاید نہ ہوتے ہوں لیکن ہماری طرف یہ ایک کامن پریکٹس ہے۔"

"مجھے افسوس ہے لیکن میں آپ کو ایک اچھی خاتون سمجھ کر صرف آپ کی کچھ مدد کرنا چاہتا تھا تاکہ آپ کی مشکل آسان ہو جائے۔"

"میں جانتی ہوں لیکن میرے شوہر نہیں جانتے یہ بات۔ خیر آج کے لیے آپ کا شکریہ لیکن آئندہ ایسا مت کیجیے گا۔"

ڈینیل نے سر ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ مال تک جانے والے راستے میں کئی موڑ تھے۔ وہ آرام آرام سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا، باتیں کرتا ہوا چل رہا تھا کہ اچانک ایک سنسان سے موڑ پر تین آدمیوں نے ان کی گاڑی کو روکا۔ رل کی نظر جب ان کے نقاب میں چھپے چہروں پر پڑی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ ان تینوں میں سے دو نے گاڑی کی دونوں سائڈوں کو کور کیا۔ ڈینیل کو ایک نے گن دکھائی اور رل کے منہ پر دوسرے نے کوئی رومال رکھ دیا جس سے اسے ایک لمحے کے لیے کوئی ناگوار سی بو آئی اور دوسرے لمحے میں وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر نہ جانے کس اندھیری دنیا میں چلی گئی۔

☆☆☆

اس کے فون کے جواب میں ژونگ خود ہی چلا آیا تھا۔

"کیا بات ہے شہریار! تم نے کہا کہ تمہاری اسسٹنٹ غائب ہے...... صبح سے۔ کیا تم نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی؟ کہاں جا سکتی ہے وہ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ صبح اس نے مجھ سے میرا کریڈٹ کارڈ لیا تھا۔ گروسری لینے جانا تھا جب کی گئی ہوئی اور اب تک واپس نہیں آئی۔ میں نے کتنے ہی فون کیے ہیں اس کو لیکن کوئی فون اٹینڈ نہیں کیا اس نے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں اسے کہاں تلاش کروں؟"

"کیا تم اس مال میں گئے جہاں وہ گروسری کے لیے جاتی ہے؟"

"نہیں کیونکہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس مال میں جاتی ہے۔ میں کبھی اس کے ساتھ نہیں گیا۔"

"اوہ! اچھا۔ پھر تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں جا سکتی ہے؟ کوئی دوست، کوئی رشتے دار یا کوئی اور جس سے وہ ملتی جلتی ہو؟"

"نہیں۔ رشتے دار ہمارے یہاں کوئی بھی نہیں۔ دوست بنانے کی میں نے اسے کبھی اجازت نہیں دی۔ کافی عرصے سے وہ پاکستان جانے کا کہہ رہی تھی لیکن یہاں میرا کام آخری مراحل میں تھا۔ اس لیے میں ٹال رہا تھا۔ ویسے بھی میں نے چیک کیا۔ اس کا پاسپورٹ یہیں ہے اور بغیر پاسپورٹ کے وہ جا نہیں سکتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں

آ رہا ہے کہ کہاں چلی گئی ہے۔"

"ویسے تو یہ پولیس کیس ہے لیکن میں تمہیں پولیس کے پاس جانے کا مشورہ دینے سے پہلے۔ اپنے طور پر کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری اجازت ہو۔" ژوانگ نے سنجیدگی سے کہا تو شہریار نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ وہ کہیں غلط ہاتھوں میں نہ پڑ گئی ہو۔ اس کے پاس بہت کچھ ہے بتانے کے لیے۔ پچھلے کافی عرصے سے بہت سے نامعلوم افراد میرے اس پروجیکٹ کی سن گن لیتے محسوس ہو رہے ہیں۔ تمہیں یاد ہے، ایک دن وہ چور گھسا تھا میری اس لیب میں اور اس سے متعلق ضروری پیپرز کی فائلیں اڑا کر لے گیا تھا جو تم نے اس سے وصول کی تھیں۔ اس کے بعد ایسا کچھ بھی ہونا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ بہتر ہے تم جلد سے جلد رِل کو بازیاب کروانے کی کوشش کرو۔"

"تم اتنے آگے کی سوچ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہو۔" ژوانگ نے فکرمندی سے کہا۔

"وہ سامنے دیکھو۔ میں نے کب سے یہ مقامی نیوز چینل لگا رکھا ہے۔ اگر کہیں کوئی حادثہ ہوا ہوتا تو اب تک اس کی خبر تو نشر ہو چکی ہوتی۔"

"یہ تو واقعی ایک گمبھیر مسئلہ ہو گیا ہے۔ خیر! تم فکر نہ کرو۔ میں فوراً اپنے ایمرجنسی ونگ سے رابطہ کرتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں۔" ژوانگ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے اس کے آفس سے باہر نکل گیا۔

شہریار کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے پاکستان میں اپنے ماموں اور رِل کے والد کو فون ملایا۔

"ماموں! کیسے ہیں آپ؟ اب کیسی طبیعت ہے؟"

"تم جانتے ہو اچھی طرح کہ میں کیسا ہوں۔ میری زندگی کی شام ہو چکی ہے۔ کب یکلخت اندھیرا ہو جائے، معلوم نہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ رِل کو فوراً بھیج دو۔ وہ ابھی تک آئی نہیں۔ کب آ رہی ہے؟"

"آ جائے گی ماموں! ہم پلان کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلدی آ جائے گی۔"

"شیری! میرے پاس انتظار کا وقت نہیں ہے۔ اسے جلدی بھیج دو۔ آج کل میں ہی۔"

"جی! بہتر ہے۔ بھیج دیتا ہوں۔"

اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رِل کو کہاں تلاش کروائے۔ اس کا غیاب ایک الجھی ہوئی ڈور کی طرح اس کے سامنے تھا اور وہ اس کا سرا تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔

اچانک میسج کی ٹون نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ژوانگ کا میسج تھا۔ ایک تصویر بھی ساتھ تھی۔

"کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟"

شہریار نے اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ کسی سڑک پر تیز دھوپ میں، ایک دراز قد شخص ایک گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے بڑے سائز کا سیاہ شیشوں والا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ سر پر سرخ رنگ کی پی کیپ تھی۔ تیز دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے اس کے چھجے کو کافی نیچے تک جھکایا ہوا تھا۔ ان دونوں چیزوں کے سبب اس کے چہرے کا بہت کم حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بغور اس کا جائزہ لے کر پہچاننے کی بہت کوشش کی لیکن شناخت کا کوئی تاثر ظاہر نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر ذہن دوڑانے کی مشقت کرنے کے بعد اس نے ژوانگ کو مختصر جواب بھیج دیا۔

"نہیں۔ میں اسے نہیں پہچانتا۔"

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک مختصر صاف ستھرے کمرے میں پایا۔ ایک سنگل بیڈ، جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی الماری اور ایک سادہ سی ٹیبل اور کرسی، جو جالی کے پردے والی کھڑکی کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر تو بے خیالی میں جائزہ لیتی رہی پھر اسے صورتحال کا ادراک ہوا تو وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ میں کہاں ہوں؟" یہ سوال اپنی پوری گمبھیرتا کے ساتھ اس کے ذہن میں آیا لیکن ظاہر ہے جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔

کیا ڈینئل نے؟ اس نے ایک لمحے کو سوچا تو یاد آیا کہ اغوا کرنے والوں نے تو اس کے بھی سر پر پستول تانی تھی اور اس کی تھوڑی مزاحمت کرنے پر انہوں نے وہ پستول دستے کی طرف سے گھما کر اس کے سر پر ماری تھی جس سے شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ اس کا سر ڈھلک کر سیٹ کے سائڈ پر گرنے تک کا منظر اس کی یادداشت میں موجود تھا لیکن اس کے بعد اندھیرا تھا۔ اب وہ نہ جانے کہاں تھی۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھی تاکہ باہر کا جائزہ لے کر کچھ اندازہ لگا سکے لیکن کھڑکی کے سامنے صرف ایک سفید سپاٹ دیوار تھی اور اس کی بلندی کے پار نیلا آسمان تھا۔ وہاں سے ہٹ کر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن

ناکام رہی، کیونکہ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اب اسے سوائے کسی کے آنے کا انتظار کرنے کے، کوئی اور کام نہیں تھا۔

اور اس کی یہ توقع بہت جلد پوری ہوئی۔ باہر سے کسی نے نرم سی دستک دے کر آہستگی سے دروازہ کھولا۔ وہ مخصوص نقوش والی ایک چینی لڑکی تھی جس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے تھوڑا سا جھک کر اسے تعظیم دی اور کھانے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔

”آیئے میم! کھانا کھا لیجیے۔“ اس نے شستہ انگریزی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو رل نے اسے بغور دیکھا پھر پوچھا۔

”میں اس وقت کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟“

”میم آپ کھانا کھا لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں آپ کو آپ کے سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ آپ اس وقت دوستوں کے درمیان ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے واپس چلی گئی۔ وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی پھر کھانے کی ٹرے اپنی طرف کھینچ لی۔

وہ دو تھے۔ خدوخال سے کسی مغربی ملک کے لگ رہے تھے۔ سپاٹ چہروں اور سرد نیلی آنکھوں والے۔

”میم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہمیں آپ کو اس طرح لانا پڑا لیکن یقین ہے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔ آپ ہمارے لیے محترم ہیں۔ آپ سے صرف چند سوالات کرنے ہیں۔ ان کے جواب مل جائیں تو آپ کو بصد احترام واپس بھجوا دیا جائے گا۔“ ایک نے مخصوص لہجے والی انگریزی میں اس سے پوچھا۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

”ہم جانتے ہیں کہ آپ ایک بہت جینئس سائنٹسٹ کی بیوی ہیں اور یہاں وہ جو کام کر رہے ہیں، آپ اس میں انہیں اسسٹ کر رہی ہیں۔ یقیناً آپ جانتی ہوں گی کہ وہ کس چیز پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ ہمیں یہی تفصیل آپ سے معلوم کرنا ہے۔ امید ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گی۔“ اس کی بات سن کر رل کے ذہن میں ایک کلک ہوئی۔ شہریار نے اپنے پروجیکٹ کو بہت زیادہ کانفیڈنشل رکھا ہوا تھا لیکن پھر بھی ان لوگوں کو اس کی بھنک ہو گئی۔ اس کا مطلب ہے شہری کا پروجیکٹ واقعی کوئی بہت ہی اہم چیز ہے۔

”میم! کیا میں اپنا سوال دوبارہ دہراؤں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ معلومات حاصل کرنے کے لیے آپ نے ایک بالکل غلط شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ میں انہیں اسسٹ ضرور کرتی ہوں لیکن صرف اس حد تک کہ وہ مجھے جو بھی چیز مکمل کرنے کو دیں، ان کی ہدایات کے مطابق مکمل کر کے میں انہیں واپس کر دوں۔ چاہے وہ کسی سلائیڈ پر کوئی میٹر دے دیں جس کا تجزیہ کر کے مجھے رپورٹ بنا کر دینا ہو... یا پھر کوئی تجربہ جس کی رپورٹ تیار کر کے دینا ہو۔ میرا کام بس اتنا ہی ہے۔ اس سے پروجیکٹ کی نوعیت کا کوئی اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔ زیادہ کے بارے میں میں نے بھی کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس لیے میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ وہ کیا کر رہا ہے؟“

”یہ ممکن نہیں ہے خاتون! آپ خود ایک بہترین مائیکروبیالوجسٹ ہیں۔ آپ تو بہت اچھی طرح جانتی ہوں گی کہ آپ جو کام کر رہی ہیں اس کی بنیاد اور مقصد کیا ہیں۔ ہم وہی جاننا چاہتے ہیں۔ آپ کا یہ جھوٹ کہ آپ کو کچھ نہیں معلوم، ہم تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اچھے ماحول میں اس بارے میں بات کریں۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی زبردستی، یا زیادتی ہو اور آپ کا احترام مجروح ہو۔“

”کیا آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“

”نہیں۔ یہ دھمکی نہیں ہے۔ صرف آپ کو زمینی حقائق سے آگاہ کرنے کی کوشش ہے۔ آپ جانتی ہیں ہم نے کتنی طویل پلاننگ کے بعد آپ کو حاصل کیا ہے۔ آپ کے ڈاکٹر صاحب تو باہر نکلتے ہی نہیں ہیں۔ آپ بھی کبھی کبھار ہی نکلتی ہیں۔ ہم نے ایک طویل ریکی کے بعد آپ کے معمولات سے آگاہی حاصل کی اور بہت بڑا رسک لیتے ہوئے آپ کو یہاں لائے ہیں تو پھر آپ سے معلومات حاصل کیے بغیر تو آپ کو ہم واپس نہیں پہنچا سکتے۔ یا تو آپ آج ہی کی نشست میں سب کچھ بتا کر واپس جا سکتی ہیں یا پھر ہم انتظار کریں گے کہ آپ کتنا سوچنا چاہتی ہیں۔ تب تک آپ اسی کمرے میں مقیم رہیں گی۔ یہ آپ کی مرضی پر ہے۔“

”مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آپ کو شہریار کی ریسرچ سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ کورونا وائرس کے بعد تو تقریباً ہر جگہ اسی پر کام کیا جا رہا ہے۔ شہریار کوئی انوکھا کام تو نہیں کر رہا ہے۔ جو آپ لوگ اس کے بارے میں جاننے کے لیے اتنے بے تاب ہو رہے ہیں۔“

”وہ انوکھا کام کر رہا ہے اور یہ بات صرف ہم ہی نہیں، آپ بھی جانتی ہیں۔ آپ کو کورونا کی پھیلائی ہوئی تباہی کا اندازہ ہے نا۔ پوری دنیا تقریباً مفلوج ہو کر رہ گئی ہے اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ تباہ کن جرثومہ بنانے اور

پھیلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر سوچ لیجیے کہ تباہی کا عالم کیا ہوگا۔ یہ نقطہ جزیشن وار ہے میم! بم، میزائل، یہاں تک کہ ایٹمی ہتھیار بھی اب تقریباً پرانی چیزیں ہو چکے ہیں۔ اپنی ناپسندیدہ دنیا کو ختم کرنے کے نت نئے اور مہلک طریقے دریافت کرنا اور ان کو استعمال کرنا آج بھی انسان کی طاقتور ترین خواہش ہے تو اس پاگل پن کو روکنا تو ضروری ہے نا میم!"

"کورونا سے بھی زیادہ مہلک؟ لاکھوں لوگ اس خطرناک وائرس سے ہلاک ہو چکے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اس سے بھی زیادہ طاقتور اور مہلک وائرس۔ کیا کوئی پوری دنیا کو ہی تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے...... لیکن کوئی کیوں ایسا کرنا چاہتا ہے؟"

"کیونکہ ہر کوئی اس دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور بننا چاہتا ہے۔"

"ہر عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ شہریار کے پاس ایسا کوئی مقصد ہے کیا کہ وہ دنیا کی تباہی کے لیے دن رات ایک کر دے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ لوگ محض اپنی سپرمیسی کو قائم کرنے کے لیے اس قسم کی سوچ کو پروان چڑھا رہے ہوں؟"

"آپ کے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ یہ سپرمیسی چیلنج کا شاخسانہ ہے۔ انسان اور انسانیت کی بقا اور اس کی بھلائی کے لیے کوئی اقدام کرنا، کیا یہ کوئی غلط سوچ ہے؟ اور رہے آپ کے شوہر صاحب تو وہ پیسے کے بہت لالچی ہیں۔ بہت زیادہ، بلکہ زیادہ سے زیادہ پیسا ان کی شدید ترین خواہش ہے اور پیسے کے ساتھ اگر شہرت کا تڑکا بھی ہو تو کیا بات ہے۔ چیری آن دا کیک۔ کم از آپ تو ان کی ریپلیکا نہ بنیں۔ آپ تو انسانوں اور انسانیت کے بارے میں سوچیں۔ شاید پیسے میں آپ کا بھی انٹرسٹ ہو لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس قدر لالچی نہیں ہوں گی کہ تباہی میں دونوں ہاتھوں سے حصے دار بن جائیں اس لیے میری ریکویسٹ ہے کہ آپ پوزیٹولی سوچیں۔"

"اوکے! فرض کریں کہ آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ میرے شوہر کوئی بہت ہی نئی اور مہلک چیز دریافت کر چکے ہیں اور اسی پر کام بھی کر رہے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟ انہیں جان سے تو نہیں ماریں گے یقیناً کیونکہ آپ ایک جینئس کو ضائع تو نہیں کریں گے تو پھر کیا کریں گے؟"

"آپ میری توقع سے بھی زیادہ ذہین ہیں خاتون! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اسے جان سے مار دینا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے لیکن اتنا قیمتی ذہن اس طرح برباد ہو یہ ہم بھی نہیں چاہیں گے۔"

"تو پھر کیا کریں گے؟"

"یہ تو بعد میں سوچا جائے گا اور ویسے بھی یہ سوچنا پالیسی میکرز کا کام ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو کس طرح ہینڈل کیا جائے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اس دریافت کی حقیقت معلوم کریں اور اسے ہر قیمت پر حاصل کریں۔ چاہے ہمیں اس کے لیے ڈاکٹر شہریار کو ان کی منہ مانگی قیمت دینی پڑے یا پھر کوئی زبردستی کرنا پڑے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ معاملات بحسن وخوبی طے ہو جائیں اور کوئی بدمزگی نہ ہو۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ کونسا راستہ اختیار کرتی ہیں۔ یہ مت سوچیے گا کہ ہمیں آپ کی اس بات پر یقین آ گیا ہے کہ آپ کو کچھ نہیں معلوم۔"

"آپ نے کہا کہ آپ شہریار کی دریافت اس کی منہ مانگی قیمت پر حاصل کرلیں گے اور اس سلسلے میں زبردستی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ آپ اسے حاصل کر کے کیا کریں گے؟ کیا آپ کے پاس اس کا کوئی متبادل استعمال بھی ہے؟ کوئی مثبت اور خلق خدا کے لیے فائدہ مند اور اگر ایسا ہے بھی تو مجھے نہیں لگتا کہ اس خودغرضی والے ماحول میں آپ بہت زیادہ پیسا محض خلق خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کریں گے اور اسے صرف اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ یا شاید یہ بھی اسی خیال کی ایک کڑی ہے کہ دنیا کے تمام وسائل صرف اور صرف آپ کے تصرف میں ہونا چاہئیں۔ مجھے اپنے اس عمل کی کوئی وضاحت تو دیں کہ کیوں؟ کیوں آپ کو یہ دریافت حاصل کرنا ضروری ہے؟"

رل کے سوال پر ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ایک نے گلا صاف کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"اقوام متحدہ کے تقریباً تمام بڑے پروگرام اسی مقصد کے لیے ہوتے ہیں۔ انسانوں کی بھلائی کے لیے۔ یہ بھی اسی کی صوابدید پر ہوگا کہ وہ اس دریافت کو لوگوں کے لیے کس طرح استعمال کرتی ہے۔ یقیناً کوئی اچھا ہی استعمال ہوگا۔ انسانیت کو بہت بڑے خطرے سے بچا کر محفوظ کرنا تو ہم سب کے مقاصد میں سے ایک ہونا چاہیے۔ آپ بھی ان میں شامل ہو سکتی ہیں۔"

رل سوچ میں پڑ گئی تو دوسرے نے محاذ سنبھالا۔

"یہ ڈیل صرف آپ سے بھی ہو سکتی ہے کہ آپ ہمیں

اس کام کے بلیو پرنٹ لاکر دے دیں اور ایک خالی چیک لے کر اس میں اپنی مرضی کی رقم بھر لیں۔ چاہے وہ سات، آٹھ ڈیجٹس والی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ یقین ہم آپ کو دلاتے ہیں کہ وہ چیک کیش ہو کر ڈائریکٹ آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گا۔" اس کی بات سن کر رل خالی الذہنی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس گورکھ دھندے میں بری طرح الجھی ہوئی تھی۔

اسے کافی حد تک معاملے کی ہولناکی کا ادراک ہو رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ قوم کی بھلائی کا نام استعمال کر کے وہ صرف اس کی آمادگی چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ اس کی ذات تو ایک بہت معمولی رکاوٹ تھی۔ پھونک مار کر اڑا دینے والی۔ اس کے ذہن میں بگولے سے اڑ رہے تھے اور وہ بے تاثر انداز میں ان کے چہرے دیکھ رہی تھی۔

"آپ چاہیں تو......" وہ کچھ بول ہی رہا تھا کہ رل نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا اور گویا ہوئی۔

"آپ لوگوں نے میرا دماغ ہلا دیا ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ جا کر گرم کافی کا لبالب بھرا ہوا پیالہ میرے لیے بھجوا دیں۔" اس نے ایک شاہانہ انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے انہیں نکل جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے اس انداز پر وہ سخت مزاج لوگ بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ واپسی کے لیے مڑے اور باہر نکل گئے۔ خودکار دروازہ بند ہو گیا۔

☆☆☆

"تم اس طرح مجھ سے اجازت لیے بغیر کہیں بھی کیسے جا سکتی ہو؟ کہاں تھیں تم کل سے؟ اور میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔ بتاؤ!"

شہریار آگ بگولا تھا۔ غصے سے چہرہ سرخ اور چلانے سے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

"سچ؟ اور یہ تم کہہ رہے ہو کہ تم سچ سننا چاہتے ہو... کیوں؟ میں تمہیں اپنا کوئی بھی سچ کیوں بتاؤں؟ کیا تم نے اپنی زندگی کے سارے سچ مجھے بتائے ہیں؟"

"بکواس بند کرو۔ میری زندگی تمہارے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ سب کچھ جانتی ہو میرے بارے میں۔ اب کون سا سچ جاننا چاہتی ہو؟ بولو۔ بولو کون سا سچ ہے جس کے بارے میں تمہیں تکلیف ہو رہی ہے؟"

"تم نے مجھے بتایا کہ تم کس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہو؟ تم نے ایسا کیا دریافت کر لیا ہے جس کی بہت بڑی قیمت وصول کرنے کے لیے تم نے اسے بین الاقوامی مارکیٹ میں نیلام پر ڈال دیا ہے؟ وہ لوگوں کے لیے کس قدر تباہ کن ہے۔ پوری دنیا میں سسکتی، تڑپتی موت بانٹنے کا انتظام کر لیا ہے تم نے۔ صرف اور صرف پیسوں کے لیے۔ تم نے یہ سچ بتایا مجھے...... بتاؤ؟" رل کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ یہ سب خرافات کس نے کہی ہیں تم سے؟ تم میرے ساتھ کام کرتی ہو۔ جو کچھ کرتا رہا ہوں اس سے بخوبی واقف ہو۔ پھر یہ کس قسم کا احمقانہ سوال ہے؟"

"میں صرف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تصویر کے الگ الگ حصوں پر کام کرتی رہی ہوں۔ مجھے کبھی تم نے یہ اندازہ لگانے کا موقع ہی نہیں دیا کہ اصل تصویر ہے کیسی؟ اور وہ سب چھوٹے چھوٹے تجربات کس بڑے مقصد کے لیے تھے۔ میں صرف تمہاری ایک ملازمہ تھی، جو تمہارے حکم کے مطابق ان دیے ہوئے ٹکڑوں کو مکمل کر کے دیتی رہی۔ وہ بھی بہت تھوڑی تنخواہ پر۔"

"تم میری بیوی ہو اور بیویاں شوہروں کے کام آتی ہی ہیں۔ تم نے ایسا کوئی انوکھا کام تو نہیں کیا۔ اتنا پڑھنے لکھنے کے بعد گھر میں نوکرانیوں کی طرح تھوڑا بہت کام کرتا اور سونا، عیش کرنا۔ یہ تمہیں زیب دیتا تھا کیا۔ میں نے تم سے شادی اسی لیے کی تھی کہ تم میرے کام میں ہاتھ بٹاؤ۔"

"ہاں۔ شاید یہ منصوبہ تمہارے ذہن میں اس وقت سے پنپ رہا تھا جب تم نے میرا داخلہ مائیکرو بیالوجی میں کروایا تھا۔ میرے نہ چاہنے کے باوجود۔ پھر شادی بھی مجھے دھوکا دے کر کی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں مراد سے مر جانے کی حد تک پیار کرتی ہوں۔ کیا یہ سچ تم نے مجھے بتایا کہ میرا تمہاری زندگی میں اس طرح آنا، دھوکوں کے ایک طویل سلسلوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ پہلے لوگ غلام اور کنیزیں خریدتے تھے۔ اب بھی ہوتا ہے یہ کاروبار جیسے تم نے کیا کیونکہ تمہیں اپنی مدد کے لیے ایک ملازمہ درکار تھی جو تمہارے سارے کاموں میں تمہاری مددگار بھی ہو۔ پیسے بھی نہ مانگے اور تمہاری اجازت کے بغیر ایک پائی روپے کا بزنس بھی نہ کما سکے۔ یہ سچ ہے نا! لیکن کیا تم نے یہ سچ مجھے بتایا؟" اس کے اس دلیرانہ انداز گفتگو پر شہریار نے ایک لمحے کو غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں بغاوت صاف صاف نظر آ رہی تھی۔

"او کے! اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"مجھے آزاد کر دو۔ میں اب ایک لمحہ بھی تمہیں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"تا کہ تم پاکستان جا کر اس ڈاکٹر سے شادی کر سکو۔"

"ہاں۔ تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔" اس کی بات سن کر شہریار ہنسا تو رل نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"تمہاری شادی اس سے نہیں ہو سکے گی۔ نہ ابھی اور نہ کبھی۔ میں نے ماموں کے دل میں اس کی طرف سے اس قدر نفرت اور اشتعال بھر دیا ہے کہ وہ اب اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کریں گے اور اگر تم نے اس کا نام بھی لیا تو وہ یہاں آکر تمہیں صحیح معنوں میں اتنے جوتے ماریں گے کہ تمہاری شکل تک بگڑ کر رہ جائے گی۔ تم کسی کو منہ دکھانے کے بھی لائق نہیں رہو گی اور رہا وہ تمہارا عاشقِ صادق تو ماموں نے اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ وہ کیا ہے کہ اب وہ شاید تمہارے تصور سے بھی نفرت کرنے لگا ہوگا۔ یہ وہ سچ ہے جو تم نہیں جانتیں۔" وہ ہنسا۔

"تمہاری کمینگی سے مجھے یہی امید تھی اور بڑی حد تک اندازہ بھی تھا کہ تم نے بہت کچھ ایسا کیا ہے جس سے میرے آگے بڑھنے کے تمام راستے کانٹوں سے بھر چکے ہیں لیکن اب۔ اب مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ کچھ بھی سہی، مجھے اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا اور طلاق لے کر پاکستان جانا ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اس معاملے کو خوش اسلوبی سے مکمل کرو اور مجھے آزاد کر دو۔ یہ تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟"

"تو تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم کن عذابوں میں گھر جاؤ گے۔ کل صبح سے لے کر آج رات تک کا وقت میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ فیصلہ اب تمہیں نہیں بلکہ مجھے کرنا ہے اور یہ سب سے نرم فیصلہ ہے جو میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے۔"

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ بہتر ہے کہ خوش خیالی کی اس دنیا سے باہر نکل آؤ۔ میرا پروجیکٹ مکمل ہو گیا ہے۔ صرف اس کا ہیومن ٹیسٹ باقی رہ گیا ہے۔ وہ ہو جائے اور مثبت رزلٹ آجائے تو میں اسے ہینڈ اوور کر دوں گا۔ پھر تم جہاں چاہے چلی جانا۔"

"کسے ہینڈ اوور کر دو گے؟" رل نے مکمل اعتماد سے پوچھا تو شہریار کے لیے اس کا یہ لب و لہجہ بالکل نیا تھا۔

"تمہیں بتانا ضروری تو نہیں ہے لیکن آج تم کچھ زیادہ ہی بھرم دکھا رہی ہو تو بتا دیتا ہوں۔ چائنا میں کام کر رہا ہوں۔ وہی اس کے سب سے بڑے خریدار ہیں تو ظاہر ہے انہی کو ہینڈ اوور کروں گا۔"

"ہوں۔ کیا کسی اور نے بھی اس کی خریداری میں دلچسپی ظاہر کی ہے؟" رل کے سوال پر اس نے کچھ چونک کر دیکھا۔

"ہاں لیکن مجھے اس کی زیادہ قیمت یہی لوگ دے رہے ہیں تو میں نے کسی سے بات بڑھائی ہی نہیں۔"

"اور اگر وہ بات بڑھانے پر آمادہ ہوں..... تمہاری مرضی کی قیمت دے کر تو کیا تم انہیں یہ بیچ دو گے؟ اس کے بعد وہ اس سے کتنی تباہی پھیلاتے ہیں، تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

"یہ میرا اثاثہ ہے۔ میری سالہا سال کی محنت اور قربانیاں اس میں شامل ہیں۔ میں اسے اپنے پاس تو نہیں رکھ سکتا۔ ظاہر ہے۔ مجھے اپنی محنت کا صلہ بھی تو چاہیے۔ اب خریدار اس کا کیا کرتا ہے، میرا اس سے کیا لینا دینا ہے۔ وہ اسے فائدے کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے اور نقصان کے لیے بھی۔ میں اسے پابند تو نہیں کر سکتا۔"

"لعنت ہے تمہاری سوچ پر۔ انسانیت نام کی کوئی چیز تمہارے اندر شاید ہے ہی نہیں۔ تم محض آدمی کے آدمی ہی رہ گئے ہو۔ تمہارے سارے سچ سننے کے بعد یہ آخری سچ ہے تمہارے بارے میں۔ جو میں نے دریافت کیا ہے۔ خیر! میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ۔ میں اب ایک لمحہ بھی تمہارے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتی۔ دو چار دنوں میں ہی طلاق کا معاملہ قانونی طریقے سے حل کرو اور میری کراچی کی سیٹ بک کروا دو۔ ٹکٹ اور طلاق کے کاغذات مجھے ایک ساتھ لا کر دو۔"

"ٹکٹ منگوا دوں گا لیکن طلاق ابھی نہیں دے سکتا۔"

"کیوں.... ؟ طلاق کیوں نہیں دے سکتے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ طلاق تو دینا ہی ہوگی۔" رل غصے سے بولی۔

"غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے معاملات نمٹ جانے دو۔ میں تمہاری خواہش پوری کر دوں گا۔ اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس بے وقت کے مطالبے کو تھوڑا ٹال دینا بہتر ہوگا۔" رل نے مشکوک انداز میں اس کے اس مفاہمانہ طرزِ تکلم کو دیکھا۔ کچھ دیر غور سے دیکھتی رہی پھر کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔

☆☆☆

"مسٹر شہریار! اس موضوع پر ہماری پہلے ہی بات ہو چکی ہے اور یہ ایک ایسا اگریمنٹ تھا جس کے ہم دونوں پابند ہیں۔ اگرچہ تحریر میں نہیں ہے لیکن بہرحال ہم نے بات اسی آخری نوٹ پر ختم کی تھی کہ آپ کی اس دریافت پر پہلا حق ہمارا ہی ہوگا۔ یہ ایک جنٹلمین پرامس تھا۔ ڈاکٹر لی کے ساتھ آج ایک اور آدمی بھی تھا۔ غالباً وہ فنانس سے متعلق تھا۔" لی کے بات ختم کرتے ہی وہ بولا۔

"آپ کی اس دریافت کی وہی قیمت دینا طے ہوا تھا جس پر اس وقت بات ہوئی تھی اور آپ نے بھی اس کو اوکے کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی پورے فنانس کے محکمے سے مرحلہ وار منظور ہوتی ہے۔ اس میں... ردوبدل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ہم نہیں جانتے کہ آپ کو اچانک یہ کیوں محسوس ہوا کہ یہ رقم کم ہے بلکہ بقول آپ کے بہت کم۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے؟"

ژوانگ، لی اور وہ نیا آنے والا بندہ یوآن...... تینوں کی کھوجتی ہوئی سی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہاں! اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنا مشکل، طویل اور اتنا تھکا دینے والا ہوگا۔ میں اور میری بیوی دونوں اس پروجیکٹ میں دو سالوں تک اس قدر مصروف رہے کہ کب دن ہوتا تھا، کب رات ہمیں بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔ ان دو سالوں میں ہم ایک دفعہ بھی اپنے گھر تک نہیں جاسکے۔ مہلت ہی نہیں ملی۔ کوئی سیر و تفریح، ملنا جلنا کچھ بھی نہیں۔ ہماری فرصت کا ایک ایک لمحہ اس کی نذر ہو گیا تو اب آپ ہی بتائیے کہ کیا ہم بہتر ڈیزرو نہیں کرتے؟" شہریار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"کیا آپ کو کسی نے آپ کے اس کام کے لیے کوئی اور آفر کی ہے۔ ویسے تو یہ بے حد کانفیڈنشل تھا لیکن آج دنیا بہت بدل گئی ہے۔ چھتوں، دیواروں، یہاں تک کہ زمانوں میں بھی اتنے چھید ہیں کہ دیکھنے اور جاننے کی کوشش کرنے والوں کے لیے حدِ نظر لامحدود ہو گئی ہے۔ بعض اوقات ہماری ساری احتیاطوں کو سیندھ لگادی جاتی ہے۔ کہیں آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ تو نہیں ہوا؟"

ژوانگ کے اندازے بالکل درست تھے۔ شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اثبات میں سرہلایا تو وہ تینوں کچھ فکرمند سے نظر آنے لگے۔ کچھ دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر لی نے بات شروع کی۔

"آپ نے ہمیں بتایا نہیں کہ ایسے کچھ لوگوں نے آپ سے رابطہ کیا ہے جو آپ کی دریافت خریدنا چاہ رہے ہیں۔"

"یہ ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے میری بیوی کو اٹھالیا تھا اور اسی کے ذریعے یہ پیغام مجھے بھجوایا ہے۔ بمع چند دھمکیوں کے۔"

"اوہ! تو یہ بات لیک آؤٹ ہوگئی۔ یعنی آپ کی تحقیق کی بھنک کچھ غیر متعلقہ لوگوں کو بھی مل چکی ہے۔"

"یقیناً! مسٹر ژوانگ کے علم میں ہے یہ بات کہ یہاں میری لیب میں ایک چور گھسا تھا جو میرے پروجیکٹ کے تمام ڈاکیومنٹس لے گیا تھا۔ اس نے گن پوائنٹ پر ہی مجھ سے میرا والٹ ڈور اور لاکر کھلوایا تھا۔ اگرچہ وہ واپس مل گئے تھے لیکن ان نیلی آنکھوں والوں کا یہ اقدام بتاتا ہے کہ وہ میرے کام سے بےخبر نہیں ہیں۔ انہوں نے تحمل سے انتظار کیا اور شاید اب انہیں یہ بھن گن بھی مل گئی ہے کہ میرا پروجیکٹ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ اس لیے انہوں نے ترازو میں رکھ کر اس کی جتنی زیادہ قیمت آفر کی ہے، اتنی ہی بھاری دھمکیاں بھی بھیجی ہیں۔"

"اوہ! تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے اس بارے میں؟ کیا کریں گے؟"

"ژوانگ! یہ میرے بس سے اوپر کی بات ہے۔ میں ان کے ہتھکنڈوں سے نمٹ نہیں سکتا۔ اگر اس سلسلے میں کچھ کرنا ہے تو وہ آپ کو ہی کرنا ہے۔ اس لیے آپ مجھے بتائیے کہ کیا کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہاں میں آپ کی سیکیورٹی کے بھروسے پر رہ رہا ہوں۔"

"آپ نے ہمیں صورت حال سے مکمل طور پر آگاہ نہیں رکھا۔ ورنہ ہم یہاں تک نوبت آنے ہی نہیں دیتے۔"

"جو صورت حال میرے سامنے آئی ہے۔ اس میں پہلا منظر چور کے گھسنے کا تھا جو فوری طور پر آپ کے علم میں آگیا تھا۔ دوسرا منظر بھی اتنا کوئی پرانا نہیں ہے۔ صرف دو دن پہلے یہ لوگ میری بیوی کو، ایک بھری پری سڑک سے اٹھا کر لے گئے۔ میں نے شام کو ہی آپ کو اطلاع دے دی تھی۔ اس کے بعد کی ساری صورت حال آپ جانتے ہیں۔"

"اوکے! اب آپ بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ میں نہیں، آپ بتائیں گے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ میرے لیے آپ کی آفر پہلے سے موجود ہے کیونکہ آپ نے کہا ہوا ہے کہ میری اس پروڈکٹ کے پہلے خریدار آپ ہی ہوں گے لیکن اگر ان لوگوں نے مجھے ایسے ہی کسی اقدام سے مجبور کردیا اور مجھے یہ ان کو بیچنا پڑ گئی تو کیا آپ خوشی دستبردار ہو جائیں گے۔"

"یہ ملین ڈالر کا سوال ہے۔ اس کے بارے میں غور کرنا پڑے گا۔ اگرچہ ہم اپنی آفر پر قائم ہیں اور پوری کوشش بھی کریں گے کہ مسائل نہ ہوں لیکن اب جب ہم اس بات سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ معاملہ کانفیڈنشل نہیں رہا ہے تو اس کے بہت سے پہلو ہوں گے جن پر ہمیں ازسرِنو غور کرنا پڑے گا۔"

"تو کیجیے نا غور۔ آپ سب متعلقہ لوگ تو یہیں موجود ہیں۔" شہریار نے ان تینوں کی طرف ہاتھ پھیلا کر اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔
"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ پورا گینگ ہے جو ان معاملات کو ڈیل کرتا ہے۔ ان سے بات کرنا پڑے گی۔ پھر ہمیں آپ کی بیگم سے بھی بات کرنا پڑے گی تا کہ ان لوگوں کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ لوگ کون ہیں جو انہیں لے گئے تھے۔" لی نے اس سے کہا تو وہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں کو وقت چاہیے۔ وہ شاید پہلے اپنی کچھ ہائر اتھارٹیز سے بات کریں گے پھر کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔
"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ لوگ چاہیں۔" شہریار نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔
ژوانگ نے دور لیب میں کام کرتی ہوئی رل کو بغور دیکھا پھر وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

آج رل کو مراد موہن بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔
وہ کتنی دیر سے اپنے بیڈ پر لیپ ٹاپ لیے بیٹھی تھی۔ اس میں اس کی جتنی تصویریں تھیں، انہیں نہ جانے کتنی بار دیکھ چکی تھی۔ آج اسے خیال آ رہا تھا کہ پانچ سال گزر جانے کے بعد اب وہ کیسا دکھتا ہوگا۔ کہاں ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا؟ بہت سے سوالات اس کے ذہن میں چبھ رہے تھے۔
کس طرح؟ کس طرح ڈھونڈوں میں تمہیں مراد؟ اس کے پاس اس کا کوئی پتا نشان تھا اور نہ ہی کوئی ایسی دوست کا، جو اسے کچھ بتا سکے پھر اسے حنا یاد آئی۔ وہ اسے فیس بک پر تلاش کرے، تو شاید اس کا پتا مل جائے اور اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی۔ فوراً ہی اس نے میسج دیا اور حیران ہو کر فوراً ہی آنے والے جواب کو دیکھا، تو اس کی نظریں اسکرین پر جم کر ہی رہ گئیں۔
"کیسی دوست! اتنے عرصے کے بعد آخر کار میری یاد آ ہی گئی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تو آنجہانی ہو گئی۔ میں نے تو .... تیرے لیے دعائے مغفرت بھی کر لی تھی۔ کوئی اس طرح بھی بھولتا ہے اپنوں کو بھی۔ نامعقول عورت!" ان الفاظ کو پڑھ کر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ کتنا ترس گئی تھی وہ ایسی اپنائیت اور محبت کو۔ آنکھیں کیا چھلکیں، اس کے سینے میں دبی ہچکیاں اور سسکیاں بھی ابل پڑیں۔
"مر ہی گئی تھی۔ اب دوبارہ زندہ ہونے کی کوشش کر رہی ہوں اور اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری دوست بچ کچ زندہ ہو جائے تو مجھے فوراً مراد کا پتا نشان ڈھونڈ کر بتاؤ کیونکہ میرے پاس سے تو وہ لاپتا ہو گیا ہے۔ اسے ڈھونڈنے کی

میری ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ شاید میں اس کے لیے مر چکی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر مجھ سے بے تعلق ہو گیا ہے۔"
"میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے لیکن تم نے سچ کہا کہ وہ تمہارے ساتھ تعلق ختم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے سارے نشان مٹا دیے۔ پرانا فون نمبر، ای میل ایڈریس .... انسٹا اور ٹویٹر وغیرہ۔ سب کچھ بدل دیا اس نے۔ تمہارے جانے کے بعد اس کے ساتھ ہوا بھی بہت برا۔ پتا نہیں تمہیں معلوم بھی ہے یا نہیں۔"
"کیا ...... ! کیا ہوا اس کے ساتھ؟ مجھے واقعی کچھ معلوم نہیں۔ تم بتاؤ پلیز!" رل نے بے تابی سے پوچھا تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔
"یار! پتا نہیں۔ تمہیں بتانا بھی چاہیے یا نہیں۔ تمہیں بہت دکھ ہی ہوگا۔"
"جن دکھوں کا سامنا میں کر چکی ہوں اور کر رہی ہوں ان سے بڑا کوئی دکھ میری زندگی میں آ نہیں سکتا۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا اس کے ساتھ۔ کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ بدنصیب ہے؟ مجھے نہیں لگتا۔"
"تمہارے جانے کے بعد جب اس کا ایم بی اے مکمل ہو گیا تو وہ اپنی ماما کو لے کر تمہارے پاپا سے ملنے گیا جب تمہارے پاپا نے بتایا کہ تم شہریار سے شادی کر کے جا چکی ہو تو اس کی ماما نے وہیں اس کو برا بھلا کہا کہ ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو جس نے چند ماہ بھی تمہارا انتظار نہیں کیا۔ شہریار نے انہیں اور تمہارے پاپا کو بتانے کی کوشش کی کہ تم لوگوں کے درمیان کیا طے ہوا تھا۔ اس سے حالات اور زیادہ خراب ہو گئے اور تمہارے پاپا نے ان دونوں کی بہت زیادہ بے عزتی کر کے انہیں دھکے دے کر نکلوا دیا۔"
"یہ ..... یہ کب کی بات ہے حنا یہ؟ مجھے تو اس بارے میں کچھ بھی پتا نہیں۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
"یہ انہی دنوں کی بات ہے جب تمہیں گئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے اور مراد نے فائنل کیا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ تمہیں یہ بات معلوم کیوں نہیں ہوئی۔ کیا مراد نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"
"نہیں۔ میرا اس سے کئی مرتبہ رابطہ ہوا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں بتایا مجھے بلکہ تسلیاں ہی دیتا رہا۔ اچھا وقت آنے کی آس میں زندہ رکھا اس نے۔ کافی دنوں تک ہم باتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی مجھے اس نے ناموافق حالات کی شدت کے بارے میں نہیں بتایا لیکن پھر وہ اچانک غائب

ہو گیا۔ بغیر کچھ کہے ہوئے اور آج تک میں اس کا پتا نشان ڈھونڈ رہی ہوں۔ آج بھی کمنٹوں سے اسی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ جینکس کا ذکر تمہارا خیال آیا اور تم مل بھی گئیں لیکن اگر پاپا نے ایسا برا کیا بھی تھا تو مجھے بتا تا تو سہی۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس آجاتی لیکن اس نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا۔" رل نے سسکی لی تو عنایہ دوبارہ مخاطب ہوگی۔

"اس نے اپنا ہاؤس جاب کرنے کے لیے جہاں بھی اپلائی کیا، وہاں سے اسے صاف جواب دے دیا گیا۔ وہ حیران تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اس کے ساتھ۔ اس نے معلومات کیں تو اس کے ایک دوست ڈاکٹر نے اسے بتایا تمہارے پاپا کے بارے میں۔ وہ اتنے سینئر ڈاکٹر اور میڈیکل کونسل کے بہت سینئر رکن بھی ہیں اور انہوں نے مراد کے بارے میں کونسل کی میٹنگ میں سب کو کہہ دیا تھا کہ مراد مومن کو کہیں بھی ہاؤس جاب نہ دی جائے۔ وہ ایک کرپٹ انسان ہے۔ اس نے میڈیکل میں ایڈمیشن لینے سے لے کر ہر سمسٹر میں پاس ہونے تک رشوت، دھونس، غنڈا گردی کا سہارا لیا ہے اور اس کے بارے میں مستند اطلاعات ہیں یہ۔"

"اور یہ مستند اطلاعات انہیں دیں کس نے؟ کوئی ثبوت تھا ان کے پاس یا ایسے ہی ہوا میں تیر چلا دیا اور لوگوں نے مان بھی لیا۔"

"ہاہ...... ہاہ۔ میری جان! تمہارا نصیب کہ تمہیں اپنے آس پاس سب دشمن ہی ملے۔ یہ مستند اطلاعات انہیں تمہارے اسی کزن نے دی تھیں جو اب تمہارا شوہر ہے اور شاید اسی کے دباؤ میں آ کر انکل نے یہ فضول حرکت کر کے مراد کا کیریئر تباہ کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کی۔ یہاں تک کہ جب مراد نے ثبوت دکھانے کو کہا تو تمہارے اسی کزن کے کچھ شاگرد اور دوست اس کی گواہی تک دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ تمہارے ان دونوں رشتے داروں نے اس جیسے ہونہار اور اچھے انسان کا کیریئر ختم کر دیا۔ اسے بدنام اور رسوا کر دیا اور جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا گیا، اس نے اس کی ساری سیلف ریسپیکٹ کی عمارت کو دھڑام کر کے زمین بوس کر دیا۔ وہ ٹوٹ گیا۔ تنہائی اور گوشہ نشینی میں وہ نفسیاتی مریض بننے لگا تو اس کی ماما نے اس کو ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا اور ساتھ لے کر لندن چلی گئیں۔ وہاں اس کو اپنا کیریئر بنانے کے لیے دوبارہ آمادہ کیا۔ یوں بہت مایوس اور دل شکستہ ہو کر اس نے نارمل زندگی میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔ اب بھی وہ وہیں ہے اور سنا ہے وائرولوجی میں اسپیشلائزیشن کر لی ہے۔ بڑا شہرہ ہے اس فیلڈ میں اس کا۔"

"کیا پاکستان آتا ہے کبھی؟"

"ابھی تک تو نہیں آیا تھا لیکن سنا ہے اس کی والدہ بہت زیادہ بیمار ہیں آج کل۔ اس نے انہیں وہاں بلوانے کی کوشش کی تھی مگر ان کے ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی تو اب شاید ان کی وجہ سے آنا پڑ جائے۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟ کیا تمہاری اس سے بات ہوتی رہتی ہے؟"

"ہاں اکثر بات ہوتی ہے۔ میں تم دونوں کی مشترک دوست تھی۔ تم نے تو رابطہ رکھا ہی نہیں لیکن وہ مجھے یاد رکھتا ہے۔ یہ سب جو میں نے تمہیں بتایا، اسی سے مجھے معلوم ہوتا رہتا ہے۔"

"کیا اس نے تم سے کبھی میرے بارے میں بات کی؟ میں اس کی یادوں میں ہوں بھی... یا اس نے دل کے ساتھ ساتھ اپنی یادوں سے بھی مجھے نکال کر پھینک دیا ہے۔"

"اس کی سزاؤں کا سلسلہ تمہاری وجہ سے ہی شروع ہوا تھا لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کی قصوروار تم نہیں ہو۔ یہ بھی معلوم ہے کہ شاید تمہیں ان باتوں کا کوئی علم بھی نہیں ہوگا لیکن تمہارے شوہر نے اسے فون کر کے پہلے تو بہت بے عزتی کی پھر کہا ہے کہ اگر اس نے تم سے رابطے کی کوشش بھی کی تو وہ تمہارا وہ حال کرے گا کہ تم اسے پہچان بھی نہیں پاؤ گے اور طلاق تو وہ زندگی بھر نہیں دے گا۔ اس لیے بھول جاؤ اس معاہدے کو جو کبھی تم لوگوں کے درمیان ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر اس نے کبھی بھی تم سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو تمہاری سزاؤں میں اضافہ ہونے کا سبب بن جائے گا۔ اس لیے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ تمہاری تکلیف کو بڑھانے کے بجائے وہ تمہاری زندگی سے اس طرح گم ہو جائے کہ تم ڈھونڈ نہ سکو۔" عنایہ نے اس کے لیے دعا کے کر دیے۔ وہ سر پکڑ کر کراہی اور فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس میں سے عنایہ کی آواز آتی رہی۔ وہ اسے نام لے کر آوازیں دیتی رہی لیکن وہ اپنے ٹوٹتے بکھرتے وجود میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ چھ لوگ تھے۔ ڈاکٹر لی یانگ ان کی سربراہی کر رہے تھے۔ آج انہوں نے شہریار کے مسئلے پر گفتگو کرنا تھی۔ ژیا نگ نے تو رل کو بھی شامل کرنے کو کہا تھا لیکن شہریار نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اس کے خیال میں فیصلے تو سب اسی کو کرنے ہیں۔ رل کو تو وہی سب کرنا ہوتا ہے، جو وہ اسے کہتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ بات اسی سے کی جائے۔

''مسٹر شہریار! یہ سب باتیں مفروضی ہیں کہ کیوں، کیا اور کیسے؟ لیکن حقیقت یہی ہے کہ آپ کے کام کو کانفیڈنشل رکھنے کی تمام کوششوں کے باوجود اس کی معلومات لیک آؤٹ ہوگئیں اور آپ کے سامنے ایسی ترغیبات رکھ دی گئیں کہ آپ ہم سے کیا گیا معاہدہ نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' لی نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا تو شہریار نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ لیک آؤٹ کی وجہ میں نہیں ہوں۔ دوسری بات کہ ان ترغیبات کے ساتھ ہولناک دھمکیاں بھی ہیں۔ میں آج بھی دل سے اس معاہدے کی پاس داری کرنا چاہتا ہوں لیکن جو کچھ ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے، کیا اسے نظرانداز کرسکتا ہوں میں؟''

''آپ مکمل طور پر لیک آؤٹ کا الزام ہمیں نہیں دے سکتے۔ اس کا ذریعہ آپ کی مسز بھی ہوسکتی ہیں۔''

''اس کو تو ابھی ہی اٹھایا گیا تھا اور جو بات اس سے کی، اس کے مطابق انھوں نے صرف سودے بازی کے لیے اسے استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے نہ اس کا کسی سے کوئی رابطہ ہوا تھا اور نہ ہی اس بارے میں کسی سے کوئی بات ہوئی۔ پھر اس پر یہ الزام کیوں؟''

''یہ الزام نہیں، ہم صرف امکانات پر بات کر رہے ہیں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ میری بیوی اس معاملے میں کوئی غلطی کرسکتی ہے۔ اس لیے اسے اس موضوع سے نکال کر بات کرتے ہیں۔ کہیے! اب آپ کیا چاہتے ہیں؟ کوئی حل ہے آپ کے پاس تو بتائیے۔''

''تم دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے بخوبی واقف ہو۔ اس وقت اختیارات اور فیصلوں کی تمام طاقتیں ہر ملک اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے جان توڑ کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کا بیانیہ مخصوص بڑی طاقتوں کے درمیان وجۂ تنازع بنا ہوا ہے۔ ہر طاقت اپنا آرڈر دنیا پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو جنگ جاری ہے۔ وہ کوئی روایتی جنگ نہیں ہے۔ یہ ففتھ جنریشن وار ہے اور اس کے ہتھیار کوئی گولہ بارود، میزائل یا ایٹمی ہتھیار نہیں ہیں بلکہ یہی ہیں جن میں سے ایک تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اب یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم کون سا بہتر فیصلہ کرتے ہو۔'' وہ ایک نسبتاً بڑی آنکھوں اور مکمل چپٹی ناک والا چینی تھا جس نے شہریار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یہ سب کہا۔

''میں مشرق سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہاں کی تہذیب میرے مزاج کا حصہ ہے۔ ان میں سے ایک اصول وعدے کی پاسداری ہے اور میری خواہش ہے کہ جو آپ سے وعدہ کیا تھا، اس پر پورا اتروں لیکن درمیان میں یہ کہانی آگئی ہے اور مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے کیسے پار کروں۔''

''یہی تو اصل مسئلہ ہے شہریار کہ مغرب کسی طور نہیں چاہتا کہ مشرق کسی بھی طرح ذہانتوں میں خودکفیل ہوسکے۔ یہ تعصب کی بدترین شکل ہے کہ کوئی شاندار ایجاد مشرق کے کسی ذہین شخص کے نام سے پہچانی جائے۔ تمہاری اس دریافت کو وہ تم سے چھین کر مغرب کے کسی سائنٹسٹ کے نام سے موسوم کردیں گے۔ مشرق کو وہ کوڑا کچرا سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ انھیں برداشت نہیں کہ مشرق کسی علمی، سائنسی، تکنیکی یا ادبی میدان میں ان سے آگے نکلتا ہوا محسوس ہو۔ وہ پیسے کے زور پر مشرق کو بانجھ رکھنا چاہتے ہیں اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہ مسائل اسی لیے پیش آرہے ہیں۔''

''آپ ایک بات بتایئے ڈاکٹر! آپ نے جو وائرس دریافت کیا ہے، کیا اس کی ویکسین بھی تیار ہوگئی ہے یا ابھی وقت لگے گا؟''

یہ سوال دبلی پتلی، کم عمر نظر آنے والی ڈاکٹر شی وانگ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تیار تو دونوں چیزیں ہیں لیکن دونوں کا ہیومن ٹیسٹ کرنا باقی ہے۔ اس کے بغیر ان کا کام ابھی ادھورا ہی ہے۔ میں نے ژوانگ سے درخواست کی تھی کہ مجھے کوئی رضاکار لا کر دو تو میں ان کا ہیومن ٹیسٹ کر کے اسے فائنل کروں۔''

''ہمارے ملک میں اس بارے میں قانون بہت سخت ہے۔ یہاں شاید ہی کوئی رضاکار مل سکے۔ اس کا انتظام آپ کو خود ہی کرنا پڑے گا۔ یہ بات آپ کو پہلے ہی بتادی گئی تھی۔ آپ جانتے ہیں۔''

''میں اپنے ملک سے بہت دور یہاں رہتا ہوں۔ وہاں ہوتا تو کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ بھاری رقم کے عوض، وہاں رضاکار مل جاتے۔''

''آپ وہاں رابطہ کریں اور اگر کوئی رضاکار مل جاتے ہیں تو ان کا ویزا اور تمام اخراجات ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟''

''ہو تو سکتا ہے لیکن مجھے دیکھنا پڑے گا۔''

''ضرور دیکھیے! اور جلدی دیکھیے کیونکہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' خرانٹ سے نظر آنے والے شخص

نے دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

''وقت نہیں ہے؟ کیا مطلب وقت نہیں ہے۔ اتنی زیادہ جلدی کیوں؟'' شہریار کو شاید اس کا انداز پسند نہیں آیا۔

''مسٹر شہریار! آپ شاید معاملات کی سنجیدگی کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پار ہے ہیں۔ اس وقت آپ کے حصول کے لیے نہ جانے کتنے گروہ سرگرم عمل ہیں۔ وہ اس جگہ داخل ہونے اور آپ تک پہنچنے کے لیے جان توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کوششوں کو آپ آسان زبان میں حملے کہہ سکتے ہیں اور ان کی اب تک ہمارے محافظوں سے کئی جھڑپیں ہو چکی ہیں، جن میں کچھ ان کے اور کچھ ہمارے لوگ مارے بھی جا چکے ہیں۔ وہ پاگل ہو رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ آپ ان کے پاگل پن کا شکار ہوں، ہمیں جلد سے جلد ان معاملات کو اختتام تک پہنچانا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔'' وہ غالباً شاید سکیورٹی معاملات سے متعلق تھا۔

''اوہ! حالات اتنے خراب ہیں۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا لیکن میں کام مکمل کیے بغیر تو آپ کو دے بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ آخری مرحلہ، یعنی ہیومن ٹیسٹ جب تک ہو نہیں جاتا' یہ نامکمل ہے۔ اس لیے آپ بھی کوشش کریں اور میں بھی کہ ہمیں ٹیسٹ کے لیے کوئی رضا کار مل جائے۔''

''ہم تو اپنی مجبوری آپ کو بتا چکے ہیں۔ اب جو بھی کرنا ہے وہ آپ کو ہی کرنا ہے اور وہ بھی جلدی کیونکہ ہر گزرتا دن آپ کی سکیورٹی کو مشکل بناتا جا رہا ہے۔'' وہ سب خاموش ہو کر حالات کی سنگینی اور اپنے مسائل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ مختلف مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والے چھ افراد تھے، جو ایک ٹیبل کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سب یہاں جس کانفرنس میں موجود تھے اس کا ون لائن ایجنڈا تھا کہ کس طرح ڈاکٹر شہریار سے اس کی تحقیق حاصل کی جائے۔

''ابھی تو کورونا نے ہمیں دنیا بھر کی طاقت کا بھرپور اختیار نہیں دیا ہے۔ اب اگر ڈاکٹر شہریار کامیاب ہو جاتا ہے تو ان چینیوں کے ہاتھ ہم سے زیادہ مہلک ہتھیار آ جائے گا۔ وہ ہم مغربی ممالک کو بھی کا ناچ نچا سکتا ہے۔'' ایک نے اپنی نیلی سرد مہری آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہوئے بات کی ابتدا کی۔

''اور پھر ہماری معلومات کے مطابق اس نے جو وائرس تیار کیا ہے، اس کی ہلاکت خیزی کورونا سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر چائنا نے اسے حاصل کر لیا تو وہ ہمیں نہ جانے کہاں کہاں بلیک میل کرے گا۔'' دوسرے نے پالیسی سازی کی طرف اشارہ کیا۔

''ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ اس دفعہ مشرق ہم پر بازی لے گیا تو دنیا پر ہمارا جو بھرم ہے، وہ بھی کمزور پڑ سکتا ہے۔ ہمارا امیج بگڑ سکتا ہے۔''

''نہیں۔ ہم اس کی نوبت نہیں آنے دیں گے۔ ہمیں جلد سے جلد اس چوہے کو اپنے بل سے باہر نکالنا پڑے گا۔ اس کے لیے سب سے بہتر ذریعہ اس کی بیوی ہی ہو سکتی ہے۔ اسے دوبارہ اٹھانا پڑے گا۔''

''اب وہ محتاط ہو گئے ہیں۔ شاید وہ بھی اب باہر نہ نکلے۔ اگر ایسا نہ ہوا اور دیر ہو گئی تو ممکن ہے بازی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق اس کی تحقیق مکمل ہو چکی ہے اور وہ کسی بھی وقت اسے چین کے حوالے کر سکتا ہے۔''

''تو پھر ہمیں ڈائریکٹ ایکشن لینا پڑے گا۔ ہم آخری حد تک جا کر اس کے بل میں گھسیں گے اور اس کی تحقیق سمیت اس کو گھسیٹ کر لے آئیں گے۔''

''اول تو وہ اسے بچانے کی آخری حد تک کوشش کریں گے لیکن ہم نے انہیں ڈاج دے کر اپنا مطلوبہ ہدف حاصل کر بھی لیا تو... چین کے غصے کا سامنا کون کرے گا۔''

''یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری حکومتوں کا کام ہے۔ وہ ہینڈل کر لیں گی۔ ہمارا جو کام ہے، ہمیں صرف اس پر فوکس کرنا ہے اور ہر صورت کامیابی حاصل کرنا ہے۔''

''او کے گائیز! تو آج رات کو ہی ہمیں اپنے کمانڈوز کو آخری اور کامیاب حملے کے لیے اس لیب کمپلیکس میں بھیجنا ہے۔ اس ٹاسک کے ساتھ کہ کامیابی یا موت۔ ہوپ فار دا بیسٹ۔'' ان سب نے اپنے انگوٹھے کھڑے کر کے امید کا اظہار کیا۔

☆☆☆

''میں نے تم سے کہا تھا کہ تین چار دنوں میں ہی مجھے طلاق کے کاغذات اور کراچی کا ٹکٹ چاہیے لیکن شاید تم نے میری بات پر غور نہیں کیا۔''

دل کا ضبط آخری حد پر تھا۔

''اور میں نے بھی تم سے کہا تھا کہ میرے معاملات کو پورا ہو جانے دو۔ کر دوں گا تمہاری فرمائش پوری۔''

''جہنم میں جائیں تمہارے معاملات۔ میرا ان سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مجھے آزاد کرو۔ مجھے جانا ہے۔ رائٹ

"نا ڈا!" وہ دہاڑی۔

"بکواس مت کرو۔ تم اپنی اس بچکانہ ضد کے سبب، میری سالہا سال کی محنت کو مٹی میں ملانا چاہتی ہو۔ جانتی بھی ہو کہ میری یہ دریافت کس قدر قیمتی ہے؟ دنیا کے کئی ملکوں کے درمیان اس کی طلب پر بولی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر ملک مجھے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت آفر کر رہا ہے۔ ہر شخص اسے میری منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہے اور میں اس بولی کے زیادہ سے زیادہ اوپر جانے کے انتظار میں ہوں۔ اتنا پیسا، اتنی دولت کہ میری سات نسلیں بھی اگر بیٹھ کر کھائیں تو ختم نہ ہو۔"

"تو تم اپنی اگلی سات نسلوں کو انسانی لہو پر پالنا چاہتے ہو۔ تمہاری یہ بھیانک دریافت لاکھوں کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی، تم اسے پیسے کے حصول کے لیے ان آدم خور بھیڑیوں کو بیچنا چاہتے ہو۔ جو اپنی سپر میسی قائم کرنے کے لیے نوع انسانی کو بھیانک تباہی کی طرف لے جا سکتے ہیں۔"

"کیا بکواس ہے۔ میں سالوں سے اتنی محنت اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ اپنی دریافت کو ایسے ہی کسی کو دان کر دوں۔ تم اپنی احمقانہ سوچ اپنے تک رکھو اور میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش بھی مت کرو۔"

"میں تو نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے زبردستی اس معاملے میں گھسیٹ لیا گیا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے تمہارے اس مشن سے کوئی دلچسپی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ اب ہے۔ میں تو تم سے نجات چاہتی ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے نجات دو اور مجھے جانے دو۔"

"یہی تو اصل مسئلہ ہے کہ وہ تمہیں پھر اٹھالیں گے اور تمہیں میری کمزوری بنا کر مجھے مجبور کریں گے۔ میں انہیں یہ موقع دینا نہیں چاہتا۔"

"ہاہ! کمزوری؟ کیا میں واقعی تمہاری کمزوری ہو سکتی ہوں؟ تمہارے نزدیک میری اتنی اہمیت ہے کہ تم مجھے بچانے کی خاطر اپنے اتنے مہنگے سودے سے دستبردار ہو جاؤ گے۔ لگتا تو نہیں ہے۔" زل کے لہجے کی تلخی انتہا پر تھی۔

"تمہیں بچانے کی خاطر نہیں۔ وہ تم سے وہ سب کچھ اگلوالیں گے جو تم اس بارے میں جانتی ہو اور میرا خیال ہے کہ تم نے پورے تجربات کے دوران میرے ساتھ کام کر کے کافی کچھ جان لیا ہے۔ اس لیے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

"بھاڑ میں جاؤ۔ مجھے پاکستان جانا ہے۔ صرف یہاں سے ایئرپورٹ تک میری سیکیورٹی کا مسئلہ ہوگا۔ اس کے بعد میں پاکستان پہنچ جاؤں گی جہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور تمہاری سودے بازی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ پاکستان تو بہت آسان ہدف ہے۔ یہاں تو پھر بھی یہ چھپے ان کے ساتھ برابری کی بنیاد پر مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ ابھی تک کامیاب نہیں ہو پائے ہیں۔"

"جہنم میں جاؤ۔ اپنی اس نحوست کو چائنا کے حوالے کرو اور مجھے اس قید سے آزاد کرو۔"

"نہیں کر سکتا۔ اس کا آخری ٹیسٹ کرنا باقی ہے، ابھی جب تک وہ نہیں ہو جاتا، انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تو کرتے کیوں نہیں ہو ٹیسٹ۔ انتظار کس بات کا ہے۔ اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھے کسی ہونی کا انتظار کر رہے ہو، وہاں پاپا اس قدر بیمار ہیں کہ مجھے ہر صورت ان کے پاس ہونا چاہیے اور تمہارے یہ بیہودہ بہانے......" زل کا غصہ عروج پر تھا۔

"پاپا؟ پاپا تمہارے لیے اتنے اہم کب سے ہو گئے۔ جانتا ہوں میں کہ اصل میں تمہیں اس گھٹیا ڈاکٹر کی یاد ستا رہی ہے۔ بہانہ پاپا کا بنا رہی ہو۔ جیسے بہت ہی پیاری بیٹی ہو تم ان کی۔ ہونہہ۔"

شہریار کی اس بات پر زل کا ضبط جواب دے گیا اور اگلے کئی گھنٹے ان کی لڑائی اپنے عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہوئی اور وہ دونوں اس کے اختتام پر اس نتیجے پر پہنچے کہ اب معاملات کو جلد سے جلد نمٹانا زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ کیونکہ زل نے غصے میں چلاتے ہوئے اسے بتا دیا تھا کہ وہ لیب سے اس کی ریسرچ کا بلیو پرنٹ حاصل کر چکی ہے۔ اگر اس نے دو دن میں ہی اس کی طلاق اور روانگی کا مسئلہ حل نہ کیا تو وہ اسے جیسے چاہے استعمال کرنے کا حق رکھتی ہے اور شہریار نے اس کی بات سن کر اپنا آخری ٹیسٹ کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

دونوں پوری رات جاگ کر اپنے اپنے مسائل کے ممکنہ حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہے اور صبح ہونے تک شاید کوئی بہتر فیصلہ کر کے اٹھ گئے۔

زل واش روم سے باہر آئی تو شہریار ناشتے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اس کے روم میں داخل ہوا۔ اس نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ ہلکے سے مسکرایا بھی۔

"میں نے سوچا کہ بہت ہو گئی۔ ہم آخر کب تک ایک دوسرے کے ساتھ حالت جنگ میں رہیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کے جذبات کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ اس

لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں تمہیں زبردستی یہاں نہیں روکوں گا۔ تمہیں واپس بھیج دیتا ہوں۔ کل ہی تمہارے طلاق کے کاغذات اور پاکستان کا ٹکٹ تمہیں مل جائیں گے۔ تم جب چاہے واپس جا سکتی ہو۔ شاید پھر ہماری کبھی ملاقات نہ ہو سکے تو میں نے سوچا کہ ایک آخری ناشتا میرے ہاتھ کا تو ہونا ہی چاہیے۔ آؤ!"

رِل نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اچھا خاصا ناشتا اور کافی کے مگوں سے بھاپ کے ساتھ اڑتی خوشبو اسے بھی اچھی لگی۔ شہریار کے اس انداز پر کچھ بے یقینی اور کچھ بے چینی کی کیفیت نے اسے الجھن میں ڈال دیا لیکن شہریار کے چہرے پر ایک نارمل اور نرم سی کیفیت دیکھ کر وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ ناشتے کے دوران اس سے ادھر ادھر کی کچھ ایسی باتیں کرتا رہا جیسے اسے رِل کی بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ اسے بلاوجہ باندھ کر رکھنے سے اس کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ اس کی کمزوری بن سکتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ وہ چلی جائے۔ پھر اس نے ایک خاکی لفافہ اس کے سامنے رکھا اور بتایا کہ اس میں اس کی طلاق کے کاغذات ہیں اور ویسے میں زبانی طور پر بھی تمہیں طلاق دے رہا ہوں پھر اس نے زبانی طور پر بھی طلاق کا معاملہ مکمل کر دیا۔

"خوش ہو جاؤ۔ آج سے آزاد ہو تم۔ کل تک ٹکٹ بھی مل جائے تو جب چاہو پاکستان جا سکتی ہو۔"

کافی کا آخری گھونٹ لے کر اس نے مگ ٹرے میں رکھا اور الجھے ہوئے انداز میں اسے ٹرے اٹھا کر مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر جاتا دیکھتی رہی۔ وہ چلا گیا اور وہ بیٹھی سوچتی رہی کہ اٹھ کر ایک اچھا سا شاور لے کر فریش ہو جائے۔ پھر دیکھے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ مگر وہ بیٹھی سوچتی رہی۔ اٹھنے کے بجائے آہستہ آہستہ نیم دراز ہوئی اور کب گہری نیند سو گئی اسے پتا نہیں چلا۔

تھوڑی دیر میں شہریار کی دوبارہ آمد ہوئی۔ اسے گہری نیند میں دیکھ کر ایک سچی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی اور وہ اس کی طرف بڑھا تو ایک کٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک انجکشن اس کے بازو پر لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ اس کے بازو پر ہلکی سی سوجن دیکھ کر سر ہلاتا رہا۔ پھر کٹ میں سے کوئی دوا نکال کر ایک کاٹن بال پر لگا کر اس کے بازو پر رگڑا۔ ایک کاغذ پر کچھ نوٹ لکھے اور واپس ہو گیا۔

وہ گہری نیند سوتی رہی۔

☆☆☆

رات بہت گہری اور تاریک تھی۔ سخت سردی کے سبب ہر شخص اپنے گرم بستروں میں دبکا ہوا گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

لیب کمپلیکس کے سینٹرل ٹاور پر لگا ہوا ڈیجیٹل کلاک رات کے تین بجا رہا تھا۔

کمانڈ اینڈ کنٹرول روم میں لگی بہت ساری اسکرینز میں سے ایک پر کچھ ہلچل سی ہوئی تو گارڈ نے چونک کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔

ایسا لگ رہا تھا کوئی اسکرین کو تاریک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ یہی کیفیت دوسری اسکرین پر بھی نظر آئی تو اس نے خطرے کے سگنل دینے شروع کر دیے۔ فوراً ہی بیرونی گارڈز نے اس سے رابطہ کر کے صورت حال جاننے کی کوشش کی تو اس نے خطرے کی نشاندہی کی۔

"کوئی لیب کی حدود میں چھپ کر داخل ہو گیا ہے۔ اس نے حفاظتی نظام سے کچھ چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ اسکرین تاریک ہو گئی ہے۔ کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ داخل ہونے والا ریزیڈنشل ایریا کی طرف ہے کیونکہ وہیں کا کیمرا ریسپشن نہیں دے رہا ہے۔ فوراً چیک کرو۔ او۔ او۔ او۔ دوسرا اور تیسرا کیمرا بھی بیکار کر دیا گیا ہے۔ جلدی خطرے کا الارم دو۔ جلدی۔" گارڈ نے تناؤ کی کیفیت میں چلا کر کہا۔

اسی وقت پورے کمپلیکس میں ایک خاموش سی ہلچل مچ گئی۔ یوں بھی حالات کی سنگینی کے سبب فاضل احتیاطی تدابیر اختیار کر لی گئی تھیں۔

چند لمحوں میں گارڈز اور کمانڈوز خاموشی سے کمپلیکس کے پورے ایریا میں پھیل گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے ڈاکٹر شہریار کو چیک کرنے کے لیے اس کے گھر کا رخ کیا۔ اندر داخل ہوئے تو وہ اپنے بیڈ روم میں نظر نہیں آیا۔ رِل بھی موجود نہیں تھی۔ انہوں نے پورا گھر چھان مارا۔

دونوں موجود نہیں تھے۔ فوراً ہی انہوں نے الٹرا الرٹ جاری کیا اور حکام بالا کو سوتے سے اٹھا کر یہ بری خبر سنائی۔ تھوڑی ہی دیر میں سچویشن سنبھالنے مختلف ماہرین سے وہ گھر بھر گیا۔ دس منٹ میں ہی انہوں نے اعلان کر دیا کہ رِل تو وہاں کہیں موجود نہیں ہے لیکن شہریار کو نیچے ایک خفیہ کمرے سے بازیاب کیا جا سکتا ہے۔

"کیا ہوا تھا شہریار؟" وہ نڈھال کیفیت میں صوفے پر پڑا تھا اور چار سر فکر مند آنکھوں کے ساتھ اس پر جھکے ہوئے تھے۔ سوال کرنے والا ڈپٹی تھا۔

"وہ گھر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

تب ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ میں فوری طور پر چھلانگ لگا کر بستر سے اتر کر بھاگا اور اس خفیہ کمرے میں پناہ لے لی جس کو سینس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد یہاں کیا ہوا میں نہیں جانتا۔ ویسے رُل کہاں ہے؟'' اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ یہاں کہیں موجود نہیں ہے۔ تم نہیں ملے تو وہ شاید اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

''اوہ میرے خدا! تم لوگ اس کو بچا نہیں سکے۔ اتنے سخت پہرے کے باوجود وہ یہاں گھس آئے اور میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے اور تم کچھ نہیں کر سکے۔''

''تم بھی کچھ نہیں کر سکے شہریار! یہ کمرا ہم نے صرف تمہارے لیے ہی نہیں بلکہ اس کے لیے بھی تیار کروایا تھا جب خود وہاں پناہ لینے گئے تھے تو اسے ساتھ کیوں نہیں لے گئے۔ بیڈ پر وہ تمہارے ساتھ ہی ہوگی نا۔ اپنے ساتھ اسے بھی بچانا تھا تمہیں۔ یہ بہت ضروری تھا اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے تھے لیکن تم نے صرف اپنے آپ کو بچالیا۔ اسے چھوڑ دیا۔ کیوں؟'' اپنی بات ختم کر کے ژیانگ نے گارڈز اور دوسرے سب لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ انہیں نہیں بتا سکتا تھا کہ میاں بیوی ہونے کے باوجود ان کے بیڈروم الگ الگ تھے۔

''تمہاری دریافت جتنی خفیہ رہتی اتنا اچھا تھا۔ اب یہ خبر ان دشمنوں میں عام ہو چکی ہے جو جان پر کھیل کر بھی ہر صورت اسے حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اب تم، تمہاری دریافت سمیت ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکے ہو۔ ہمیں یقیناً کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

ژیانگ کے چہرے کا تاثر کچھ اچھا نہیں تھا۔

''ویسے تمہارے پروجیکٹ کے بلیو پرنٹس اور پروڈکٹ تو غالباً لیب میں ہی ہوں گے۔ ژیانگ! فوراً لیب کی سیکیورٹی کو ہائی الرٹ کرواور ان سے معلوم کرو۔ وہاں تو کوئی انہونی نہیں ہوا۔'' یہ وہی خرانٹ سی شکل والا چینی یو آن تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں خود اس وقت لیب میں ہونا چاہیے۔ اگر مسٹر شہریار اپنی پروڈکٹ اسی وقت ہمارے حوالے کر دیتے ہیں تو ہم اس کی بہتر طور پر حفاظت کر سکیں گے۔ باقی معاملات بعد میں طے ہوتے رہیں گے۔'' ڈاکٹر لی کے لہجے میں بھی سرد مہری محسوس ہوئی۔

''لیکن.... میں......؟'' شہریار کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسی خرانٹ شکل والے نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تمہیں معلوم ہے مسٹر شہریار! تمہاری اس پروڈکٹ اور تمہاری بیوی کی حفاظت کرنے کے چکر میں میرے چار بہترین کمانڈوز مارے جا چکے ہیں۔ ہمارے یہاں کے سیکیورٹی سسٹم کو بار بار کتنا نقصان پہنچا ہے۔ اب اور مزید نقصان ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوگا اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ڈاکٹر لی کی بات مان لی جائے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے اگر انہوں نے تمہاری بیوی کو ٹارچر کر کے اس سے سب کچھ اگلوالیا تو تمہاری پروڈکٹ کی اوقات دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ ہمارے لیے بھی وہ اس لیے بیکار ہو جائے گی کہ ہم سے پہلے اس کا فارمولا دوسروں کے پاس پہنچ جائے گا۔ یعنی طاقتور ترین ہتھیار ہمارے بجائے ان کے ہاتھوں میں ہوگا تو ہم تو صرف اس سے بچاؤ کی تدبیریں ہی ڈھونڈتے رہیں گے۔'' ژیانگ کے لہجے میں بھی کڑواپن تھا۔

''لیکن اس کی ویکسین تو میرے پاس ہی ہے۔ میں تیار کر چکا ہوں۔ صرف آخری مرحلہ باقی ہے۔ اس کا ہیومن ٹیسٹ ہو جائے تو سو فیصد وہ ہمارا ہتھیار ہے۔'' شہریار نے بچاؤ کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا تو لی ہلکے سے ہنسا۔

''شہریار! کیا تم ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر تمہاری دریافت شدہ وائرس کی آر این اے سیکوئنسنگ انہیں مل گئی تو ویکسین بنانا کون سا مشکل کام ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ رُل انہیں کچھ بھی بتا نہیں پائے گی۔ کیونکہ وہ کل سے سخت بخار اور غنودگی کی کیفیت میں ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ انہیں کچھ بھی کام کی بات بتا سکے۔''

''کیا مطلب ہے؟ معمولی بخار کب تک اسے مجبور رکھ سکتا ہے۔ میڈیسن لیتے ہی وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ کیا یہ بات وہ نہیں سمجھ سکتے۔''

ژیانگ نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا تو شہریار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مجرمانہ خاموشی اختیار کرلی۔

''کیا؟ کہیں تم نے ہیومن ٹیسٹ کے لیے اس کا استعمال تو نہیں کرلیا؟ اوہ شہریار!'' ژیانگ نے ملامتی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا اور اسے خاموش دیکھ کر اشارہ کیا۔

''اٹھو۔ چلو۔ کپڑے بدلو۔ ہم ابھی لیب جارہے ہیں۔'' اس کا لہجہ سرد اور بے مہر تھا۔

وہ سب لیب جانے کے لیے نکل گئے اور کمرا خالی ہو گیا۔

☆☆☆

سفید یونیفارم میں ملبوس، چہرے پر ماسک اور ہاتھوں میں سرجیکل دستانے پہنے وہ نرس اندر داخل ہوئی تو

خودکار دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا۔ بیڈ پر پڑی مریضہ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟" اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا حال پوچھا۔

"ڈاکٹر کہاں ہے؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ مجھے کیا ہوا ہے۔" زل نے اس سے پوچھا۔

"میں بتا دیتی ہوں۔ تمہیں شاید فلو کا شدید اٹیک ہوا ہے۔ کل جب تم یہاں آئی تھیں تو بہت تیز بخار میں مبتلا تھیں۔ اب تو مجھے کافی بہتر لگ رہی ہو۔ فکر نہ کرو۔ جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"فلو؟ فلو ہوا ہے مجھے۔ آر یو شیور؟" زل نے کچھ فکر مندانہ انداز میں پوچھا۔ وہ اس سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی لیکن پھر اس پر بے حد نقاہت اور غنودگی کا حملہ ہوا اور وہ آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئی۔

اسی وقت کچھ پیرامیڈکس شفاف پلاسٹک کی کینوپی اور اس سے متعلق بعض دوسری اشیا لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ نرس کو جانے کا اشارہ کیا اور ایک نے بڑھ کر بڑی سی سوونگ اسپرے گن سے زل کے بیڈ کے اوپر نیچے اور خود اس کے اوپر بھی اچھی طرح سینیٹائزر کا چھڑکاؤ کیا۔ اس کے بعد اس پلاسٹک کے خیمے نما کینوپی کو اس کے بیڈ کے اوپر فکس کیا۔ پھر اس کے بھی اندر اور باہر اچھی طرح چھڑکاؤ کر دیا۔

کچھ دیر کے بعد تین دوسرے لوگ اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک یقیناً ڈاکٹر تھا۔ وہ اس کینوپی کے اندر داخل ہوا تو اس کا چہرہ اور ہاتھ محفوظ طریقے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس نے زل کا معائنہ کیا پھر سر ہلاتا ہوا باہر نکل آیا۔

"کیا صورت حال ہے ڈاکٹر؟"

"ویل! اس کی بلڈ رپورٹ دیکھی ہے میں نے۔ یہ تو طے ہے کہ یہ وائرس کا شکار ہوئی ہے۔ آج کل کورونا ہی وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ میرا بھی یہی اندازہ تھا لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ کورونا کا شکار نہیں ہوئی ہے بلکہ کوئی عجیب و غریب نیا ہی وائرس ہے۔ میں نے کانگو، ایبولا، سارس کے علاوہ جتنے بھی وبا کی طرح پھیلنے والے وائرس ہیں، سب سے کمپیئر کر کے دیکھ لیا۔ یہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔"

"اوہ ڈاکٹر! یہ تو کمال ہو گیا۔ اس کا شوہر جس نئے وائرس کو لیب میں کلچر کر رہا ہے، شاید یہ اسی وائرس کا شکار ہو گئی ہے۔ ہم جس پروڈکٹ کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں، وہ خود چل کر ہمارے پاس آ گیا ہے۔ آپ فوراً اس کے سیمپل تیار کر کے ہمیں دے دیں۔ ہم اپنے ریسرچرز کو دیتے ہیں۔ اب یہ ہتھیار ہمارے ہاتھ آ گیا ہے تو ہم موقع ضائع نہیں کر سکتے۔ یہ کئی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ہم اس ایڈیٹ پاکستانی ڈاکٹر کو جو اتنی بڑی بڑی آفرز کر رہے تھے اور وہ مان کر نہیں دے رہا تھا، اب اس کے ہاتھ خالی کر دیے ہیں ہم نے۔ یس..... " اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہنیوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا دے کر اپنے جوش اور خوشی کا اظہار کیا۔

"یس! یہ تو کمال ہو گیا۔ ہم نے کیا صحیح وقت پر چھاپا مارا ہے جس کے ملنے کی امید مدھم ہو رہی تھی، وہ بڑی آسانی سے ہمیں مل گیا۔ گڈ!"

دوسرے نے بھی بھرپور خوشی کا اظہار کیا اور ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو انتہائی سنجیدگی سے ان دونوں کو خوش ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں! یہ اس لڑکی کے ذریعے ہم تک پہنچ تو گیا ہے۔ نہایت خوشی کا مقام ہے لیکن افسوس، میں اس وقت آپ کو کوئی اچھی خبر نہیں دے سکتا۔"

"کیا مطلب ہے ڈاکٹر؟ کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ ہم جیسے ہی اس وائرس کو چھیڑتے ہیں، یہ ڈیڈ ہو جاتا ہے۔ کمپلیٹلی ڈیڈ۔ اس کے بعد یہ صرف کوڑا کچرا ہے۔ ہم اس کی ماہیت جان سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی فنکشن۔ بیکار ہے میں آپ کو سیمپل دے بھی دوں تو کوئی بڑے سے بڑا ایکسپرٹ بھی اس کو جانچ کر کچھ بتا نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی اس پر کافی کام باقی تھا۔ وقت سے پہلے ہی اس کا ہیومن ٹیسٹ کر لیا گیا ہے اور خوامخواہ اس اچھی لڑکی کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا ہے۔"

"اوہ نو! سب برباد ہو گیا۔ ساری محنت خاک میں مل گئی۔ اب پھر نئے سرے سے سب کچھ کرنا پڑے گا۔" ایک نے چیختے ہوئے اپنے سر کے بال دونوں ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

"کوئی صورت ہو ڈاکٹر۔ کوئی ایسا طریقہ کہ ہم اس کے بارے میں سب کچھ جان سکیں۔" دوسرے نے تحمل سے پوچھا تو بھی اس کی مایوسی چھپ نہیں سکی۔

"میرے حساب سے تو نہیں ہے کوئی طریقہ لیکن آپ چاہیں تو دوسرے ایکسپرٹ سے رائے لے سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ سے اچھا ایکسپرٹ کون ہو سکتا ہے بھلا۔ ٹاپ پرسن ہیں آپ اس فیلڈ میں۔ یعنی اب یہ لڑکی بیکار ہے ہمارے لیے تو اس کو واپس کر دیں۔"

"جیسا آپ لوگ مناسب سمجھتے ہوں۔ ویسے بھی اس کے ساتھ جو ظلم کیا گیا ہے تو یہ زیادہ عرصے زندہ تو نہیں رہ سکے گی۔ ہمیں خواہ مخواہ اس کی دیکھ بھال میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کرنی پڑیں گی۔ بہتر ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ ہمارے کسی کام کی نہیں ہے یہ۔"

ڈاکٹر نے مایوسی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھائے تو وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ خودکار دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ بند ہوا تو مریضہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی لبریز آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں ہو گیا۔ شاید وہ ان کی باتیں سن رہی تھی اور اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ بس اس کی زندگی کی شام ہو چکی ہے۔ کچھ ہی دن جاتے ہیں کہ وہ منوں مٹی اوڑھ کر سو جانے والی ہے۔ آنکھیں بند کیں تو ذہن کے دریچے کھل گئے اور وہاں سے جھانکنے والی پہلی شخصیت مراد موسیٰ کی تھی۔

"ہمارے مقدر میں ملنا تھا ہی نہیں۔ کاش اس وقت مراد یہاں ہوتا تو میں اس کے ہاتھوں کے جادوئی لمس سے دوبارہ زندہ ہو جاتی۔ کاش..... کاش..... مرنے سے پہلے ایک بار اسے دیکھ سکتی۔ کاش..... کاش۔" ان بہت سارے کاش کے درمیان سے بے ہوشی اسے اچک کر لے گئی۔

رات گئے نہ جانے کب اس کا احساس جاگا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ پورے جسم میں شدید درد کی کیفیت کے سبب اس کے منہ سے آہ نکلی۔ بے چین ہو کر اس نے سر کو گھمایا تو اس کو کینوپی کے پیچھے کوئی کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ نائٹ بلب کی ہلکی روشنی میں وہ اسے پہچان نہیں پائی کہ وہ کون ہے۔ تھوڑی دیر دیکھتی رہی پھر کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

"تمہارا ایک دوست۔" جواب ملا اور کمرے کی روشنی تھوڑی بڑھا دی گئی۔

"اوہ... ڈینیل! تم یہاں کیسے؟ کیا تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جو مجھے زبردستی اٹھا کر لائے ہیں؟"

"نہیں۔ میں تو صرف تمہارا دوست ہوں۔ تمہیں کوئی دوسرے لوگ اٹھا کر لائے ہیں۔ میں نے تو اتفاق سے تمہیں دیکھ لیا۔ معلوم ہوا کہ بہت بیمار ہو۔ علاج کے لیے یہاں لائی گئی ہو۔ تو میں رہ نہیں سکا اور تمہاری خیریت معلوم کرنے چلا آیا۔ کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"بہت سخت تکلیف میں ہوں۔ کیا تم مجھے اس تکلیف سے نجات دلوا سکتے ہو؟"

"ڈاکٹرز تمہارا علاج کر رہے ہیں۔ تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ تمہیں انجکشن دے کر گئے ہیں۔" ڈینیل نے اسٹینڈ پر لگی ڈرپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں ڈینیل! اب میں کبھی ٹھیک نہیں ہو پاؤں گی۔"

"کیوں؟ ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ تھوڑے دن لگیں گے۔ تم ٹھیک ہو کر اپنے گھر چلی جاؤ گی۔ مایوسی کو دل میں جگہ مت دو۔"

"نہیں ڈینیل! میں جانتی ہوں کہ مجھے جو روگ لگایا گیا ہے، اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اب تو بس گنے چنے دن ہیں۔ پھر تمہاری اس دوست کا چہرہ تمہیں کبھی نظر نہیں آئے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمین کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔" اس کی آواز بھرا گئی تو ڈینیل بھی آزردہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رل کو اپنی بیماری کی وجہ معلوم ہو چکی ہے۔ اس نے شاید ڈاکٹرز کی باتیں سن لی تھیں۔ یا پھر اس کے طریقۂ علاج سے اندازہ کر لیا ہے۔

"سوری مائی فرینڈ! کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔ اگر کچھ کر سکتا ہوں تو بتاؤ۔" اس کی بات سن کر رل نے اسے غور سے دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کب تک رہوں گی اور مجھے کہاں بھیجا جائے گا۔"

"ڈاکٹرز نے تو ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔ وہ اب صرف تمہاری تکلیف کم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انجکشن اور دوائیں یہی کام کر رہی ہیں لیکن اصل بحالی جب ہو گی جب تم بھی اپنی مضبوط قوت ارادی کو کام میں لاؤ گی اور اسی کے سہارے تم اس بستر کی قید سے جلد سے جلد آزاد ہو پاؤ گی۔ کیا تم ایسا کرو گی۔ اگر تم اپنے لیے ایسا کچھ کرنا چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے لیے سب کچھ کروں گا جس سے تم ایک نارمل لائف کی طرف آؤ اور سکون سے اپنے گھر جاؤ۔"

"میں پوری کوشش کروں گی اور تمہاری راہنمائی میں۔ اپنی قوت ارادی کا سہارا لے کر اس بستر سے کھڑی بھی ہو جاؤں گی لیکن یہ سب تمہارے ایک وعدے سے مشروط ہے۔"

"میرا وعدہ؟ کیسا وعدہ چاہتی ہو؟"

"یہ وعدہ کہ اگر میں اپنے قدموں پر کھڑی ہو جاتی ہوں تو تم مجھے شہریار کے گھر نہیں بلکہ میرے اپنے وطن پاکستان بھجوا دو گے۔ میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میں

...پنے ملک میں مرنا چاہتی ہوں۔"
"وہاں تمہارا انتظار کرنے والے کون کون لوگ ہیں؟"
"ویسے تو کوئی بھی نہیں لیکن شاید میرے پاپا ہوں ...ور مراد ہو۔ مراد مومن۔ جس کا میں نے ساری زندگی بہت ...بے چینی سے انتظار کیا ہے۔"
"اوہ! تم اس کے لیے اپنے ملک جانا چاہتی ہو؟"
...نیل نے پوچھا تو اس نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔
"میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں تمہارے ملک ...جوا دوں لیکن اس کے لیے تمہیں اپنے پیروں پر چلنا ہوگا۔ ...تنا لمبا سفر بیماری میں تو کر نہیں سکتیں۔ اس لیے ہمت کرو۔"
"یہ سب تمہارے وعدے سے مشروط ہے۔ اگر تم ...ھی مجھے اس بات کا یقین دلا دو تو میں شاید بہت جلد اپنے ...روں پر کھڑی ہو جاؤں ورنہ پھر میں یہیں اسی بستر پر موت ...ا انتظار کرنا پسند کروں گی۔ کیونکہ مجھے اپنے شوہر کے ...گھر نہیں جانا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔"
...استانبول کر وہ ہانپنے لگی تو ڈینیل نے ہاتھ اٹھا کر ...سے تسلی دینے کی کوشش کی۔
"آل رائٹ...... آل رائٹ! تم ٹھیک ہو جاؤ۔ میں ...تمہارے جانے کے انتظامات کرتا ہوں جب تمہیں دوست ...مانا ہے تو دوستی نبھاؤں گا بھی۔ بس ہمت پکڑو اور ٹھیک ...ہونے کی کوشش کرو تاکہ آٹھ نو گھنٹے کا لمبا ہوائی سفر کرنے ...کے قابل ہو جاؤ۔"
"کیا تم سچ مچ ایسا کرو گے؟ صرف مجھے تسلی دینے ...کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو؟"
"بالکل بھی نہیں...... کہہ دیا ہے تو کرنا بھی ہوگا۔ میرا ...یقین کرلو۔"
"ہاں یقین کرنے کو دل تو چاہ رہا ہے لیکن میرے کسی ...قسم کے کاغذات میرے پاس نہیں ہیں۔ پاسپورٹ، آئی ...ڈی، ڈرائیونگ لائسنس یا کچھ بھی اس سے متعلق۔"
"کوئی بات نہیں۔ میں سب کچھ تیار کروا دوں گا۔ ...نہیں تو تمہارے گھر سے لے آؤں گا۔ مجھے جب کچھ کرنا ...ہے تو کسی رکاوٹ کو خاطر میں لانے والا نہیں ہوں میں۔ ...و چار دنوں میں ہی تمہارے سارے کاغذات تیار ہو کر ...جائیں گے۔ سو ڈونٹ وری۔ بی چیئر۔ او کے!"
"ون تھنگ مور۔ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے ...دی ہے۔ وہ کاغذات بھی وہیں ہوں گے۔ انہیں حاصل کرنا ...بھی بے حد ضروری ہے۔"
"او کے...... مل جائیں گے۔ کچھ اور حکم ڈیئر لیڈی!"

ڈینیل خوش دلی سے مسکرایا تو اس نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔
"گڈ...... گڈ سائن۔ تمہاری مسکراہٹ اچھی امید دلا رہی ہے۔ اسی طرح مسکراتی رہو۔ تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ او کے۔ بائے۔"

☆☆☆

ژیا نگ نے ایک مرتبہ پھر گھڑی دیکھی۔ مقررہ وقت میں ابھی دو منٹ باقی تھے۔ وہی شاید کچھ جلدی آ گیا تھا۔ یہ ایک مال کا فوڈ کورٹ تھا جہاں اس نے اس اجنبی غیر ملکی کو ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک بہت اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ حوالہ کیونکہ شہریار کا تھا، اس لیے ژیا نگ نے ملنے کے لیے ٹائم دے دیا تھا اور ایک پبلک پلیس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہ ملاقات غیر اہم نظر آئے۔ اتفاقی یا محض اوور آ کپ آف ٹی۔
اسی وقت وہ اجنبی اس کے سامنے کھڑا ہوا بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔
"ہیلو! میں ڈینیل ہوں۔ میری آپ سے ملاقات طے تھی۔ امید ہے آپ کو میرا انتظار کرنا نہیں پڑا ہوگا۔" وہ سامنے کھڑا اپنی گہری نیلی آنکھوں میں خوشگوار تاثر لیے اسے دیکھ رہا تھا۔
"اوہ مسٹر ڈینیل! آپ ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ تشریف رکھیں۔" وہ بیٹھا تو ویٹر کافی کے دو کپ سامنے رکھ گیا۔
"کہیے! کون سی اہم بات کرنا چاہتے تھے آپ۔ میں منتظر ہوں۔"
"بات ڈاکٹر شہریار کی بیوی کی ہے۔ اسے لوگوں نے اس لیے اہم سمجھا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو اسسٹ کرتی رہی ہے۔ اس لیے اس کے منصوبے کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوگی۔ مگر حقیقت جو سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ اسے ڈاکٹر نے اصل معاملات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ وہ صرف اس سے وہ کام لیتا رہا جو بالکل غیر متعلق تھے اس لیے تم لوگوں کے لیے اتنی محنت سے اغوا کرنے کے باوجود وہ بیکار ہو گئی۔
اب تم کیا چاہتے ہو؟" ژیا نگ نے سنجیدگی سے سوال کیا۔
"صرف اس کے لیے انسانی ہمدردی۔" ڈینیل کے لہجے میں تاسف تھا۔
"میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"یہ بات اب تک تو تم لوگوں کو بھی معلوم ہو گئی ہوگی کہ اس کے ساتھ بہت بھیانک ظلم کیا گیا ہے۔ اس کو جان بوجھ کر وائرس کا شکار بنا دیا گیا۔ شاید اس کے ذریعے ہیومن

ٹیسٹ کیا گیا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر۔ اب وہ موت کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ شاید چند دنوں کی بات ہے۔ اس کی کہانی ختم ہونے والی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ اپنی اس کنڈیشن کے بارے میں جان گئی ہے۔ بہت دکھی، بہت آزردہ ہے۔ تمہیں اندازہ ہے؟"

"ہاں! شہریار نے بہت برا کیا ہے اس کے ساتھ۔ ہم بھی اب اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ سوائے افسوس کے۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کے دکھ کا اندازہ کر سکتا ہوں میں۔" ژیانگ کے لہجے میں تاسف تھا۔

"کیا تم اس کے ساتھ کوئی ہمدردی کر سکتے ہو؟ اسے مرنے والے کی آخری خواہش سمجھ لو۔"

"ہاں کہو۔ اگر میں کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا۔"

"اس نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ اپنی آخری سانسیں اپنے وطن میں لینا چاہتی ہے اور اپنی مٹی میں دفن ہونے کی خواہش مند ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسے پاکستان بھجوا دیا جائے۔ اس نے اس سلسلے میں مجھ سے مدد مانگی ہے۔ میں دل و جان سے اس کی یہ مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے سفری کاغذات اور خاص طور پر اس کی طلاق کے کاغذات اسے درکار ہیں۔"

"کیا؟ کیا شہریار اسے طلاق دے چکا ہے؟ اس نے بتایا نہیں۔"

"تم پوچھو گے تو بتا دے گا۔ اس نے اس لڑکی سے زبردستی شادی کی تھی۔ دھوکا دے کر۔ صرف اس لیے کہ اسے اپنے پروجیکٹ کے لیے ایک قابل بھروسا اسسٹنٹ چاہیے تھی اور یہ لڑکی اس کے معیار پر پوری اترتی تھی۔ اس سے کام لینے کے بعد جو کچھ شہریار نے اس کے ساتھ کیا، اس نے لڑکی کے دل میں اس کے لیے شدید نفرت بھر دی ہے۔ اب وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اب شہریار کے پاس جانا نہیں چاہتی۔ صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ پاکستان چلی جائے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اسے ایسا سوچنا بھی چاہیے۔ اتنے ظالم شخص کی شکل نہ دیکھنے کا فیصلہ بالکل جائز ہے۔ وہ جب چاہے جا سکتی ہے۔"

"ہاں! اسی لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں کیونکہ اس نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ جیسے بھی ہو، میں اس کے جانے کا انتظام کروں۔ ورنہ وہ یہیں اسی بستر پہ لیٹ کر مرنا پسند کرے گی۔ شہریار کے گھر نہیں جائے گی۔ اس کی ضرورت کے تمام کاغذات اس کے گھر میں پڑے ہیں اور میں یقیناً اس کے گھر میں داخل ہونے کا اجازت نامہ نہیں رکھتا۔ اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکو گے کیا؟"

"ہم کل اسی جگہ اور اسی وقت ملتے ہیں۔ کاغذات تمہیں مل جائیں گے۔ میری ہمدردیاں اور میری نیک خواہشات اس تک پہنچا دینا۔"

ژیانگ نے اٹھتے ہوئے کہا تو ڈینیل بھی کھڑا ہو گیا۔

"تھینکس مسٹر ژیانگ۔ بائے!"

☆☆☆

سفارتی پورٹ فولیو رکھنے والے ایک شخص کے ساتھ ڈینیل اسے ائرپورٹ تک رخصت کرنے آیا تھا۔

"رل! تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں تمہیں اپنی ایک بہترین دوست کے طور پر ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ میری دعا ہے کہ گاڈ تمہیں ایک لمبی اور صحت مند زندگی دے اور مجھے اپنی اس دعا کے قبول ہونے کی ایک امید سی ہو گئی ہے۔ کیونکہ پچھلے دنوں تمہاری بدترین حالت دیکھنے کے بعد ایسی امپروومنٹ کی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا جو میں نے تم میں دیکھی۔"

"میں بھی اپنے ذہن میں ایسے الفاظ ڈھونڈ نہیں پا رہی ہوں جن سے میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ تم نے اپنی مہربانیوں سے ایک مرتی ہوئی لڑکی کو دوبارہ زندگی کی طرف آنے پر مجبور کر دیا۔ چند دن کی ہی سہی لیکن تم سوچ بھی نہیں سکتے یہ میرے لیے کتنی قیمتی ہے۔ بہت شکریہ ہر اس مہربانی کا جو تم نے میرے ساتھ کی۔" رل نے ایک حزنیہ مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا کہ وہ نیلی آنکھیں سمندر ہو گئی ہیں۔ پانی لہریں لیتا صاف نظر آیا تھا اسے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور اس کے چہرے پر رنگ بدلتے رہے پھر ایک طویل سانس لے کر وہ ہلکے سے بولا۔

"کاش میں تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ کچھ کر سکتا۔ تمہیں اپنی زندگی کا آدھا حصہ ہی دے سکتا۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم زندہ رہو اور اس زندگی میں وہ سب کچھ تمہیں ملے جس کی تم آرزومند ہو۔ ٹیک کیئر۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ اس لیے کہ یہاں کوئی تمہاری زندگی اور صحت کے لیے ہمیشہ بہت دعا گو رہے گا۔" اس کا لہجہ، اس کے الفاظ چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ اس کا دل گداز ہو چکا تھا۔ رل کے لیے۔ رل کو کچھ حیرت بھی ہوئی اور وہ بہت متاثر بھی ہوئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنے آنسو روکے اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گڈ گرل! جاؤ۔ تمہارا وطن اور تمہارے لوگ تمہارا

انتظار کر رہے ہیں...... اور ہاں! رابطے میں رہنا۔ میں ہر روز تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔''

وہ تل سے گزر کر اس کو جہاز کے گیٹ تک لے کر آیا تھا۔ جانے کا اشارہ کر کے اور ہاتھ ہلا کر بائے کہتا ہوا وہ واپسی کے لیے مڑا تو رل نے اسے آواز دی۔

''ڈینیل! ایک منٹ۔ یہاں آؤ۔'' وہ آیا تو اس نے اپنے گلے میں پہنا ہوا تعویذ نما لاکٹ اتار کر اسے دیا۔

''یہ میری طرف سے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔ جانتے ہو یہ کیا ہے؟''

''ہاں۔ جانتا ہوں۔ اس چھوٹے سے باکس میں تمہاری کچھ ہولی ورسز ہوتی ہیں جو تم لوگ گاڈ کی طرف سے سیفٹی پانے کے لیے پہنتے ہو۔''

''ہاں لیکن یہ وہ نہیں ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی یو ایس بی ہے اور اس میں کروڑوں لوگوں کے قتل عام کا فارمولا محفوظ ہے۔ اس میں شہریار کا تجربہ کیا ہوا وہ ہولناک فارمولا ہے جسے شہریار کے پاگل پن نے تخلیق کیا ہے۔ جس کے لیے تم سب لوگ، چینی لوگ اور شہریار پاگل ہو رہے ہیں۔ میں نے شہریار سے چھپ کر اسے یو ایس بی میں محفوظ کیا تھا۔ وہ اس بارے میں نہیں جانتا۔ میری طرف سے یہ ہولناک تحفہ قبول کرو اور جب تمہارا ضمیر کروڑوں لوگوں کے قتل عام کے لیے راضی ہو جائے تو اسے ڈی کوڈ کر کے استعمال کر لینا۔ بے پناہ دولت کے انبار تمہیں مل جائیں گے جو تمہیں بے انتہا خوشیاں دیں گے۔ میں تمہارے کیے ہوئے بہت بڑے احسان کے بعد بدلے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ تھینک یو اگین۔ اللہ حافظ۔'' وہ مسکراتی ہوئی مڑی اور جہاز میں داخل ہو گئی۔ ڈینیل اپنی ہتھیلی پر رکھے اس تعویذ نما لاکٹ تیز بم کو دیکھتا رہا۔ ایک الجھن سی اس کی آنکھوں میں لہرائی۔ اس نے مٹھی بند کر کے واپسی کی طرف قدم بڑھائے اور ایئر پورٹ سے باہر آ گیا۔ باہر نکلنے سے پہلے وہ اس یو ایس بی کو ڈسٹ بن میں پھینکنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

وہ ایئر پورٹ کے لاؤنج سے باہر آئی تو ایک ہجوم اور گہما گہمی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس نے بھی متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے لینے کوئی آنے والا نہیں ہے۔ کسی کو یہاں اس کا انتظار نہیں ہے۔ پھر بھی دل میں ایک چھوٹی سی خواہش نے چٹکی لی لیکن وہ سر جھٹک کر باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئی۔

اچانک کسی نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ کسی کے ہاتھ کا لمس نہیں تھا، بلکہ زندگی کی ایک لہر تھی جو ہاتھ سے ہوتی ہوئی اس کے پورے صحرائی وجود کو زندگی بخشتی جا رہی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''مراد؟'' اس نے آنکھیں بند کیے کیے اپنے آپ سے سرگوشی کی تو ایک ہنستا مسکراتا وجود اس کے سامنے آ گیا۔ وہ سچ مچ مراد ہی تھا جس نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

''ہاں میں مراد۔ میں تو کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ شکر ہے تم آ گئیں۔ آؤ۔'' اس نے اس کا مختصر سا بیگ اس کے ہاتھ سے لیا اور ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا اور رل تو جیسے گم صم سی ہو کر صرف اس کی جانب دیکھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ کب اسے گاڑی میں بٹھا کر اس کے گھر لے آیا، اسے معلوم ہی نہیں ہوا۔

گھر پہنچ کر مراد نے ہی اس کو سہارا دے کر لاؤنج میں لا کر صوفے پر بٹھایا۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' اس نے سوال کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ چند لمحوں میں ہی وہ اس قدر روئی کہ نہ جانے کب کب کے دکھ اس کے آنسوؤں کے ساتھ بہنا شروع ہو گئے۔ وہ افسردہ نظروں سے اسے خاموشی سے روتا دیکھتا رہا کیونکہ جانتا تھا کہ اس وقت کا رونا اس کی بہتری کے لیے کتنا ضروری تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آ رہی ہوں؟'' کچھ دیر بعد وہ سنبھلی تو اس نے مراد سے پوچھا۔

''پچھلے پانچ سالوں میں تم کہاں ہو، کیا کر رہی ہو، اور کس حال میں ہو۔ مجھے سب کچھ پتا تھا تو یہ کیسے معلوم نہ ہوتا کہ آج تم یہاں آ رہی ہو۔ کل مجھے پتا چلا تھا تو کل سے آج تک کا وقت گزارنا کتنا کٹھن، کتنا مشکل تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔'' مراد نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ الجھ گئی۔

''تمہیں یہ اطلاع کس نے دی؟ یہ تو کسی کو بھی پتا نہیں تھا۔''

''کسی ڈینیل نام کے بندے کی میل آئی تھی میرے پاس۔ اسی نے تمہارے آنے کا بتایا تھا۔''

''اوہ ڈینیل! کتنے احسان کیے ہیں تم نے مجھ پر۔'' اس نے آنکھیں میچتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ پھر چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

''مراد! پاپا کہاں ہیں؟ وہ یقیناً یہاں نہیں ہیں۔ اسی لیے تم یہاں ہو۔ کہاں ہیں؟''

''تم ایسا کرو، فریش ہو جاؤ۔ میں تمہیں ان کے پاس لے کر چلتا ہوں۔ وہ بھی بڑی شدت سے تمہارا

''اللہ بچائے نوجوانوں سے''

انتظار کر رہے ہیں۔ خالدہ بی! آپ ذرا چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا سا بنوا دیں کی خانساماں سے۔ آپ کی بی بی اتنے دن بعد آئی ہیں۔ کچھ خاطر تواضع تو کریں۔''

مراد نے اس گھر کی پرانی کیئر ٹیکر سے کہا تو رل نے چونک کر دیکھا۔

''خالدہ بی! آپ ابھی تک ہیں یہاں؟'' اس نے سوال کیا تو خالدہ بی نے بھری ہوئی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئیں۔

وہ پاپا کا اپنا اسپتال تھا جہاں مراد اس کو لے کر آیا تھا۔ ماسک اور دستانے پہنے وہ اس پرائیویٹ روم میں داخل ہوئی تو بیڈ پر پاپا کو دیکھ کر رک گئی۔

''یہ لیجیے سر! آپ کی بیٹی کو لے آیا ہوں اور اب آپ کو بستر سے اٹھ کر اس سے ملنا پڑے گا۔'' مراد نے خوشگوار لہجے میں انہیں مخاطب کر کے کہا، تو وہ بھی ایک خوشگوار سے اضطراب میں مبتلا ہو گئے۔ مراد نے آگے بڑھ کر انہیں اٹھا کر بٹھایا تو انہوں نے رل کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ وہ حیران ہو رہی تھی۔ ایک تو مراد سے اتنے قریب اس کے پاپا پھر جنہوں نے کبھی اسے پیار سے مخاطب نہیں کیا تھا آج اپنی بانہیں اس کے لیے پھیلائے ہوئے تھے۔ وہ شش و پنج میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

''آگے آؤ رل! یہ اٹھ کر اتنی دور نہیں آ سکتے۔'' مراد نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بے یقینی میں گھری آگے بڑھی تو پاپا نے اسے بانہوں میں لے کر گلے لگا لیا۔

''پاپا! شہر یار بہت برا تھا۔ بہت ہی برا۔'' وہ روتے روتے ان کے کان میں منمنائی۔

''جانتا ہوں بیٹا۔ جانتا ہوں۔ وہ کتنا بڑا سازشی اور مکار ہے۔ اچھی طرح جان گیا ہوں میں۔''

''آپ کیسے جانتے ہیں؟ کیا آپ میرے حالات سے باخبر تھے۔ کیونکہ میں نے تو آپ کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔''

''ہاں مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ اس وقت جب میں بہت بیمار ہو گیا تھا، ورنہ میں وہاں آ کر تمہیں لے جاتا اور تمہارے بارے میں سب کچھ اس ڈاکٹر مراد نے بتایا۔'' انہوں نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے پاپا کو کیا بتایا مراد؟''

''تمہارے حالات اور شہر یار کی سازشوں کا احوال۔ تم کن کن مشکلوں سے گزریں۔ سب کچھ بتایا میں نے سر کو۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ ہمارے درمیان تو کوئی رابطہ بھی نہیں تھا۔'' اس کی بات سن کر مراد نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''پھر بتاؤں گا کبھی۔ فی الحال تو میں ذرا ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں۔ ڈیوٹیز چیک کرنا ہیں۔ سر! اگر آپ کی اجازت ہو؟''

''ہاں ضرور۔ اسٹاف تمہاری جان کو رو رہا ہوگا اور مریض بیزار۔ جاؤ جاؤ۔ شاباش۔'' انہوں نے خوشدلی سے ہاتھ اٹھا کر اجازت دے دی۔ رل یہ سب حیران ہو کر دیکھ رہی تھی۔

''ہمارے اسپتال کا آر ایم او ہے ڈاکٹر مراد۔ بہت ہی اچھا انسان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں نہ جانے کب کا مر کھپ چکا ہوتا۔ اس کو دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ کاش خدا نے مجھے بیٹا دیا ہوتا۔ وہ بھی اس جیسا تو مجھے زندگی میں شاید کسی چیز کی کمی نہ ہوتی لیکن خیر اب یہ مجھے مل گیا ہے تو بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوتی اور اب تو تم بھی آ گئی ہو۔ ہم مل کر ایک

ی زندگی گزاریں گے انشاء اللہ۔"

ان کی بات سن کر رل حیرت کی انتہاؤں پر تھی۔

"یہ معجزہ کیسے ہوا۔ آپ تو ڈاکٹر مراد سے بہت سخت
رت کرتے تھے۔ پھر یہ سب؟"

"ہاں! یہ بھی شہریار کی کارگزاریوں میں سے ایک
ہے۔ اس نے اس کا ایک بہت ہی غلط امیج بنا کر پیش کیا۔
بھی، پیسے اور اسٹیٹس کا بھوکا۔ مطلب پرست اور کردار کا
ہلا۔ نہ جانے کیا کیا لیکن پھر یہ اسی کی ہمت تھی کہ اس نے
پنے بارے میں اس قسم کی ساری غلط فہمیوں کو ایسے دھو دیا
د اس کی شفاف شخصیت سامنے آگئی۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ فی
حال تو میں تم سے شرمندہ ہوں کہ میں نے شیری کی باتوں
ں آکر تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کیں۔ میں اب ان
اری زیادتیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس طرح پاپا؟ کیسے تلافی کریں گے۔ اب تو
ت گزر چکا ہے اور جو گزر گیا' اسے واپس نہیں لایا جا
سکتا۔ اس بات کو بھول جائیں۔"

"نہیں رل! میں جانتا ہوں۔ تم مراد کو اور وہ تمہیں
ت زیادہ پسند کرتے ہو۔ اب میں شہریار کا سایہ بھی تم پر
ہیں پڑنے دوں گا۔ تمہاری شادی مراد سے کروں گا اور
ب تک یہ ہو نہیں جاتا، میں اس دنیا سے جانے والا نہیں
وں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو رل کی آنکھیں
یگ گئیں۔ وہ ایک حسرت بھری اداس سی مسکراہٹ سے
ہیں دیکھتی رہی۔

☆☆☆

"تم میری سالوں کی محنت پر زبردستی اپنا حق جتا
ہے ہو۔ میرا یہ پروجیکٹ میرا زندگی بھر کا سرمایہ ہے۔
تر ہے اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔ ویسے بھی اس کی
ور میری حفاظت تمہاری ذمے داری تھی۔ اگر اس میں کہیں
وئی دراڑ پڑی ہے تو اس کا ذمے دار میں نہیں ہوں بلکہ
مہارے اس فیلیئر کی وجہ سے۔ میں کتنی مشکلوں میں گھر گیا
وں۔ اس کا شاید تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم اگر یہ لینا ہی
چاہتے ہو، تو اسے خریدنا ہوگا تمہیں۔ میں اتنی محنت کے بعد
الی ہاتھ نہیں رہنا چاہتا۔ میرے آئندہ کے بھی کچھ پروگرام
یں جو پیسے کے بغیر چل نہیں سکتے۔ پھر میری بیوی بھی غائب
ہے اور اسے تم اب تک بازیاب نہیں کروا سکے۔ اس کی مدد
کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اسے بازیاب کرواؤ۔"

یبن میں وہ چاروں موجود تھے اور شہریار آج پہلی مرتبہ اس
طرح گرج برس رہا تھا۔ ژیانگ اور ڈاکٹر لی کے علاوہ وہ
خرانٹ چینی بھی موجود تھا جس کے ذمے یہاں کی سیکیورٹی تھی
اور براہ راست زک اسی پر پڑ رہی تھی۔ اس لیے وہ کینہ توز
نظروں سے شہریار کو گھور رہا تھا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ ہم تم سے تمہاری یہ
دریافت چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں؟" لی نے تحمل سے پوچھا۔

"میری جگہ تم ہوتے تو تمہیں بھی ایسا ہی لگتا کیونکہ
اپنی غلطیوں کا ذمے دار بھی تم مجھے ٹھہرا کر مجھ سے میری
دریافت ہتھیانے کی کوشش کر رہے ہو حالانکہ میں تم سے
وعدہ کر چکا ہوں کہ یہ تمہاری ہی ہوگی لیکن اس کی قیمت
ادا کرنے کے بعد۔"

"ہم وعدہ خلاف نہیں ہیں۔ جو طے ہو چکا ہے، ہم
وہی کریں گے لیکن تم جانتے ہو، ابھی تمہارا کام نامکمل ہے۔
جب تک اس وائرس اور اس کی ویکسین کا ہیومن ٹیسٹ نہیں
ہو جاتا، ہمارے لیے یہ بیکار ہے۔" ژیانگ نے اسے
سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اسی سے الجھ پڑا۔

"اس کے لیے ضروری ہے کہ تم میری بیوی کو
بازیاب کروا کر لاؤ۔ کیوں، کیا، کیسے والے سوال کیے بغیر۔
کیونکہ میں تمہارے غیر ضروری سوالات کے جواب نہیں
دے سکتا۔ مجھے وہ ہر صورت میں چاہیے۔ اس کے بغیر میرا
کام مکمل نہیں ہو سکتا۔" وہ چلایا۔

"اور اگر وہ نہ ملی۔ وہ بھی ایک باقاعدہ ریسرچر ہے۔
تمہارے پروجیکٹ میں شریک رہی ہے۔ تمہارے کام کے
بارے میں، پورا نہیں تو بھی بہت کچھ جانتی ہوگی۔ جو اسے
لے گئے ہیں، وہ اسے یوں ہی تو نہیں چھوڑ دیں گے۔ سب
کچھ اگلوا لیں گے۔ چاہے اس پر کتنا ہی ٹارچر کیوں نہ کرنا
پڑے۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ ٹارچر سہہ نہ پائے۔ ذہنی
معذور ہو جائے۔ یا جان سے ہی گزر جائے تو پھر تم کیا کرو
گے؟ اسے بھول جاؤ کوئی اور راستہ دیکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر تم یہ ذمے داری اٹھاؤ۔ مجھے کہیں
سے بھی کوئی رضاکار لا کر دو۔ تمہارے ہاں جیلیں بھی تو ہوں
گی اور ان میں موت کی سزا پانے والے قیدی بھی ہوں
گے۔ ایسے ہی کسی قیدی کا بندوبست کر لو۔ یہ تمہارے لیے
مشکل نہیں ہوگا۔"

"نہیں۔ ہمارے لیے یہ بہت مشکل ہے کیونکہ
ہمارے قانون میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہم خلاف
قانون کوئی کام کر نہیں سکتے۔ ویسے بھی موت کی سزا پانے
والے قیدیوں کو ہم رکھ کر پالتے نہیں ہیں۔ وہ فوراً ہی
فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔

ہماری جیلوں میں سزائے موت کا کوئی قیدی نہیں ہوتا۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میں ایسا کرتا ہوں کہ اس سارے فساد کو آگ لگا دیتا ہوں۔ سارے پروجیکٹ اور میری سالہا سال کی محنت کو اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ کر دیتا ہوں۔ تاکہ سارے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔" شہریار بے بس ہو کر اپنے بال نوچنے لگا۔ وہ تینوں اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی پاگل ہو۔

"ویسے میں تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ تمہاری بیوی پاکستان پہنچ گئی ہے۔" ڈیانگ نے جیسے اس کے کان میں کوئی صور پھونکا تو وہ حیرت کی زیادتی سے گنگ ہو کر رہ گیا۔

"کک۔۔کیا؟ وہ پاکستان کیسے جا سکتی ہے؟ اس کے تمام ضروری کاغذات میرے پاس ہیں۔ وہ ان کے بغیر نہیں جا سکتی۔ تمہیں یقیناً غلط اطلاع ملی ہے۔"

"نہیں۔ ہماری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔ اس کی روانگی کا سارا ریکارڈ ہم نے چیک کر لیا ہے۔ وہ وہاں پہنچ چکی ہے۔ اس کی تصدیق بھی کروائی گئی ہے۔ اس وقت وہ کراچی میں ہے۔"

"او مائی گاڈ! ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے بلواؤ ڈیانگ! اسے کسی بھی بہانے سے یہاں بلواؤ۔ کسی بھی طرح۔ اس کو ہر صورت یہاں آنا ہوگا۔"

"وہ سخت بیمار ہے اور اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ سفر کر سکے۔ ویسے بھی اگر وہ آنا نہ چاہے تو زبردستی تو نہیں کی جا سکتی نا۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ تم وہاں جاؤ اور اگر وہ آ سکے تو لے آؤ۔"

ڈیانگ نے تجویز پیش کی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن اسے خطرہ تھا تو اپنے ماموں سے۔ اگر رمل نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا تو پہلی فرصت میں اسے کسی ایسی انتقامی کارروائی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے جس کے بعد وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہے تو یہ فیصلہ اسے بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑے گا۔ پہلے اس کے لیے کوئی معقول گراؤنڈ بنانا پڑے گا تاکہ ماموں اس کے بجائے رمل کو ہی مجرم سمجھیں۔ ویسے بھی وہ رمل کو کوئی خاص لفٹ تو کرواتے نہیں ہیں اور ناراضگی بھی چل رہی ہے دونوں باپ بیٹی میں۔ شاید وہ ان کے پاس گئی بھی نہ ہو۔ کہیں اور ہو۔ کچھ سوچنا پڑے گا۔ رمل تو ہر صورت میں چاہیے تاکہ وہ اچھے ہیومن ٹیسٹ کے رزلٹ حاصل کر سکے۔

اسے سوچوں میں ڈوبا چھوڑ کر وہ تینوں وہاں سے جا چکے تھے۔

☆☆☆

"رمل! تمہیں ہوا کیا ہے؟ تم اس قدر کمزور اور نحیف کیسے ہو گئی ہو۔ کچھ بیمار ہو کیا؟ چلو میرے ساتھ۔ تمہارا مکمل چیک اپ کروانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔" مراد نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اس کو کچھ بھی بتا نہیں سکی۔

رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ وہ تینوں اسپتال کے اس کمرے میں بیٹھے تھے جہاں پاپا داخل تھے۔ خالدہ بی کھانا لے کر آئی تھیں۔

"واہ خالدہ بی! آپ تو سوپ بنانے کی ماہر ہو گئی ہیں۔ روزانہ کچھ نئی قسم کا مزیدار۔۔ سوپ ہوتا ہے۔ میں تو آپ کے ہاتھ کے ذائقے کا اتنا عادی ہوتا جا رہا ہوں کہ سوچتا ہوں جب سر ٹھیک ہو کر گھر چلے جائیں گے تو میں کیا کروں گا؟" مراد مزے لے کر سوپ پیتے ہوئے بولا تو خالدہ بی مسکرائیں۔

"نہیں میاں! آپ کا جب جی چاہے سوپ پینے کو تو بلاتکلف خالدہ بی کو فون کریں۔ پہنچ جائے گا سوپ۔ یہ لیں صاحب! آپ بھی شروع کریں۔" خالدہ بی نے ان سب کو کھانا کھلایا پھر برتن سمیٹ کر چلی گئیں۔

"پاپا! میں جاننا چاہتی ہوں کہ مراد آپ کی گڈ بکس میں کیسے آ گیا۔ آپ تو اسے جانتے بھی نہیں تھے۔" رمل نے بات شروع کی تو انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"یہی تو غلط ہوا کہ میں اسے جان ہی نہیں پایا اور جب جانا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ تمہاری شادی کے کچھ ماہ بعد ہی یہ اپنی والدہ کو لے کر آیا تھا۔ انہوں نے تمہارا رشتہ مانگا تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شہریار نے اس کے بارے میں نہ جانے کیا الٹی سیدھی باتیں کر کے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی ڈاکٹر مراد آئے گا رمل کے لیے۔ آپ نے اسے باہر کا راستہ دکھانا ہے کیونکہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کی نظر آپ کے اسپتال پر ہے۔ ویسے بھی اچھی خاصی دولت جائداد بھی ہے جو آپ کے بعد رمل کی ہی ہوگی۔ وہ یہ سب ہتھیانا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہ کہے کہ رمل اپنے شوہر سے طلاق لے کر آ جائے گی اور اس سے شادی کرلے گی لیکن آپ اس کی باتوں میں بالکل نہ آئیے گا۔ بہت برا انسان ہے وہ۔ آپ کی دولت اور اسٹیٹس کو ہتھیانے کے چکر میں وہ رمل سے شادی کی سر توڑ کوشش کرے گا۔ اس کی ماں بھی اس کے اس پلان میں شامل ہے۔ اگر دونوں ماں بیٹے آ گئیں تو دھکے مار

کرنکال دیجیے گا۔

”اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے اس کی کوئی بھی بات سنے
بغیر اس کو ایسا ہی سمجھا اور اس کی والدہ کو بھی بہت برا بھلا کہہ
کر جانے کے لیے کہہ دیا جس کا مجھے آج تک افسوس ہے
اور اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حقیقت کھل
جانے پر میں ان سے معافی بھی نہیں مانگ سکا۔ انہوں نے
اس کا موقع ہی نہیں دیا پھر کئی مرحلے آئے اور اس نے
میرے دل میں گھس بیٹھنے کی جگہ بنالی۔ اسپتال کے ساتھ
ساتھ مجھے بھی بہت اچھی طرح سنبھالا۔ میری ساری غلط
فہمیاں دور کیں۔ تمہارے بارے میں بتایا۔ پھر شہریار کی
چالبازیوں کے بارے میں بتایا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ
اس کی وجہ سے میری بیٹی کو کتنی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ اس
لیے اب میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں نے غلط کیا ہے
اسے درست کردوں اور کروں گا۔“

انہوں نے رل کی لبریز آنکھوں کو دیکھ کر تسلی دینے
کے انداز میں ہاتھ ہلایا۔

”آپ نے اپنی بیٹی کو ایک بھیڑیے کے حوالے کر
دیا۔ وہ مجھے کھا گیا پاپا! وہ مجھے کھا گیا۔“ وہ چہرے پر ہاتھ
رکھ کر سسک سسک کر رو پڑی۔

انہوں نے خاموشی سے سر جھکالیا۔ شاید اندر کہیں
کوئی پچھتاوا ان کو کچوکے لگا رہا تھا۔

”رل! رل پلیز! سنبھالو اپنے آپ کو۔ جتنا کچھ تم کو
سہنا تھا، سہہ لیا۔ اب سب ٹھیک ہے۔ اٹس اوکے ناؤ۔“
مراد نے تسلی دی۔

”آنٹی کہاں ہیں؟“ رل نے اس کی والدہ کے بارے
میں سوال کیا تو اس کے چہرے پر ایک تحت سایہ سا لہرایا۔

”ان کا انتقال ہوچکا ہے۔ دو سال پہلے۔ لندن
میں۔ میرے معاملے میں وہ ملگٹ کا شکار ہوگئی تھیں۔ انکل
کے انکار نے انہیں پچھتاوے کا شکار کردیا تھا۔ وہ اکثر مجھ
سے کہتی تھیں کہ مراد! میری بے جا ضد نے تمہاری زندگی
برباد کردی۔ میں پہلے ہی تمہارا رشتہ لے کر چلی جاتی تو یہ
نوبت نہ آتی۔“

”تو انہوں نے تمہاری شادی کسی اور لڑکی سے بھی
نہیں کی؟“

”بہت کہا انہوں نے لیکن میرا دل راضی نہیں ہوا۔
پھر وہ اور بھی مایوس ہوگئیں اور اس مایوسی کو دل سے ایسا لگایا
کہ دنیا سے ہی چلی گئیں۔“

”پھر تم یہاں کیسے آئے؟“ رل نے آزردگی سے
سوال کیا۔

”میں وہاں اسپیشلائزیشن کررہا تھا تو حنا سے تمہاری
خبر ملی۔ تمہاری زندگی کی وہ ساری باتیں جو تم نے اس سے
شیئر کی تھیں۔ اس نے مجھے بتائیں تو مجھے انکل کا خیال آیا
کہ ایک بزرگ شخص، ایک چالباز آدمی کے پھیلائے ہوئے
جال میں پھنس کر کس طرح اندھیروں سے لڑ رہا تھا۔ اس کی
اکلوتی بیٹی اس سے چھین کر اسے کتنا اکیلا کر گیا ہے وہ۔ پھر
میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پاکستان جانا ہے۔ مجھے انکل سے مل
کر ان کی غلط فہمیاں دور کرکے حقیقت بتانا ہے۔ جب میں
یہاں آیا تو انہی کے اسپتال میں جاب بھی مل گئی مجھے، اور
میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کتنی بے بسی کی زندگی جی
رہے ہیں یہ۔ پھر مجھ سے جو بن پڑا میں نے کیا۔“ مراد نے
سب کچھ بتایا اور یہ سن کر رل کے آنسوؤں کی روانی اور بھی
زیادہ بڑھ گئی۔

”رل بیٹے! اب بس کرو۔ مصیبت کے دن ختم ہو
گئے۔ اب تم یہاں ہو۔ اپنے پاپا کے پاس۔ ہم نئے سرے
سے، نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ بس یہ نالائق راضی ہو
جائے تو۔ میں اسے گھر داماد بنالوں گا۔ پھر ہم تینوں ایک
خوشیوں بھری زندگی گزاریں گے جس میں کہیں کوئی غم، کوئی
دکھ نہیں ہوگا۔ میں اسپتال اس کے حوالے کرکے، صرف
اپنے نواسے نواسیوں کے ساتھ کھیلا کروں گا اور انہیں لاڈ
پیار میں خوب بگاڑوں گا۔ تم دونوں چاہے کتنا بھی چلاتے
رہنا۔ میں نہیں سننے والا۔“ ان کی بات سن کر ایک مسکراہٹ
ان سب کے لبوں پر آگئی اور ماحول بدل گیا۔

☆☆☆

اس نے اپنی ریسرچ سے متعلق تمام کاغذات کو
فائلوں میں لگا کر، ان ساری فائلوں کو ایک دوسرے، بڑے
فائل کور یا کس میں رکھا اور اسے لاک کردیا۔ پھر اپنے
والٹ روم میں جا کر سیف میں رکھا اور سیف کو اپنی ہتھیلی
کے سینسر کے ساتھ لاک کردیا۔ پھر اسی طرح کئی مرحلوں
میں اپنی انگلیوں اور آنکھوں کے سینسرز کے ساتھ آخری موٹا
لوہے کا دروازہ بھی لاک کرکے سکون کا سانس لیا۔ اب کوئی
کتنا ہی سر پٹخ لے، اس دروازے اور اندر موجود سیف
وغیرہ کو کھول نہیں سکتا تھا۔ اس کی متاع جاں بالکل محفوظ ہو
چکی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو اسے لگا کہ پاکستان کال کرنے
کا بالکل مناسب وقت ہے۔ ماموں اس وقت سونے کی
تیاری کررہے ہوں گے۔

”ہیلو ماموں! میں شہریار۔ کیسے ہیں آپ؟“

"ٹھیک ہوں۔" دوسری جانب سے مختصر جواب ملا۔

"ماموں! رل کیسی ہے۔ وہ خیریت سے پہنچ گئی وہاں۔"

"رل؟ وہ یہاں کب آئی؟ تم نے اس کے آنے سے پہلے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ کب آئی ہے وہ یہاں؟"

"کیا مطلب ہے...... وہ گھر نہیں پہنچی؟ اگر گھر نہیں گئی تو کہاں گئی؟"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو نالائق! جب اسے یہاں بھیج رہے تھے تو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جائے گی۔"

"وہ...... دراصل بات یہ ہے ماموں کہ وہ یہاں سے بھاگ گئی ہے۔ مجھے کچھ بتائے بغیر۔ چپکے سے۔"

"گھر سے رل بھاگ گئی تو تم کہاں تھے گدھے؟ اور اسے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا تم نے اسے قید میں رکھا ہوا تھا؟ جہاں سے وہ بھاگ گئی۔ کہاں ہے میری بیٹی؟ شرافت سے اس سے میری بات کرواؤ۔ ورنہ میں یہاں کے چینی سفارت خانے والوں کو اس کی گمشدگی کی اطلاع دیتا ہوں۔ پھر وہ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ذرا ٹھیک سے ڈھونڈیں گے۔ کل اسی وقت میری اس سے بات کرواؤ۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو میں اگلے روز ہی چینی سفارت خانے چلا جاؤں گا۔ جاؤ اسے تلاش کرو۔ میرے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ باقی بات کل۔ تم سے نہیں رل سے۔ اوکے۔"

"مگر ماموں...... ماموں! بات تو سنیں......" وہ چلاتا ہی رہا۔ دوسری جانب سے فون بند ہو گیا۔

"کہاں گئی؟ ماموں کے پاس نہیں گئی تو کہاں جا سکتی ہے؟ اوہ...... یقیناً اس ڈاکٹر کے پاس گئی ہو گی۔ وہیں گئی ہو گی۔ ٹھیک ہے رل۔ میں آرہا ہوں۔ تم مجھ سے بھاگ نہیں سکتیں۔ میری سالوں کی محنت اور بے انتہا دولت داؤ پہ لگا کر۔ تم مجھے فلاش نہیں کر سکتیں۔ میں آرہا ہوں۔ مجھے ہر صورت اپنے ٹیسٹ کے رزلٹ چاہیے ہیں اور وہ میں حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ آرہا ہوں۔ آرہا ہوں میں۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر صاحب اور رل کے گھر آنے پر خالدہ بی نے ایک ٹھیک ٹھاک ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ وہ تینوں تو تھے ہی خوش لیکن گھر کے پرانے ملازمین بھی بہت خوش تھے۔ مراد کی بذلہ سنجی سے وہ سب بھی بہت مزے لیتے تھے۔ وہ بھی کبھی خانساماں نور چاچا کو مچھلی اور مرغی کے پائے بنانے کی ترکیبیں بتاتا تو کبھی خالدہ بی کو سمجھاتا کہ لڑکیوں کی عمر زیادہ ہو جائے تو اچھے رشتے نہیں ملتے۔ اب انہیں بھی شادی کر لینا چاہیے۔ کچھ دن اور گزر گئے تو مجھ جیسا کوئی بوڑھا ہی ملے گا۔ وہ ان کے سفید بالوں کو نزلے کا اثر قرار دیتا تو سب اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے اور خالدہ بی کی ایک گھرکی سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

اس رات بھی وہ کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہنستے بولتے رہے۔ پھر مراد نے اجازت لی اور اسپتال روانہ ہو گیا۔ اس نے وہیں اپنی رہائش رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت گہری نیند میں تھا جب فون کی مسلسل گھنٹی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ خالدہ بی کا فون تھا۔

"مراد میاں! جلدی آؤ۔ رل بیٹا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بہت تیز بخار ہو رہا ہے اور وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔"

وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ پھر ایمبولینس کے لیے فون کرتا ہوا باہر کی جانب دوڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں رل ایمرجنسی میں تھی۔ واقعی بہت شدید بخار تھا۔ وہ پریشان تو ہوا لیکن جلد سے جلد اس کو ضروری طبی امداد پہنچانے میں دیر نہیں لگائی۔ عملے کے ساتھ وہ خود بھی صبح تک وہیں رہا۔

صبح ہوتے ہوتے اس کا بخار کچھ کم ہوا تو سکون ہوا۔ اس کے ضروری ٹیسٹ لکھ کر اس نے اسسٹنٹ کو دیے اور ریٹائرنگ روم میں جا کر کاؤچ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے رل میں کچھ ایسی علامات دیکھی تھیں جس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

"خدا کرے میرے یہ خدشات غلط ثابت ہوں۔ رل نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اب جب اس کی راہ کے کانٹے دور ہو گئے ہیں تو یہ کہیں کسی اور راہ پر نہ نکل جائے۔ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا میرے اللہ!" اسے لگا کہ اسے دعا کرنا چاہیے۔ فجر کا وقت تھا۔ اس نے نماز پڑھی اور بڑی دیر تک رل کے لیے دعائیں کرتا رہا۔ پھر اسٹاف کو فون کر کے پوچھا۔

"رل ابھی سو رہی ہے کیا؟"

"نہیں سر! جاگ گئی ہیں۔ آپ کو پوچھ بھی رہی تھیں۔"

"میں آرہا ہوں۔" وہ لمبے لمبے قدم بڑھاتا آئی سی یو میں داخل ہوا تو رل نے اسے دیکھا اور ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔

"رل! کیسا محسوس کر رہی ہو اب۔ تم نے تو ڈرا دیا سب کو۔ اتنا تیز بخار کیسے ہو گیا۔ رات تک تو تم ٹھیک تھیں۔ پھر اچانک یہ کیسے ہوا؟"

"اچانک نہیں۔ مجھے ہلکا بخار تھا اس وقت بھی۔ میں نے میڈیسن لے لی تھی مگر وہ بڑھ گیا۔"

"رل! مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ خاص نہیں۔ بس بخار ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ تیز ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے سانس رک رہا ہو۔ جان نکلنے لگتی ہے۔ رات بھی ایسا ہی ہو رہا تھا لیکن ایمبولینس میں یہاں تک لاتے ہوئے تم نے تین بار میری پیشانی کو چھوا اور مجھے ہر بار ایسا لگا کہ میرے اندر زندگی کی لہریں سرایت کر رہی ہوں۔ مجھے کچھ بھی ہو۔ بس تم مجھے چھو لیا کرو۔ میں موت کی دہلیز سے بھی واپس آ جاؤں گی مراد۔" رل کے لہجے اور یقین نے اسے سرتاپا ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ جذبات کی شدت نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔

"رل! میں نے بڑی مشکلوں سے اپنے اور تمہارے راستے کی دوریوں کو پار کیا ہے۔ اب تم مجھ سے دور نہ جانا۔ اگر تم کہو گی تو میں ساری زندگی تمہارا ہاتھ تھام کر بیٹھا رہوں گا۔ مگر تم مجھ سے دور نہ جانا۔"

اس کی بے تابیوں کے جواب میں ایک حزنیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔ آنکھیں بند کیں تو آنکھ کے گوشے سے ایک آنسو نکل کر ڈھلک گیا۔

اگلے دو دن ایک ہی بین بین سی کیفیت میں گزرے لیکن تیسرا دن مراد کے لیے ایک قیامت لے کر آیا۔ رل کے ٹیسٹ کی رپورٹس آ گئی تھیں۔ اس کے خون میں کورونا وائرس کی موجودگی پائی گئی تھی لیکن رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وائرس کورونا ہے یا نہیں۔ اس کے لیے مزید ٹیسٹ کرنا ہوں گے، کیونکہ کچھ اجنبی قسم کے وائرس کی موجودگی دیکھی گئی ہے اور انہیں شناخت نہیں کیا گیا ہے۔

اس بات نے مراد کو الجھا دیا تھا۔ اجنبی وائرس کا کیا مطلب ہے؟ پھر اس کا خیال شہریار کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی تو کسی قسم کے وائرس پر کام کر رہا تھا۔ رل بھی اسکو اسسٹ کرتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی غلطی کی وجہ سے وہ اسی وائرس کا شکار ہو گئی ہو۔ وہ اس سے یہ بات پوچھنے کے لیے آئی سی یو میں گیا تو رل کے بیڈ کے گرد شفاف پلاسٹک کا خیمہ سا تان دیا گیا تھا۔ تازہ تازہ سینیٹائزیشن کی مہک فضا میں تیر رہی تھی اور وہ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا زرد اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

دروازہ بند ہوا تو نو انٹری کا بورڈ نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ وہ بھاری قدموں سے اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے اندر اٹھنے والی ٹیسوں کو ضبط کرنے کے مرحلے میں تھا کہ اسٹاف اندر داخل ہوئی۔

"سر! یہ آپ کا ڈریس ہے۔ پیشنٹ کو اٹینڈ کرنے کے لیے اب آپ کو یہ پہننا پڑے گا۔" اس نے ایک خلا بازوں جیسا سفید لباس شفاف پلاسٹک میں ملفوف ہینگر میں لٹکا دیا اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"مجھے رل کو دیکھنا ہے۔ وہ کہاں ہے؟"

"آپ کون ہیں؟"

"شہریار! ڈاکٹر شہریار۔"

"آپ تشریف رکھیں۔ میں معلوم کرتی ہوں۔" نرس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے! میں اس کا شوہر ہوں۔ میں جلد سے جلد اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری ہے۔ آپ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ وہ کس وارڈ میں ہیں۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"جی سر! میں معلوم کر کے بتاتی ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔" نرس نے فون اٹھایا لیکن اس سے صبر نہیں ہوا۔ وہ آگے چل دیا۔ پھر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کہاں ہے تو وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا آئی سی یو میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں صرف ایک ہی بیڈ لگا ہوا تھا اور وہ شفاف پلاسٹک کے خیمے میں تھا۔ اس بیڈ پر اسے رل نظر آئی۔ ہاتھ پر ڈرپ لگی ہوئی اور چہرہ وینٹی لیٹر میں چھپا ہوا۔ وہ کچھ بے چین سی تھی۔

دوسری جانب کوئی ڈاکٹر اسی محفوظ خلا بازوں جیسے ڈریس میں کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے چینی بڑھی تو وہ اس خیمے کو ہٹا کر اندر داخل ہوا اور اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کے دبیز دستانوں میں وہ کہیں کھو گیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو تھپکتا رہا لیکن مریضہ کی بے چینی کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے تکیے پر سر ادھر اُدھر پٹختے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے ہاتھ کو ان دبیز دستانے والے ہاتھوں میں دیکھ کر اس نے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا تو شفاف ہیلمٹ جیسے خود کے پیچھے اسے مراد کا چہرہ اور اشکبار آنکھیں دکھائی دیں۔ وہ اور بھی بے چین ہو گئی۔ اب اس کی سانسیں بھی رک رہی تھیں اور وہ کھینچ کھینچ کر سانسیں لینے کی جدوجہد میں نڈھال ہو رہی تھی۔ مراد سے شاید برداشت نہیں ہوا۔ وہ اس خیمے سے باہر نکل کر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوششیں کر رہا تھا کہ اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو شہریار نظر آیا۔ اس نے اسے دیکھ کر باہر جانے کا اشارہ کیا اور رل کو دیکھا جو بھی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی

طرف پھیلا رہی تھی۔ اس کی سانسیں رک رہی تھیں اور وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شاید اس سے اپنے لیے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

اور اس نے آخری بار اسے زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ دیوانگی ہے۔ وہ اسے تو زندگی کی طرف واپس نہیں لا سکے گا لیکن شاید خود اس کے وجود کو چھوڑ کر، وہ اپنے آپ کو موت کے راستے پر ڈال دے گا لیکن اس وقت وہ ساری مصلحتوں اور حفاظتوں کو بھول کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر شاید اوپر والے سے اس کی زندگی کے کچھ لمحے ادھار لینا چاہتا تھا۔

اس نے پہلے اپنا خود اتارا۔ پھر دستانے اتار دیے۔ اس کے بعد پورا حفاظتی سوٹ اتارنے لگا۔ اسے شہریار کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ ”مت جاؤ اس کے نزدیک۔ مارے جاؤ گے۔ وہ خطرناک وائرس کی کیریئر ہے۔ مت جاؤ۔“

لیکن وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ سارا حفاظتی لباس اتار کر اس نے اپنے ہاتھوں کو الکحل سے رگڑا اور خیمے میں داخل ہو گیا۔

اس وقت رمل سانس لینے کی جدوجہد میں بری طرح تڑپ رہی تھی۔

”رمل! آنکھیں کھولو رمل! رمل!“ اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہلکے ہلکے رگڑا تو اس کی بے چینی میں کچھ کمی آئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال کر اس کے چہرے کی طرف بڑھائے۔ مراد نے اپنا چہرہ اس کے نزدیک کیا اور ایک ہاتھ اس کی گردن کے نیچے سے نکال کر اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

رمل کی بے چینی کو قرار آ گیا۔ اس کی اکھڑتی ہوئی سانسیں مدھم ہوتے ہوتے رک گئیں اور آنکھیں بند ہوتے ہوتے بھی مراد کو یہ پیغام دے گئیں کہ وہ بہت آسودہ اس دنیا سے گئی ہے۔ اس کے تھامے ہوئے ہاتھ کو اس نے بے جان ہوتے ہوئے محسوس کیا اور دکھ کی اذیت کے بوجھ سے وہ ٹوٹ گیا۔ آنسو ابلے تو سسکیاں بھی بے قابو ہو گئیں۔

اس وقت نہ تو اسے شہریار کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی اور نہ ہی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کئی لوگوں کے سامنے اس قدر بے قراری سے رو رہا ہے پھر اسی حفاظتی سوٹ میں ملبوس رمل کے والد اندر داخل ہوئے اور انہوں نے مراد کو بڑے پیار اور نرمی سے اٹھایا اور باہر لے گئے۔

☆☆☆

رمل کے انتقال کو پانچ دن ہو چکے تھے تو ڈاکٹر شاہ نے اسپتال کا چکر لگانے کا سوچا۔

”سر! وہ شہریار صاحب کئی چکر لگا چکے ہیں۔ وہ میم رمل کے جو پیپرز لے کر گئے تھے، وہ مانگ رہے ہیں۔“

”اچھا! وہ کیوں مانگ رہا ہے؟“

”پتا نہیں سر! وہ کہہ رہے تھے کہ وہ ریسرچ ہیں اور میم جس وائرس کا شکار ہوئی ہیں، وہ ان پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ اس لیے انہیں اس کی ضرورت ہے۔“

”اسے کچھ بھی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب اگر آئے تو اسے کہہ دینا کہ میں لے گیا ہوں وہ پیپرز۔ وہ مجھ سے لے لے۔ گھر پر ہیں۔“

”اوکے سر!“

اگلی ہی رات کو شہریار کی آمد ہوئی۔

”السلام علیکم ماموں! کیسے ہیں آپ؟“

”جس کی جوان بیٹی کسی کی درندگی کا شکار ہو جائے، اس باپ سے پوچھتے ہو کہ وہ کیسا ہے؟“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں ماموں؟ وہ وائرس کا شکار ہوئی ہے۔ نہ جانے کہاں سے کیری کیے اس نے یہ وائرس۔ مجھے تو بتایا بھی نہیں اس نے کچھ اور بھاگ کر یہاں آ گئی۔“

”اچھا! تو اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا اور بھاگ کر یہاں آ گئی۔ شاباش ہے تمہیں۔ اگر ڈھٹائی کا کوئی میڈل ہوتا تو تم یقیناً اس کے حقدار ہوتے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے تمہارے کرتوتوں کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ سب کچھ بتایا اس نے۔ تمہاری کیمنگی کے بارے میں ایک ایک بات بتائی اس نے۔ تم نے جو انسانیت سوز کارنامہ انجام دیا تھا اس کے ہیومن ٹیسٹ کے لیے، تم نے اسے کیریئر بنایا۔ تم قاتل ہو اس کے...... تمہارے دماغ میں یہ کیڑا اس وقت سے پل رہا تھا جب تم نے اسے یہاں مائیکروبیالوجی پڑھنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ تم نے اس کے اور میرے درمیان کے فاصلوں سے فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ تمہیں ایک مفت کام کرنے والی مل گئی۔ اس سے کام تو لیا ہی سہی لیکن آخر میں کوئی اور نہیں ملا تو اپنے بے ہودہ مقصد کے حصول کے لیے۔ تم نے اسی پر اس ہولناک وائرس کا ہیومن ٹیسٹ بھی کر ڈالا۔ تم نے میری بیٹی کا ناحق خون کیا ہے۔ اس کا قصاص تو بنتا ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس نے جھوٹ بولا ہے آپ سے۔ الزام لگایا ہے تاکہ مجھ سے جان چھڑا کر اپنے اس گھٹیا ڈاکٹر کے پاس جا سکے اور آپ نے اس کی بات کو سچ سمجھ لیا۔“

"وہ تمہارے دیے ہوئے اس زہر سے مر چکی ہے۔ اس سے زیادہ بڑا اس کی سچائی کا ثبوت اور کیا ہوگا اور تم اب بھی، اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی کردار کشی کر رہے ہو۔ اپنے لیے اپنی سزا کا انتخاب خود کرو۔ بتاؤ، تمہارے جیسے لوگوں کے لیے کیا سزا ہونا چاہیے۔ بولو!"

شہریار کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ پریشانی سے ماموں کو دیکھے جا رہا تھا جو آج پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ جنہوں نے کبھی بیٹی کو اہمیت ہی نہیں دی۔ آج اسی کی محبت میں اس کو مجرم ٹھہرائے جا رہے ہیں۔

اس کو خاموش دیکھ کر شاہ صاحب نے فون پر نمبر ملائے اور کسی کو آنے کے لیے کہا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں گارڈز اندر داخل ہوئے اور انہوں نے شاہ صاحب کا اشارہ پاتے ہی اسے کرسی پر بٹھا کر دونوں ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے۔ وہ چلانے لگا مگر کسی نے پروا نہیں کی۔

گارڈز باہر چلے گئے تو شاہ صاحب اندر گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک مخصوص سرنج تھی جس میں پانی کے رنگ کا کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر شہریار کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں ماموں؟"

"وہی جو تم نے رِنل کے ساتھ کیا تھا۔ تم اس کے حقدار ہو۔ تم نے اس پر سے وائرس آزمائے تھے۔ یہ تو اس کے جسم سے حاصل کیا ہوا وہ مواد ہے جس میں وائرس کی طاقت یقیناً اتنی نہیں ہوگی اور اگر تم خوش قسمت ثابت ہوئے تو شاید تمہارا امیون سسٹم اس کو نکال باہر کرے۔ تم بچ جاؤ تو آج کے بعد سے تم اپنے آپ کو بچانے کی کوششیں کرتے رہنا۔ اگر زندہ رہ گئے تو تمہارا امیون ٹیسٹ کامیاب ہو جائے گا اور تم دولت کے پہاڑوں پر باقی زندگی گزارنا۔ جو تمہاری شدید ترین خواہش ہے لیکن اگر نہ بچ سکے تو تم بھی رِنل جیسی اذیت ناک موت کا مزہ چکھنا۔ اس لیے گڈ بائے بھی اور نہیں بھی۔" وہ سرنج لے کر اس کی طرف بڑھے تو وہ بہت چیخا چلایا۔ خوشامدیں کیں۔ دھمکیاں اور لالچ بھی دیے لیکن شاہ صاحب سب کچھ سنتے رہے اور اطمینان سے اپنے کام کو انجام دیتے رہے۔ پورا محلول اس کے بازو میں انجیکٹ کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ گارڈز کو بلایا اور حکم دیا۔

"اسے اٹھا کر گیٹ سے باہر دور لے جا کر پھینکو اور آئندہ اگر یہ کبھی اس گھر کے آس پاس بھی نظر آیا تو اپنی نوکریاں اسی وقت ختم سمجھنا۔ لے جاؤ، دفع کرو اسے میری نظروں کے سامنے سے۔"

گارڈز اسے دھکیلتے ہوئے لے کر جا رہے تھے اور وہ بچوں کی طرح بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مراد ایک ٹھنڈی سانس لے کر داستان کو اختتام تک لے آئے تھے۔

بس پھر ایک کینسر زدہ بوڑھے آدمی کو آخر وقت میں اتنے بڑے بڑے دھچکے لگے تو ان کی زندگی اور بھی مختصر ہو گئی۔ انہوں نے قانونی طور پر اپنا یہ اسپتال، گھر اور ساری دولت میرے نام کر کے کہا۔

"مراد بیٹے! میرے بعد رِنل کو بھول مت جانا۔ میری خواہش ہے کہ تم اس کے نام سے ایک ٹرسٹ بناؤ اور ساری دولت اس ٹرسٹ میں ڈال دو۔ اس کے نام سے ایک میڈیکل یونیورسٹی بناؤ جہاں وائرولوجی کے بہت سے ماہرین تیار ہوں اور وہ لوگوں کو ان خطرناک اور غیر انسانی مہلکات سے بچائیں اور ہاں انہیں میڈیکل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انسانیت کی تعلیم دلوانے کا بھی اہتمام کرنا۔ کوشش کرنا کہ ان میں کوئی شہریار پیدا نہ ہو۔" یہ آخری گفتگو تھی جو انہوں نے مجھ سے کی۔ اگلے روز ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

"اب یہ آپ لوگ مجھے بتائیں گے کہ کیا میں ان کی توقعات پوری کر پایا ہوں یا ناکام ہو گیا ہوں۔" ڈاکٹر مراد کا لہجہ بھیگا ہوا تھا اور آنکھوں کی نمی کا انہیں احساس بھی نہیں تھا۔

"نو سر! آپ نے اپنا وعدہ مکمل طور پر پورا کیا ہے۔ ہم سب اس کی گواہی دیں گے۔ یہ یونیورسٹی مثالی ادارہ ہے۔ یہاں سے پاس آؤٹ ہونے والے ڈاکٹرز صرف ملک میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ نے صرف ڈاکٹرز ہی نہیں بنائے بلکہ انہیں انسان دوست ڈاکٹرز بنایا ہے۔"

وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس ان کے سامنے زمین پر بیٹھے انہیں بہت عقیدت مندی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھی نے جو الفاظ کہے باقی سب نے بھی اس کی بلند آواز میں تائید کی۔

"اچھا! آپ لوگ یہ کیک کاٹو اور کھاؤ۔ میں کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو میں گھر جانا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر مراد نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تو سب نے لیس سر کہہ کر ان کے لیے راستہ بنا دیا۔ وہ اٹھے اور آہستہ آہستہ قدم دروازے کی طرف بڑھاتے گئے اور ان کے پیچھے تالیاں گونجتی رہ گئیں۔

✖✖✖

ایفائے عہد

نجمہ مودی

دن، مہینے، سال ایک ہی لڑی کے موتی اور... وقت کی چال کے مختلف انداز ہیں... جیسے کہ ان دوستوں نے محض تفریحاً پچیس سال کی عمر میں ایک ایسا عہد کیا جسے مزید پچیس سال بعد پورا کر کے دکھانا تھا... گویا مصنف نے گولڈن جوبلی کے موقع پر پچاس سال کا قصہ ان چند صفحات پر لکھ دیا۔

پیمانِ عہد کو نبھا کرنے والے دو جگری

یاروں کا دلگداز ماجرا

ان دونوں کی عادات و اطوار کی طرح ان کی دوستی بھی عجیب سی ہی تھی۔

دونوں تقریباً روزانہ ہی شام کو ملتے تھے اور دو ڈھائی گھنٹے ساتھ گزارتے تھے لیکن اس دوران دونوں کے درمیان بہت کم بات چیت ہوتی۔ دونوں زیادہ تر خاموش نظر آتے اور ایک دوسرے کی موجودگی میں بھی گویا اپنے خیالات میں ہی گم رہتے۔ اس کے باوجود دونوں گویا تقریباً روزانہ ملنا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ یہ ان کا پانچ سات سال کی عمر سے ہی معمول تھا۔ ان کے گھر لاہور کے پرانے علاقے، اندرون بھاٹی گیٹ میں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ اس کے باوجود بچپن سے ہی اسکول سے آنے کے بعد ہر شام ان میں کوئی ایک، دوسرے کی گلی میں آجاتا اور سورج

غروب ہونے تک دونوں گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے اور اندھیرا پھیلنے لگتا تو اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے۔

میٹرک کرنے تک دونوں کا یہی معمول رہا۔ کالج میں آئے تو ان کی شامیں بھاٹی گیٹ کے علاقے سے باہر، بس اسٹاپ کے قریب، سستے سے ایک ریسٹورنٹ میں گزرنے لگیں۔ اس ریسٹورنٹ میں لوگوں کے باتیں کرنے کا شور اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی لیکن وہ دونوں بہت کم بولتے تھے۔ چائے کے کپ سامنے رکھے وہ زیادہ تر دوسروں کی طرف دیکھتے رہتے۔ ریسٹورنٹ کے مالک نے چاروں طرف دیواروں پر جلی لفظوں میں لکھوایا ہوا تھا۔ ”سیاست پر گفتگو کرنا اور گالم گلوچ کرنا سخت منع ہے۔“

اس کے باوجود سب سے زیادہ گفتگو سیاست پر ہی ہوتی تھی اور بیچ بیچ میں گالم گلوچ بھی چلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو لوگ اچھے خاصے جذباتی ہو جاتے تھے۔ کسی کسی کی تو باچھوں سے کف بھی بہنے لگتا تھا۔ بس غنیمت یہ تھا کہ ایک دوسرے کا گریبان پکڑنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ ریسٹورنٹ کا مالک کاؤنٹر پر بیٹھا بے بسی سے لوگوں کے چہروں کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا۔

ان دونوں دوستوں کو زیادہ تر لوگ بھائی سمجھتے تھے کیونکہ دونوں کی شکلوں میں معمولی سی مشابہت بھی موجود تھی۔ حد تو یہ تھی کہ دونوں کے نام بھی ملتے جلتے تھے۔ ایک کا نام راشد تھا، دوسرے کا ساجد۔ کسی اجنبی سے دونوں کا تعارف ہوتا تھا تو وہ خواہ منہ سے نہ بولتا لیکن دل ہی دل میں فوراً فرض کر لیتا تھا کہ وہ دونوں بھائی ہوں گے۔

دونوں بی اے کر چکے تھے اور کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں دھکے کھا رہے تھے۔ شاید ہی کوئی جگہ یا دفتر ایسا رہ گیا ہو جہاں انہوں نے درخواست نہ دی ہو لیکن کہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سی جگہوں سے تو انہیں انٹرویو کے لیے بلاوا تک نہیں آیا تھا اور بہت سے دفتروں میں، جہاں انٹرویو ہو گئے تھے، وہاں سے کسی نے جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کی۔ انہوں نے خود رابطہ کیا تو رکھائی سے بتایا گیا کہ اس اسامی پر کسی اور کو رکھ لیا گیا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان کی مایوسی بڑھ رہی تھی۔ لہجے میں تلخی آنے لگی تھی اور دنیا کچھ بری بری سی لگنے لگی تھی۔ نوکری نہ ملنے سے راشد زیادہ پریشان تھا۔ اس کے والدین کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو چکا تھا اور وہ کوئی خاص جمع پونجی چھوڑ کر اس دنیا سے نہیں گئے تھے، اوپر سے گھر بھی کرائے کا تھا۔ اب تو بھی کبھار گھر کی کوئی چیز بیچنے کی نوبت بھی آ جاتی۔ ساجد کے حالات قدرے بہتر تھے۔ وہ کبھی کبھار راشد کے مانگے بغیر ہی اسے کچھ رقم دے دیتا۔ وہ اس نظریے کا قائل تھا کہ وہ دوست ہی کیا جو دوست کے بتائے بغیر اس کے حالات سے آگاہ نہ ہو۔ بیچ میں کبھی کبھار راشد کو کوئی چھوٹا موٹا، عارضی سا کام مل جاتا تو کھینچ تان کر کچھ دن گزر جاتے۔ اس دوران کسی سے کچھ مانگنے، ساجد سے بغیر کچھ مانگے، مدد میسر آ جانے یا گھر کی کوئی چیز فروخت کرنے کی نوبت نہ آتی۔

کچھ عرصہ اور گزرا تو راشد کی مایوسی انتہا کو پہنچ گئی۔

آخر ایک روز اس نے ریسٹورنٹ میں نشست کے دوران اعلان کر دیا۔ ”اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو میں کراچی چلا جاؤں گا۔“

وہ ایک دوسرے کی بات پر ذرا کم ہی چونکتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں کو پہلے ہی سے علم ہوتا تھا کہ کس وقت دوسرا کیا کہنے والا ہے۔ تاہم اس وقت راشد کی بات سن کر ساجد تھوڑا سا چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیوں؟“ اس نے بھویں اچکا کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”بس یار...... تم دیکھ ہی رہے ہو، یہاں گزر بسر کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔“ راشد کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی تھی۔ ”آخر کب تک اس طرح وقت گزرے گا؟ لگتا ہے یہاں رہ کر میں اپنی زندگی کو ضائع کر رہا ہوں...... یا پھر شاید زندگی مجھے ضائع کر رہی ہے۔“

”اور تمہارا خیال ہے کہ کراچی جا کر تمہارے دن بدل جائیں گے...... تم سیٹھ صاحب بن جاؤ گے؟“ ساجد نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”سیٹھ تو چاہے نہ بنوں...... سیٹھ بننے کی مجھے خواہش بھی نہیں ہے۔ میری خواہش تو بس اتنی ہے کہ عزت سے زندگی گزارنے کے قابل ہو جاؤں۔ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ ہر روز اس فکر میں دل نہ ڈوبتا رہے کہ آج کا دن تو گزر گیا۔ کل کا دن پتا نہیں کیسے گزرے گا؟“ راشد نے ہلکی سی افسردگی سے کہا۔ ”اور کیا بعید ہے کہ میں سیٹھ ہی بن جاؤں۔ کہتے ہیں کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ میں کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو یہاں جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے۔ کراچی گئے تو ان کے دن ہی پھر گئے اور دن پھرے تو اوقات بھی بھول گئے۔ پرانے جاننے والوں کو پہچاننا چھوڑ دیا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے......“ ساجد پُرخیال سے انداز میں بولا۔ ”لیکن ممکن ہے کہ وہ یہیں رہتے تب بھی ان کے دن پھر جاتے۔ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ انسان کا مقدر اس کے

ساتھ چلتا ہے۔ تم کہیں بھی رہ لو، جو کچھ تمہارے مقدر میں ہے، وہ تمہیں مل کر رہے گا۔"

"نظریہ تو میرا بھی یہی ہے...... لیکن پھر میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ میری طرح بہت سے لوگ حالات سے تنگ آکر یا بے روزگاری سے مجبور ہو کر کراچی چلے گئے...... وہاں سے سعودی عرب، کینیڈا یا آسٹریلیا...... یا پھر کسی اور ملک چلے گئے۔ شہر یا ملک بدلنے سے گویا ان کا مقدر پلٹا کھا گیا۔ حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔"

ساجد اب خاموش رہا۔ وہ دونوں ہی کم گو تھے۔ بحث کبھی نہیں کرتے تھے۔ آج تو پھر بھی انہوں نے ذرا لمبی بات کر لی تھی ورنہ وہ بات کو اتنا طول بھی نہیں دیتے تھے جتنا آج دے دیا تھا۔ مختصر بات کرتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کو اپنی بات پر قائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگاتا تھا۔ کسی بات پر دونوں کا موقف مختلف ہوتا تھا تب بھی گفتگو کا اختتام کسی ناخوشگوار موڑ پر نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اس روز دونوں اپنی "نشست" ختم کر کے ریسٹورنٹ سے نکلے تو دونوں کے چہروں پر ہلکی سی اداسی تھی۔

باہر ذرا ایک طرف کو ہو کر وہ رک گئے۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ اسٹاپ پر دو بسیں بھی آگے پیچھے آکر رکی تھیں لیکن سواریاں اتارتے ہی تیزی سے دوبارہ چل پڑی تھیں۔ لگتا تھا ان میں ریس لگی ہوئی تھی۔

چند لمحے خاموشی سے وہ دونوں چلتے ٹریفک کو دیکھتے رہے پھر ساجد نے گہری سانس لے کر گویا تصدیق چاہی۔ "تو گویا یہ طے ہو گیا کہ اگلے ماہ کی پہلی تاریخ کو تم کراچی روانہ ہو جاؤ گے؟" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے دل ہی دل میں گویا اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔

"ہاں......" راشد کا لہجہ اب بھی فیصلہ کن تھا۔ "وہ جنوری کی پہلی تاریخ ہو گی...... نیا سال شروع ہو رہا ہو گا...... 1995ء......" وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں خاموش ہو گیا۔ وہ گویا کچھ سوچ رہا تھا۔ ساجد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ راشد ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا۔

اس کا اندازہ درست ہی تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راشد نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "یہ میری سالگرہ کا دن بھی ہو گا۔ یکم جنوری 1995ء کو میں پورے پچیس سال کا ہو جاؤں گا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ساجد نے قدرے مایوسی سے کہا۔ "میں سمجھا تھا، اس تاریخ کے حوالے سے تم مجھے کوئی خاص بات بتانے لگے ہو۔"

"ہاں...... خاص بات میں اب بتانے لگا ہوں" راشد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں اس روز کراچی کے لیے روانہ ہوں گا تو پھر پچیس سال تک پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ اس دوران میں تم سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھوں گا۔ کسی بھی ذریعے سے تمہیں اطلاع نہیں دوں گا کہ میں کیا کر رہا ہوں، کس حال میں ہوں۔ کچھ بننے میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں...... میں ٹھیک پچیس سال بعد واپس آؤں گا اور اپنی ساری رام کہانی تمہیں خود ہی سناؤں گا۔ پچیس سال کی اپنی جدوجہد کی ساری داستان تفصیل سے سناؤں گا۔"

"بہت خوب!" ساجد نے گویا اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "گویا تم اتنے لمبے عرصے تک سسپنس میں مبتلا رکھنا چاہتے ہو۔ پورے پچیس سال تک میں تمہارے بارے میں سوچتا ہی رہوں گا کہ پتا نہیں تم کراچی میں کس حال میں ہو گے، کیا کر رہے ہو گے؟"

"ہاں...... میرا خیال ہے تم اتنے سالوں تک تجسس میں گرفتار رہو گے تو پھر ملاقات میں بڑا لطف آئے گا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو سنانے کے لیے بے شمار باتیں ہوں گی۔ پوری داستان الف لیلیٰ ہو گی۔" راشد کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری جیسے وہ اس تصور سے محظوظ ہو رہا ہو۔ آج کی ملاقات کے دوران پہلی بار اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری تھی ورنہ زیادہ تر وہ قدرے متفکر اور کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہی دکھائی دیا تھا۔

ایک لمحے کی پرخیال سی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "تین دن بعد یکم جنوری ہو گی۔ میں اب شاید تم سے ملنے نہ آسکوں۔ سردست یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ زندگی رہی تو ٹھیک پچیس سال بعد اسی جگہ آئندہ ملاقات ہو گی۔ یکم جنوری 2020ء کو ہم رات دس بجے اس ریسٹورنٹ کے سامنے، ٹھیک اسی جگہ ملیں گے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ ہم میں سے جو بھی پہلے یہاں پہنچ جائے، وہ یہیں کھڑے ہو کر دوسرے کا انتظار کرے۔ کیا تمہیں یہ تجویز منظور ہے؟ کیا تم اس پر عمل کرو گے؟"

"کیوں نہیں......" ساجد نے گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم نے ہمیشہ ہی ایک دوسرے کی بات مانی ہے۔ ایک دوسرے کی تجویز پر عمل کیا ہے۔ زندگی رہی تو اس تجویز پر بھی عمل کریں گے۔"

اس وعدے کے ساتھ وہ دونوں دوست ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

وہ یکم جنوری 2020ء کی رات تھی۔ راشد اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک پچیس سال بعد اس ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ دس بجے سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور اب بے تابی سے ساجد کا انتظار کر رہا تھا۔ درحقیقت وہ ریسٹورنٹ کے سامنے نہیں، بلکہ کاروں کی ایک ورکشاپ یا گیراج کے سامنے کھڑا تھا جس کا بڑا سا ڈبل شٹر اس وقت بند تھا۔ ریسٹورنٹ اب وہاں رہا ہی نہیں تھا۔ اس کی جگہ گیراج کھل گیا تھا۔ پرانی بہت سی دکانیں ختم ہو چکی تھیں۔ ان کی جگہ دوسری دکانیں کھل چکی تھیں۔ ایک جگہ نئی مارکیٹ بن گئی تھی۔ علاقے کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ پچیس سال ایک طویل عرصہ تھا۔ تبدیلیاں تو آنی ہی تھیں۔

قریب ہی ایک اوور ہیڈ برج بھی بن گیا تھا۔ تقریباً سب کچھ ہی بدل گیا تھا لیکن راشد کے لیے اس جگہ کو پہچاننا ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوا تھا، جہاں کھڑے ہو کر اس نے پچیس سال پہلے ساجد سے الوداعی ملاقات کی تھی۔ اس کا بچپن اور جوانی یہانی گیٹ اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں گزری تھی۔ جن جگہوں پر پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزیں بن چکی تھیں، اسے ان مقامات کو پہچاننے میں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ البتہ اب ساجد کے انتظار میں چند منٹ گزارنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ساجد ٹھیک دس بجے ہی آئے گا۔ راشد سوچ رہا تھا۔ "ساجد کو شاید مجھ جتنی بے تابی نہیں ہے۔"

وہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ بس اسٹاپ اب بھی قریب ہی تھا۔ وقفے وقفے سے وہاں بسیں آ رہی تھیں۔ کچھ بسیں اوور ہیڈ برج سے بھی گزر رہی تھیں تاہم علاقے میں اتنا رش اور گہما گہمی نہیں تھی جتنی راشد کو توقع تھی۔ شاید اس کی وجہ موسم بھی تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی اور کچھ دیر پہلے کی ہلکی سی بارش نے اس میں اضافہ کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے رات کے دس بجے ہی سڑکوں پر ویرانی پھیلنے لگی تھی۔ اوپر سے لائٹ بھی گئی ہوئی تھی۔ راشد جہاں ٹہل رہا تھا، وہاں ملگجا سا اندھیرا ہی تھا۔ وہ بار بار بے تابی سے سر گھما کر اِدھر اُدھر آتے جاتے ہیولا نما انسانوں کو دیکھنے لگتا۔ ساجد اسے کسی طرف سے آتا جاتا دکھائی نہ دیا۔ آخر اسے ذرا تھکن کا احساس ہوا اور وہ سڑک سے ذرا پیچھے ہٹ کر گیراج سے متصل ایک دکان کے تھڑے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے۔

عین اس وقت جب اس کے خیال میں دس بج چکے تھے اور وہ ایک مرتبہ پھر گھڑی دیکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، ایک پولیس موبائل اس کے عین قریب آ کر رکی۔ وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا سا گیا۔ شاید پولیس والوں کو اس کے کھڑا ہونے کا انداز کچھ مشکوک لگا تھا اس لیے انہوں نے جاتے جاتے موبائل روک لی تھی۔

موبائل کی کھڑکی کا دھندلا شیشہ نیچے ہوا لیکن کیبن میں موجود ڈرائیور یا اس کے قریب پسنجر سیٹ پر بیٹھے پولیس والے کی شکل راشد کو ذرا بھی ٹھیک طرح نظر نہیں آئی۔ بس یہ احساس ہوا کہ وہ دونوں وردی میں تھے اور ان کے سروں پر پولیس کی مخصوص ٹوپیاں تھیں۔ راشد کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تھا۔ سگریٹ نوشی اس نے چند سال پہلے شروع کی تھی۔

اضطراری سے انداز میں اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر لائٹر سے سلگایا اور گہرا کش لیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ شاید موبائل کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے پولیس والے نے لائٹر کے شعلے کی روشنی میں اس کا چہرہ غور سے دیکھا تھا۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ شاید سگریٹ سلگا کر اس نے غلطی کی تھی لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ پولیس والوں کی تو یہ عادت ہوتی ہے۔ وہ موٹر سائیکل پر، پولیس کار میں یا موبائل میں گشت کرتے وقت اِدھر اُدھر بے مقصد سے انداز میں کھڑے لوگوں کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوتے ہیں۔ راشد بس اسٹاپ سے بھی کچھ دور ہی کھڑا تھا اس لیے یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ وہ بس کا انتظار کر رہا تھا۔

موبائل انجن کی گھرر گھرر کے درمیان آخر کار پولیس والے نے پوچھ ہی لیا۔ "بھائی صاحب! خیریت ہے...... آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں...... کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟" لہجہ نرم، مہذبانہ اور شائستہ تھا۔ اس میں وہ درشتی، کرختگی یا سختی نہیں تھی جو راشد کے خیال میں اکثر پولیس والوں کے لہجے میں ہوتی تھی۔

"جی ہاں! میں اپنے ایک پرانے دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ ہماری ملاقات طے ہے۔ اسے یہاں آنا ہے۔" راشد نے بھی نرمی اور شائستگی سے جواب دیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی بیش قیمت گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس کا لباس بھی عمدہ تھا۔ اپنی شخصیت اور پہناوے سے وہ مکمل طور پر ایک کامیاب اور آسودہ حال آدمی نظر آ رہا تھا۔ اگر کسی کو معلوم ہوتا کہ پچیس سال کراچی میں گزار کر آیا تھا تو وہ یقیناً یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ راشد نے وہاں کسی پیشے یا کاروبار میں بہت کامیابی حاصل کی ہوگی۔ وہ جب لاہور سے گیا تھا تو تھرڈ ریٹ سے

جسم کا نوجوان تھا۔ اب اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا اور کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اسے خود بھی اپنے سراپا میں رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کا احساس تھا اور یہاں آتے وقت اس نے کئی بار تجسس سے سوچا تھا کہ ساجد کی شخصیت میں نہ جانے کیا تبدیلیاں آئی ہوں گی۔

پولیس والے نے گردن گھما کر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جو راشد کو بالکل نظر نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے شاید آپس میں کوئی مختصر سی بات بھی کی تھی۔ پولیس والا دوبارہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے پہلے سے زیادہ خوشگوار لہجے میں راشد سے مخاطب ہوا۔ ”سر جی! کچی بات ہے نا..... آپ جس پرانے دوست کے انتظار میں کھڑے ہیں، وہ بندہ ہی ہے..... خاتون تو نہیں ہے نا؟“

راشد کو پولیس والے کی اس بے تکلفی پر ذرا حیرت بھی ہوئی لیکن چونکہ اس نے نہایت دوستانہ اور خوشگوار لہجے میں پوچھا تھا اور شاید وہ اپنی دانست میں مذاق کر رہا تھا، اس لیے راشد نے بھی خوشگوار سے لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں جناب! میں اتنا بدذوق نہیں ہوں کہ کسی خاتون کو اس قسم کی سڑک کے کنارے ملنے کا ٹائم دیتا۔ شہر میں بہت سارے اچھے ہوٹل موجود ہیں۔ سڑکوں کے کنارے تو عام طور پر مردوں کی مردوں سے ہی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔“

”ارے نہیں بھائی صاحب! سڑکوں کے کنارے بے شمار بندوں کی بھی بے شمار خواتین سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ بعد میں چاہے یہ ملاقاتیں ہوٹلوں میں جا کر ہی ختم ہوتی ہوں۔ لگتا ہے، آپ کو تجربہ نہیں ہے۔“ پولیس والے نے یہ کہتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور موبائل ڈرائیو کرنے والے نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

راشد قدرے تعجب سے سر جھٹک کر رہ گیا۔ آج سے پہلے کسی پولیس والے نے اتنے دوستانہ انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ دس بج کر تین منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کسی طرف سے ساجد کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ جتنی اچھی طرح وہ ساجد کو جانتا تھا، اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے امید تو نہیں تھی کہ ساجد وعدہ خلافی کرے گا لیکن اب راشد یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس قسم کا وعدہ کرنا کوئی خاص عقل مندی کی بات بھی نہیں تھی۔ پچیس سال بہت طویل عرصہ تھا۔ انسان کو پتا نہیں ہوتا کہ کل اس کی زندگی میں کیا ہو جائے۔ پچیس سال میں تو نہ جانے کیا کیا انقلاب آ سکتے تھے۔ انسان بدل بھی سکتا تھا۔ بہت سی اہم

چیزیں اس کی زندگی میں غیر اہم بھی ہو سکتی تھیں۔ اس کے نظریات بدل سکتے تھے۔ وہ شہر چھوڑ کر بھی جا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ دنیا چھوڑ کر بھی جا سکتا تھا۔

یہاں پہنچ کر راشد نے اپنے خیالات کے بے لگام گھوڑے کو لگام ڈالی۔ وہ اپنے عزیز ترین اور اکلوتے دوست کے بارے میں یہ امکان ذہن میں نہیں لانا چاہتا تھا کہ وہ دنیا چھوڑ گیا ہوگا۔ ساجد تو ویسے بھی عمر میں اس سے دو سال چھوٹا ہی تھا۔ یہ سب کچھ تو اس نے سوچ لیا لیکن یہ سوال بہرحال اسے پریشان کر رہا تھا کہ ساجد ابھی تک آیا کیوں نہیں تھا؟ ویسے تو اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ جس معاشرے کا فرد تھا، اس میں دو چار منٹ کی تو کیا، دو چار گھنٹے کی تاخیر بھی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی لیکن ساجد سے وہ دو چار منٹ کی تاخیر کی بھی توقع نہیں رکھتا تھا۔ خواہ ملاقات کا یہ وقت پچیس سال پہلے طے ہوا تھا۔

پولیس موبائل گو کہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ شاید کربلا گامے شاہ کی طرف مڑ گئی تھی لیکن راشد اب بھی قدرے اضطراب محسوس کر رہا تھا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے چل دے اور بعد میں کسی روز ساجد کے گھر جائے یا کسی اور طرح اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے لیکن پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کم از کم آدھا گھنٹا

ساجد کا انتظار ضرور کرے گا۔ آدھا گھنٹا انتظار کرنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔

اس نے ایک اور سگریٹ سلگالیا۔ دو تین کش لینے کے بعد وہ منتظر انداز میں کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف دیکھنے لگا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے سے گزرنے والے اِکا دُکا لوگوں میں سے کسی کسی نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کیے ہوئے تھے۔ کسی نے سر اور گردن پر اسکارف لپیٹا ہوا تھا اور کوئی گرم ٹوپی سر پر رکھے ہوئے تھا۔ راشد کو اندازہ نہیں تھا کہ رات میں سردی اتنی بڑھ جائے گی۔ وہ ایک نفیس شلوار سوٹ، بہترین ویسٹ کوٹ اور ہلکے پھلکے جوتے پہن کر اس ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا تھا جہاں اس نے کراچی سے آکر قیام کیا تھا۔ اب اسے احساس ہورہا تھا کہ اس کا بیش قیمت اور نفیس مگر ہلکا پھلکا لباس سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے جسم میں جھرجھریاں سی دوڑ رہی تھیں۔

دس بج کر گیارہ منٹ پر ایک شخص اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ گلے میں مفلر اس نے اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ آدھا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی تھی۔ راشد کو اس کا چہرہ ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دیا۔

وہ چند قدم دور سے ہی ذرا ہچکچاہٹ مگر نہایت پرجوش آواز میں بولا۔ ”تم.....تم راشد ہونا؟“

راشد کی انتظار کی کوفت یکدم ہی دور ہوگئی۔ اس کے سر سے جیسے کوئی بوجھ سا ہٹ گیا۔

”اور تم ساجد ہونا.....؟“ اس کے لہجے میں بچوں جیسا اشتیاق تھا۔

”ہاں!“ اس شخص نے قریب آکر بازو پھیلا کر اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا، مجھے تھوڑی سی دیر ہوگئی.....“ شاید فرطِ اشتیاق سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”دراصل میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے نا..... جس رکشے میں آرہا تھا، وہ راستے میں خراب ہوگیا اس لیے مجھے تھوڑی سی دیر ہوگئی۔ اب میں بھاٹی میں نہیں، حسن آباد میں رہتا ہوں۔“ اس نے گرمجوشی سے راشد کو بھینچتے ہوئے ساری وضاحت کردی۔

راشد نے محسوس کیا کہ ساجد پہلے کے مقابلے میں کافی موٹا ہوچکا تھا۔ اس کی اچھی خاصی توند نکل آئی تھی۔ چہرہ بھی بھاری بھاری سا ہوگیا تھا۔ پہلے وہ کلین شیو ہوا کرتا تھا۔ اب اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں۔ راشد کو اس کی آواز بھی پہلے کے مقابلے میں کچھ بھاری لگی۔

”ظاہر ہے..... پچیس سال کچھ کم مدت نہیں ہوتی۔ عمر کے ساتھ ساتھ انسان میں بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ خود مجھ میں بھی نہ جانے کتنی تبدیلیاں آچکی ہوں گی..... لیکن انسان کو خود اپنے اندر آنے والی تبدیلیوں کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔“ راشد نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم آج کی رات ضرور یہاں پہنچو گے۔“ ساجد نے اس کی پیٹھ تھپک کر الگ ہوتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ محبت اور گرمجوشی سے تھام لیا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم اپنا وعدہ نہیں بھولو گے اور حالات خواہ کچھ بھی ہوں، تم چاہے جہاں بھی ہو، لیکن مقررہ دن اور مقررہ وقت پر تم یہاں ضرور پہنچو گے..... بلکہ مجھے تو امید تھی کہ تم مجھ سے پہلے یہاں میرے انتظار میں کھڑے ہوگے کیونکہ مجھے تو کراچی سے آنا تھا لیکن تمہیں تو یہاں قریب سے ہی آنا تھا۔ میرے خیال میں تو تم ابھی تک بھاٹی میں ہی رہ رہے تھے۔“ راشد بھی مسرت آمیز جوش سے بولا۔ خوشی اس کے چہرے سے بھی عیاں تھی لیکن ملگجے اندھیرے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے تاثرات صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔

”دراصل تم نے جو شرط رکھ دی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے بالکل رابطہ نہیں رکھیں گے، اس کی وجہ سے پچیس سال تک ہم ایک دوسرے کے حال احوال سے بالکل ہی بے خبر رہے۔ میں تمہیں یہ تک نہیں بتاسکا کہ میں بھاٹی سے حسن آباد چلا گیا ہوں۔“ ساجد نے کہا۔ اس کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا۔

”اس بے خبری میں ہی تو سارا سسپنس اور لطف تھا یار!“ راشد اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”اگر ان پچیس برسوں کے دوران ہم ایک دوسرے کے پورے حال احوال سے واقف ہوتے تو یہ مزہ تھوڑا ہی آنا تھا جو اس وقت اس ملاقات میں آرہا ہے۔“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ ساجد نے تسلیم کیا۔

”میں ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا، جو کامیاب رہا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ہم دونوں اس تجویز پر بالکل اسی طرح عمل کرپائیں گے جس طرح ہمارے درمیان طے پایا تھا۔“ راشد بولا۔

”کچی بات یہ ہے کہ اس پروگرام پر پوری طرح عملدرآمد صرف تمہاری وجہ سے ممکن ہوسکا۔“ ساجد نے تحسین آمیز انداز میں راشد کو ایک بار پھر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم شاید اپنے ارادے پر ثابت قدم رہے ورنہ میرا تو کئی بار جی چاہا کہ تمہارا کھوج لگانا شروع کردوں، حال احوال معلوم کروں،

بلکہ ہوسکے تو تمہیں تلاش کر کے ملنے کی بھی کوشش کروں۔''

''اچھا ہوا تم نے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی۔'' راشد ہولے سے ہنسا۔''تم مجھے تلاش کرنے یا رابطہ کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ تمہیں میرا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔''

''اچھا! تو کیا تم نے کراچی جا کر ایسی پراسراریت کی چادر اوڑھ لی تھی؟'' ساجد نے قدرے تعجب سے کہا۔

''ہاں یہی سمجھ لو۔'' راشد بے پروائی سے بولا پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔''اب پروگرام کیا ہے؟ کیا ہم یہیں کھڑے باتیں کرتے رہیں گے؟''

''نہیں...... نہیں......'' ساجد جلدی سے بولا۔''چل کر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔ اگر تم نے ابھی کھانا نہیں کھایا تو کھانا کھاتے ہیں، چائے پیتے ہیں۔ گپ شپ بھی چلتی رہے گی۔ میں نے تو تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اتنے طویل عرصے بعد تم سے ملاقات کے خیال سے کچھ ایسی حالت تھی کہ کھایا ہی نہیں گیا۔''

''کھانا میں نے بھی نہیں کھایا۔'' راشد بولا۔

''چلو...... نعمت کدہ چلتے ہیں۔ وہاں تک تو پیدل بھی جاسکتے ہیں۔'' ساجد بولا۔

''ٹھیک ہے...... وہیں چلتے ہیں۔'' راشد نے فوراً اس کی تجویز قبول کر لی۔''کوئی زمانہ تھا کہ ہم نعمت کدہ میں کھانا افورڈ نہیں کر سکتے تھے لیکن آج اگر تم چاہو گے تو وہاں جتنے بھی کھانے پکے ہوں گے اور جتنی بھی مقدار میں پکے ہوں گے، وہ سب میں تمہیں خرید کر دے سکوں گا۔''

''میں اتنے کھانوں کا کیا کروں گا......'' ساجد ہنس کر بولا۔''ویسے بھی اس وقت تم میرے مہمان ہو، کھانے کا بل میں ادا کروں گا۔''

''چلو...... خیر...... یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔'' راشد نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر کہا۔

دونوں کچھ دور چلنے کے بعد سرکلر روڈ کی طرف مڑ گئے اور پھر ان کا رخ انارکلی کی طرف ہو گیا۔ ساجد کا بازو راشد کے کندھوں پر ٹکا ہوا تھا اور راشد کو وہ بازو خاصا بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ ساجد نے شاید اپنائیت اور محبت کی وجہ سے اسے تقریباً اپنے ساتھ لگا رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ ذرا آہستہ چل پا رہے تھے۔

تقریباً آدھا فرلانگ چلنے کے بعد وہ ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے سے گزرنے لگے تو تیز روشنی میں نہا گئے۔ تب دونوں نے ہی گردن گھما کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شاید جب سے ان کی ملاقات ہوئی تھی، تب سے ہی وہ ایک دوسرے کو روشنی میں اچھی طرح دیکھنا چاہ رہے تھے۔

راشد نے آہستگی سے ساجد کا بازو اپنے کندھوں پر سے ہٹا دیا اور آنکھیں سکیڑ کر ذرا اور غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولا۔''تم ساجد نہیں ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ پچیس سال بہت طویل عرصہ ہوتا ہے لیکن اتنے عرصے میں ایک نوجوان کے نین نقش تو نہیں بدل جاتے۔ تمہاری ناک تو خاصی اونچی اور تیکھی سی ہوا کرتی تھی۔ اب تمہاری ناک پکوڑا سی دکھائی دے رہی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

پھر راشد کی توجہ گویا ایک اور چیز کی طرف گئی۔ اس نے شاید اپنے اور ساجد کے قد کا موازنہ کیا۔ اس کے لہجے میں اور بھی زیادہ بے یقینی جھلک آئی۔''ارے...... تمہارا تو قد بھی مجھ سے ذرا بڑا ہو گیا ہے۔ میں جب لاہور سے گیا تو میری طرح تم بھی جوان تھے۔ انسان مکمل جوان ہو جائے تو اس کے بعد اس کے نین نقش نہیں بدلتے اور نہ ہی قد بڑھتا یا گھٹتا ہے۔ البتہ عمر کافی زیادہ ہو جانے کے بعد شکل کچھ بگڑ جاتی ہے۔ وجاہت اور کشش ختم ہو جاتی ہے لیکن ہم دونوں ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے۔ تم میں یہ تبدیلیاں کہاں سے آگئیں؟ سچ سچ بتاؤ...... تم کون ہو اور ساجد بن کر مجھ سے کیوں ملے ہو؟ تمہیں کیسے معلوم تھا کہ میں آج رات اس ریسٹورنٹ کے سامنے...... میرا مطلب ہے اس گیراج کے سامنے ساجد کا انتظار کر رہا ہوں گا؟''

راشد اب اس شخص سے ذرا دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا جو اپنے دعوے کے مطابق ساجد تھا۔ اسی دوران راشد کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے اپنی قمیص کے نیچے گیا تھا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں المونیم کے رنگ کا ایک پستول چمک رہا تھا جس کا رخ ''ساجد'' کی طرف تھا۔

تب ساجد نے گہری سانس لی اور راشد کی گن سے ذرا بھی خوفزدہ ہوئے بغیر بزرگانہ سے لہجے میں کہا۔''گولی چلانے کی بے وقوفی نہ کرنا۔ تم اس وقت تین طرف سے سادہ لباس والوں کے گھیرے میں ہو۔ چوتھی طرف میں کھڑا ہوں۔ تم اگر فائر کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تب بھی فرار نہیں ہوسکو گے، مارے ضرور جاؤ گے۔''

اسٹریٹ لائٹ کے نیچے ویسے ہی راشد کا چہرہ کچھ زرد سا نظر آ رہا تھا۔ اب وہ کچھ اور زرد دکھائی دینے لگا۔

"ساجد" نے پُرسکون لہجے میں بات جاری رکھی۔
"سچی بات تو یہ ہے کہ پچھلے دس منٹ سے ...... یعنی جب وہ پولیس موبائل تمہارے پاس آکر رکی تھی...... اس وقت سے تم زیرِ حراست ہو۔ یعنی پولیس روزنامچے میں تمہاری گرفتاری کا وہی وقت درج ہوگا۔ یوں سمجھو کہ اس وقت تم ایک گرفتار شدہ مجرم کی حیثیت سے مجھ سے بات کر رہے ہو۔ اگر تم نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ذرا سا بھی بڑھایا تو تمہارا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا......"

راشد نے کن انکھیوں سے اپنے اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے احساس ہوا کہ آس پاس کچھ باوردی پولیس والے موجود تھے اور شاید ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں جن کا رخ اسی کی طرف تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

"ساجد" نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ہے اور اس ہاتھ کی انگلی ایک پسٹل کے ٹریگر پر ہے۔ میں تو تمہیں فائر کرنے کا موقع بالکل ہی نہیں دوں گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم میرے سامنے یہ سب کیا بکواس کر رہے ہو؟ تمہیں ساجد بن کر مجھ سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اصل ساجد کہاں ہے؟" راشد تھوک نگل کر بولا۔ اب اس کے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"اصل ساجد صاحب اس پولیس موبائل میں تھے جو تمہارے پاس آکر رکی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھے۔ خود موبائل چلا رہے تھے۔ انہیں اچھا نہیں لگا کہ اپنے بچپن کے دوست کو خود گرفتار کریں، اس لیے انہوں نے یہ ذمے داری مجھے سونپی تھی۔"

"لیکن کیوں......؟ تم لوگ مجھے کیوں گرفتار کر رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟" راشد نے شاید چلّانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔

"تمہارے ہاتھ میں جو پستول ہے، اگر اس میں جان ہوتی تو شاید یہ بھی تمہارے سوالات کا جواب دے دیتا۔" نقلی ساجد نے ترحم آمیز سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بڑی جرأت ہے کہ اب بھی چلّانے کی کوشش کرتے ہوئے اس قسم کے سوال کر رہے ہو۔"

"تم ان سوالوں کے جواب دے دو نا......" راشد کے لہجے میں اب لجاجت سی آگئی۔ اس نے پستول والا ہاتھ بھی نیچے کرلیا۔ اس کے چہرے پر شکست خوردگی تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا...... پچیس سے پچاس سال کی عمر کے درمیان انسان کی شکل اتنی نہیں بدلتی جتنی بدلی ہوئی تمہیں میری شکل لگ رہی تھی...... اور نہ ہی اس کا قد بڑھتا یا گھٹتا ہے...... لیکن اس دوران اندر سے انسان ضرور بدل سکتا ہے...... بہت زیادہ بدل سکتا ہے۔ ایک شریف نوجوان سے ایک خطرناک ڈاکو بن سکتا ہے، گینگسٹر بن سکتا ہے جیسے تم بن گئے ہو......!" نقلی ساجد ترحم آمیز سے انداز میں راشد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" راشد نے برہمی کا اظہار کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا لہجہ کمزور تھا۔ "کیا تم مجھے ڈاکو یا گینگسٹر کہہ رہے ہو؟ ایک شریف آدمی کو...... جو پچیس سال بعد اپنے دوست سے ملنے آیا ہے۔ تم مجھے کس چکر میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"میں پھنسانے کی کوشش نہیں کر رہا...... انجانے میں تم خود ہی آن کر پھنس گئے ہو...... اور ٹھیک ہی پھنسے ہو۔ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ تم اپنے جس دوست سے ملنے آئے تھے، یوں سمجھو کہ وہ تم سے مل کر جا چکا ہے۔ انہوں نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ موبائل سے اتر کر وہ اس لیے نہیں ملے کہ اب وہ تم سے دوستوں کی طرح نہیں مل سکتے تھے۔ اب تم اور ساجد صاحب ندی کے دو کناروں کی طرح ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔ تم ایک مفرور مجرم ہو، وہ پولیس آفیسر ہیں...... قانون کے محافظ...... پرسوں انہیں اتفاق سے کمپیوٹر پر پولیس کے بین الصوبائی نیٹ ورک پر ایک تصویر نظر آگئی۔ تصویر روٹین میں، محض ضابطے کی کارروائی کے طور پر بھیجی گئی تھی۔ وہ تصویر ایک ڈاکو اور چھوٹے سے مفرور گینگسٹر کی تھی جو کراچی پولیس کو کئی ڈاکوں اور ایک قتل کے سلسلے میں مطلوب تھا۔ امکان ظاہر کیا گیا تھا کہ شاید اس کا تعلق لاہور سے ہے اور وہ پنجاب کی طرف ہی فرار ہوا ہے۔ انسپکٹر ساجد صاحب بھاٹی گیٹ تھانے کے ایس ایچ او ہیں۔ انہیں وہ تصویر دیکھ کر شدید حیرت ہوئی اور دھچکا بھی کیونکہ انہوں نے اپنے بچپن کے دوست کو پہچان لیا تھا جس کے بارے میں نیٹ ورک پر بتایا گیا تھا کہ وہ چند سال پہلے ایک بار گرفتار ہو چکا ہے لیکن صرف تین ماہ قید کاٹ کر رہا ہو گیا تھا۔ کراچی پولیس کو ایک بار پھر شدت سے اس کی تلاش تھی۔ انسپکٹر ساجد کو یقین تھا کہ ان کا بچپن کا دوست اب خواہ ایک مفرور ڈاکو اور گینگسٹر سہی لیکن وہ یکم جنوری 2020ء کو رات دس بجے اپنا ملاقات کا وعدہ پورا کرنے مقررہ جگہ پر ضرور آئے گا۔"

xxx

موسم کسی شوخ ادا حسینہ کے مزاج کی طرح ہو رہا تھا۔ صبح کی اجلی فضا میں خنکی گھلی ہوئی تھی اور دھوپ کی چمک بھی بجھی بجھی سی لگتی تھی لیکن ایک گھنٹے بعد خلاف ہوا اجلی محسوس ہونے لگی۔ سڑک کی سیاہی پر لین کی نشان دہی کرنے والی لکیر کی سفیدی بڑھ گئی اور دونوں سمت سے آنے والی گاڑیوں کی تعداد دوگنی چوگنی ہو گئی۔ پیچھے بیٹھی شائکہ عرف شی نے ایک بازو شاہد کی کمر کے گرد حمائل کر رکھا تھا اور دوسرے سے شانوں تک تراشیدہ بالوں کو اڑ کر چہرے پر آنے سے روکنے میں مسلسل مصروف تھی۔ اسی شولڈر پر معلق وینڈ بیگ اسٹریپ چھوٹا ہو جانے کے بعد قابو میں آ گیا تھا۔ موٹر سائیکل تیز رفتاری میں کاروں کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ گاڑیوں کے ڈرائیور شی کو دیکھ کر فحش اشارے بھی کرتے

بھنور

احمد اقبال

اکثر انسان خودسری کی انتہا کو چھو کر ایسا دھوکا کھاتا ہے کہ اپنی ہی جنت کو آگ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس شیطان کے جھانسے میں آکر کانٹوں پر چلنے کے لیے مجبور ہو گئی... لیکن زخموں سے رستے لہو نے اسے ایسا عزم بھی دیا کہ دھوکا دینے والے بھی دھوکا کھا گئے اور آخری لمحوں تک اس بھید کو نہ پا سکے۔

تھے یا اس کے حسن کی تابانی اور ملبوس کی جلوہ نمائی سے ہکا بکا رہ جاتے تھے۔ ثمی کے بال اڑ رہے تھے اور چست لباس جسم سے مزید چپک گیا تھا۔ اس فلائنگ فیشن شو کے رسپانس سے وہ بہت اچھا محسوس کر رہی تھی اور بھی شکر یہ کی ایک جادو بھری مسکراہٹ بھی لٹا دیتی تھی۔ اس کا اپنی قوت تسخیر پر اعتماد خاصا بحال ہو چکا تھا۔ تیئس سال کی عمر میں سے آٹھ دس نکالنے کی کوشش ابھی تک کامیاب تھی۔ یوں چوبیس سال کا شاہد اس سے دو چار برس زیادہ کا ہو گیا تھا۔ یہ شاہد کی زندگی پر ملکیت کے تمام حقوق حاصل کرنے کی آخری کوشش تھی کہ وہ لاہور سے اس کے ساتھ پنڈی جا رہی تھی۔

گھر میں بھی جھوٹ بولنا مشکل نہ تھا۔ اماں ابا سادگی کی عادت میں سب سچ مان لیتے تھے لیکن چھوٹا بھائی شادی کر کے اچانک بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی زبان بند کرنے کے لیے ثمی کا ایک سچ کام کرتا تھا۔

''تمہیں ہر لڑکی اپنی بیوی جیسی چالباز تو لگے گی بھیا مگر میرے کردار کی ٹھیکے داری مت کرو۔'' اپنی بھابی کی پیروی تو وہ کب سے کر رہی تھی لیکن خرابی یہ تھی کہ قسمت کے ستارے عین وقت پر اپنی چال بدل لیتے تھے جب کامیابی کے خواب کی تعبیر نظر آنے لگتی تھی۔ اب مدت سے ورکنگ ویمن ہاسٹل میں اس کی زندگی میں کسی کی مداخلت نہیں تھی لیکن اس کا ہر انتخاب فریب آرزو ثابت ہوا تھا۔

نوبت یہ آ گئی تھی کہ اس کے خوابوں کا کوئی شہزادہ، کسی صنعت کار کا اکلوتا وارث، کوئی سی ایس ایس، کوئی چھیل چھبیلا کپتان، ڈاکٹر، انجینئر زیر دام آیا نہیں تھا۔ باقی اپنا الو سیدھا کر کے صاف نکل گئے تھے۔ بھولے بھالے نظر آنے والے ایک سے بڑھ کر ایک کمینے ثابت ہوئے تھے۔

شاہد نے رفتار کم کیے بغیر بائیک گھمائی اور ایک دم بریک لگا کے روک لی۔ ثمی نے ایک چیخ مار کے اپنے سارے وجود کا بوجھ شاہد پر ڈال دیا۔ ''کیا کرتے ہو یار۔'' اس نے ایک ادائے ناز سے کہا اور ہم آغوشی کے منظر میں دیکھنے والوں کے لیے وقتی سنسنی پیدا کی پھر شاہد کے بازو پر جھولتی وہ اندر جانے والے راستے پر چلنے لگی۔ وہ انٹرچینج کے مختصر سے باغیچے سے گزر کے ایک میز پر بیٹھ گئے جس پر رنگین چھتری سایہ فگن تھی۔ کافی بھی یہاں کم بری نہ تھی لیکن پیپر کپ والی چائے سے بہرحال بہتر تھی۔ ثمی نے اپنے گورے گداز بازو اٹھا کے ہوشربا قسم کی انگڑائی لی اور بیگ ٹیبل پر رکھ کے واش روم کی طرف چلی گئی۔ شاہد نے رشک سے دیکھنے والوں کے سامنے خود کو سکندر جیسا فاتح اعظم محسوس کیا۔

فون کی گھنٹی پر اس کی نظر نے کال کرنے والے کے نام کو دیکھا۔ یہ وقت بے وقت اس کو فون کر کے اس کے اخلاق اور کردار کی اصلاح کرنے اور اس کی عاقبت سنوارنے والے امام چاچا تھے جو آج کل اسے بتاتے رہتے تھے کہ اولاد صالح کی حیثیت سے اس کو کیا کرنا چاہیے۔ خیر خواہی کے مرض کو وہ اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ وہ ان کی سب باتیں اس لیے سن لیتا تھا کہ گاؤں میں وہی اس کے بیمار باپ کا خیال رکھنے والے بھی تھے۔ ان کا فون وہ اکثر ریسیو نہیں کرتا تھا۔

دوسری بار ان کی کال پھر آئی جب وہ اسلام آباد کے قریب چکری انٹرچینج پر کچھ کھانے کے لیے رکے تھے۔ ثمی برگر اور کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دینے کے لیے اندر گئی تھی جب شاہد کے فون پر امام چاچا کی کال آئی۔ ''پتر شاہد! کدھر ہو تم؟ آفس میں؟''

''ہاں چاچاجی! اس وقت اور کہاں جا سکتا ہوں۔''

''اچھا وہ بتانا یہ تھا کہ ماں تیری بہت بیمار ہے۔''

شاہد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اب مجھے بتاؤ کہ اتنی دور بیٹھ کے میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''وہ کل بے ہوش ہو گئی تھی۔ حکیم عباسی نے کہا دل کا دورہ تھا۔ اسے شہر لے جانے کا کہہ رہا تھا۔''

''امام چاچا! آج تو میں نہیں آ سکتا۔ بہت کام ہے۔ کل دیکھوں گا شام تک۔ آواز نہیں آ رہی آپ کی۔ سگنل خراب ہے ادھر۔ ہیلو... ہیلو۔'' شاہد نے اپنا لہجہ سپاٹ رکھا۔

''کل تک دیر نہ ہو جائے پتر۔'' امام چاچا نے کہا لیکن اس وقت تک شاہد فون بند کر چکا تھا۔

ثمی نے سب چیزیں درمیان میں رکھ دیں۔ ''کس کا فون تھا؟ وہی دفتر والے ہوں گے۔ اب کال آئے تو مجھے دینا فون۔ میں بات کروں گی۔ تم ان کو جھاڑ نہیں لگا سکتے۔ کیسے باس ہو؟''

شاہد ہنس پڑا۔ ''پاگل جو کر رکھا ہے تم نے۔ شادی کے بعد نمٹ لینا سب سے۔ سب کا باس میں... میری باس تم۔''

☆☆☆

فائیو اسٹار کہلانے والے ہوٹل کا کمرا بہت پرتکلف تھا مگر ثمی کو عجیب سی تھکن اور بے چینی کے احساس نے آ لیا تھا۔

''یہ تو تمہارا شہر ہے یار۔'' اس نے شاہد کو دیکھا جو واش روم سے فریش ہو کے نکلا تھا۔ ''تمہارے عزیز رشتے دار و دوست سب ہوں گے یہاں۔''

''ہاں، بہت ہیں لیکن تمہیں ساتھ لے کر میں کہیں بھی

جاتا، سو سوال کرتے سب۔ ایک دن کی تو بات ہے۔ ہوٹل ٹھیک ہے۔''

''اور اگر تمہارے ممی ڈیڈی کسی وجہ سے کل بھی لوٹ کر نہ آئے پھر؟'' ثمی کی فکرمندی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

وہ ہنس پڑا۔ ''کیوں نہیں آئیں گے جانو۔ ڈیڈی سے بات ہوگئی ہے میری۔ مجھ پر خفا ہونے لگے کہ آنے سے پہلے بتایا کیوں نہیں؟ کر لو بات۔ میں نے کہا کہ پہلے کب بتاتا ہوں؟ اپنے ہی گھر آیا ہوں نا۔ غلطی آپ کی ہے جو مجھے بتائے بغیر لاہور نکل لیے۔ بس اتنا کہنا غضب ہو گیا۔ چلّانے لگے کہ غلطی میری نہیں اس دوست کی ہے جو مجھے بتائے بغیر مر گیا؟ پھر امی نے فون لے لیا اور کہا کہ بیٹا ایک رات کی تو بات ہے۔ کل ہم آجائیں گے۔ ہوٹل کا مشورہ انہی کا تھا۔ چاچے ماے سب ایسے ہیں کہ باتیں بناتے۔''

ثمی نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم لوگوں نے چوکیدار بھی نہیں رکھا اتنی بڑی کوٹھی میں۔''

شاہد ہنسا۔ ''اتنی بڑی کیا۔ چھ سو گز ایک کنال ہیں یہاں۔ کوٹھیاں تو ہوتی ہیں، چار چھ اور دس کنال کی اسلام آباد میں۔ ابا نے چالیس سال پہلے یہ کوٹھی بنائی تھی۔ وہ بگڑ جاتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد جہاں چاہو چلے جانا۔''

ثمی نے اتفاق میں سر ہلایا۔ ''اتنے پرانے فیشن کے ابا ہماری شادی پر کیسے مانیں گے یار؟''

''وہ بس پٹاخہ ہیں۔ آواز بہت لیکن ان سے ڈرتا کوئی نہیں۔ ایک تو میں اکلوتا۔ دوسرے ابا کا اسٹیئرنگ اماں کے ہاتھ میں ہے۔ تم دیکھتی جاؤ، کیسے یوں راضی ہوں گے، یوں۔'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''چلو اٹھو مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔''

''یار! کھانا یہیں نہ منگوا لیں؟ یہی کپڑے پہن کے ہال میں بیٹھنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' ثمی نے اپنے سراپا کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا۔

شاہد نے کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے کھینچ لیا۔ ''کم آن یار! میں بھی تو انہی کپڑوں میں ہوں۔ وہاں دیکھنے والے تمہیں دیکھیں گے۔ کپڑوں کو تو بس برداشت کریں گے۔'' وہ آنکھ مار کے بے شرمی سے ہنسا۔

کھانے سے فراغت کے بعد رات گیارہ بجے ثمی کا حال تھکن سے برا تھا لیکن شاہد کو ہوٹل میں خلوت نے بہت زیادہ رومانٹک کر رکھا تھا۔ ثمی سوچتی رہی کہ یوں موٹر سائیکل پر بیٹھ کے ایک دم نکل آنے کا ایڈونچر کرنے سے پہلے وہ دو چار جوڑے سوٹ کیس میں ڈال لیتی تو اچھا تھا لیکن شاہد نے مہلت ہی کہاں دی۔ اسے اپنی عجلت اب بڑی حماقت محسوس ہو رہی تھی۔ شاہد نے کہا تھا کہ یار تم ریڈی میڈ پہنتی ہو تو فکر کیسی۔ پہلے تمہارے کپڑے لیں گے پھر گھر جائیں گے۔ وہ اس خیال کی اسیر ہو کے ہوش کھو بیٹھی تھی کہ جس دن کی پلاننگ اس نے چھ مہینے پہلے کی تھی وہ قسمت کی لاٹری بن کے اچانک آ گیا تھا۔ بالآخر زندگی نے اسے خوابوں کی تعبیر دے دی تھی۔ جذبات کی یلغار میں اسے لگا تھا جیسے سب الٹا ہو گیا لیکن فکر کی بات کوئی نہیں تھی۔ بازی اس نے جیت لی تھی۔ احساسِ طمانیت کی آسودگی میں نیند اس پر موت کی بے ہوشی بن کے اترتی چلی گئی۔

☆☆☆

شاہد کے کان میں اس کی رسٹ واچ کا الارم آہستگی سے گنگنایا۔ اس نے الارم کو آف کر کے ثمی کو دیکھا جو آنکھیں موندے بے سدھ پڑی تھی۔ شاہد نے نرمی سے اس کا نرم ریشمی بازو الگ کیا اور کروٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔ کپڑے بدلنے کی ضرورت ابھی نہیں تھی۔ خاموشی سے جوگر پہن کے اس نے بالوں میں برش پھیرا اور بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ثمی کا سنہرا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔ اس کے کریڈٹ کارڈ کے ساتھ ہزار پانچ سو اور سو کے سارے نوٹ اس نے فولڈ کر کے پتلون کی دائیں جیب میں رکھے۔ پھر پچاس والے نوٹ بھی نکال لیے۔ بیگ میں اب بیس روپے رہ گئے تھے۔ عادت کے مطابق وہ اپنا زیور بھی اتار لائی تھی۔ شاہد کا چھ ماہ قبل کا دیا ہوا نیکلس سیٹ زیادہ بھاری تھا اور سونے کی قیمت کے بڑھنے سے دگنی قیمت کا ہو گیا تھا۔ عادت کے مطابق چوڑیاں اور بندے ثمی نے سوتے وقت اپنے تکیے کے نیچے رکھے تھے لیکن اس کا سر اب دوسرے تکیے پر تھا، شاہد نے اپنا پرایا سارا زیور رومال میں لپیٹ کر پتلون کی دوسری جیب میں ڈالنے کی کوشش کی پھر ایک شاپنگ بیگ میں ڈال لیا۔ اس مالِ غنیمت کا کچھ حصہ خود اس کے تحائف پر مشتمل تھا۔ ثمی کا موبائل فون آف کر کے اس نے ہاتھ میں ہی رکھا۔ دو فون اب بہت سے لوگ رکھتے تھے۔ ایک کاروباری اور دفتری معاملات کے لیے۔ دوسرا رشتے داروں اور دوست احباب کے لیے۔ وال کلاک صبح کے آٹھ بجے کا وقت دکھا رہا تھا اور کھڑکی پر پھیلے دبیز پردوں کے پیچھے ایک اجلی صبح کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ثمی کا دس گیارہ بجے سے قبل جاگنا محال ہے۔ اعتماد اور اطمینان کے ساتھ وہ دروازہ کھول کے طویل خاموش کوریڈور میں آیا تو اس نے ڈور لاک پر ''ڈونٹ

ڈسٹرب'' کا کارڈ جھولتا دیکھا اور مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔

ناشتا اس نے فراغت کے ساتھ ہال میں کیا جہاں اس وقت کاغان مری یا سوات کی طرف جانے والے ہنی مون جوڑے اور ادھیڑ عمر لوگ سر جھکائے ناشتے میں مصروف تھے۔ باہر جانے سے قبل شاہد نے ایک کونے میں لگی اے ٹی ایم مشین میں ثمی کا گولڈ کارڈ لگا کے پن کوڈ ڈالا اور پچاس ہزار کی رقم نکالی۔ اس کے چہرے پر خوشی اور طمانیت کی مسکراہٹ پھیل گئی جب نوٹ برآمد ہوئے۔ ثمی نے بھی ہر بے وقوف لڑکی کی طرح اندھے اعتماد میں اس سے کوئی راز نہیں رکھا تھا۔ مشین سے برآمد ہونے والی اکاؤنٹ سلپ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب اس کے اکاؤنٹ میں صرف دو ہزار باقی تھے۔ اطمینان سے نوٹ گنتا وہ کاؤنٹر کی طرف گیا جہاں مستعد اور اسمارٹ نوجوان اسے ''گڈ مارننگ'' سر کہنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔

متانت سے سر ہلا کے شاہد نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ کو بریک فاسٹ کمرے میں بھجوا دیں پلیز۔ دس بجے تک۔'' اس نے اپنی گولڈن رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ایک فون سے اس نے دوسرے کا نمبر ملایا اور بیل بجتے ہی دوسرے فون میں کہا۔ ''جی کرنل صاحب! گڈ مارننگ سر! آ رہے ہیں آپ؟ کیا؟ آپ باہر کھڑے ہیں؟ او وائی گاڈ۔ میں آتا ہوں سر! بس دس سیکنڈ میں۔'' وہ گیٹ سے باہر کی طرف لپکا۔ کسی کو شک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ فرار ہو رہا ہے۔

باہر آ کے اس نے کار پارکنگ کے ایک گوشے میں کھڑی اپنی موٹر سائیکل نکال کے اسٹارٹ کی اور اعتماد کے ساتھ گیٹ سے نکل گیا۔

بہت دیر بعد ثمی کی آنکھ دروازے پر ہلکی سی دستک سے کھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کے مقابل کی دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا جس میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ شاہد اپنی جگہ موجود نہیں تھا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ واش روم میں ہے۔ وہ خود اب ایک تھکن دور کرنے والے غسل کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ دوبارہ دستک پر اس نے اٹھ کے کپڑوں کو سمیٹا۔ ''کون ہے یار صبح صبح۔'' اس نے برہمی سے کہا۔

''روم سروس میڈم۔'' باہر سے دبی دبی آواز آئی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے دروازے کے پاس جا کے پوچھا۔ ''دیکھو باہر کیا لکھا ہے۔''

''سوری میم! بریک فاسٹ کا آرڈر تھا۔'' ویٹر نے کہا۔

''بریک فاسٹ؟ کس نے کہا تھا؟'' اس نے دروازہ کھول کے وردی والے ویٹر کو دیکھا جو ٹرے اٹھائے کھڑا تھا۔

''صاحب نے میڈم۔'' ویٹر نے سکون کا سانس لیا اور ٹرے آگے بڑھائی۔ ''جب وہ ہال میں ناشتا کر کے باہر جا رہے تھے۔''

ثمی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر اس نے ٹرے لے کر دروازہ بند کر دیا۔ شاہد نے ہال میں جا کے ناشتا کیا؟ اتنی جلدی کیا تھی؟ اور باہر کہاں گیا ہے وہ؟ ٹرے رکھ کے اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ شاہد واقعی باہر گیا ہوا تھا۔ خفگی میں اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے فون اٹھانا چاہا مگر فون وہاں نہیں تھا۔ اس نے تکیہ پلٹ دیا۔ فون کہاں جا سکتا ہے؟ ثمی نے بیگ کھول کے دیکھا۔

ایک دم وہ ساکت ہو گئی۔ کھلے بیگ کے اندر بہت کچھ تھا لیکن بیگ پھر بھی خالی تھا۔ اس میں سونے کی اجالا دینے والی زرد روشنی نہیں تھی۔ اس میں نیلے نوٹوں کا اجالا نہیں تھا اور ان کی خوشبو نہیں تھی۔ کانپتی انگلیوں سے اس نے دس روپے والے تین میلے مسلے ہوئے بے وقعت نوٹ اٹھائے اور خالی قبر جیسے بیگ میں جھانکتی رہی۔ درپیش حقیقت کی بے رحمی اور سنگینی نے ثمی سے جیسے ساری طاقت چھین لی تھی۔ وہ وہیں بیڈ پر گر گئی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ہو میرے ساتھ شاہد۔ یہ کوئی خواب ہے۔ برا خواب۔ ناشتے کی ٹرالی جیسے گرائی اور چینی کے برتنوں اور چھری کانٹے چمچوں کا شور کسی پُرنحوست ہنسی کی طرح پھیل گیا۔ آہستہ آہستہ فریب آرزو کا سفاک عفریت اس کے سامنے آ کر ننگا ناچنے لگا۔

☆☆☆

ہوش آنے پر اس نے کچھ دیر بعد دیکھا کہ ہوٹل کا مہذب اور شائستہ اطوار والا منیجر اس کے سامنے کسی بد اطوار جاہل اور سفاک تھانیدار کی طرح موجود ہے اور وہ ایک پیشہ ور دھوکے باز عورت کی طرح تفتیش کے شرمناک عمل سے گزر رہی ہے۔

یقیناً جھوٹ کہا تھا اس نے۔ اس کے باپ کی سیٹلائٹ ٹاؤن میں کوئی کوٹھی نہیں ہوگی۔ شاید وہ پنڈی کا رہنے والا ہی نہیں ہوگا۔ وہ دھوکے سے اسے یہاں لایا اور اس کا سب کچھ سمیٹ کر بھاگ گیا۔ بے شک لاہور میں بھی اس کو شاہد کی رہائش کا بس اندازہ تھا۔ وہ یقین کے ساتھ اس گھر تک نہیں جا سکتی تھی کیونکہ شاہد ہمیشہ خود اس سے ملنے پہنچ جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے ساتھ راوی روڈ پر دو کرایہ دار اوپر کی منزل پر رہتے تھے۔ وہ سب بے انگ گیسٹ

تھے اور نیچے رہنے والی فیملی جس میں ایک ریٹائرڈ پنشنر، اس کی بیوی اور ایک بیوہ ہو جانے والی بیٹی تھے، پرانے خیال کے جاہل لوگ تھے جو کرایہ دار رکھتے وقت واضح کر دیتے تھے کہ گھر میں مہمان کوئی نہیں آئے گا۔ گھر والے بھی نہیں۔ جس کو ملنا ہو باہر ملے۔

"تمہارا یہ نام نہاد منگیتر کام کیا کرتا تھا؟" منیجر نے اس پر جھک کے سوال کیا۔ "یہ تمہیں خاک بھی معلوم نہیں ہو گا۔ کہا ہوگا اس نے کہ میں بزنس مین ہوں۔ چیف ایگزیکٹو ہوں۔ بہت بڑا بزنس مین ہوں اور تم نے مان لیا ہو گا۔ تمہیں اس کی موٹر سائیکل کا نمبر تک یاد نہیں جس پر تم اس کے ساتھ ہر جگہ چلی جاتی تھیں۔ وہ تمہارا بینک اکاؤنٹ تک خالی کر گیا۔ اپنا پن کوڈ بھی اس کو بتا دیا تھا؟ کس درجہ عقل سے پیدل ہوتی ہو تم لڑکیاں۔" اس کے لہجے میں تذلیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ہر سوال کا جواب دینے کی پابند تھی لیکن وہ یقین بالکل نہیں کر رہا تھا۔ وہ منت سماجت اور آنسوؤں سے اسے پولیس کو بیچ میں نہ لانے پر قائل کر چکی تھی اور مکمل رازداری کے ساتھ واجبات کی ادائیگی کرنے کو تیار تھی۔

"مجھے تمہاری زندگی سے کیا۔ میرا پینتیس ہزار کا بل ہے۔ ادا کر دو اور جاؤ۔"

"میں کل تک انتظام کر لوں گی۔ ابھی تو کچھ نہیں ہے میرے پاس۔" شمی نے یہ اعتراف کرتے ہوئے شاہد کے خلاف سخت نفرت محسوس کی۔

"کل تک رقم پچاس ہزار ہو جائے گی۔ یہ سمجھ لو۔ نیچے ایک سرونٹ روم ہے۔ تم اس میں شفٹ کر سکتی ہو ایک دو دن کے لیے۔ کھانا بھی دے دیں گے ہم۔"

"میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ سمجھے تم۔" شمی نے خود کو سنبھال کے کہا۔ "کل تک پچاس ہزار کا بندوبست بھی کر لوں گی، اب تم جا سکتے ہو۔"

منیجر کاہل بے حسی کے ساتھ دروازے تک گیا۔

"آل رائٹ۔ چھوٹے موٹے معاملات میں پولیس کو ہم کبھی بیچ میں نہیں لاتے۔ تمہاری نہ سہی ہمارے ہوٹل کے نام کی عزت تو ہے لیکن لیٹ می بی کلیئر۔ اگر دو چار دن تک رقم ادا نہیں ہوئی تو پھر اگلے دس دن تم رات کے وقت یہ بل ادا کرو گی۔ کسی مہمان کی مہمان بن کے۔ آئی بات سمجھ میں؟ دن میں بھی تم اندر ہی رہو گی۔ سونے کے لیے کمرے خالی مل جاتے ہیں۔ قرض ادا کیے بغیر تم باہر نہیں جا سکو گی۔ آئی ایم سوری کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا۔" پھر جواب سننے سے پہلے وہ باہر نکل گیا۔ شمی نے محسوس کیا کہ منیجر کے لہجے میں اس کے لیے عزت نہ سہی کچھ ہمدردی آ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ شمی کے لیے ناشتا بھی بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ پُرسکون ہو گئی تو شمی کو یہ خیال ضرور آیا کہ مسئلہ اتنا سنگین نہیں۔ وہ منیجر کی آفر پر غور کرے تو ہوٹل میں مستقل قیام کر سکتی ہے۔ اس کے سامنے شاہد کی دغابازی سے کامیابی کے نئے افق روشن ہو گئے تھے۔ اس نئی شکارگاہ میں اس کے تیر کا صرف ایک ہدف نہیں ہو گا۔ یہاں قیام کرنے والے سب حقیقی دولت مند ہوتے تھے۔ جوان نہیں ہوتے تھے تو کیا، ناکارہ بوڑھے بھی نہیں ہوتے تھے۔ ایسا تو دنیا بھر میں تھا۔ جوانی سب کی اپنے خوابوں کی تعبیر کے پیچھے بھاگتے گزر جاتی تھی۔ اس کا چہرہ امید کی روشنی سے دمکنے لگا۔ کتنا وقت اس نے دریا میں جسی ڈال کے کسی بڑی مچھلی کے پھنس جانے کا انتظار کرتے گزار دیا۔ جو پھنسی، وہ بھی نکل گئی۔ ایک حادثاتی بدبختی نے اسے فش فارم میں پہنچا دیا تھا جہاں سب ہی بڑی مچھلیاں تھیں۔ شکاری کو شکار کرنا ایک چیلنج ضرور تھا لیکن شمی ابھی اپنے جسم کی قوت تسخیر سے مایوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنا اسلحہ استعمال کرنا جانتی تھی۔ ایک حیادار، نیک سیرت شریف زادی بن کے زندگی گزارنے کی یہ آخری کوشش بھی بدترین ناکامی بن گئی تھی۔

☆☆☆

شاہد نے درست ہی اندازہ لگایا تھا کہ اس کے گھر میں فرشتہ اجل نے پھیرا لگایا ہے۔ امام چاچا نے اسے فون پر خبردار کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن حقیقت جان کر وہ پریشان سے زیادہ حیران ہوا تھا کہ روانگی ابا کی نہیں ہوئی تھی جو مدت سے سفرِ آخرت کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ نکل گئی تھی اماں پہلے۔ پرانی چارپائیوں پر سب ہی پرانے لوگ روایتی انداز میں غم زدہ چہرے بنائے بیٹھے تھے۔ وہ موٹر سائیکل کو احاطے کے باہر کھڑی کر رہا تھا کہ امام چاچا نے اسے گلے لگا لیا۔

"دیر کر دی تو نے پتر۔" امام چاچا نے پگڑی کے شملے سے آنکھوں کی نمی صاف کی۔ اس محلے میں شاید وہی ایک تھے جن کی صورت پر دکھ کی اصل تحریر تھی۔ شاہد کی آنکھوں سے کوشش کے باوجود آنسو نہیں گرے کہ نظر آتے۔ اس نے امام چاچا کے کندھے پر اپنا سر رکھ کے سسکیوں کی آواز ضرور نکالی اور آنکھوں کو خشک کر لیا۔ اچانک اس کا دل ماں کو مردہ حالت میں دیکھنے کے خیال سے بوجھل ہو گیا تھا اور اندر جا کے جب فرش پر بیٹھی عورتوں سے گھری چارپائی پر سیدھی ساکت لیٹی ماں کو دیکھا تو آنسو ایک دم ابلے۔

اس کو ماں کے سارے روپ یاد آئے اور وہ چپ

کھڑا روتا رہا۔ پھر بوجھل دل کے ساتھ باہر آ کے سب کے درمیان بیٹھ گیا۔ کاش وہ امام چاچا کی پوری بات سن لیتا اور ایک رات ہوٹل میں کسی کے ساتھ نہ گزارتا۔ آخری بار وہ عید پر گاؤں آیا تھا۔ اس بات کو بھی آٹھ مہینے گزر گئے تھے۔ ماں سے اپنی آخری ملاقات کی یاد نے اسے مزید دکھی کیا۔ جب ماں نے پھر اس کے آگے ہاتھ جوڑ کے کہا تھا۔ ''کیا میرے مرنے کا انتظار کر رہا ہے تو۔ دے دے مجھے زہر۔''

اس نے ہنستے ہوئے ماں کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ ''سو سال جینا ہے تو نے ماں۔ مرنے کی نہیں۔''

''شیدے میں سچ بتا رہی ہوں تجھے۔ اب مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا۔ ہر مہینے میں اکیلی تیرے ابا کو کیسے شہر میں ہڈیوں والے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ تیرا امام چاچا ہی سب کرنے والا ہے۔ اب تو دوا علاج کے لیے بھی میرے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ قرض الگ بڑھ رہا ہے۔''

''ابا کو کچھ نہیں ہوتا ماں۔ بس کچھ دن کی بات ہے۔ پھر میں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ کوٹھی ہوگی، نوکر چاکر ہوں گے۔'' وہ پرانے جھوٹ کو نیا یقین دینے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ مائیں بے وقوف ہیں یا بناتی ہیں۔ ہر بات مانتی جاتی ہیں۔

عصر کے بعد جنازہ اٹھا تو اس کا باپ اچانک چلانے لگا۔ ''میں بھی جاؤں گا ساتھ۔'' لیکن وہ چارپائی سے اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہت دور اس کی آواز سنائی دی۔ پھر ویران راستے پر کہیں پیچھے رہ گئی۔

☆☆☆

ماں کے مرنے سے بڑی خرابی ہو گئی تھی۔ شاہد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ابا عجیب سی آواز میں روتا رہا تھا جو اس رات کی منحوس ویرانی کو پُرآسیب بناتی تھی۔ کھانا نہ جانے کس نے بھیجا تھا۔ اس نے امام چاچا کے ساتھ بیٹھ کر ان کے اصرار پر چند لقمے کھا لیے تھے۔ اندر ان کی بیٹی نے کسی طرح ابا کے حلق میں پتلا دلیا اتار دیا تھا۔ شاہد آدھی رات کے بعد تک کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ ابا کی دیکھ بھال کس کے سپرد کرے۔ ماں کے بعد یہ ذمے داری اس پر آتی تھی لیکن وہ یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ بی اے کر لینے کے بعد اس نے ایک دوست کے ساتھ ڈسٹری بیوشن کا کام سنبھالا تھا جو اچھا چل رہا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ سال دو سال میں وہ اپنا کام شروع کر سکے۔ وہ تین افراد کے ساتھ دو کمروں کے ایک سستے سے مکان میں رہتا تھا۔ وہ سب کم آمدنی والے اچھے لوگ تھے۔ ان میں سے دو کو کھانا پکانا آتا تھا تو باقی دو برتن دھوتے تھے اور صفائی کرتے تھے۔ وہ سخت مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اب اس کے لیے سب کچھ چھوڑ کر گاؤں میں رکنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا لاہور میں باپ کو اپنے ساتھ رکھنا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر ماں کی جگہ وہ چلا جاتا۔ سب کی مشکل آسان ہو جاتی۔ شاہد نے رات کے آخری پہر میں سوچا اور اسے اپنے خیال پر کوئی ندامت نہیں ہوئی۔ یہ ایک پریکٹیکل بات تھی۔

امام چاچا اور ان کی پردہ دار بیٹی کلثوم جو رات کو وہیں رکے تھے، شاید فجر کی نماز سے پہلے چلے گئے تھے۔ شاہد نے صاف کہہ دیا تھا کہ مفت خوروں کو کھلانے کے لیے سوئم کے نام پر پلاؤ زردے کی کوئی دیگ نہیں پکے گی۔ امام چاچا نے اس سے اتفاق کیا تھا کہ یہ شرع میں ضروری نہیں۔ باورچی خانے میں اس نے اپنے لیے چائے بنائی تو اسے چنگیر میں ایک پراٹھا ملا جو صبح ہی بنایا گیا ہوگا اور کلثوم نے بنایا ہوگا۔ چائے اس نے خود ہی بنالی۔ ناشتا کرتے ہوئے اس نے باپ کے چلانے کی آواز سنی۔ ''اوئے شیدے کمینے۔ مجھے کچھ کھانے کو دے۔'' ناشتا ختم کر کے وہ ابا کو دیکھنے گیا تو وہ پھر کھانے کو مانگنے لگا۔

''کیا دوں تمہیں کھانے کو؟ زہر بھی تو نہیں ہے گھر میں۔'' اس کے منہ سے نکل گیا۔

ابا اسے گالیاں دینے لگا۔ ''زہر تو میں تجھے دے دیتا پیدا ہوتے ہی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں سانپ کو پال رہا ہوں۔''

''چپ کر جا ابا! میرا دماغ خراب نہ کر۔'' شاہد دہاڑا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ چائے کا مگ دیوار پر دے مارے۔ گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو وہ ابا کو کھلا سکتا۔ شاہد کچھ بنا بھی نہیں سکتا تھا۔ ماں کے ہوتے اس نے کبھی نل کے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ ابا ڈر کے چپ ہو گیا تھا۔ اچانک شاہد نے ایک کونے میں اسٹول پر رکھا پیالہ دیکھا جو کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس میں پتلا دلیا تھا۔ ظاہر ہے یہ بھی امام چاچا کی بیٹی ہی بنا کے گئی ہوگی۔ وہ پیالہ اٹھا کے باپ کی چارپائی کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کے منہ میں دلیا ڈالنے لگا۔ ''معاف کرنا ابا۔ میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔'' وہ نرمی سے بولا۔ چار چمچے اس کے حلق سے اترے۔ پھر اس نے سب نکال دیا۔ شاہد نے چادر کے کونے سے اس کا منہ صاف کیا اور پھر دلیا کھلانے لگا۔ پیالہ خالی ہو گیا۔ ابا نے کہا۔ ''اور دے مجھے سور کے بچے۔''

''اب اللہ سے مانگ۔'' شاہد جھلا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت جیسے اس کو ستانے کے لیے ابا نے پیشاب کر دیا۔ اس

کے سب کپڑے اور بستر خراب ہو گئے۔ شاہد کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "نہیں ابا! وہ جو تیری بیوی کرتی رہی میں نہیں کر سکتا۔ کوئی نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے تو چلا جا اسی کے پاس۔ کیا ہے اس زندگی میں جو تو جی رہا ہے؟" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ پچھلے اجاڑ حصے میں نکل آیا جہاں ایک زمانے میں بھینسوں کا باڑا تھا لیکن اب ایک نحوست زدہ ویرانی تھی۔ کنوئیں کی منڈیر پر جھکا ہوا چرخی کو سنبھالنے والا درخت کا ستون۔ رسی اور چمڑے کا ڈول سب اپنی جگہ موجود تھے اور گہرائی میں چمکتا پانی کا ساکت دائرہ بھی ہوگا لیکن اس منظر میں اب زندگی کہیں نہ تھی۔ گزر جانے والا وقت شاہد کے تصور میں ان تصویروں کی طرح رہ گیا تھا جو لاہور میوزیم کے ایک نیم تاریک ہال کی دیوار پر لگی ہوئی تھیں اور آج گزرا ہوا وقت ہی دکھا سکتی تھیں۔ اس کے خیال کی ایک تصویر میں بھینسوں کی تعداد صرف دو تھی، دوسری میں دس ہو گئی تھی اور آخری میں یہاں بیس بھینسیں بھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان کا سارا دودھ منڈی جاتا تھا۔ دیکھ بھال کے لیے اکیلا سراج دین تھا۔ وہ پہلوانی بھی کرتا تھا۔ ایک مقابلے میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور جراح نے جوڑی تو وہ لنگڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے صوفی بشیر کے نکھٹو بیٹے جانو کو رکھ لیا۔ وہیں سے ساری خرابی کا آغاز ہوا۔ پہلے ایک بھینس چوری ہو گئی۔ تھانیدار نے صرف پانچ ہزار لے کر رپورٹ لکھ لی مگر سراج دین نے اسے بھی نقصان ہی شمار کیا۔ پہلے چوری ہونے والی کوئی بھینس آج تک ملی نہیں تھی، سب کو معلوم تھا کہ چور جاتے وقت تھانیدار کو ہر بھینس کی چوری کا اجازت نامہ دینے پر دس ہزار دے جاتے تھے۔

جب دوسری بھینس گئی تو سراج دین نے جانو سے سخت پوچھ گچھ کی۔ دو ماہ میں بتدریج دودھ کی آمدنی میں کمی کیوں آرہی ہے؟ تیری بیوی نے اتنے مہنگے نئے ریشمی کپڑے کیسے بنوا لیے؟ تھانیدار تمہارے گھر کیوں آتا ہے؟ اور بالآخر جانو کو برطرف کر کے ڈیڑھ ٹانگ کے ساتھ تقسیم کا کام خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ دو ہفتے میں آمدنی بڑھ گئی لیکن قسمت کا پانسا پلٹ گیا تھا۔ ایک دن وہ دودھ پہنچا کے ریڑھے پر واپس آرہا تھا کہ سامنے سے آنے والی ایک لاری نے ٹکر مار دی۔ چوٹ سے اس کا نچلا دھڑ مکمل مفلوج ہو گیا۔ اس کو علاج کے لیے شہر لانے لے جانے میں آدھی بھینسیں بک گئیں لیکن دو سال کی دوڑ دھوپ کا فائدہ رتی بھر نہ ہوا۔ بیوی نے شوہر کو جیسے تیسے سنبھالا لیکن فارم کے معاملات اس کے بس کے نہ تھے۔ اس کے یقین کے مطابق شہر سے ڈگری لینے والا بیٹا وہیں بڑا افسر لگ گیا تھا اور لوٹ کے گاؤں آنے پر راضی نہ تھا۔ باڑا ختم ہونے کے بعد گزر اوقات مشکل ہو گئی تھی لیکن وہ اکیلی عورت کیا کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہار مان لی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ اتنی خود غرض ہو گئی تھی کہ اس نے صرف اپنے لیے سوچا۔ بیماری سے معذور شوہر کے بارے میں نہیں سوچا۔ بیٹے کے لیے نہیں سوچا کہ وہ کس آزمائش میں پڑ جائے گا۔

☆☆☆

شام کے سائے پھیل رہے تھے کہ شاہد نے موٹر سائیکل نکالی اور قبرستان چلا گیا۔ فاتحہ خوانی کے بعد وہ ماں کی کچی قبر کے نزدیک ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جانو کو وہاں قبروں کے درمیان سرگرداں دیکھا۔ اس کے بال جھاڑ جھنکاڑ اور کپڑے مٹی جیسے ہو رہے تھے۔ یہ سب ہیروئین کی لت کا نتیجہ تھا۔ شاہد کو دیکھ کر وہ اس کے سامنے آ گیا۔

"تو شیدا ہے نا۔ سراج دین کا بیٹا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے۔" شاہد نے کہا۔

"شیدے! میں چور نہیں ہوں۔ تیری بھینس میں نے چوری نہیں کی تھی۔ کمینے تھانیدار نے مجھے پکڑ لیا تیرے باپ کے کہنے پر۔ اس نے بہت مارا تھا مجھے۔ وہ میری بیوی کو بھی لے گیا۔" وہ پرانی بات دہرانے لگا۔

"تو یہاں کیا کر رہا ہے جانو؟" شاہد نے اسے سو کا ایک نوٹ دیا کہ وہ ٹل جائے مگر وہ کھڑا رہا۔

"کیا تجھے اپنے باپ کے لیے جگہ چاہیے؟ ماں کی قبر کے ساتھ جگہ بنا دوں؟" وہ سو کے نوٹ کو دیکھتا رہا۔ "مجھے پانچ سو روپے اور دے دے۔ میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے اور میں نے کل سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ میں ساتھ ہی قبر بنا دوں گا۔"

سوچے سمجھے بغیر شاہد نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "چل بنا دے۔ ابا نے اب کتنے دن جینا ہے۔" اور پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا جو اس نے چیل کی طرح جھپٹ لیا اور باہر نکل گیا۔

بہت سوچ بچار کے بعد شاہد ابا کے لیے ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اکیلا وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے زندہ رکھنے کی ساری جدوجہد ایک عورت کر رہی تھی جو اب نہیں رہی تھی۔ یہ کام شاہد کے لیے زیادہ ناممکن تھا جو یہاں تھا ہی نہیں۔ سراج دین کو پہلے کے مقابلے میں بہت دولت مند سمجھا جا سکتا تھا۔ اسلام آباد کے فیڈرل کیپٹل ایریا میں شامل ہونے والی ساری زمین کی قسمت جاگ اٹھی تھی لیکن سراج دین کی زمین تو اسلام آباد ہائی وے کو چھوتی تھی۔ اس

کے کچھ کیے بغیر زمین سونے کے بھاؤ ہوگئی تھی لیکن خود اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ترقیاتی پروگرام کا دائرہ پھیلا تو اس صدیوں کی بے وقعت زمینوں پر نیا شہر پھیل گیا۔ اردگرد کی ساری زمین ہاؤسنگ اسکیموں نے خرید لی تھی۔ یہاں ایک جدید شہر کے خدوخال نظر آتے تھے۔ زمین کی آج کی قیمت کا اندازہ شاہد کر چکا تھا۔ اب اس کا سودا کر لینا ہی بہتر تھا۔ ماں زندہ رہتی تو اس کے لیے اپنے پلان پر عمل درآمد آسان ہوتا۔ وہ دونوں کو اپنے ساتھ لاہور لے جاتا کہ ہم غریب لوگ ایسی مہنگی جگہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ ابا کبھی نہ مانتا لیکن ماں کو منانے کا آسان نسخہ اس کے پاس تھا کہ وہ اس کی منتخب کی ہوئی کسی ایک لڑکی سے شادی کر لے۔ اس فہرست میں ٹاپ پر تو امام چاچا کی نیک پروین بیٹی کلثوم تھی۔ دوسرے اور تیسرے نمبر پر اسکول ماسٹر کی استانی بیٹی رجو اور پھر چودھری غلام رسول کی میٹرک فیل مگر چار مربعوں کی مالک عائشہ شامل تھی۔ ہر لحاظ سے یہ جامع فہرست ماں کی فراست کا ثبوت تھی۔ اس نے شاہد کے لیے آئیں بائیں شائیں کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ بول کیا چاہیے پتر۔ خوبصورتی کے علاوہ تربیت تعلیم یا مال۔ ٹالنے کے لیے شاہد کے پاس "جلدی کیا ہے ماں" کے سوا بہانہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

ماں کے مر جانے سے صورت حال اچانک اور غیر متوقع طور پر بدل گئی تھی۔ اب شاہد کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ خود اس کا یہاں رکنا تو غیر ممکن تھا لیکن وہ ابا کا کیا کرے۔ اپنے ساتھ لاہور لے جائے تو اس کو کس کے پاس چھوڑا جائے۔ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہ کر اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے والی بیوی ہی تھی، وہ خود تو گزشتہ دس سال سے مفلوج ہوتے ہوتے اب اٹھ کے بیٹھنے سے بھی قاصر تھا۔ ماں تو اس کی چوبیس گھنٹے کی نرس تھی جس نے ایک بار بھی اپنی اس ڈیوٹی پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ آخر تم مر کیوں نہیں جاتے۔ وہ تھک گئی تو کچھ کہے بغیر آرام کے لیے خود قبر میں جا کر لیٹ گئی۔ شاہد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ابا کو بھی اس کے پاس ہی چلا جانا چاہیے۔ ماں کی قبر کے ساتھ ہی ابا کے لیے ابھی جگہ تھی اور وہ گورکن سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن جانو نے پانچ سو کے نوٹ کے بدلے یہ کام خود ہی کر دیا تھا۔ قبرستان سے باہر آ کے وہ پکی خالی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے چھوٹی بڑی کوٹھیوں کو دیکھتا رہا جو سیکڑوں کی تعداد میں آباد ہو چکی تھیں۔ طے شدہ طور پر وہ اب کروڑ پتی بن چکا تھا۔ اس کے پاس پانچ مرلے والے پلاٹ تھے جو کم سے کم بھی پچیس لاکھ کا ایک بک رہا تھے۔ دو کروڑ کی ملکیت کی منزل اب اسے چند دن کی دوری پر محسوس ہوتی تھی۔ ابھی تک اس نے یہاں رک کر خود پلاٹ یا ان پر مکان بنا کے بیچنے کا نہیں سوچا تھا۔

شاہد گھر میں داخل ہوا تو اندر اندھیرا تھا۔ بجلی جو دن میں کسی وقت بھی چلی جاتی تھی، اس وقت بھی غائب تھی۔ پھر بھی شاہد نے بہتر سمجھا کہ وہ مین سوئچ ہی آف کر دے۔ پنکھا بند ہونے سے کمرے میں حبس کے ساتھ بو بھر رہی تھی۔

شاہد آہستہ سے چارپائی پر بیٹھا تو بڈھے نے چونک کر پوچھا۔ "کون؟ شاہد..... میرے لیے کچھ کھانے کو نہیں لایا؟"

"کیا کرے گا کھا کے ابا۔ کچھ دن اور جی لے گا مگر ایسے جینے کی تجھے کیا ضرورت ہے۔ کوئی فائدہ بتا مجھے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے؟ کیا تو چاہتا ہے میں مر جاؤں بیٹے؟" ابا دکھ سے بولا۔

"ہاں۔ یہی اچھا ہوگا سب کے لیے۔ خود تیرے لیے بھی ورنہ مجھے بتا کیسے جیے گا تو۔ ماں تو رہی نہیں۔ میں بھی چلا جاؤں گا واپس لاہور۔"

"تو نہیں رک سکتا یہاں تو مجھے اپنے ساتھ لے جا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"میں تو رہتا ہوں کرائے کے ایک کمرے میں۔ صبح دفتر جاتا ہوں تو رات کو واپس آتا ہوں۔ تو مر جاتا تو ماں کو میں ساتھ رکھتا۔ میرے لیے بہت آسانی ہو جاتی۔ تجھے کون زندہ رکھے گا۔"

بڈھا رونے لگا۔ "حرامزادے! کیا نہیں کیا میں نے تیرے لیے۔ تو نے جو مانگا کر دیا۔ تو شہر میں پڑھتا رہا۔ موٹر سائیکل مانگی تو نے تو دی۔ پرانی گاڑی دلانے کے لیے بھی دو بھینسیں بیچ دی تھیں۔"

"مجھے پتا ہے ابا سب کرتے ہیں اولاد کے لیے۔" شاہد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اپنی اولاد کے لیے میں بھی کروں گا۔ اس وقت بھی جو میں کر رہا ہوں تیرے فائدے کے لیے ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماں کے بستر کا تکیہ اٹھا کے اس نے بڈھے کے منہ پر جما دیا اور دونوں طرف سے دبائے رکھا۔

"مجھے معاف کر دینا ابا لیکن ہم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے۔" شاہد نے دل ہی دل میں کہا، سانس لینے کی ناکام کوشش میں ایک بیمار اور کمزور جسم نے ساری توانائی صرف کی مگر بہت کم وقت میں زندگی نے ہار مان لی۔ شاہد کے لیے وہ ایک منٹ سے بھی کم کا وقت ایک گھنٹے سے زیادہ صبر آزما تھا۔ تکیہ اپنی جگہ رکھ کے وہ چپ کھڑا اس ساکت اور پُرسکون

وجود کو دیکھتا رہا جو ایک ختم ہو جانے والا رشتہ تھا۔

"شیدے! جگہ بتا دی میں نے...... تو نے کہا تھا نا۔"

جانو کی آواز پر وہ ایسے اچھلا جیسے یہ کان کے پاس ہونے والا فائر کا دھماکا تھا۔ وہ ایک دم پلٹا تو اسے دھند کے میں کھلی کھڑکی کے چوکھٹے میں جانو کا جھاڑ جھنکاڑ چہرہ نظر آیا۔

"جانو! تو کیا کر رہا ہے یہاں؟" شاہد چلا کے کھڑکی بند کرنے دوڑا تو جانو کا متوحش چہرہ خوف سے بھر گیا۔

"میں — میں تو بتانے آیا تھا شیدے۔" جانو نے بند کھڑکی کے پیچھے سے کہا۔ شیدے نے فوراً ہی باہر نکل کے دیکھا مگر وہ دور کہیں بھاگ گیا تھا۔ شاہد نے بہت دیر تک اسے ادھر ادھر تلاش کیا اور اسے آوازیں بھی دیتا رہا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھا۔

گھر کے در و دیوار ایک ہولناک پُرآسیب خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شاہد نے وہ کمرا بند کر دیا جس میں اس کے باپ کا بے جان وجود پڑا تھا۔ اس نے سارے گھر کی لائٹس آن کر دیں۔ لائٹ اگر آئی تھی تو پھر چلی گئی تھی۔ گھر کے اندر اندھیرا ابھر گیا تھا۔ اسے بہت تلاش کے بعد گھر میں موم بتی بھی نہیں ملی۔ باہر شاید بادل تھے کہ اندھیرا زیادہ سیاہ لگتا تھا۔ ہوا کچھ تیز تھی کہ گھر کی کھلی کھڑکیوں کے پٹ چوکھٹ سے ٹکرانے لگے۔ اس نے کھڑکیاں بند کر دیں تو اندر کی خاموشی شاہد کے کانوں میں گونجنے لگی۔ پرانے لوگ جا چکے تھے اور نیا کون تھا جو ہمسائیگی کے تعلق سے میت والے گھر میں کھانا بھیجے۔ گاؤں جب شہر بنتے ہیں تو در و دیوار بھی اجنبیت کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ اس کا محدود رشتوں والا خاندان سمٹ کر ختم ہو رہا تھا۔ کمرے میں اکیلا لیٹا وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اس خیال سے وہ خوف زدہ یا پریشان نہیں تھا کہ اس پر باپ کی جان لینے کا الزام آئے گا۔ اسے معلوم تھا کہ سراج دین کی موت پر کسی کو تشویش نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ اس کی بیوی سے محبت کی بات ضرور کریں گے جس کے بغیر وہ ایک دن بھی نہ جی سکا۔ زندگی کے سفر کا ایک جذباتی انجام کی طرف جانا کسی کو حیران نہیں کرے گا۔

ایک دم بادل گرجا اور دروازہ تیز ہوا کے جھونکے سے کھلا۔ شاہد نے دروازے میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچا دیکھا جس کے بازو جھول رہے تھے۔ اس کے کاسۂ سر میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے اور بوری بتیسی نظر آ رہی تھی۔

"تو نے مجھے مار دیا کمینے۔ میں سب کو بتا دوں گا کہ تو قاتل ہے۔ تیری ماں کو بھی۔ میں تجھے بھی اپنے ساتھ اسی قبر میں لے جاؤں گا۔"

شاہد اٹھ کے دوڑا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کا خوف اور احساسِ جرم اب آسیب بن کر اسے ڈرا رہا تھا۔ وہ کوئی وہمی آدمی نہیں تھا۔ خیالات کے انتشار میں وہ صبح تک جاگتا رہا۔ صبح بارش نہیں تھی۔ سورج طلوع ہوا اور روشنی پھیلی تو اس نے سوچا کہ اب جا کے امام چاچا کو باپ کے مرنے کا بتا دے لیکن پھر اس نے مزید کچھ دیر انتظار کا فیصلہ کیا۔ وہ باہر نکل آیا۔

یہ مکان جو پہلے پانچ چھ مرلے پر تھا، اب ایک کنال سے کچھ کم جگہ پر پھیل گیا تھا۔ زیادہ حصے میں اس کی ہمیشہ متحرک ماں سبزیاں اگاتی تھی اور مرغیاں پالتی تھی۔ اس کم بولنے والی عورت میں شادی کے بعد والے تیس برسوں میں صرف عمر کا فرق پڑا تھا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی تھی چنانچہ اس کا ہارٹ فیل سے مر جانا شاہد کو بڑی عجیب بات لگی تھی۔ لاہور شہر میں لوگ دل کے مرض سے کسی کے مرنے کی بات کرتے تھے تو اس کے دس اسباب بتاتے تھے اور پھر بھی اکثر بات پوسٹ مارٹم کی خواری اور خرچے تک جاتی تھی۔ یہاں "جو رب کی رضا" پر بات ختم ہو جاتی تھی۔ شاہد نے تمام صورتِ حال پر غور کیا تو اسے سارے مسائل کا یہی حل نظر آیا تھا کہ وہ باپ کو بھی ماں کے پاس بھیج دے۔

☆☆☆

دھوپ چڑھی تو وہ قبرستان چلا گیا۔ واپسی پر ایک جگہ رک کر اس نے چائے پی اور پاپے کھائے۔ اس کی توقع کے عین مطابق امام چاچا جب ان کے گھر آئے تو ان کو اپنے بچپن کے دوست کی گزشتہ رات ناگہانی وفات کا علم ہوا۔ شاہد نے بھی ضرورت کے مطابق ان کے ساتھ رونا دھونا کیا اور بتایا کہ صبح اس نے دیکھا تو سمجھا کہ ابا سو رہے ہیں اور وہ قبرستان چلا گیا۔ امام چاچا اسے تسلی دیتے رہے اور سمجھاتے رہے کہ بہ آواز بلند رونا خلافِ شرع ہے۔ سارا دن آنے والوں میں سے کسی نے سراج دین کی ناگہانی موت پر حیرانی یا تشویش کا بالکل اظہار نہیں کیا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ وہ اکیلا نہیں جی سکا۔ شام تک ابا اسی جگہ پہنچ گیا جو شاہد نے اس کے لیے مخصوص کرائی تھی مگر اس انتظام کا علم جانو کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔ طمانیت سے وہ تدفین کے تمام انتظامات کو دیکھتا رہا تھا۔ اس رات امام چاچا اور وہ دیر تک سراج دین کی باتیں کرتے رہے جو شاہد کی سب سنی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار اپنے آنسو صاف کرتے تھے۔ شاہد نے اگلا دن بھی سب سے تعزیت وصول کرتے گزارا۔ تیسرا دن تھا جب اس نے صبح گھر کے سامنے شامیانہ لگا دیکھا۔ کچھ دیر بعد خلیفہ رمضانی کی نگرانی میں چولہے بنانے اور دیگیں صاف

کرنے کا کام بھی شروع ہو گیا۔ گزشتہ شام جب شاہد نے امام چاچا سے کہا تھا کہ سوئم میں نزدیک اور دور کے سب لوگوں کی شرکت ہو اور انتظام بھی ایسا ہو کہ سب یاد رکھیں۔ تو اسے شرم ضرور آئی تھی کہ وہ دن پہلے کی شرع اچانک کیسے بدل گئی۔ امام چاچا کے سوال کرنے سے پہلے شاہد نے کہہ دیا۔ ''اب میں شرع کو دیکھوں چاچا تو سب کی نظر میں ناخلف۔ جن کو پہلے ہی شکایت تھی کہ ماں کے لیے کچھ نہیں کیا، وہ پھر باتیں بنائیں گے۔''

امام چاچا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''زبانِ خلق کا بھی سوچنا ہی پڑتا ہے بیٹا۔ تم فکر نہ کرو۔ سب ہو جائے گا۔''

شاہد نے یہی سوچا تھا کہ اپنے گھر کی فروخت کا معاملہ کسی اسٹیٹ ایجنٹ کے سپرد کر کے اگلے دو چار دن میں وہ لاہور لوٹ جائے گا لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس پروگرام میں کلثوم رشید بنت مولانا عبدالرشید مہتمم و پیش امام جامع مسجد کی دختر نیک اختر نے یوں مداخلت کی کہ شاہد کی ساری پلاننگ کو چوپٹ کر دیا۔ انتظامات کی ساری ذمے داری اور متوقع اخراجات کے لیے اندازے سے کہیں زیادہ رقم امام چاچا کے حوالے کر کے شاہد نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ رات اس کی سوتے جاگتے ہی گزری تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے پیچھے والے کمرے میں جا کے لیٹا تو سو گیا۔ ابا کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد اب اس کا صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ وہ جلد از جلد ساری زمین کا سودا کر لے۔ اس کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق یہاں ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہو گیا تھا۔ پلاٹ کم رہ گئے تھے اور خریدار زیادہ تھے۔ شاہد انکار نہیں کر سکتا تھا۔ آج کی قیمت پر پہلے آنے والا جو خریدار پہلے بیعانہ ادا کرے، اسی سے سودا کر لیا جائے۔ دس فی صد پر بھی وہ دو چار دن میں بیس لاکھ وصول کر کے لاہور جا سکتا تھا۔ باقی رقم کی وصولی آئندہ ماہ سیل ڈیڈ اور ٹرانسفر کی کارروائی کے وقت ہی ممکن تھی۔ زمین سے اس کا ناتا بہت پہلے ٹوٹ چکا تھا۔ جب یہاں اس کا کچھ نہیں ہو گا تو وہ کیوں پاکستان میں رہے گا۔ اس کے وہ جذباتی رشتے بھی ختم ہو چکے تھے جو پاؤں کی زنجیر بنتے ہیں۔ امریکا کو اپنا وطن بنانے کا خواب اس کی عمر کے سب نوجوان دیکھتے تھے لیکن تقدیر موقع کسی کسی کو فراہم کرتی تھی۔ اس کی راہ میں تو کوئی رکاوٹ ہی نہیں تھی۔ سہ پہر کے بعد وہ پچھلے کمرے میں جا کے لیٹا تو اسے نیند آ گئی۔ شام کو وہ جاگا تو پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا اور اس نے ''یا اللہ'' کی چیخ کے ساتھ لہراتے نیلے دوپٹے کو دیکھا جو اس کے قدموں میں فرش پر گرا ہوا تھا۔ اس نے دوپٹا اٹھایا تو بند دروازے کے پیچھے سے نارنجی چوڑیوں والا ایک اجلا گداز نازک سا ہاتھ سامنے آ گیا۔ ''یہ ہمیں دے دیجیے پلیز۔'' کسی نے نرمی سے شہری لہجے میں کہا۔ میکانکی انداز میں شاہد نے دوپٹا آگے بڑھا دیا۔ ہاتھ غائب ہو گیا اور کسی نے کہا۔ ''کیا ہو گیا ہے جی۔ ایسے اندر کہاں گھستے چلے آ رہے تھے۔ پتا نہیں اندر عورتیں بیٹھی ہیں۔ یہاں کوئی کام ہے؟''

شاہد ہکلایا۔ ''وہ در اصل...... سوری...... پیاس لگی تھی...... میں پانی۔''

''پانی باہر بھی ہے مگر میں لا دیتی ہوں...... رکیے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''اتنے بدحواس کیوں ہیں شاہد؟''

''میں...... میں پی لوں گا باہر لیکن آپ کون؟'' اس نے سر کھجایا۔ ''جو میرا نام بھی جانتی ہیں۔''

''میں کلثوم۔ یاد رہے گا نام؟'' اس نے سکون سے کہا مگر لہجے کی شوخی نے شاہد کو مبہوت کر دیا۔ وہ ایک دم باہر جانے کے لیے پلٹا تو وہ ہاتھ پھر ایک کاغذ کے ساتھ سامنے آ گیا۔ ''ایک منٹ رکیے۔ یہ بابا کو دے دیں۔'' کاغذ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ شاہد نے پرچہ لے لیا۔ تحریر بہت صاف لیکن زنانہ تھی۔

''کلثوم نے دیا ہے یہ۔'' باہر آ کے اس نے امام چاچا کو وہ کاغذ تھما دیا اور ایک کرسی پر ٹک گیا۔

انھوں نے بس سر ہلایا اور کسی سے کہا۔ ''یہ اگر بتیاں پہلے لا دو۔ اندر ضرورت ہے۔'' اور ادھر چلے گئے جدھر دیگوں کو رکھا گیا تھا۔ شاہد نے ایک مٹکے سے گلاس بھرا اور سائے میں رکھی کرسی پر بیٹھ کے پیا۔ یاد رہے گا نام؟ درخت پر سے ایک طوطے نے کہا۔ وہ ہنس پڑا۔ کئی سال پہلے کی کلثوم ایک بے وقوف نظر آنے والی سانولی سی لڑکی تھی جو بعد میں برقع اوڑھ کے تانگے میں کالج جانے لگی تھی۔ مسجد کی امامت سنبھالنے سے پہلے امام چاچا کا گھر اسی گلی میں تھا اور وہ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے تو اکٹھے جاتے تھے۔ کلثوم اس سے بہت مار کھاتی تھی لیکن شکایت کسی سے نہیں کرتی تھی اور شاہد نہ جائے تو خود بھی اسکول نہیں جاتی تھی کیونکہ راستے میں کتے ہوتے تھے۔ امام چاچا گاؤں سے باہر بنائی جانے والی جامع مسجد میں امام کے لیے بنے کوارٹر میں چلے گئے تو بچپن کے دوستوں کا ساتھ تو اسی طرح برقرار رہا لیکن اس نے پھر کلثوم کو کئی سال بعد اس وقت دیکھا جب

وہ تانگے میں شہر کے کالج جانے لگی تھی۔ بس اس نے ایک بار نقاب اٹھا کے شاہد کو دیکھا تھا اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کے سلام بھی کیا تھا۔ جیسے لڑکیاں کسی چچازاد، خالہ زاد کو کرتی ہیں۔ اسے کچھ دیر بعد یاد آیا تھا کہ وہ کلثوم تھی۔ وہی بہتی ناک والی بچی جو اس سے مار کھاتی تھی تو مزاحمت بھی نہیں کرتی تھی اور شکایت بھی، بس رونے لگتی تھی۔ اس وقت تک تانگا ایک موڑ پر غائب ہو گیا تھا۔ حیرانی اسے تب بھی ہوئی تھی کہ گاؤں کی کلثوم ایسی لڑکی کیسے بن گئی تھی جیسی کہ لاہور میں ہوتی ہیں۔ وہ خود پڑھنے کے لیے لاہور چلا گیا تھا اور بہت کم گھر آتا تھا۔ کلثوم کی کبھی نظر آجانے والی کوئی جھلک کسی پرانے جذباتی تعلق کے احیا کا سبب نہیں بن سکی تھی لیکن آج تو برسوں بعد کلثوم نے پھر سامنے آئے بغیر اسے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ کہ بولو لاہوری شہزادے! کچھ یاد آیا۔ نام بتا کے اس نے کتنی سادگی آمیز شوخی کی ادا سے کہا تھا۔ یاد رہے گا نام...... وہ ہنس پڑا۔

امام چاچا نے کسی سے بات کرتے کرتے اسے اگربتی کا پیکٹ تھمایا اور شامیانے کی طرف چلے گئے۔ وہ ایک دم اٹھا اور اندر جا کے اس نے درمیانی دروازہ بجایا اور اس کی توقع کے عین مطابق کلثوم سامنے آئی اور پھر ایک پٹ کے پیچھے چھپ کر دی نارنجی چوڑیوں والا گورا گداز ہاتھ بڑھا کے پیکٹ لے لیا لیکن وہ ایک پل کی ادھوری جھلک میں پوری کلثوم کا سراپا یوں دل میں اتار چکا تھا جیسے کیمرے کا شٹر فلم پر تصویر اتار لیتا ہے۔ چند سیکنڈ مبہوت کھڑے رہ کر وہ پلٹنا ہی تھا کہ اس کی آواز پر رک گیا۔ ”شاہد! وہ ذرا دیکھیں ڈیکوریشن والے کو۔ دو گلاس کم ہیں۔ چار پلیٹوں کے کنارے جھڑے ہوئے ہیں، دوسرے لائے۔“

شاہد نے پلٹ کے کچھ نہیں دیکھا لیکن اب وہ دروازہ جیسے شیشے کی ٹی وی اسکرین بن گیا تھا کہ وہ کلثوم کی آواز کے ساتھ اس کی تصویر بھی فل کلر میں دیکھ سکتا تھا۔ ایک سرور کے عالم میں وہ باہر کی طرف چل پڑا۔ اس نے شاہد کا نام لیا تھا تو اس کے لہجے میں پرانے رشتوں کی اپنائیت تھی اور نئی عورت کا اعتماد تھا۔ دلکشی کے باقی رنگ قدرت نے اس کوزی سے عورت بناتے ہوئے ڈیے تھے۔ وہ عورت جو سمجھتی ہے کہ بس اک نگاہ میں ہوتا ہے فیصلہ دل کا۔ وہ دلوں پر اور ملکوں پر اور حاکموں پر حکومت کر سکتی ہے۔

شامیانے کے نیچے قرآن خوانی کرنے اور چنے پڑھنے والوں کی تعداد غروبِ آفتاب تک بڑھتی رہی تھی۔ آنے والے مغموم چہرہ بنا کے اداس لہجے میں اس سے تعزیت کرتے تھے تو میاں بیوی کی مثالی محبت کی بات بھی کرتے تھے۔ شاہد کے لیے دل میں چبھی ہوئی پھانس کی خلش بڑھ جاتی تھی۔ تعزیت وصول کرنے کا فرض امام چاچا کو سونپ کر وہ ایک طرف کرسی ڈالے بیٹھا تھا جب ایک بچے نے دوڑتے دوڑتے رک کر کہا۔ ”آپ کو بلایا ہے اندر۔“ تو شاہد چونک کر خیالوں کے گرداب سے نکلا۔ ایک بار پھر کلثوم اس کے مقابل آئی اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ شاہد نے اس کے نیلے ٹراؤزر اور نارنجی شرٹ کو دیکھا جس کی آستینیں نیلی تھیں اور ان کے آگے نارنجی چوڑیوں کی کھنک۔

”آپ نے دیکھا، کتنے لوگ نہیں آئے؟“ کلثوم کے اداس لہجے میں شکوہ تھا۔

”آئے تو بہت لوگ ہیں۔“ شاہد چونکا۔ ”شامیانہ بھرا ہوا تھا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”یہ سب مفت خورے تھے یا کچھ نئے لوگ ہیں۔ پرانے لوگ بہت چلے گئے ہیں یہاں سے، سب کچھ بیچ کر۔ لیکن کچھ لوگ ہیں یہاں مگر وہی جنہوں نے نئے مکان بنا لیے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کے بچوں نے۔“

پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ شکایت کر رہی تھی یا اسے اچھا کہہ رہی تھی۔ شاہد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس پر کیا تبصرہ کرے۔ ”ان کو معلوم تو ہے نا؟“

”رمضانی کو ابا نے سب کے پاس بھیجا تھا۔ اسے بھی معلوم ہے پرانے لوگ کہاں کہاں ہیں۔“ اس کے لہجے میں شکایت آ گئی تھی۔ شاہد کے نزدیک یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں تھا۔

”پھر...... کیا کرنا ہے۔ پولیس بھیج کے بلوانا ہے انہیں؟“

”یہ مذاق کی بات ہے؟“ اس نے افسوس اور خفگی سے کہا۔ ”اب نیاز کا کھانا لے کر آپ کو جانا ہے ان سب کے گھر۔“

”کیا؟ مگر مجھے تو نہیں معلوم کہ کون نہیں آیا تھا۔“ شاہد نے بوکھلا کے کہا۔

”ابا کو معلوم ہے۔ میں کھانا پیک کراتی ہوں، آپ لے جائیں۔“

”یار کلثوم! میں نہیں جانتا کسی کو بھی۔“

”اُفوہ شاہد! اتنا جھلانے کی کون سی بات ہے۔ خلیفہ رمضانی کا بیٹا ہے نا، اسے ساتھ لے جاؤ موٹر سائیکل پر۔“

بالکل نامعلوم طور پر آپ سے وہ تم پر آ گئے تھے۔ تعلق کے درمیان لاتعلقی کا ایک طویل دورانیہ تھوڑی سی جھجک کا سبب بنتا تھا لیکن اس سے زیادہ یہ حفظِ مراتب کا احساس تھا۔ کلثوم وہ روتی بسورتی صورت والی بچی نہیں تھی جو اس کی سیکیورٹی کے بغیر اسکول نہیں جاتی تھی اور اس سے مار کھاتی رہی تھی۔

امام چاچا تین بار نماز کی امامت کے لیے گئے۔ وہ نہ جانے کتنی بار کلثوم سے مقابل گیا۔ آہستہ آہستہ ان کے درمیان پرانے تعلق کا اعتماد لوٹ آیا، وہ سامنے آ کے بات کرنے لگی۔ متعدد بار پلاؤ زردے کا پیک لیتے ہوئے اس کے ہاتھوں نے کلثوم کے گداز ہاتھوں کی انگلیوں کو چھوا لیکن کلثوم کا سارا دھیان کام کی طرف تھا۔ وہ وقفے وقفے سے جانے والی عورتوں کو بھی رخصت کر رہی تھی۔ سب اس کی چاچیاں تھیں یا خالہ۔ سوئم میں آنے والی عورتیں اسی کمرے میں بیٹھی تھیں جس میں دو دن قبل زندگی تھی۔ کلثوم نے اسے دھو کر صاف کرنے کے بعد چاندنی بچھا دی تھی اور اگربتیوں کے دھوئیں نے اس بدبو کو بھی بے دخل کر دیا تھا جو وہاں برسوں سے تھی۔

ایسا نہیں کہ امام چاچا کو شاہد کی ان ڈور ایکٹیوٹی کا علم نہیں ہوا تھا لیکن وہ معترض نہیں ہوئے تھے۔ امام چاچا اور سراج دین اسی طرح پیدائش کے وقت سے ساتھ تھے۔ ان کے درمیان عمر میں بھی چند ماہ کا فرق تھا۔ پہلے دونوں گھروں کی درمیانی دیوار مشترک تھی۔ پڑوس کے علاوہ دونوں اسکول کے ساتھی بھی رہ چکے تھے۔ سراج دین نے آٹھویں تک پڑھا تھا۔ امام چاچا نے میٹرک کر لیا تھا۔ اتنے طویل ساتھ کے بعد آج ان کا خود کو حقیقی چاچا کی جگہ محسوس کرنا فطری بات تھی۔ شاہد ان کا حقیقی بھتیجا یوں بھی ہو گیا تھا کہ خود ان کے کوئی بھائی بہن نہیں تھے۔ آخری مہمان بھی عشا سے پہلے جا چکا تھا۔ وہ مسجد سے لوٹے تو سامان سمیٹا جا رہا تھا۔ شاہد اندر دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا ایک کاپی میں وہ حساب لکھ رہا تھا جو کلثوم مختلف رسیدیں اور پرچیاں دیکھ کے لکھوا رہی تھی۔ شاہد سخت بیزار تھا لیکن وہ پیسے پیسے کا اندراج چاہتی تھی۔ پھر امام چاچا تھکن سے بے حال وہیں آ کر لیٹ گئے تو شاہد نے فریاد کی۔ ”امام چاچا! یہ کیا منشی گیری کروا رہی ہے مجھ سے۔ جو ہونا تھا خرچ ہو گیا۔ کون مانگ رہا ہے حساب؟“

امام چاچا نے ایک حدیث کے حوالے سے کہا کہ لین دین کے مالی معاملات کو لکھنے کی تاکید ہے۔ شاہد کے سامنے کلثوم کا ایک نیا روپ آیا تھا جو یکسر مختلف تھا۔ وہ بہترین منتظم اور معاملہ فہم ثابت ہوئی تھی جس کی نظر کہیں چوکی نہیں تھی۔ لاہور جیسے شہر میں تقریبات کی ذمے داری لینے والے ایونٹ مینجمنٹ کی سند رکھتے تھے اور اپنے کام کے بہت پیسے لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ کلثوم کو مستقبل میں ایک گھر کی بہترین منتظم دیکھ رہا تھا۔ ایک ایسی شریک حیات اور ماں جس کے ہوتے کسی شوہر کو کسی بھی معاملے میں فکرمند یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کے انداز حسن کی قوت تسخیر اپنی جگہ۔ خوش قسمت ہوگا وہ جو اس سے شادی کرے گا۔ یہ خیال شاہد کو حسابات کا دفتر بند کرتے ہوئے آیا تو اس سے منسلک دوسرا خیال از خود اس کے سر میں سما گیا کہ وہ خود بھی تو وہ مرد ہو سکتا ہے۔ یہ سارا عشق محبت کا کھیل تماشا اپنی جگہ۔ بالآخر زندگی میں قیام اور ٹھہراؤ آئے گا، جب گھر بسانا ناگزیر ہوگا۔ اور وہ وقت اب زیادہ دور بھی نہیں ہے تو کیوں نہ وہ تلاش ختم کر دے؟ یکلخت شاہد پُرسکون ہو گیا۔ اس کے وجود کی بے قراری اور اضطراب میں کسی تلاش کے ختم ہونے کا اطمینان یوں اترا جیسے کھیت کی سوکھی مٹی میں ساون کی بارش اترتی ہے۔ اب وہ چاہتا تھا کہ کلثوم اس کے فیصلے کو قبولیت کی سند عطا کر دے لیکن وہ دل کو سمجھانے میں کامیاب رہا کہ یہ بات ابھی کرنے کی نہیں ہے اور جب بھی ہوگی فیصلہ اس کے حق میں ہی ہوگا جو اس کی ماں بہت پہلے کر چکی تھی۔

رات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے امام چاچا اور کلثوم وہیں سو گئے۔ وہ خود باہر والے کمرے میں جا کے لیٹ گیا مگر نیند کو منانے میں ناکام رہا۔ اس کے ذہنی انتشار میں احساس جرم و ندامت کی خلش کے ساتھ اب ایک نئی زندگی کے خواب بھی شامل ہو گئے تھے۔ [illegible] زندگی کے خوابوں کی تعبیر میں کلثوم کا خیال نئے رنگ بھر رہا تھا۔ کلثوم نے اس جگہ سے نقل مکانی کرنے والوں کے لیے اچھے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پاکستان چھوڑنے کے لیے وہ کہاں تیار ہوگی۔ اکیلا رہ جانے والا باپ اس کی ذمے داری تھا۔ اس باپ نے بیٹی کی پرورش کرنے کے لیے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اب خیال رکھنے کی ذمے داری بیٹی پر آ گئی تھی تو ایسی خودغرضی کا مظاہرہ کلثوم کبھی نہیں کرے گی۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ امام چاچا نے اپنا سب کچھ بیچ کے ایک مسجد میں لگا دیا تھا جس کو ایک شاندار دارالعلوم بنانا ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ ان سے وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ آپ چل کے ہمارے ساتھ رہیں۔ کلثوم بھی یہی کہے گی کہ میں ابا کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گی۔

کیا جو اس سے شادی کرے گا اسے گھر داماد بن کے رہنا ہوگا؟ وہ بھی اپنی زندگی اسی دنیا میں گزارے گا؟

شاہد کو مستقبل کے راستے ایک دوسرے کو کاٹتے محسوس ہوتے تھے۔

☆☆☆

سفر بے شرط
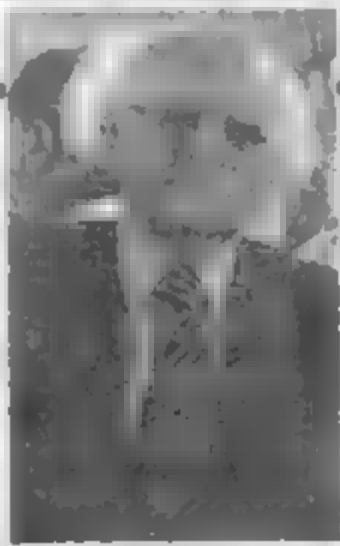
میری اس ادارے سے وابستگی کی عمر چالیس برس ہو چکی۔ معراج رسول نہیں رہے۔ ان سب میں سے کوئی نہیں رہا جن کو وہ شوق اور عزم کے ساتھ اس ادارے میں لائے تھے۔ شوق تھا ادارے کو معیار میں اعلیٰ ترین مرکز اشاعت بنانے کا اور عزم تھا لاکھوں قارئین کو خوب سے خوب تر تفریحی ادب فراہم کرنے کا۔ سسپنس ڈائجسٹ کی گولڈن جوبلی درحقیقت انہی مقاصد کی تکمیل ہے۔ میں بھی حصول مقصد کے طویل سفر میں ان سب کے ساتھ تھا جو اب ہم میں نہیں لیکن ادارے کی تاریخ میں زندہ ہیں۔ اس سفر میں میری تخلیقی کاوش کا انداز سلسلہ وار کہانیوں کی صورت میں بھی سامنے آیا، پہلی یا آخری طویل کہانی اور پرمزاح بھورے ماموں اور کالے خان کے کردار کی صورت میں بھی۔
مجھے آج بھی سسپنس ڈائجسٹ کے توسط سے دنیا بھر میں لاکھوں نئے پرانے قارئین کی پسند کا اعزاز حاصل ہے جن میں ہر عمر اور طبقہ خیال کے لوگ شامل ہیں۔ اب میں دعا اور مشورہ دینے والوں میں شامل ہوں تو نو واردان شوق سے یہی کہوں گا کہ ہر منزل کے حصول کے لیے استقامت ہی شرط ہے اور اچھا لکھنے کے لیے دو ہی لوازم ہیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ۔

گولڈن جوبلی ہم سب کو مبارک

احمد اقبال

فی نے کمرے کی کھول سے عقبی حصے کا منظر دیکھا۔ کمرا کچھ چھوٹا اور ٹاپ فلور پر کاریڈور کے بالکل آخر میں تھا چنانچہ کچھ کم کرائے کے باوجود یہاں قیام کے لیے آنے والوں کی آخری ترجیح ہوتا تھا اور عموماً خالی رہتا تھا۔ عاصم بٹ ایک کوالیفائڈ منیجر تھا۔ ہوٹل مینجمنٹ کی ڈگری ضرور ہوگی اس کے پاس لیکن اس کی کامیابی کے پیچھے اچھی شخصیت اچھے مینرز اور اچھی انتظامی صلاحیت کا ہونا لازمی تھا۔ کاروبار پبلک ڈیلنگ کا تھا اور واسطہ پڑتا تھا اس ایلیٹ کلاس سے جو سب اچھا چاہتی ہے۔ عاصم کی ڈیوٹی کے کوئی اوقات کار نہیں تھے۔ وہ صبح دس بجے سے نصف شب تک ہوٹل میں ہر جگہ نظر آتا تھا۔ حد درجہ کاروباری اخلاق کے پیچھے وہ ایک اچھا آدمی نہ ہوتا تو مشکلات کی دلدل میں گھری فی کی دستگیری کے لیے ہاتھ کیوں بڑھاتا۔ اس کا سخت گیر رویہ بھی ایک ضرورت تھا لیکن فی نے محسوس کیا کہ شاہد کی فریب دہی پر اس کا غصہ بہت جلد فی کے لیے ہمدردی میں بدل گیا تھا۔

رسمی انداز میں دروازے پر ناک کر کے وہ اندر آیا اور اس کے سامنے صوفے پر ٹک گیا۔ ”مجھے اس حرامزادے کے بارے میں کچھ تو بتاؤ۔ چلو مانا کہ اس کے گھر کا پتا، کام یا کاروبار کا نہیں معلوم۔ حد یہ ہے کہ جس موٹر سائیکل پر اس کے ساتھ پھرتے پھرتے یہاں تک آ گئی ہو، اس کا نمبر بھی نہیں دیکھا۔“

”کبھی دیا نا کہ بس دھیان نہیں دیا۔“

”وہ چوری کی تھی۔“ عاصم اس انکشاف کا ردعمل دیکھتا رہا۔

فی چونک پڑی۔ ”کیا مطلب وہ یہی کام کرتا تھا۔“

”یہ تو میں نے نہیں کہا مگر یہ ہو سکتا ہے۔ اس نے رات کو موٹر سائیکل یہاں مہمانوں کی کار پارکنگ میں کھڑی کی تھی۔ اس کا نمبر رجسٹر سے مل گیا جس میں کاروں کے ہی نمبر ہوتے ہیں۔“

”پھر تو وہ پکڑا جائے گا۔“

”پکڑا تو وہ ضرور جائے گا لیکن لاہور رجسٹریشن آفس سے پتا چلا ہے کہ اس کا مالک کوئی اور ہے۔ مالک نے بتایا کہ گاڑی ایک سال پہلے لبرٹی سے چوری ہوئی تھی۔ تھانہ گلبرگ نے رپورٹ کی تصدیق کی اور یہ بھی کہا کہ گاڑی برآمد ہو گئی تھی لیکن مالک لینے نہیں آیا تو مجسٹریٹ نے سپرداری میں دے دی مگر وہ شاہد نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”چکر ہیں چور پولیس ریکٹ کے۔ کوئی چوری کی گاڑی اچھی حالت میں مل جائے تو یہ مالک کو بتاتے ہی نہیں۔ اندراج

کر دیتے ہیں کہ بار بار کی طلبی و یاد دہانی کے باوجود شکایت کنندہ برائے وصولی مالِ مسروقہ نہیں حاضر ہوا۔'' عاصم ہنسا۔ ''یہی زبان لکھی جاتی ہے تھانے میں۔ گاڑی یہ لوگ اپنے کسی بھائی بند کے سپرد کرنے کے احکام حاصل کر لیتے ہیں۔ سالے مالک کو بھی پتا نہیں چلتا کہ اس کی گاڑی کون لیے پھر رہا ہے۔ خیر پتا لگ جائے گا۔ تمہارا شاہد ہوگا تو شام تک حاضر کر دیا جائے گا لیکن مجھے پتا ہے وہ کوئی اور ہوگا۔''

ثمی حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔ ''کیسے پتا ہے؟''

''ارے بی بی! کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھا ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہاں جو آتے ہیں نا ایک سے ایک توپ قسم کے لوگ سب کو خوش رکھنا میرا کام ہے۔ سب کے کارڈ ہیں میرے پاس۔ ایک فون کرتا ہوں، ہر کام ہو جاتا ہے۔ تمہارا مجرم تین دن میں تمہارے سامنے کھڑا ہوگا۔''

''میں واقعی بہت بے وقوف ہوں نا۔ ایک بات پوچھوں۔ آخر کیوں کر رہے ہو یہ سب تم؟''

''تمہارے لیے ہرگز نہیں۔ واردات اس نے یہاں کی میرے ہوٹل میں۔ اس کا سراغ تو مجھے لگانا ہے اور مجھے تم سے واجبات بھی وصول کرنے ہیں۔ پیسا تمہارے پاس تھا نہیں تو میں نے تمہیں کمائی کے راستے پر لگا دیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کمانے کی صلاحیت ہے تمہارے پاس۔''

ثمی کے حلق میں تلخی سی گھل گئی۔ ''یعنی تم نے مجھے ایک پیشہ ور طوائف بنا دیا۔''

''تم پہلے کیا تھیں خاتون؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ایک عفت مآب دخترِ مشرق؟ یہ ڈراما یہاں ہر رات چلتا ہے اور میں دیکھتا ہوں سب۔ میں بھی لگ گیا باتوں میں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ۔ دوپہر کا کھانا آجائے گا۔ پھر تم ہماری گاڑی میں جا کے کچھ اچھے کپڑے خریدو۔ ہوٹل کا یہ قرض بھی تمہیں چکانا ہو گا۔ لیکن میرا خیال ہے تم بہت جلد ہائی سوسائٹی میں قدم جما لو گی۔ رات کو میں تمہیں روف ٹاپ بوفے ڈنر میں کچھ لوگوں سے ملواؤں گا۔ آج فل مون ہے نا۔ وش یو گڈ لک۔ ابھی تم مجھے اس مفرور عاشق کا فون نمبر دو اور اپنا۔ میں ذرا کال ریکارڈ نکلواتا ہوں۔ ایک ریٹائرڈ جنرل صاحب ہیں میرے مہربان۔ ان کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں میں لیکن پہلے کچھ فائدہ اٹھا لوں۔''

ثمی نے اسے دونوں نمبر لکھ کر دے دیے۔ ''پتا چل جائے گا وہ کس کس کو فون کرتا تھا اور اس کے پاس جو فون آتے تھے؟''

''ساری کال ہسٹری دیکھ لینا کل تک تمہارے سامنے ہوگی۔ اور انشاء اللہ ایک دو دن میں مفرور عاشق بھی دست بستہ لایا جائے گا۔''

کتنا بولتا ہے یہ شخص۔ ثمی نے اس کے جانے کے بعد سوچا۔ لیکن ہے چلتا پرزہ۔ بھلا اسے کیا دھوکا دے گا کوئی۔ خود ثمی کی زندگی کی گاڑی تو عین اس وقت پٹری سے اتر جاتی تھی جب سفر کی منزل کے سراب میں مبتلا ہو کے وہ ایک محفوظ زندگی اور پُرآسائش گھر، دو پیارے پیارے بچوں اور پھر ان کے بچوں کے خواب کی تعبیر کو حقیقت تسلیم کر لیتی تھی۔

یونیورسٹی تک وہ اپنی خود سری اور بغاوت سے پہنچی تھی ورنہ ماں باپ تو اسے میٹرک کے بعد ہی رخصت کر دیتے۔ اس کا تعلیمی کیریئر بہت شاندار رہا۔ وہ ہر ایکٹیویٹی میں پیش پیش ہوتی تھی لیکن اسے سخت حیرانی اور مایوسی ہوتی تھی جب اس کے بہت روشن خیال اور ماڈرن نظر آنے والے کلاس فیلوز خاندان کی دقیانوسی خیالات والی کسی کزن سے شادی کر لیتے تھے۔ ان میں سو فیصد وہ طلبہ لیڈری کرنے والے بھی شامل تھے جو خواتین کے حقوق، تحفظ اور مساوات پر تقریریں کرتے رہتے تھے۔ ثمی کے چار سال دل لگانے کی دل لگی میں گزر گئے۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد کے تجربات نے اس کی روشن خیالی کے سارے تصورات باطل کر دیے۔ وہ جہاں گئی اسے مرد کی حاکمیت والی دنیا ملی۔ اسے ٹی وی چینلز پر نیوز ریڈر سے ماڈل اور ایکٹریس تک بنانے والوں نے استعمال کیا۔ دو مردوں نے اسے شادی کے خواب دکھا کے چھوڑ دیا۔ تیسرے نے ایفائے عہد کیا مگر اس کے گھر میں جوائنٹ فیملی کا لائف اسٹائل بہت پرانا تھا۔ اتنی پابندیوں کی زندگی کا ثمی نے تصور نہیں کیا تھا۔ صرف چھ ماہ میں جھگڑے اتنے بڑھے کہ ثمی نے علیحدگی اختیار کر لی۔ طلاق سے اس کو ایک لاکھ ملے تھے۔ اس کا زیور ساس سسر نے ضبط کر لیا تھا۔ اس سے پہلے جو کچھ اس نے ادھر ادھر سے کمایا تھا، بہت زیادہ نہیں تھا لیکن بعد میں جب وہ ایک ورکنگ ویمن ہاسٹل میں رہی تو وہی سرمایہ اس کے کام آیا تھا۔ جو تھوڑا بہت بچا تھا شاہد نکال لے گیا تھا۔ گھر سے اس کا تعلق ٹوٹے دو سال ہو چکے تھے۔ دو مہینے پہلے اس نے ماں باپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا تو بھائی نے بہت تند و تیز سنا کے بتایا تھا کہ ابا تو رہے نہیں۔ اماں بھی اسے بھول چکی ہیں۔ ان کی یاد داشت جواب دے چکی ہے۔ سامنے آؤ گی تو بھی وہ نہیں پہچانیں گی پھر بھائی نے فون لے لیا تھا اور اسے کھری کھری سنائی تھی۔

"تمہاری یادداشت ٹھیک ہے اور ہمیں سب یاد ہے کہ تم نے اس گھر کی عزت کا کیا تماشا بنایا تھا۔ خبردار جو پھر کبھی فون کیا۔ تم مر چکی ہو ہمارے لیے۔" اور اس دن ثمی بہت روئی تھی۔ اس نے پہلی بار ناکامیوں سے دلبرداشتہ ہو کے سوچا تھا کہ اسے مر جانا چاہیے۔ زندگی نے ہر قدم پر اسے مات دی تھی حالانکہ اس نے خدا سے بھی کوئی کروڑ پتی نہیں مانگا تھا۔ خوش نصیبی کسی کی میراث نہیں لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ عقل و دانش، لگن اور ہمت سے کامیابی ضرور ملتی ہے۔ جھوٹ، پُرفریب خیالی دنیا کی باتیں۔ عملی دنیا کے مالک مرد تھے یہاں جو ملتا تھا انہی کی شرائط پر ملتا تھا۔

ثمی کو یقین تھا کہ اس کا انگریزی اردو کا تلفظ درست ہے، وہ اچھی مقرر اور ڈی بیٹر تھی یونیورسٹی کے کئی فنکشن اس نے کمپیئر کیے تھے لیکن جب اسے خبریں پڑھنے کا موقع ملا تو بہت سی خامیاں سامنے آ گئیں۔ وہ ٹریننگ اکیڈمی جانا چاہتی تھی لیکن وہاں ایسی ہی تھیں جو چل رہی تھیں کیونکہ ان کو چلانے والے تھے۔ خیرخواہوں نے بتا دیا کہ جب تک نیوز پروڈکشن کے کرتا دھرتا خوش نہیں ہوں گے، وہ کامیاب نہیں ہوگی۔ یہ خوش کرنے کا معاملہ ڈراما پروڈکشن یونٹ میں سب سے مشکل تھا جہاں ہر روز نئی لڑکیاں قسمت آزمانے اور گلیمر کی دنیا میں راج کرنے کے خواب لے کر آتی تھیں اور مایوسی، رسوائی اور شکست کی ساری کی ساری سمیٹ کر جاتی تھیں۔ ثمی کی توقعات کا شیش محل سفاک حقائق کے پتھروں سے ٹوٹا تو پھر وہ سنبھل نہ سکی۔

شاہد اس کی آخری امید تھا۔ اس کی سادگی انتہائی پُرفریب ثابت ہوئی تھی۔ ثمی کو اپنی زندگی کے تجربات سے ملنے والی دانائی پر بہت بھروسا تھا لیکن اسے ایک بار پھر بدترین شکست ہوئی تھی۔ اب وہ اس فائیو اسٹار ہوٹل کی یرغمال تھی اور اسے حسن و شباب کی باقی ماندہ دولت کے ساتھ ہر رات ایک نیا جوا کھیلنا تھا۔ ہار جیت کی پروا کیے بغیر اس کے لیے نئے روم سروس نے فراہم کیا۔ وقتی طور پر عاصم نے اسے جینے کی راہ دکھا دی تھی اور اس کی مجروح انا کے زخم سے خون رسنا بند ہو گیا تھا لیکن زخم کا مندمل ہونا وقت کی مسیحائی مانگتا تھا۔ وہ تھوڑا سا پُرسکون ہوئی تو سو گئی۔ عاصم اندر آیا اور لوٹ گیا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے آہستگی سے اس کو آواز دے کر بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ گہری نیند میں تھی۔ اس نے ثمی کے گالوں پر چٹکی دی۔ ثمی نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کوئی اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ چیخ مار کے ایک دم اٹھ بیٹھی۔ "کک...... کون...... کون ہے؟"

"میں عاصم...... تمہیں آواز دی لیکن تمہاری نیند بہت گہری تھی۔ میں سونے دیتا تمہیں مگر شاپنگ کے لیے جانا ضروری ہے۔"

"ہاں۔" اس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا جو تیسرے دن اس قابل نہیں رہے تھے کہ باہر پہنے جا سکیں۔

"واش روم میں ایک سوٹ ہے دیکھ لو۔ گیسٹ چھوڑ جاتی ہیں کبھی تو ہم رکھ لیتے ہیں کہ شاید واپس آ کے مانگے۔" عاصم نے کہا۔

ثمی نے اسے ممنونیت سے دیکھا۔ "صحیح پروفیشن لیا تم نے۔ مہمانوں کی ضرورت کا خیال رکھتے ہو۔"

وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے رکا۔ "یہ رکھ لو۔" اس نے جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ "بہت اچھا تو نہیں ہے لیکن کام چل جائے گا۔ اس میں ہوٹل کے کانٹیکٹ ہیں، ضرورت پڑے تو کال کر لینا۔"

ثمی نے فون لے لیا۔ "تھینک یو۔ تھینک یو عاصم۔ جو بھی تم نے میرے لیے کیا۔" فرطِ جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "تم کیسے میرے ساتھ کیا کرتی؟"

"باہر گاڑی کھڑی ہے شوفر کے ساتھ۔ سفید کرولا جو مہمانوں کو لانے لے جانے میں استعمال ہوتی ہے۔ تمہیں تو جہاں کا پتا ہے نہیں پر اس کو میں نے سب سمجھا دیا ہے کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔"

"تم نے کہا تھا پچاس ہزار۔"

وہ دروازہ کھول کے باہر جاتے جاتے رک گیا۔ "ہاں۔ اس میں چار ڈریس اور دو شوز لا سکتی ہو تم۔ چوائس تمہاری ہے۔ ایک بات میں نے بتا دی تھی کہ یہ قرض ہے ہوٹل کا جو تمہیں واپس کرنا ہوگا۔ اگر ہمت ہے زیادہ کی تو...... ایک لاکھ ہو سکتے ہیں لیکن میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

"میرے بیگ میں تو سو روپے بھی نہیں۔" وہ خفت سے ہنسی۔

"نیچے کاؤنٹر سے کیش لے لینا۔ میں نہ ہوا تو کیشیئر دے دے گا۔" وہ دروازہ بند کر کے نکل گیا۔ ثمی کچھ دیر موبائل فون ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔ اس محبت کی فریب خوردہ عورت میں جو گزشتہ روز جاگی تو اسے لگتا تھا کہ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے کھینچ لی گئی ہے اور آج کی ثمی میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ وہ بے یقینی اور عدم اعتماد کے خلا میں گر رہی تھی اور ٹوٹ کے بکھرنے والی تھی جب عاصم نے اس کے لیے پیراشوٹ کھول دیا تھا۔ اس کے قدم پھر مضبوطی سے زمین پر جم گئے تھے۔ ایک اجنبی زمین بھی بے یقینی کا

اندھا خلا نہیں تھی۔

وہ نئے حوصلے کے ساتھ واش روم گئی اور نکلی تو ایک نئے جوڑے میں تھی جو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے لیے نہیں تھا۔ شاپنگ کے دو گھنٹے بھی خواب کی صورت تھے۔ وہ بنک روڈ کا کوئی چھوٹا سا فیشن شاپنگ سینٹر تھا جہاں مؤدب باوردی شوفر نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ مہذب سیلز گرل اس کے ساتھ رہیں اور پھر ایک وردی والا ملازم سب سامان گاڑی تک لایا تو شوفر دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کپڑوں کے بعد دو جوتے خریدتے ہوئے اسے بالکل احساس نہیں ہوا کہ وہ شوق کے سامنے تنگ دامنی کا شکار ہوئی۔ وہ بہت خوش تھی کہ یہ عین ان خوابوں کی تعبیر تھی جو اس نے دیکھ رکھے تھے۔ واپس ہوٹل جاتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر کے پھر کھولیں۔ یہ فریب آرزو نہیں تھا۔ کار اسی ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی۔

رات نو بجے اسے عاصم کا فون موصول ہوا۔ ''کیا تم تیار ہو؟''

''بس پندرہ منٹ اور۔'' وہ نروس لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے۔ جلدی کوئی نہیں۔ تم سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔''

''مجھ سے کون ملنے آئے گا؟''

''ایک فیشن اور شوبز میگزین کا پرعزم پبلشر اینڈ ایڈیٹر سب کچھ۔ جنہیں ایک سرکل میں متعارف کرائے گا آج کا لانائٹ میں۔''

''اوہ عاصم! میں نروس ہو رہی ہوں۔ کیوں کر رہے ہو تم یہ سب؟''

وہ ہنسا۔ ''اپنا قرضہ وصول کرنے کے لیے۔'' اور فون بند کر دیا۔

شہریار مرزا پینتالیس سال کا گریس فل مرد ایلیٹ کلاس کی شادی شدہ خواتین اور ٹین ایجرز میں ایک سا مقبول تھا۔ شوقین مزاج مردوں کے اس اجتماع نے شی کو پُرتجسس دلچسپی اور ان کی بیویوں بیٹیوں نے محتاط شک بھری نظر سے دیکھا۔ بیشتر لوگ آپس میں شناسا تھے۔ ہر گالا نائٹ پر ایلیٹ کلاس کے اس سوشل سرکل میں نئے لوگوں کا شامل ہونا عام سی بات تھی لیکن شہریار مرزا کا کسی کو متعارف کرانا عام بات نہیں تھی۔ شی کے پاس یونیورسٹی ایجوکیشن کے ساتھ ایکسٹرا اکیڈمک کیریئر کا اعتماد تھا اور وہ مجبوری تھی جو میڈیا یا ہاؤس کی غلام گردشوں کے تجربات سے ملی تھی۔ اس سب کے ساتھ شی کا وہ حسن تھا جس میں آسمان پر روشن چودھویں کے چاند کی چکا چوند نہیں تھی، پندرھویں شب کی چاندنی کا دھیما پن تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے اپنی اجنبیت کے احساس کی جگہ پر قابو پالیا اور ایک گروپ میں سیٹل ہو گئی جس میں شوقین مزاج ارسٹوکریٹ اور بیورو کریٹ شامل تھے۔ ان میں سے ایک کو یاد آ گیا تھا کہ وہ ٹی وی اینکر تھی۔ دوسرے نے اعتراف کیا کہ وہ ایک سیریل میں بھی نظر آئی تھی۔ اتنی راہ و رسم، آشنائی کافی تھی۔ اس وقت تک شہریار مرزا ماڈلز، بیوٹی پارلرز اور فیشن برانڈز کی مالک خواتین میں گم ہو چکا تھا۔ یہ بھی ایک بزنس ڈیل تھی جس میں عاصم اسے گراؤنڈ فراہم کرتا تھا اور شہریار مرزا اس کے لیے کلائنٹ بناتا تھا۔ شی کو یہ خیال پریشان کرتا رہا کہ اس کھیل میں وہ کیوں شامل کی گئی ہے۔ وہ اندر سے بہت ڈری ہوئی تھی۔

نصف شب کے بعد وہ اپنے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر ایک ویٹر سنہری ٹرے میں ہوٹل کے مونوگرام والا ایک بند لفافہ لیے کھڑا تھا۔

''یہ ایک سو دو نے دیا ہے میم۔'' اس نے سر جھکا کے کہا۔

شی نے لفافہ اٹھالیا اور دروازہ بند کر کے کھولا۔ اس میں پچاس ہزار کے ایک چیک کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ کافی تھکی ہوئی تھی لیکن ایک کے بعد دوسری شکست نے اسے زندگی کی حکمت عملی بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ خوابوں سے نکل کے حقائق کی دنیا میں قدم رکھنا اس کی ضرورت بن گیا تھا۔ وقت بھی گزر گیا تو بھی واپسی اور پشیمانیوں کے سوا کچھ بھی پاس نہیں ہوگا۔ بوجھل قدموں کے ساتھ اس نے کوریڈور سے لفٹ تک کا فاصلہ طے کیا اور فرسٹ فلور پر ایک سو دو کے دروازے پر آہستہ سے ناک کیا۔

''یس پلیز.....'' کی آواز کے ساتھ ہی وہ اندر داخل ہو گئی۔ صوفے پر نائٹ سوٹ میں لیپ ٹاپ کے ساتھ بیٹھا ادھیڑ عمر کا صحت مند اور وجیہ شخص مسکراتا ہوا اٹھا۔ ''ویلکم مس شی! بہت اچھا کیا کہ آپ چلی آئیں۔ سب کے درمیان کوئی کام کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔''

مسکرا کے اس نے ایک ادائے ناز کے ساتھ نصف چہرے پر جھولتے چمکیلے بالوں کو ہٹایا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایک نظر میں اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ رفیق شب ایک کامیاب دولت مند اور تعلیم یافتہ بزنس مین ہے۔ ''مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''ایک کام تو بہت اچھا آتا ہے..... دل جیتنا۔'' وہ مسکرایا۔ ''لیکن اصل بزنس کی بات کرنے سے پہلے بتائیں آپ کیا لیں گی؟ کافی، کولڈ ڈرنک یا اس سے آگے کی چیز۔''

''بس جو آپ پی رہے ہیں وہی کافی ہے۔''

''یس یہ کافی ہے۔'' وہ ہنسا اور فون اٹھا کے کافی کا

آرڈر دیا۔

’’ثمی! بزنس ڈیل میں تکلفات نہیں چلتے۔ دو اور دو چار کی زبان ٹھیک رہتی ہے۔ جب تمہیں دیکھا تو میں نے سوچا کہ کیا تم میری اگلی فلم کے لیے موزوں ہو۔ میں یوسف بیگ ایک بزنس مین ہوں، میرا کاروبار افریقا سے جاپان اور ملیشیا تک ہے۔ امپورٹ اور ایکسپورٹ۔ مگر میں فلموں میں انویسٹ کرتا ہوں۔ جو اب کھیلتے ہیں اٹ از اے گڈ گیمبل۔ فلم کی کامیابی جوئے کا داؤ ہے جو ابھی تک تو لگا نہیں۔‘‘ وہ ہنسا۔ ’’لیکن یہ میرا شوق ہے، لالچ نہیں۔ اگلی فلم کے لیے میں سوچوں گا کہ پہلے سے کیسے مختلف ہو۔‘‘

’’بہت اچھی لگی مجھے یہ بات۔‘‘ ثمی واقعی متاثر ہوئی۔

’’فلم پر کافی کام ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں آفر کروں لیکن آفر کے ساتھ کچھ اور شرائط ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم میرے ساتھ رہو گی۔ الگ گھر میں الگ گاڑی۔ میری پہلی بیوی کے دو بچے خاصے بڑے ہیں۔ پہلے شور کرتی تھی۔ اب سمجھ لیا ہے اس نے بھی کہ یہ سب تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ میرے ساتھ تم باہر بھی جاؤ گی۔ تمہارے ساتھ کوئی مستقل کمٹمنٹ نہیں ہے۔ تم بھی جب چاہو جا سکتی ہو۔‘‘

ان کے درمیان خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔

ثمی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ’’ایک دو روز میں بتاؤں گی میں۔ ویسے تو آپ کی آفر اچھی ہے۔‘‘

صبح ثمی نے چیک کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے عاصم کو دے دیا۔ ’’اب میں تمہاری مقروض نہیں ہوں۔‘‘

عاصم نے چیک کو ایک نظر دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ’’کیش چاہیے مجھے۔ ابھی دو دن بینک بند رہیں گے۔ سوموار تک تم مقروض رہو گی لیکن اس چیک کی ضمانت پر تمہیں مزید لون مل سکتا ہے۔‘‘

’’لوں گی اگر ضرورت پڑی تو۔‘‘

’’تمہارے لیے سنسنی خیز معلومات ہیں میرے پاس۔‘‘ اس نے چیک کو ایک دراز میں ڈال دیا۔ ’’تم بیٹھو ہال میں اور کافی لانے کا کہو۔ میں بھی آ رہا ہوں۔‘‘

وہ پانچ منٹ میں آ گیا۔ ’’تمہارے مفرور مجنوں کا پتا چل گیا۔ یس، میرا خیال صحیح تھا۔ وہ راولپنڈی کا رہنے والا ہے۔‘‘ اس نے ایک لمبے کاغذ کی پٹی نکالی جس پر درجنوں فون نمبرز تھے۔

ثمی کا دل ایک بار تیزی سے دھڑکا۔ ’’کیسے پتا چلا؟ بات ہوئی؟‘‘

’’اس نمبر پر کالز لاہور سے زیادہ تھیں لیکن ایک نمبر تھا یہاں کا۔ اس سے شاہد کو بار بار کال ہوئی تھی۔ خاص طور پر اس دن اور پھر رات تک جب وہ یہاں تھا تمہارے ساتھ۔‘‘ اس نے فہرست سامنے کی جس پر ایک نمبر انڈر لائن کیا گیا تھا۔

’’یہ کس کا نمبر ہے؟‘‘

’’پتا نہیں۔ اسلام آباد کی طرف ایک گاؤں ہے سہالہ۔ وہاں کون ہو سکتا ہے اس کا؟‘‘

ثمی نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’کسی امام چاچا کا فون تو آتا تھا۔‘‘

عاصم نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا۔ ’’بالکل...... یہ نمبر جس شخص کا ہے، وہ اس کے امام چاچا ہوں گے۔ میں فون کرتا ہوں بلکہ تم کرو بات۔‘‘

ثمی نے تعمیل کی اور امام چاچا کو پوچھا۔

دوسری طرف سے کسی لڑکی نے جواب دیا۔ ’’ابا تو نہیں ہیں۔ ظہر کی نماز کے بعد ملیں گے۔‘‘

’’شاہد صاحب ہیں۔‘‘ ثمی نے کہا۔

’’وہ یہاں نہیں ہوتے۔ ان کا گھر کچھ فاصلے پر ہے۔‘‘ لڑکی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ثمی نے فون عاصم کو دے دیا۔ ’’وہ اغوا ہو گیا تھا۔‘‘

’’گڈ! ابھی بلوا لیتے ہیں اسے مالِ مسروقہ کے ساتھ۔‘‘ وہ کوئی نمبر ملانے لگا۔ ’’پولیس اٹھا لائے گی۔‘‘

’’نہیں عاصم! میں خود اسے پکڑنا چاہتی ہوں، سامنے جا کے۔ کتنی دور ہے وہ جگہ؟‘‘

’’میرا خیال ہے پندرہ بیس کلومیٹر...... تم بھی چلی جاؤ پولیس کے ساتھ۔‘‘

’’نہیں، پولیس نہیں۔ تم چلو میرے ساتھ...... پلیز۔‘‘ ثمی نے کہا۔

’’میں؟ یار میں ڈیوٹی پر ہوں ابھی تو۔ سوری، تم ڈرو مت۔ گاڑی لے جاؤ لیکن جلدی کوئی نہیں۔ وہ ہمارے ریڈار میں آ گیا ہے تو غائب نہیں ہو سکتا۔ تم جب کہو گی اس کو حاضر کر دیا جائے گا۔ مجرم تو وہ تمہارا ہے۔‘‘

ثمی کا فون بولنے لگا۔ ’’جی سر! میں نے کہاں جانا تھا۔ ہوٹل میں ہی ہوں۔ جی سر!‘‘ ثمی نے فون بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ ’’باس کی گاڑی آ رہی ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا آفس اور گھر دیکھ لوں۔‘‘

’’مبارک ہو لیکن ایک بات کہوں ثمی۔ یہ سب میرے لیے بھی حیران کن ہے۔ ایسا ہوتا نہیں۔ میں نے تو تمہیں ہمدردی میں انٹروڈیوس کرا دیا تھا۔ یہاں تو ایک بزنس فیئر سارا سال لگا رہتا ہے۔ ہر قسم کے سودے ہوتے ہیں۔ صنعتی

پیداوار سے زرعی پیداوار تک تاجر یہاں آتے ہیں۔ بیچنے والا بھی خریدنے والا بھی۔ بس اخلاقیات کے درس دینے والوں کا یہاں گزر نہیں۔ وہ پبلک میں اپنی دکان چلاتے ہیں۔ رزق حلال اور کالا دھن حرام حلال جیسے الفاظ یہاں کوئی نہ بولتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ عورت یہاں بس ایک ہوسٹ ہے...... میزبان۔ جیسے بیوپاری ویسا ان کا مال۔"

ثمی خلا میں دیکھتی رہی۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ میں پرانے شہر کی پرانی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی۔ مجھے نئی دنیا کی چمک دمک بڑا لبھاتی تھی اور میں سمجھتی تھی کہ اس کو تسخیر کرنا کیا مشکل ہے لیکن اپنی دنیا چھوڑ کے میں بس بھٹکتی ہی رہی۔ اب بھی مجھے لگتا ہے کہ اچانک کچھ ہوگا اور یہ سب خواب کی صورت بکھر جائے گا۔ میں پھر کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی نظر آؤں گی۔"

عاصم نے ہنس کر ثمی کے شانے پر تھپکی دی۔ "مجھے ایسا نہیں لگتا۔ تم میں حوصلہ اور صلاحیت ہے لیکن یہ تو سب کے پاس ہوتا ہے یا ایسا وہ سمجھتی ہیں۔ تمہارے پاس ایک گڈ لک فیکٹر بھی ہے۔ خوش قسمتی کا اثاثہ۔ ابھی وہ ختم نہیں ہوا۔"

"کیوں سمجھتے ہو تم ایسا؟"

"تم نے ایک رات میں لاٹری جیت لی۔ جس کے لیے یہاں آنے والی مسلسل کوشش کرتی ہیں، بار بار کوشش کرتی ہیں۔ میں نے عارضی اور مصنوعی کامیابی کی اڑان بھی دیکھی ہے۔ ہماری مستقل مہمان شوبز کی دنیا سے ہی آتی ہیں، تم اب اس دنیا میں قدم رکھو گی، گڈ لک۔"

ثمی کے لیے پورچ میں کھڑی ایک سیاہ پراڈو کے سفید یونیفارم والے ڈیئر نے دروازہ کھولا۔ اندر کا خوف مسلسل اس کے کان میں کہتا رہا۔ یہ سب تمہارا نہیں ہے۔ دونوں استعمال کی چیز ہیں تم بھی اور پراڈو بھی۔ یوسف بیگ نے دونوں کو خریدا ہے، ثمی نے آنکھیں بند کرلیں۔ یا میرے خدا! کیوں پریشان کرتے ہیں ایسے خیالات مجھے، لیکن مستقبل کی بے یقینی کا خوف اس کا آسیب بن گیا تھا۔ وہ اتنی بار فریب آرزو کا شکار ہوئی تھی کہ اب آرزو سے ڈرتی تھی۔

صاف ستھری شاہراہ پر ان گنت گاڑیوں کے ہجوم میں راستہ بناتی پراڈو اسلام آباد کے سرسبز و شاداب ایریا میں ایک عمارت کے اندر ٹھہر گئی۔ ضرور شوفر نے اپنی آمد کی خبر دے دی ہوگی کہ یوسف بیگ خود اسے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا۔ بہترین تراش کے بیش قیمت لائٹ گرے سوٹ میں وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ فرسٹ فلور پر کشادہ اور آراستہ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ آمنے سامنے دو دو کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ یوسف نے ایک دروازہ کھول کے کہا۔ "یہ تمہارا آفس ہے۔"

ثمی نے انتہائی پُرتکلف انداز میں سجائے گئے کمرے کو دیکھا۔ فرنیچر، لائٹس، پردے، قالین، ڈیکوریشن پیس سب ثمی کو اپنے بیش قیمت ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔ پیچھے ایک دروازہ اس کے ریٹائرنگ روم میں کھلتا تھا، اس میں بیڈ کے سامنے دیوار کے ساتھ صوفہ سیٹ تھا، بیچ میں ایک میز۔ اس کا واش روم بھی اندر ہی تھا۔ وہ بھی شاہانہ ہی ہوگا۔ ثمی نے اسے کھول کے دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ یوسف نے اسے آفس چیئر پر بٹھایا اور خود سامنے بیٹھ کر اسے بتانے لگا کہ یہاں اس کا ملازم خاص کون ہوگا اور گاڑی کا شوفر کون ...... اور پھر اپنا آفس دکھانے لے گیا۔ ثمی کی نظر میں اس شان و شوکت کے نظارے سے چکا چوند ہو رہی تھی۔ یوسف اب چاہتا تھا کہ وہ اپنا گھر بھی دیکھ لے اور شام کے بعد وہاں منتقل ہو جائے۔ ثمی کے پاس چوائس کوئی نہیں تھی۔ وہ خوشی خوشی رضامندی کا اظہار کرتی رہی۔ واپس لاؤنج سے گزرتے ہوئے ثمی نے سامنے والے دو کمروں کے بارے میں پوچھ لیا۔ "وہاں کون بیٹھتا ہے؟"

"میری آدھے کی بزنس پارٹنر۔ میری وائف۔ ساتھ والا کمرا اس کے سیکریٹری بیٹھنے کا ہے۔"

"تمہاری بھی تو جناب روہ؟"

"نہیں۔" یوسف نے مختصر جواب دیا جس سے ثمی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیوی کا پہلے بھی کوئی شوہر تھا اور یہ یوسف کے لیے کوئی پسندیدہ موضوع نہیں ہو سکتا تھا لیکن ثمی سوچتی رہی کہ کہانی کیا ہو سکتی ہے۔ پہلا شوہر کون تھا؟ کتنا عرصہ ساتھ رہا۔ پھر کیا ہوا۔ مر گیا یا طلاق ہو گئی۔ اہم کون تھا؟ شوہر یا بیوی اور یوسف کے ساتھ وہ برابر کی شریک کیوں تھی؟ یہ یوسف کی محبت تو ہو نہیں سکتی۔ ضرور بیوی کی دولت ہوگی۔ کہانی دلچسپ لگتی تھی۔

ثمی نے اسلام آباد میں دو بیڈ کا لگژری اپارٹمنٹ مرعوب ہو کے دیکھا۔ اس کے بیڈ روم کی ایک کھڑکی سے مارگلا ہلز کی شادابی آسمان کے نیلے رنگ اور بادلوں کے چمکتے ٹکڑوں کے ساتھ نظر آتی تھی۔

یوسف بیگ نے گھڑی دیکھی۔ "میرا بزنس لنچ ہے ایک وفد کے ساتھ۔ میں چلتا ہوں۔ تمہاری گاڑی اور شوفر موجود ہیں، نیچے گیراج ہے۔ فلیٹ میں سب کچھ ہے لیکن کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو شوفر سے کہہ دینا۔ تمہاری خادمہ آج شام تک آجائے گی۔ وہ گھر کا ہر کام کرے گی اور سارا

دن یہاں ہوگی۔ ہم اب شام کو ملیں گے۔ رائٹ؟''

باہر عجیب سا سناٹا تھا۔ اسے خوبصورت چمکتے رنگوں اور باغیچوں والے گھر خالی لگے جیسے سب برائے فروخت ہوں۔ وہ بہت دیر تک باہر دیکھتی رہی لیکن کسی بالکونی یا ٹیرس میں کوئی عورت نظر آئی نہ بچہ۔ ذیلی سڑک پر سے کوئی گاڑی نہیں گزری۔ آواز لگا کے سبزی پھل بیچنے یا ٹین ڈبے خریدنے یا خیرات مانگنے والے فقیر کا یہاں نظر آنا جرم تھا۔ اندرون بھاٹی گیٹ لاہور کے پرانے گھر کی گلیاں صبح سے رات تک زندگی کا احساس دلانے والی آوازوں سے گونجتی رہتی تھیں۔ چھت پر سے مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کے مینار نظر آتے تھے۔ آسمان کبوتروں اور پتنگوں سے آباد لگتا تھا۔ ورکنگ ویمن ہاسٹل بھی بہت بارونق جگہ پر تھا جہاں صبح سے رات تک رکشا، موٹر سائیکلیں شور کرتے گزرتے تھے اور بازار میں ہر وقت لوگ بھرے نظر آتے تھے۔ یہ حاکموں کی بستی اس سے کتنی مختلف تھی۔ وہ کچھ تھکی ہوئی اداس سی کھڑی رہی۔

پھر خادمہ نمودار ہوئی۔ فوزیہ پینتیس چالیس سال کی قبول صورت اور خوش لباس عورت تھی۔ یقیناً یوسف بیگ نے اس کا انتخاب بھی کاروباری سمجھ بوجھ کے ساتھ کیا ہوگا اور اس کام کا معاوضہ بھی اتنا دیتا ہوگا کہ ایک بار ہمدردی یا کوتاہی کی مرتکب ہونے سے پہلے فوزیہ سو بار سوچے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ سوال جواب کے بغیر یوسف کی ہر مہمان کو بھی شکایت کا موقع نہ دے۔ فوزیہ نے اس سے پوچھا کہ وہ دوپہر کے کھانے میں وہ کیا پسند کرے گی۔ سب تیار بھی ہوسکتا تھا اور منگوایا بھی جاسکتا تھا۔ فوزیہ سے اس نے کہہ دیا کہ اسے کہیں جانا ہے اور کمرے میں آکے عاصم کو فون کیا کہ میں آرہی ہوں اور کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔ پھر شوفر کو طلب کیا اور ہوٹل پہنچ گئی۔ اتنی احتیاط ضروری تھی کہ وہ نظر سے اوجھل نہ ہو۔ شوفر بھی رپورٹ دے کہ اس نے ہال میں بیٹھ کے کھانا کھایا اور بس۔

عاصم اس کے ساتھ آبیٹھا۔ ''کیا ہوا؟ تمہاری صورت پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں۔ تم خوش نہیں ہو؟''

''خوشی کا پیکیج اگر اپنی مجبوری کے ساتھ ہو تو بس قبول کرنا پڑتا ہے۔ تم اپنی صلاحیت اور کارکردگی کی بنیاد پر ہو یہاں۔''

''ایسا سوچو گی تو زندگی بھر روتی رہو گی۔ مجبوری سب کی اپنی اپنی ہے۔ میں بھی چاہتا تو ہوں کہ کسی انٹرنیشنل چین کو مینیج کروں، مالک ہوتا تو آسمان کو چھونے والی بات ہے لیکن میں اس ہوٹل میں اسسٹنٹ منیجر ہوں۔ شعر سنو—

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا..... کبھی زمیں تو کبھی آسماں نہیں ملتا۔ اب بتاؤ کیا لوگی؟ وہی کلب سینڈوچ اور کوک؟''

وہ اداس ہی رہی۔ ''ہاں..... میں ساری عمر مجبوری کے ساتھ نہیں جی سکتی عاصم۔ میں بہت کچھ اپنی صلاحیت کے بل پر کرنا چاہتی تھی لیکن ہر جگہ میں بس ایک خوبصورت چہرے اور پرکشش جسم والی عورت سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ یہ جو میں کر رہی ہوں یہ کیا ہے۔ ایک طوائف کا کام۔'' وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' وہ پریشان ہوگیا۔ ''تم ڈپریشن کا شکار ہو۔ میری ایک بات سنو۔ یہاں کون خود کو نہیں بیچ رہا ہے۔ اپنے اصول اپنا ایمان..... اپنا ضمیر۔ کیا سیاست داں، کیا تاجر اور کیا اقتدار کے ایوان میں بیٹھے لوگ۔ علم کے سوداگر۔ ڈاکٹر وکیل انجینئر سب کیا کر رہے ہیں۔ ملک کا کیا حال ہے۔ جانے دو۔ اس ایک زندگی میں ہم دنیا کو بدل نہیں سکتے۔''

وہ مشتعل بیٹھی رہی۔ ''خوش کیا میں اس زندگی سے مطمئن بالکل نہیں ہوں۔ تم دیکھنا میں یہ سب چھوڑ دوں گی ایک دن۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے غریبی سے ڈر لگتا ہے۔ بہت محرومی دیکھی ہے میں نے۔ بھوک دیکھی ہے۔ خواہشوں کو قتل کیا ہے۔ مجھے ایک اچھا شوہر اور گھر مل جاتا تو میں لامحدود خواہشوں پر دروازے بند کرکے بیٹھ جاتی، دنیا دیکھنے اور ہر شہر میں شاپنگ کرنے۔ خیر چھوڑو۔''

''جب تمہارے اندر کی یونیورسٹی گریجویٹ اور مقرر بولتی ہے تو بھی پریشان ہوتی ہے۔ میں بھی صادقین جیسا مصور بننا چاہتا تھا لیکن کام کر رہا ہوں اس کاؤنٹر پر۔ مصوری کرتا تو بھوکا مرتا۔ فنکار ہونا یہاں جرم ہے۔ اب تم بیٹھو۔ میں ذرا کام دیکھ لوں۔'' وہ اٹھ گیا۔

''الو کا پٹھا۔ آخر کہتا کیوں نہیں کہ مجھے پسند کرتا ہے۔ کیا میں سمجھتی نہیں کہ وہ میری مدد کیوں کرتا رہا؟ وہاں تو ایک سو ایک اور ایک سے ایک آتی ہیں، مجھ سے اتنی لمبی لمبی باتیں کیوں کرتا ہے؟ کیا دلچسپی اسے میرے مستقبل اور میری زندگی میں؟ پھر بھی وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے محبت کی بھیک مانگوں۔ تاکہ وہ بھی مجھے ٹھکرا دے؟ نہیں مسٹر اسمارٹ۔ بار بار کی مار کھانے والی تھی یہ نہیں کرے گی۔'' وہ آہستہ سے اٹھی اور باہر آکے اپنی گاڑی میں آبیٹھی۔

خلاف توقع رات کو یوسف نہیں آیا۔ اس نے شوفر کو بھیج کر کلب سینڈوچ منگوا کر کھائے اور سوگئی۔

اگلی صبح اس کو آفس میں یوسف بیگ کے اسٹاف نے

مسکراتے چہروں کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ شمی کو کچھ لوگوں کی تمسخر اور طنز میں بھی مسکراہٹ کا پیغام واضح نظر آیا کہ بی بی یوسف بیگ کو دولت مندی ہم اپنے کام سے دیتے ہیں جس سے وہ تم جیسی خوبصورت اشیا رکھتا ہے۔ شمی نے ان سب کو رواں انگریزی میں بات کر کے حیران کر دیا۔ وہ سب سے ان کے کام کی نوعیت اور مسائل پوچھتی رہی۔ یہ یوسف بیگ کا نافذ کیا ہوا پروٹوکول تھا کہ چیئرمین کو ہر فائل اس کی وساطت سے بھیجی جائے گی۔ دوپہر کے بعد اس نے کھانا منگوایا ہی تھا کہ دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی ہیلو پر کسی عورت نے کہا۔ ''کیسی ہیں آپ شمی۔ میں وہ ہوں جس کی جگہ آپ نے لی ہے، فردوس۔''

شمی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ ''جی فردوس! میں کیا کر سکتی ہوں آپ کے لیے؟''

''بہتر ہے تم اپنے لیے کچھ کرو۔ تین مہینے ہیں تمہارے پاس۔ پھر یہاں کوئی اور بیٹھی ہوگی۔''

''کیا کروں میں فردوس؟''

''مال جمع کرو اور کیا۔ وہی تمہارے کام آئے گا۔ ہو سکے تو .... چیئرپرسن راشدہ یوسف سے رابطہ رکھو جو اصل مالک ہے۔ اس کی حریف مت بنو۔''

''آپ نے کہا کہ وہ اصل مالک ہیں؟''

''ہاں۔ کاروبار اس کے شوہر کا تھا۔ یوسف نے اس کا اعتماد حاصل کیا اور پھر اس کی بیوی پر ڈورے ڈالے اور کہتے ہیں اسے مروا دیا۔ اس کے دو بچے تھے۔ ایک کاروبار میں ماں کی مدد بھی کرتا ہے۔ لڑکی لندن میں پڑھ رہی ہے۔ شادی کے بعد یوسف بیگ بزنس کا مالک بن گیا۔ بے شک کاروبار کو اس نے دگنا چوگنا کیا دس گنا کر دیا لیکن راشدہ کا پورا کنٹرول ہے۔''

''ان معلومات اور راہنمائی کا بہت شکریہ فردوس۔'' شمی نے سپاٹ جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

شاہد اس نئی ابھرتی آبادی کی گلیوں اور پکی سڑکوں پر چلتا پرانے بازار تک گیا۔ پرانے بازار میں جو اس کے تصور میں تھا، پرچون کی ایک دکان کرم داد کی تھی۔ دوسری اس کے بھائی فیروز کی گوشت اور سبزی کی ایک ایک دکان تھی اور عاشق کا چائے خانہ جہاں صبح سے رات تک لوگ چائے پیتے یا تیر لٹاتے نظر آتے تھے۔ رات کو تانگے سڑک کے کنارے روک کر تانگے والے گھوڑے کو کھول دیتے تھے اور وہ گلیوں سے گزرتے گھر پہنچ جاتے تھے۔ ایک کونے میں چھ فٹ سے زیادہ کی بلندی پر رکھا ٹی وی چلتا رہتا تھا۔ اب سڑک کے کنارے چار پٹرول پمپ تھے، چار ہی بینک اور کھانے پینے کی بہت سی دکانوں میں خان بابا تکا ہاؤس اور دو برگر پیزا والے تھے اور دو شیشوں کے گھومتے دروازوں والے سپر اسٹور۔ یہ ایک بارونق بازار تھا جہاں سے راولاکوٹ آزاد کشمیر جانے والی گاڑیاں گزرتی تھیں۔ سب سے زیادہ برور تھے۔ پہلے چکر میں ہی شاہد کو ایک آشنا چہرہ نظر آ گیا۔ یہ اسکول میں اس کا کلاس فیلو غفور تھا۔ وہ اندر گیا تو پرانے یار بڑے جوش سے گلے ملے۔

غفور نے رسم دنیا کے مطابق پہلے اس کی ماں اور پھر باپ کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ ''میں نہیں آسکا تھا یار بیوی اسپتال میں تھی۔ دوسرا لڑکا ہوا ہے، بچی ایک ہی ہے۔ تو بتا کتنے بچے ہیں؟''

شاہد ہنسنے لگا۔ ''اوئے شادی تو کر لوں پہلے۔''

غفور نے چائے منگوائی تھی۔ وہ سب پرانی باتیں کرتے رہے۔ پھر شاہد نے اپنا مسئلہ بتایا۔

غفور نے کہا۔ ''جگہ بکنے میں تو دیر نہیں لگے گی۔ قانونی کارروائی میں وقت لگتا ہے۔ عدالت سے سرٹیفکیٹ بنوانا پڑے گا کہ تو ہی زمین کا مالک ہے۔ اور کوئی نہیں اس میں حصے دار تو چاہیے، اخبار میں اشتہار چھپوانے کے لیے۔ پندرہ دن اور لگ جائیں گے۔ فائل کہاں ہے؟''

''فائل؟'' شاہد نے سر کھجایا۔ ''میں نے دیکھی نہیں۔ ہوگی گھر میں۔''

''فائل کی فوٹو کاپی کرا لوں گا میں۔ وکیل چاہیے تو تیرا یار خود وکیل ہے۔ امتحان پاس کر لیا ہے لیکن دیکھ ہر کسی کو مت دینا۔ فراڈ نہ ہو جائے پتر۔''

شاہد نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے مگر غفورے۔ کیا کوئی پارٹی بیعانہ نہیں دے گی؟''

''اوئے پاگل نہ ہو تو۔ ابھی زمین کاغذوں میں تیرے ابا کے نام ہے۔ کسی کو کیا معلوم اس کے کتنے وارث ہیں اور تو اس کا بیٹا ہے۔ یہ قانونی معاملات ہیں۔ وراثت کا سرٹیفکیٹ ملتے ہی بیعانہ بھی اور پوری ادائیگی بھی۔''

''یار! میں اتنے دن نہیں رک سکتا۔ لاہور میں میرا کام رک گیا ہے۔''

''تو جا۔ جب ضرورت پڑے گی تو میں فون کر دوں گا۔'' شاہد کو سخت مایوسی ہوئی۔ واپس گھر آ کے اس نے فائل کی تلاش میں سارا گھر چھان مارا۔ اگر فائل تھی تو اماں نے کہاں سنبھال کے رکھی ہوگی؟ جہاں جہاں خیال گیا اس

نے دیکھا مگر فائل جیسی کوئی چیز نہیں ملی۔ پھر اسے امام چاچا کا خیال آیا۔ او ہو۔ ماں نے انہی کے حوالے کی ہوگی لیکن ابھی ان سے فوراً تو زمین بیچ کے لاہور جانے کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے اپنے اور کلثوم کے مستقبل کی بات کرنا ضروری تھا۔ وہ مسجد میں پیش امام تھے چنانچہ دن میں پانچ وقت تو ان کا ملنا یقینی تھا لیکن اس وقت وہ کسی بھی مسئلے پر بات نہ کرتے۔ فجر کی نماز کے بعد وہ طلبا کو پڑھاتے تھے، رات کے وقت لوگ اپنے معاملات بھی لے آتے تھے ورنہ دینی مسائل پر بات کرتے تھے۔ ظہر کے بعد وہ آرام کے عادی تھے۔ عصر اور مغرب کے درمیان وقفہ بہت کم تھا۔ ان سے بات کرنے کے لیے مناسب وقت دوپہر سے پہلے کا تھا۔

شاہد کی خواہش ضرور تھی کہ کلثوم کی رضا کا پہلے کچھ پتا چلے مگر اس سے ملاقات اب ممکن نظر نہ آتی تھی۔ وہ امام چاچا کے گھر جاتا تو وہ پردہ نہ کرتی لیکن شہری انداز میں آداب میزبانی نبھانے کے لیے ابا کے ساتھ بھی نہ بیٹھتی۔ ان کے کوارٹر میں دو ہی کمرے تھے، وہ دوسرے کمرے میں رہتی۔ اس کو پیغام دے کر کہیں بلوانا بھی بعید از امکان تھا۔ درمیان میں نامہ بر کا کام کرنے والی کوئی بہن یا کزن کی سہیلی تک دستیاب نہ تھی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کے وہ صبح گیارہ بجے مسجد پہنچا تو درس جاری تھا۔ وہ سلام کر کے طلبا کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دس پندرہ منٹ میں طلبا رخصت ہوئے تو شاہد نے عرض مدعا کی۔

''مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔ کچھ اپنے بارے میں۔''

''یہاں تو اب دھوپ آ گئی ہے آؤ اندر بیٹھتے ہیں۔'' اندر ٹھنڈک تھی اور بڑا سکون دینے والی خاموشی تھی۔ ایک پنکھا چلا کے وہ ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

''میں معافی چاہتا ہوں کہ خود یہ بات کر رہا ہوں۔ اب کوئی تھا ہی نہیں جس کو میں بھیجتا۔ آپ ضرور جانتے ہوں گے۔ اماں کی کیسی شدید خواہش تھی کہ میں اب گھر بساؤں اور انہوں نے میرے لیے کلثوم کا انتخاب بہت پہلے کیا تھا۔ میں کچھ تعلیم میں اور پھر اپنے کاروبار کو سیٹ کرنے میں مصروف رہا۔''

امام چاچا نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔ ''کیا کاروبار؟''

''جی، کچھ ڈسٹری بیوشن ہے مختلف مصنوعات کی۔ لاہور کی ہول سیل مارکیٹ میں قدم جمانے کا موقع ملا ہے خوش قسمتی سے۔''

''گویا تم نے یہ جگہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کلثوم اس سے متفق ہوگی یا نہیں۔''

امام چاچا نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کا فیصلہ اسے قبول نہیں ہوگا؟''

''یہ فیصلہ نہیں حکم ہو تو وہ تسلیم کرے گی لیکن زندگی اس کی ہے۔ میں اس پر اپنا حکم مسلط نہیں کروں گا۔ میں نے ہمیشہ اسے عقل سے سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا سکھایا ہے، میں اس سے بات کرتا ہوں اللہ بہتری کرے گا۔''

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کی حکم عدولی بھی کر سکتی ہے؟'' شاہد نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''میں نے اسے سکھایا ہے کہ میرا کوئی فیصلہ غلط ہو تو مجھے بتائے تاکہ نقصان نہ ہو۔ یہ معاملہ اس کی زندگی کا ہے لیکن اس کی زندگی میری بھی تو ہے۔ اس کو کانٹا بھی چبھے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔''

شاہد اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا تھا، اسی وقت امام صاحب کا ایک ملاقاتی آ گیا جو چاہتا تھا کہ وہ شام کو اس کی بچی کا نکاح پڑھا دیں۔ اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے شاہد نے جانو کو دیکھا جو ایک ڈھابے کے باہر پڑی بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا۔ شاہد نے ہوٹل والے سے کہا کہ اسے چائے کھانا جو مانگے دے دے اور اسے سو کا نوٹ پکڑا دیا۔

جانو مسکرانے لگا۔ ''شیدے! میں نے کسی کو نہیں بتایا کچھ بھی۔''

شاہد رک گیا۔ ''کیا نہیں بتایا؟''

''یہی کہ تم نے اپنا کے مرنے سے پہلے قبر کی جگہ لے لی تھی۔'' وہ سامنے رکھی گئی دال روٹی پر ٹوٹ پڑا۔ ہوٹل والے نے بس ایک بار سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

''یہ تو بہت لوگ کرتے ہیں۔'' شاہد نے کہا اور چل پڑا۔ شاہد کے لیے اس وقت یہی بہتر تھا کہ جانو کی بات کو کسی پاگل کی بے سروپا بات سمجھ کر ٹال دے لیکن اب یہ جاننا ضروری تھا کہ بار بار وہ ایک ہی بات ہر جگہ کیوں دہراتا ہے۔ وہ پیدل آیا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں رک کر اس نے دیکھا کہ ہوٹل والا جانو کے پاس آ بیٹھا تھا اور اس سے نہ جانے کیا بات کر رہا تھا۔ شاہد تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ جانو کو نشے کی لت نے بھی ہوش و حواس سے بیگانہ کر رکھا تھا اور کسمپرسی کی زندگی نے بھی۔ وہ قبرستان میں کہیں جھونپڑی ڈال کے رہ سکتا تھا لیکن وہ ایک مقامی سائیں دریکاں والا کے چھوٹے سے خستہ حال مزار میں پڑا رہتا تھا۔ جمعرات کو کبھی کوئی عورت چراغ روشن کرنے آ جاتی تھی تو جانو کو بھی کچھ مل جاتا تھا ورنہ قبر کھودنے

کی آمدنی تھی۔ یہاں ہر روز کوئی مرتا بھی نہیں تھا، جانو مانگ تانگ کے گزارہ کرتا تھا۔

شاہد بہت دیر تک خستہ حال گنبد والے ویران مزار کے چبوترے پر بیٹھا جانو کی واپسی کا منتظر رہا لیکن پیٹ بھر کے وہ نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ ایک دیوانے کی بات کو بھی جو چاہے پھیلا سکتا ہے۔ قبر کی زمین لینا کوئی مشکوک بات نہیں ہوسکتی تھی لیکن جانو کا لہجہ اسے بہت معنی خیز لگتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ جانتا اور کہہ سکتا ہے مگر نہیں کہہ رہا ہے۔ شاہد اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کی الٹی کھوپڑی میں کیا پک رہا ہے۔

دوپہر کے بعد وہ کھانا کھانے اسی ہوٹل پر چلا گیا جہاں اس نے جانو کو دیکھا تھا۔ شاہد نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا۔ ''اس جگہ کب سے ہوٹل چلا رہے ہو؟''

''ابھی سال بھر سے۔'' چالیس سال کے شخص نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میرا بھی خیال تھا کہ یہاں نئے ہو۔ میں تو خیر پیدا ہی یہیں ہوا تھا۔ اب پرانے زمین بیچ کے جا چکے ہیں۔ گزارہ چل رہا ہے؟''

''ہاں۔ نئی مسجد بنی ہے تو رونق کچھ بڑھ گئی ہے۔''

''جانو کیا کہہ رہا تھا؟'' شاہد نے ظاہری بے نیازی سے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' ہوٹل والے نے اسے دیکھنے کے بعد کچھ سوچ کے جواب دیا۔ ''اسے ہوش کہاں ہوتا ہے اپنا۔''

شاہد شام تک سوتا رہا۔ مغرب کے وقت اسے پیش امام چاچا کی طرف جانے کا خیال آیا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھانے جاتے تو عشا سے فارغ ہو کے ہی لوٹتے۔ آج تو ان کو نکاح پڑھانے کے لیے بھی جانا تھا۔ وہ رات کو ہی لوٹیں گے۔ کلثوم اپنے گھر میں اکیلی ہوگی، یہاں سب کے بیچ میں بات اور تھی وہاں وہ اس کو گھر میں بلا کے بات کرتی ہے یا نہیں۔ یہ کوشش کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس خیال نے اسے اتنا مجبور کیا کہ اندھیرا ہوتے ہی وہ امام چاچا کے گھر جا پہنچا۔ ان کا کوارٹر مسجد کے صحن کے آخری کونے میں اکلوتے مینار کے ساتھ تھا اور کوارٹر کے ایک کمرے سے سیڑھیاں اوپر تک جاتی تھیں۔ اس میں کچھ بجلی کا سامان رکھا رہتا تھا۔ امام چاچا یہ چھوٹا موٹا کام خود ہی کر لیتے تھے۔

پہلی ہی دستک پر اندر سے کلثوم کی آواز آئی۔ ''پیش امام صاحب نہیں ہیں گھر میں۔''

شاہد نے کہا۔ ''کلثوم میں شاہد ہوں۔''

وہ دروازے کے پیچھے آگئی۔ ''جی میں نے کہا نا......''

''مجھے معلوم ہے وہ نکاح پڑھانے گئے ہیں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔ یہ اچانک اجنبیت کیسی۔ تمہیں اعتماد نہیں مجھ پر۔''

''اعتماد مجھے خود پر ہے شاہد لیکن کسی اجنبی پر نہیں جو اس کا غلط مطلب نکال سکتا ہے۔ ابا کی عزت پر میری وجہ سے کیوں حرف آئے۔''

شاہد نے شدید خفت محسوس کی۔ ''یہ بات تمہارے ابا کے سامنے کرنے کی نہیں ہے۔''

''ایسی کوئی بات میں کروں گی ہی نہیں۔ جائیے اب آپ۔ دروازے پر مت کھڑے نظر آئیں پلیز۔''

شاہد خفت زدہ اس بے عزتی پر اپنے ہونٹ کاٹتا رہا پھر واپس چل پڑا۔ ''خیر ہے سب شاہد پتر۔ بے عزتی کا حساب چکانے کے لیے عمر پڑی ہے۔ جو ابھی ہوا کس نے دیکھا؟ اور اسے غلط فہمی ہے اپنے بارے میں تو بیٹھی رہے کسی شہزادہ گلفام کے لیے۔''

☆☆☆

معمول کے مطابق وہ گیارہ بجے کے قریب اپنے لیے چائے بنا چکا تھا کہ اس کا پراپرٹی ڈیلر یار غفور آگیا۔ شیدے نے ایک کپ اس کے سامنے بھی رکھ دیا۔

''اوئے شیدے! یہ کیا... سوکھی چائے سے جگر جلائے گا ناشتے میں؟ کھانے کو کچھ نہیں؟''

''کیا کھاؤں یار! جا کے لاؤں تو وہی سوکھے پاپے۔ یا ڈبل روٹی بھی ملتی ہے کبھی نہیں۔ نہ انڈے نہ مکھن گھر میں۔''

غفور ہنسنے لگا۔ ''او یار شادی کر لے موجاں ای موجاں۔ قسم سے۔ صبح بھی گرما گرم خستہ پراٹھے اور انڈوں کا حلوہ بنایا تیری بھابی نے تو ابھی تک نشہ ہے۔''

''زمانہ بڑا بے مروت ہے غفورے۔ وہ چار دن کے لیے بھی اپنی بیوی کوئی نہیں دیتا کسی پردیسی مسافر کو۔''

''بکواس مت کر۔ تجھے زمین بیچنے کی جلدی تھی تو میں خود آ گیا۔ فائل دے مجھے۔''

''یار وہ اس بڈھے پیش امام کے پاس ہے۔ گھر میں نہیں ملی مجھے۔ ابھی جا کے بات کرتا ہوں دونوں کی۔ لڑکی بھی تو لینی ہے مجھے اس کی۔ تو فکر مت کر۔ شام تک میں پہنچا دوں گا۔''

غفور گیا تو شاہد نے امام چاچا کو جا گھیرا۔ وہ کچھ دیر بعد آخری شاگرد سے بھی فارغ ہو گئے تو انہوں نے کہا۔ ''تمہارے اس وقت آنے کی وجہ میں سمجھتا ہوں لیکن مجھے

افسوس ہے کلثوم، نہیں مانتی۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کے کسی قیمت پر لاہور جانے کے لیے تیار نہیں۔ اب اپنا فیصلہ تم بھی نہیں بدلو گے مجھے لگتا ہے۔ اگر اس کو قائل کر سکتے ہو تو خود بات کر کے دیکھ لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ رات کو کھانا ہمارے ساتھ کھا لو عشا کے بعد۔"

شاہد کو سخت صدمہ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا کہ مسترد ہونے کے بعد اب وہ اسی لڑکی کے سامنے رحم کی اپیل لے کر حاضر ہو اور امید رکھے کہ اس کے دلائل سے قائل ہو کے اپنا فیصلہ بدل دے گی۔ جس نے باپ کی نہیں مانی، وہ اس کی کیوں سنے گی۔ یہ کیسی دینی تربیت تھی کہ لڑکی اپنی شرائط منوانے پر اڑی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی کیسے گزرے گی۔

"نہیں چاچا! جب آپ نے بات کر لی تو میں اس سے کیا کہوں۔ اس کے پاس بھی یہاں سے نہ جانے کی ٹھوس وجہ ہے اور میرے لیے شادی ضرور اہم ہے لیکن اس پر میں اپنے مستقبل کی کامیابی اور خوشحالی کے سارے خوابوں کو قربان نہیں کر سکتا۔ باپ دادا کی طرح اس زمین سے جڑے رہنا میرے لیے ناممکن ہے۔"

"کیا ہیں تمہارے پلان؟" وہ شاہد کو دیکھتے رہے۔

"میں نے بتایا تھا کہ وہاں میرا انڈسٹری یونین کا چھوٹا کام ہے۔ اس میں انویسٹ کروں تو پانچ دس سال میں لاکھوں کما دوں لیکن میرے جیسے نوجوان اب اپنا مستقبل پاکستان میں نہیں دیکھتے۔ میں بھی امریکا جا سکتا ہوں۔ موقع کی سرزمین کہا جاتا ہے اسے۔ جو خالی ہاتھ گئے وہ بھی نہال ہو گئے۔ میرے پاس تو اپنی زمین سے ملنے والی رقم ہوگی۔ اس کی مارکیٹ ویلیو کا پتا ہے مجھے۔ اب میں ہی تو مالک ہوں سب کا۔"

امام چاچا نے نفی میں سر ہلایا۔ "رک جا پتر! میرا خیال تھا کہ تجھے پتا ہوگا۔ کس زمین کی بات کر رہا ہے تو؟"

"جو ابا کی تھی۔ مکان اور باڑے کی زمین۔"

"اس کا مالک اب تو نہیں شیدے۔ سراج دین نے وہ سب مسجد کے نام کر دی تھی۔"

شاہد کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کان کے پیچھے فائر کر دیا ہو۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"میرے ہوتے ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی باپ ایسا نہیں کر سکتا۔ میں ہوں اس کا وارث۔"

"اپنی زندگی میں ہر شخص اپنی دولت جائداد کا خود مالک ہوتا ہے۔ سارے فیصلے کر سکتا ہے۔"

تحمل

فرم کے مالک کے پاس ایک شخص نوکری کی غرض سے آیا۔ مالک نے اس سے کہا۔ "دیکھیے جناب! میرا خیال ہے آپ نے اسامی کے لیے جملہ شرائط غور سے ضرور پڑھی ہوں گی۔ ہمیں ایک ایسے رابطہ افسر کی ضرورت ہے جو بے حد تحمل مزاج اور انتہائی قوت برداشت کا مالک ہو۔"

امیدوار نے سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں جناب! جبھی تو میں حاضر ہوا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تحمل اور ضبط میں میرا ثانی شاید ہی کوئی ہو۔"

مالک نے اسے غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "اپنے تحمل، بردباری اور ضبط کے ضمن میں آپ کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟"

"بالکل....." امیدوار نے کہا۔ "اس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ میری دو بیویاں ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان دونوں کی مائیں میرے گھر پر ہفتے میں دو بار آتی ہیں۔ تیسرا یہ کہ میرے دس بچے ہیں۔ چوتھا یہ کہ میرا پڑوسی پچھلے پانچ سال سے ہارمونیم سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور پانچواں یہ کہ میں عرصہ سات سال سے ایک دیوانی مقدمہ لڑ رہا ہوں۔"

مرسلہ: سکندر خان، کوئٹہ

شاہد چلایا۔ "وہ ایسا ظلم نہیں کر سکتا۔"

"اس کے نزدیک یہ ظلم نہیں کارِ ثواب تھا۔ مغفرت کا راستہ۔"

"جھوٹ۔ بکواس ملا جی! یہ چکر تم نے چلایا۔ تم نے میرا حق غصب کیا۔ اس کی زمین ہتھیالی۔"

"زمین مسجد ٹرسٹ کی ہے۔"

"اور مسجد ٹرسٹ تمہارا۔ تمہارے بعد تمہاری بیٹی کا۔ تم نے اس کے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔" شاہد نے چیخ کر کہا۔

پیش امام کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "میں نے اسے سمجھایا تھا کہ کچھ بیٹے کا بھی خیال کرے۔ سب مسجد کو نہ دے لیکن اس نے کہا کہ مجھے اپنی عاقبت کی فکر ہے۔ میں اس کی فکر کیوں کروں جس کو میری کوئی فکر نہیں۔"

شاہد کھڑا ہو گیا۔ "دھوکے باز ملا۔ میں چھوڑوں گا

نہیں تجھے۔ کدھر ہے اس کی فائل۔ ابھی نکال نہیں تو میں تیری جان نکال دوں گا۔" اس نے پیش امام کا گلا دبوچ لیا۔

پیش امام نے گھٹنا اٹھا کے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں مارا۔ درد کی شدت سے شاہد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک دھکے سے وہ فرش پر دور جا گرا۔ اس نے موذن کو دوڑ کر آتا دیکھا۔ وہ گالیاں بکتا رہا۔ چار ہاتھوں نے اسے گلی میں پھینک دیا۔

☆☆☆

شام تک زخم خوردہ شاہد اپنے خیالوں کے عفریت سے لڑتا رہا جو اس کو اکساتے تھے کہ وہ پیش امام اور اس کی عیار بیٹی دونوں کو قتل کر دے لیکن اس سے زمین اسے واپس نہ ملتی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ مکر و فریب آزمائے۔ پیش امام کے پاؤں پکڑ لے کہ مجھے معاف کر دو۔ میں پاگل ہو گیا تھا لیکن یہ سب ناممکن ہو چکا تھا۔ دروازے کی کنڈی کھڑکی تو شاہد نے باہر جا کے دیکھا۔ دھند لکے میں جالو اسے چپ چاپ کھڑا نظر آیا۔ اس کی صورت پر برستی نحوست بتاتی تھی کہ اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے اور شاید وہ بھوکا بھی ہے۔ شاہد نے اسے اندر بلایا لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔

شاہد نے پانچ سو کا نوٹ نکال کے دکھایا تو وہ لپک کے آگے آیا۔ شاہد نے نوٹ پیچھے کر لیا۔ "ایسے نہیں جالو۔ پہلے بتا کیا ہے جو تو جانتا ہے۔ کہتا پھرتا ہے کہ کسی کو نہیں بتائے گا؟"

جالو کے قدم رک گئے۔ وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"وہ ..... تو نے قبر لی تھی ناں ابا کے لیے؟"

"بکواس نہیں۔ کیا دیکھا تھا تو نے کھڑکی میں سے؟ کب سے کھڑا تھا تو وہاں؟" شاہد نے سختی سے کہا۔

اس وقت شاہد نے دیکھا کہ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "نہیں ..... نہیں ..... کچھ نہیں دیکھا تھا میں نے۔" ■ خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹا اور پھر ایک دم پلٹ کے متعکہ خیز طریقے سے بھاگتا ہوا غائب ہو گیا۔ دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سچ پوچھنے والا خطرناک عزائم رکھتا ہے اور سچ بولنے سے اس کی جان جا سکتی ہے۔ شاہد کے لیے اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ یہ چرسی دیوانہ نہ جانے کس کس کو سچ بتا کے پیسا لے چکا تھا۔ یہ بہت خطرناک بات تھی۔ لوگ کب تک یقین نہیں کریں گے۔ زبان خلق بولے تو جھوٹ بھی سچ ہو جاتا ہے۔ چل بیٹا!! اپنی قبر تو نے خود کھود لی ہے۔ شاہد نے دل میں کہا۔ اس پر اب دیوانگی سوار تھی۔ اس گھر میں وہ کسی بد روح کی طرح ہو گیا تھا۔ خالی سنسان گھر میں صرف سناٹے کی آواز تھی۔ وہ بے مقصد اندر باہر سرگرداں رہتا تھا۔ دو تین بار وہ چائے پینے نکل جاتا تھا۔ کھانے کے لیے جاتا تھا تو اس کی کوئی سمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ رکشا میں سڑک پار چلا جاتا تھا جہاں بڑی اچھی آبادی تھی اور ہر قسم کے ریسٹورنٹ۔ اسے لگتا تھا کہ پرانے لوگ اسے مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں۔ ضرور پیش امام نے اس کے خلاف زہر اگلا ہوگا۔ غفور نے اسے بڑی مایوس کن خبر سنائی تھی کہ پیش امام نے اس سے بھی فائل کے موضوع پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

گزشتہ روز غفور نے کہا تھا۔ "دیکھ شیدے پتر! اس فائل کے معاملے سے تو میں نمٹ لوں گا۔ ڈپلیکیٹ نکلوا لوں گا۔ اب پاور آف اٹارنی تو ہو گئی بے کار۔ تو ہی مالک ہوگا۔ بس ٹائم زیادہ لگے گا اور خرچہ تھوڑا سا بڑھ جائے گا۔ کچہری میں تو منشی بھی سلام کا جواب پیسا لیے بغیر نہیں دیتا۔ تو بتا وہ پاگل چرسی جالو کہاں ہے؟"

"وہ مجھے بھی نہیں نظر آیا۔ دو بار قبرستان گیا۔ باہر آتے جاتے دیکھتا رہتا ہوں۔"

"اس کا ملنا ضروری ہے شیدے۔ میں نے بندہ بھیجا تھا اس کو بلانے کے لیے مگر وہ غائب ہے۔"

"کیا وہ بکواس کرتا پھر رہا ہے؟"

"بکواس وہ کر چکا۔ مجھے ڈر ہے اب تیرے دشمن اس کو تیرے خلاف استعمال کریں گے۔" اس نے تشویش سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ ایسا ہے کہ بیٹا اگر باپ کا قاتل ہو تو وہ اس کا وارث نہیں رہتا۔ اس کو باپ کی دولت جائداد میں سے کچھ نہیں ملتا۔"

شاہد کا دل ڈوبنے لگا۔ "یعنی اس کی گواہی سے مجھ پر کیس بن سکتا ہے ..... کسی ثبوت کے بغیر؟"

"ایک چشم دید گواہ سے بڑا ثبوت کیا ہوگا۔ تو پکڑا گیا تو ضمانت کے بعد بھی تھانے کی حدود سے باہر نہیں جا سکے گا ورنہ اشتہاری۔"

"اچھا میں کچھ پکا بندوبست کرتا ہوں اس کمینے کا۔"

غفور نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے ڈر ہے کہ وہ اب تیرے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس کو تیرے دشمنوں نے اپنا ہتھیار بنا لیا ہے۔"

شاہد کے دماغ میں بجلی سی کوندی۔ "یعنی، امام چاچا کی تحویل میں ہے وہ؟"

"ہاں۔ وہ وہیں ہوگا۔ اس کو کھانا اور سو روپے نشے کے لیے مل جاتے ہوں گے۔ کچھ پتا نہیں تیرے خلاف بیان بھی تیار ہو۔" غفور نے جاتے جاتے کہا۔

شیدے کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ وہ بہت دیر سوچتا رہا۔ یہ قسمت کیا کھیل کھیل رہی تھی اس کے ساتھ۔ وہ دو کروڑ کی امید چھوڑ بیٹھا تھا کہ سب اسے واپس مل گیا اور اب وہ پر امید تھا تو جس خطرے کو اس نے زیادہ اہم نہیں سمجھا تھا، وہی اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن رہا تھا۔ اس کھیل کا انجام کیا ہے۔ دولت مندی یا کم سے کم عمر قید۔

"قاتل اپنے باپ کا وارث نہیں ہو سکتا۔" رات اس کے گھر کی دیواریں بھی ہوا کے ساتھ سرگوشی کرتی رہیں۔ اس نے ہر لائٹ جلا دی تھی لیکن بار بار اسے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی جب کہ اس کے سوا وہاں کون ہو سکتا تھا۔ خوف کا نادیدہ عفریت اس کے تعاقب میں تھا۔ ایک بار اس کے کانوں میں جانو کی آواز آئی "شیدے میں نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا۔" احساس جرم اب ہر نئے روپ میں اس کے اعصاب کو شکست دینا چاہتا تھا۔

وہ کھانا کھانے گیا تو واپسی پر اچانک اس کو جانو نظر آ گیا۔ اس نے چلا کے اسے پکارا۔ "اوے جانو۔"

جانو نے ایک دم پلٹ کے اسے دیکھا اور بھاگا۔ شاہد کے موٹر سائیکل موڑ کر پیچھے دوڑنے تک وہ پیچ دار راستوں پر مکانوں اور گلیوں کے موڑ کاٹ کر غائب ہو گیا تھا۔ اس کی ڈائریکشن بتاتی تھی کہ امام چاچا کے گھر یا مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ مسجد نماز ظہر کے لیے کھلی تھی لیکن شاہد دور سے ہی واپس ہو گیا۔ اپنی موٹر سائیکل تک وہ ان اجنبی راستوں پر گھومتا پھرتا پہنچا۔ واپس گھر کی طرف جاتے ہوئے آدھے راستے میں پٹرول ختم ہونے سے موٹر سائیکل رک گئی۔ اس نے باقی راستہ اسے ساتھ گھسیٹا اور سوچتا رہا کہ اس وقت وہ مخالف سمت میں غفور کی طرف جاتا تو بازار کے قریب ہوتا۔ اتنا کھینچ کر وہ پٹرول پمپ تک جا سکتا تھا۔

ایک موڑ سے جب اس نے گھر کو دیکھا تو شاہد کے دماغ کو شاک لگا۔ بے اختیار وہ ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کے گھر کے سامنے ایک شاندار سیاہ پراڈو کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک جیپ تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اس نے امام چاچا کو دیکھا اور سب اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ ادھر سے برآمد ہوئے اور پراڈو میں آگے بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے ایک سب انسپکٹر نکلا جو شاید مقامی تھانیدار تھا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے وقفے سے کندھے پر بندوق لٹکائے دو ڈھیلے ڈھالے تھکے ہارے کانسٹیبل توند ہلاتے نکلے۔

شاہد کی نظر میں ایک چکا چوند ہوئی اور اس کے دماغ میں ہیروشیما جیسا ایٹمی دھماکا ہوا جس نے اس کو ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کر دیا۔ اس نے جمی کو باہر آ کے پراڈو میں ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوتے دیکھا۔ آخر میں باہر آنے والے پولیس مین نے اس کو مقفل کر دیا۔ اس میں حسن نظر کے دھوکے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ پراڈو اسی کی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت اور پر اعتماد ہو گئی تھی۔ وہ پراڈو کے پیچھے پولیس کی جیپ کو جاتا دیکھتا رہا۔ یہ منظر اب اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ جمی کسی طرح اس کا پیچھا کرتی آئی اور شاہد کا پتا ٹھکانا پوچھا۔ وہ نہیں ملا تو لوگوں نے اسے امام چاچا کی طرف بھیج دیا۔ امام چاچا نے کہا کہ میں تمہیں شاہد کے گھر کی طرف لے جاتا ہوں۔ ویسے تو اب وہ میرا ہی ہے۔ شاہد کے دشمنوں کا اتحاد ثلاثہ بن گیا تھا۔ جمی، امام چاچا اور جانو۔

دن کا اجالا شاہد کے لیے مایوسی اور ناکامی کی تاریکی میں ڈھلنے لگا تھا۔ دولت مندی کے جگمگاتے ایوانوں کے سارے چراغ گل ہو گئے تھے اور اس پر کال کوٹھری کی آخری رات محیط ہو گئی جس کا اختتام پھانسی گھاٹ پر ہوتا تھا۔

وہ موٹر سائیکل وہیں چھوڑ کے دیوانہ وار غفور کی طرف بھاگا۔ دغاباز اور سازشی سپہ سالار کی طرح جو شکست ناگزیر دیکھتا ہے تو دشمن سے مل جاتا ہے۔ اس کی موٹر سائیکل بھی ایسے وقت میں ساتھ چھوڑ گئی جب وہ سب سے زیادہ مدد کر سکتی تھی۔ وہ اسی کی مدد سے فرار ہو کے سیدھا لاہور جا سکتا تھا۔

غفور اس کو دیکھ کے حیران ہوا۔ "کیا ہوا شیدے پتر! کیا کوئی بھوت دیکھ لیا ہے؟"

"اس سے بھی بدتر غفور...... وہ سب ایک ہو گئے ہیں۔ میرے سب دشمن۔ میں یہاں رکا تو وہ مجھے پکڑ کے جیل میں ڈال دیں گے۔ میں لاہور پہنچ جاؤں پھر میں روپوش ہو جاؤں گا۔ جب تک ضمانت قبل از گرفتاری نہیں ہو جاتی۔"

"مگر اس کے لیے تجھے یہاں عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔"

"وہ بھی ہو جاؤں گا یار جب تاریخ پڑے گی۔ بس میں آج کی رات یہاں کی حوالات میں جوتے کھاتے نہیں گزار سکتا۔ میں جانتا ہوں وہ کسی سے بھی اعتراف جرم کیسے لیتے ہیں۔ گھر کو پولیس نے لاک کر دیا ہے، اب میں وہاں نہیں جا سکتا اور یہاں روپوش۔"

غفور نے اسے پریشانی سے دیکھا۔ "شیدے! تو روپوش نہیں رہ سکتا۔ جائداد واپس لینے کے لیے تیرا یہاں ہونا ضروری ہے۔"

"میں لاہور پہنچ کے تجھ سے بات کروں گا، ٹھیک ہے۔ میں کسی دن آجاؤں گا خاموشی سے تیرے پاس تو ملتے کرلیں گے۔ خدا کا شکر ہے فون میرے پاس تھا اور بینک کے کارڈ میرے پاس تھے۔ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں، کسی بس سے نکلتا ہوں۔ تو مجھے یہاں سے نکال دے تو تیری مہربانی۔"

غفور نے سر ہلایا۔ "چل لیکن شیدے! تو بہت غلط کر رہا ہے۔ کوئی بھی ساری عمر نہیں بھاگ سکتا۔"

"جب زندگی ہی داؤ پر لگی ہو تو آدمی کیا نہیں کرسکتا۔ میں اس ملک سے بھی نکل جاؤں گا۔ مجھے کچھ لوگوں کا پتا ہے جو ترکی یونان کے راستے یورپ پہنچاتے ہیں۔"

"یہ وجہ ہی کی تو نے یہ ساری جدوجہد۔" غفور نے افسوس سے سر ہلایا۔

"دو کروڑ کی پراپرٹی پر بس میری قبر بنے۔ دو کنال میں سے دو گز زمین ملے مجھے۔ نہیں غفورے! یہ جائداد میرے نصیب میں نہیں تھی ورنہ کیا کوئی باپ یہ کرسکتا ہے اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ؟"

غفور کہتے کہتے رک گیا کہ جو تو نے اپنے باپ کے ساتھ کیا کون بیٹا کرسکتا ہے۔ رستے پر شاہد نے جہلم کے اے ٹی ایم سے اپنی کچھ رقم نکلوائی اور اس سے گلے ملا۔ "میں تجھے یاد رکھوں گا غفورے۔ اس دنیا میں تو میرا ایک ہی دوست تھا۔"

لاہور جانے والی عوامی بس میں وہ پیچھے والی سیٹ پر خود کو چادر میں لپیٹے بیٹھا رہا۔ آس پاس بیٹھے لوگ اس سے لاتعلق تھے۔ شاہد کے لیے صرف دس دن میں دنیا بدل گئی تھی۔ ثمی کے ساتھ یہاں آتے وقت وہ مفرور مجرم نہیں تھا۔ فاتح اعظم تھا۔ ثمی جسے وہ بے آسرا اور لاوارث چھوڑ آیا تھا، اتنی قوت اور شان کے ساتھ اس تک کیسے پہنچ گئی تھی۔ ضرور اس نے کسی کو پھانس لیا تھا جس نے اس کی مدد کی۔ وہ جگہ ایسی ہی تھی کہ ثمی نے سودا کرلیا۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ اس عورت کی قوت تسخیر ابھی تک بے مثال تھی۔ اس کو بڑی آسانی سے کوئی بڑا گاہک مل گیا۔ شاہد کو اب اپنی ہر چالاکی ایک بے وقوفی لگ رہی تھی۔ وہ اس فائیو اسٹار ہوٹل کے بجائے کسی عام ہوٹل میں ہوتی تو تھانے والے اس کا نام مسافر خانوں میں پیشہ کرنے والی عورتوں کی فہرست میں لکھ چکے ہوتے۔

جہلم کا دریا پار کرتے ہی سرائے عالمگیر پر بس رک گئی۔ دو پولیس والے اندر آگئے۔ ان کو کسی اشتہاری کی تلاش تھی۔ سب کے چہرے دیکھتے ہوئے وہ شاہد کے پاس آکے رک گئے۔ ایک پولیس مین عیاری سے مسکرایا اور بندوق اس کی طرف کرلی۔ "شاباش ہے تجھے۔ منہ سر لپیٹ کے نکلا ہے۔"

دوسرے نے اسے بے رحمی سے کھینچ کے دبوچ لیا اور ایک گالی دی۔ "ہمارے مخبر نے کہا تھا کہ کانا ہاتھ آئے تو اپنی...... سو تمہیں موڑ دینا۔" اس نے شاہد کو دروازے کی طرف دھکا دیا۔

شاہد چلایا۔ "میں کانا نہیں ہوں۔ غلطی کر رہے ہو تم۔"

دوسرے پولیس مین نے اس کے کندھے پر بندوق کا بٹ مارا۔ وہ باہر جا گرا۔ "قسم خدا کی میں کانا نہیں، شیدا ہوں۔"

انہوں نے اس کو مار مار کے ایک جیپ میں ٹھونس دیا۔

"راجا صاحب کہہ رہے تھے کہ اس بار ہاتھ لگے تو قصہ مکاؤ۔" جیپ کے چلتے ہی ایک نے کہا۔

شاہد چلانے لگا۔ "کانا نہیں ہوں میں۔ میری بات سنو بس۔ بہت فائدہ ہوگا تمہارا۔ غلط بندے کو پکڑ لیا ہے تم نے۔"

"سب لگ پتا جائے گا صبح تک۔" شاہد کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑ گئی۔

"سودا کرلو مجھ سے۔ ورنہ تمہارا ابھی بہت نقصان ہو جائے گا۔"

خوف زدہ اور حیران مسافروں سے بھری بس روانہ ہوگئی تو ایک کانسٹیبل نے کہا۔ "کیسا سودا؟" اور دوسرے کو آنکھ ماری۔

جیپ کچھ دیر چلی اور پھر سڑک کے ایک کنارے پر رک گئی۔

"میں...... میں تمہیں ایک لاکھ دے سکتا ہوں۔ ابھی مگر پہلے میری ہتھکڑی کھولو۔" شاہد نے لہجہ دوستانہ کیا۔

دوسرے کانسٹیبل نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ نیچے اتر کے اس نے کہا۔ "ایک لاکھ تو ہم ایسے بھی لے سکتے ہیں۔"

"اور اس کا کیا کریں گے؟"

"آگے دیکھتے ہیں۔ کوئی سنسان سڑک ہو تو...... خلاص۔"

دوسرے نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب وہ خود دے رہا ہے تو قتل ضرور کرنا ہے؟ ہتھکڑی کھول کے دیکھتے ہیں۔ بھاگ تو سکتا نہیں۔"

☆☆☆

ثمی ہوٹل میں سوئمنگ پول کی طرف کھلی ایک میز پر تنہا

ثمینی کافی کی تلخی سے جسمانی تکان کا علاج کر رہی تھی جو ذہنی بیزاری کی کیفیت کا نتیجہ تھی۔ زندگی کے صد درجہ یکسانیت والے معمول میں کسی خواہش یا جدوجہد کا کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ جو وہ چاہتی تھی ہو جاتا تھا۔ جو خواہش کرتی تھی پوری ہو جاتی تھی لیکن یہ سب ایک سنہرے نظر نہ آنے والے جال کے اندر ہی ممکن تھا۔ اسلام آباد کے ایک پارک میں ثمی نے ''برڈ سینکچوری'' دیکھی تھی۔ یہ درختوں سے بھی اونچا زمین سے دو سو فٹ کی بلندی پر ایک مضبوط جال تھا۔ رنگ رنگ کے خوشنما پرندے اس کے اندر پرواز کرتے پھرتے تھے۔ درختوں پر کہیں بھی آشیانہ بنا سکتے تھے لیکن ان کو اندازہ نہ تھا کہ یہ آزادی کتنی محدود ہے۔

ثمی کی حد بھی طے تھی۔ یوسف بیگ کے ساتھ وہ دو بار دبئی جا چکی تھی اور ایک بار لندن بھی رہ کے آئی تھی۔ وہ شوفر کے ساتھ پنڈی اسلام آباد کی ہائی سوسائٹی کے ہر فنکشن میں اور مری بھوربن کے پی سی جا سکتی تھی لیکن کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ گاڑی خود چلا کے لاہور یا کراچی جانے کے لیے آزاد نہیں تھی۔ اس کو اپنی آزادی اور خواہشات کی حدود کا علم تھا۔ اب اس کے اندر اپنی نظر نہ آنے والی آزادی کی سرحدوں سے آگے جانے کی سرکش خواہش مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ سونے کے پنجرے میں قید طائر کے پر اسے اجنبی ہو جانے والے آسمانوں کی طرف اڑنے پر اکسا رہے تھے۔

''ہیلو۔'' اس نے چٹکی بجا کے ایک ویٹر کو متوجہ کیا۔ ''عاصم صاحب کو بولو میں آئی ہوں۔''

ویٹر کے کچھ کہنے سے پہلے عاصم نمودار ہوا۔ ''سوری یار! یہ نوکری اور غلامی ایسی ہی چیز ہے۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ہر وقت ایک مسکراتا چہرہ اور شائستہ لہجہ رکھتا۔ سب کسی کو بھی اجنبی نہیں لگتا تھا۔ شاید باہر بھی وہ ہر جگہ ہر وقت ایسا ہی تھا۔ اصل عاصم کو وہ خود بھی بھول چکا تھا۔

''بھوک سے برا حال ہے میرا۔'' وہ خفگی سے بولی۔ ''اب چلیں؟''

''چلو بابا! کسی اپنے غصے کو ہوٹل میں پھینک جاؤ۔''

''تمہاری مینڈکی میں جائیں گے۔ رائٹ؟ نکلو یہاں سے پھر بتاؤں گی کہاں جانا ہے۔ اپنا فون چھوڑ جانا یہاں۔''

وہ ہنسا۔ ''ہاں ہاں۔ وہ میں بھول کر جا رہا ہوں۔''

جب اس کی مہران ہوٹل سے نکل آئی تو ثمی نے کہا۔ ''اب فیصل مسجد چلو آرام آرام سے۔ جیسے ہوا چل رہی ہے۔ بادل دیکھے تم نے، کیسے بھٹک رہے ہیں۔''

''دیکھے۔ اس وقت کون سی نماز ہوگی؟ عصر میں دیر ہے۔''

وہ خوشدلی سے ہنسی۔ ''میں کالج سے بھاگنے والی لڑکی ہوں۔ چلو سید پور۔ وہاں پہاڑوں کے دامن میں ریسٹورنٹ ہیں۔ دیس پردیس کو چھوڑ دو۔ پیچھے کچھ پشاوری ہوٹل ہیں۔ ان کے پاس ہر کیبن میں فرشی نشست ہے۔ قالین اور گاؤ تکیے ہیں۔ دنبہ کڑھائی کھاؤں گی میں، مگر برقع کہاں ہے میرا۔'' وہ پھر ہنسی۔

گاڑی اسلام آباد ہائی وے پر پھسلتی گئی۔ اچانک ثمی نے کہا۔ ''شاہد کی کوئی خبر ہے؟''

''کوئی نہیں۔ اس کی موٹر سائیکل پولیس نے تحویل میں لے لی تھی۔ سنا ہے وہ لاہور فرار ہو گیا تھا مگر لاہور نہیں پہنچا۔ اس بات کو بھی کتنے مہینے ہو گئے۔ آج اس کی یاد کیسے آ گئی؟''

ثمی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان ننھے منے بکری کے بچوں کو دیکھتی رہی جو ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بچی اور خواتین ان کو پالنے کے لیے بڑے شوق سے لے جاتی تھیں۔ سال بھر میں جب عید آ جاتی تھی تو ان کو ذبح کر کے کھا لیا جاتا تھا۔

سرسبز و سربلند پہاڑوں کے دامن میں یہ قدیم آبادی اب ماڈل ویلج بن گئی تھی۔ مندر اب ایک کونے میں سمٹ گیا تھا اس کے سامنے درجنوں گاڑیاں تھیں اور ہر قسم کے ہوٹل تھے۔ سڑک کے کنارے پکی قطار میں بڑے نام والیوں کا قبضہ تھا جہاں اسلام آباد کی مینڈری اور فورسٹ ہر طرح کے شوخ اور نظر نواز ملبوسات پہنے تصویریں اتارتے پھر رہے تھے۔ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ ثمی نے برقع اوڑھا اور وہ بھاگتے ہوئے پیچھے کی طرف کے ایک ہوٹل میں گھس گئے۔ ہال میں میز کرسیاں تھیں، سائڈ میں دس بائی دس کے کمروں میں ایک تخت تھا۔ سامنے صوفہ اور درمیان میں سرخ قالین جس کے پیچھے کھلی کھڑکی سے پہاڑ اتنے قریب تھے کہ درخت اندر جھانکتے تھے۔

''یہ بالکل ایک خواب کا منظر ہے نا؟'' کھانے کے بعد گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ثمی نے کہا۔

''تم واقعی ایک اسکول گرل والی باتیں کر رہی ہو۔'' عاصم نے ہوا کا خوشبودار سگار جلایا جو کوئی مسافر جاتے وقت کمرے میں بھول گیا تھا۔

''کیسی پرکشش مہک ہے۔'' ثمی نے ایک گہری سانس لی۔ ''عاصم! مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا۔''

وہ قالین پر لیٹ کے لکڑی کی چھت کو دیکھتا رہا۔ ''ہاں پوچھو۔''

"تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

ایک بیرا پردہ ہٹا کے اندر آیا اور پشاوری قہوے کی چینک اور دو پیالیاں ان کے درمیان تخت پر رکھ گیا۔

"شادی تو میں بہت پہلے کر چکا ہوں بی بی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یہاں تمہارے پاس اوپن چوائس تھا۔" ثمی نے ایک پیالی اسے تھمائی۔ "لیکن میں تین مہینے سے دیکھ رہی ہوں، وہ سب کچھ جو تم نے میرے لیے کیا۔ یہ ہمدردی یہ لگن، یہ توجہ ہر وقت کی خبر گیری...... میری ہر پریشانی پر تمہاری پریشانی۔ یہاں تو ایک سو ایک آتی ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کے، خوبصورت، کامیاب، دولت مند، بارسوخ...... اور میں دیکھتی ہوں تمہارے لیے ان کا التفات بھی۔ تم نے کسی کو لفٹ نہیں کرائی۔ سوائے میرے۔ ہر شخص دیکھتا ہے سمجھتا ہے تمہاری اس دلچسپی کو۔ شاید کسی نے بات بھی کی ہو۔"

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ خاموشی سے قہوہ پیتا رہا۔

"دل چاہتا ہے باقی قہوہ تمہارے سر پر انڈیل دوں۔ بولتے کیوں نہیں عاصم۔"

"کیا بولوں؟"

"کہو کہ میں اچھی لگتی ہوں تمہیں۔ تم محبت کرتے ہو مجھ سے۔" وہ چلائی۔

"یہ تو ہے۔" اس نے جیسے خود سے کہا۔

"پھر کہا مجھ سے کہ ثمی مجھے محبت ہے تم سے۔ تمہیں دیکھا ہے جب سے۔ مجھ سے شادی کرلو۔ میں بھی تمہیں دھوکا نہیں دوں گی۔"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے مجھے جب تم جانتی ہو۔ میں جانتا ہوں سب لوگ جانتے ہیں لیکن ثمی! میں شادی نہیں کرسکتا تم سے۔ آئی ایم سوری۔" وہ باہر دیکھنے لگا۔

ثمی اسے دیکھتی رہی۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ شادی میں کر چکا ہوں بہت پہلے۔"

"تم بے عزتی کر رہے ہو میری۔" وہ چلائی۔ "یہ مذاق نہیں کر رہی تھی میں تم سے۔"

"ثمی یہ سچ ہے مذاق نہیں۔ شادی میں نے چھ سال پہلے کرلی تھی۔ بہت سے لوگ جانتے ہیں یہ مگر وہ بات نہیں کرتے۔"

خاموشی! کے ایک لمحے میں وہ عاصم کو دیکھتی رہی جو کھڑکی سے باہر بارش کو دیکھ رہا تھا۔ "کون ہے وہ تمہاری بیوی؟" ثمی کا لہجہ بے جان ہو گیا۔

"شائلہ؟ اسے بھی میں ثمی ہی کہتا ہوں۔ وہ بہت خوبصورت ہے اور... ایک ڈاکٹر ہے۔"

"تمہارے ساتھ بھی نظر نہیں آئی وہ۔ تم بھی اپنے ساتھ ہوٹل بھی نہیں لائے اسے؟"

"اس سے ملو گی تم؟ چلو میں ملواتا ہوں آج۔ تمہیں اپنے سارے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

بے یقینی میں مبتلا ثمی برقع اوڑھے عاصم کے ساتھ گاڑی میں چپ بیٹھی ونڈ اسکرین کے وائپرز کی حرکت کے درمیان بارش سے دھلی سیاہ چمکیلی سڑک کو دیکھتی رہی۔ کہیں سے اذانِ عصر کی صدا آئی۔ گاڑی نے ایک مضافاتی کالونی کا موڑ کاٹا جہاں سب دس مرلے اور ایک کنال کے نئے گھر تھے۔ صاف ستھری گلیوں میں درخت تھے اور پھول جو لوگوں نے لگائے تھے اور خاموشی تھی۔

مہران ایک چھوٹے گھر کے گیٹ میں داخل ہو کے ٹھہر گئی۔ ایک ملازمہ قسم کی عورت نے انہیں دیکھا اور دروازے کی طرف منہ کر کے بولی۔ "بیگم جی صاحب آگئے ہیں، مہمان بھی ہیں ان کے ساتھ۔"

ثمی کو ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا تھا۔ اس کے ایک سوال کا جواب یہ احساس تھا کہ کچھ نیا ہونے جا رہا تھا۔ عاصم اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں بیڈ پر پیچھے ٹیک لگائے ایک عورت لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہی تھی۔ اس کے سامنے کی دیوار پر ٹی وی چل رہا تھا۔

عاصم نے مسکرا کے کہا۔ "دیکھو ثمی! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔ ثمی! یہ میری بیوی ہے ڈاکٹر شائلہ۔ اور یہ بھی ثمی ہے جاناں جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔" ثمی اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے مسکرا کے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور ٹی وی بھی آف کر دیا۔

"مجھے عاصم نے کبھی آپ کے بارے میں نہیں بتایا۔ کب ہوا تھا یہ حادثہ۔"

"بہت پرانی بات ہے۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ دو ہفتے گلیات میں ہنی مون منایا۔ مری نتھیا گلی، بھوربن، کاغان واپس آ رہے تھے تو بارش ہو گئی۔ اس میں گاڑی لینڈ سلائیڈ کی زد میں آ گئی اور نیچے کھائی کی طرف الٹ گئی۔"

"اوہ مجھے بہت افسوس ہوا۔"

"تب سے عاصم ہی میری خدمت کر رہا ہے۔ یہ خادمہ بہت اچھی ہے۔ پورا گھر اسی کے سپرد ہے لیکن مجھے عاصم خود سنبھالتا ہے۔ میں جانتی ہوں اس کا کام بہت سخت ہے اور کام کا وقت بھی کوئی نہیں مگر یہ سب کرتا ہے۔ اب

میں کیا بتاؤں کیا کیا کرتا ہے۔''

''آپ ڈاکٹر تھیں؟''

''میں اب بھی ڈاکٹر ہوں۔ پہلے کلینک کرتی تھی اب گھر میں ہی کرتی ہوں۔ شام کو میرے پاس مریض آنے لگتے ہیں بہت دور دور سے۔ کچھ گڈ ول بن گئی ہے کہ میرے ہاتھ میں شفا ہے۔ فیس بھی میں آدھی لیتی ہوں۔ کیا کرنا ہے زیادہ کا ہم نے۔ دو جان ہیں۔ اللہ بہت دے رہا ہے لیکن عاصم کو دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ زندگی ایسے نہیں گزر سکتی۔''

''جی۔''

''یہ کہتا ہے جس دن تم جیسی دوسری ملی میں کر لوں گا۔ اس کو ڈر یہ ہے کہ وہ مجھے تم سے چھین لے گی۔ خود تو کچھ کرے گی نہیں۔ مجھے بھی نہیں کرنے دے گی۔ کہتا ہے تم گارنٹی دو کسی کی تو میں کر لیتا ہوں۔ میں کیا بتاؤں۔''

''اگر میں کہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا ..... پھر؟'' ثمی کو کہنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ بیٹھی ہے۔ اب وہ بیک وقت عاصم اور اس کی مفلوج بیوی کی نظر کا ہدف بن گئی تھی۔

''کیا مطلب؟ کوئی ایسی عورت ہے تمہاری نظر میں جس کے بارے میں تم اتنے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتی ہو؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''وہ ..... دراصل ..... میرا مطلب ہے ناممکن تو کچھ نہیں ہوتا۔ ایسی عورت ہو سکتی ہے۔ آپ ان ٹی وی ڈراموں کو جانے دیں۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔'' ثمی نے بہتر سمجھا کہ اس موضوع سے ہی ہٹ جائے۔

شائلہ نے اس کو بتایا کہ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی تھی۔ اس کے انگلینڈ میں تعلیم مکمل کرنے تک وہ منتظر رہے کہ بیٹی کسی کے ساتھ سیٹل ہو جائے اور پھر پاکستان آ گئے۔ یہاں اس کی عاصم سے شادی ہو گئی۔ وہ کسی اسپتال میں جاب کر لیتی لیکن اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ماں باپ واپس چلے گئے۔ وہاں ان کا گھر بھی تھا اور چھوٹا سا بزنس بھی۔ ثمی نے اس کی مسلسل بے تکان گفتگو سے اندازہ کیا کہ وہ کس درجہ تنہائی کا شکار ہے۔ اسے احساس ہے کہ وہ غیر اہم ہو چکی ہے۔ وہ صرف اپنے بارے میں بات کرتی رہی۔ ثمی کے بارے میں اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ درمیان میں ٹرالی لانے والی خادمہ کے آنے سے ماحول بہتر ہوا۔ اب شام پر رات کا اندھیرا غالب آ چکا تھا۔

''مجھے اب جانا چاہیے۔ دوپہر سے رات ہونے تک کچھ فرصت کا وقفہ ملتا ہے۔ اس کے بعد نصف شب کے بعد تک بھاگ دوڑ۔ فون ہوتا تو اب تک گھنٹی بجتی ہی رہتی۔'' وہ ہنسا۔ ''اچھا کیا کہ بھول آیا۔ تم یہاں رکنا چاہو تو گاڑی چھوڑ جاتا ہوں۔ ایک موٹر سائیکل بھی کھڑی ہے پورچ میں۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں آ جاؤں گی بعد میں۔'' ثمی نے کہا۔ چند منٹ کے بعد اس نے موٹر سائیکل کی آواز سنی۔ یہ کوئی ہیوی اسپورٹ بائیک تھی۔ شاہد کے پاس بھی ایسی ہی تھی۔

''اب تم اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ۔'' ڈاکٹر شفقت سے ہنسی۔ ''میں ہی بولے جا رہی ہوں۔''

☆☆☆

شاہد کی تصویر اس نے ایک پرانے اخبار میں دیکھی جس میں تازہ سرخ گلابوں کا ہار لایا گیا تھا۔ اس کے نیچے کی خبر میں لکھا تھا کہ ایک نامعلوم شخص کی لاش سرائے عالمگیر سے آگے ایک ذیلی سڑک کے کنارے ملی تھی۔ پولیس یا کسی رفاہی ادارے نے وارثوں کی تلاش کے لیے ایک مقامی روزنامے میں تصویر شائع کرا دی تھی۔ اس بھیگے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے سے تاریخ کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن شاہد کی صورت کے نقوش بہت واضح تھے۔

عاصم نے اندر جھانکا اور شوخی سے بولا۔ ''دلہن تیار ہے۔''

''آؤ آؤ دولہا میاں۔ دیکھو یہ تصویر۔ تم نہیں پہچانتے اسے۔ یہ شاہد ہے۔''

''او مائی گاڈ۔'' عاصم نے گیلے کاغذ کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور میز پر رکھ دیا۔ ''زندگی کا سفر کہاں سے شروع ہو کے کہاں ختم ہوگا، کوئی نہیں جان سکتا۔ تمہیں افسوس ہوا؟''

''ہاں۔ اس بات پر کہ میں خود اسے سزا نہ دے سکی۔ قدرت کے نظام انصاف نے یہ کام کیا۔''

''ایک بار پھر سوچ لو ثمی۔ مجھ سے محبت پھر تمہاری غلطی تو نہیں بن جائے گی؟'' وہ باہر جاتے جاتے رک کر بولا۔

ثمی نے محبت کے سب روپ دیکھ لیے تھے۔

محبت اس فریب کا نام بھی تھا جس کا شکار فردوس بیگم ہوئی۔ اس قوت خرید کا بھی نام تھا جو یوسف بیگ نے ثمی کی ملکیت کے غرور پر صرف کی۔ ثمی نے اس محبت میں سب جیت لیا تھا۔ بینک بیلنس، گاڑی، گھر۔

محبت وہ بھی تھی جو عاصم نے اپنی بیوی سے کی۔ یہ بھی محبت تھی کہ جب اس کی مفلوج بیوی نے ثمی سے کہا کہ عاصم کو اب تم سنبھال لو تو اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔

محبتوں کی ایک نئی کہانی کا آغاز ہو رہا تھا۔

اس نے ہار گلے میں ڈال کے اخبار کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

✖✖✖

شہ زور

عمار قادری

قسط: 11

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ نا ہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور قوانین عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہ رہا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرفِ غلط کی مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
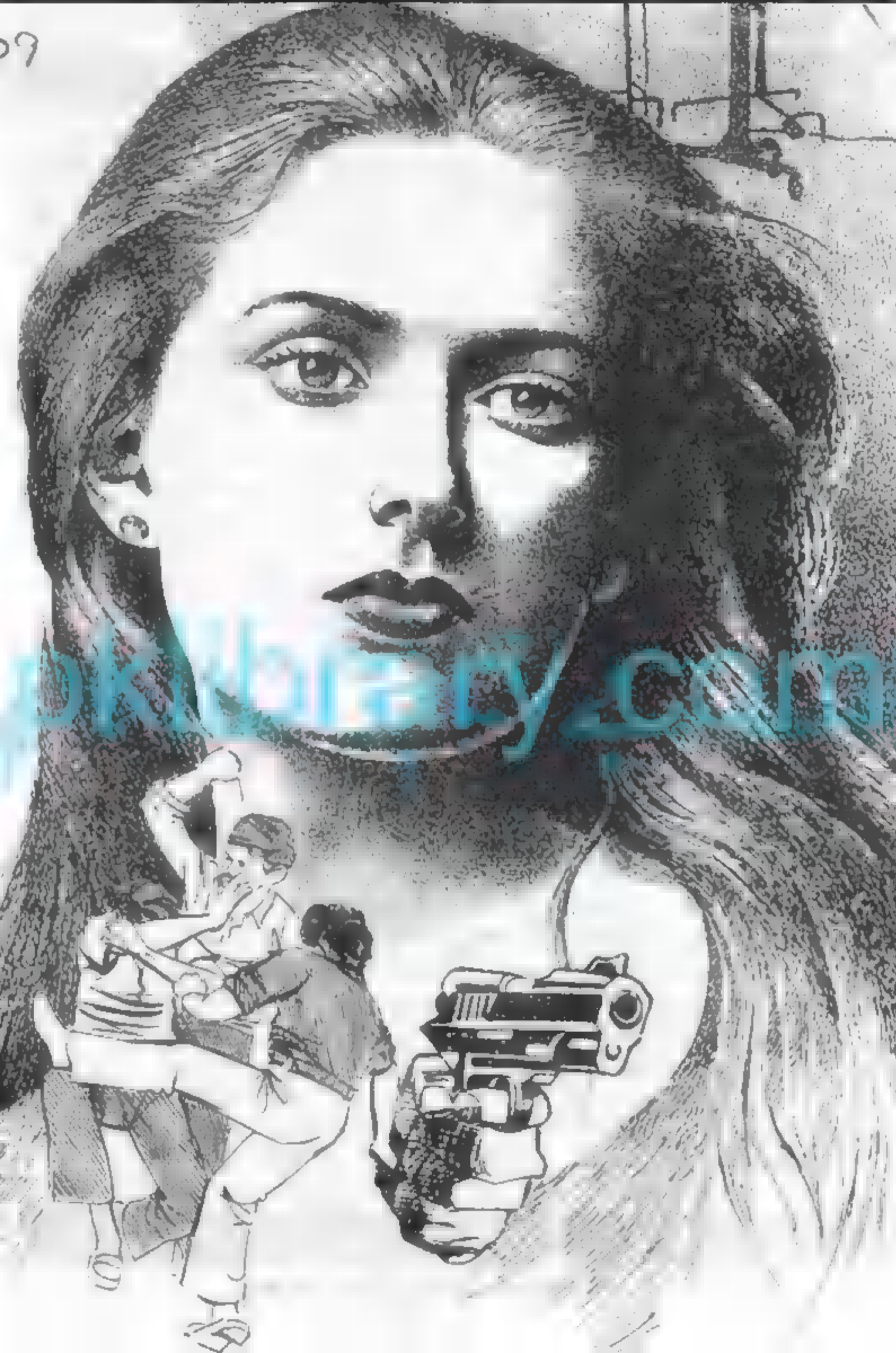
معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی تند فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دن اس جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جا سکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاص بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں بازل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر بازل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے بازل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں۔ نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہرحال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لطفو سے حاصل اُلو کے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ بشریٰ، کامران کو پھانسنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچے کو چھاپتا ہے اور اسے کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو سیٹ کرنے کے لیے غیر ملکی جاسوس کو فرار کرانے کا مشن دیا جاتا ہے۔ معاذ سوچتا ہے کہ کیا وہ وطن کے دشمن کو آزاد کرائے گا۔ اسی دوران وہ گن کا رخ جاسوس کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

گاڑی کے ہلتے ٹکڑے کی حدت کو محسوس کرتا ہوا
عالم شاہ دیکھ رہا تھا کہ جاچڑ کے ساتھی راہِ فرار اختیار کر رہے
ہیں۔ خود اس کے ساتھیوں نے بھی پسپائی اختیار کرنا شروع
کر دی تھی۔ ڈاکوؤں کی طرح وہ بھی پولیس کے ہاتھ لگنے کا
خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتا تھا
اس لیے خود کو سنبھالتے ہوئے حرکت میں آیا۔ بلٹ پروف
کے باوجود پیٹھ پر لگنے والی گولی نے اسے دھچکا لگایا تھا اور
کچھ لمحوں کے لیے اس کی قوتِ عمل کمزور پڑ گئی تھی۔ چند لمحوں
کے اس فرق نے اس کے فرار کی راہیں مسدود کر دیں اور
پولیس موبائل قریب آتی چلی گئی۔ اس مایوس کن صورت
حال میں یکدم ہی ایک کرشمہ سا ہوا اور اس نے اپنے بالکل
قریب گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ اس آواز پر وہ پلٹا ہی تھا
کہ سرمد کی تیز آواز سنائی دی۔

"جلدی سے گاڑی میں آجائیں سائیں!" اس کا
جملہ مکمل ہونے سے قبل وہ گاڑی کے کھلے دروازے سے
اندر چھلانگ لگا چکا تھا۔ سرمد نے ایک تیز چرچراہٹ کے
ساتھ گاڑی کو آگے بڑھایا لیکن یہ دیکھ کر اس کے ہونٹ بھنچ
گئے کہ پولیس موبائل ان کے تعاقب میں لگ چکی ہے۔
دانت پر دانت جمائے اس نے گاڑی کی رفتار کو خطرناک حد
تک بڑھا دیا۔ گاڑی بہت شاندار تھی، اس کے طاقتور انجن
نے سرمد کی کوشش کا بھرپور ساتھ دیا اور لمحہ بہ لمحہ ان کے اور
پولیس موبائل کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ دھیرے
دھیرے موبائل نظروں سے اوجھل ہوئی تو ان دونوں ہی
نے سکھ کا سانس لیا اور گاڑی کی رفتار قدرے کم کر دی لیکن
جلد ہی ان کا یہ سکون غارت ہو گیا۔ وہ جس سڑک پر سے
گزر رہے تھے اس پر آگے ناکا لگا ہوا تھا۔ ان کے پاس غیر
قانونی اسلحہ اور چند دیگر مشکوک چیزیں موجود تھیں اس لیے وہ
اس ناکے سے گزرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ان
کی گاڑی بھی چوری کی تھی۔ رات کے سناٹے کا فائدہ اٹھا کر
سرمد نے وہیں سے گاڑی موڑ لی اور رانگ سائیڈ پر گاڑی
دوڑانے لگا۔ اتنی زیادہ رات کو سڑک پر ان کی گاڑی کے
علاوہ اکا دکا گاڑیاں ہی موجود تھیں اس لیے کسی حادثے کے
امکانات تو بہت کم تھے لیکن پھنس جانے کا اندیشہ شدید ہو گیا
تھا۔ ناکے سے ایک پولیس موبائل ان کے پیچھے لگ چکی تھی
اور خدشہ تھا کہ جسے وہ پہلے جل دے چکے ہیں وہ بھی اسی
طرف چلی آ رہی ہو گی۔

"گاڑی چھوڑ دو سرمد! ہم پیدل نکلنے کی کوشش
کرتے ہیں۔" اچانک ہی اب تک خاموش بیٹھے عالم شاہ
نے اسے مشورہ دیا تو وہ چونکا اور پھر سمجھ گیا کہ یہی مناسب
فیصلہ ہے۔ فیصلے پر عمل کے لیے وہ جگہ بھی خاصی مناسب
تھی۔ انہوں نے گاڑی چھوڑی اور اتر کر تیزی سے ریلوے
پل کی طرف بھاگتے چلے گئے۔ جانے کس زمانے میں
بنائے گئے اس پل کے نیچے سے گزرنے کے لیے موجود
راستے کی اونچائی اتنی کم تھی کہ کسی بڑی گاڑی کا اس کے نیچے
سے گزرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ راستے کی چوڑائی بھی قابلِ
رشک نہیں تھی اور ایک وقت میں ایک چھوٹی گاڑی ہی وہاں
سے گزر سکتی تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ اردگرد کے
ٹوٹے راستے اور جمع شدہ پانی کو پار کرنے کی سکت رکھتی ہو۔
ان دونوں کی جان پر بنی تھی اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے
گڑھوں اور گندے پانی کی پروا نہ کرتے ہوئے وہاں سے
گزرتے چلے گئے اور پل کی دوسری طرف پہنچنے کے بعد بھی
رکنے کے بجائے دوڑتے ہی چلے گئے۔ آگے سڑک کی
حالت کافی بہتر تھی لیکن فی الحال انہیں سڑک سے اتنی دلچسپی
نہیں تھی اور توجہ کا اصل مرکز سڑک کے اطراف میں لگے
گھنے درخت تھے جو ان کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہو سکتے
تھے۔ وہ ان درختوں کی آڑ لے کر بھاگتے ہوئے محسوس
کر رہے تھے کہ پولیس نے اب بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا
ہے۔ تعاقب کے اس احساس نے انہیں درختوں کے
درمیان بھی نہیں رکنے دیا اور وہ دائیں جانب ہو کر بھاگتے چلے
گئے۔ رات کا وقت تھا اور انہوں نے سمت کا تعین کیے بغیر
راہِ فرار اختیار کی تھی اس لیے صحیح طور پر اندازہ لگانے سے
قاصر تھے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔

بھاگتے بھاگتے وہ دونوں ایک وسیع چار دیواری تک
پہنچے تو عالم شاہ کو پہلی بار ادراک ہوا کہ وہ یزدانی بلڈرز والوں
کے اس زیرِ تعمیر پروجیکٹ تک پہنچ گئے ہیں جس کے گھپلے ظاہر
کرنے کے چکر میں بشریٰ گلزار مشکل میں پھنس گئی تھی۔ بشریٰ
کے موبائل کے حصول کے لیے وہ ایک بار معاذ کے ساتھ
یہاں آ چکا تھا اور جانتا تھا کہ یہاں کے مالکان ہرگز بھی اس
کے ہمدرد اور دوست ثابت نہیں ہو سکتے لیکن فی الحال پناہ کے
لیے کوئی اور بہتر جگہ موجود بھی نہیں تھی۔ ایک تسلی یہ بھی تھی کہ
اس وقت کون سا مالکان سے سامنا ہو سکتا ہے۔ رات کے اس
پہر وہاں زیادہ سے زیادہ چند چوکیدار ہی موجود ہو سکتے تھے
اور اسے اعتماد تھا کہ وہ اور سرمد مل کر انہیں سنبھال سکتے ہیں
اس لیے سرمد سمیت دیوار پھلانگ کر اندر جانے میں زیادہ
تامل سے کام نہیں لیا۔ وہ لوگ جس جگہ سے اندر کودے تھے،
پروجیکٹ کا سائٹ آفس وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور اندر

جیسی بھی روشنی دھندلے شیشے سے باہر جھلک رہی تھی۔ وہ دونوں آہستگی سے اسی طرف حرکت کرنے لگے۔ ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ سائرن کی مخصوص آواز نے اعلان کردیا کہ پولیس وہاں پہنچ چکی ہے۔ سائرن کی آواز کے ساتھ ہی آفس کے اندر بھی زندگی جاگ اٹھی اور یوں محسوس ہوا کہ دو یا دو سے زیادہ افراد آپس میں بات کررہے ہوں۔ ایک دو منٹ کے وقفے سے کال بیل کی آواز سنائی دی اور ایک بلند آواز نے پولیس کی آمد کا اعلان کیا۔ فوراً ہی آفس کا باہر کی طرف والا دروازہ کھلا اور کوئی شخص باہر نکلا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور گفتگو بلند آواز میں ہورہی تھی اس لیے سرمد اور عالم شاہ کو پتا چل گیا کہ پولیس ان ہی کی تلاش میں یہاں تک پہنچی ہے اور آفس میں سے نکلنے والے بندے سے ان ہی کے متعلق استفسار کیا جارہا ہے۔

''یہاں کوئی نہیں آیا سرجی! آیا ہوتا تو ہم سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔'' اس بندے نے بڑی سی جمائی لیتے ہوئے پولیس والے کو بیزاری سے جواب دیا۔

''تمہیں کیا پتا اوئے! تم تو پڑے سو رہے تھے۔'' اس کے جواب پر پولیس والے کو تپ چڑھ گئی۔

''ہم سوتے میں بھی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں جی۔ ویسے بھی یہاں چوکیدار موجود ہیں جو رات بھر راؤنڈ مارتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی اندر گھسا ہوتا تو اب تک چوکیداروں میں سے کسی کے ہتھے چڑھ چکا ہوتا۔ اگر پھر بھی آپ مطمئن نہیں ہیں تو یہاں کی تلاشی لے لیں۔'' پولیس سے نمٹنے والے کے لہجے میں بیزاری در آئی۔

''تلاشی تو ہم ضرور لیں گے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ وہ دونوں اسی طرف آئے ہیں۔'' پولیس والوں کی طرف سے کیے گئے اس اعلان نے ان دونوں کو قدرے پریشان کردیا اور وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر اپنے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کرنے لگے۔

''شوق سے لیں جی تلاشی لیکن سوچ لیں کہ اتنی تھوڑی سی نفری کے ساتھ آپ اتنے بڑے پروجیکٹ کی تلاشی لیں گے کیسے؟'' اس شخص کے لہجے میں استہزا تھا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس کے بحث مباحثے پر پولیس والوں کو بھی جیسے ضد ہوگئی تھی کہ تلاشی ضرور لینی ہے۔ اس ساری گفتگو کو سنتے سرمد اور عالم شاہ اس دوران فیصلہ کرچکے تھے کہ انہیں کس جگہ پناہ لینی ہے۔ ڈھیروں زیرِ تعمیر کمروں کے درمیان چھپنے کی جگہوں کی کمی نہیں تھی۔ تعمیراتی سامان بھی جگہ جگہ ڈھیر لگا ہوا تھا جو انہیں اچھی آڑ مہیا کرسکتا تھا لیکن ان دونوں نے زیرِ تعمیر مکانات اور تعمیراتی سامان کو چھوڑ کر ایک مضبوط تنے کے اونچے درخت کا انتخاب کیا اور بندروں کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھتے چلے گئے۔ جس وقت بڑا گیٹ کھلوا کر پولیس اندر داخل ہوئی، وہ دونوں درخت کی بلند ترین شاخوں پر پہنچ چکے تھے۔ سیاہ اور چست لباسوں میں درخت کی شاخوں سے لپٹے وہ گویا ان ہی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ پولیس والے موبائل سے اتر کر اب ادھر اُدھر پھیل رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں تھی۔ اس تعداد کے ساتھ اتنے وسیع رقبے پر جہاں چھپنے کے لیے بے شمار جگہیں موجود تھیں، رات کے اندھیرے میں کسی کو تلاش کرنا آسان بات نہیں تھی۔ پولیس والوں نے اپنی ضد میں یہ کام شروع کیا لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ یہ بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہے۔ آدھے گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ہی انہوں نے ہار مان لی اور خیال ظاہر کیا جانے لگا۔

''لگتا ہے وہ کسی اور طرف نکلے ہیں۔''

''ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا سرجی کہ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ ادھر ہمارے آدمی چوکس رہتے ہیں۔ اگر کوئی آئے تو ہماری نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔'' ردعمل میں وہی آواز سنائی دی جو ابھی پہلے بھی وہ سنتے رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں پولیس والے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ پولیس والوں کے جانے کے بعد وہاں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ موقع غنیمت جان کر وہ دونوں بہ آہستگی نیچے اتر آئے۔ ارادہ تھا کہ جس طرح دیوار پھلانگ کر اندر آئے ہیں اسی طرح واپس بھی نکل جائیں گے۔ ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابھی دو قدم ہی چلے تھے کہ یکدم روشنی میں نہا گئے۔ فطری ردعمل کے تحت دونوں نے اپنے ہتھیاروں کا رخ اس سمت کرلیا جہاں سے روشنی ڈالی جارہی تھی لیکن اگلا ہی لمحہ ان کے لیے حیران کن تھا۔ ان کے ہتھیار یوں ان کے ہاتھوں سے نکلے جیسے کسی نادیدہ طاقت نے انہیں اچک لیا ہو۔ لیکن حقیقت میں یہ کوئی نادیدہ طاقت نہیں بلکہ ہوشیاری و مہارت سے پھینکے گئے پھندے تھے جو ان کے ہاتھوں سے ہتھیار اچک کر لے گئے تھے۔ ہتھیاروں کے یوں ہاتھ سے نکل جانے پر وہ سنبھل پاتے، اس سے قبل ہی دو پھندے ان کی گردنوں میں آپڑے۔ بے ساختہ ہی ان کے ہاتھ گردن میں پڑتے پھندوں کو ڈھیلا کرنے کے لیے اٹھے لیکن پھندوں کو اتنی زور سے جھٹکے دیے گئے کہ گردنیں چھل گئیں اور نرخروں پر دباؤ پڑنے سے دم گھٹنے لگا۔ اسی حالت میں وہ

زمین پر گھسیٹ لیے گئے۔ اس ناگہانی آفت پر بدحواس وہ اپنے بچاؤ کے لیے اندھا دھند ہاتھ پیر چلا رہے تھے کہ ایک سماعت شکن قہقہے نے اپنی طرف توجہ مرکوز کر لی۔ اس موقع پر ان کی گردنوں میں پڑے پھندوں کی رسیوں کا تناؤ ذرا کم کر دیا گیا تھا اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ وہ اس شخص کو دیکھ سکیں جو ان کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا ہوا اب بھی مسلسل قہقہے لگا رہا تھا۔ ان کے ہتھیار اچکنے اور گلوں میں پھندے ڈالنے والے اب بھی پوشیدہ تھے لیکن وہ شخص روشنی میں آ کھڑا ہوا تھا۔ درمیانی قامت اور معمولی شکل و صورت والے اس شخص کو شناخت کرنے میں عالم شاہ کو ایک پل ہی لگا۔ وہ غلیظ مکار آنکھوں والا عرفان اللہ کا چھوٹا باذل تھا۔ جس طرح باذل کا سامنا اس کے لیے غیر متوقع تھا، اسی طرح باذل نے اسے پہچانا تو وہ بھی چونک گیا۔

"تم صداقت شاہ کے بیٹے ہو نا؟" اس نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔ عالم شاہ نے جواب دینے کے بجائے نفرت بھری نظروں سے اسے گھورا۔

"واہ میرے شیروں..... ! آج تو تم نے بڑا ہی زبردست شکار کیا ہے۔ شکار —— وہ بھی دشمن کا ..... واہ، واہ.. کیا بات ہے۔ یہ تو لطف ہی دوبالا ہو گیا ہے۔" باذل کا خوشی سے برا حال تھا۔

"چلو بھئی بچے۔ پہنچاؤ انہیں اسپیشل پوائنٹ میں۔ اتنے خاص مہمانوں سے تو فرصت سے ملاقات میں ہی لطف آئے گا۔" باذل کی طرف سے حکم جاری ہوتے ہی دو ہتھیار بردار افراد سامنے آ گئے جنہوں نے عالم شاہ اور سرمد کو اٹھ کر اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہماری کبھی آپس میں ملاقات بھی نہیں ہوئی اور تم ہم سے دشمنی کا ناتا جوڑ رہے ہو۔" معاذ کے معاملات میں جہاں تک عالم شاہ کا تعلق رہا تھا، اس کا باذل سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ باذل باقاعدہ طور پر بشریٰ کی والدہ عائشہ گلزار کی بے حرمتی اور قتل والے معاملے کے بعد ہی سامنے آیا تھا اور یہ وہ دور تھا جب عالم شاہ اپنے والد صداقت شاہ کے جذباتی دباؤ میں آ کر خود کو معاذ کے مسئلے سے الگ رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے باذل سے یہ جملے کہے تھے۔

"زیادہ بھولے بادشاہ نہ بنو یار! اس لونڈے معاذ سے دوستی نبھانے کے لیے تم نے بھی اتنے ہی ہاتھ پیر مارے تھے جتنے میں اپنے باس سے وفاداری نبھانے کے لیے مارتا رہا ہوں۔ وہ تو باس نے تمہارے ابا جی کو ڈرا دھمکا کر تمہیں لگام ڈلوائی تھی ورنہ ہمارا تمہارا ٹاکرا بہت پہلے ہی ہو چکا ہوتا۔ خیر دیر آید درست آید۔ اب تمہاری آزمائش ہو جائے گی کہ کتنے پانی میں ہو۔" باذل کے جواب نے ظاہر کر دیا کہ نا صرف وہ خود حالات سے مکمل طور پر آگاہ ہے بلکہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ عالم شاہ اس سے انجان نہیں ہے۔

"جب میں اپنے والد کے کہنے پر سب معاملات سے الگ ہو گیا تھا تو اب ہمارے تمہارے درمیان دشمنی کی کیا تک بنتی ہے۔" عالم شاہ اسے گفتگو میں الجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید کوئی موقع مل جائے لیکن موقع دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کی گردنوں میں پڑے پھندے اتنے کسے ہوئے تھے کہ وہ بولنے میں بھی تھوڑی سی دشواری محسوس کر رہا تھا اور سونے پہ سہاگہ وہ جدید ہتھیاروں سے لیس اس کے چیلوں کے نرغے میں بھی پھنسے ہوئے تھے۔

"تمہاری یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ تم ان معاملات سے الگ نہیں ہوئے ہو۔" باذل اس کی دلیل سے قطعی متاثر نہیں ہوا۔

"ہمارا یہاں آنا صرف اتفاق ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ پناہ کے چکر میں ہم کہاں آ گئے ہیں۔"

"رات کے اس پہر یہاں اتفاق ہی کوئی آتا ہے لیکن اسے بھی یہاں سے جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ اگر تم جانے پر زیادہ اصرار کرو تو میں پولیس والوں کو واپس بلوا لیتا ہوں۔ اتنی رات گئے اس ویرانے میں پیدل کہاں خوار ہوتے پھرو گے۔ پولیس والوں کے ساتھ آرام سے ان کی موبائل میں چلے جانا۔" باذل کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ اس بار عالم شاہ نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص ہر حال میں اس سے دشمنی نبھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"لے بھی جاؤ یار انہیں۔ اب کیا میں باقی کی رات یہاں کھڑا ان بھگوڑوں سے مذاکرات ہی کرتا رہوں گا۔ لے جا کر آرام سے ٹھہراؤ ہمارے مہمانوں کو۔ پہلے معلوم کر لو کہ پولیس کیوں ان کو اپنا مہمان بنانے کے چکر میں پڑی ہوئی تھی پھر آرام سے ان کی میزبانی کے فرائض ادا کروں گا۔" باذل کی طرف سے حکم جاری ہوتے ہی ہتھیار بردار افراد انہیں اپنے ہتھیاروں سے ٹہوکے دینے لگے۔ گلے میں پھندا نہ پڑا ہوتا تو عالم شاہ میں اتنی جرأت تھی کہ وہ ہتھیاروں کی موجودگی کے باوجود ان سے بھڑنے کی کوشش کر بیٹھتا لیکن پھندے نے اسے اپنی مرضی کے مطابق

حرکت کرنے کے لائق ہی نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال سرمد کا تھا اسی لیے وہ مکمل خاموشی اختیار کیے کشن عالم شاہ کی پیروی ہی کرسکتا تھا سو وہ اس نے کی اور دونوں دھیرے دھیرے اس سمت بڑھنے لگے جس طرف بڑھنے کا گن برداروں نے اشارہ کیا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی بات تھی کہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکے ہیں۔

☆☆☆

معاذ کے فائر کھولنے پر چیخ کر رہ جانے والا روشن ماتھر اس وقت گہری سانس لے کر رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ گولی نے اس کے پاؤں میں پڑی بیڑی کا تالا توڑ دیا ہے اور اب وہ آزاد ہے۔

"ویری نائس۔" اتنے بچے نشانے پر وہ معاذ کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"جلدی باہر نکلو۔" اس کی داد پر کوئی ردعمل دیے بغیر معاذ نے اس سے کہا اور باہر کا رخ کیا۔ روشن ماتھر اس کے ساتھ تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ دونوں اس ہال نما کمرے تک پہنچ گئے جہاں سے اس قید خانے کے لیے راستہ بنایا گیا تھا۔ ہال میں پہنچ کر انہیں باہر کی آوازیں زیادہ بہتر طور پر سنائی دے رہی تھیں اور ان آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آگ بہت بری طرح پھیل چکی ہے۔ وہ دونوں ہال سے باہر نکلے تو برآمدے میں دھواں چکرا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی سانسیں روکیں اور بائیں طرف بھاگتے چلے گئے۔ کھانے کا کمرا اور دفاتر وغیرہ دائیں جانب تھے اور اسی طرف آگ کے شعلے بھی بھڑک رہے تھے۔

ناشتے کا وقت ہونے کی وجہ سے پہلے ہی لوگوں کی زیادہ تعداد اسی حصے میں تھی اور باقی صورت حال جاننے اور آگ بجھانے کے چکر میں اس طرف کا رخ کر چکے تھے اس لیے ان دونوں کا کسی سے واسطہ نہیں پڑا۔ ایک آدھ بندہ ٹکرایا بھی تو دھوئیں کی وجہ سے ان کی شناخت کا اندازہ نہیں کرسکا اور وہ تیزی سے چھت کی طرف جانے والے زینے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ زینہ چڑھتے ہوئے یکدم ایک اہلکار ان کے سامنے آ گیا۔ وہ اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔

"ہالٹ..." ان دونوں کو سامنے پا کر وہ للکارا۔

"یہ میں ہوں سر، سیمسن۔" زینوں پر دھواں نہیں تھا اس لیے معاذ نے کوشش کی کہ ماتھر کو اپنی آڑ میں چھپا لے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔

"سب لوگ باہر نکل چکے ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں تو خود یہ چیک کرنے آیا ہوں کہ قیدیوں والے حصے سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا۔" وہ بولتا ہوا دو قدم مزید نیچے آ گیا۔ اس کے انداز سے یہ لگ رہا تھا کہ وہ معاذ کے پیچھے اس کی آڑ میں کھڑے ماتھر کو چیک کرنا چاہ رہا ہے۔ معاذ کے پاس اب مزید مہلت نہیں تھی۔ اس نے وہیں سے ایک جست لگائی اور اہلکار پر جا پڑا۔ اس کے ہاتھ میں موجود گن نے بے ساختہ ہی گولیاں اگلیں۔ اگر ماتھر عین وقت پر اپنی جگہ سے ہٹ نہ گیا ہوتا تو گولیاں اسے چاٹ چکی ہوتیں۔ ماتھر کے دوبارہ کھڑا ہونے سے قبل معاذ نے اہلکار کی کھوپڑی گن کے دستے سے بجا دی۔ وہ بے چارہ بے ہوش ہو کر وہیں سیڑھیوں پر لڑھک گیا۔

"گولی کیوں نہیں ماری سالے کو؟" ماتھر نے اس سے شکوہ کیا۔

"جلدی چلو۔" اس کی بات کو خاطر میں لائے بغیر معاذ نے اس سے کہا۔ اہلکار کے ہاتھ سے چھوٹنے والی گن ماتھر کے ہاتھ نہ لگے اس لیے وہ پہلے ہی نہایت ہوشیاری سے پیر کی ٹھوکر مار کر گن نیچے برآمدے میں لڑھکا چکا تھا۔ اندر اس نے جن اہلکاروں کو بے ہوش کیا تھا ان کی گنیں بھی ماتھر کی دسترس سے دور رکھی تھیں۔ وہ اسے قطعی اس بات کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کسی کی ہلاکت کا باعث بنے اور اس کی نہایت احتیاط سے کی گئی کارروائی پر کسی اہلکار کے خون کا دھبا لگے۔ وہ اپنی جگہ پُرامید تھا کہ آگ نے کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچایا ہوگا اور سب لوگ بحفاظت باہر نکل گئے ہوں گے۔ قیدیوں والا حصہ بالکل الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے وہاں آگ یا دھواں پہنچنے کا امکان ویسے بھی بہت کم تھا اور امید کی جا سکتی تھی کہ آگ کے اس حد تک پھیلنے سے قبل ہی اس پر قابو پا لیا جائے گا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے مسلسل بجتے ہوٹرز اس بات کا اعلان تھے کہ آگ پر قابو پانے کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ یہ ہوٹرز اس کے لیے بھی ایک اشارہ تھے۔ اسے اور ماتھر کو ان ہی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی کے ذریعے فرار ہونا تھا لیکن وہ اس سے قبل ایک کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ کام اس سے احسن طریقے سے ہو سکے گا یا نہیں یہ اس کے لیے ایک آزمائش تھی اور اس آزمائش میں پورا اترنے کے لیے وہ اپنی اہلیت سے زیادہ جذبے کی صداقت اور اللہ کی نصرت پر انحصار کر رہا تھا۔

"ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟" کھلی چھت پر پہنچتے ہی ماتھر نے اس سے سوال کیا اور یوں آسمان کی طرف دیکھنے

لگا جیسے اسے اپنے فرار کے لیے کسی ہیلی کاپٹر کی آمد کی امید ہو۔ اس کی اس حرکت کا معاذ نے فائدہ اٹھایا اور اس کی کنپٹی پر ایک جچا تلا وار کر ڈالا۔ اس کی طرف سے بے خبر ماتھر ایک ہی وار میں تیورا کر نیچے گر پڑا۔ معاذ نے اس کے آڑے ترچھے پڑے جسم کو سیدھا کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ جلد ہی ماتھر نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ یہی معاذ کے لیے عمل کا وقت تھا۔ اس سے قبل کہ ماتھر پوری طرح ہوش میں آکر صورتِ حال کو سمجھتا، اس نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا کر اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور خاص لب و لہجے میں پکارا۔

''روشن ماتھر! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں، میں سن رہا ہوں۔'' خوابیدہ سے لہجے میں دیا گیا ماتھر کا جواب اس کے لیے کامیابی کی نوید تھا۔ ایک جلتی ہوئی عمارت کی چھت پر، فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے ہوٹرز کے شور میں، ایک خطرناک جاسوس پر عمل تنویم کا تجربہ نہ تو پروفیسر وکٹر جیسا کوئی ماہر کر سکتا تھا نہ ہی کلینیکل سائیکولوجی میں ڈگری یافتہ کوئی اور شخص۔ یہ صرف معاذ کر سکتا تھا جس نے کیرتھر کی پہاڑیوں میں فیضو جیسے پراسرار شخص سے، فطرت کے مظاہر کے سنگ اس علم کا اکتساب کیا تھا۔ وہ اپنے آس پاس والوں میں ہمیشہ ایک غیر معمولی لڑکا تصور کیا جاتا تھا اور اس وقت وہ اپنے غیر معمولی ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کی ساری توانائیاں اپنی آنکھوں میں سمو دی تھیں اور آنکھوں سے خارج ہوتی توانائی کی یہ غیر معمولی لہریں اس کی آواز کے سنگ مل کر ماتھر جیسے شخص کا دماغ کنٹرول کر رہی تھیں۔ ماتھر جیسا جاسوس کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ بہت ٹھونک بجا کر منتخب کیے جاتے ہیں اور خصوصی تربیت سے لیس کر کے میدانِ عمل میں بھیجے جاتے ہیں لیکن ایسوں کا واسطہ جب معاذ جیسے دیوانوں کے جذبات سے پڑتا ہے تو انہیں ہار ماننا پڑتی ہے۔ روشن ماتھر نے بھی سپر ڈال دی تھی کہ اس کا واسطہ ایک ایسے دیوانے سے پڑا تھا جو خود کسی کا منتخب کردہ تھا۔ جس کی غیر معمولی خصوصیات نے اسے کچھ طاقتور لوگوں کے ہتھے چڑھا دیا تھا۔ جو اپنے پیاروں کے تحفظ کے لیے ان طاقتور لوگوں کے ہاتھوں کھیلنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن کیا وہ سچ مچ مجبور تھا؟ بپھرتی لہریں بھی کیا کبھی کسی کے قابو میں آئی ہیں اور پانی کو اپنا راستہ بنانے سے کوئی روک سکا تھا جو معاذ اپنا راستہ بنانے سے رک جاتا۔ اس نے ان مشکل حالات میں بھی اپنا راستہ ڈھونڈ نکالا اور ڈیڑھ دو منٹ کے عمل میں وہ کر ڈالا جو بازی الٹنے کے لیے کافی تھا۔

''آؤ اب چلیں ماتھر۔'' اپنا کام مکمل کر کے وہ کھڑا ہوا تو ماتھر اس کا بے دام غلام بن چکا تھا۔ ماتھر کو اپنے ساتھ لیے وہ چھت کے جنوبی حصے میں پہنچا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق فائر بریگیڈ کی وہ مخصوص گاڑی وہاں موجود تھی جس پر لہراتا چھوٹا سا سفید جھنڈا اس کے لیے اشارہ تھا۔ اس سنگل اسٹوری کی عمارت کی چھت اتنی بلند نہیں تھی کہ اس گاڑی تک پہنچنے کے لیے انہیں کسی ذریعے کی ضرورت ہوتی۔ دونوں ہی تربیت یافتہ افراد تھے چنانچہ آرام سے چھت سے سیدھے گاڑی پر کود گئے۔ ان کے کودتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ وہاں بے حد افراتفری تھی۔ کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے تھے جنہیں باقی لوگ ایمبولینسوں میں منتقل کرنے کے لیے عملے کے ساتھ بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ یہ کوئی فوجی چھاؤنی، جیل یا ہیڈ کوارٹر وغیرہ نہیں تھا جہاں اہلکاروں کی بڑی تعداد موجود ہوتی۔ یہاں اہلکاروں کی بس ایک مخصوص تعداد ہی موجود تھی جن میں سے کچھ اندر رہ گئے تھے، کچھ زخمی تھے اور کچھ اپنے ساتھیوں کی بقا کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اس لیے مسلسل آتی جاتی گاڑیوں کے درمیان کسی نے توجہ نہیں دی کہ ایک گاڑی دو افراد کو لے کر وہاں سے فرار ہو رہی ہے۔

گاڑی ذرا آگے نکلی تو معاذ نے دیکھا کہ کچھ افراد چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ لوگ سیڑھیوں کے راستے اندر جا کر اندر والوں کا حال جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے لیے بہتری کی دعا کرتا ہوا وہ اپنے ماحول میں واپس آ گیا۔ گاڑی میں اس کے اور ماتھر کے علاوہ چار افراد مزید موجود تھے جنہوں نے فائر مین کی مخصوص وردیاں پہن رکھی تھیں۔ پانچواں فرد ڈرائیور تھا۔ جو چار افراد اس کے سامنے تھے ان کے پاس اسلحے کی موجودگی ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈرائیور بھی یقیناً مسلح ہو گا۔ یہ محض خوش قسمتی تھی کہ وہ کسی سے مڈبھیڑ کے بغیر ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر ان کے فرار کی راہ میں کہیں سے مزاحمت کی جاتی تو فائر مین کے روپ میں موجود یہ افراد اس کا بھرپور جواب دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں نقصان کی شرح کافی بڑھ سکتی تھی اس لیے معاذ کے حساب سے کامیابی سے فرار سب کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا اور اب وہ مزید بہتری کے لیے ماتھر کے حرکت میں آنے کا منتظر، کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ماتھر بظاہر ہر طرف سے بے نیاز خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا

تین معاذ اس کے وجود میں ایسا تناؤ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ شکاریوں کے نرغے میں پھنس جانے والا کوئی درندہ ہو۔ اس کے تیزی سے پھولتے پچکتے نتھنے اس کے اندرونی انتشار کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس کی یہ کیفیت معاذ کے لیے باعث اطمینان تھی اور وہ اپنی گن بے پروائی سے زانو پر رکھے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

پوری رفتار سے چلتی گاڑی تیزی سے فاصلہ طے کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ چار میں سے دو فائر مین ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دو کھڑے ہوئے چوکنے پن سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے کہ کسی بھی غیر موافق صورت حال سے نمٹ سکیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ جو فتنہ اٹھنا ہے اندر سے اٹھنا ہے اور اس شخص نے اٹھانا ہے جس کے لیے انہوں نے اتنا کھڑاگ کیا ہے۔ سر جھکا کر بیٹھے ماتھر نے اپنا سر اٹھایا تو معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ لمحہ آ گیا ہے جس کا اسے انتظار تھا۔ وہ خود کو ماتھر کی طرف سے مزید بے پروا ظاہر کرنے لگا لیکن حقیقتاً وہ اس پر پورا دھیان رکھے ہوئے تھا جب ہی تو جیسے ہی ماتھر نے اس کے زانوؤں پر رکھی گن پر ہاتھ ڈال کر پہلا فائر اسی پر کیا تو وہ پھرتی سے نیچے گر کر خود کو اس فائر کی زد میں آنے سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ فائر کی آواز نے فائر مین کے روپ میں موجود چاروں افراد کو چونکایا لیکن اس سے قبل کہ وہ صورت حال کو سمجھ کر کوئی ردعمل ظاہر کر پاتے، ماتھر سامنے بیٹھے دونوں افراد کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ تجربے کار آدمی تھا اور اس بات کو سمجھتا تھا کہ ان لوگوں نے سر پر موجود حفاظتی ہیلمٹ کے علاوہ بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن رکھی ہوں گی اس لیے سارے فائر چہروں اور گردن پر کیے تھے۔ ان مہلک گولیوں نے ان دونوں کو پل بھر کی بھی مہلت نہیں دی اور وہ فوراً ہی ڈھیر ہو گئے۔ کھڑے ہوئے افراد میں سے ایک نے ماتھر کے گن والے ہاتھ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن ماتھر کسی چیتے کی طرح جست لگا کر اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ جگہ چھوڑتے چھوڑتے بھی اس کی گن نے گولیاں اگلی تھیں جن میں سے بیشتر تو ضائع ہو گئیں لیکن ایک ان میں سے ایک کی ٹانگ میں گھس گئی۔ گولی کھا کر وہ شخص گرا لیکن اپنے ہاتھ سے گن نہ گرنے دی اور ماتھر کی طرف فائر جھونکا لیکن ماتھر چلتی ہوئی گاڑی اور محدود جگہ کے باوجود کمال کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ گولی کا نشانہ بننے کے بجائے اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور کسی مچھلی کی طرح پھسلتا ہوا مر جانے والے افراد تک پہنچا۔ ان میں سے ایک کی گن کھینچ کر اس نے دوسرے ہاتھ میں لی اور بیک وقت دونوں ہاتھوں سے فائر کرنے لگا۔ ڈرائیور کو صورت حال کا درست اندازہ نہیں تھا اور شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ان پر حملہ کیا گیا ہے اس لیے اس نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی تھی۔

اندھا دھند چلتی ان گولیوں کے باعث معاذ کا اپنا وجود بھی خطرے کی زد میں تھا لیکن اسے اپنی پروا نہیں تھی۔ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ ماتھر فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن فی الحال ماتھر کا پلہ بھاری تھا۔ وہ اس کی دی گئی تربیت کے تحت اس سمیت گاڑی میں موجود ہر فرد کو اپنا دشمن تصور کرتے ہوئے بے دریغ فائرنگ کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ اگر اسے خود کو بچانا ہے تو ان لوگوں کو ہلاک کرنا ہوگا۔ دوسری طرف مقابل ذرا سی جھجک کا شکار تھے۔ وہ جس شخص کو فرار کروانے کے مشن پر کام کر رہے تھے، اسے ہلاک کرنے کا فیصلہ کرنا مشکل تھا اس لیے ان کی کوشش تھی کہ جان لیوا فائر کرنے کے بجائے ماتھر کے جسم کے ایسے حصوں کو نشانہ بنائیں کہ اس کی جان محفوظ رہے لیکن ماتھر کی جارحیت نے فوراً ہی انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ جس شخص کی ٹانگ پر گولی لگی تھی، ایک اور گولی اس کے جبڑے میں جا گھسی۔ چوتھے شخص کے پاس اب احتیاط کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے بغیر کسی لحاظ کے اپنی گن کا رخ ماتھر کی طرف کیا اور وحشیانہ انداز میں اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب آڑ میں چھپے معاذ نے "ڈونٹ۔ کل ہم" کا نعرہ لگایا تھا لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی بات نہیں سنی جائے گی۔ ایسا ہی ہوا اور متعدد گولیاں ماتھر کے سر، چہرے اور سینے میں پیوست ہو گئیں۔ وہ ایسی جگہ پر موجود تھا کہ گولیاں کھا کر بے جان ہوا تو سیدھا گاڑی سے نیچے گرتا چلا گیا۔ معاذ نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر دیکھا، ماتھر کی لاش ذرا سی دیر میں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور ان کی گاڑی پانی کی موٹی دھاریں گراتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ انہی گولیوں نے پانی کے ذخیرے والی ٹنکی میں بہت سے سوراخ کر دیے تھے۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا۔ ہمیں تو اسے محفوظ طور پر یہاں سے نکالنا تھا۔" اس نے بلند آواز میں صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا۔

"وہ محفوظ رہتا تو اب تک اس گاڑی پر موجود ایک شخص بھی محفوظ نہ رہ پاتا۔" ماتھر کو گولی مارنے والا قہرناک لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں معاذ کے لیے بھی شک کی پرچھائیاں تھیں۔ ساتھ ہی وہ ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا پیغام

بھی دے رہا تھا۔ وہ جن راستوں سے گزر رہے تھے، وہ عام گزرگاہ نہیں تھی اور نہ ہی اس کے قرب و جوار میں کوئی باقاعدہ آبادی موجود تھی اس لیے فائرنگ کی آواز سن کر کوئی فوری طور پر اس طرف رخ کرتا، یہ تو ممکن نہیں تھا لیکن وہ خود ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکے تھے کہ ان کے لیے اپنا آگے کا لائحہ عمل طے کرنا دشوار ہو گیا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اچانک اس شخص کا دماغ کیوں الٹ گیا تھا۔ میں اپنی جان داؤ پر لگا کر اسے وہاں سے نکال کر لایا تھا اور اس نے پہلا فائر ہی مجھ پر کیا تھا۔ میں صرف اپنی خوش قسمتی سے بچ سکا ہوں۔'' معاذ جس وقت اپنی صفائی میں یہ جملے ادا کر رہا تھا، ڈرائیور بھی ان کے درمیان پہنچ گیا۔ ماتھر کو ہلاک کرنے والے نے اسے مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا۔

''ہمیں سب سے پہلے اس گاڑی کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ مرنے والوں کی لاشیں تلف کرنا ہوں گی اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم لاشوں سمیت گاڑی کو آگ لگا دیں۔ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی یہاں ضرور پہنچے گا اور ہمیں اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑنا ہے۔'' ڈرائیور نے فیصلہ سنایا۔

''یہاں صرف لاشیں نہیں، ایک عدد زخمی بھی ہے۔ زخمی کو اٹھا کر اس ویرانے میں طویل پیدل سفر مشکل ہوگا۔ یہ اتنا زیادہ زخمی ہے کہ فوری طبی امداد نہ ملنے کی صورت میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔'' جس شخص کی ٹانگ اور جبڑے میں گولیاں لگی تھیں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معاذ نے اس فیصلے پر اعتراض کیا۔

''ہم اپنے ساتھ کسی زخمی کو نہیں لے جا رہے ہیں۔'' ڈرائیور غرانے کے انداز میں بولا اور ایک نظر کھینچ کھینچ کر سانس لیتے زخمی شخص پر ڈالی۔ وہ جوان لڑکا تھا جس کا ہیلمٹ سر سے اتر کر دور جا گرا تھا اور سیاہ چمک دار ریشمی بالوں کو ہوا ہلکورے سے دے رہی تھی۔ ڈرائیور نے صرف ایک پل کے لیے اس کی طرف دیکھا پھر گن کا رخ اس کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ اس کی پیشانی میں بننے والے روشن دان نے اس کے خوب صورت چہرے کو بھیانک بنا ڈالا۔

''اوکے! اب یہاں کوئی زخمی نہیں ہے۔ اب تم جلدی سے نیچے اترو ورنہ ہم تم سمیت بھی اس گاڑی کو آگ لگا سکتے ہیں۔'' ڈرائیور شاید سینئر تھا جس نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔

''مجھے تمہارے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن میں اپنے ساتھ ثبوت لے جانا چاہتا ہوں کہ ہم جس شخص کو سیف ہاؤس سے فرار کروا کر لائے تھے، وہ روشن ماتھر ہی تھا۔'' اس نے مطالبہ کیا۔

''اب کیا تم ماتھر کی لاش اٹھا کر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' ڈرائیور جھنجلایا۔

''لاش نہیں، صرف دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کافی ہوں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اس کی بات ماننا ہوگی۔'' اس بار ڈرائیور کے ساتھی نے اس کے موقف کی تائید کی۔ فیصلہ ہو چکنے کے بعد وہ تینوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اتنی دیر میں پانی کا سارا ذخیرہ بہہ چکا تھا۔ وہ لوگ گاڑی سے کچھ فاصلے پر جا کھڑے ہوئے اور ایک ہینڈ گرینیڈ کی پن نکال کر اسے گاڑی کی طرف اچھال دیا۔ ہینڈ گرینیڈ پھٹنے سے قبل ہی تینوں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے پنجوں کے بل وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ خاصا فاصلہ پیدا کر لینے کے باوجود انہوں نے گرینیڈ پھٹنے کی آواز اور زمین کی لرزش کو محسوس کیا لیکن رکے نہیں اور مسلسل آگے بڑھتے چلے گئے۔ دوسرا کان پھاڑ دھماکا سنائی دینے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ پیٹرول ٹینک پھٹنے کا دھماکا تھا۔ معاذ نے بھاگتے بھاگتے ایک پل کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آگ بجھانے والی گاڑی اس وقت خود آگ کے گولے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آج کے دن آگ کی ہی حکمرانی رہی تھی۔ پہلے آگ نے ایک سیف ہاؤس کو نگلا تھا اور اب اس گاڑی کو خاک کر رہی تھی۔ اپنے وطن کی ان املاک کے ضائع ہونے کا معاذ کو افسوس تھا لیکن اس نقصان کے بدلے میں روشن ماتھر جیسا عفریت ختم ہوا تھا۔ اگر وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو جانے وطن کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دینے والی اور کن کن کارروائیوں میں حصہ لیتا۔ آگ اور خون کے اور کتنے کھیل کھیلے جاتے جن میں سیکڑوں زندگیاں داؤ پر لگتیں اور سازشوں کے کون کون سے تانے بانے جاتے جن کے باعث ملک عالمی سطح پر بدنام ہوتا۔ جن نقصانات کے بدلے روشن ماتھر کی زندگی کا خاتمہ ہوا تھا، وہ اس کے زندہ بچ نکلنے کے مقابلے میں بہت معمولی تھی اور کہا جا سکتا تھا کہ معاذ نے زیادہ مہنگا سودا نہیں کیا تھا۔

بھاگتے ہوئے انہوں نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ وہ ماتھر کی لاش تک پہنچ سکیں چنانچہ جلد ہی انہوں نے اسے پالیا۔ تیز رفتار چلتی گاڑی سے گرنے کے باعث اس کی باڈی متاثر ہوئی تھی اور یقینی طور پر کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں لیکن اس سے قبل ہی وہ ہر تکلیف سے آزاد ہو چکا تھا۔

ڈرائیور نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر نہایت صفائی سے اس کے دونوں انگوٹھے جڑ سے کاٹے اور ایک چھوٹے سے پولی تھین بیگ میں محفوظ کر لیے۔ معاذ کو اس وقت بے اختیار ہمسن یاد آیا۔ روشن ماتھر کی زندگی بچانے کے لیے اس غریب کی جان لی گئی تھی اور اس کے انگوٹھوں کی کھال نہایت کاریگری سے معاذ کے انگوٹھوں پر منڈھی گئی تھی کہ وہ سیف ہاؤس کی سیکیورٹی سے گزر سکے۔ سیکیورٹی سے گزرنے کے لیے ہی معاذ کو بغیر کسی ہتھیار کے خطرے میں کودنا پڑا تھا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے اس کے پاس ایک اہلکار کی گن تھی جس سے روشن ماتھر نے اس کے حسب منشا خوب کام لیا تھا۔ ماتھر کی اس کارروائی نے باقی دو بچ جانے والے افراد کو اتنا ہراساں کر دیا تھا کہ وہ رسی کو بھی سانپ سمجھ سکتے تھے اسی لیے انہوں نے احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاذ کو کوئی ہتھیار نہیں دیا تھا۔ معاذ کو ہتھیاروں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ فرار کی اس کے پاس گنجائش نہیں تھی اور ان دونوں کو وہ گواہ کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہی تو تھے جو گواہی دیتے کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا تھا اور جو بھی گڑبڑ ہوئی وہ ماتھر کی اپنی وجہ سے ہوئی۔ ماتھر کا دماغ اچانک کیوں الٹ گیا تھا، اس معمے کو معاذ کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا چنانچہ وہ بڑا ہلکا پھلکا سا ان دونوں کے ساتھ چلا جا رہا تھا جو اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہرگز اس کے ساتھی نہیں تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ڈرائیور نے کہیں پیغام بھیج کر اپنے لیے مدد طلب کر لی ہے۔ چنانچہ پیدل چلنے کی یہ مشقت بھی زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔ یوں بھی ایک موذی دشمن کو انجام تک پہنچانے پر اس کا دل اتنا شاد تھا کہ فی الحال کوئی تکلیف، تکلیف محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

عالم شاہ اور سرمد ایک دیوار سے ٹیک لگائے اس تاریک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جو یقینی طور پر کسی قید خانے کا حصہ تھا۔ انہیں اس حال میں یہاں پہنچایا گیا تھا کہ ان کے جملہ سامان کے ساتھ ساتھ ان کے کپڑے اور جوتے بھی اتروا لیے گئے تھے اور ان کے جسم پر صرف ایک ایک انڈرویئر ہی باقی رہ گئی تھی۔ ان چیزوں سے محروم ہوتے ہوئے عالم شاہ نے ایک بار پھر بات چیت سے معاملہ حل کرنے کی اچھی سی کوشش کی تھی لیکن باذل کے چیلے اس کی کسی پیشکش کو خاطر میں نہیں لائے تھے اور انہوں نے صاف بتا دیا تھا کہ ان سے جو بھی بات ہوگی وہ باذل خود کرے گا۔ کب؟ یہ بھی باذل ہی طے کرتا تھا، سو وہ بے بس سے بیٹھے چیونٹی کی رفتار سے چلتے وقت کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں وہ اس قید خانے کا جائزہ کیسے لیتے اور فرار کی کوشش کیونکر کر پاتے۔ ویسے بھی اندازہ تھا کہ انہیں یہاں تک پہنچا کر باذل کے گرگے بے خبر نہیں بیٹھ گئے ہوں گے۔ باذل نے انہیں ہدایت کر رکھی ہوگی کہ قیدیوں کی کڑی نگرانی کی جائے اس لیے فی الحال کچھ نہ کرنا اور مناسب وقت کا انتظار کرنا ہی بہتر تھا۔

''مجھے حیرت ہے کہ اس رہائشی اسکیم میں باذل کیا کر رہا ہے؟ یہ یزدانی کا پروجیکٹ ہے اور باذل، عرفان اللہ کا باڈی مین سمجھا جاتا ہے۔ اگر دوستی میں یزدانی نے اسے یہاں چھپا بھی رکھا ہے تو یہ چھپنے کے لیے اتنی مناسب جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو بہت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہوگا اور کوئی نہ کوئی تعمیراتی عملہ تو روزانہ آتا ہوگا۔ کسی کے ذریعے بھی بات باہر نکل سکتی ہے کہ باذل یہاں چھپا ہوا ہے۔'' کافی دیر خاموش بیٹھنے کے بعد عالم شاہ نے یہ تبصرہ کیا۔

''میرے خیال میں یزدانی نے صرف دوستی میں باذل کو یہاں چھپنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ درون خانہ عرفان اللہ نے بھی اس پروجیکٹ میں رقم لگا رکھی ہے۔ وہ سیاست دان سے پہلے بزنس مین ہے اور اس کی اور یزدانی کی دوستی کی بنیاد بزنس ہی ہے۔ عرفان اللہ کے بھاری شیئرز کی وجہ سے یزدانی، باذل کو یہاں رکھنے کے لیے راضی ہوا ہوگا۔ رہی بات یہ کہ تعمیراتی عملے کے ذریعے باذل کی یہاں موجودگی ظاہر ہو سکتی ہے تو اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق فی الحال یہاں تعمیراتی کام رکا ہوا ہے۔ یزدانی اور اس کے جیسے دوسرے بلڈرز کا طریقہ ہے کہ بکنگ کا آغاز کرنے کے بعد شروع میں کچھ عرصہ تو تعمیراتی کام میں خوب تیزی دکھاتے ہیں اور اس کی تشہیر بھی بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں لیکن جب ان کا ایک خاص ہدف پورا ہو جاتا ہے تو تعمیراتی کام میں بڑے بڑے وقفے ڈال کر قبضے کے وقت کو آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس صورت حال پر بہت سے لوگ بددل ہو کر یا تو قسطیں بھرنا بند کر دیتے ہیں یا پھر اپنی بکنگ کینسل کرا دیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بلڈر کو ہی فائدہ ہوتا ہے۔ قسطیں نہ بھرنے والوں کی بکنگ پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق خود بخود کینسل ہو جاتی ہے اور جو لوگ بکنگ کینسل کرواتے ہیں انہیں بھاری کٹوتی کے بعد بڑا رلا کر ان کی باقی رقم ادا کی جاتی ہے۔ اس وقت بلڈر ایک نیا کام کرتا ہے۔ وہ ان واپس آ جانے والے پلاٹس اور گھروں وغیرہ کو

دوبارہ فروخت کے لیے پیش کرتا ہے اور پروجیکٹ کی ابتدائی قیمت کے مقابلے میں کئی گنا مہنگا بیچتا ہے کہ اس کے پاس لوگوں کو للچانے کے لیے ایک دلالی پاپ آجاتا ہے۔ اب اس کا پروجیکٹ زیر تعمیر نہیں بلکہ تکمیل کے قریب ظاہر کیا جارہا ہوتا ہے چنانچہ لوگ زیادہ قیمت کے باوجود قبضہ ملنے کی امید پر پھانسے میں آجاتے ہیں۔ اب یہ الگ بات کہ یہ جلد قبضہ بھی سال دو سال سے کم کی مدت میں مشکل سے ہی مل پاتا ہے۔"

عالم شاہ کے تبصرے پر سرمد نے اپنا بھرپور تجزیہ پیش کیا۔

"ہاں یار! یہ لوگ خوابوں کے سوداگر ہیں۔ اپنا گھر ایک عام آدمی کا سب سے بڑا خواب ہوتا ہے اور اس خواب کی تعبیر کا جھانسا دے کر یہ لوگ اس عام آدمی کو کانٹوں پر گھسیٹ لیتے ہیں۔ آس سے بندھا آدمی اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر طے شدہ قسطوں کے علاوہ دیگر معلوم اور نامعلوم اخراجات کی مد میں بھی رقوم بھرتا رہتا ہے لیکن اسے اپنا گوہر مراد آسانی سے نہیں ملتا۔ اس عرصے میں بلڈر کے البتہ وارے نیارے ہو جاتے ہیں اور اس کے اکاؤنٹس بھرتے چلے جاتے ہیں۔" عالم شاہ نے بھی ہمدردانہ لہجے میں اس کی بات کی تائید کی لیکن پھر ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ کسی کے کراہنے کی آواز تھی جو اسی قید خانے کے کسی گوشے سے ابھری تھی۔ اس کی طرح سرمد نے بھی یہ کراہ سن لی تھی لیکن وہ بھی اس کی طرح فوری طور پر سمت کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ دوسری بار آواز دوبارہ آئی اور کراہنے والا ذرا تسلسل سے کراہنے لگا تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دائیں طرف موجود ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے وہ اسے دیکھنے سے تو قاصر تھے لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اب تک بے ہوش پڑا رہا تھا اور اب ہوش میں آرہا تھا۔ دونوں نے بیک وقت آہستگی سے آواز کے ماخذ کی طرف پیش قدمی کی۔

"پپ..... پپ..... پانی..... پا..... نی....." اب وہ بڑے کرب سے پکار رہا تھا۔ عالم شاہ اور سرمد دونوں ٹھٹک گئے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس قید خانے میں پانی کا کوئی انتظام ہے بھی یا نہیں۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

"تم پانی دیکھو، میں اس شخص کو دیکھتا ہوں۔" عالم شاہ نے سرمد سے کہا اور آواز کی سمت بڑھ گیا۔ وہ شخص پکارنا چھوڑ کر اب پھر دھیرے دھیرے کراہنے لگا تھا۔ عالم شاہ آواز کے سہارے اس کے قریب پہنچا اور ٹٹول کر اس کے جسم کو چھوا۔ چھوتے ہی اسے لگا کہ اس کا ہاتھ انگاروں پر جا پڑا ہے۔ وہ شخص بے انتہا تیز بخار کی حد سے جل رہا تھا۔ عالم شاہ اندازے سے اپنا ہاتھ اس شخص کے چہرے تک لے گیا اور دھیرے سے اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کو تھپتھپا کر اسے پکارا۔

"کون ہو بھائی تم اور یہاں اس حال میں کیوں پڑے ہوئے ہو؟" اپنی اس پکار کے جواب میں اسے سسکیاں سی سنائی دیں لیکن یہ سسکیاں بھی ایسی تھیں جیسے اس شخص کے اندر ڈھنگ سے رونے کی بھی ہمت نہ ہو۔ بس ایک شدید کرب تھا جس کا اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا۔

"یہاں کہیں پانی نہیں ہے سائیں۔ میں چاروں دیواروں کے ساتھ ٹٹول کر گھوم کے دیکھ چکا ہوں۔" عالم شاہ سسکیاں لیتے ہوئے شخص کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر پاتا یا کسی قسم کی تسلی دلاسا دے پاتا، اس سے قبل اندھیرے میں سرمد کی آواز گونجی۔

"دروازے کو زور سے بجاؤ اور کسی کو پکار کر دیکھو۔ شاید کوئی آجائے۔ اس شخص کی حالت بہت خراب ہے اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

"جو حکم سائیں۔" سرمد نے اپنی ازلی تابعداری سے جواب دیا اور دروازے کے قریب جا کر لوہے کے اس بھاری دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے کے ساتھ ساتھ زور زور سے آوازیں بھی دینے لگا۔ پورے پانچ منٹ یہ عمل انجام دیتے ہوئے جب اسے لگا کہ اس کے ہاتھ دروازہ بجاتے بجاتے شل ہو گئے ہیں اور حلق میں خراشیں سی پڑنے لگی ہیں تب کہیں جا کر ردعمل ظاہر ہوا اور کھٹ پٹ کی ہلکی آوازوں کے بعد روشنی کا چھوٹا سا دائرہ نمودار ہوا۔ روشنی کسی چھوٹی ٹارچ کی تھی لیکن اتنے شدید اندھیرے میں رہنے کے باعث کافی تیز محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جب اس قید خانے میں لائے گئے تھے تب بھی لانے والوں میں سے ایک نے یہ ٹارچ پکڑ رکھی تھی لیکن وہ شخص سیڑھیوں پر ہی رکا رہا تھا اور باقیوں نے اسلحے کے زور پر ان دونوں کو قید خانے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ اس مختصر عرصے میں وہ صرف یہ دیکھ سکے تھے کہ جس دروازے سے گزار کر انہیں قید خانے میں دھکیلا گیا ہے، وہ بھاری لوہے کا بنا ہوا ہے اور اس دروازے میں ایک چھوٹا سا چوکور خلا ہے جس میں ایک ہاتھ باہر نکلنے سے زیادہ گنجائش موجود نہیں ہے۔ آنے والا اسی خلا کے سامنے آکھڑا ہوا اور اکھڑ لہجے میں بولا۔

"کیا بات ہے، کیوں شور مچا رکھا ہے؟"

"پانی چاہیے۔ یہاں جو دوسرا آدمی موجود ہے اس

کی حالت خراب ہے۔ اسے پانی اور دوا دارو کی ضرورت ہے۔'' سرمد نے تحمل سے اسے جواب دیا۔

''آرڈر تو ایسے کر رہے ہو جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو۔'' اس شخص نے طنز کیا۔

''مجھے معلوم ہے کہ ہم فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں، جہنم میں موجود ہیں لیکن انسانیت کے ناتے ایک بے بس اور بیمار شخص کی خاطر میں تم سے یہ مطالبہ کر رہا ہوں۔'' سرمد کا لہجہ اب بھی ٹھنڈا ہی تھا۔

''جہنم کیا ہوتی ہے، یہ تو تمہیں اس وقت پتا چلے گا جب تم اس جہنم کا عذاب سہو گے۔ ابھی میں تمہیں اس جہنم کی جھلک دکھانے کا انتظام کرتا ہوں۔'' بجائے طیش کا مظاہرہ کرنے کے اس شخص نے بھی ٹھنڈے ٹھار لہجے میں ہی جواب دیا اور تیزی سے واپس مڑ گیا۔ وہ کیا کرنے والا تھا، اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہرحال وہ لوگ انتظار کرنے لگے کہ شاید پانی آجائے۔ اس بار انتظار طویل ثابت نہیں ہوا اور جلد ہی وہ شخص واپس لوٹ آیا اور دروازے کے خلا میں سے پانی کی ایک چھوٹی سی بوتل سرمد کو تھمائی۔

''یہ ٹارچ بھی رکھ لوتا کہ تمہیں اندازہ ہو جائے کہ جہنم میں پہنچنے والوں کا کیسا عبرت ناک حال ہوتا ہے۔'' روشنی کی ضرورت تو بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی اور سرمد اس کا مطالبہ کرنے کو سوچ بھی رہا تھا لیکن اس کے مطالبہ کرنے سے قبل ہی اس شخص نے خود ہی وہ چھوٹی ٹارچ بھی دروازے کے خلا میں سے اسے تھما دی اور خود واپس پلٹ گیا۔ پانی کی بوتل شفاف پلاسٹک کی تھی جس کے باعث اندر موجود پانی ٹارچ کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مٹیالی سی رنگت کا وہ پانی ہرگز بھی پینے کے لائق نہیں تھا لیکن یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ ایسا پانی جان بوجھ کر فراہم کیا گیا ہے جس کی جگہ دوسرا پانی کسی صورت فراہم نہیں کیا جائے گا۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے ٹارچ کا رخ بوتل کی طرف سے ہٹایا اور عالم شاہ اور دوسرے قیدی کے قریب پہنچا۔ ٹارچ کی روشنی اب انہیں اس شخص کا حال دکھا رہی تھی۔ اس کا جسم بھی ان ہی کی طرح ایک زیرِ جامہ کے علاوہ لباس سے محروم تھا اور جسم کی ہر ہڈی یوں نمایاں ہو رہی تھی جیسے کھال اور ہڈیوں کے درمیان کہیں کسی جگہ چھٹانک بھر گوشت بھی موجود نہیں ہے۔ گہری سانولی رنگت والے چہرے پر موت سی ٹھنڈی ہوئی تھی اور ہونٹ اس قدر خشک ہو رہے تھے کہ پپڑیوں کے درمیان سے خون رسنے لگا تھا۔ ان پپڑی زدہ ہونٹوں سے اب بھی دھیمی کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔

''لو بھائی پانی پی لو۔'' سرمد نے اس کے سر کو سہارا دے کر ذرا سا اونچا کیا اور بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ شدید پیاسا ہونے کے باوجود وہ تیزی سے پانی پینے کے لائق نہیں تھا اور سرمد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی شیر خوار بچے کو پانی پلانے کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اس کی احتیاط کے باوجود پانی کا کچھ حصہ اس شخص کی باچھوں سے بہے جا رہا تھا۔

''اس شخص کے دونوں ہاتھ شدید زخمی محسوس ہو رہے ہیں۔ دیکھو دونوں ہاتھوں پر کپڑے بندھے ہوئے ہیں جس پر خون بھی لگا ہوا ہے۔'' سرمد کے اس شخص کو پانی پلانے کے دوران ٹارچ عالم شاہ نے تھام لی تھی اور ٹارچ کی روشنی میں ہی اس شخص کے دونوں جانب پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر سرمد کو بھی متوجہ کیا تھا۔

''شاید زخم کی وجہ سے ہی اسے بخار چڑھ گیا ہے۔ میرے کہنے پر بھی اس پانی کے ساتھ کوئی دوا فراہم نہیں کی گئی ہے۔ پانی بھی آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ کتنا خراب ہے۔'' زخمی اور بیمار شخص نے تھوڑا سا پانی پی کر ہی بوتل سے منہ ہٹا لیا تھا۔ سرمد نے نرمی سے اس کا سر واپس زمین پر رکھا اور بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے جواب میں بولا۔

''پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لیتے ہیں پھر ایک بار پھر کوشش کریں گے کہ اس کے لیے کوئی دوا وغیرہ منگوا سکیں۔'' عالم شاہ نے تجویز پیش کی جس پر سرمد فوراً ہی عمل پیرا ہو گیا۔ پٹی بھی کیا تھی، بس میلے کچیلے سے کپڑے تھے جنہیں بری طرح ہاتھوں پر منڈھ دیا گیا تھا۔ سرمد نے دائیں ہاتھ پر بندھا کپڑا کھولنے کا آغاز کیا۔ نڈھال پڑے شخص نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کپڑا کافی بڑا تھا جس کا ہر بل کھلنے کے ساتھ خون کی زیادہ مقدار نظر آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ زخم میں سے بہت زیادہ خون بہا تھا اور اب بھی کچھ نہ کچھ رِس رہا جاری تھا جس کی وجہ سے اتنا بڑا کپڑا بھی تر بتر ہو گیا تھا۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ پٹی کھولنے سے خون مزید تیزی سے بہنا شروع ہو جائے۔'' سرمد کے ہاتھ درمیان میں ہی رک گئے اور اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

''اب تو پٹی کھل ہی چکی ہے۔ پوری طرح کھول کر جائزہ تو لو کہ زخم کس نوعیت کا ہے۔ جس قسم کی پٹی اسے باندھی گئی ہے یہ تو ویسے بھی اس کے زخم کو سڑا کر رکھ دے گی۔'' عالم شاہ نے جواب دیا تو سرمد نے پوری پٹی کھول ڈالی۔ پٹی پوری کھل گئی تو وہ دونوں اس کے ہاتھ کا حال دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ اس کی پانچوں میں سے ایک بھی انگلی

سلامت نہیں تھی۔ انگوٹھا، شہادت کی انگلی اور چھوٹی انگلی تو جڑ سے ہی اکھڑے ہوئے تھے جبکہ درمیانی دو انگلیوں کی ایک ایک پور باقی رہ گئی تھی۔ زخموں کا جائزہ لینے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان پر کوئی باقاعدہ دوا وغیرہ نہیں لگائی گئی ہے بلکہ خون کا رساؤ روکنے کے لیے زخموں پر اندر تک کوئی مادہ بھر دیا گیا ہے۔ وہ کوئی چپچپا سا ٹھوس مادہ تھا جو خود بھی خون میں لتھڑا ہوا ہونے کے باعث پہچان میں تو نہیں آرہا تھا لیکن چھونے پر سرمد کو ایسا لگا تھا کہ وہ موم یا اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے۔ اس شے کی موجودگی کے باوجود زخموں سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ شاید پٹی کھولنے کا بھی اثر پڑا تھا۔

''اب کیا کروں سائیں؟'' زخموں کی تشویش ناک حالت دیکھتے ہوئے سرمد نے فکرمندی سے عالم شاہ کی طرف دیکھا۔

''میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ لوگ اس بے چارے کو طبی امداد پہنچانے پر راضی ہو جائیں یا کم از کم ہمیں ہی فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان مہیا کر دیں کہ کم از کم اس کے زخموں کی ڈھنگ سے پٹی تو ہو جائے۔'' عالم شاہ خود اس کے زخموں کی نوعیت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس اجنبی کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کر رہا تھا اس لیے فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ چھوٹی سی ٹارچ نے اس اندھیرے قید خانے کا حصہ کافی واضح کر دیا تھا۔ وہ ایک اچھا خاصا بڑا کمرا تھا جس کا فرش دھول مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ کمرے میں مستقل ایک ناگوار سی بو محسوس ہو رہی تھی جو عقبی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ٹارچ کی محدود روشنی میں عالم شاہ نے دیکھا کہ اس جانب ایک تنگ سا راستہ ہے۔ اس طرف کیا ہے، یہ جاننے کی خواہش اس نے پس پشت ڈالی اور دروازے کے چوکور خلا سے منہ لگا کر اس قید خانے کے نگرانوں کو پکارنے لگا۔ اس بار زیادہ آوازیں نہیں لگانی پڑیں اور ردعمل فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔

''تم لوگوں کو چین کیوں نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ آج کی رات آرام سے سو جاتے اس کے بعد تمہاری زندگی میں ایسی کوئی رات آنا بہت مشکل ہے جب تم سکون سے سو سکو۔'' آنے والا بڑبڑایا لیکن عالم شاہ نے توجہ نہیں دی اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''اس دوسرے شخص کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے مناسب طبی امداد نہیں ملی تو وہ مر جائے گا۔ بہتر ہے کہ اسے کسی اسپتال لے جاؤ۔''

''ہائے بھی بے ..... زمانہ تمیں تو دیکھو سائیں سرکار کی۔ ایسے آرڈر دے رہے ہیں جیسے قید خانے کے بجائے اپنی جاگیر پر موجود ہیں۔'' اس شخص نے مذاق اڑایا۔

''آرڈر نہیں، درخواست سمجھو۔ وہ شخص سچ مچ بہت تکلیف میں ہے اور میں کسی کو اتنی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔'' عالم شاہ نے رسان سے کہا۔

''یہ جہنم ہے شاہ سائیں اور جہنم میں آنے والوں کو اذیتیں ہی سہنی ہوتی ہیں۔ جہنم میں علاج معالجہ نہیں کیا جاتا۔'' اس شخص نے سرمد کے الفاظ پکڑ لیے تھے اور اسی حوالے سے طنز کر رہا تھا۔

''پلیز! ان باتوں کو رہنے دو اور انسان کی حیثیت سے اس شخص کے لیے تھوڑی ہمدردی سے سوچو۔ اگر تم اس کا تسلی بخش علاج نہیں کروا سکتے تو اتنا تو کر دو کہ کچھ ضروری دوائیں اور صاف پٹیاں ہی لا کر دے دو۔ ایسے تو وہ مر ہی جائے گا۔'' عالم شاہ کو اس وقت قطعی یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے بڑے باپ کا بیٹا تھا اور اپنی حویلی میں اس کی کیا شان تھی۔ اس وقت وہ ایک انسان کے لیے انسانیت کے ناتے کچھ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس معمولی آدمی سے بھی انکساری سے درخواست کر رہا تھا۔

''میں تمہاری یہ بات مان لیتا ہوں لیکن جلد تم جان لو گے کہ تمہاری ہمدردی اس شخص کے لیے زیادہ بری چیز ہے۔'' وہ شخص اتنی کہہ کر واپس پلٹ گیا۔ وہ ایک بار پھر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران سرمد، عالم شاہ کے مشورے پر بوتل سے چلو چلو پانی نکال کر اس شخص کے ماتھے اور سر پر پھیرنے لگا کہ کچھ تو بخار کی شدت کم ہو۔ اس بار وہ شخص دس منٹ کے وقفے سے واپس لوٹا اور دروازے کے خلا میں سے کچھ چیزیں عالم شاہ کو تھمائیں۔ ان اشیا میں کپڑے کے ٹکڑے، ایک زخم پر لگانے والا ٹیوب اور دو درد کش گولیاں تھیں۔ اتنے شدید زخمی شخص کے لیے یہ سامان نہایت ناکافی تھا لیکن اس وقت اس نے اسے بھی غنیمت جانا۔ سب سے پہلے اس نے سرمد کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح اس شخص کو دونوں گولیاں نگلنے پر مجبور کیا پھر ممکنہ حد تک زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم لگانے کے بعد دوسری پٹی باندھ دی۔ آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے زخم میں بھرا ہوا مادہ باہر نہیں نکالا تھا۔ وہ جو بھی شے تھی اس نے خون کے بہاؤ کو روکا ہوا تھا اور وہ اسے نکال کر صورتِ حال کو مزید خراب نہیں کر سکتے تھے۔ اس شخص کے دوسرے ہاتھ کا بھی پہلے ہاتھ جیسا ہی حال تھا۔ انہوں نے اس کے دوسرے ہاتھ کی بھی ممکنہ

حد تک مرہم پٹی کی پھر سرمد ایک کپڑے کو پانی میں بھگو کر اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھنے لگا۔ اس ساری کارروائی کے دوران وہ شخص کرب ناک انداز میں کراہتا رہا تھا لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ان دونوں کو کچھ کرنے سے روک پاتا۔ ایک دو دفعہ اس نے درد ناک لہجے میں چھوڑ دو، معاف کر دو جیسے جملے ضرور ادا کیے لیکن یہ کوئی باقاعدہ گفتگو نہیں تھی اور بخار کی شدت میں طاری ہونے والی ہذیانی کیفیت سے مشابہ بھی جا سکتی تھی۔

عالم شاہ نے سرمد کو اس شخص کے ساتھ مصروف چھوڑا اور ٹارچ ہاتھ میں لیے کمرے کے عقبی حصے میں نظر آنے والے مختصر راستے کی طرف بڑھا۔ یہ راستہ ایک تنگ گیلری نما جگہ میں کھل رہا تھا جہاں ایک اور بغیر کواڑ کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر بدبو کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا پھر بھی عالم شاہ نے ہمت کر کے قدم آگے بڑھائے اور دروازے سے جھانکا۔ جھانکتے ہی اسے زور سے ابکائی آئی اور وہ تیزی سے واپس پلٹا۔ وہ ایک چھوٹا سا باتھ روم تھا جہاں پانی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بے حد غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا ساتھی قیدی اور شاید اس سے پہلے کچھ اور لوگ بھی اس جگہ کو حوائج ضروریہ کے لیے بحالت مجبوری استعمال کرتے رہے تھے اس لیے وہاں کی اتنی بری حالت تھی۔

''کیا ہوا سائیں؟'' سرمد نے اسے اتنی بری طرح ابکائیاں لیتے ہوئے آتے دیکھا تو زخمی کو چھوڑ کر بے تابی سے کھڑا ہو گیا۔

''کچھ نہیں یار! بس گندگی سے طبیعت متلا گئی تھی۔'' عالم شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دی اور خود کو ذرا سنبھال کر بتانے لگا کہ پیچھے موجود باتھ روم کتنی بری حالت میں ہے۔

''جو لوگ بندے کو پینے کا پانی ایسا دیں وہ باتھ روم میں کوئی سہولت کیسے دے سکتے ہیں۔'' سرمد نے اپنے ہاتھ میں موجود پانی کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ بوتل میں اب چند گھونٹ ہی پانی باقی رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ مٹیالا سا پانی ہی اس نیم جان شخص کے لیے آبِ حیات تھا جس کو سرمد کبھی قطرہ قطرہ کر کے اس کے منہ میں ٹپکا رہا تھا تو کبھی کپڑے میں جذب کر کے اس کے بخار کی شدت کم کرنے کے لیے کپڑے کو پٹی کی صورت اس کے ماتھے پر رکھتا تھا۔

''ہمارے لیے اس جگہ رہنا بہت کٹھن ثابت ہو گا سرمد! ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنا ہو گی۔'' عالم شاہ یوں تو سخت جان تھا لیکن معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے کے باعث اس کی جس ناز و نعم اور نفاست کے ساتھ پرورش ہوئی تھی اس کے لیے ایسی جگہ رہنا کسی دوسری تکلیف کے مقابلے میں زیادہ اذیت ناک تھا۔

''تدبیر تو میں مسلسل سوچ رہا ہوں سائیں! لیکن فی الحال کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو حکم کریں۔ میں اپنی جان آپ کی راحت کے لیے قربان کرنے کو تیار ہوں۔'' سرمد کے انداز میں وہی اس کی ازلی جاں نثاری تھی۔

''میں جانتا ہوں سرمد کہ تم میرے پسینے پر اپنا خون بہا سکتے ہو۔ مجھے تمہاری وفاداری کا امتحان لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ مجھے بھی فی الحال کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی ہے جسے ہم اپنی فوری رہائی کے لیے آزما سکیں۔'' عالم شاہ اس جگہ کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔

''میرے خیال میں ہمیں سکون سے بازل کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ آئے گا تو ہم پر صورتِ حال واضح ہو پائے گی کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟'' سرمد نے مشورہ دیا جس کے جواب میں عالم شاہ کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چاچڑ جیسے بدنام ڈاکو کے خلاف انتہائی کارروائی کے لیے نکلتے ہوئے اس نے بدترین حالات کو بھی ذہن میں رکھا تھا۔ اپنے زخمی، معذور یا ہلاک ہو جانے کے امکانات بھی اس کے ذہن میں آئے تھے لیکن یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ چاچڑ کو بھیانک انجام سے دوچار کرنے کے بعد وہ کسی چوہے کی طرح یوں کسی گندی جگہ پر پھنس کر رہ جائے گا۔

''آپ تھوڑی دیر آنکھ لگانے کی کوشش کریں سائیں۔ میرے اندازے کے مطابق صبح ہونے میں بہت زیادہ وقت باقی نہیں ہے۔ صبح تک اللہ نے چاہا تو صورتِ حال میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آ جائے گی۔'' سرمد اس کے اتنے قریب رہا تھا کہ اس وقت اس کی کیفیات کو سمجھنا اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ اسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے ہی اس نے ایک امید دلا کر تناؤ کی کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی۔ بات عالم شاہ کی سمجھ میں آ گئی اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کے بیٹھنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دماغ کو بھی ڈھیلا چھوڑ دیا۔ لڑنے بھڑنے کی تربیت حاصل کرنے والوں کو اچھے استاد اعصاب پُرسکون رکھنے کی مشقیں بھی کرواتے ہیں۔ عالم شاہ نے یہ مشقیں بدرو پہلوان کے اکھاڑے میں کی تھیں۔ بدرو کا وہ تربیتی اکھاڑا اس کی اور معاذ کی دوستی کا نقطۂ آغاز تھا۔ مختصر عرصے میں وہ بہترین دوست بنے تھے اور بہت جلد ہی معاذ اس سے جدا

بھی کر دیا گیا تھا۔ معاذ کہاں تھا، وہ نہیں جانتا تھا لیکن یہ حالات کا عجیب الٹ پھیر تھا کہ اس وقت وہ معاذ کے ایک دشمن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ معاذ کے ساتھ گزارے اچھے وقت کے بارے میں سوچتے ہوئے بالآخر سولی پر بھی آجانے والی نیند اس پر مہربان ہوگئی۔ وہ کتنی دیر سویا رہا، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہاں رات جیسی تاریکی نہیں تھی اور بہت معمولی سی ہی سہی، روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی کا کچھ حصہ دروازے کے چوکور خلا میں سے اندر آرہا تھا اور کچھ اس تنگ راستے کی طرف سے جس کے دوسری طرف وہ غلیظ باتھ روم موجود تھا جس کی ایک جھلک نے ہی اس کی طبیعت مکدر کردی تھی۔ گھپ اندھیرے کے مقابلے میں یہ روشنی امید کا پیغام تھی۔ اس روشنی نے ایک آس سی جگائی تھی کہ اس قید خانے سے فرار کا کوئی راستہ مل سکتا ہے۔

''صبح بخیر سائیں۔'' اسے آنکھ کھولتے دیکھ کر سرمد بولا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ سرمد اب بھی زخمی قیدی کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ اس نے ایک پل کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپکائی ہے۔ وہ چھوٹی سی ٹارچ جو عالم شاہ نے جلتی ہوئی حالت میں دیوار سے ٹکا کر رکھ دی تھی، اب سرمد کے قریب بجھی ہوئی رکھی تھی۔ یقیناً قدرتی روشنی اندر آنے کے بعد اس نے ٹارچ کو بجھا دیا تھا کہ اس کی توانائی محفوظ رہے۔ دوبارہ ان کے ساتھ ایسی کوئی مہربانی کی جاتی یا نہیں، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔

''اس کی حالت اب کیسی ہے؟'' عالم شاہ نے سوئے ہوئے قیدی کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

''رات کے مقابلے میں بہتر ہے۔ بخار خاصا کم ہوا ہے اور اس وقت معمولی سی حرارت ہی باقی ہے۔ تکلیف میں بھی شاید کمی آئی ہے اسی لیے پہلے کی طرح مسلسل کراہ نہیں رہا اور سانس بھی خاصی ہموار ہے۔'' سرمد نے اسے اس شخص کی حالت کے بارے میں آگاہ کیا۔ روشنی اب بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ اس شخص کو واضح طور پر دیکھ سکتے لیکن اتنا اندازہ بہرحال ہو رہا تھا کہ وہ کافی دنوں سے اس قید خانے میں موجود ہے۔ اس کے جسم پر میل کی تہ چڑھی ہوئی تھی، سر کے بال بری طرح الجھے ہوئے اور چیکٹ تھے اور داڑھی مونچھیں بھی کسی خودرو جنگل کی طرح بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم سے ایک عجیب سی ناگوار بو بھی پھوٹ رہی تھی جو یقیناً اس قید خانے میں قیام کا تحفہ تھی۔

''باہر والوں میں سے کوئی دوبارہ یہاں نہیں آیا؟''

عالم شاہ نے سرمد سے ایک دوسرا سوال کیا۔

”نہیں، کوئی نہیں آیا۔ میں نے ہی ذرا چل پھر کر جائزہ لیا ہے۔ سیڑھیوں والا راستہ شاید اس وقت کھلا ہوا ہے اور وہیں سے روشنی یہاں بھی آرہی ہے۔ باتھ روم والی گیلری میں بھی اوپر چھت پر چھوٹا سا ایک خلا ہے جس پر لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی ہے۔ وہ خلا اتنا اونچا ہے کہ بغیر کسی اونچی چیز پر چڑھے وہاں تک ہاتھ نہیں جاسکتا۔ ہاتھ چلا بھی جائے اور آدمی کسی طرح لوہے کے جال کو توڑ بھی دے تو خلا اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں سے زیادہ سے زیادہ بلی ہی گزر سکتی ہے۔ کسی آدمی کے لیے اس خلا میں سے گزرنا ممکن نہیں ہے۔“ سرمد کی دی اطلاعات حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ عالم شاہ اس پر کوئی تبصرہ کرتا اس سے قبل ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور چوکھٹے میں سے ایک تھیلی اندر لٹکائی گئی۔ ساتھ ہی پکارا گیا۔

”جہنم کا اسپیشل ناشتا لے لو۔“ ان دونوں کی بھوک پیاس اڑی ہوئی تھی لیکن زخمی شخص کا خیال آنے پر عالم شاہ نے سرمد کو اشارہ کیا کہ ناشتا لے لے۔

”کل والی بوتل واپس کردو تو میں تمہیں پانی کی دوسری بوتل دے دیتا ہوں۔“ سرمد نے لٹکائی گئی تھیلی تھامی تو ایک اور صدا پانی کی گئی۔ سرمد نے خاموشی سے بوتل اسے لے جاکر واپس کردی۔ جواب میں اسے رات جیسی ہی پانی کی بوتل تھما دی گئی۔

”خیال رکھنا یہ پانی تم تینوں کے لیے ہے اور اب کل صبح ہی دوبارہ پانی ملے گا۔“

”یہ پانی تم کسی اسپیشل پلانٹ سے لاتے ہو؟“ شفاف بوتل میں موجود گدلا پانی ہی دل جلانے کو بہت تھا اس پر سے خصوصی ہدایت بھی دی گئی تو سرمد سے برداشت نہیں ہوا اور زبان سے طنز پھسل گیا۔

”جہنم کے اسپیشل پلانٹ سے۔“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ رات سرمد کی زبان سے نکلنے والے جہنم کے لفظ کو اس شخص نے پکڑ لیا تھا اور ہر موقع پر اسی لفظ کو استعمال کررہا تھا۔

”باذل سے کہو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ شخص واپس پلٹ جاتا اس سے قبل عالم شاہ نے اس سے بلند آواز میں مطالبہ کیا۔

”ان سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں صرف وہ کہتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے تم لوگوں کو یاد کیا تو ملاقات ہوجائے گی۔“ اس کے مطالبے کو خاطر میں نہ لاکر صاف جواب دیا گیا۔

”اسے میرا پیغام پہنچاؤ۔ میں اس گندی اور بدبودار جگہ پر نہیں رہ سکتا۔ اس سے کہو وہ جو چاہتا ہے فوراً بتادے۔ روپیا، پیسا، تشدد یا جان لینا، جو بھی اس کا مقصد ہے وہ پورا کرلے۔“ اس کا انکار سننے کے باوجود عالم شاہ نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”یہ جہنم ہے شاہ جی! جہنم میں کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا لیکن اپنے کرتوتوں کے سبب پہنچا دیا جاتا ہے۔ آپ نے بھی جو کچھ کیا ہے اس کو بھگتنے کے لیے یہاں رہنا تو پڑے گا۔ یہاں رہ کر سزا کیا ملتی ہے اس کا فیصلہ داروغہ جہنم باذل صاحب کریں گے۔“ وہ شخص ایسے انداز میں گفتگو کرتا تھا جیسے دوسرے کی بے بسی سے لطف اٹھا رہا ہو۔ عالم شاہ کو احساس ہوگیا کہ اس سے بات کرنا بے کار ہے، سو خاموشی اختیار کرلی۔ انہیں خاموش پاکر وہ شخص بھی واپس پلٹ گیا۔

رات سے یہی شخص تھا جو مسلسل ان سے ملاقات کے لیے آرہا تھا یعنی ان پر اس کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ چلا گیا تو سرمد نے تھیلی کھول کر اندر کا جائزہ لیا۔ پلاسٹک کی اس تھیلی میں کل تین عدد رسک موجود تھے یعنی فی بندہ ایک رسک۔ یہ رسک دیکھنے میں ہی باسی اور سیلن زدہ تھے۔ ان لوگوں کا پہلے ہی کچھ کھانے پینے کا ارادہ نہیں تھا، اس اسپیشل ناشتے کو دیکھ کر تو مستقبل کی بھوک بھی اڑ گئی لیکن بہرحال وہاں موجود تیسرے شخص کو تو اس ناشتے کی ضرورت تھی جو پتا نہیں کتنے عرصے سے ناشتے میں ایک رسک کھا کر جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس شاہی ناشتے کے بعد دوپہر اور رات کے کھانے میں کچھ دیا جاتا تھا یا نہیں۔ جس طرح اس شخص کی کھال ہڈیوں سے لگی ہوئی تھی اور پیٹ، پیٹھ ایک ہورہے تھے اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ مسلسل فاقہ کشی سے گزر رہا ہے۔

”یہ ناشتا اس بے چارے کو کروا دو سرمد۔ جیسی بھی ہے یہ غذا ہے اور اسے غذا کی ضرورت ہے۔“ عالم شاہ نے بھی رسک دیکھ لیے تھے چنانچہ سرمد کو مشورہ دیا۔ اس اجنبی کی حالت اتنی قابل رحم تھی کہ اگر وہ شدید بھوکا بھی ہوتا تو اپنے حصے کی خوراک اسے دے دیتا اور اس وقت تو سرے سے خواہش ہی نہیں تھی۔ خواہش نہ ہونے کے پیچھے ایک سبب وہ گندا باتھ روم بھی تھا جسے استعمال کرنے کے خیال سے ہی دم الٹنے لگتا تھا اس لیے معدے پر کوئی بوجھ نہ ڈالنا ہی مناسب تھا۔

سرمد پانی کی بوتل اور رسک لے کر اس شخص کے

قریب چلا گیا اور دھیرے دھیرے اس کے گال تھپتھپا کر اسے نیند سے جگانے لگا۔ ذرا سی کوشش کے نتیجے میں وہ جاگ گیا اور کچھ دیر اجنبی اور خوف زدہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا لیکن جب ان کے حلیوں پر توجہ دی اور انہیں بھی اپنے جیسی ''ڈریسنگ'' میں پایا تو آنکھوں سے خوف غائب ہو گیا۔

''آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیسے آئے؟'' حلیہ جو بھی تھا ان دونوں کے بشروں سے بہر حال ان کی حیثیت جھلک رہی تھی چنانچہ سوال کرتے ہوئے اس شخص کا انداز مؤدبانہ تھا۔

''ہم کون ہیں اور تم کون ہو، یہ تعارف بعد میں آرام سے ہوتا رہے گا۔ پہلے تھوڑا سا کچھ کھا پی لو تاکہ تمہارے جسم میں ذرا جان آئے۔ پوری رات تم بخار سے تپتے رہے ہو۔ بیماری کو شکست دینے کے لیے غذا ضروری ہے۔'' سرمد نے اس کا سوال ٹال کر اسے ناشتے کی طرف متوجہ کیا اور رسک والی تھیلی کھول کر اس کے سامنے کی۔

''پورے تین رسک....'' وہ تھیلی میں موجود رسک کی تعداد کو دیکھ کر قدرے حیران اور خوش ہوا لیکن پھر شاید اس کی سمجھ میں بات آ گئی اور بولا۔

''ان میں سے ایک ایک آپ لوگوں کے لیے بھی ہوگا۔''

''یہ تینوں تمہارے ہیں۔ تم انہیں کھا لو۔'' اس بار عالم شاہ نے گفتگو میں حصہ لیا اور نرمی سے اس سے بولا۔

''آج آپ کا پہلا دن ہے نا اس لیے مجھ سے ہمدردی جتا رہے ہیں۔ کچھ دن یہاں رکنا پڑ گیا تو خوراک کے ایک ایک ذرے کے لیے لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں گے۔'' اس کے لہجے میں کرب، حسرت، بے چارگی اور نہ جانے مزید کون کون سے جذبے تڑپ رہے تھے جو ان دونوں نے اپنا دل گداز ہوتا ہوا محسوس کیا۔

''جب وہ وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو تم یہ کھا لو۔'' سرمد نے اسے سہارا دے کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور اپنے ہاتھ سے اسے رسک کھلانے لگا۔ سوکھے رسک حلق سے نیچے اتارنے کے لیے بیچ بیچ میں پانی کے گھونٹ بھی پلانے پڑ رہے تھے۔ دو رسک کھانے کے بعد اس نے مزید کھانے سے انکار کر دیا۔

''کیوں دوست اور کیوں نہیں کھا رہے؟'' سرمد نے اسے ٹوکا۔

''طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے اور بھوک کے باوجود

کلام: فنا نظامی کانپوری

ڈوبنے والے کی میت پر لاکھوں رونے والے ہیں
پھوٹ پھوٹ کر جو روتے ہیں وہی ڈبونے والے ہیں

کس کس کو تم بھول گئے ہو غور سے دیکھو بادہ کشو
شیش محل کے رہنے والے پتھر ڈھونے والے ہیں

سونے کا یہ وقت نہیں ہے جاگ بھی جاؤ بے خبرو
ورنہ ہم تو تم سے زیادہ چین سے سونے والے ہیں

آج سنا کر اپنا فسانہ ہم یہ کریں گے اندازہ
کتنے دوست ہیں ہنسنے والے کتنے رونے والے ہیں

میں بھی انہیں پہچان رہا ہوں غور سے دیکھو بادہ کشو
شاید شیخ حرم بیٹھے ہیں وہ جو کونے والے ہیں

☆☆☆

اہل دیر و حرم رہ گئے
تیرے دیوانے کم رہ گئے

مٹ گئے منزلوں کے نشاں
صرف نقش قدم رہ گئے

ہم نے ہر شے سنواری مگر
ان کی زلفوں کے خم رہ گئے

بے تکلف وہ اوروں سے تھے
ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے

رند جنت میں جا بھی چکے
واعظ محترم رہ گئے

دیکھ کر تیری تصویر کو
آئینہ بن کے ہم رہ گئے

اے فنا تیری تقدیر میں
ساری دنیا کے غم رہ گئے

مزید ضائع نہیں ہوسکتی۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور بیٹھے بیٹھے ہی آنکھیں موند لیں۔

"نہیں بخار دوبارہ تو تیز نہیں ہونے لگا۔ میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں کہ دوبارہ تمہارے لیے کوئی دوا منگوا سکوں۔" سرمد نے اس کا ماتھا چھوا۔ کم ہو جانے والا بخار واقعی ایک بار پھر تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"رہنے دو بھائی۔ یہ لوگ انسان نہیں، درندے ہیں۔ ان کی قید میں جینے سے بہتر ہے کہ آدمی مر ہی جائے۔ رات آپ لوگ یہاں نہ آتے تو شاید موت مجھ پر مہربان ہو ہی جاتی۔ مجھے اب یاد آرہا ہے کہ رات میری غشی کے دوران کوئی میری دیکھ بھال کرتا رہا ہے۔ وہ یقیناً آپ لوگ ہی تھے۔ آپ کی اس مہربانی کے لیے شکریہ لیکن مجھے خود اب جینے کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ لوگ قطرہ قطرہ کر کے میرے بدن سے زندگی کو نچوڑ چکے ہیں اور اب کسی بھی لمحے میری زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں شدید تھکان اور تکلیف تھی۔

"تم کون ہو اور یہ لوگ تمہیں کس جرم میں قید کر کے اذیتیں پہنچا رہے ہیں؟" وہ سوال جو موقوف کر دیا گیا تھا، عالم شاہ کی زبان پر چلا آیا۔

"میں کون ہوں اس سے شاید کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ درندے بلکہ درندے سے بھی بدتر ہیں کیونکہ درندہ تو پھر بھی ضرورتاً شکار کرتا ہے لیکن یہ لوگ اپنی اذیت پسندی کی حس کو تسکین پہنچانے کے لیے لوگوں کو شکار کرتے ہیں۔ درندہ اپنے شکار کو تڑپاتا نہیں بلکہ ایک جھٹکے میں ہلاک کر دیتا ہے لیکن یہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ان کا شکار ہلاک نہ ہونے پائے اور یہ آخری لمحے تک اس کے تڑپنے کا لطف اٹھا سکیں۔ میں شاید پندرہ دن سے یہاں ہوں اور اپنے سامنے یہاں ایک بندے کو اس طرح مرتا ہوا دیکھ چکا ہوں کہ وہ روزانہ خود اپنے منہ سے اللہ سے اپنے لیے موت مانگا کرتا تھا۔ ان لوگوں نے اسے قسطوں میں مارا تھا۔ ناک، کان، زبان، انگلیاں ہر روز اس کے جسم سے ایک عضو کاٹ کر پھینک دیا جاتا تھا اور اس کے زخم کی ایسی ہی مرہم پٹی کر دی جاتی تھی جیسی آپ نے میرے ہاتھوں پر دیکھی ہوگی۔ جب تک وہ بے چارہ زندہ تھا، مجھے بھوک، پیاس اور گندگی کی اذیت کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں برداشت کرنا پڑتی تھی۔ اس کے مرتے ہی مجھے مشق ستم بنانا شروع کر دیا گیا۔ وہ جو عجیب سی شخصیت والا ان کا سربراہ ہے، اس نے کئی بار میری پیٹھ پر خنجر سے کٹ لگا کر ان میں نمک مرچیں بھروانے کے بعد دیر تک بیٹھ کر میرے تڑپنے کا نظارہ کیا ہے۔ وہ شخص ذہنی مریض ہے جو لوگوں کو کسی اور وجہ سے نہیں صرف اس لیے تکلیف دیتا ہے کہ تشدد کے نئے نئے طریقوں کا تجربہ کر سکے۔ اپنے اس شوق کی تسکین کے لیے وہ انسانوں کو ایسے شکار کرتا ہے جیسے سائنس دان اپنے تجربات کے لیے چوہوں سے کام لیتے ہیں۔ میرے سامنے جو شخص یہاں مرا تھا وہ ایک پیشہ ور بھکاری تھا اور یہ لوگ اسے لالچ دے کر گھیر لائے تھے۔ وہ مجھ سے صرف ایک دن پہلے یہاں لایا گیا تھا جبکہ میں اپنی قسمت کی خرابی سے پھنس گیا۔ میں پینٹنگ وغیرہ کا کام کرتا ہوں اور روزگار کی تلاش میں دوسرے شہر سے آیا تھا۔ اس پروجیکٹ میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا تو میں بہت خوش ہوا کہ چلو ایک بڑا کام مل گیا ہے جس سے اچھے خاصے عرصے تک مجھے روزی اور روزی لگتی رہے گی۔ کام ٹھیک چل رہا تھا۔ تھوڑی بہت ناجائز کٹوتیوں کے بعد تنخواہ بھی مل ہی جاتی تھی۔ پندرہ دن پہلے اعلان کیا گیا کہ کچھ مسائل کی وجہ سے فی الحال کام بند کیا جا رہا ہے اس لیے سب مزدوروں کی چھٹی ہے جو جہاں چاہے کام کر سکتا ہے۔ یہاں جب دوبارہ کام شروع ہوگا تو دوبارہ بھرتی کر لی جائے گی۔ میں یہاں کام کرنے والے ان چند لوگوں میں سے ہوں جو شروع سے ہی کام کر رہے تھے اور دوسرے شہر سے آنے کی وجہ سے مجھے یہاں رہنے کی اجازت تھی۔ میں اور میرے تین چار ساتھی ایک ادھورے تعمیر شدہ گھر کے اندر ٹھکانا بنا کر رہ رہے تھے۔ کام رکنے کا اعلان ہوا تو ہمیں بھی یہاں سے بوریا بستر گول کر لینے کا حکم دے دیا گیا۔

"میرے ساتھی تو حکم ملتے ہی روانہ ہو گئے کہ چند دن ... جا کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزاریں گے لیکن میں اپنے گھر اس لیے نہیں گیا کہ میں کہیں اور کام تلاش کر کے تھوڑے پیسے مزید جوڑ لوں تو پھر گھر جاؤں گا۔ اصل میں اگلے مہینے میری بہن کی شادی ہونے والی ہے اس لیے میں زیادہ سے زیادہ پیسے جوڑنے کے چکر میں لگا رہتا تھا۔ اسی چکر میں، میں نے حکم کے باوجود یہ جگہ نہیں چھوڑی کہ پہلے کہیں اور کام تلاش کر لوں تو وہاں چلا جاؤں گا۔ فوراً یہاں سے نکل کر کمرا وغیرہ کرائے پر لینے کے چکر میں رقم لگتی جو میں خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کی بات ہے، میں چھپ کر رہ لوں گا تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ پتا بھی چلا تو چوکیدار وغیرہ ہی کو پتا چلے گا اور یہاں

کے چوکیداروں سے میری اتنے عرصے میں اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔ وہ مجھے بلا اجازت یہاں رہنے پر کچھ بھی لیتے تو رعایت کر دیتے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ ذرا سی بچت کی خواہش مجھے تباہی کے گڑھے میں گرانے جا رہی ہے۔ میں نے کوشش کر کے ایک دوسرے پروجیکٹ میں اپنے لیے کام تلاش کر لیا تھا اور رہائش کی بات بھی کر لی تھی۔ بس ایک رات گزار کر اگلی صبح مجھے یہاں سے چلے جانا تھا کہ سب کچھ تباہ ہوگیا۔ میں پیچھے سے باؤنڈری پھلانگ کر اندر آنے کے بعد اپنے ٹھکانے پر سو رہا تھا کہ مجھے لگا کوئی شخص بلبلا کر چیخ رہا ہے۔ آواز بہت بلند نہیں تھی اور گھٹی گھٹی سی مجھ تک آ رہی تھی لیکن میں چونک گیا کہ یہاں اس طرح کون چیخ رہا ہے۔ تجسس نے مجھے اپنی جگہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ باہر نکلتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ آوازیں اس مکان کی طرف سے آ رہی ہیں جو مکمل تعمیر شدہ ہونے کے باوجود برائے فروخت نہیں تھا اور جس کے نیچے تہ خانہ بھی بنایا گیا تھا۔ آپ لوگوں نے شاید باتھ روم والی گیلری کی چھت پر لگی جالی دیکھی ہوگی۔ آوازیں وہیں سے باہر آ رہی تھیں۔ میں یہ دیکھنے کے لیے کہ کون آدمی ہے جو تہ خانے کے اندر تکلیف سے چیخ رہا ہے، مکان کے اندر چلا گیا۔ مجھے تہ خانے تک کا راستہ معلوم تھا اس لیے میں نے کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ نہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرنے جا رہا ہوں۔ مکان میں داخل ہوتے ہی میں پھنس گیا اور ایسا پھنسا کہ لگتا ہے اب بس میری روح ہی یہاں سے نکل سکے گی۔ جسم کو تو ویسے بھی یہ لوگ مکمل تباہ کر چکے ہیں۔ اس ناکارہ وجود کے ساتھ باہر جا کر میں کروں گا بھی کیا۔"

اس طویل تفصیل کے دوران وہ کئی بار سانس لینے کے لیے رکا تھا۔ ایک بار سرمد نے اسے تھوڑا سا پانی بھی پلایا تھا لیکن دخل دونوں میں سے کسی نے نہیں دیا تھا کہ کہیں اس کا تسلسل نہ ٹوٹ جائے۔ وہ کچھ حیران سے یہ سب سنتے رہے تھے۔ باذل کے بارے میں کوئی اچھی بات تو پہلے بھی انہیں نہیں معلوم تھی لیکن یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی تفریح طبع کے لیے اس طرح بے قصور اور غیر متعلق لوگوں کو بھی نشانہ بناتا ہوگا۔

"مایوس مت ہو دوست! اللہ نے چاہا تو یہاں سے نکلنے کا انتظام بھی ہو جائے گا اور تمہارا بہترین علاج معالجہ بھی ہو سکے گا۔ بہن کی شادی کے لیے بھی تم فکرمند نہ ہو، ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر خود تمہاری بہن کو عزت اور شان سے رخصت کریں گے۔" اس شخص کی بے کسی اور زندگی سے مایوسی نے عالم شاہ کے دل کو شدید تکلیف پہنچائی تھی اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے الفاظ سے اس کے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔

"یہاں سے نکلنا دیوانے کا خواب ہے۔ شروع میں، میں بھی یہ خواب دیکھتا تھا لیکن اب اس خواب سے دستبردار ہو چکا ہوں۔" اس نے حسرت سے اپنے پنجوں میں لپٹے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔

"تمہارے ہاتھوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم نے زخم دیکھے ہیں۔ انگلیاں بے شک غائب ہیں لیکن انہیں دیکھ کر یہ نہیں لگ رہا کہ انہیں کاٹا گیا ہے۔ کچھ عجیب نوعیت کے زخم ہیں۔" وہ جن مایوس کن حالات سے گزر رہا تھا اس کے لیے یقیناً کوئی اچھی امید قائم کرنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے عالم شاہ نے مزید ایسی کوشش نہیں کی اور اس سے اس کے زخموں کے بارے میں پوچھا۔

"میری انگلیاں کاٹی نہیں گئیں بلکہ گولیوں سے اڑائی گئی ہیں۔" اس نے انکشاف کیا۔

"گولیوں سے...؟" وہ لوگ ہکا بکا حیران رہ گئے۔

"میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ یہ لوگ تشدد کے نئے تجربوں کے لیے انسانوں کو پکڑتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی انہوں نے کیا کیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے میری گردن اور سر کو ایک طوق میں جکڑ دیا تھا تاکہ میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکوں۔ میرے ہاتھوں کو دونوں جانب صلیب کی طرح پھیلا کر کلائیاں دیوار میں لگے کلیپس میں قید کر دی گئی تھیں اور پانچوں انگلیوں کو خوب پھیلا کر ہر دو انگلیوں کے درمیان اس طرح میخیں ٹھونک کر گیپ بنا دیا گیا تھا کہ میں چاہوں بھی تو انگلیوں کو سکیڑ کر آپس میں قریب نہ کر سکوں۔ میرے ساتھ یہ سب کرنے کے بعد مجھے بتایا گیا تھا کہ باس اپنے نشانے بازی کی مہارت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اس ظالم نے اپنی مہارت کا ثبوت اس طرح دیا تھا کہ میری ایک ایک انگلی میں الگ الگ گولی ماری تھی۔ میں کتنا چیخا تھا اور کتنی انگلیاں اڑنے تک ہوش میں رہ سکا تھا، مجھے یاد نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ تین دن سے میں اتنی شدید تکلیف میں ہوں کہ ہر سانس کے ساتھ خود ہی اپنے مرنے کی دعا کرتا ہوں۔ موت کے علاوہ مجھے اس تکلیف سے نجات کا کوئی ذریعہ نظر ہی نہیں آتا۔" اس کی ویران آنکھوں سے نکل کر خشک جلد والے سانولے رخساروں پر بہتے آنسو ہی کسی انسان کے دل کو لرزا دینے کے لیے کافی تھے۔ ان آنسوؤں کے پیچھے موجود دردناک کہانی نے تو ایسا تڑپایا کہ عالم شاہ نے اپنے دل میں دھواں

ہوا محسوس ہوا اور شدت سے یہ خواہش ابھری کہ کسی طرح بازل ہاتھ لگ جائے تو اس کا ایک ایک ریشہ ادھیڑ کر اس سے ان مظالم کا حساب لیا جائے لیکن ابھی تو ظلم کی داستان بھی پوری سننا باقی تھی سو اس سے ایک سوال اور کیا۔

''تمہارا خون روکنے اور زخموں کا منہ بند کرنے کے لیے انہوں نے کیا کاری گری دکھائی ہے؟''

''اندر راکھ بھر کر ساتھ ہی گرم پگھلا ہوا موم ڈالا گیا ہے جس نے زخموں کو خاصی حد تک بند کر دیا ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی خون رسنے لگتا ہے۔'' اس کے جواب نے تصدیق کر دی کہ وہ جو اس کی پٹی تبدیل کرتے وقت انہوں نے موم جیسا مادہ محسوس کیا تھا، وہ سچ مچ موم ہی تھا۔ ایک انسان کے ساتھ اس قدر انسانیت سوز سلوک نے ان کی زبانوں کو ہی گنگ کر دیا اور مزید کوئی سوال کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

''آپ لوگ یہاں کیسے آ پھنسے؟'' ان کے سوالات ختم ہو گئے تو اس نے ان سے سوال کیا۔

''شامتِ اعمال سے۔ اپنی طرف سے تو ہم یہاں پناہ لینے آئے تھے لیکن الٹا اس مصیبت میں پھنس گئے۔'' عالم شاہ نے زیادہ تفصیل میں جائے بغیر مختصر جواب دیا۔

''اللہ آپ لوگوں کو اس مشکل سے نکالے۔ میری مشکل تو یوں بھی لگتا ہے کہ اب آسان ہونے والی ہے۔'' اس نے بھی زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی اور بجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بخار تیز ہوتا جا رہا ہے۔'' سرمد نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی حالت کا اندازہ لگایا، ساتھ ہی اسے چھو کر بھی دیکھا۔ بخار واقعی تیز ہو چکا تھا۔

''میں تمہارے لیے دوا منگوانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کے خلا سے منہ لگا کر پہرے دار کو پکارنے لگا۔ وقفے وقفے سے کافی دیر تک پکارنے کے باوجود کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔

''آپ زحمت نہیں کریں بھائی۔ وہ نہیں سنے گا۔ کوئی کوئی دن ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک بار بھی چکر نہیں لگاتا۔ میں نے یہاں ایک رسک اور تیس ایم ایل ((30ml) پانی کے ساتھ چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ وقت گزارا ہے۔ اس وقت بھی میں ستائیس اٹھائیس گھنٹے سے زیادہ کا بھوکا پیاسا تھا۔ میرے ہاتھوں کو ناکارہ بنا دینے والوں کو شاید مجھے اپنے ہاتھ سے کھلانے پلانے کی ڈیوٹی انجام دینا گوارا نہیں۔'' وہ مسلسل باتیں تو کر رہا تھا لیکن بولنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جو طبیعت میں سنبھلاؤ آیا تھا، وہ ایک بار پھر بگاڑ کی طرف جا رہا ہے۔

''تھوڑی دیر بعد دوبارہ پکار کر دیکھوں گا۔'' مایوس سا سرمد واپس اپنی جگہ آ بیٹھا۔

''کیا میں اپنے ہمدردوں کے نام جان سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ میرا نام عالم شاہ ہے اور میرے ساتھی کا نام سرمد ہے۔ ہم بنیادی طور پر گاؤں کے رہائشی ہیں لیکن کاروبار کی وجہ سے یہاں شہر میں زیادہ وقت گزرتا ہے۔'' سوال کرتے وقت وہ عالم شاہ کی طرف متوجہ تھا اس لیے جواب دینے کی ذمے داری بھی اسی نے نبھائی۔ ویسے بھی یہ عجیب بات تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اتنا سارا وقت گزار چکے تھے لیکن ابھی تک باقاعدہ ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہو سکے تھے۔

''میں نقیب لاشاری ہوں۔'' اس نے بھی اپنا نام بتایا۔

''میں نے اخبارات اور رسائل میں کبھی کبھی اس نام کے ایک شاعر کا کلام پڑھا ہے۔'' سرمد کو اس کا نام سن کر یاد آیا۔

''وہ نقیب لاشاری میں ہی ہوں۔ والد کی وفات کے بعد معاشی مسائل نے محنت مزدوری میں الجھا دیا اس لیے میٹرک کے بعد مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ شاعری کی طرف قدرتی میلان تھا اس لیے موقع ملنے پر کبھی کبھی کوئی نظم یا غزل وغیرہ لکھ کر مختلف اخبارات و رسائل میں بھیج دیتا تھا جو خوش قسمتی سے شائع بھی ہو جاتی تھیں۔ دل میں ایک خواہش سی تھی کہ کبھی زندگی میں موقع ملا تو اپنی شاعری پر مشتمل ایک کتاب چھپواؤں گا لیکن اب تو لگتا ہے کہ کتابِ زندگی کا ہی آخری باب پڑھا جا رہا ہے۔'' اس کی اداس آنکھیں اپنے پنجوں میں جکڑے ہاتھوں پر جا کر جم گئیں۔ ایک شاعر، ایک قلم کار سے وہ انگلیاں ہی چھین لی گئی تھیں جن سے وہ قلم تھاما کرتا ہے۔ اس سے بڑا بھلا کیا ظلم ہو سکتا تھا۔ عالم شاہ اور سرمد دونوں اپنی اپنی جگہ چپ بیٹھے رہ گئے۔ نقیب لاشاری بھی سرمد کے سہارے سے اپنی پہلے والی جگہ پر لیٹ گیا۔ خاموشی اور بیکاری میں وقت کی رفتار بہت سست ہو گئی تھی لیکن بہرحال وقت گزر رہا تھا اور اس گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نقیب کے بخار اور تکلیف کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سرمد نے دوبارہ بھی کئی بار آوازیں دے کر دیکھ لیا تھا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا تھا اور کسی نے اس کی پکار پر کان نہیں دھرے تھے۔ وہ ماتھے اور ہتھیلیوں پر پانی سے تر پٹیاں رکھ رکھ کر نقیب کا بخار کم کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن بغیر دوا کے یہ تدبیر بھی بے کار ہی تھی۔ اس کا بخار اس کے

زخموں میں ہو جانے والے انفیکشن کا شاخسانہ تھا اور حقیقتاً اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ نقیب کے ساتھ ساتھ وہ دونوں اپنی ذات کے لیے بھی فکرمند تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ان کی جسمانی ضروریات نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ بھوک اور پیاس کو اگرچہ وہ ابھی زیادہ خاطر میں نہیں لا رہے تھے لیکن دیگر فطری حوائج بھی تو تھے جن پر ایک حد سے زیادہ قابو نہیں رکھا جا سکتا تھا لیکن دوسری طرف اس غلیظ باتھ روم کو استعمال کرنے کا تصور بھی محال تھا۔ یہ فکریں بھی بار بار سرمد کو دروازے کے مختصر چوکھٹے سے منہ لگا کر پکارنے پر مجبور کر رہی تھیں لیکن پیاس سے خشک حلق میں خراشیں پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”یہ سب کیا ہے وکٹر؟“ میڈم ایکس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے اور وہ یوں وکٹر کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

”میں آپ کے سوال کا مقصد نہیں سمجھا میڈم! روشن ماتھر کی موت پر مجھے بھی افسوس ہے لیکن اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ جو کچھ ہوا اس میں میری کوئی کوتاہی شامل ہے تو آئی ایم سوری، میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ میرا کام معاذ کی ذہن سازی تھا اور معاذ نے اپنے حصے کا کام پوری خوبی سے کیا اس لیے میں خود کو سرخرو محسوس کرتا ہوں۔ عینی شاہدین کی گواہی معاذ کو ہر طرح سے کلیئر ظاہر کرتی ہے اور اصل معما صرف یہ ہے کہ روشن ماتھر نے جو کچھ کیا وہ کیوں کیا؟“ وکٹر کا انداز بُرا ماننے والا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو پروفیسر۔ جو کچھ ہوا اس میں بظاہر معاذ کا کوئی ہاتھ نظر نہیں آتا، اس کے ساتھ مشن میں شامل دونوں افراد نے تسلیم کیا ہے کہ ماتھر کو انہوں نے گولیاں ماری تھیں اور معاذ نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس مجھے معاذ کی طرف سے مطمئن نہیں ہونے دیتی۔ میں جانتی ہوں وہ غیر معمولی ہے اور کچھ بھی ایسا کر سکتا ہے جسے ہم پکڑ نہ سکیں۔ تم اس نکتے پر غور کرو کہ ہم نے اس سے دو کام لیے۔ دونوں کاموں میں اس کی کارکردگی میں کوئی جھول نظر نہیں آتا لیکن دونوں ہی میں ہمیں اپنے مقاصد حاصل نہیں ہو سکے۔“ وکٹر کے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا اور وہ دلیل سے اپنے شک کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے میڈم! پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ہم اپنی سو فیصد کارکردگی کے باوجود

مقررہ اہداف حاصل نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات اتفاقات بے داغ منصوبہ بندی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ معاذ کے معاملے میں بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ موجودہ واقعے میں ماتھر کی حرکت کو ہم اس تناظر میں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ وہ طویل عرصے سے قید میں رہ رہا تھا۔ میرے خیال سے ایک قیدی جو جاسوس ہو اس سے زیادہ کسی پر سختی نہیں برتی جاتی۔ انتہائی تشدد انسان کا ذہنی توازن بھی پلٹ دیتا ہے۔ ایک دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ قید کے دوران ماتھر کی برین واشنگ کی گئی ہو جس کے نتیجے میں اس کے لیے دوست دشمن اور دشمن دوست بن گئے ہوں۔'' معاذ کی کارکردگی پر شک وکٹر کی کارکردگی میں سقم نکالنے کے برابر تھا اس لیے وہ مسلسل معاذ کو درست ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں اپنی چھٹی حس کے دیے گئے سگنلز کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی اس لیے چاہتی ہوں کہ تم معاذ پر مزید کام کرو اور اس کے ذہن کو زیادہ سے زیادہ اپنے کنٹرول میں لے لو۔ اس کا دماغ اپنے کنٹرول میں مکمل طور پر لینے کے بعد ہی ہم اس سے اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔'' پروفیسر سے اتفاق کر لینے کے باوجود اس کی خوب صورت آنکھوں میں شک اور تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔

''او کے میڈم! میں جائزہ لیتا ہوں کہ اس سلسلے میں مزید کیا اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ کیا اب مجھے اجازت ہے؟'' پروفیسر کو اپنے علم اور مہارت پر ناز تھا اس لیے میڈم کی تشویش اسے تکلیف دے رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اب یہ بحث ختم کر دی جائے۔

''او کے۔ یو ے گو ناؤ۔'' میڈم نے اس کے مزید رکنے پر اصرار نہیں کیا لیکن خود ہنوز سوچ میں ڈوبی رہی۔ سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ میں موجود جام سے سنہری محلول بھی اپنے حلق میں انڈیلتی جا رہی تھی۔ سنہری سی عورت کے حلق سے نیچے اترنے والا وہ سنہرا محلول بھی معاذ کا معما حل کرنے میں اس کی معاونت نہیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

کنول شاہ نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔ اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی کھڑی تھی جس کی عمر ابھی پورے اکیس برس بھی نہیں ہوئی تھی اور اتنی سی عمر میں وہ ایک بیٹے کی ماں بننے کے ساتھ ساتھ بیوگی کی سفید چادر بھی اوڑھ چکی تھی۔ یہ گویا کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ پور پور سجا کر معظم شاہ کی بیوی کی حیثیت سے اس حویلی میں لائی گئی تھی۔

یہاں اس کے ناز اٹھائے گئے تھے۔ معظم نے ایک اچھے شوہر کی طرح اس کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی اور اب جب کہ وہ ماں بننے کا اعزاز حاصل کر کے خود کو مکمل تصور کر لینے کی منزل پر پہنچ چکی تھی، اس کی ہستی کو اتنا بڑا دھچکا لگ گیا تھا کہ وہ خود بھی کبھی کبھی اپنے آپ کو قابل رحم محسوس کرنے لگتی تھی۔ وہ فطرتاً نہایت بردبار، معاملہ فہم اور متین لڑکی تھی لیکن اکیس سال سے بھی کم عمر میں بیوہ ہو جانا اتنی معمولی بات نہیں ہوتی کہ اعدر کوئی دراڑ ہی نہ پڑے۔ وہ بھی ٹوٹی تھی لیکن اپنے پیاروں اور خصوصاً اس ننھی جان کے لیے خود کو سنبھال لیا تھا جو دنیا میں آنکھ کھولنے سے قبل ہی باپ کے سائے سے محروم ہو چکا تھا۔ اپنے چھوٹے سے بیٹے میں اس کی جان تھی اور ملازماؤں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود اسے سنبھالنے کو ترجیح دیتی تھی۔ اب بھی اس نے بڑے جتن کر کے اسے نہلانے اور فیڈ کروانے کے بعد سلا کر کاٹ میں لٹایا تھا اور یونہی بے خیالی میں آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ آئینہ اسے خود ترسی میں مبتلا کرنے لگا تو اس نے خود کو ٹوکا اور اس کے سامنے سے ہٹ کر باہر سے گزرتی ایک ملازمہ کو آواز دی۔

''حکم سائیں۔'' بھاگی نامی وہ ملازمہ فوراً خدمت میں حاضر ہوگئی۔

''دیکھو ذرا تھوڑی دیر کے لیے چھوٹے شاہ کے پاس بیٹھ جاؤ۔ ظہر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ اسے نہلانے کے چکر میں میرے کپڑوں پر چھینٹے آ گئے ہیں اس لیے میں غسل کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ملازمہ کو بلانے کا مقصد بتایا۔

''آپ نے چھوٹے شاہ سائیں کو خود کیوں نہلایا سائیں۔ مجھے حکم دیتیں اس خدمت کے لیے۔'' بھاگی نے اپنی نمک خواری کا اظہار کیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے بھاگی! مجھے معلوم ہے کہ تم سمیت یہاں سب بہت خدمت گزار ہیں لیکن مجھے اپنے بچے کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے سکون ملتا ہے۔'' کنول نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

''اللہ لمبی زندگی دے ہمارے چھوٹے شاہ جی کو اور اس کے دم سے سائیں قربان شاہ کا خاندان خوب پھولے پھلے۔ ہم تو نسلوں سے اس خاندان کے نمک خوار ہیں۔ آج اس حویلی میں دکھ اور ماتم کی فضا دیکھتے ہیں تو کلیجا کھنچنے لگتا ہے۔'' بچے کو دعا دیتے بھاگی نے اپنے جذبات کا بھی اظہار کیا۔

''جو نصیب میں لکھا تھا وہ ہو گیا۔ اب رب سائیں ہی سب کو صبر دے گا۔ بس اب تم باتیں بند کرو اور تھوڑی دیر کے لیے یہاں بیٹھ جاؤ۔'' بھاگی کے باتونی پن سے واقف کجل نے اسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ دینے کے لیے تحکمانہ انداز اختیار کیا تو بھاگی نے جھٹ اپنی زبان بند کر لی۔ اس کی موجودگی کے باعث بچے کی طرف سے مطمئن کجل نے کاٹ کی طرف ایک نظر ڈالی اور غسل خانے میں گھس گئی۔ اسے معلوم تھا کہ نہانے اور پیٹ بھر کر سونے کی وجہ سے بچہ طویل وقت تک نہیں جاگے گا اس لیے خوب اطمینان سے غسل کیا۔ غسل کے بعد وہ تولیے سے بال خشک کرتے ہوئے کمرے میں واپس آئی تو بھاگی اپنی جگہ پر موجود تھی۔

''آپ کے بال بہت خوب صورت ہیں سائیں۔''

بھاگی نے بے ساختہ ہی اس کے بالوں کی تعریف کی تو وہ ادا سے مسکرا دی۔ معظم شاہ بھی اس کے بالوں کی تعریف کرتا تھا بلکہ ہر وہ شخص جو اس کے بال دیکھتا تھا، تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ خود بھی اپنے بالوں کی خوب صورتی سے واقف تھی لیکن کبھی انہیں نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ الٹا اس کی خواہش ہوتی تھی کہ انہیں چھپا کر رکھے۔ ہر وقت سر ڈھانپے رکھنے کی عادت کی وجہ سے وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہتی تھی اس لیے کم ہی کسی کو اس کے بال دیکھ کر ان پر تبصرہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔

''تم ابھی کچھ دیر اور یہیں بیٹھی رہو بھاگی! میں نماز بھی ادا کر لوں تو پھر چلی جانا۔'' بال سکھانے اور پھر انہیں سنوارنے میں وقت لگتا اس لیے کجل نے یہ کام نماز کے بعد موقوف کر کے بھاگی کو کچھ دیر مزید وہاں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور خود نماز کے لیے چادر لپیٹنے لگی۔ خشوع و خضوع سے نماز ادا کرنے کے بعد وہ فارغ ہوئی تو بھاگی کی جان چھوٹی۔ بھاگی کے جانے کے بعد وہ ایک نظر بچے کو دیکھنے کے خیال سے اس کی کاٹ کی طرف بڑھی۔ یہ دیکھ کر اسے تھوڑا سا غصہ آیا کہ بچہ سر تک چادر میں ڈھکا ہوا سو رہا تھا حالانکہ اس نے سانس کی آمد و رفت کو تسلی بخش رکھنے کے لیے اس کا چہرہ کھلا رکھا تھا۔ بھاگی کو اس غیر ضروری کارکردگی پر تنبیہ کرنے کا سوچتے ہوئے اس نے پہلے کاٹ پر فکس نیٹ ایک طرف سے ہٹائی پھر بچے کے چہرے سے چادر ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہاں بچے کا چہرہ تھا ہی کہاں۔ وہاں تو بس سر کے نیچے رکھنے والا ایک گول تکیہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بے تابی سے پوری چادر ہی کھینچ لی۔ چادر کے نیچے سرے سے بچے کا وجود ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ دھیمی آواز میں بات کرنے

ہر دل عزیز

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کچھ لوگ دنیا میں بڑے کام کرنے کے لیے ہی آتے ہیں۔ محترم معراج رسول صاحب بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں ان کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا اور نہ ہی ان کے ہاتھوں لگے اس پودے کو جو آج ایک تناور درخت بن چکا ہے اور دنیا میں ڈائجسٹ کی تاریخ لکھتے ہوئے ماہنامہ سسپنس کو بھی نظر انداز کرنے کی جرأت نہ کی جا سکے گی۔ نصف صدی قبل جاری ہونے والے ماہنامہ سسپنس نے چند سو، ہزار یا لاکھ نہیں بلکہ کئی نسلوں کے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ ہمیں بھی ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق اپنے والدین سے منتقل ہوا اور سسپنس کے اسلوب نے کچھ اس طرح جکڑا کہ آج الیکٹرانک میڈیا کی یلغار میں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوٹ سکا۔ ابتدائی صفحات پر موجود تاریخی کہانیوں سے لے کر تحقیق، جرم و طبع زاد اور آخری صفحات کی خصوصی کہانیوں تک اس رسالے کی ہر تحریر شاندار اور شاہکار رہی۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جنہوں نے اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ کے قاری سے لکھاری بننے تک کا سفر طے کیا اور اپنی پہچان بنائی۔ اس سفر میں ادارے کی طرف سے دیا گیا مان اور عزت قابل تعریف ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں [illegible] کے پیچھے تو سو فیصد ان خواتین و حضرات کی کوششیں ہی اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ جاسوسی کے طویل سلسلے کردار سے لے کر سسپنس کے شیش محل اور اب شہ زور تک میں اپنے مدیران کے تعاون کی شکر گزار ہوں۔ ممکن ہے کہ ہماری تحریریں اپنے پیش روؤں جیسی متاثر کن نہ ہوں لیکن کیا یہ کم نہیں کہ ہم نے اس دور میں بھی قارئین کی ایک بڑی تعداد کو ڈائجسٹ سے باندھا ہوا ہے اور ہمارا پیارا سسپنس آج بھی اپنے پورے وقار سے شائع ہو رہا ہے۔ گولڈن جوبلی نمبر کے اعلان کے بعد سے قارئین کی طرف سے جس جوش و خروش اور اشتیاق کے مظاہرے دیکھنے کو ملے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ سسپنس آج بھی قارئین کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے اور اس نے پوری شان سے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ معراج صاحب کے ہاتھوں جاری ہونے والے اس خوبصورت رسالے کو جو اپنے منفرد اسلوب، اخلاقی اقدار اور معاشرتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ دیگر بے شمار خصوصیات کی بنا پر قارئین کے دلوں پر راج کرتا ہے، محترمہ عذرا رسول صاحبہ کے زیر سایہ دن دونی رات چوگنی ترقی دے کہ بس یہ ڈائجسٹ ہی ہیں جو آج بھی ایک عام قاری کی علمی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار کی تعمیر میں اپنا بہترین حصہ ڈال رہے ہیں۔

آخر میں محترمہ عذرا رسول صاحبہ، منتظمین، مدیران، مصنفین اور پیارے قارئین کو سسپنس کی گولڈن جوبلی کی دلی مبارک باد۔

اسما قادری

والی بیروبار زمل شاہ کی چیخوں نے قربان شاہ کی حویلی کے درو دیوار کو لرزا کر رکھ دیا۔ لمحوں میں بات پوری حویلی میں پھیل گئی۔ خاندان کا اکلوتا وارث دن دہاڑے حویلی کے ایک محفوظ کمرے سے غائب ہو گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بھاگی کی شامت سب سے پہلے آئی۔

"اللہ سائیں کی قسم، میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو چھوٹے شاہ سائیں کے قریب بھی نہیں گئی اور سائنو جہاں بٹھا کر گئی تھیں، وہیں بیٹھی رہی۔" بھاگی خاندانی ملازمہ تھی اور اس کا خاندان نسلوں سے حویلی سے اپنی وفاداری نبھا رہا تھا۔ اس پر شک کرنا آسان نہیں تھا لیکن یہاں درپیش مسئلہ بھی معمولی نہ تھا۔ قربان شاہ کا اکلوتا پوتا، معظم شاہ کی آخری نشانی اور زمل شاہ کے دل کا قرار چپ چپاتے غائب کر دیا گیا تھا۔ اس سانحے پر جتنی آفت مچتی کم تھی۔ زیرِ عتاب بھاگی کو بھی اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا پڑا۔

"میں چولہے پر ہانڈی رکھ کر آئی تھی۔ سائنو کے کمرے میں بیٹھے مجھے خیال آیا کہ ہانڈی جل نہ جائے۔ میں ہانڈی دیکھنے کے لیے بس پانچ دس منٹ کے لیے باہر گئی تھی اور پھر واپس آ گئی تھی۔" اس کا بیان کتنا سچا یا جھوٹا تھا یہ جانچنے کا فی الحال وقت نہیں تھا۔ اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور دوسرے زاویوں سے معاملے کی تحقیق ہونے لگی۔ اتنی دیر میں کون حویلی میں آیا، کون باہر گیا، ساری پوچھ تاچھ ہو گئی اور جو اہم بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ہفتے بھر سے ملازمہ سکھی سے ملنے کے لیے اس کے پاس آ کر ٹھہری ہوئی اس کی خالہ زاد بہن کریمہ اسی دوران اپنے سازوسامان سمیت اچانک ہی رخصت ہو گئی تھی۔ کریمہ کے بارے میں خاص بات یہ تھی کہ وہ لطیف سومرو کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ عام حالات میں یہ اتنی خاص بات نہیں تھی۔ حویلی کے ملازموں سمیت گاؤں کے بیشتر گھرانوں کے رشتے دار آس پاس کے گاؤں دیہاتوں میں رہتے تھے اور ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سکھی کا شمار ان ملازماؤں میں ہوتا تھا جو دن رات حویلی میں رہتی تھیں اور جن کی رہائش کے لیے پچھواڑے چھوٹے چھوٹے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ ایسے ملازمین کے رشتے داروں کا ملاقات کے لیے حویلی آنا ایک معمول تھا۔ کریمہ کی آمد کو بھی ایک معمول سمجھا گیا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی۔ سکھی کے علاوہ دیگر ملازماؤں سے بھی اس کی گاڑھی چھنتی تھی اور ساری حویلی میں بے تکلفی سے گھومتے پھرنے پر بھی کبھی کسی نے قدغن نہیں لگائی تھی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ اس نے اسی آزادی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ چھوٹے سے بچے کو سامان میں چھپا کر لے جانا مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ حویلی سے اچھو تانگے والے کے تانگے میں گئی تھی۔ اس کی تلاش میں بندے دوڑے تو اچھو گاؤں کی ہی ایک سواری کو لاتے ہوئے راستے میں مل گیا۔ اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کریمہ اس کے ساتھ اپنے گاؤں تک نہیں گئی تھی اور راستے میں ہی اتر گئی تھی جہاں سے وہ ایک موٹر کار میں بیٹھی تھی۔ موٹر کار کس کی تھی؟ یہ اچھو نہیں بتا سکا تھا، نہ وہ ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھے بندے کو جانتا تھا۔ اس بات پر اسے خود بھی حیرت تھی۔ جیسے وہ لوگ آس پاس کے دیہاتوں کے رہائشیوں کو جانتے تھے، ویسے ہی انہیں ان دیہاتوں کے بڑے زمینداروں کی گاڑیوں اور کارندوں سے بھی واقفیت تھی۔ کریمہ کو یوں ایک گاڑی میں بیٹھ کر جاتا دیکھ کر وہ کھٹکا بھی تھا لیکن دخل اندازی کی ہمت اس لیے نہیں کر سکا تھا کہ وہ لوگ مسلح تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ بات گاؤں کے کسی اہم آدمی کو بتائے گا لیکن پھر اسے سواری مل گئی۔ اس سواری کو بس اڈے تک چھوڑ کر اور وہاں سے دوسری سواری اٹھا کر... واپس گاؤں آ رہا تھا تب ہی اسے قربان شاہ کے ملازمین نے راستے میں روک لیا اور یہ ساری پوچھ گچھ کر ڈالی۔

اس تفتیش کے بعد وہ لوگ آندھی کی طرح کریمہ کے گھر تک پہنچے لیکن وہاں دروازے پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔ آس پڑوس والوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ کریمہ تو ہفتے بھر سے ہی اپنے شوہر اور بچوں سمیت غائب ہے۔ کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ بچہ کریمہ نے ہی اغوا کیا ہے اور یہ سب ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ ہفتے بھر سے حویلی میں ٹھہری وہ بچے ہی کی تاک میں تھی۔ جیسے ہی اسے موقع ملا وہ بچہ لے کر غائب ہو گئی۔ اس نے یہ سب کس کے حکم پر کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے کسی کو سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی لیکن براہ راست لطیف سومرو کی حویلی پہنچ کر اس سے بچے کا مطالبہ بھی نہیں جا سکتا تھا۔

تھانے تک بات پہنچی۔ صداقت شاہ کو فون کیا گیا اور عالم شاہ سے رابطے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ صداقت شاہ تو فوراً پہنچ گئے لیکن عالم شاہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا ذاتی موبائل نمبر بند جا رہا تھا اور کوٹھی پر ملازمین نے اس کی غیر موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ یہ اطلاع سارا دن ملتی رہی۔ بے حد پریشان قربان شاہ اور صداقت شاہ خود ہی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ تھانے میں پرچہ کرواتے ہوئے قربان شاہ نے پہلے

مرحبا
SINCE 1975
Honey
پھول پھول کا رس
مرحبا شہد میں گیا بس
MARHABA
NATURAL PRODUCTS
Pakistan Standards
PS # 1934, Lic #
Marhabalaboratoriespk | www.marhaba.com.pk | UAN: 111-152-152

ی آئیف سومرو پر شک ظاہر کردیا تھا۔ لطیف سومرو اس وقت ایم پی اے تھا اس لیے تھانے دار اس کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کررہا تھا لیکن دوسری طرف قربان شاہ اور صداقت شاہ کا بھی ایک اثر رسوخ تھا جس سے مجبور ہوکر وہ لطیف سومرو سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔

''ہاں بھئی تھانے دار! کیسے آنا ہوا؟ سنا ہے جہاں پولیس آئے وہاں سے خیر اٹھ جاتی ہے۔ یہاں سے کسی کو ہتھکڑی لگا کر لے جانے کا تو ارادہ نہیں۔'' سلام دعا کا مرحلہ طے ہوجانے کے بعد لطیف سومرو نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں سائیں! پولیس تو لوگوں کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے اور لوگوں کی خیر ہی چاہتی ہے بس کچھ کالی بھیڑوں نے ہمارے محکمے کو بدنام کیا ہوا ہے۔'' تھانے دار نے جھینپ کر اسے جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ صداقت شاہ کے دور میں ان کے ساتھ اچھے تعلقات کے باعث لطیف سومرو اس سے خار کھاتا ہے۔

''ہمیں کیا خبر ہمارے لیے کون کالی بھیڑ ثابت ہوسکتا ہے۔'' لطیف سومرو نے بظاہر سرسری لہجے میں بولتے ہوئے اس کے چہرے کو تولتی نظروں سے دیکھا تو تھانے دار کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ اسی وقت ایک ملازمہ لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''باتیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے کچھ کھانا پینا ہوجائے۔'' لطیف سومرو نے اپنا لہجہ یکدم بدل لیا اور نہایت خوش اخلاقی سے بولا۔ اس کے اشارے پر ملازمہ بڑھ چڑھ کر تھانے دار کی خاطر داری کرنے لگی۔

''سائیں شکیل سومرو کی حالت اب کیسی ہے؟ طبیعت میں کچھ بہتری آئی یا نہیں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ انہیں علاج کے لیے ملک سے باہر لے جانے والے ہیں۔'' یہ خاطر داری بھی عجیب شے ہے۔ آدمی کے حلق سے تر نوالہ نیچے اترتے ہی اس کا مزاج بدل جاتا ہے۔ تھانے دار جو پہلے محتاط تھا اب خوش اخلاق اور بے تکلف ہو چلا۔

''حالت تو ابھی ٹھیک نہیں ہے بابا! باہر کے ڈاکٹروں سے بات چیت چل رہی ہے جہاں سے زیادہ امید دلائی گئی وہاں بھیج دیں گے۔''

''کچھ پتہ چلا کہ اس حرکت کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟'' تھانے دار نے ایک دوسری حلق سے نیچے اتارتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

''ایک دن پتا لگ ہی جائے گا ہمیں بھی اور ان لوگوں کو بھی جو اس حرکت کے پیچھے ہیں۔'' لطیف سومرو کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔ تھانے دار کا تو گویا تا منہ ذرا سی دیر کے لیے ساکت ہوگیا۔ وہ جیسے لطیف سومرو کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر اسے ایک ہی بات سمجھ آئی کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر مناسب نہیں اس لیے چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ سجائی اور مونچھوں پر لگ جانے والی کریم کو انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

''آپ پہنچ والے لوگ ہیں سائیں! آپ کے لیے اپنے مجرم تک پہنچنا کیا مشکل ہے۔ گردن تو ہم جیسے چند ہزار کی نوکری کرنے والوں کی پھنسی رہتی ہے۔ ہر اختیار والا بندہ ہم کو اپنی لاٹھی سے ہانکنا چاہتا ہے۔ اب بھی سائیں صداقت شاہ اور سائیں قربان شاہ کے ہانکنے پر آپ کی حویلی کی طرف آ تو نکلا ہوں پر کچھ نہیں آتا کہ اپنے چھوٹے منہ سے وہ بڑی بات کیسے نکالوں جسے کرنے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہوں۔''

''جب آ ہی گئے ہو تو بات بھی نکال دو۔ مجھے خبر ہے کہ صداقت شاہ اتنے عرصے اقتدار کی کرسی پر بیٹھا ہے کہ اب کرسی چھن جانے پر بھی اسے یقین نہیں آتا اور پہلے ہی کی طرح حکم چلانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔'' تھانے دار موقع دیکھ کر لیکن ڈرتے ڈرتے ہی اپنے مدعے کی طرف آیا تھا لیکن خلاف توقع لطیف سومرو کا انداز دوستانہ تھا اس لیے اس کی ہمت بڑھ گئی اور وہ اصل بات زبان پر لے آیا۔

''سائیں قربان شاہ کی حویلی سے آج ان کے پوتے کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اغوا کا الزام حویلی کی ہی ایک ملازمہ سکھی کی خالہ زاد بہن کریمہ پر لگایا جارہا ہے۔'' تھانے دار نے بتانا شروع کیا تو پھر ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔ لطیف سومرو سنجیدگی سے سنتا رہا۔ جب بات یہاں تک پہنچی کہ اغوا کار عورت کریمہ کا تعلق لطیف سومرو کے گاؤں سے ہے تو سومرو گویا تھانے دار کی آمد کا مقصد سمجھ گیا اور بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ قربان شاہ اور صداقت شاہ سمجھتے ہیں کہ بچے کو میں نے اغوا کروایا ہے اور اب انہوں نے تمہیں تفتیش کے لیے یہاں بھیجا ہے؟''

وہ ہال نما کمرا تھا۔ سامنے کی طرف دو فٹ بلند اسٹیج تھا جس کے سامنے دس دس کرسیوں کی چار قطاریں تھیں۔ کرسیوں پر تمام مرد حضرات براجمان تھے۔ میں نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے اندازہ لگایا کہ حاضرین کی عمر تیس اور پچاس کے مابین تھی۔ میں خود بیالیس برس کا تھا۔

یہ اپنی نوعیت کا عجیب پرائیویٹ کلب تھا۔ کلب کی میٹنگ سال میں ایک مرتبہ منعقد کی جاتی تھی۔ کلب شادی شدہ افراد کے لیے مخصوص تھا۔ میرا دوست ماجد تین سال سے مجھے مدعو کرتا آرہا تھا لیکن میں ہچکچاہٹ کے ساتھ انکار کر دیتا تھا کیونکہ میں کلب کی سالانہ میٹنگ کی نوعیت سے آگاہ تھا اور ہچکچاہٹ اس لیے تھی کہ میں کلب کی ممبرشپ کے لیے نہ صرف موزوں تھا بلکہ کسی حد تک ہیجانی قسم کی

معاشرے کے سب سے مظلوم طبقے کی اذیتوں کا دلچسپ اظہار

پانی کو جب بہنے کا رستہ نہ ملے تو دھیرے دھیرے دلدل کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اسی طرح حبس زدہ موسم میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جس... انسان کے اندر گھٹن بڑھ جائے تو اسے وحشت کسی پل چین نہیں لینے دیتی... وہ بھی کچھ ایسی ہی وحشتوں کا شکار تھی... جسے دور کرنے کے لیے انہیں کسی خاص سمت کی تلاش تھی۔

مظلوم

امجد رئیس

دلچسپی کی رہتی تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے لفافہ نکال کر کاغذ برآمد کیا۔ یہ دعوت نامہ تھا۔ کاغذ پر کلب کا نام، میٹنگ کی تاریخ، وقت اور جگہ کے علاوہ کلب کے ممبرز کے نام بھی لکھے تھے۔ میں نیا ممبر تھا۔ میرا نام آخر میں تھا۔ کاغذ کے نچلے کونے میں عظیم پاشا کرمانی نام کے کسی آدمی کے دستخط تھے۔ مجھے نام کچھ عجیب سا لگا۔

میں نے ایک بار پھر حاضرین پر طائرانہ نظر ڈالی۔ سب ہی مرجھائے ہوئے اور ڈپریشن کا شکار نظر آئے۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ خود میں کون سا خوش تھا۔ ہم سب اپنی ہی بیگمات کے ہاتھوں مارے گئے شرفا تھے، تنگ تھے، بیزار تھے یا بزدل تھے۔

اسٹیج پر پاشا نامی آدمی ہی کھڑا تھا جس نے مختصر تقریر کے بعد خالد عمر کا تعارف کرایا۔ خالد میرا نام تھا۔ پاشا نے بتایا کہ ہمیشہ کی طرح علی الترتیب حروف تہجی کے حساب سے سب باری باری اسٹیج پر آئیں گے۔ اس نے اکرام بھائی کو آواز دی اور خود اسٹیج سے اتر گیا۔ شاید بھائی کا لفظ اکرام کے نام کا حصہ تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کا وزن زیادہ اور شانے ڈھلک رہے تھے۔ وہ گویا لڑکھڑاتا ہوا دوسری صف سے نکل کر آیا۔ اسٹیج کے قریب تھے پر پیر رکھ کر اوپر چلا گیا۔

وہ نروس تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے خودکشی کی ناکام کوشش کر چکا ہے اور دوبارہ کوشش کرے گا۔ اس کے عقب میں اسکرین روشن ہوئی اور خود اس کی عمر سے آدھی عمر کی خوش شکل عورت کی بڑی سی تصویر نظر آئی۔ میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ اپنی ہی غلطی کی سزا بھگت رہا ہے۔

”بہت پیسا ہے اس کے پاس؟“ میں نے اپنے برابر کی کرسی پر موجود راشد سے سوال کیا۔

”ظاہر ہے ورنہ نسرین اس کے قریب نہ پھٹکتی۔“ اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

”کون نسرین؟“

”یار! وہ اسکرین کی جل پری اس کی بیوی ہے۔“

میں نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔

”یہ سال میری زندگی کا بدترین سال ثابت ہوا ہے۔“ اکرام بھائی نے آغاز کیا۔ ”آپ سب نے دیکھ لیا ہے، وہ بہت خوبصورت ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ میں ایک خوش قسمت شوہر ہوں جبکہ ایسا نہیں ہے...... نہیں ہے...... نہیں ہے۔“ اس کی آواز بلند ہوگئی۔

”نسرین نے میرے ساتھ نہیں بلکہ شاپنگ سینٹرز کے ساتھ شادی کی ہے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدتی ہے۔ وہ خواب میں بھی شاپنگ کرتی ہے۔“ دھیرے دھیرے اکرام بھائی کے تاثرات میں غصے کا عنصر نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔

”آپ لوگ تصویر میں اس کا لباس اور زیورات دیکھ سکتے ہیں۔ وہ سوتے ہوئے بھی ہیرے کی انگوٹھیاں پہن کے رکھتی ہے۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب میں اکرام بھائی سے صرف اکرام رہ جاؤں گا۔ شادی کے وقت میں نے بنگلا اس کے نام کر دیا تھا۔ بینک اکاؤنٹ بھی مشترک ہے۔ میں اس کی محبت میں اندھا ہوگیا تھا۔ نہیں نہیں...... اس نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہنوں کے لیے بھی خریداری کرتی ہے...... میں اس کے لیے صرف ایک اے ٹی ایم مشین کے سوا کچھ بھی نہیں ہوں۔“

میں نے دیکھا کہ اکرام بھائی کا غصہ اداسی اور بے بسی میں ڈھل رہا تھا۔

”اور میں......“

”ایک منٹ رہ گیا ہے۔“ پاشا نے اکرام بھائی کی بات کاٹی۔

اکرام بھائی نے بقیہ ایک منٹ میں تیزی سے دل کی بھڑاس نکالی اور اسٹیج سے اتر گیا۔

اس کے بعد شکیل نامی ایک پستہ قد شوہر اسٹیج پر آیا۔ اسکرین پر اب اس کی بیوی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ اپنی بیوی کی برائیاں کرتے ہوئے اس نے ایک نئی مصیبت کا ذکر کیا۔ وہ یہ کہ مارچ میں بیگم نے ماں، یعنی شکیل کی ساس کو بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے اس نے جو انکشافات کیے وہ خاصے اذیت ناک تھے۔ شکیل پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ جاں کنی کے عالم میں اول فول بک رہا تھا پھر اچانک وہ پُرسکون ہوتا چلا گیا اور چند نازیبا الفاظ بکتا ہوا اپنی کرسی پر واپس آگیا۔

دفعتاً میری ذہنی کیفیت بدلنا شروع ہوئی۔ ”وہاٹ اے گریٹ آئیڈیا۔“ میں نے دل میں کہا۔ ایسی نشست سال میں کم از کم دو مرتبہ ہونی چاہیے۔ کڑھنے اور جلنے کے بجائے ایکشن لو یا پھر یہاں آ کر دل کا بوجھ ہلکا کرو۔ یہ مجھے Katharsis کے مانند لگ رہا تھا۔ ماہر نفسیات بھی تناؤ اور پریشانی کم کرنے کے لیے مریض کو موقع دیتا ہے کہ جو دل میں ہے وہ بولتا چلا جائے۔

افروز نامی آدمی اسٹیج پر آیا۔ اسکرین پر اس کی بیوی کی تصویر دیکھ کر میری کم ہوتی ہوئی ٹینشن بڑھ کر خوف میں بدل گئی۔ وہ عورت نہیں، بلڈوزر تھی۔ اگر کوئی ریسلنگ کا

شوقین ہے تو اس نے خاتون ریسلر نایا جیکسن کو ضرور دیکھا ہوگا۔ نایا عام مرد کو تھپڑ مار کر ہی بے ہوش کر سکتی ہے لیکن افروز کی بیوی غیر معمولی قد اور وزن رکھنے کے علاوہ بدشکل بھی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس نے اس بھیانک مخلوق سے شادی کیوں کی تھی؟

''دوستو! میری بیوی شادی کے وقت ہاتھی کے مانند نہیں تھی۔'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''اور نہ میں احمق تھا۔ بہرحال اس کا وزن زیادہ تھا اور شکل آپ دیکھ رہے ہیں۔ میری مجبوری کچھ اور تھی۔ میری بہن کی عمر ڈھل رہی تھی۔ مجھے اس کی شادی کرنا تھی اور میری مالی حالت...... مالی حالت کچھ بھی نہیں تھی۔ الٹا میں مقروض تھا۔ میری بیوی کا باپ دولت مند تھا لیکن اس کی بیٹی سے شادی کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ میں نے اخبار میں اشتہار دیکھا اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔'' افروز نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

''میری بہن کی شادی ہوئی اور قرضہ بھی اتر گیا۔ میرے حالات بدلنے لگے۔ مجھے سسر جی کی فیکٹری میں اچھی جاب مل گئی۔ چھ ماہ بعد مجھے احساس ہونے لگا کہ میں ایک نئے عذاب میں پھنس گیا ہوں۔ میں شوہر تھا اور نہ داماد بلکہ میں ایک غلام تھا۔''

افروز بولتے بولتے رک گیا۔ لگ رہا تھا کہ رو پڑے گا۔ وقفے وقفے سے اس نے غیبت کے نئے در کھولنا شروع کیے...... تاہم رقت انگیز بیان طویل ہونے سے پہلے ہی پاشا نے متعین وقت کے اختتام کا اشارہ کر دیا۔

مصیبت کے مارے شوہر باری باری آکر دردناک کہانیاں سنا رہے تھے۔ ہر ایک خود کو مظلوم ترین ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ بیگمات کے بارے میں نت نئے انکشافات کا ایک طوفان تھا۔ زیادہ تر کو میں نے اسٹیج سے پُرسکون ہو کر اترتے دیکھا۔ گویا اسٹیج پر بوجھ اتارا جا رہا تھا۔ میرا آخری نمبر تھا۔

میرا موڈ بدل چکا تھا لیکن جب میرا نمبر آیا تو اسٹیج پر مجھے بدمعاشیاں یاد آگئیں۔ بیوی سے زیادہ سالوں کی۔ میرے دو سالے پولیس میں تھے......

میں نے اپنی تقریر دلگیر کا آغاز ہی...... انتہائی نازیبا...... الفاظ کے ساتھ کیا۔ پتا نہیں دوسروں کی ہرزہ سرائی نے میرے اندر گویائی کو آلودہ کیا تھا یا کوئی اور بات تھی...... میں نے بلاتکلف مغلظات سے بھرپور یاوہ گوئی کا مظاہرہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ زندگی رہی تو ایسا موقع دوبارہ

ایک سال بعد ملے گا۔ میں نے پاشا کو اشارے کا موقع نہیں دیا اور تقریر کا اختتام بھی گالی پر کیا۔ میں ان چند لوگوں میں شامل تھا جو قہقہہ لگاتے اسٹیج سے اترے تھے۔

راشد کے برابر میں جو آدمی بیٹھا تھا، وہ شروع سے میری توجہ کا مرکز رہا تھا۔ شروع سے اس کے چہرے پر طمانیت اور مسکراہٹ تھی۔ وہ اسٹیج پر بھی نہیں آیا تھا۔ اسٹیج سے اترتے وقت مجھے اس کا مکمل چہرہ نظر آیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی۔ اس کی ناک چپٹی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

پاشا اسٹیج پر آیا۔ ”آخری مرحلہ ووٹنگ کا ہے۔“ اس نے اعلان کیا۔ میں چونک اٹھا۔

”ووٹنگ؟ کیا مطلب؟“ میں نے راشد کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہاں! رائے شماری کے ذریعے جیتنے والے کا انتخاب ہوگا۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں نہیں سمجھا!“ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”یہی کہ کس کی بیوی بدترین ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا تاہم خاموش رہا۔ ووٹنگ کے بعد پاشا نے رائے شماری کے پرچوں کو جانچا اور اعلان کیا۔

”دوستو! یہ پہلا اتفاق ہے کہ کلب کا نیا ممبر جیت گیا ہے۔ بیوی کے بارے میں وہ مظلوم ترین ہے۔ اس میں دو رائے بھی کوئی ابہام نہیں نظر آتا۔“ پاشا براہ راست مجھے دیکھ رہا تھا۔

”خالد عمر وہ واحد شوہر ہے جس کی تقریر کا آغاز اور انجام دونوں..... الفاظ سے شروع ہو کر..... الفاظ پر ختم ہوئے۔“ اس نے مجھے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔

میں ہونق زدہ تھا۔ فخر و حماقت کے ملے جلے احساسات لیے میں اٹھا پھر اچانک افسردہ اور ڈپریسڈ افراد نے اٹھ کر مجھے گھیر لیا۔ کوئی مجھ سے ہاتھ ملا رہا تھا، کوئی میرے شانے پر تھپکی دے رہا تھا، کئی ایک نے مجھے مبارک باد دی اور مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اتنے افراد کے سامنے میں نے اپنی بیوی کے بارے میں جو زبان استعمال کی تھی، وہ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں نے جتنے شوہروں کی بکواس سنی تھی، ان میں کچھ مجھے بیویوں کے مقابلے میں خود نامعقول نظر آئے تھے۔ مثلاً انہوں نے صرف بیگمات کی بدصورتی کا رونا رویا تھا جبکہ وہ خود زیادہ بدشکل اور بھدے تھے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری نظر پھر اسی چپٹی ناک والے پر گئی۔ وہ پراسرار آدمی اپنی کرسی پر ہی جما ہوا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر تھی۔ نگاہ میں تمسخر تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ آنکھوں آنکھوں میں میرا مذاق اڑا رہا تھا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد ہم ہال نما کمرے سے نکل کر ملحقہ کمرے میں آ گئے جہاں کھانے پینے کا انتظام کیا گیا تھا۔

”یہ آئیڈیا کس کا تھا؟“ میں چائے کا کپ لے کر پاشا کے قریب ہو گیا۔

”یہ خیال میرا تھا۔“ پاشا نے فخر سے کہا۔ ”چند برس پہلے کلب کے صرف پانچ ممبر تھے۔“

”مجھے کیوں مدعو کیا گیا؟“

”ماجد تمہارا اور میرا مشترکہ دوست ہے۔ اس کے ذریعے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ تم کلب کی ممبرشپ کے لیے موزوں ہو۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے برے حال میں ہو۔“

”لیکن اسٹیج پر تم نے اپنا حال بیان نہیں کیا؟“

”اوہ ہاں! تین سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔“ اس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس خبر پر اظہار افسوس کروں یا نہیں۔ وقفہ لے کر میں نے آہستہ سے کہا۔

”وہ آدمی کون ہے؟ وہ بھی اسٹیج پر نہیں آیا تھا۔“ میرا اشارہ چپٹی ناک والے کی جانب تھا۔

ہلکی سی مسکراہٹ اب بھی اس کے ہونٹوں پر تھی۔ گویا مسکراہٹ اس کے تاثرات کا لازمی حصہ ہو۔ وہ واحد آدمی تھا جو شروع سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس مرتبہ میں نے شناسائی کی جھلک محسوس کی۔ تاہم پہچاننے میں ناکام رہا۔

پاشا نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”تمہاری کبھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی؟“ پاشا نے سوال کیا۔ ”وہ شوکت ہے۔ سلمان پلازا کی ساتویں منزل پر رہتا ہے۔ حساب کی غلطیاں درست کرتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ اکاؤنٹنٹ ہے۔“ پاشا نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا اور مجھے یاد آ گیا۔ غالباً ڈیڑھ سال پہلے وہ خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ شوکت کی بیوی ساتویں منزل کی بالکونی سے گر کر ہلاک ہوئی تھی۔

”ہاں! مجھے یاد آ گیا۔“ میں نے سر ہلایا۔

پاشا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”گزشتہ برس یہاں شوکت جیتا تھا۔ اس نے سو فیصد ووٹ حاصل کیے تھے۔“

✖✖✖

عمارت کے اندر گہری خاموشی مسلط تھی۔ اس خاموشی میں یا تو کبھی چوکیدار کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دیتی تھی یا پھر سفیر کے ریڈیو کی ہلکی موسیقی، یا پھر کسی اتاشی کے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ جسے معمول کے خلاف دیر تک بیٹھ کر کام کر

پڑ رہا تھا۔ اس خاموشی میں اگر کوئی بلی بھی تہ خانے میں چل رہی ہوتی تو شاید اس کے پنجوں کی چاپ بھی سنائی دے جاتی لیکن وہ آدمی جو اس وقت تہ خانے میں داخل ہوا تھا کسی بلی سے بھی زیادہ ہلکے قدموں سے چل رہا تھا۔ خاموش اور تاریک تہ خانے

اسرار اور سراغ رسانی پر مشتمل سسپنس کلاسک کے لیے بہترین انتخاب

دنیا میں مٹی کا کھیل جانے کتنے اسرار اور بھیدوں کو چھپائے ہوئے ہے جنہیں آج تک کوئی نہ پاسکا... مٹی کا یہ انسان مٹی کا کھلونا ہی تو ہے جو بچپن میں مٹی سے کھیل کر بڑا لطف اٹھاتا ہے... مگر افسوس انسانوں میں چند خود کو اشراف المخلوقات سمجھتے ہیں اور چند کو محض کھلونے... جب دل چاہا کھیلا اور جب دل چاہا توڑ کر پھینک دیا۔

مٹی کے کھلونے

اثر نعمانی

میں ایک منٹ کے لیے وہ بالکل خاموش کھڑا رہا۔ اس کے کان ہلکی سے ہلکی آہٹ کو بھی سننے کے لیے کوشاں تھے۔ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس، اس شخص کے چہرے پر چڑھا ہوا نقاب بھی سیاہ تھا اور اس کا وجود کسی شخصیت کے بجائے تہ خانے کے سایوں میں سے ایک سایہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ سانس بھی اتنی آہستہ سے لے رہا تھا کہ آواز ہی نہیں، سینے کا اتار چڑھاؤ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی بالکل یوں جیسے تہ خانے کا کوئی سایہ حرکت میں آ گیا ہو۔

بغیر آواز، بظاہر کسی خاص رفتار کے بغیر وہ شخص جیسے ہوا میں تیرتا ہوا تہ خانے سے گزر کر اس بڑی چمنی تک پہنچ گیا جو رات ہونے کی وجہ سے زیر استعمال نہیں تھی۔ وہ شخص چمنی کے اندر داخل ہو گیا۔ اپنا نقاب پوش چہرہ اٹھا کر اس نے اینٹوں سے بنی ہوئی اس چمنی کے اندر دیکھا جو عمارت کی چار منزلوں تک کسی مینار کی طرح اوپر اٹھتی چلی گئی تھی۔ پھر اس نے وہ چھوٹا سا سیاہ بکس جو اب تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا ڈوری کی مدد سے اپنی گردن میں لٹکایا اور اپنی پشت اور طاقت ور ٹانگوں کے سہارے چمنی میں اوپر چڑھنے لگا۔ چمنی کی ایک دیوار سے پیٹھ اور دوسری جانب پیروں کی مدد سے وہ اس طرح اوپر چڑھتا چلا جا رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا کیڑا آہستہ آہستہ اوپر کی جانب رینگ رہا ہو۔ یہاں تک کہ وہ چاروں منزل چڑھ کر سفارت خانے کی چھت پر چمنی سے باہر نکل آیا۔ یہاں بھی ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ چمنی سے نکل کر وہ شخص اس دروازے کی طرف بڑھا جو ایک زینے کا تھا اور جس کی سیڑھیاں چھت سے نیچے اترنے کا واحد ذریعہ تھیں۔ یہاں وہ پورے پانچ منٹ تک خاموشی سے کھڑا رہا۔ اس دوران دروازے کے دوسری جانب قدموں کی آواز ابھری۔ یہ چوکیدار تھا جو چھت کے دروازے کو چیک کرنے آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دروازہ اندر کی جانب سے بند اور باقاعدہ مقفل ہے اور قفل کو کھینچ کر اپنا اطمینان کرنے کے بعد وہ نیچے اترتا چلا گیا۔ جلد ہی اس کے قدموں کی آواز معدوم ہو گئی۔

اس کے باوجود اس شخص نے مزید چند لمحے انتظار کیا اور پھر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ وہ چھت پر بالکل اکیلا ہے، وہ عمارت کے پچھلے حصے کی جانب چل دیا جس کے سامنے ایک پارک واقع تھا۔ اس پارک کے ساتھ ساتھ ایک سڑک چلی جا رہی تھی جس کے کنارے پر اونچے اونچے تناور درخت ایستادہ تھے۔ اس وقت سڑک پر نہ کوئی ٹریفک تھا اور نہ کوئی راہ گیر فٹ پاتھ پر چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس آدمی نے اپنے سیاہ بکس سے تین چیزیں نکالیں اور انہیں آپس میں جوڑ دیا۔ جڑنے کے بعد اس چیز نے ایک چوڑی نالی کی رائفل جیسی شکل اختیار کر لی۔ اس نے رائفل سے سڑک کے کنارے لگے ہوئے ایک درخت کے تنے کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہلکی سی آواز ہوئی اور کوئی چیز رائفل کی نال سے نکل کر درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی نائلون کی ایک پتلی مگر بے حد مضبوط رسی سفارت خانے کی چھت سے لے کر پارک کے اوپر سے ہوتی ہوئی درخت کے تنے تک تنی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس شخص نے رسی کا دوسرا سرا رائفل کی نال سے نکال لیا۔ دو تین بار جھٹکے دے کر اس کی گرفت کا اندازہ لگایا اور پھر دوسرے سرے میں ایک پلاسٹک کا ہک باندھتے ہوئے اسے عمارت کی چھت کی منڈیر سے اٹکا دیا۔ پھر اس نے دھات کا بنا ہوا ایک نما کنڈا جس میں ایک دستہ بھی لگا ہوا تھا، پھسلنے کے لیے رسی میں ڈال دیا اور پھر اس کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے سیاہ بکس دوبارہ اپنی گردن میں لٹکانے کے بعد سفارت خانے کی چھت سے چھلانگ لگا دی۔ کنڈا بہت تیزی سے پھسلتے ہوئے نیچے کو چلا اور اس کے ساتھ ہی وہ شخص بھی۔ زمین پر پہنچنے کے بعد اس نے پہلے رسی کو جھٹکا دے کر پلاسٹک ہک کو آزاد کیا۔ پھر درخت کے تنے سے وہ کانٹا نکالا جو رائفل کی نال سے نکل کر مع رسی کے تنے میں دور تک گھس گیا تھا اور پھر چند سیکنڈ کے اندر وہ کسی طرف جا کر غائب ہو گیا۔

☆☆☆

اس کے ایک دن بعد اسکاٹ ولسن، مکینیکل، ایرو اسپیس لمیٹڈ کا انجینئر، ایسٹ افریقن ایئرویز کے ایک جیٹ طیارے سے سفارت خانے کے مخصوص ایئرپورٹ پر اترا اور وہاں سے ایک ٹیکسی کے ذریعے تقریباً نو میل کا سفر کرنے کے بعد نیروبی پہنچا، جو کہ کینیا کا دارالحکومت تھا۔ وہاں سے وہ اپنے ہوٹل پہنچا اور پھر ہوٹل سے نکل کر سیدھا ایسٹ افریقہ مائنز لمیٹڈ کے دفاتر روانہ ہو گیا۔ ولسن دبلے پتلے جسم اور معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا اور اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی کہ دارالحکومت کی مصروف سڑک پر کوئی بطور خاص اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ بظاہر برطانوی کمپنیوں کے ان سیکڑوں ملازمین میں سے ایک تھا جو اپنے دائرۂ کار میں کینیا کی ترقی پذیر مملکت کے مفاد کے لیے کام کر رہی تھیں اور دوسری جانب خود بھی خاصا فائدہ حاصل کر رہی تھیں۔ اسے غور سے دیکھنے والا ہی یہ سمجھ سکتا تھا کہ

ولسن اتنا کمزور بھی نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے۔

سر جیر اللہ کے دفتر میں جو کہ ایسٹ افریقا مائنز کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے، ولسن نے اپنا ملاقاتی کارڈ پیش کیا اور ملاقات کے منتظر دوسرے افراد کے ساتھ انتظار کرنے بیٹھ گیا۔ پھر جب اس کی باری آئی تو اس نے اندرونی آفس میں قدم رکھا اور اس کے ساتھ ہی بیرونی اور اندرونی دفتر کے درمیان واقع دروازہ بند ہوگیا اور ٹھیک اسی مقام سے ایک معمولی اور روزمرہ کی ملاقات کا انداز ختم ہوگیا۔ ولسن سر جیر اللہ کی بڑی سی میز کی طرف بڑھا اور بلاتکلف سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جیر اللہ نے دو بٹن دبائے۔ فوراً ہی ایک ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی درمیانی دروازہ مقفل ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہلکی بھنبھناہٹ کی آواز شروع ہوگئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی آلے کی مدد سے بھی ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتا تو یہ آواز اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتی۔

"سب کچھ ٹھیک ہے؟" مسٹر جیر اللہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" ولسن نے جواب دیا۔ "ایک ماہر اور تجربہ کار آدمی کے لیے اندر جانا اور باہر آنا کوئی مشکل کام نہیں ہے سفارت خانے کے عام اور معمولی حفاظتی اقدامات کے علاوہ کوئی خصوصیت نہیں برتی جاتی اور اس حفاظتی انتظام میں سب سے بڑا رخنہ وہ بڑی چمنی ہے جسے وہ لوگ زیادہ استعمال نہیں کرتے۔"

"اور وہ ابتدائی روٹ پلان؟" سر جیر اللہ نے پوچھا۔

"وہ ملٹری اتاشی کے دفتر میں موجود ہے اور اس تک پہنچنا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔" ولسن نے جواب دیا۔ "مشکل جو ہے وہ یہ ہے کہ نہ تو اسے اس کی اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہے اور نہ اس کا عکس اتارا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کچھ ایسے انتظامات کیے ہیں کہ دونوں صورتوں میں انہیں فوراً پتا چل جائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس روٹ پلان کو یادداشت میں محفوظ کرنا پڑے گا۔"

"اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ صورت ممکن ضرور ہے۔ ہمیں بہرحال کوشش کرکے دیکھنا چاہیے۔" ولسن نے کہا۔

"گویا ہمیں ڈی ہوگ کو آزمانا پڑے گا۔" سر جیر اللہ نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ بشرطیکہ ایم۔ آئی۔ فائیو اس کی خدمات ہمارے سپرد کرنے پر آمادہ ہوجائے۔"

"اس صورتِ حال میں وہ انکار نہیں کرسکتے۔" سر جیر اللہ نے جواب دیا۔ "سوال صرف یہ ہے کہ آیا وہ بھی تیار ہوگا یا نہیں۔ تم جانتے ہو اس کے سابقہ ریکارڈ اور بہترین خدمات کی وجہ سے اسے پسند و ناپسند کا اختیار حاصل ہے۔"

"وہ تیار ہوجائے گا۔" ولسن نے خاموشی سے کہا۔ "میں نے اس کی فائل دیکھی ہے۔ اس کے پورے ریکارڈ میں جو بات نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ اسے اپنی مہارت اور اپنے اعصاب کی مضبوطی پر غرور کی حد تک فخر ہے۔"

سر جیر اللہ نے کچھ اس طرح منہ چلایا جیسے وہ کوئی ایسی چیز چبا رہا ہو جو اسے ناپسند ہو۔ "بہت خوب۔" آخر اس نے کہا۔ "مجھے فوراً ایم۔ آئی۔ فائیو سے رابطہ قائم کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس کام کرنے کے لیے صرف چار دن باقی ہیں۔"

اسکاٹ ولسن نے اثبات میں سر ہلایا اور چلنے کے لیے کھڑا ہوگیا اور جب سر جیر اللہ نے دروازے کا قفل کھولنے کے لیے بٹن دبایا تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن پیرس کے لیٹن کوارٹرز کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اسکاٹ ولسن نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر ایک دراز قد چھریرے جسم کے شخص کو خوش آمدید کہا جس کی عمر اڑتالیس سال سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس شخص نے اندر آنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کردیا اور چند لمحوں تک اس گندے، تنگ و تاریک کمرے اور ولسن کو غور سے دیکھتا رہا۔ "تو تم ہو اسکاٹ ولسن؟" اس نے نرم مگر ایسے لہجے میں کہا جو اس کے چہرے کی طرح سپاٹ تھا۔ "میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، نمبر ایک آدمی ہو، بالکل اسی طرح جس طرح میں اپنی جوانی کے زمانے میں تھا، بے داغ ریکارڈ، مضبوط اعصاب۔"

"کیا ایم۔ آئی سکس میں برقرار رہنے کا کوئی اور طریقہ ہے ڈی ہوگ۔" ولسن نے پوچھا۔

ڈی ہوگ جس کا پورا نام پال ڈی ہوگ تھا، مسکرایا۔

"نہیں تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ بولا۔ "اور اسی وجہ سے مجھے یہ تعجب ہے کہ تم لوگ مجھ جیسے ایک بوڑھے گھوڑے کی ضرورت کیوں محسوس کررہے ہو۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ میں عملاً ایسی مہمات سے ریٹائر ہوچکا ہوں اور اب دفتر میں بیٹھ کر کاغذی نوعیت کے کام کرتا ہوں۔"

"ہم جانتے ہیں اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی عار نہیں ہے کہ کمانڈر کو اب بھی شبہ ہے کہ تم واقعی ہمارے کام

آسکتے ہو۔'' ولسن نے جواب دیا۔ ''بہر حال مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جس کی یادداشت ایک کیمرے کی طرح ہو اور یہ تمہاری خصوصیت رہی ہے جو اس وقت ہمارے کام آسکتی ہے۔ اس کے باوجود کہ تمہارے ساتھ کچھ مضمرات بھی ہیں۔''

''ہاں۔ مثلاً میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ اتنا مشہور یا دوسرے الفاظ میں بدنام کہ دشمن کے تمام ہی ایجنٹ مجھے جانتے ہیں، اسی وجہ سے مجھے ایم۔ آئی فائیو میں بھیجا گیا تھا لیکن کیا تمہارے ڈپارٹمنٹ ایم۔ آئی سکس میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے؟''

''مگر کوئی شخص تمہاری جیسی صلاحیت رکھنے والا نہیں ہے۔'' ولسن نے کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ بڑھاپے کے باوجود تمہاری یہ خصوصیت اپنی جگہ برقرار ہوگی۔''

''ہاں میں اب بھی ایک مشین گن کے پلان کو بیس منٹ کے اندر اس کی تمام تفصیلات سمیت اپنے ذہن میں محفوظ کر سکتا ہوں اور ایک ہفتے تک محفوظ رکھ سکتا ہوں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اب بھی روزانہ پابندی سے اپنی یادداشت کی یہ صلاحیت برقرار رکھنے کی مشق کرتا رہتا ہوں۔''

وہ کہتے کہتے رک گیا... مسکرایا اور بولا۔ ''مگر ظاہر ہے کہ تم خود بھی یہ سب باتیں جانتے ہو گے بلکہ میرا خیال ہے کہ کچھ مدت سے میری نگرانی بھی کرا رہے ہو گے۔''

''ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔'' ولسن نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کسی مشین گن کے پلان کو یاد رکھنا۔ البتہ تمہیں بیس منٹ کا وقت نہیں مل سکے گا۔''

''جانا کہاں ہوگا؟''

''ایک سفارت خانے میں...... اور وہ بھی اس طرح کہ اندر جانے یا باہر آنے کا کوئی نشان یا سراغ نہ رہ جائے۔''

''میں نے تقریباً سات سال سے اس قسم کا کوئی کام انجام نہیں دیا۔'' ڈی ہوگ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اگر کچھ وقت مل جاتا تو شاید......''

''اور وقت ہی ہمارے پاس نہیں ہے۔'' ولسن نے بات کاٹی۔ ''ہمیں آج رات ہی جانا ہے۔''

''لعنت ہو۔ ولسن! میں کسی ایسے کام کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔'' ڈی ہوگ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے تو ہم اس کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ ہمیں کسی اور کو آزمانا پڑے گا اور جیسا کہ میں نے بتایا، کمانڈر کو پہلے ہی شبہ تھا کہ تم اب ایسے کام نہیں کر سکتے۔''

ڈی ہوگ اپنے پتلے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس نے غور سے ولسن کی طرف دیکھا اور دوبارہ بیٹھ گیا۔

''مجھے اندر جانے اور باہر آنے کے راستے کو اسٹڈی کرنے کا کتنا موقع ملے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہیں اسے اسٹڈی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں پہلے ہی اندر جا کر باہر آچکا ہوں۔ وہی راستہ تم بھی استعمال کر سکتے ہو اور میں تمہیں پوری تفصیل سے بتادوں گا کہ یہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔''

''میں سمجھا۔'' ڈی ہوگ نے کہا۔ ''تم پہلے خود ہی یہ کام کرنے کی کوشش کر چکے ہو۔ کیا تم نے اپنے گوہر مقصود کا پتا بھی لگا لیا ہے؟''

''یقیناً۔ مگر وہ کاغذات نہ تو چرائے جاسکتے ہیں اور نہ ان کا فوٹو لیا جاسکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی کوشش کی گئی تو دشمن کے حفاظتی اقدامات کی وجہ سے یہ بات فوراً ظاہر ہو جائے گی۔ اگر میری یادداشت تمہاری طرح ہوتی تو میں اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔''

ڈی ہوگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور گہرا کش لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ کچھ اور کھنچا ہوا نظر آنے لگا۔ ''اچھی بات ہے۔'' آخر اس نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کام کیا ہے؟''

ولسن نے تقریباً غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی اور کرسی پر کچھ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''کینیا کی حکومت کو اطلاع ملی ہے کہ صومالیہ کے شمال میں ایک باغی گروپ کو ہر قسم کے اسلحے کی ایک بھاری مقدار پہنچانے کا پلان بنایا گیا ہے۔ آج کل صومالیہ کے باغی بہت کمزور اور نہتے ہیں لیکن انہیں ہتھیار مل گئے تو وہ بڑے پیمانے پر گوریلا جنگ شروع کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ کینیا کی گورنمنٹ نے وائٹ ہال سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ اس کام کے لیے ایم۔ آئی سکس کا تقرر کیا گیا اور ہمیں ہدایت کی گئی کہ ہم اس کام کو تمام کاموں پر فوقیت دیتے ہوئے حکومت کینیا سے مکمل تعاون کریں۔ ہمیں اسلحے کی مقدار و تعداد معلوم ہو گئی۔ یہ پتا چل گیا کہ وہ کس دن بھیجا جانے والا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کر سکے کہ اسے کس راستے سے صومالیہ بھیجا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں روٹ پلان کا علم نہیں ہے۔''

''اور یہ روٹ پلان اس سفارت خانے میں موجود ہے؟''

''ہاں ملٹری اتاشی کے آفس میں، حفاظت کے تمام

انتظامات کے ساتھ۔ ایسے انتظامات جنہیں کے۔ جی۔ بی کے ایجنٹوں نے تیار کیا ہے اور اپنے کئی دوست ممالک کو ان حفاظتی انتظامات سے نہ صرف آگاہ کردیا ہے بلکہ اس کی تربیت بھی دی ہے۔"

"میں اب کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں کہ تمہیں میری ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔" ڈی ہوگ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہم کسی دوسرے ایجنٹ کے سپرد یہ کام نہیں کرسکتے۔" ولسن نے خاموشی سے کہا۔

"طریقۂ کار کیا ہے؟"

"ہماری ٹیم تین افراد پر مشتمل ہوگی۔" ولسن نے بتایا۔ "میں، تم اور ایک ریڈیو آپریٹر۔ میں اور ریڈیو آپریٹر پارک میں تمہارا انتظار کریں گے جبکہ تم اندر جاؤ گے۔ روٹ پلان کو جلد سے جلد اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے کی کوشش کرکے پھر فوراً باہر آجاؤ گے اور وہ تمام تر تفصیلات ریڈیو آپریٹر کو بتادو گے، وہ اسے اسی وقت ریڈیو کے ذریعے ہیڈ کوارٹر نشر کردے گا اور ہمارا کام ختم ہوجائے گا۔"

"اور اگر ان لوگوں کو ذرا سا بھی شبہ ہوگیا تو وہ متبادل روٹ پلان استعمال کریں گے۔" ڈی ہوگ نے کہا۔

"ہاں اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ ہم اس دوسرے روٹ پلان کو حاصل کرنے کی کوشش کرسکیں۔ اگر ہم ناکام رہے تو تمام اسلحہ باغیوں کو مل جائے گا۔ سوائے اس کے کہ کوئی گشتی فوج کا دستہ انہیں روک لے۔"

"اور یہ ایسی مہم ہے جسے ہم اس اتفاق کی امید پر نہیں چھوڑ سکتے۔" ڈی ہوگ نے خشک لہجے میں کہا۔ "ہمارا ان مہمات کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ہم انسانی معاملات میں اتفاقات کے عنصر کو کم سے کم کرسکیں۔"

ولسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈی ہوگ اس وقت تک اپنا سگریٹ پیتا رہا جب تک وہ اس کی انگلیوں تک نہیں پہنچ گیا اور وہ سگریٹ کے ٹوٹے کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ ولسن اسے رخصت کرنے کے لیے کمرے میں باہر تک اس کے ساتھ گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن نیروبی واپس آنے والوں میں سب سے پہلا نمبر اکاٹ ولسن کا تھا۔ وہ حسب معمول میک نیل اینڈ میسن کے انجینئر کے بھیس میں تھا۔ سرحدی کسٹم چوکی پر اس کے ساتھ کوئی غیر ضروری چیکنگ نہیں کی گئی۔ وہ بہر حال ایک سرکاری محکمے کے ساتھ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے آیا تھا۔ ریڈیو مین جس کا نام میکس مس تھا ایک بوڑھا آدمی تھا اور اب بھی گاہے بگاہے ایم۔ آئی سکس کے لیے کام کرتا رہتا تھا لیکن چوں کہ اب جنگ کے زمانے والی کیفیت نہیں تھی، اس لیے اس کی سبوتاژ کرنے والی مہارت اور صلاحیت سے شاذ و نادر ہی فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ اس کے بجائے اکثر اسے دوسری قسم کی مہمات سپرد کی جاتی تھیں جیسی کہ یہ موجودہ مہم تھی جس میں اسے ریڈیو آپریٹر کا کام سرانجام دینا تھا۔ وہ اس وقت ایک پادری کے میک اپ میں تھا جو کسی مذہبی کانفرنس میں شریک ہونے آیا تھا۔

پال ڈی ہوگ سب سے آخر میں وارد ہوا۔ اس نے اپنا ایک پرانا میک اپ استعمال کیا تھا یعنی ایک میوزیم انچارج اور اتنے عرصے بعد اس میک اپ کے بارے میں اسے اطمینان نہیں تھا کہ چل سکے گا یا نہیں لیکن کسٹم پر اسے کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور اس نے کسٹم کی جانچ پڑتال سے فارغ ہوتے ہی ایک ٹیکسی پکڑی اور اس ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا جہاں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنا سامان کھولا اور ایک پریمیٹو آرٹ کی میٹنگ میں شریک ہونے چلا گیا جسے اس نے اپنے دارالحکومت میں آنے کا جواز ظاہر کیا تھا۔ میٹنگ میں جو کہ کلچرل سینٹر میں ہورہی تھی، اپنا نام درج رجسٹر کرانے کے بعد وہ باہر آگیا اور ولسن اور میکس سے ملنے کے لیے جانے کا ارادہ کررہا تھا کہ اچانک اس کی نظر دولکاف پر پڑی۔ اس نے دولکاف کو فوراً پہچان لیا، وہ کے۔ جی۔ بی کے اس ایجنٹ کو ساری عمر نہیں بھول سکتا تھا کیونکہ یہ دولکاف ہی تھا جس کی وجہ سے وہ آٹھ برس پہلے موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ کیا دولکاف نے بھی اسے دیکھ لیا ہے؟ اور اس بارے میں ڈی ہوگ کو بہت کم شبہ تھا۔ یوں بظاہر دولکاف اس سے بے پروا دکھائی دے رہا تھا بلکہ وہ اس کی مخالف سمت میں منہ کیے کھڑا تھا۔ اور تب اچانک ڈی ہوگ کو یاد آیا کہ اس نے اس وقت بھی وہی میک اپ اختیار کررکھا تھا جس میں اس کی اور دولکاف کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔

ڈی ہوگ ذرا بھی ہچکچاہٹ ظاہر کیے بغیر کلچرل سینٹر سے باہر آیا اور ...... یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ دولکاف کی موجودگی سے آگاہ ہوگیا ہے سیدھا اسی ہوٹل کی جانب چل دیا جہاں ولسن ٹھہرا ہوا تھا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر اس نے مسٹر ٹیرنس پول کے نام ایک پیغام چھوڑا (ولسن اسی نام سے ہوٹل میں مقیم تھا) اور پھر ایک فیشن ایبل ریسٹورنٹ میں جا پہنچا جو شہر کے خاص بازار میں واقع تھا۔ وہاں اس نے چائے کا آرڈر دیا اور جب چائے پی چکا تو ریسٹورنٹ کے

مردانہ ٹوائلٹ روم میں جا کر ایک بوتھ کے اندر بیٹھ گیا۔
"کیا کوئی مشکل درپیش آگئی ہے؟" ولسن نے پوچھا جو اس کے برابر والے بوتھ میں موجود تھا۔
"ہاں۔ مجھے دیکھ لیا گیا ہے۔ وہ ایک کے۔ جی۔ بی کا ایجنٹ تھا۔ اس کا نام دولکاف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خاص طور سے میرے پیچھے لگا ہوا یہاں تک نہیں آیا ہے بلکہ اس نے اپنے روزمرہ کے گشت کے دوران غالباً ائرپورٹ پر مجھے دیکھ لیا اور تب سے تعاقب کر رہا ہے۔"
"ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ کے۔ جی۔ بی کے ایجنٹ مخصوص احتیاط کے خیال سے گھومتے رہتے ہیں۔" ولسن نے جواب دیا۔ "لیکن یہ ایسا خطرہ ہے جسے ہمیں مول لینا ہی پڑے گا۔"

دونوں بہت آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ان کی توجہ دروازے کی جانب بھی لگی ہوئی تھی کہ کوئی اور تو اندر نہیں آرہا ہے مگر کوئی نہیں آیا۔ ٹوائلٹ کا کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا اور اس لیے دولکاف کے لیے بہترین طرزِعمل یہ تھا کہ وہ باہر ہی موجود رہتے ہوئے ڈی ہوگ کا انتظار کرے۔
"میں اس کا انتظام کرلوں گا۔" ولسن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں سے باہر نکلو اور تمہارے طرزِعمل سے کسی غیر معمولی پن کا اظہار نہ ہونے پائے۔ یہاں سے سیدھے میٹنگ روم جاؤ، وہاں میکس موجود ہوگا۔"
ڈی ہوگ ٹوائلٹ روم سے نکلا، اپنی چائے کا بل ادا کیا اور باہر سڑک پر آگیا۔ اس نے دیکھا کہ دولکاف بدستور اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اسے ولسن یا میکس میں سے کوئی نظر نہیں آیا یہاں تک کہ وہ ہیلتھ کلب کے تقریباً قریب پہنچ گیا جہاں ان کی میٹنگ ہونا قرار پائی تھی۔ جب اس نے آخری چوڑی سڑک لوگوں کے ہجوم کے ساتھ پار کی تو ولسن اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ ڈی ہوگ ایک اسٹور کے شوکیس میں کچھ چیزیں دیکھنے کے بہانے رک گیا اور پلٹ کر دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت ولسن اور دولکاف لوگوں کی بھیڑ میں ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ چند لمحے ولسن اور دولکاف بالکل ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر اچانک ولسن نے دولکاف کو دھکا دیا اور ساتھ ہی کوئی چیز شعلے کی طرح چمکی۔ اتنی تیزی کے ساتھ کہ ڈی ہوگ جو مسلسل ان دونوں کو دیکھ رہا تھا اندازہ بھی نہیں کر پایا کہ وہ کیا شے ہوسکتی ہے۔ ولسن رکے بغیر آگے بڑھتا گیا اور جلد ہی لوگوں کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن دولکاف نے ابھی دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ دھڑام سے گزرتے لوگوں کے عین درمیان، سڑک پر گر پڑا۔
عورتیں چیخنے لگیں۔ باقی لوگ خوفزدہ ہو کر دولکاف سے دور ہوگئے، جو اب بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر پوری سڑک سنسان ہوگئی اور پولیس کے آدمی جائے واردات کی طرف بھاگ بھاگ کر آنے لگے۔ ڈی ہوگ رکا نہیں بلکہ انتہائی سکون مگر پھرتی کے ساتھ ہیلتھ کلب کی عمارت میں داخل ہوگیا۔ یہاں اس نے لباس اتار کر ایک بڑی چادر نما تولیا اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا اور بھاپ سے بھرے ہوئے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ ہیلتھ کلب دراصل گرم بھاپ کا ایک حمام تھا جہاں اس وقت ڈی ہوگ اور میکس کے علاوہ دو اور افراد بھی بھاپ میں غسل کر رہے تھے۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد ولسن بھی آگیا۔ اس نے بھی ایک تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ تینوں تقریباً دس منٹ تک بھاپ میں نہاتے رہے اور پھر ایک ایک کر کے ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں داخل ہوگئے جہاں غسل کے لیے آنے والے گاہک اگر چاہتے تو چند منٹ لیٹ کر آرام کر سکتے تھے۔
"لعنت ہو۔" ڈی ہوگ بولا۔ "کیا اسے قتل کرنا ضروری تھا؟"
"ہاں۔" ولسن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"لیکن اگر اس نے پہلے ہی میری رپورٹ کردی ہوگی تب کیا ہوگا؟"
"یہ ایک چانس ہے جو ہمیں لینا ہی تھا۔" ولسن نے جواب دیا۔ "اس مہم کی سب سے اہم چیز تیز رفتاری ہے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم دولکاف کو باز رکھنے کے لیے کوئی دوسرا طریقہ سوچ سکتے یا اس پر عمل کر سکتے۔"
"لیکن اب ان لوگوں کو پتا چل گیا ہوگا کہ شہر میں کوئی نہ کوئی مخالف ایجنٹ ضرور موجود ہے۔" ڈی ہوگ نے اعتراض کیا۔ "اور وہ ہوشیار ہوجائیں گے۔"
"مجبوری ہے۔" ولسن نے جواب دیا۔ "اگر انہیں پتا چل بھی گیا تو یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم یہاں کس منصوبے کے تحت آئے ہوئے ہیں کیونکہ اگر یہ بات ظاہر ہوچکی ہوتی تو دولکاف ضرور تمہیں کوئی نقصان پہنچائے بغیر نہ رہتا۔ پھر میرا خیال یہ بھی ہے کہ اسے اتنا موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ تمہارے بارے میں رپورٹ کر دیتا لیکن مجھے تمہارے اس خیال سے اتفاق ہے کہ وہ لوگ اب ہمیں پورے شہر میں تلاش کر رہے ہوں گے چنانچہ اب ہمیں رات کافی دیر تک حمام میں رہنا پڑے گا۔"
"مجھے یہ سب کچھ قطعی پسند نہیں ہے۔" ڈی ہوگ

نے کہا۔

"اگر ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو تو اب بھی ایسا کر سکتے ہو۔" ولسن نے جواب دیا۔ "میں خود بھی چاہتا تھا کہ ہمیں اس انتہائی اقدام پر عمل نہ کرنا پڑے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ بہرحال فیصلہ اب بھی تم پر چھوڑتا ہوں۔ اگر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔"

ڈی ہوگ دیر تک ولسن کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کے تاثرات تھے۔ آخر اس نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔ "نہیں، اب میرے انکار کا وقت گزر چکا ہے۔" آخر وہ بولا۔ "اب تو مجھے اس مہم کے اختتام تک ساتھ رہنا ہے۔ خواہ انجام کچھ بھی ہو۔"

"تب پھر ٹھیک ہے۔" ولسن نے کہا۔ "اس عمارت کے تہ خانے میں ایک کمرا ہے۔ میں نے اسے ایسی ہی ہنگامی صورت حال کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ ہم اسے استعمال کریں گے۔ ایک ایک کر کے اس کمرے میں پہنچ جاؤ اور خیال رکھنا کہ اب تم پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔"

☆☆☆

کمرا بہت چھوٹا تھا جس میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ تینوں فرش پر بیٹھ گئے اور ولسن نے انہیں رات کے پروگرام کی تفصیل بتائی جس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ میکس اونگھنے لگا۔ ولسن موم بتی کی مدھم روشنی میں اپنا ریوالور صاف کرنے لگا اور ڈی ہوگ سگریٹ سلگا کر خاموشی سے کش لینے لگا۔

"کیا تمہارے بیوی بچے اور دوسرے خاندان کے افراد ہیں؟" ڈی ہوگ نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"پھر تو انہیں اس بات کا کافی ملال ہوگا کہ تمہاری زندگی میں وہ اہمیت نہیں رکھتے جو ان کا حق تھا۔" ڈی ہوگ نے کہا۔ "تم نے سیکرٹ ایجنٹ کا پیشہ اختیار کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا۔"

"کام کچھ بھی ہو، آخر کام ہوتا ہے۔"

"لیکن یہ محض ایک پیشہ نہیں، ایک پوری زندگی ہے۔ جب تم نے اس کا انتخاب کیا تو تمہاری اپنی شخصیت جو کچھ بھی تھی ختم ہو گئی اور تمہاری اپنی صلاحیتیں ایک قسم کے پردے میں تبدیل ہو گئیں۔ ایک انسان کی حیثیت سے تمہاری نشوونما ...رک گئی۔"

"ظاہر ہے کہ اس کا احساس مجھے بھی تھا کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔" ولسن نے جواب دیا۔

"تمہاری زندگی میں ایسے بے شمار مواقع آئے ہوں گے جب تمہاری بیوی کو یہ احساس ہوا ہوگا کہ تم ایک دوسری دنیا میں رہتے ہو۔"

ولسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہر لمحہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ محض ہماری اصلی زندگی کو چھپانے کے لیے ایک پردہ ہوتا ہے۔ ہم ایک دروازے سے ایک نوجوان اور پُرجوش آدمی کی طرح گزرتے ہیں اور ہمارے پیچھے وہ دروازہ بند ہو جاتا ہے اور یوں حقیقی دنیا کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کر دیتا ہے۔"

"کیا تمہیں اس پر افسوس ہو رہا ہے ڈی ہوگ؟"

ولسن نے ریوالور صاف کرتے کرتے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے کبھی شادی نہیں کی۔" ڈی ہوگ نے ایک دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہ میرے بچے ہیں اور نہ دوسرے عزیز و اقارب۔ مجھے پتا ہی نہیں کہ مجھے کیا ہونا چاہیے تھا اور میں کیا بن گیا ہوں۔ پھر یہ کہ مجھے دفتری نوعیت کا کام دے دیا گیا ہے اور مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے لیکن ایک نہ ایک دن مجھے ریٹائر ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ریٹائر ہونے کے بعد ہم ایک ایسی دنیا میں قدم رکھیں گے جس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ جو ہمارے

حکمت کی باتیں

حافظ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اسماء الصحابہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اے میرے پیارے بیٹے، میں نے تیرے لیے تمام حکمت یعنی دانائی چار باتوں میں جمع کر دی ہے۔

○ دنیا کے لیے اتنی محنت کر جتنا تجھے یہاں رہنا ہے۔

○ آخرت کے لیے اتنی محنت کر جتنا تجھے وہاں رہنا ہے۔

○ اللہ کی رضا کے لیے اتنی کوشش کر جتنا تو اس کا محتاج ہے۔

○ گناہ اتنا کر جتنی تجھ میں عذاب سہنے کی طاقت ہے۔

○ صرف اسی ذات سے مانگ جو کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔

○ جب تو اللہ کی نافرمانی کرے تو وہاں جا جہاں وہ نہ دیکھتا ہو۔

مرسلہ: علی حذیفہ، لاہور

لیے بالکل بے معنی ہوگی۔"

"آیندہ کیا ہونا ہے، یہ کون جانتا ہے۔" ولسن بولا۔ "سردست تو ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ہم ایک فرض انجام دے رہے ہیں۔"

ڈی ہوگ نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ دیر کے بعد آنکھیں بند کرلیں۔ ولسن خاموشی سے بیٹھا ہوا دونوں سوئے ہوئے آدمیوں کو دیکھتا رہا۔ خود اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

وہ چاند سے محروم رات تھی۔ ٹھیک دس بجے ولسن اور میکس سفارت خانے کے سامنے پارک میں موجود تھے۔ ان کے پیچھے ایک کار درختوں کی آڑ میں چھپی کھڑی تھی۔ پال ڈی ہوگ کو سفارت خانے میں داخل ہوئے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ دوسرے اہم ادارے بیرونی حفاظتی اقدامات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اندر کی اتنی زیادہ فکر نہیں کرتے لیکن اس کے برعکس سفارت خانے، خاص طور پر اپنے اوقات کار میں، بیرونی حفاظتی انتظام کی زیادہ فکر نہیں کرتے۔ تمام دن مختلف لوگ اندر جاتے اور باہر آتے رہتے ہیں ان سب کاموں کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ ڈی ہوگ جس بہانے سے اندر داخل ہوا تھا وہ یہ تھا کہ وہ ایک ماہر ارضیات و معدنیات ہے اور جیولوجی پبلک کے جنگلات میں اس مقصد کے لیے زمین کھودنے کی اجازت حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے لیے اسے ری پبلک میں جانے کا ویزا دیا جائے۔

ایک مرتبہ اندر داخل ہونے اور ویزا کے لیے اپنی درخواست دینے کے بعد ڈی ہوگ کو اس اسٹور روم میں چھپنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی جس کے بارے میں ولسن نے اسے بتایا تھا اور اسٹور روم میں پہنچ کر اس کے پاس ایک طویل انتظار کرنے کے علاوہ کوئی دوسری مصروفیت نہیں تھی۔ پانچ گھنٹے کا طویل انتظار، تنہائی اور خاموشی میں۔ تاریک اسٹور روم کے ایک تاریک گوشے میں ایک بڑے سے کریٹ کی آڑ میں۔ اس وقت تک جب تک ولسن اور میکس پارک میں نہ پہنچ جائیں۔ اس کے بعد مزید دو گھنٹے کا انتظار۔ جس کے بعد اسے اپنی پناہ گاہ سے نکل کر نیم تاریک سنسان راہداریوں سے گزرتے ہوئے ملٹری اتاشی کے دفتر کی جانب جانا ہوتا۔

آفس تاریک اور مقفل تھا۔ ڈی ہوگ نے اس کا تالا بڑی جلدی اور خاموشی سے کھول لیا اور اندر داخل ہوگیا۔

الارم جیسا کہ ولسن پہلے ہی معلوم کرچکا تھا، رات کے ایک بجے سے پہلے آن نہیں کیا جاتا تھا۔ دفتر میں ڈی ہوگ نے اتنی دیر توقف کیا کہ اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوجائیں۔ وہ دوسرے دفاتر سے آنے والی آواز سن رہا تھا لیکن ملٹری اتاشی کے دفتر کے سامنے والی راہداری بالکل خاموش تھی۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سیاہ ڈبیا نکالی اور اسے دروازے کے ہینڈل کے ساتھ لگادیا۔ ڈبیا کے طاقتور مقناطیس نے اسے ہینڈل کے ساتھ بالکل چسپاں کردیا۔ اس ڈبیا کا کام یہ تھا کہ اگر کوئی کافی فاصلے سے بھی اس دفتر کی طرف آئے تو ڈی ہوگ کو اس کی اطلاع ہوجائے۔ اس نے دفتر کا جائزہ لیا اور فائل کی دو الماریوں کے پیچھے ایک گوشہ اس کام کے لیے منتخب کیا کہ واقعی اگر کوئی آجائے تو وہ فوری طور پر اس گوشے میں چھپ جائے۔

اس کے بعد وہ سیدھا سیف کی طرف بڑھا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا اور کام کے دوران آپ ہی آپ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ ایک مدت کے بعد کام کا موقع ملنے کے باوجود اس کی سابقہ صلاحیتیں زنگ آلود نہیں ہوئی تھیں اور آخرکار وہ سیف کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔

سیف کا دروازہ کھلتے ہی ایک ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی۔ اتنی ہلکی کہ اسے شبہ تھا کہ آیا اس نے اسے واقعی سنا بھی تھا یا نہیں، اور وہ سیف کو گھورنے لگا۔ کیا یہ کوئی الارم تھا؟ وہ پانچ منٹ تک کوئی آہٹ سننے کا انتظار کرتا رہا مگر کوئی نہیں آیا۔ آخر اس نے سوچا کہ ممکن ہے کلک کی وہ آواز خود سیف کے قفل سے نکلی ہو اور ایک مرتبہ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ولسن کی بتائی ہوئی تفصیلات کے مطابق وہ روٹ پلان تلاش کرنے لگا۔ پلان ایک نیم ٹرانسپیرنٹ لفافے میں تھا اور انسانی آنکھ تو اسے لفافے سے نکالے بغیر دیکھ سکتی تھی لیکن اگر اس کا فوٹو لینے کی کوشش کی جائے تو اس کے لیے اسے لفافے سے باہر نکالنا ضروری تھا اور پلان پر ایسا کیمیاوی محلول لگادیا گیا تھا کہ اگر اسے چھونے کی کوشش کی جاتی... اس کے نشانات پلان پر باقی رہ جاتے لیکن اسے لفافے کے اندر رکھی ہوئی حالت میں چھوا جاسکتا تھا اور سیف سے نکالا جاسکتا تھا۔ یہ اس لیے تاکہ خود سفارت خانے کے لوگ اسے اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرسکیں اور اس کے باوجود نقشے کے کیمیاوی محلول پر کوئی نشان نہ چھوڑیں۔

ڈی ہوگ نے اطمینان کے ساتھ لفافے کو ایک کونے سے پکڑتے ہوئے باہر نکال لیا۔ نقشہ میز پر رکھتے

ہوئے اس نے کوئی روشنی کیے بغیر راہداری کے بلب سے آتی ہوئی ہلکی روشنی میں ہی نقشے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کوشش کی وجہ سے اس کی آنکھوں پر بہت زور پڑ رہا تھا اور ان میں بار بار پانی آرہا تھا مگر ڈی ہوگ دفتر کی کسی بتی کو جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نقشہ صرف ایک کاغذ پر مشتمل تھا جس پر مختلف مقامات پر نام درج تھے اور ہر دو مقامات کے درمیان سفر کرنے کی سمت کا رخ اور اس کے درمیان فاصلے کا تعین میلوں کے حساب سے کیا گیا تھا۔ ڈی ہوگ نے پورے روٹ پلان کو ایک مرتبہ پڑھا۔ پھر دوسری مرتبہ نسبتاً آہستہ اور رک رک کر پڑھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دو منٹ تک اسے اپنے ذہن میں سوچا۔ پھر آنکھیں کھول کر اسے دو مرتبہ اور پڑھا... اور اب اسے پورا نقشہ ازبر ہو چکا تھا۔

اس نے جلدی سے روٹ پلان کا لفافہ واپس سیف میں رکھا۔ سیف کو مقفل کیا۔ دروازے کے پاس آیا، اپنی لگائی ہوئی ڈبیا علیحدہ کی اور آہٹ لینے لگا مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ پھرتی سے آفس سے باہر نکل آیا اور تیز قدموں سے تہ خانے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ تہ خانے میں پہنچا اور ایک تاریک گوشے میں بیٹھ کر رات کے ایک بجنے کا انتظار کرنے لگا جبکہ رات کے حفاظتی الارم کھول دیے جاتے ہیں۔

تہ خانے میں پہنچ کر اس نے پہلی مرتبہ خود کو کانپتا ہوا محسوس کیا۔ اس کے اعصاب برسہا برس کی عادت اور مشق کی وجہ سے اس وقت تک اس کے کنٹرول میں رہے جب تک وہ اپنے کام میں مصروف رہا لیکن اب جبکہ محض انتظار کرنا باقی رہ گیا تھا اسے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد اس نے خود کو سنبھالا یہاں تک کہ دوبارہ سرگرم عمل ہونے کا وقت آ گیا۔

وہ کھڑا ہو کر آہٹ سننے لگا۔ اسے دور فاصلے پر رات کے پہرے داروں کے قدموں کی آوازیں اور سفیر کے ریڈیو سے بلند ہوتی ہوئی موسیقی بہت ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھی۔ وہ چمنی کے پاس آیا۔ اپنا سیاہ تھیلا گردن میں لٹکاتے ہوئے اس نے پشت اور پیروں کی مدد سے چمنی میں اوپر چڑھنا شروع کر دیا لیکن وہ چوتھی منزل پر پہنچنے کے قریب ہی تھا کہ اس کے اعصاب ایک مرتبہ پھر جواب دینے لگے۔ نتیجے میں وہ قوت کمزور پڑ گئی جس کے سہارے وہ اوپر چڑھ رہا تھا اور اس نے خود کو چمنی میں نیچے کی جانب پھسلتے محسوس کیا۔ وہ تقریباً ایک ہی فٹ نیچے پھسلا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کا سہارا لیتے ہوئے خود کو مزید پھسلنے سے باز رکھا۔ وہ دوبارہ اوپر چڑھا اور چمنی کے کنارے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا مگر عین اسی لمحے کوئی چیز اس کی جیب سے نکل کر نیچے گر گئی۔ یہ اس کا ریوالور تھا جو چمنی کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا ایک گونجتے ہوئے شور کے ساتھ نیچے گر رہا تھا۔ اب اس کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے اعصاب نے فوری خطرہ محسوس کرتے ہی خود کو سنبھال لیا اور وہ ایک ہی جست میں چھت کے اوپر آ گیا۔ اب احتیاط کا وقت بھی گزر چکا تھا، اسے جو کچھ کرنا تھا انتہائی تیزی اور پھرتی سے کرنا تھا۔

☆☆☆

اور نیچے پارک کے اندھیرے میں میکس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر ولسن کی طرف۔ ''ایک بج کر پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ڈی ہوگ عنقریب چھت پر پہنچنے والا ہوگا۔ کیا ریڈیو سیٹ کردیا ہے؟''

''ہاں۔ وہ کوئی بھی پیغام نشر کرنے کے لیے بالکل تیار ہے اس کے رسی سے نیچے آنے کے دو سیکنڈ بعد میں تفصیلات نشر کرسکتا ہوں۔''

''تب پھر نشریئے کو آن کردو۔'' ولسن نے کہا۔ ''اور دوسری طرف پیغام موصول کرنے والوں کو تیار رہنے کی ہدایت کردو۔''

میکس نے اس ہدایت کی تعمیل کی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اسے روٹ پلان کی تفصیلات نشر کرنے میں کم سے کم پندرہ منٹ ضرور لگ جائیں گے اور اگر دشمن کے آدمی کسی نشری پیغام کو پکڑنے کے منتظر بھی ہوں تب بھی انہیں اس مقام کا پتا لگانے میں جہاں سے ریڈیائی پیغام نشر کیا جارہا ہے پندرہ سے بیس منٹ ضرور لگیں گے۔ ویسے اس کا امکان کم ہی تھا اس لیے اسے توقع تھی کہ پیغام نشر کرنے کے دوران کوئی پریشانی نہیں آئے گی۔

''وہ چھت پر آ گیا۔'' اچانک ولسن نے سرگوشی میں کہا۔

اور رات کے اندھیرے میں انہوں نے ڈی ہوگ کو سفارت خانے کی چھت کے اس حصے پر دیکھا جو پارک کی سمت واقع تھا۔ ڈی ہوگ نے رسی پھینکنے والی اسپیشل رائفل سے نشانہ لیا اور رسی کے ساتھ بندھا ہوا مخصوص طرز کا کانٹا ایک درخت کے تنے میں پیوست ہو گیا جو ولسن اور میکس سے چار پانچ منٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میکس رات میں دیکھنے والی خصوصی دوربین سے سفارت خانے کی چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اس نے رسی پھسلنے والا ہک لٹکا دیا ہے۔'' اس نے ولسن کو بتایا..... ''لیکن ...... لیکن وہ رک گیا۔ اب وہ گھوم کر دیکھ رہا ہے۔''

اور ولسن جو اپنی دوربین سے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا بولا۔ ''شاید اس نے کسی کو چھت پر آتے دیکھ لیا ہے۔''

''وہ نیچے آرہا ہے۔'' میکس نے کہا۔

☆☆☆

اور چھت پر ڈی ہوگ پھسلنے والے ہک کو پکڑے ہوئے رسی کے ذریعے نیچے پارک کی طرف آرہا تھا۔ اچانک دو آدمی چھت پر نمودار ہوئے اور اسی کے ساتھ دو فائرز رات کے سناٹے میں گونج کر رہ گئے۔ ڈی ہوگ کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ رسی سے چھوٹ کر سڑک کے فٹ پاتھ پر گر گیا۔ ولسن اور میکس سڑک پر گرے ہوئے ڈی ہوگ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے سے انتہائی تکلیف کے تاثرات نمایاں تھے اور اس کا بایاں بازو ٹوٹ کر جھول رہا تھا۔ گولیوں کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔

میکس نے جھاڑیوں کے پیچھے سے اٹھنے کی کوشش کی۔

''ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''نہیں۔'' ولسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ ''اب بہت دیر ہو چکی ہے۔''

میکس نے ایک مرتبہ پھر اپنی دوربین آنکھوں سے لگائی۔ ڈی ہوگ گھٹنوں کے بل اٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ چھت پر کھڑے ہوئے پہرے داروں نے دوسری مرتبہ گولی چلائی۔ ڈی ہوگ سڑک پر الٹ گیا۔ اس کا چہرہ خون میں تر ہو گیا تھا مگر ایک مرتبہ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ عین اس سمت کی جانب اٹھا ہوا تھا جہاں ولسن اور میکس چھپے ہوئے تھے اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بھی اس بات سے آگاہ ہے کہ اس کے ساتھی اسے دیکھنے کے باوجود مدد کے لیے آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔

''او میرے خدا۔'' بے اختیار میکس کے منہ سے نکلا۔

''کیا بات ہے؟'' ولسن نے پوچھا۔

''وہ ... وہ مسکرا رہا ہے۔'' میکس نے دوربین سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ ہم پر ہنس رہا ہے۔ وہ سر ہلا رہا ہے ولسن۔ ہمیں ہر قیمت پر اس کی مدد کرنا چاہیے۔''

''اب کوئی مدد اس کے کام نہیں آسکتی۔'' ولسن نے اپنی دوربین آنکھ سے لگاتے ہوئے کہا۔

اور اس نے دیکھا کہ میکس کا کہنا درست تھا۔ ڈی ہوگ واقعی مسکرا رہا تھا۔ ایک عجیب مسکراہٹ اور پھر دیکھتے دیکھتے اس کا سر نیچے لڑھک گیا اور وہ بے حس و حرکت سڑک پر پڑا رہ گیا۔ چھت پر کھڑے ہوئے پہرے دار بھی غائب ہو چکے تھے۔

''وہ مر چکا ہے۔'' ولسن نے کہا۔ ''آؤ جلدی سے نکل چلیں۔'' میکس نے ولسن کی طرف دیکھا۔

''کیا؟''

''جلدی کرو۔'' ولسن نے غصیلی آواز میں کہا۔ ''پہرے دار چند لمحوں میں نیچے پہنچنے والے ہوں گے۔ ریڈیو کو یہیں چھوڑ دو اور اپنی جان بچانے کے لیے بھاگو۔''

ڈگمگاتے قدموں سے میکس، ولسن کے ساتھ ساتھ درختوں میں چھپی ہوئی کار کی طرف دوڑا اور پھر چند سیکنڈ کے اندر وہ دونوں کار میں بیٹھے ہوئے پوری تیز رفتاری سے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کار میں بیٹھتے ہوئے میکس نے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا تھا۔ تین پہرے دار ڈی ہوگ کی لاش کے گرد کھڑے تھے اور چوتھا پہرے دار چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ غالباً اس نے وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر دیکھ لیا تھا جسے میکس ولسن کی ہدایت کے مطابق وہیں چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆

پال ڈی ہوگ کی ناکامی کے دو دن بعد ولسن اور میکس سر جیرالڈ۔ منیجنگ ڈائریکٹر ایسٹ افریقا مائننگ لمیٹڈ کے پرائیویٹ آفس میں موجود تھے۔ دروازہ بند اور مقفل ہوتے ہی میکس میز کے سامنے ایک کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔

''کتنی افسوسناک ناکامی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بے چارے ڈی ہوگ کو اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔''

ولسن یا سر جیرالڈ نے میکس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا حد یہ کہ اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ولسن بھی اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سر جیرالڈ کی طرف دیکھا۔

''وہ اس قسم کے کاموں کے لیے بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔'' میکس نے پھر کہا۔ ''پھر ایک مدت سے اس نے ایسی کسی مہم میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اسے تو لازمی طور پر ناکام ہونا ہی تھا۔''

اب سر جیرالڈ نے میکس کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں یہ خطرہ مول لینا ہی تھا میکس!'' اس نے کہا۔ ''بہر حال تمہارا کام مکمل ہو چکا ہے اور تمہارا بونس لندن پہنچتے ہی تمہیں ادا کر دیا جائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو؟''

میکس اس کے بعد بھی چند لمحے کرسی سے اٹھنے سے ہچکچاتا رہا، یوں جیسے کوئی بات اس کے ذہن میں چبھ رہی ہو

جیسے وہ کہنا تو چاہتا ہو مگر یا تو ہمت نہ پڑ رہی ہو یا سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ کس طرح کہے، مگر پھر آخر کار وہ سر ہلاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف چل دیا۔

میکس کے جانے کے ایک منٹ بعد تک جبکہ سر جیر اللہ نے اپنی میز کا بٹن دبا کر دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا تھا۔ ولسن خاموشی سے بیٹھا ہوا بے حسی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر اس نے کہا۔ ''وہ مسکرا رہا تھا...... ڈی ہوگ مرنے سے پہلے مسکرا رہا تھا۔''

''ہم نے گزشتہ رات تمام اسلحے پر قبضہ کر لیا ہے۔'' سر جیر اللہ نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس کے ساتھ دشمن کے چار ایجنٹ بھی پکڑے گئے۔ اب صومالیہ کے باغی راہ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ ہماری مہم بڑی کامیابی سے ختم ہوئی ہے اور تم نے اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ہے ولسن۔''

ولسن نے اس طرح سر ہلایا جیسے اس نے سر جیر اللہ کے بجائے کوئی دوسری ہی آواز سنی ہو جو خود اس کے اپنے ضمیر سے بلند ہو رہی ہو۔ ''میکس جانتا ہے یا کم سے کم اسے شبہ ہو گیا ہے کہ ہم نے کیا کیا ہے اور یہ بات اس کے ضمیر کو بے چین کر رہی ہے۔ وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے ڈر بھی رہا تھا کہیں اس کا شبہ واقعی حقیقت نہ ہو۔''

''ممکن ہے تمہارا اندازہ درست ہو۔'' سر جیر اللہ نے کہا۔ ''لیکن وہ جلد ہی اس بات کو بھول جائے گا۔''

''مگر میں نہیں بھول سکتا۔'' ولسن نے جواب دیا۔ ''کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہم نے کیا کیا ہے۔ میں ڈی ہوگ کی مسکراہٹ بھی فراموش نہیں کر سکتا۔''

سر جیر اللہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آہستہ، نرم مگر سپاٹ آواز میں کہنا شروع کیا۔ پھر جیسے کوئی ماہر نفسیات اپنے مریض سے مخاطب ہو۔ ''اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا، اسکاٹ! اور تم بھی یہ بات جانتے ہو۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا جس سے ان کا پہلا روٹ پلان بغیر ان کے علم میں آئے حاصل کیا جا سکتا اور یہ تمہارا ہی منصوبہ تھا کہ تم پہلے جاؤ اور ان کے اولین روٹ پلان کے بجائے وہ متبادل روٹ پلان حاصل کر لو۔''

''اور میں نے ان کا متبادل روٹ پلان حاصل کر لیا کیونکہ میں نوجوان تھا۔ اپنے کام میں ہوشیار اور تجربہ کار تھا۔ میں گیا اور ان کے اولین پلان کے بجائے اس راستے کا نقشہ معلوم کر آیا جو انہوں نے از راہ احتیاط اس لیے تیار کیا تھا کہ اگر ان کا پہلا روٹ پلان ہمیں معلوم ہو جائے تو وہ دوسرے روٹ پلان کے ذریعے اسلحہ باغیوں تک پہنچا دیں۔''

سر جیر اللہ نے اپنی نرم مگر سپاٹ آواز میں سلسلۂ کلام کو اس طرح جاری رکھا جیسے ولسن نے درمیان میں کوئی مداخلت نہ کی ہو۔

''تم جانتے ہو کہ ہمیں انہیں اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ اپنا دوسرا متبادل روٹ پلان استعمال کریں۔ تم نے ڈی ہوگ کو استعمال کرنے کا مشورہ اس لیے دیا کہ ہم اس کے علاوہ کسی دوسرے ایجنٹ کو اس کام کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ سب ہی لوگ یہ بات جانتے تھے کہ ڈی ہوگ کی یادداشت غیر معمولی ہے۔ وہ کسی پلان یا نقشے کو محض چند منٹ دیکھ کر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ کے۔ جی۔ بی کے ہیڈ کوارٹرز میں اس کے متعلق ایک پوری فائل موجود ہے۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا ہوگا اور سمجھ گئے ہوں گے کہ چونکہ ہم ان کا اولین پلان کسی اور طریقے سے حاصل نہیں کر سکتے تھے اس لیے ہم نے ڈی ہوگ کی یادداشت سے کام لینا چاہا ہے اور پھر تم نے جس طرح ڈی ہوگ کے پاس ریڈیو ٹرانسمیٹر کو آن کر کے چھوڑ دیا تھا۔ اس سے دشمن کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ مرنے سے پہلے ہمیں ان کے اولین روٹ پلان سے آگاہ نہ کر چکا ہو حالانکہ یہ امکان بہت مبہم تھا مگر ہم دونوں جانتے تھے کہ ایک مرتبہ شبہ پیدا ہو جانے کے بعد دشمن ان کے بجائے اپنا دوسرا متبادل روٹ پلان استعمال کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہمارے پھیلائے ہوئے دام فریب میں آ گئے اور ہم نے انہیں شکست دے دی۔''

ولسن پتھر کے کسی مجسمے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ سر جیر اللہ کے خاموش ہونے پر وہ اس طرح بولا جیسے سر جیر اللہ سے زیادہ خود اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

''ہم نے اس کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ وہ ناکام ہو۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس میں پہلے جیسی چستی اور پھرتی نہیں رہی تھی۔ برسوں سے کسی مہم میں حصہ نہیں لے سکا تھا اور پھر اپنی صلاحیتوں پر اتنا نازاں بھی تھا کہ وہ دوسروں کے سامنے یہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ ہم جانتے تھے کہ اس کا فخر و ناز اسے انکار کرنے سے باز رکھے گا اور ہم یہ بھی جانتے تھے یا ہمیں کم سے کم یقین کی حد تک معلوم تھا کہ اس کام کے دوران اس سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور سرزد ہو گی اور ہم نے اس کا انتخاب دانستہ طور پر اسی لیے کیا تھا کہ اس سے غلطی ہو اور وہ مارا جائے۔''

''اور ہمارا منصوبہ بے حد کامیاب رہا۔ ہم جیت

گئے۔'' سرجیر اللہ نے کہا۔

''ہاں۔ ہم کامیاب ہو گئے۔'' ولسن نے پہلی مرتبہ سرجیر اللہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ڈی ہوگ مرنے سے پہلے مسکرا دیا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ بھی جان چکا تھا۔ تم مجبور ہو سرجیر اللہ..... ڈی ہوگ مرنے سے قبل ہماری اسکیم سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم نے اس کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ ہمیں اس کی ناکامی کا یقین تھا۔''

سرجیر اللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دفتر میں سکوت چھایا رہا اور اس کی آنکھیں ولسن کو گھورتی رہیں۔ اچانک ولسن اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''میں اس کام سے بھر پایا سرجیر اللہ۔ یہ میری آخری مہم تھی، اس کے بعد میں اس قسم کا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں اسکاٹ! ہم ایسا کرنے پر مجبور تھے۔'' سرجیر اللہ نے جواب دیا۔ ''میری خواہش تھی کہ یہ دنیا اس سے کہیں بہتر جگہ ہوتی جیسی کہ اب ہے لیکن ایسا نہیں ہے...... اور جب تک یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے گی ہمیں بھی اپنے کام اسی کے مطابق انجام دینا پڑیں گے اور جو کچھ تم نے کیا اسے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔''

''نہیں۔ اب اس طرح سے کوئی کام نہیں ہوگا یا کم از کم میں نہیں کر سکوں گا۔'' ولسن بولا۔ ''مجھے اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں کسی دوسرے شخص کی جان لینے سے کوئی انکار نہیں کیونکہ یہ محض ایک موت ہوتی لیکن ڈی ہوگ جانتا تھا کہ ہم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ہم نے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کی ناکامی ہماری کامیابی تھی اور اس کی زندگی کے اس آخری لمحے میں جبکہ وہ ہمارے منصوبے..... یا شاید ہماری سازش سے باخبر ہو گیا تھا۔ اس آخری لمحے میں ڈی ہوگ کے ذہن کے اندر کیا ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت کیا کچھ محسوس کر رہا تھا شاید تم اسے محسوس نہ کر سکو... سرجیر اللہ! مگر میں اسے یہاں بالکل اسی طرح محسوس کر رہا ہوں جس طرح ڈی ہوگ نے محسوس کیا ہوگا۔ زندگی کی اس آخری گھڑی میں ہم نے اس کے فخر کو پامال کر دیا تھا۔ اس کے غرور کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچائی تھی اور یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کے لیے کم سے کم میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔''

ولسن تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ سرجیر اللہ نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا مگر ولسن اس کا جواب سننے کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی بات ختم کرتے ہی تیزی سے گھوما اور دروازے کا ہینڈل گھماتے ہوئے باہر نکل گیا۔

باہر سڑک پر آکر وہ اس چھوٹے بار میں گھس گیا جو اسے راستے میں نظر آیا۔ اور جاتے ہی ایک مشروب...... کا آرڈر دیا۔ چند گھونٹوں میں گلاس خالی کرنے کے بعد اس نے دوسرا گلاس لانے کے لیے کہا۔ کاؤنٹر کے سامنے ہی ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ ولسن نے آئینے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھا تو ایسا لگا کہ اس کا اپنا چہرہ نہیں بلکہ ڈی ہوگ کا چہرہ ہے جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔ ''یہ محض ایک کام نہیں ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ یہ ایک پوری زندگی ہے..... اور جب ہم اس سایوں سے بھری ہوئی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو ہمارے پیچھے ایک دروازہ بند ہو جاتا ہے...... اور جب ہم ریٹائر ہوں گے تو ہم ایک ایسی دنیا میں قدم رکھیں گے جسے ہم بالکل نہیں جانتے۔''

ولسن شراب پیتا رہا اور آئینے میں ڈی ہوگ کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا اور تب بالکل اچانک ہی اس پر ڈی ہوگ کے دم مرگ اس عجیب انداز میں مسکرانے کا راز کھل گیا۔ ڈی ہوگ کو بالکل ابتدا سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس مہم کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ بالکل شروع سے کسی انجانے طریقے سے۔ ہاں ڈی ہوگ جان گیا تھا کہ اس کا انتخاب صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ ناکام ہو۔ موت سے ہمکنار ہو کیونکہ اس کی موت ہی اصل میں اس مہم..... اس فرض کی کامیابی ہے۔

اور ولسن ایک طویل وقت تک بار میں بیٹھا آئینے کو گھورتا رہا..... وہ مشروب کا وہ دوسرا گلاس بھی پینا بھول گیا تھا جس کا اس نے آرڈر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا..... اپنی بیوی کے بارے میں..... اپنے بچوں کے بارے میں۔ اپنی دنیا اور اپنے کام کے بارے میں۔ یہ کیسی لعنتی دنیا تھی اور یہ کیسا لعنتی کام تھا لیکن اس دنیا کے علاوہ آخر کوئی اور دنیا بھی تو نہیں۔

کافی دیر کے بعد ولسن بار سے نکلا اور اس جانب واپس چل دیا جہاں وہ جانتا تھا کہ سرجیر اللہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اسے پال ڈی ہوگ کا خیال آیا جو یہ جانتے ہوئے موت سے ہم آغوش ہو گیا کہ اسے اسی مقصد کے لیے مہم میں شامل کیا گیا تھا کیونکہ یہ اس کا کام تھا۔ اس کا فرض تھا اور کیونکہ شاید ولسن کی طرح اسے بھی یہ توقع ہو کہ ایک نہ ایک دن اس کی اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی یہ قربانیاں اپنا رنگ ضرور دکھائیں گی۔

❋❋❋

شیریں فرہاد
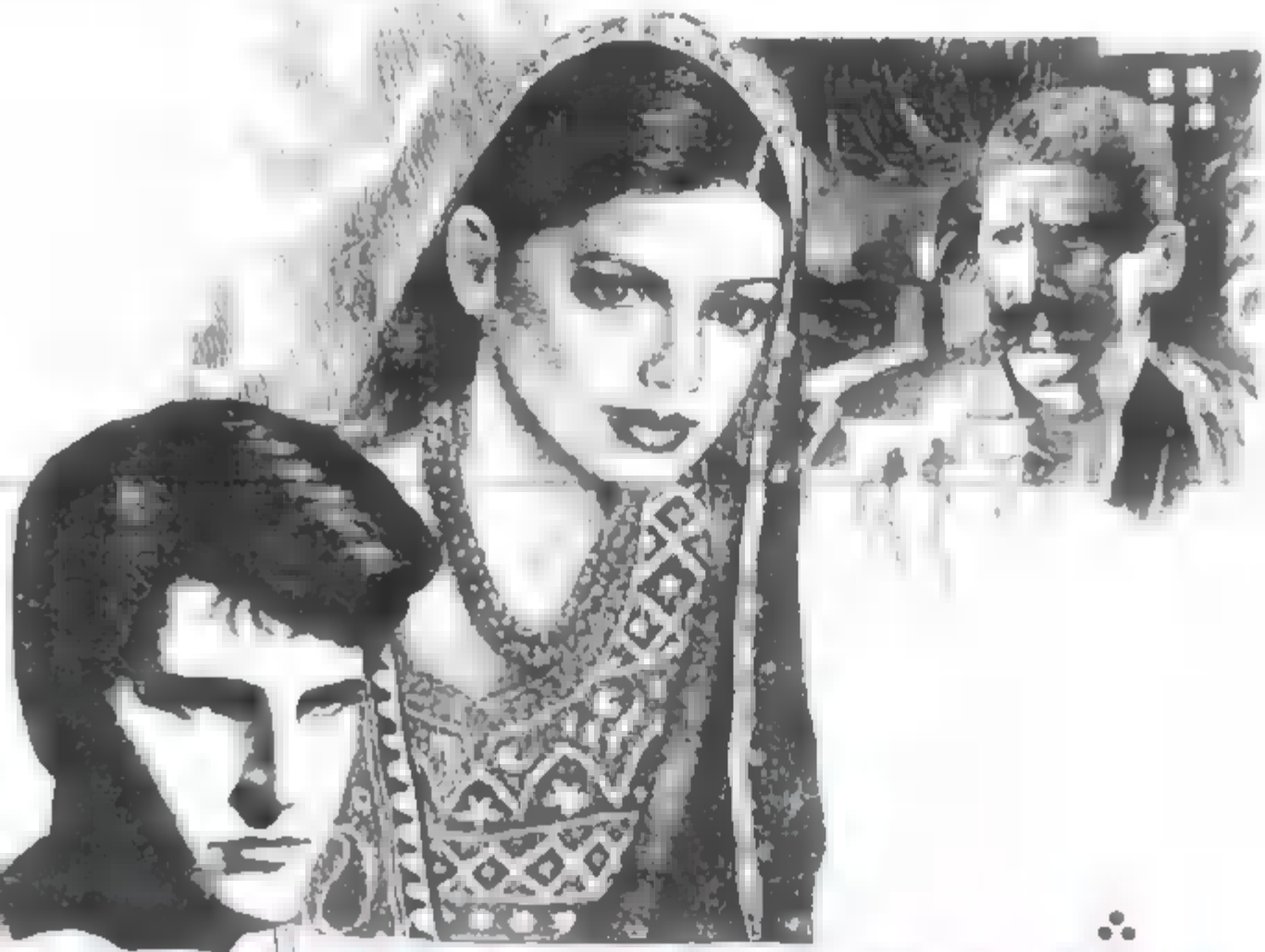
ایم اقبال

عشق کا وار اتنا کاری ہوتا ہے کہ جس پر چل جائے پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے پرانے ہو کر آج بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ زندہ ہیں۔ چاہت کے اس جذبے نے جس کے بھی دل میں گھر کیا اسے پھر گھر کا سکون نصیب نہ ہوا اور جسے مل گیا گویا اس سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں پھر کوئی نہیں ہو سکتا...

پچاس سال پورے ہونے پر قارئین کے لیے

مصنف کا ایک خوب صورت تحفہ

شام ہونے میں بہ مشکل آدھا گھنٹا رہ گیا تھا۔ صبیحہ اپنی حویلی کی پہلی منزل کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ دوربین آنکھوں سے لگائے وہ اپنی زمینوں پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ یہ اس کا مشغلہ تھا کہ شام کے وقت کسانوں کو کام کرتے اور پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے دیکھے۔ ان کے گھروں کے منظر بھی دوربین سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

یہ حویلی مشرقی جاگیر والوں کی حویلی کہلاتی تھی جو کسی محل کی طرح بے حد وسیع رقبے میں بنائی گئی تھی۔ ایک عی

خاندان کے کئی گھرانے اس حویلی میں رہتے تھے۔ ان گھرانوں کو منقسم اور غیر منقسم اس لیے کہا جا سکتا تھا کہ درمیانی دیواروں میں دو، دو دروازے تھے جن سے تمام گھرانے ایک دوسرے کے حصوں میں آجا سکتے تھے۔

صبیحہ نے سنا تھا کہ مغربی جاگیر والوں کی حویلی بھی کسی محل ہی کی طرح تھی اور وہاں بھی ایک ہی خاندان کے کئی گھرانے منقسم اور غیر منقسم تھے۔ دونوں ہی جاگیروں کی وہ حویلیاں کچھ ایسے زاویوں سے بنی تھیں کہ دوربین سے بھی کوئی دوسری حویلی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دونوں ہی جاگیر والے ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن کئی نسلوں سے ان کے درمیان خوف ناک دشمنی چلی آرہی تھی۔

ملک کا ایک بہت بڑا شہر ان جاگیروں سے بارہ پندرہ میل کے فاصلوں پر تھا لیکن وہاں کی پولیس کو یہاں کے خون خرابے کا علم ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ دونوں ہی جاگیروں کے لوگ اپنے جھگڑے خود ہی نمٹا لیتے تھے۔

☆☆☆

نوشین کی گھوڑی اس کی اور اس کے باپ کی سدھائی ہوئی تھی لیکن اس شام نوشین جب گھوڑی پر سوار ادھر ادھر سیر گشت کر رہی تھی تو گھوڑی شاید کوئی سانپ دیکھ کر بدک گئی۔ نوشین کے قابو میں نہیں آئی۔ نوشین گھوڑی کی گردن سے لپٹ گئی۔ جلد ہی نوشین نے محسوس کیا کہ گھوڑی ایک پگڈنڈی پر دوڑ رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ گھوڑی مشرقی یا مغربی جاگیروں میں سے کسی کے علاقے میں گھس گئی ہے۔ نوشین کے لیے یہ پریشانی کی بات تھی۔ اسے دونوں جاگیروں کے جھگڑوں کا علم تھا لیکن خون خرابے کا علم نہیں تھا۔

ایک مرتبہ گھوڑی ایک کھائی پر جست لگا کر دوسری طرف پہنچی تو نوشین کو اس پر ذرا بھی قابو نہیں رہا۔ وہ گھوڑی سے اچھل کر ایک طرف گری اور اسے جسم کے کئی حصوں پر چوٹیں لگنے کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھ نہیں سکی۔ اس کے ٹخنے میں شدید چوٹ آئی تھی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اس نے پرس سے اپنا موبائل نکالنا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا پرس بھی اس کے شانے سے نکل کر کہیں جا گرا تھا۔ اس نے ہر طرف نظر دوڑائی لیکن پرس دکھائی نہیں دیا۔

گھوڑی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ نوشین نے گھوڑی کو ایک گالی دی اور سوچنے لگی کہ اب کیا کرے؟ اسے بس یہ سوجھا کہ گھسٹتے ہوئے ہی واپس چلے کیونکہ ٹانگ تو اسے کھڑا ہونے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اسے اس طرح چلتے ہوئے دس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ اس نے عقب میں ایسی آواز سنی جیسے کوئی گاڑی آرہی ہو۔ اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہ ایک کار تھی جو تیزی سے اس کی طرف آرہی تھی۔

نوشین اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ اس کار میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کے لیے مددگار ثابت ہوں گے یا اس کے لیے ایک پریشانی کا سبب بنیں گے۔ کار اس کے قریب آکر رک گئی۔ نوشین نے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان محسوس کیا کہ کار سے ایک نوجوان لڑکی اور ایک ادھیڑ عمر عورت اتری تھیں۔ عورت کے لباس اور وضع قطع سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ملازمہ ہوگی البتہ لڑکی فیشن ایبل تھی اور وہی اس کار کی مالک ہو سکتی تھی۔ وہ دونوں لپک کر نوشین کے قریب آگئیں۔ نو وارد لڑکی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''شاید تم نوشین خان ہو، آرٹسٹ، پینٹر؟''

''ہاں۔'' نوشین نے دھیمی آواز میں کہا۔ تکلیف کی وجہ سے اس کی آواز نڈھال سی تھی ورنہ عام حالات میں پینٹر ہوتے ہوئے بھی نہایت شوخ و شنگ لڑکی تھی۔

''تم خاصی زخمی ہو۔ تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اپنی حویلی میں لے جا سکتی ہوں۔ وہاں ہمارے خاندان کے دو ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر ہر وقت رہتے ہیں۔''

''میری خاطر آپ کیوں اپنی راہ کھوٹی کرتی ہیں۔ آپ کہیں جا رہی ہوں گی۔'' نوشین نے کہا۔

''میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔'' جواب میں کہا گیا اور ملازمہ کو ہدایت کی کہ وہ نوشین کو اٹھا کر کار کی پچھلی نشست پر لٹائے۔

ملازمہ مضبوط جسم کی مالک تھی۔ اس نے نوشین کو اٹھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ دروازہ لڑکی نے کھولا تھا۔

یہ امداد نوشین کے لیے نعمت غیر مترقبہ جیسی تھی۔

''میرا نام صبیحہ ہے۔'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا گیا۔ ''میں نے تمہارے گھوڑے کو بدکتے اور تمہیں گرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا اپنی حویلی کی ایک کھڑکی سے۔''

''وہ گھوڑا نہیں گھوڑی ہے۔'' نوشین بول پڑی۔

''وہ کچھ بھی ہو، اس سے مجھے کیا لینا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ تم کھڑی نہیں ہو سکی تھیں اس لیے میں تمہاری مدد کے لیے کار لے کر دوڑ پڑی۔''

''مہربانی آپ کی۔''

''مجھے تو اچھا لگ رہا ہے کہ میں ایک پینٹر کے کام

آ رہی ہوں۔ میں نے شہر کی آرٹ گیلری میں ایک ماہ پہلے ہی کچھ پینٹنگز دیکھی تھیں اور تمہیں بھی وہاں دیکھا تھا۔"

حویلی پہنچ کر نوشین کو فوری طبی امداد دی گئی۔ زخموں پر دوائیں لگائی گئیں اور جہاں ڈریسنگ کی ضرورت تھی، وہاں ڈریسنگ بھی کی گئی۔

"یہ پرسوں تک ٹھیک ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر نے صبیحہ سے کہا۔ "اور یہ ہیں کون؟ تم انہیں کہاں سے لائی ہو؟"

نوشین کو صبیحہ پہلے ہی بتا چکی تھی کہ حویلی کے ڈاکٹر اور لیڈی بھی خاندان ہی کے لوگ ہیں۔

"پاپا بہت پریشان ہوں گے۔" نوشین بولی۔ "کافی دیر ہو چکی ہے مجھے گھر سے نکلے ہوئے۔"

"تم رہتی کہاں ہو؟" صبیحہ نے پوچھا۔

"شمال میں بیس میل دور ایک چھوٹی سی جاگیر ہے۔"

"تم بھی جاگیردار خاندان کی ہو؟" صبیحہ چونکی۔

"نہیں۔" نوشین نے جواب دیا۔ "میرے پردادا تو کسان ہی تھے لیکن ان کا دماغ بہت اونچا سوچتا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر کوئی کاروبار کیا تھا۔ پردادا کے بعد دادا نے سارا کام سنبھالا اور اتنا سرمایہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے کہ میرے والد نے اب کچھ کرنا ہی گوارا نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اب زندگی [illegible] گئی ہے [illegible] محنت نہ کی جائے۔ اب وہ [illegible] اور کتابیں پڑھتے ہیں۔ اتنا سرمایہ ہے کہ وہ میری شادی کر کے بھی قلاش نہیں ہوں گے۔" نوشین نے وضاحت سے بتا دیا۔

"کہاں کرو گی شادی؟" صبیحہ مسکرائی۔

"جب بھی کوئی تراش خراش کا آدمی مل گیا۔"

"باتیں اچھی بنا لیتی ہو۔" صبیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خیر... تم اپنے والد کا فون نمبر دو۔ میں اپنے فون سے تمہاری بات کرا دیتی ہوں۔ پریشان تو وہ ہوں گے۔"

نوشین نے نمبر بتا دیا۔ پھر اس نے اپنے باپ کو سارے حالات سے آگاہ کیا۔

"یہ اچھا ہوا کہ تم مشرقی جاگیر میں کسی لڑکی کی مہمان ہیں۔ مغربی جاگیر والے مجھے زیادہ دور پڑتے۔ میں ابھی آتا ہوں کسی طرح تمہیں لینے۔"

نوشین نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر صبیحہ سے کہا۔ "وہ ابھی آنا چاہتے ہیں مجھے لینے۔"

"کوئی حرج نہیں، آ جائیں لیکن مناسب یہ ہوگا کہ وہ فی الحال تمہیں اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔"

☆☆☆

مغربی جاگیر کی وسیع و عریض حویلی کی ایک شاندا[illegible] خواب گاہ کے بستر پر دانش چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی نظریں [illegible] چھت سے لگی ہوئی تھیں۔ چہرہ بالکل سپاٹ تھا، تکلیف کی [illegible] کوئی جھلک نہیں تھی حالانکہ اس کا بایاں شانہ گردن کے قریب [illegible] سے بازوؤں تک پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا جس پر خون کے د[illegible] ایک داغ تھے۔

بستر کے قریب ہی کرسیوں پر اس کی ماں سکینہ بی بی [illegible] بیٹھی تھیں جن کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے۔ دوسری کرسی [illegible] پر بابا پیر بیٹھے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"دیکھو بیٹا جذباتیت سے کوئی فائدہ نہیں۔ کئی نسلوں [illegible] سے چلتے ہوئے انتقامی جذبات کو اب ٹھنڈا ہونا چاہیے جس [illegible] کے لیے میں کوشش تو کر رہا ہوں لیکن اس میں وقت لگے گا۔"

ستر سالہ بابا پیر کا .... تعلق مشرقی جاگیر اور مغربی [illegible] جاگیر کے خاندانوں سے یکساں تھا اور دونوں طرف کے لوگ [illegible] ان کی عزت کرتے تھے لیکن ان کے لیے بھی نسلوں سے چلتے [illegible] ہوئے انتقامی جذبات اور خون خرابے کو صلح میں تبدیل کر[illegible] آسان ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

تین سال میں دونوں طرف کے چند افراد مارے جا[illegible] چکے تھے۔ گزشتہ ہفتوں سجاد نے جمیل یا دانش کو ختم کرنے کی [illegible] قسم کھائی تھی کیونکہ ان کے باپ کو اذیت پہنچی تھی جیسے اس [illegible] کے باپ نے اپنے کسی قریبی عزیز کے قتل پر اذیت اٹھائی [illegible] تھی۔ اس خون خرابے سے دونوں ہی طرف کی خواتین بہت [illegible] نالاں تھیں اور وہی صلح صفائی کی اس مہم میں در پردہ رہ کر بابا پیر کی مدد کر رہی تھیں۔

ایک دن پہلے سجاد نے دانش پر گولی چلائی تھی لیکن اس [illegible] کا نشانہ خطا گیا تھا۔ گولی مونڈھے کے قریب بازو کے [illegible] اندرونی حصے کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی جس کے نتیجے میں دانش [illegible] اس وقت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں پیر بابا؟" آخر دانش نے [illegible] زبان کھولی۔

"تم اب سجاد کے دشمن ہو گئے۔ اب تم مارے جاؤ [illegible] سجاد، انتقامی سلسلہ تو برقرار رہے گا جبکہ میں اس سلسلے کو ختم کرنا [illegible] چاہتا ہوں۔ تم سجاد کو مارنے کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو [illegible] اور اپنے بھائی جمیل کے ساتھ کچھ عرصے کے لیے سمندر پار [illegible] کسی ملک میں چلے جاؤ۔ تم سے یہ باتیں کرنے سے پہلے [illegible] تمہارے والد سے بھی بات کر چکا ہوں۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اور جمیل اپنی اپنی [illegible] پیشانی پر بزدلی کا ٹیکا لگا لیں۔" اس مرتبہ دانش کے لہجے میں [illegible]

تلخی تھی۔

”نہیں، یہ بزدلی نہیں، مصلحت ہوگی۔ میں کچھ دنوں میں دونوں خاندانوں کی صلح ضرور کرا دوں گا۔ اس وقت تم دونوں بھائیوں کو واپس بلا لیا جائے گا۔“

”لیکن اس وقت تو......“

”نہیں، تمہیں بزدل نہیں کہا جائے گا۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر سب سے کہوں گا کہ میں نے ہی تم دونوں کو باہر جانے پر مجبور کیا ہے۔ تم نے آکسفورڈ میں وحشیانہ زندگی گزارنے کی تعلیم تو حاصل نہیں کی ہوگی...... ہمیں چاہیے کہ ان دونوں خاندانوں کو مہذب دنیا کے دھارے میں لایا جائے۔ کیا تم ایسا نہیں چاہو گے؟“

دانش خاموشی سے کچھ سوچنے لگا۔

”بابا پیر کی بات مان جاؤ بیٹا۔“ سکینہ بی بی بول پڑیں۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

دانش نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا، پھر بابا پیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے اس بارے میں جمیل سے بات کی؟“

”کر چکا ہوں۔ اس نے زیادہ حجت کیے بغیر میری بات مان لی ہے اور میں ابھی تمہارے والد سے یہ کہہ کر اٹھا ہوں کہ تم سے اپنی بات منوائے بغیر آج اس حویلی سے نہیں جاؤں گا۔“

”سجاد سے بھی بات کی ہے آپ نے؟“

”وہ کیونکہ معقول تعلیم سے بے بہرہ ہے اس لیے میں نے اس سے بات نہیں کی ہے۔ ضدی اور اجڈ سمجھتا ہوں میں۔ اس کے بڑوں سے بات کروں گا۔ تمہارا یہ معاملہ کیونکہ تازہ تازہ ہے اس لیے میں نے سوچا کہ پہلے تم دونوں کو یہاں سے نکال دوں۔“

”کہاں چلے جائیں ہم دونوں؟“ دانش نے پژمردگی سے پوچھا۔

”جمیل نے تو سوئٹزرلینڈ کا نام لیا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ دانش نے کہا۔ ”میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کہاں جانا ہے۔ جمیل نے یہ نام لیا ہے تو یہی سہی۔“

سکینہ بی بی کا چہرہ کھل اٹھا۔

دانش نے ہامی بھر لی تھی لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی یہ ہامی بادل ناخواستہ تھی۔

بابا پیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ”تم دیکھنا بیٹا کہ یہ زمین خوشیوں کا گہوارا بن جائے گی۔“

”کیا دانش نے مان لیا؟“ دانش کے والد محسن قزلباش کمرے میں داخل ہوئے۔

”ہاں محسن میاں!“ بابا پیر نے جواب دیا۔ ”اور مجھے امید ہے کہ میں مشرقی محاذ پر بھی یہ جنگ جیت کر رہوں گا۔ بس سجاد کی جہالت سے کچھ دیر لگ سکتی ہے۔“

”مشرقی محاذ“ سے بابا پیر کی مراد ”مشرقی جاگیر“ ہی ہو سکتی تھی۔

بابا پیر نے مزید کہا۔ ”آپ کی طرف کی عورتوں کی طرح وہاں کی عورتیں بھی میری مدد کر رہی ہیں۔ آج صبح سجاد کی بہن صبیحہ سے ملا تھا میں...... اس نے اس پر افسوس کا اظہار بھی کیا تھا کہ سجاد نے دانش پر گولی چلائی تھی اور اس بات پر خوشی کا اظہار بھی کیا تھا کہ گولی نے کوئی خطرناک کام نہیں کیا۔ ڈاکٹر کے خیال کے مطابق ایسا ہی ہے نا محسن میاں کہ دانش کا زخم مندمل ہونے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ شاید ہفتے بھر کی بات ہے۔“

”تو میں ابھی دس دن بعد کے لیے کسی فلائٹ میں چار سیٹیں بک کرائے لیتا ہوں۔“

”چار سیٹیں؟“ دانش نے الجھی ہوئی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ محسن قزلباش نے کہا۔ ”احتیاط ضروری ہے۔ شاید سجاد کو کسی طرح معلوم ہو جائے کہ جمیل اور دانش کہاں گئے ہیں اور وہ بھی سوئٹزرلینڈ پہنچ جائے۔ وہاں ان دونوں کی حفاظت کے لیے اپنے دو باڈی گارڈز بھی ان کے ساتھ بھیجوں گا۔“

”لیکن بابا آپ؟“ دانش بولا۔ ”آپ باڈی گارڈز کے بغیر......“

”نہیں۔“ محسن قزلباش نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ ان باڈی گارڈز کے جاتے ہی میرے لیے دو اور باڈی گارڈز آ جائیں گے۔“

”تم یہ مناسب سمجھ رہے ہو تو ٹھیک ہے۔“

”جمیل کو تاکید کر دیجیے گا۔“ دانش نے سکینہ بی بی سے کہا۔ ”وہ ان دس دنوں میں گھر سے باہر نہ نکلے۔“

”اس کو میں سمجھا دوں گا۔“ محسن قزلباش نے کہا۔

دانش نے خاموشی اختیار کر لی۔ چہرہ اس کا اب بھی سپاٹ تھا۔ غالباً بابا پیر کی منصوبہ بندی نے اس کے دماغ میں چبھن سی پیدا کر دی تھی۔ اس کے لاشعور میں یہ خیال کلبلا رہا تھا کہ یہ سب کچھ بابا پیر کو جتنا آسان نظر آ رہا ہے، اتنا آسان نہیں ہے۔ اسے سارا خدشہ ہٹ دھرم سجاد ہی کی

طرف سے تھا۔

اس کی اور جمیل کی نوجوان بہن شاہدہ نے جب دونوں بھائیوں کی بیرونِ ملک روانگی کی منصوبہ بندی کے بارے میں سنا تو روہانسی ہو گئی۔ سکینہ بی بی نے اسے مصلحت کے تقاضے سمجھائے تو وہ سنبھلی ورنہ رونا شروع کر دیتی۔

☆☆☆

شرقی جاگیر کی حویلی میں صبیحہ نے نوشین کو اپنے بستر ہی پر لٹا لیا جو خاصا چوڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پرسوں صبح تمہارے پاپا تمہیں لینے کے لیے آ ہی جائیں گے۔ کل رات تک تمہارے یہ معمولی زخم بھی ختم ہو جائیں گے لیکن رات کو جانے سے بہتر ہے کہ کل رات بھی یہیں آرام کرو۔“

”چکر کیا ہے بی بی جی!“ نوشین نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ ”اتنی مہربانیوں کا کچھ مقصد تو ہو گا ناں۔“

”بے شک ہے۔ میں نے تمہیں بہ حیثیت پینٹر خاصا پسند کیا ہے اور اسی سلسلے میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ شہر کی گیلری میں، میں نے تمہاری پینٹنگز دیکھی تھیں اور ان میں سے دو مجھے اتنی پسند آئی تھیں کہ میں نے موبائل سے ان کی تصویریں اتار لی تھیں اور سوچا تھا کہ بعد میں کسی وقت تم سے ملوں گی اور ان پینٹنگز کے بارے میں تم سے بات کروں گی۔ تم ایک اچھی پینٹر ہو اس لیے تمہارا پتا معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا۔“

”تم نے کن پینٹنگز کی تصویریں اتاری تھیں؟“

”ابھی دکھاتی ہوں۔“ صبیحہ نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

نوشین نے وہ تصاویر دیکھیں اور ہنس پڑی۔

صبیحہ پھر بولی۔ ”مجھے سرسبز علاقے، برفیلے پہاڑ اور پھول بہت پسند ہیں۔ تمہاری بھی پینٹنگز نے مجھے متاثر کیا تھا کیونکہ وہ ایسے ہی قدرتی مناظر کی تھیں۔“ وہ پل بھر کے لیے خاموش ہوئی، پھر اس نے پوچھا۔ ”تم ہنسی کیوں تھیں؟“

”میں آپ کو صاف صاف بتا دیتی ہوں۔ یہ سب مناظر تخیلاتی ہیں۔ صرف ان دو پینٹنگز میں، میں نے بڑی حد تک نقل کی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”گوگل پر میرے بارے میں کچھ آیا تھا۔ ان میں ان دو پینٹنگز کا ذکر ہی نہیں تھا بلکہ ان کی تصویریں بھی موجود تھیں۔ کسی نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا اور سچ لکھا تھا کہ یہ دونوں مناظر سوئٹزرلینڈ کے ہیں جن میں پینٹر نوشین خاں نے بڑی چابک دستی سے تبدیلیاں کی ہیں۔ ان سے یہ مناظر اور زیادہ خوب صورت ہو گئے ہیں۔“

”واہ۔“ صبیحہ نے بے ساختہ کہا۔ ”سوئٹزرلینڈ کے بارے میں تو میں نے سنا ہے کہ وہ حسین مناظر سے بھرا پڑا ہے۔“

”میں نے بھی سنا ہے ...... اور اس کے بارے میں پڑھا بھی ہے۔ میری بڑی شدید خواہش رہی ہے کہ میں سوئٹزرلینڈ جاؤں اور ان مناظر کو کینوس پر منتقل کروں۔“

”اگر تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے تو؟“

”ممکن ہی نہیں۔“ نوشین نے مایوسی سے کہا۔ ”میرے والد کے پاس اتنا پیسا نہیں کہ وہ میرے لیے اتنے اخراجات برداشت کر سکیں۔“

”اور اگر کوئی وہ اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو؟“

”میرا دل تو گارڈن، گارڈن ہو جائے گا۔“

”تم بعض اوقات ایسے جملے بول جاتی ہو کہ گمان ہوتا ہے تم پینٹر نہیں ہو۔ یہ مصور حضرات تو بڑے کم گو اور اپنے خیالات میں گم سم نظر آتے ہیں لیکن تم میں چلبلاہٹ ہے۔“

”میں زندگی کو انجوائے کرنے کی قائل ہوں۔“

”میری بات کا تم نے مبہم جواب دیا۔“

”کون سی بات؟“

”یہی تم سوئٹزرلینڈ جا کر وہاں کے مناظر بنا کر لاؤ۔“

”میں نے کہا تو تھا کہ میرے پاپا اتنے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔“

”میں کر سکتی ہوں برداشت۔“

”کیا؟“ نوشین نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔“ صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”گھر میں ایک مرتبہ میری شادی کی بات چلی تھی تو میں نے کسی کے ذریعے اپنے بڑوں کو اپنی اس خواہش سے آگاہ کیا تھا کہ میری شادی کے لیے ایک نیا ہال بنوایا جائے جس کی دیواروں پر سرسبز مناظر کی پینٹنگ کے فریم آویزاں ہوں۔ اس کی آرائش سوئٹزرلینڈ کے مناظر سے بنی پڑی ہو۔ میں عاشق ہوں وہاں کے مناظر کی۔“

”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہو گی یا نہیں ...... یا یوں کہہ لو کہ ہو سکے گی یا نہیں۔“ صبیحہ کچھ افسردہ ہو گئی۔

”کیوں؟“

”وجہ ہے اس کی؟“

”بتاؤ گی نہیں؟“

صبیحہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ”کیا میں یقین کر

لوں کہ تم یہ راز کسی کو نہیں بتاؤ گی۔‘‘

’’مجھے چاندنی راتیں بہت پسند ہیں تو بس میں چاندنی راتوں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمہارا راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔‘‘

صبیحہ پھر چند لمحے رک کر بولی۔ ’’میں نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہیں مجھے کوئی پسند آ گیا تھا لیکن اس کی نوبت کبھی نہیں آئی کہ میں اس سے اظہار محبت کر سکوں۔ حصول تعلیم کے بعد وہ اور میں ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ میں بہت دل شکستہ تھی کہ دوبارہ اس تک کیسے پہنچوں لیکن یہاں آ کر مجھے پتا چلا کہ وہ تو مغربی جاگیر کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ایک بار میں اسے دیکھ بھی چکی ہوں اور اب پہلے سے زیادہ دل شکستہ ہوں۔ امکان نہیں کہ میری شادی اس سے ہو سکے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’تم نہیں جانتیں مشرقی اور مغربی جاگیر کے لوگ ایک دوسرے کے شدید دشمن بن چکے ہیں۔ اگر ہماری طرف کے کسی کسان کی بھینس، گائے یا بکری بھی ان کے علاقے میں چلی جائے تو وہ اسے گولی مار دیں گے یا اپنے قبضے میں کر لیں گے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری بدکی ہوئی گھوڑی اب کہاں ہوگی؟‘‘

’’یہ تو بابا ہی کسی طرح معلوم کر سکیں گے۔‘‘

’’یقین کرو کہ اگر وہ مشرقی جاگیر کے علاقے میں چلی گئی ہوگی تو یا تو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہوگا یا وہ وہاں کسی کے قبضے میں چلی گئی ہوگی۔ بہت عرصے پہلے ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا کہ ہمارے کسانوں کی بھینس غلطی سے ان کے علاقے میں چلی گئی تھی۔ اسے گولی مار دی گئی۔ اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے باعث جھگڑے بڑھتے چلے گئے اور پھر خون خرابے کی نوبت آ گئی۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ میرے بڑے بھائی نے مغربی علاقے کے ایک نوجوان کو گولی مار کر ہلاک کرنا چاہا تھا لیکن وہ بچ گیا ہے۔ نشانہ چوک گیا تھا۔‘‘

نوشین نے سر ہلا کر کہا۔ ’’بابا سے میں نے ان جاگیروں کے اختلاف کی باتیں تو سنی تھیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ بات خون خرابے تک جا چکی ہے۔‘‘

’’کیا تم جاننا چاہو گی کہ گولی کس پر چلائی گئی تھی؟‘‘

نوشین سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

صبیحہ نے کہا۔ ’’جس پر گولی چلائی گئی تھی، اس کا نام دانش ہے اور وہی میرا محبوب ہے۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ نوشین کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

’’ان حالات میں۔‘‘ صبیحہ پھر بولی۔ ’’یہ مشکل ہی نظر آتا ہے کہ میں اور دانش ایک ہو سکیں لیکن اگر دانش سے میری شادی نہ ہو سکی تو پھر میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ بس ایک چھوٹی سی امید ہے کہ شاید بابا پیر ان خاندانوں میں صلح کرا دیں۔ وہ اس کے لیے بہت کوشش کر رہے ہیں۔‘‘

’’یہ بابا پیر کون ہیں؟‘‘

’’ایک بزرگ ہیں۔ ان کی کٹیا ہماری جاگیروں کے درمیان ہے اور وہ واحد شخص ہیں جن کو مشرقی جاگیر کے لوگ بھی مانتے ہیں اور مغربی جاگیر کے لوگ بھی مانتے ہیں۔ اسی لیے کچھ امید ہے کہ دونوں طرف کے لوگوں میں صلح ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو پیر بابا ہی میری شادی دانش سے کرا دیں گے۔ وہ شادی اسی ہال میں ہوگی جو بہت جلد بننا شروع ہو جائے گا۔ اسی کی دیواروں پر...... ابھی بتایا تو ہے میں نے...... اور میں چاہتی ہوں کہ ان مناظر کو تم ہی کینوس پر بنا کر لاؤ۔ سارے اخراجات میں اٹھاؤں گی۔‘‘

’’اس میں ایک رکاوٹ آ سکتی ہے۔ شاید پاپا اس کے لیے تیار نہ ہوں کہ میں اتنی دور اور ایک مغربی ماحول میں چلی جاؤں۔‘‘

’’تمہارے پاپا کو منانے کی ذمے داری میں لیتی ہوں۔‘‘

’’خدا کرے تم کامیاب ہو جاؤ۔ سوئٹزرلینڈ جانا میرا خواب ہے۔‘‘

’’بس تو پھر سمجھو کہ بہت جلد کام ہو جائے گا۔‘‘ صبیحہ نے جماہی لے کر کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ اب سونا چاہیے۔ میں زیادہ دیر تک جاگنے کی عادی نہیں ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، سو جاؤ۔ باتیں کرنے کے لیے تو کل کا دن اور رات پڑی ہے۔‘‘

نوشین بھی جلدی ہی سوتی تھی لیکن اس رات دیر سے سو سکی۔ سوئٹزرلینڈ کے مناظر اس کے دماغ میں چکراتے رہے۔

دوسرا دن بھی اس کا خوشگوار گزرا۔ صبیحہ اس کی اتنی جلدی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔

’’شام تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔‘‘ صبیحہ نے کہا۔ ’’کل تم اطمینان سے اپنے گھر جا سکو گی۔‘‘

’’میں کل سے تمہارے ہی کمرے میں ہوں۔ تمہارے گھر والے ......‘‘

’’ان میں سے کچھ نے تمہیں کل ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم میری بہت اچھی دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی پینٹر بھی ہو۔ میں تم ہی سے نئے ہال کی پینٹنگز بنواؤں گی۔ تم میرے بلاوے پر ہی آ رہی تھیں کہ راستے میں چھوٹا سا حادثہ ہو گیا۔ تم زخمی ہو گئی تھیں جس کے

بعد میں ہی تمہیں حویلی لائی تھی۔"

"وہ کیوں؟ مجھے سمجھ نہیں آیا؟"

"مردوں کو اپنے کام سے کام ہے اور عورتیں اس پریشانی میں پڑی ہوئی ہیں کہ بابا جبر کب تک کچھ کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ سب اسی بارے میں باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ان باتوں سے کسی کو دلچسپی نہیں کہ کس کا دوست آرہا ہے، کس کا جا رہا ہے۔"

انہی باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔

نوشین کے والد داؤد جان اپنی بیٹی سے ملنے آئے اور آدھے گھنٹے بعد چلے گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ نوشین کو اپنے ساتھ لے جائیں لیکن صبیحہ کے شدید اصرار پر وہ نوشین کو لیے بغیر چلے گئے۔

"کل آپ زحمت نہ کیجیے گا۔" صبیحہ نے ان سے کہا تھا۔ "میں خود آؤں گی اسے لے کر۔ وہاں گھر پر اس کی جو پینٹنگز ہیں، وہ دیکھنا ہیں مجھے۔"

باپ کے جانے کے بعد نوشین بولی۔ "میں نے تمہیں بتایا تو تھا شاید کہ وہ نامکمل ہیں ابھی۔ دراصل میں بہ یک وقت کئی سیریز پر کام کرنے کی عادی ہوں۔ ایک سے دل اکتاتا ہے تو دوسری شروع کر دیتی ہوں۔"

"اس معاملے میں بھی تم دوسرے پینٹرز سے مختلف ہو۔ میں نے تو سنا تھا کہ جب تک ایک پینٹنگ مکمل نہ ہو جائے، پینٹرز دوسری نہیں شروع کرتا۔"

"بس عادت ہے میری لیکن تم ادھوری پینٹنگ کیوں دیکھنا چاہتی ہو؟"

"ارے وہ تو ایک بہانہ ہے، تم نے بتایا تھا نا کہ وہ تمہیں شاید سوئٹزر لینڈ بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ میں وہاں جا کر ان سے اسی بارے میں تو بات کروں گی۔ آمادہ کر لوں گی میں انہیں۔"

"مجھے سوئٹزر لینڈ جانے کی اتنی خواہش ہے کہ میں ہوٹل کا بھی انتخاب کر چکی ہوں۔"

"وہاں جائے بغیر؟" صبیحہ نے حیرت سے کہا۔

نوشین ہنسی۔ "گوگل پر یہ سب کچھ بھی مل جاتا ہے۔ میں نے ہوٹلوں کی فہرست بھی دیکھی تھی اور ہر ہوٹل کے بارے میں تفصیلات بھی پڑھی تھیں۔ کارلٹن ہوٹل ایسا ہے کہ اس میں کونے پر بنے ہوئے کمروں میں دو کھڑکیاں ہیں۔ وہاں سے دو سمتوں کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ باقی کمروں میں ایک ایک کھڑکی ہے۔"

"گڈ...... میں تمہیں اعلیٰ قسم کی دوربین بھی دلا دوں گی جس کا اسٹینڈ بھی ہو گا۔ تم دور، دور کے مناظر بھی دیکھ سکو گی اور انہیں بنا سکو گی۔"

"میں بڑی خوش قسمت ہوں کہ میری گھوڑی بدک گئی، میں گر پڑی اور اس طرح تم سے ملاقات ہو گئی۔"

صبیحہ ہنس کر رہ گئی۔

دوسری صبح وہ نوشین کو اپنی کار میں لے کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ نوشین سوئٹزر لینڈ جانے کے خیال سے بہت پُرجوش تھی۔ وہ راستے بھر صبیحہ سے اسی کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔

نوشین کے گھر کے گرد چار دیواری نہیں تھی۔ کار جب اس کے سامنے جا کر رکی تو صبیحہ نے دیکھا کہ داؤد جان برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھے پائپ پیتے ہوئے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ صبیحہ کو کار دیکھ کر وہ بہ سرعت برآمدے سے اتر کر آئے۔ ان کے قریب آتے آتے صبیحہ اور نوشین کار سے اتر چکی تھیں۔

داؤد جان، نوشین کے ساتھ صبیحہ کو بھی گھر میں لے گئے، صبیحہ سے بولے۔ "آپ پہلے نوشین کا کام دیکھیں گی یا...... دراصل میں نے آپ کے لیے ایک خاص میٹھی ڈش بنائی ہے۔"

"پلیز انکل!" صبیحہ نے کہا۔ "آپ مجھے اس طرح مخاطب نہ کریں جیسے میں کوئی بڑی شے ہوں۔ آپ کی بیٹی کی دوست ہوں۔ مجھے بھی بیٹی ہی سمجھیے۔" صبیحہ کو آخر ان سے اپنی بات منوانی تھی۔

"اچھا، اچھا۔" داؤد جان ہنسے۔ "یوں ہی سہی۔"

"پہلے تو میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"مجھ سے؟...... مجھ سے کیا بات کرو گی؟...... اچھا بیٹھو۔" صبیحہ بیٹھتے ہی کسی تمہید کے بغیر حرفِ مدعا زبان پر لے آئی۔

داؤد جان سنجیدہ نظر آئے۔ "اکیلی لڑکی کا یورپ کے اتنے دور دراز کے علاقے میں جانا تو میرے خیال میں مناسب نہیں ہو گا۔"

"یہ اکیلی تو نہیں ہو گی۔" صبیحہ نے کہا۔ "اس کے ساتھ میں حویلی کا ایک ملازم بھی بھیجوں گی۔" صبیحہ سب کچھ سوچ کر آئی تھی۔

"ملازموں پر بھروسا تو نہیں کیا جا سکتا۔" داؤد جان نے کہا۔

"عام ملازموں اور جاگیرداروں کے ملازم میں فرق ہوتا ہے انکل...... وہ ملازم نہیں، غلام ہوتے ہیں۔ میں نے

انتخاب بھی ایک ایسے ملازم کا کیا ہے جو اس ملک سے واقفیت بھی رکھتا ہے۔ بشیر نام ہے اس کا۔ میرے والد ایک بار تین ماہ کے لیے بشیر ہی کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔''

''وہاں کے مناظر بنا کر میں بہت مشہور ہو جاؤں گی پاپا۔'' نوشین نے کہا۔ ''وہ سب سینریز صبیحہ کے گھر کے ایک ہال میں لگیں گی۔ وہاں باہر کے بہت سے لوگ بھی آئیں گے اور ان سینریز کو دیکھیں گے تو ان کی تعریف بہت کریں گے۔ صبیحہ کی شادی میں تو اخبارات کے لوگ بھی آجائیں گے۔ ان سینریز کی تصویریں بھی اخبارات میں آئیں گی اور میرے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔''

تھوڑی سی رد و قدح کے بعد داؤد جان نے صبیحہ کی بات مان لی اور نوشین کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

''میرے اچھے پاپا۔'' نوشین نے داؤد جان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور داؤد جان نے مسکرا کر اس کے گال پر چپت لگا دی۔

☆☆☆

سوئٹزرلینڈ جانے والے عموماً وہاں زیادہ دن رکنا اور وہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں لیکن دانش تیسرے ہی دن بور ہونے لگا۔ اس کی بوریت کا سبب تھے اس کے والد کے بھیجے ہوئے دونوں باڈی گارڈ زرغمان خان اور شیر خان! دانش اور جمیل جب بھی کہیں گھومنے کے لیے نکلتے، وہ دونوں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگے رہتے۔ دانش کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ دونوں بھائی کوئی مجرم ہیں جن کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

تیسری رات دانش نے کہیں نکلنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے جمیل کو بھی رکنا پڑا۔ بڑے بھائی کا وہ بہت لحاظ کرتا تھا۔ دونوں نے سونے کے لیے ایک ہی کمرا رکھا تھا۔ اس رات کھانے کے بعد دانش نے خود کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔

جمیل تقریباً تو آدھی رات تک نیند کی بات ہی نہیں کرتا تھا لیکن عام حالات میں اسے جلد ہی نیند آجاتی تھی۔ اس رات بھی وہ ساڑھے دس بجے کے قریب سو گیا تو دانش نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ جمیل کے ساتھ نکلتا تھا تو جمیل باڈی گارڈز کا کمرا کھٹکھٹا دیتا تھا لیکن دانش نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے سوچا تھا کہ کافی شاپ میں کچھ پی کر ہوٹل سے نکلے گا اور کہیں گھومے گا۔

کافی شاپ سے جب وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ کوئی اس کی کرسی سے ٹکرایا اور دانش نے اپنے کپڑوں پر کوئی گرم سیال شے گرتی محسوس کی۔

''سوری.... سوری.... آئی ایم ویری سوری....'' وہ لڑکی بولی جو اس کی کرسی سے ٹکرائی تھی اور اس کے ہاتھ میں کافی کا جو کپ تھا، وہ نہ صرف دانش پر الٹ گیا بلکہ فرش پر گر کر ٹوٹ بھی گیا۔

کچھ لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''میں اس کا کفارہ ادا کروں گی۔'' خوب صورت لڑکی بولی۔ ''آپ مجھے اپنے کمرے کی چابی دیں۔ میں آپ کا کوئی سوٹ لے کر آتی ہوں۔ آپ واش روم میں کپڑے بدل کر اپنا یہ خراب سوٹ مجھے دے دیجیے گا۔ میں دھو کر، استری کر کے لا دوں گی۔ میں صرف آرٹسٹ نہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''اچھی دھوبن بھی ہوں۔ اپنے پاپا کے کپڑے میں خود دھوتی ہوں۔''

اس کے اتنی تیزی سے بولنے پر دانش کو ہنسی آتی ہی چاہیے تھی لیکن اس نے دھوبن کی حیثیت سے اپنی جو خدمات پیش کی تھیں، وہ تو بہت ہی خوب تھیں۔

''یہ آپ نے کیا کر دیا مس نوشین!'' ایک مرد قریب آکر تیز لہجے میں بولا۔ ''دس دن میں آپ نے یہ عجیب حرکت کی ہے۔'' وہ شخص کافی شاپ کا سپروائزر تھا۔

''میں نے جان کر تو کچھ نہیں کیا۔'' نوشین نے بگڑ کر انگریزی ہی میں کہا۔ ''میں جہاں بیٹھ کر کافی پی رہی تھی، وہاں قریب کی میزوں پر لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے برا لگا تو میں اپنی کافی کی پیالی لے کر اس میز کی طرف جا رہی تھی۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''اتفاق ہے کہ میرا پیر ان کی کرسی سے الجھ گیا۔''

''آپ کی حرکتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ آرٹسٹ تو ہرگز نہیں ہیں۔''

''کیا جھوٹ بولوں گی میں؟'' نوشین نے آنکھیں نکالیں۔ ''میرے کمرے میں چلو، میرا کام دیکھو۔ تمہاری آنکھیں پھٹ جائیں گی میرا کام دیکھ کر۔''

سپروائزر کے چہرے سے صاف ظاہر ہونے لگا کہ اس کا موڈ اور خراب ہو گیا تھا۔ اس کا منہ کھلا۔ اس مرتبہ وہ شاید کوئی زیادہ سخت بات کہتا لیکن دانش نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کر دیا اور بولا۔ ''جب میں ان کے خلاف کچھ نہیں کہہ رہا ہوں تو آپ کیوں اپنا موڈ اتنا خراب کر رہے ہیں؟''

''یہ.... یہ....'' نوشین چہکی۔ ''یہ ہوئی نا بات۔'' وہ دانش کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ''آپ میرے ہم وطن معلوم ہوتے ہیں۔''

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟" دانش، نوشین کے اندازِ گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"میں اردو میں آپ سے بولی تو آپ نے بھی اردو......"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" دانش نے اس کی بات کاٹی۔ "دو بڑے ملکوں میں بولی جاتی ہے اردو۔"

"لیکن الگ پہچانی بھی جاتی ہے۔ وہ لوگ تو پھول کو بھی بےوقوف بنا دیتے ہیں۔"

"پھول کو بےوقوف؟...... کیسے؟"

"پھول کو فول کہتے ہیں نا وہ لوگ۔" نوشین نے معصومیت سے کہا۔

دانش کو نوشین کے جواب پر ہنسی آگئی۔

"آپ چابی تو دیں اپنے کمرے کی۔" نوشین تیزی سے بولی۔ "سوٹ لے آؤں آپ کا۔"

"وہاں میرا بھائی سو رہا ہے۔" دانش نے کہا۔ "بیٹھو... مجھے سوٹ نہیں دھلوانا۔"

"بہت اچھا دھوتی ہوں میں۔"

"اور آرٹسٹ بھی ہو؟" دانش ہنسا۔ اسے نوشین میں معصومیت نظر آئی تھی۔

نوشین دھم سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔ "مسٹر ہم وطن، تم کو بھی شک ہے تو چلو میرے کمرے میں... دیکھو میں نے دس دن میں کتنا کام کیا ہے۔" اس نے "آپ" سے "تم" پر آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"چلو مان لیا کہ تم آرٹسٹ ہو۔"

"تو تم پاکستانی ہو نا؟" وہ پھر بولی۔

"ہاں۔"

"میں بھی پاکستانی، تم بھی پاکستانی..." وہ ایک دم رکی، پھر سنجیدگی سے بولی۔ "تم کوئی جاگیردار تو نہیں ہو؟"

"نہیں، کیوں؟"

"جاگیرداروں سے میں اس طرح بات نہیں کر سکتی۔ کوئی کوئی اچھا بھی ہوتا ہے لیکن زیادہ تر کھرے مزاج کے ہوتے ہیں۔ ہیں ناں؟" اس کا انداز ایسا تھا جیسے حتمی طور پر اپنی تائید چاہتی ہو۔

"چلو مان لیتا ہوں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"چلو مان لیتا ہوں..." نوشین کا منہ بن رہا۔ "ایسے کہہ رہے ہو جیسے مجھ پر کوئی احسان کر رہے ہو۔"

"یہاں کے مناظر پینٹ کرنے آئی ہو؟" دانش نے کہا۔

"تو اور کیوں آئی؟...... مجھے ایک عمارت کے ہال کو ان مناظر سے سجانا ہے۔"

"تمہاری عمر تو اتنی ہے کہ تمہیں ابھی سیکھنا چاہیے۔"

"پھر چیلنج؟" نوشین نے آنکھیں نکالیں۔

"چلو، سوری کر لیتا ہوں۔"

"اب دوسرا احسان۔" نوشین کا منہ ایک بار پھر بنا۔

"تم سے بات کرنا بڑا مشکل ہے۔" دانش نے اپنا سر سہلایا۔

"میرے پاپا بھی کبھی کبھی کہتے ہیں یہ بات۔" اس مرتبہ نوشین ہنس پڑی تھی۔

"اچھا پھر ملیں گے بے بی۔"

"کیا؟" نوشین جیسے اچھل پڑی۔ "میں بے بی ہوں؟ ارے چوبیس سال ہے میری عمر!"

"تو کیا باباجی کہوں؟" دانش کو وہ اچھی لگی تھی، اسی لیے اس کی باتیں بھی اچھی لگ رہی تھیں لیکن اب وہ اس سے الگ ہونا چاہتا تھا کیونکہ اس نے ایک باڈی گارڈ کو دیکھ لیا تھا جو کچھ فاصلے کی میز پر آ بیٹھا تھا۔

دانش نے اپنی جیب سے نوٹ بک نکالی۔

"عجیب بات ہے۔ میں نے اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔" نوشین بولی۔

دانش نے اسے اپنا نام... بتانا کسی جواز کے بغیر مناسب نہیں سمجھا۔ "فرہاد۔" اس کے ذہن میں ایک نام آیا جو اس نے بتا دیا۔

"واہ......اتنا رومانٹک نام!"

دانش نے نوٹ بک سے کاغذ پھاڑ کر نوشین کو دیتے ہوئے کھڑے ہو کر اس طرح کہا کہ اس کا باڈی گارڈ نہ دیکھ لے۔ "یہ میرا فون نمبر ہے اور باتیں کرنے کو جی چاہے تو یہ نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لینا۔ ابھی میں ذرا جلدی میں ہوں۔" دانش تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا تھا۔

جب وہ لفٹ کے قریب پہنچا تو شیر خاں بھی اس کے قریب آ گیا۔

لفٹ نیچے آ کر کھل گئی تھی۔ اس میں سے کچھ افراد باہر آ گئے۔ اس میں سوار ہونے کے لیے شیر خاں اور دانش کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"صاحب......" شیر خاں بولا۔ "آپ کا اکیلے جانا مناسب نہیں تھا۔"

جواب طلبی کا یہ انداز دانش کو اچھا نہیں لگا لیکن اسے ضبط کرنا پڑا۔ اس کے والد نے دونوں باڈی گارڈز کو خاصا بااختیار بنا کر بھیجا تھا۔ وہ دانش کو کہیں جانے سے زبردستی

روک سکتے تھے۔
لفٹ چل پڑی۔ شیر خاں نے تیسری منزل کا بٹن دبا دیا تھا۔
نیچے کافی شاپ میں بیٹھی نوشین، دانش کے اس طرح چلے جانے پر سوچتی ہی رہ گئی تھی کہ فرہاد اچانک کیوں چلا گیا اور ساتھ ہی وہ سامنے بیٹھا شخص بھی... اور پھر خفیف سا مسکرائی، دوستی... تو ہو ہی گئی ہے۔ انسان بھی برا نہیں ہے بلکہ ایسا ہے کہ لوگ اس سے محبت کریں۔
یکایک وہ اس خیال پر دھیرے سے ہنسی، کیوں نہ میں ہی اس سے محبت شروع کر دوں اور اپنا نام شیریں رکھ لوں۔ ہنستے ہوئے اس نے دانش کا فون نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لیا۔

☆☆☆

رات خاصی تاریک تھی، اسی لیے سجاد کی بہن صبیحہ کچھ خائف بھی تھی اور نہایت محتاط انداز میں ایک طرف بڑھ رہی تھی۔ حویلی سے وہ چوری چھپے اس وقت نکلی تھی جب اس کے خیال میں سب لوگ سو چکے تھے۔
آخر دو گھنٹے پیدل چل کر وہ مشرقی اور مغربی جاگیروں کے درمیان پہنچ گئی جہاں بابا پیر کا کٹیا نما مکان تھا۔
"مجھے اتنی رات گئے دیکھ کر بابا چونکیں گے تو ضرور۔" اس نے سوچتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا۔
دوسری بار کھٹکھٹانے پر اندر سے بابا پیر کی کھانسی اور بھرائی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہے بھئی اتنی رات کو؟"
صبیحہ زور سے نہیں بولنا چاہتی تھی اس لیے خاموش رہی۔ بابا پیر کی بڑبڑاتی ہوئی آواز دروازے کی طرف آنے لگی۔ صبیحہ محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔
"کون ہے؟" دروازے کے قریب آکر بابا پیر نے پھر پوچھا۔
"میں ہوں بابا! صبیحہ۔"
اندر سے ایسی آواز آئی جس میں حیرت کا تاثر تھا۔ پھر دروازہ کھلا۔ وہاں لائٹ نہیں تھی اس لیے بابا کے ہاتھ میں لالٹین تھی جسے اونچا کر کے انہوں نے صبیحہ کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "خیریت بیٹا؟"
صبیحہ نے پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔
"کیا ڈری ہوئی ہو کسی سے؟ ... آؤ، اندر آجاؤ۔"
صبیحہ اندر داخل ہوئی۔ بابا پیر دروازہ بند کرنے لگے۔
صبیحہ بولی۔ "نہیں بابا... میں ڈری ہوئی تو کسی سے نہیں ہوں۔ بس ذرا محتاط تھی۔ کوئی دیکھ نہ لے۔"
"اتنی رات کو آخر..."
"بس ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔"
"آؤ۔" بابا پیر نے قدم بڑھائے۔
اس کٹیا جیسے مکان کے بس دو حصے تھے۔ دونوں ہی حصوں میں معمولی سامان تھا۔ بابا پیر نے صبیحہ سے بیٹھنے کے لیے کہا۔
"کیا پیدل آئی ہو؟" لہجے میں حیرت تھی۔
صبیحہ نے جواب دیا۔ "کار میں آتی تو اس کی آواز سے سب کو میرے کہیں جانے کا پتا چل جاتا۔ میں چھپ کر آئی ہوں۔"
"آخر بات کیا ہے؟"
"آج میں نے کسی سے سنا تھا کہ مغربی حویلی کے لوگ خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ کسی کو حویلی سے کہیں بھگا دیا گیا ہے۔"
"کس کو؟" بابا پیر کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آئی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کس کے بھاگ جانے کی فکر ہو سکتی ہے۔ دانش کی بات ہے نا؟"
"جی۔" صبیحہ نے نظریں جھکالیں۔
"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے دانش کی تصویر کا تعویذ بنا کر اپنے دائیں ہاتھ پر باندھ رکھا ہے۔"
صبیحہ چونکی۔ "یہ آپ کو کیسے معلوم؟"
بابا پیر نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "ہاں... دانش کو حویلی سے ہٹا دیا گیا ہے اور ایسا میرے مشورے ہی پر ہوا ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آج کل تمہارا بھائی بہت زیادہ آپے سے باہر ہو رہا ہے۔ جب تک میں تم لوگوں میں مصالحت نہ کرا لوں، اس وقت تک محتاط رہنے کا مطلب خوف زدہ ہونا نہیں ہے۔ اسے جمیل سیت باہر بھیج دیا گیا ہے۔"
"کہاں؟" صبیحہ نے جلدی سے پوچھا۔
"ہونٹوں سے نکلی، کوٹھوں پر چڑھی بات ہو جائے گی۔ یہ نہ پوچھو بیٹا کہ انہیں کہاں بھیجا گیا ہے۔"
"جی بہتر... بس یہی پوچھنے آئی تھی کہ وہ جہاں بھی ہوں، خیریت سے ہوں۔"
"بس ایک بات سے مجھے تشویش ہوئی ہے۔"
"کس بات سے؟" صبیحہ نے گھبرا کر پوچھا۔
"آج شام ہی کو معلوم ہوا ہے کہ کسی وجہ سے بڑی عجلت میں شاہدہ کی شادی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"
شاہدہ، دانش کی بہن تھی۔
"جلدی میں کیوں؟" صبیحہ نے پوچھا۔ "اتنی جلدی کہ آپ کو بھی آج ہی معلوم ہوا ہے؟"

''ہاں۔'' بابا پیر نے کہا۔ ''دن نکلے تو جاؤں گا مغربی حویلی اور پوچھوں گا۔ شاید کوئی وہیں سے مجھے لینے آئے اور بتائے شادی کی بات۔''

''لیکن اس میں آپ کو تشویش کیوں ہے؟''

''بہن کی شادی ہے۔ دانش اور جمیل کو واپس بلایا جا سکتا ہے جو مناسب نہیں۔''

''یہ تو دانش کے بڑوں کو سوچنا چاہیے تھا۔''

''جانے کیوں نہیں سوچا گیا۔ ملاقات ہوگی تو معلوم ہو گا مجھے۔''

''وہ خفیہ طور پر بھی تو آسکتے ہیں۔''

''بچوں جیسی بات کی ہے تم نے..... شادی کے موقع پر خفیہ آمد کیسے ممکن ہے؟''

''تو پھر؟''

''کہا تو ہے ابھی ـــ کل ملاقات ہو تو کچھ پتا چلے۔''

صبیحہ نے کہا۔ ''چلیے، چلتے ایک بات اور کہوں؟''

''بولو!''

''اگر مصالحت ہو گئی تو اس سے.....'' صبیحہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بھی کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟''

''کیسا فائدہ؟''

''میرا مطلب ہے۔'' صبیحہ گڑبڑائی۔ بات کہہ نہ سکی۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔ تمہارے دل میں کیا ہے۔'' بابا پیر مسکرائے۔ ''تم جو باز، پر اس کی تصویر باندھے پھرتی ہو تو یہ کوئی بے معنی بات نہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کوئی ایسا موقع آیا کہ تمہارے دل کی بات دانش نے جان لی ہو۔''

''جی نہیں۔'' صبیحہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''خیر..... میں سوچ بھی رہا تھا کچھ ایسے ہی خطوط پر۔''

صبیحہ اس موضوع پر زیادہ بات کرنے سے گھبرا رہی تھی کیونکہ بابا پیر کا ادب کرنا اس پر لازم تھا۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔''

''چلو دروازے تک چھوڑ آؤں۔'' بابا پیر نے لالٹین سنبھالی۔

''ہاں ایک بات اور.....'' صبیحہ قدم اٹھاتے اٹھاتے رکی۔

بابا پیر نے طویل سانس لی۔ ''چلو وہ بھی کرلو۔''

صبیحہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''اب کون آگیا۔'' بابا پیر کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔

صبیحہ کا چہرہ فق پڑ گیا۔ ''کسی نے مجھے یہاں آتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو۔''

بابا پیر نے اس کی بات پر دھیان دیا ہو، یا نہ دیا ہو لیکن زور سے پوچھا ضرور۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں بابا۔'' باہر سے بھی زور سے جواب دیا گیا۔

اب تو صبیحہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے اپنے بھائی سجاد کی آواز پہچان لی تھی۔

''شامت آجائے گی میری۔'' صبیحہ کی آواز میں لرزش تھی۔

''دیکھتا ہوں، وہ کیوں آیا ہے اس وقت۔'' بابا پیر نے کہا۔ ''تم اس ڈرم کے پیچھے چلی جاؤ۔ یہ ٹھیک نہیں رہے گا کہ وہ تمہیں یہاں دیکھ لے، اور وہ بھی اتنی رات کو۔''

وہ تیزی سے ڈرم کے پیچھے چلی گئی اور بابا پیر لالٹین سنبھالے دروازہ کھولنے چلے گئے۔

صبیحہ کو یکا یک خیال آیا کہ وہ دروازے پر ہونے والی باتیں بھی سنے، اس لیے وہ دبے قدموں چلتی ہوئی ڈرم کی آڑ سے نکل کر اس دروازے تک چلی گئی۔

دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی سجاد کی آواز بھی سنائی دی۔ اس نے بابا پیر کو سلام کیا تھا۔

بابا پیر نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''اتنی رات کو؟ کوئی خاص بات؟''

''جی ..... جی ہاں ..... کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''آؤ، بیٹھو۔''

''یہاں نہیں۔'' سجاد نے کہا۔ ''آپ جہاں سوتے ہیں، وہاں بیٹھنا میرے لیے عین سعادت ہوگی۔'' یہ سجاد کی چاپلوسی تھی یا عقیدت؟ اس کا اندازہ لگانا صبیحہ کے لیے مشکل نہیں تھا..... وہ جلدی سے لوٹی اور پھر ڈرم کی آڑ میں چھپ گئی۔

پیر بابا اور سجاد وہاں آئے۔

''لو یہاں بیٹھو۔'' بابا پیر نے کہا۔ صبیحہ نے مونڈھا کھسکنے کی آواز بھی سنی اور قیاس بھی کرلیا۔ بابا اسے اس طرح بٹھانا چاہتے ہوں گے کہ ڈرم کی طرف اس کی پیٹھ رہے۔

''ہاں اب بتاؤ، کیا بات ہے؟'' بابا پیر نے سوال کیا۔

''دانش کئی دن سے غائب ہے۔ اس کے ساتھ جمیل بھی!''

''ہاں۔'' بابا پیر نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''وہ کہیں گئے ہیں۔''

''اور ان کے والد کے دونوں باڈی گارڈ بھی؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔''

''کچھ اندازہ تو ہوگا..... جاگیر سے باہر..... شہر سے باہر..... یا ملک سے باہر؟'' سجاد کے لہجے میں چبھن تھی۔

''یہ تو تم ان دونوں کے گھر والوں سے پوچھو۔''

''آپ سے تو وہ کوئی بات نہیں چھپاتے۔''

''تمہارے بڑے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے لیکن میں ادھر کی ادھر نہیں کرتا۔''

''مجھ سے ڈر کر ہی بھاگے ہیں ناں؟''

''اب تم غیر ضروری باتیں کرنے لگے۔''

''خیر!'' مونڈھا کھسکنے کی آواز آئی۔ سجاد اٹھا ہوگا لیکن صبیحہ ڈرم کی آڑ میں تھی اس لیے نہیں دیکھ سکی۔ سجاد نے مزید کہا۔ ''میں کسی نہ کسی ذریعے سے معلوم تو کرلوں گا۔''

''انتقام کا زہر دل سے نکال دو سجاد۔'' بابا پیر نے غیر معمولی نرمی سے کہا۔

''اچھا خدا حافظ۔''

سجاد کے قدموں کی آواز آئی۔ اس نے بابا پیر کی بات کا جواب ہی نہیں دیا تھا۔

''رخصت ہونے کا یہ انداز مناسب نہیں ہوتا۔'' بابا پیر نے کہا۔

سجاد نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ وتیرہ دونوں جاگیروں کے لوگ اختیار نہیں کرتے تھے لیکن سجاد سے ہر بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔

صبیحہ نے سکون محسوس کیا۔ اسے تو یہ ڈر ہوا تھا کہ سجاد نے اس کا تعاقب نہ کیا ہو۔

بابا پیر واپس آگئے تو صبیحہ ڈرم کی آڑ سے نکلی۔

''اب تم کچھ رک کر جانا۔'' بابا پیر نے صبیحہ سے کہا۔ ''راستے میں مڈبھیڑ نہ ہو۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا بابا..... لیکن یہ ڈر بھی لگا ہوا ہے کہ حویلی پہنچنے میں دیر نہ ہوجائے۔''

''جگار ہوسکتی ہے؟''

''جی!''

''بہانہ کردینا کہ ہوا خوری کے لیے کھیتوں کی طرف نکل گئی تھیں۔''

''آپ سے ایک بات اور بھی کرنی تھی۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔ سجاد جب آیا ہے، اس وقت تم کچھ کہنے ہی والی تھیں۔'' پھر انہوں نے صبیحہ سے بیٹھنے کے لیے بھی کہا۔

صبیحہ ان کا اتنا احترام کرتی تھی کہ اجازت کے بغیر بیٹھ نہیں سکتی تھی۔

''جی۔'' صبیحہ مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ ''میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ دانش جس طرح بھی بہن کی شادی میں آجائیں، مجھے معلوم ہوجائے۔ کیا آپ اس بارے میں مجھے کسی طرح خبر دے سکتے ہیں؟''

"اس کا وعدہ میں نہیں کر سکتا۔ حالات نہ جانے کیا ہوں۔ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ کوشش کروں گا۔"

"آپ کا اتنا کہنا بھی میرے لیے اطمینان کی بات ہے۔"

"تم یہ بات کیوں جاننا چاہتی ہو؟ کیا دانش سے ملنے کا ارادہ ہے؟"

صبیحہ نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں "جی" کہا۔

"اسے اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں؟"

"بہتر ہوگا کہ یہ خیال ابھی اپنے دل سے نکال دو۔ بات کھل گئی تو ایک جھگڑا اور کھڑا ہو جائے گا۔ اس وقت کا انتظار کرو جب میں دونوں خاندانوں میں مصالحت کرانے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

صبیحہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ وقت نہ جانے کب آئے گا۔"

"اللہ سے بہتری کی توقع رکھنی چاہیے۔"

"آپ نے کوئی بات ایسی کہی تھی کہ آپ کے دماغ میں کوئی منصوبہ ہے۔"

"وہ تو ہے لیکن ابھی طریقہ کار سمجھ میں نہیں آیا ہے۔"

صبیحہ کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بابا پیر کو سلام کر کے باہر نکلی اور حویلی کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

موبائل کی گھنٹی نے دانش کو جگا دیا۔ اس کے سامنے ہی دیوار پر ایک خوب صورت گھڑی لگی ہوئی تھی۔ اتنا اندازہ ہو چکا تھا کہ گھنٹا بھر میں صبح ہو جاتی۔ دانش نے حیرت سے موبائل اٹھایا۔ اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا۔

"ریسیو تو کر لی ہے تم نے کال۔" نسوانی آواز آئی۔ "اب اجنبی نمبر دیکھ کر فون بند نہ کرنا۔ بوجھو کہ میں کون ہوں؟"

دانش نے نوشین کی آواز پہچان لی تھی۔ اس نے کمرے کے دوسرے بیڈ کی طرف نظر ڈالی۔ جمیل ہمیشہ گہری نیند سوتا تھا۔ اس وقت بھی موبائل کی گھنٹی اس جگا نہیں سکی تھی۔

"ہیلو!" نوشین کی آواز آئی۔

"بوجھ لیا ہے۔" دانش خفیف سا مسکرایا۔

"نام بتاؤ۔"

"نوشین۔"

"یہ پندرہ منٹ پرانا نام ہے۔"

"نیا نام کیا ہے؟"

"شیریں۔"

"یہ تبدیلی کیوں؟"

"جب تم فرہاد تو میں شیریں۔"

"یہ تو کوئی جواز نہیں۔"

"بالکل ہے۔"

"کیسے؟"

"ہم دونوں نے کافی شاپ میں مزے مزے کی باتیں کی تھیں اور خاصی دیر تک کی تھیں۔ اس طرح تو دوستوں ہی میں ہوتا ہے اور دوستوں کے نام تو ایسے ہی ہونے چاہئیں۔"

"تم شیریں، فرہاد کو کیا سمجھتی ہو؟" دانش کو اس سے باتیں کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔

"بہت اچھے دوست تھے دونوں۔"

"صرف دوست؟"

"محبت بھی کرتے تھے ایک دوسرے سے۔"

"کہاں کے تھے؟ کہاں رہتے تھے۔"

"اپنے اپنے گھروں ہی میں رہتے ہوں گے۔"

فرہاد نے اپنی ہنسی دبائی۔ اسے جمیل کا خیال رکھنا تھا۔

"قصے کیوں؟" نوشین نے پوچھا۔

"تم قصے کہانیوں سے بھی متاثر ہو جاتی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"شیریں فرہاد کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ فرضی کردار تھے۔ ایران کے ایک شاعر نظامی گنجوی نے تخلیق کیے تھے۔ یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ شاعری میں کیے تھے یا نثر میں۔ وہ شاعر تو بہر حال تھا۔"

"تو...... تو ...... وہ جو ہیں...... لیلیٰ مجنوں۔"

"غالباً وہ بھی نظامی گنجوی کے کردار ہیں۔"

"تو لوگ بے وقوف ہیں جو ان کی مثالیں دیتے ہیں؟"

"ان کرداروں کی شہرت ہی اتنی ہو گئی ہے۔"

"تم اتنی دھیمی آواز میں کیوں بول رہے ہو؟"

"بتایا تو تھا کہ میرا بھائی قریب ہی سو رہا ہے۔ تم بتاؤ کہ اس وقت کیسے جاگ رہی ہو؟"

"ساری رات تو ایک منظر کینوس پر اتارتی رہی، پھر......"

"اندھیرے کا منظر؟" دانش نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں، چاندنی رات ہے نا...... اتنی روشنی میں نظر آتا ہے لیکن کینوس پر آنے کے بعد منظر رات ہی کا معلوم ہوگا۔ ابھی پورا نہیں بنا ہے۔ میں تھک گئی تھی اس لیے گھنٹا بھر پہلے لیٹ گئی۔ نیند آئی نہیں، خیالات آتے رہے دماغ میں...... انہی میں یہ خیال آیا کہ تمہاری دوست بن گئی ہوں تو اپنا نام شیریں رکھ لوں۔"

"اچھا اب بہت باتیں ہو گئی ہیں باقی کل ..... اب سونے کی کوشش کرو۔"

"اچھا ایک بات بتا دو۔"

"جلدی سے پوچھ کر بند کرو فون۔"

"کافی شاپ میں وہ آدمی کون تھا جسے دیکھ کر تم چونکے تھے اور پھر جلدی سے چلے بھی گئے تھے ..... وہ آدمی بھی تمہارے پیچھے گیا تھا۔"

"وہ!" دانش نے طویل سانس لی۔ "وہ میرا باڈی گارڈ ہے۔"

"ارے باپ رے .... تو کیا تم کہیں کے شہزادے ہو؟"

"صرف شہزادوں ہی کے باڈی گارڈ نہیں ہوتے۔ جو بھی کسی خطرے میں ہو اور باحیثیت بھی ہو، وہ اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈ ملازم رکھ سکتا ہے۔"

"تو تمہیں کوئی خطرہ ہے؟" نوشین گھبرا سی گئی۔

"اتنا زیادہ بھی نہیں کہ تم پریشان ہو جاؤ۔"

"کچھ تو بتاؤ؟"

"پھر کبھی۔"

"تو کل کہاں ملو گے؟"

"سوچنا پڑے گا۔ ہماری دوستی باڈی گارڈز کے علم میں نہیں آنی چاہیے۔"

"کیوں؟"

"سب کچھ ابھی پوچھو گی؟"

"کیا حرج ہے؟"

"حرج یہ ہے کہ میرا بھائی جمیل اب اٹھنے ہی والا ہو گا۔ ہماری دوستی کا علم اسے بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"تو پھر کیسے ملیں گے ہم؟"

"فون پر بتاؤں گا۔ تمہارا نمبر تو میرے پاس آ ہی گیا ہے۔ اچھا بس ..... جمیل نے ابھی کروٹ لی ہے۔ اٹھنے ہی والا ہے۔" دانش نے فون بند کر دیا۔

فون بند کرنے کے بعد بھی دانش نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ اتنی باتیں کر کے نیند ہی اڑ چکی تھی اور اب صبح بھی قریب تھی۔ وہ نوشین کے بارے میں سوچنے لگا تھا جو اپنے مخصوص انداز گفتگو کے باعث اچھی لگی تھی اور خوب صورت بھی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک اجنبی ملک میں کوئی تو ہو جس کے ساتھ اچھا وقت گزارا جا سکے لیکن اس وقت اس نے سوچا کہ وقت گزاری کے چکر میں بات کہیں آگے نہ بڑھ جائے۔ وہ اپنے والد کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ وہ محبت، عشق وغیرہ کے سخت خلاف تھے۔

☆☆☆

بابا پیر کی توقع کے مطابق صبح ہی صبح مغربی جاگیر کا ایک آدمی انہیں لینے آ گیا۔ محسن قزلباش نے انہیں لینے کے لیے کار بھجوائی تھی۔ بابا پیر آدھے گھنٹے میں مغربی جاگیر کی حویلی پہنچ گئے۔

"خیریت تو ہے قزلباش؟" بابا پیر نے جان بوجھ کر تجاہل سے کام لیا۔

محسن قزلباش نے ہنس کر کہا۔ "آج جی چاہا کہ آپ بھی میرے ساتھ ناشتے میں شریک ہوں۔ اسی بہانے کچھ گپ شپ بھی ہو جائے گی۔"

"ہاں، بہت دن ہو گئے، تم سے گپ شپ نہیں ہوئی۔"

"آیئے۔"

بابا پیر کو اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں ناشتا لگ چکا تھا۔ بیگم قزلباش سکینہ بی بی وہاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بابا پیر کو سلام کیا۔ بابا پیر نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں اور پوچھا۔ "آج ہماری بٹیا نہیں ہے۔"

بابا پیر کئی مرتبہ ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھا چکے تھے جس میں دانش اور جمیل کے علاوہ اس کی بہن شاہدہ بھی ہوتی تھی۔

سکینہ بی بی نے جواب دیا۔ "کل اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ رات کو بہت دیر سے سوئی تھی، اس لیے اچھا ہو گا کہ وہ آج دیر تک سو لے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

بابا پیر سمجھ گئے کہ ان لوگوں کو شاہدہ ہی کی شادی کی بات کرنی تھی، اس لیے اسے ناشتے میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

"کیا طبیعت خراب ہو گئی تھی؟" بابا پیر نے پوچھا۔

ناشتا شروع کر دیا گیا۔ بابا پیر سوالیہ نظروں سے سکینہ بی بی کی طرف دیکھتے رہے۔

"کچھ خاص طبیعت خراب نہیں تھی۔" سکینہ بی بی نے جواب دیا۔ "معمولی سی حرارت تھی۔ بس سوئی ذرا دیر سے تھی اس لیے نہیں اٹھایا۔"

"بابا پیر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"دانش اور جمیل کو کب بلایا جا سکتا ہے؟" محسن قزلباش نے بابا پیر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"فی الحال اس بارے میں مت سوچو۔"

"لیکن ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے بابا۔"

"مسئلہ؟"

"بہن کی شادی میں بھائیوں کا آنا ضروری ہوتا ہے یا نہیں؟"

"بہن کی ..... یعنی شاہدہ کی شادی؟"

"جی ہاں۔"

"ابھی کچھ دن پہلے جب میں نے دانش اور جمیل کو رخصت کروایا تھا، اس وقت تو ایسی کوئی بات میرے سامنے نہیں آئی تھی۔"

"یہ فیصلہ عجلت میں کل ہی کیا گیا ہے۔ خاص طور سے اسی مسئلے پر بات کرنی ہے۔"

"لڑکی کی شادی کا فیصلہ.....؟ عجلت میں؟... کیسی بات کررہے ہو قزلباش؟"

"یہی تو مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شاہدہ کی منگنی ہو چکی ہے۔"

"ہاں... تمہارے پھوپی زاد بھائی کے بیٹے انوار سے ہوئی تھی منگنی۔"

"جی ہاں، اور طے پایا تھا کہ نکاح اور رخصتی دو سال بعد ہوگی جب شاہدہ بی اے کرلے گی۔"

"یہ بھی معلوم ہے مجھے۔"

"اب دس پندرہ دن میں انوار لندن جارہا ہے۔ اسے کچھ بیماری ہوگئی ہے جس کے علاج کے سلسلے میں وہ تین ماہ وہاں رہے گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تین مہینے بعد واپس آئے گا۔ شادی تو دو سال بعد طے ہوئی تھی ناں؟"

"وہ بات اپنی جگہ... آپ جانتے ہیں میں بہت دوراندیش آدمی ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دس دن میں ہی شادی کر دی جائے۔ انوار اور اس کے باپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"تمہاری عجلت میں کیا دوراندیشی ہے؟"

"یورپ کی ہوا بڑی زہریلی ہوتی ہے بابا... کوئی بھی میم انوار کے پیچھے لگ سکتی ہے اور انوار کا پیر بھی پھسل سکتا ہے۔" قزلباش نے کہا اور اس سے پہلے کہ بابا پیر اس بارے میں کوئی خیال ظاہر کرتے، قزلباش پھر بول پڑا۔ "بابا میں التجا کروں گا کہ آپ میری اس دوراندیشی سے اختلاف نہیں کریں گے۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ انوار کے کردار کی تعریف کریں گے۔ آپ نے ہی اس شادی کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے زاہدان خشک کے پیر پھسل جاتے ہیں اور جس کی ان سے ذرا بھی توقع نہیں ہوتی، وہ وہی کرگزرتے ہیں۔"

بابا پیر نے لمبی سانس لی اور کچھ رک کر پوچھا۔ "انوار کو ایسی کیا بیماری ہوگئی ہے جس کا علاج لندن ہی میں ہوسکتا ہے؟"

"مرض کے بارے میں تو ان لوگوں نے کچھ نہیں بتایا لیکن یہ بیان ہے ان کا کہ یہاں کے ڈاکٹر انوار کے علاج میں ہتھیار ڈال چکے ہیں۔"

"ابھی کچھ عرصے ان دونوں بچوں کا واپس آنا قطعی مناسب نہیں ہوگا۔"

"خاص طور سے اسی لیے تو آپ کو بلایا ہے کہ آپ کوئی مشورہ دیں۔"

"میں آج ہی انوار اور اس کے باپ سے ملوں گا اور اس بیماری کے بارے میں پوچھوں گا۔"

"ہاں آپ سے شاید وہ نہ چھپائیں لیکن عجلت کے اس نکاح اور ودائی میں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"دیکھتا ہوں آج۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم لوگوں کی مصالحت کے سلسلے میں میرے دماغ میں ایک منصوبہ آیا تو ہے لیکن اس کا جو طریقہ کار فی الحال میرے دماغ میں ہے، وہ گناہ ہوگا۔"

"تو پھر؟" قزلباش میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس منصوبے اور طریقہ کار کے بارے میں بابا پیر سے وضاحت کے لیے کہتا۔

"میں جب کسی مسئلے میں پھنستا ہوں تو مہینے تین دن میں مجھے خواب میں اس کا حل مل جاتا ہے۔ میں اسی خواب کا منتظر ہوں۔"

"فوری طور پر کیا ممکن ہے؟"

"انوار کو لندن جانے سے روکنا پڑے گا۔"

"لیکن اس کی بیماری؟"

"وہی تو معلوم کرنے جاؤں گا۔ اسی کے بارے میں کچھ کتابیں دیکھنی ہوں گی اور پھر انوار کو ایک تعویذ دوں گا جس سے اس کی بیماری ختم ہوجائے گی۔"

"اس میں کتنے دن لگیں گے؟"

"تعویذ بنانے میں تو دو دن لگیں گے۔"

"اور بیماری ختم ہونے میں؟"

"اس میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"زیادہ دن کی صورت میں انوار کی لندن جانے کے سلسلے میں بے قراری بڑھ سکتی ہے۔"

"اگر وہ لندن جانے کے لیے پرتول ہی لیتا ہے تو دانش اور جمیل کو اس شادی سے بے خبر رکھنا ہوگا۔ ان کا آنا تو مناسب ہی نہیں ہے۔ خون خرابا ہوکر رہے گا۔"

"لیکن شاہدہ؟" سکینہ بی بی نے کہتے ہوئے اپنے شوہر کی طرف بھی دیکھا۔

"جی بابا۔" قزلباش نے کہا۔ "وہ ضد پر آ گئی ہے کہ جب تک اس کے بھائی نہیں ہوں گے، وہ شادی نہیں کرے گی۔ سارے خاندان میں وہی تو آپ کی سب سے زیادہ لاڈلی ہے۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے قزلباش مسکرائے بھی تھے۔

"وہ تو ہے۔" بابا پیر بھی مسکرائے۔ "وہ تو روتے ہوئے گلے لگ کر مجھ سے ہر بات منوا لیتی ہے۔"

"تو ایسی صورت میں کیا کرنا ہوگا؟"

"مجھے وقت دو سوچنے کا، کوئی حل نکل ہی آئے گا۔"

"ہمیں تو آپ کے تعویذ پر مکمل اعتقاد ہے۔" سکینہ بی بی بول پڑی۔ "کئی بیماریاں یا مسئلے آپ کے تعویذ سے حل ہو جاتے ہیں۔"

یہ حقیقت تھی کہ ایسا ہو چکا تھا چاہے اس کا سبب تعویذ کو سمجھا جاتا یا اسے اتفاق کا نام دے دیا جاتا۔

"ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک اور بات آئی ہے۔"

"وہ کیا؟" قزلباش نے جلدی سے پوچھا۔

"میں کل ہی آ کر شاہدہ کے بازو پر باندھوں گا اور اللہ نے چاہا تو وہ ضد چھوڑ دے گی۔"

"وہ پوچھے گی تو کہ تعویذ کیوں باندھا جا رہا ہے؟"

"اس وقت تم بول پڑنا۔" بابا پیر نے کہا۔ "کہنا کہ یہ شادی کو کامیاب بنانے کے لیے ہے۔" یہ بات بابا پیر نے سکینہ بی بی سے کہی تھی اس لیے وہی بولی۔

"یہ تو میں کہہ دوں گی اس سے۔"

"اب میں چلتا ہوں۔"

باتیں بھی ختم ہو چکی تھیں اور ناشتا بھی کیا جا چکا تھا۔

بابا پیر نے جاتے جاتے کہا۔ "مجھے ابھی جا کر انوار اور اس کے باپ سے ملنا ہوگا۔"

قزلباش نے سکینہ بی بی سے کہا۔ "کار کا بندوبست کروا دو۔"

بابا پیر جب جاگیر میں آتے تھے تو حویلی کی کوئی ایک کار ان کے لیے وقف کر دی جاتی تھی اور ایسا ہی مشرقی جاگیر کے لوگ بھی کرتے تھے۔

☆☆☆

فرہاد اور نوشین نے ایک سبزہ زار میں ملاقات کی۔ فرہاد نے نوشین کو بتایا کہ وہ اپنے باڈی گارڈ کو ڈاج دے کر آیا تھا۔

سبزہ زار ایک پہاڑی کے قریب تھا۔ نوشین نے ادھر ادھر کی بکواس کے بعد فرہاد سے کہا کہ پہاڑی پر چڑھا جائے۔

"یہ مناسب نہیں ہوگا شیریں صاحبہ!" فرہاد نے کہا۔ "دو دن اس طرح گزر چکے ہیں کہ کسی وقت بھی بارش ہو گئی ہے۔ یہاں سے تو ہوٹل زیادہ دور نہیں۔ بارش کے آثار دیکھتے ہی ہم یہاں سے بھاگ کر ہوٹل تک پہنچ سکتے ہیں۔ پہاڑی پر چڑھ گئے تو ایسی صورت میں مشکل ہو جائے گی۔ یہاں سے سڑک قریب ہی ہے۔ ٹیکسی آسانی سے مل جاتی ہے۔"

"مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟" نوشین ہنسی۔

"کیا مطلب؟" فرہاد نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہم بھیگیں گے تو نہیں۔" نوشین نے کہا۔ "یہ بیگ دیکھ رہے ہو؟"

"میں پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ چرمی بیگ کیوں لائی ہو؟"

"ابھی آتے ہوئے خریدا ہے یہ...... اس میں ایک لباس میرے لیے ہے۔ تمہارے لیے نیا خریدا ہے۔ بارش میں بھیگے تو کپڑے بدل لیں گے۔"

"بھیگنے کے بعد کپڑے کہاں بدلے جائیں گے جزاھل صاحب؟"

"میں اس طرف کی پہاڑی پر کئی مرتبہ آ چکی ہوں۔ اس کی دوسری جانب بڑے حسین مناظر ہیں۔"

"میں پوچھ رہا ہوں کہ کپڑے کہاں بدلیں گے اور تم حسین مناظر کی بات کرنے لگیں۔"

"پوری بات سنے بغیر بول پڑتے ہو۔" نوشین نے منہ بنایا۔

"اچھا بولو۔"

"اس پہاڑی پر ایک غار ہے۔ میں دیکھ چکی ہوں۔ اگر بھیگ گئے تو اس غار میں جا کر کپڑے بدل سکتے ہیں۔"

"اور اگر غار بھول گئیں؟"

"ایسی کوڑھ مغز نہیں ہوں۔" نوشین کا منہ بنا رہا۔

اس کے باوجود فرہاد نے پہلو بچانے کی کوشش کی لیکن نوشین کی ضد کے آگے اس کی چل نہ سکی اور اس نے نوشین کے ساتھ پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔

"تمہیں آرٹسٹ کے بجائے ہم جو ہونا چاہیے تھا پاگل لڑکی۔" فرہاد نے ہنس کر کہا۔

"کیا۔" نوشین رک کر اسے گھورنے لگی۔ "کیا کہا؟ پاگل؟"

"تو اور کیا کہوں اس حرکت پر؟"

"اچھا تو تم واپس چلے جاؤ یہیں سے۔" نوشین کا موڈ خراب ہو گیا۔ "میں تو جاؤں گی اوپر...... حسین مناظر دیکھنے کے لیے میں کسی بڑے پہاڑ پر بھی چڑھ سکتی ہوں۔ جاؤ تم۔" وہ آگے چڑھنے لگی۔

ہوٹل کے باہر یہ ان کی دوسری ملاقات تھی۔ پہلی بار

بھی دانش باڈی گارڈز کو ڈاج دے کر آیا تھا۔ ان دو ہی ملاقاتوں میں نوشین اسے خاصا متاثر کر چکی تھی۔

''اب چھلانگیں نہ لگاؤ۔ آ رہا ہوں میں بھی۔'' وہ بولا۔

''مرد ہو کر اتنے پیچھے رہ گئے جبکہ میں تو یہ بیگ سنبھالے ہوئے بھی تیزی سے چڑھ رہی ہوں۔''

''ارے تمہارا مقابلہ کون کر سکتا ہے بندریا صاحبہ۔''

''پھر......؟ پھر......'' وہ پلٹ کر فرہاد کو گھورنے لگی۔

''پہلے پاگل کہا تھا۔ اب بندریا؟''

''حرکتیں ہی ایسی کر رہی ہو۔''

''تو پھر میرے ساتھ تم بھی بندر بن جاؤ۔'' نوشین نے کہا، پھر ہنس کر بولی۔ ''میں بھی تو فرہاد کے ساتھ شیریں بن گئی ہوں۔''

''کہیں سے کوئی خسرو نہ آ جائے۔''

''خسرو کون؟''

''اسی نے تو شیریں کو فرہاد سے نہیں ملنے دیا اور اس بے چارے نے سر میں تیشہ مار کر خودکشی کر لی۔''

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ فرہاد فرضی کردار ہے۔''

''ہاں...... اسی طرح خسرو بھی فرضی کردار ہے۔ فرہاد کی خودکشی کا واقعہ بھی فرضی ہے۔''

''تو پھر فرضی کرداروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔''

دانش اب بھی شیریں کی باتوں میں مزے لے رہا تھا۔ انہی باتوں میں وہ دونوں پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اس وقت تیسرا پہر ڈھلنے کو تھا لیکن اچانک اتنا گہرا اندھیرا پھیلنے لگا جیسے شام ہو گئی ہو۔ فرہاد کی نظریں فوراً آسمان کی طرف گئیں۔

''اوہ، آ گئی ناں شامت۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

گہرے سیاہ بادلوں نے سورج کو ڈھک لیا تھا۔

''بھاگو اب۔'' دانش پھر بولا۔ ''تیز بارش ہوگی۔''

''کیا مصیبت ہے۔'' نوشین بڑبڑائی۔ ''یہ بارش بھی...... کم بخت......''

دونوں نے تیزی سے نیچے اترنا شروع کیا۔

''وہ غار...... بتاؤ کس طرف ہے۔'' دانش نے کہا۔

''ہم نیچے نہیں پہنچ پائیں گے۔'' اسی وقت پھوار پڑنے لگی۔

''مارے گئے اب۔'' دانش کے منہ سے نکلا۔

''اس طرف۔'' نوشین نے کہا۔

''اس طرف کیا ہے؟...... غار؟''

''ہاں۔''

پھوار نے موٹی موٹی بوندوں کی شکل اختیار کی اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ غار تک پہنچتے پہنچتے وہ دونوں پانی میں شرابور ہو چکے تھے۔ دانش کو خود پر جھنجلاہٹ سی ہوئی کہ اس نے نوشین کی بات مانی کیوں تھی۔

وہ غار میں داخل ہوئے۔ وہاں تقریباً رات جیسا اندھیرا تھا۔

''میں ٹارچ لائی ہوں۔'' نوشین نے جلدی سے کہا۔ ''خیال تھا مجھے کہ واپسی میں دیر لگی تو اندھیرا ہو جائے گا۔''

دانش نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس لائٹر ہے۔''

نوشین نے ٹارچ نکال کر جلائی تھی جس سے غار میں کچھ نظر تو آنے لگا لیکن اس سے ٹھنڈک تو کم نہیں پڑ سکتی تھی۔ بارش کے ساتھ تیزی سے چل پڑنے والی ہوا نے ان دونوں کو کانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ان گیلے کپڑوں میں تو اس ٹھنڈک کے باعث نمونیہ بھی ہو سکتا ہے۔'' دانش بولا۔

''کپڑے تو ہیں نا؟'' نوشین نے بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہم ایک دوسرے کے سامنے کپڑے بدلیں گے۔'' دانش جھنجلایا۔

''عقل تو بالکل نہیں ہے تمہارے پاس۔'' نوشین بھی جھنجلا کر بولی۔ ''میں دوسری طرف رخ کر کے کپڑے بدلتی ہوں۔ تم بھی دوسری طرف منہ پھیر سکتے ہو۔''

دونوں نے ایسا ہی کیا۔ جسم پر خشک لباس آ جانے سے ان کی کپکپاہٹ تو کم ہوئی لیکن ٹھنڈک بالکل ختم تو نہیں ہو سکتی تھی۔

نوشین نے ٹارچ کی روشنی میں غار کا جائزہ لیا تو وہاں ان کے مطلب کی کئی چیزیں دکھائی دیں۔ کوئلے جلا کر وہ غار کو روشن بھی کر سکتے تھے اور اس کی وجہ سے ٹھنڈک بھی کم ہو سکتی تھی۔

''شاید آج کل میں ہی کوئی یہاں پکنک منانے آیا تھا۔'' فرہاد نے وہاں پھیلی ہوئی چیزیں دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''آج کل میں ہی نہیں، یہاں کوئی آتا ہی رہا ہے۔ ایک آدھ بار کے لیے کوئلوں کے اتنے ڈھیر کی ضرورت نہیں تھی، البتہ اس دری سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل میں بھی یہاں کچھ لوگ آ چکے ہیں۔''

''برتن بھی چھوڑ گئے ہیں یہاں۔'' فرہاد نے کہا۔

''لیکن گندے ہیں۔''

''وہ تو بارش کے پانی سے دھل جائیں گے اگر کھانے پینے کے لیے بھی کچھ چھوڑ گئے ہوں تو مزہ ہی آ جائے۔''

تلاش کرنے پر انہیں کافی کا ایک پیکٹ تو مل گیا لیکن کھانے کی کوئی اور چیز نہیں ملی۔
''کوئلے تو جلاؤ نا۔'' نوشین بولی۔ ''ٹھنڈک تو کچھ کم ہو۔''
دانش نے کچھ کوئلے ایک جگہ جمع کر کے لائٹر جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''بارش نے کہیں یہ بھی بے کار نہ کر دیا ہو۔ لیکن تیل یا پیٹرول کے بغیر کوئلے جلنا آسان نہیں ہوگا۔''
''یہ تو ہے۔'' نوشین نے تائید کی۔
دانش نے کافی کوشش کی لیکن لائٹر کی ننھی سی لو کسی کوئلے میں چنگاری بھی نہیں بنا سکی۔
''ٹارچ سے سارے غار کا جائزہ لو۔'' دانش نے کہا۔ ''کوئی میلا کچیلا کپڑا ہی مل گیا تو کام بن سکتا ہے۔''
نوشین نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔
''مل گیا۔'' وہ خوشی سے بولی اور ایک طرف لپکی۔
دانش نے بھی وہ میلا رومال دیکھ لیا تھا۔ نوشین وہ اٹھا کر دانش کے پاس لے آئی۔ دانش نے لائٹر سے کپڑے کو لو دکھائی تو وہ تھوڑا سا جل گیا۔ دانش نے لائٹر جلائے رکھا تو کپڑا اچھی طرح جل گیا۔ وہ دانش نے کوئلوں پر ڈال دیا۔
''اب تو کوئلوں کو آگ پکڑنی چاہیے۔'' نوشین بڑبڑائی۔
کوئلے اچھی طرح جل گئے تو دانش نے ان پر اور کوئلے ڈال دیے۔
''یہ سردی کم کرنے کے لیے الاؤ دہکانا پڑے گا۔''
نوشین غار کے دہانے پر جا کر بارش سے وہ برتن دھونے لگی جس میں پانی گرم کیا جا سکتا تھا۔ اس میں تھوڑی سی خود بھی بھیگی۔ غار میں کچھ معمولی قسم کی پیالیاں بھی تھیں۔
آگ کے قریب پانی سے بھرا برتن رکھتے ہوئے وہ بولی۔ ''اس طرح پانی دیر سے کھولے گا لیکن اس کے علاوہ کوئی صورت بھی نہیں۔''
دانش کچھ کہے بغیر لیٹا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گنتی کی ملاقاتوں میں وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے تھے جیسے طویل عرصے کے تعلقات ہوں۔ صورت حال کو یہاں تک لانے میں نوشین کی بے تکلفی اور اس کی باتوں کا بڑا ہاتھ تھا جو دانش کو اچھی لگتی تھیں۔
''کیا سونے کا ارادہ ہے؟'' نوشین بولی۔
''تم بھی لیٹ جاؤ۔ اس طرح پانی کھولنے میں دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے اور بارش تو ابھی رکتی نہیں نظر آتی۔ ابھی تو اس کا زور بھی نہیں ٹوٹا۔ دو گھنٹے بعد پینا کافی شیریں صاحبہ۔''
''کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔'' اب نوشین بھی کچھ پریشان معلوم ہوئی۔
''کوئلے ڈالتی رہو۔ یہ آگ بجھ گئی تو دوبارہ جلانا بہت مشکل ہوگا۔ میں تو ایک ہی بار جلانے میں خاصا تھک گیا ہوں۔''
''تھکن اس سے بھی ہوتی ہے اگر کوئی کام غیر متوقع طور پر کرنا پڑے۔''
''بات تو پتے کی کی ہے تم نے ... کبھی کبھی کرتی ہو۔''
نوشین اب اتنی بور ہو چکی تھی کہ کوئی اوٹ پٹانگ جملہ اس کے منہ سے نہیں نکلا اور وہ دری کے اس حصے میں لیٹ گئی جو کوئلوں کے قریب تھا۔
نوشین کوئلوں کے قریب رہنے کی وجہ سے دانش کے بہت قریب تھی۔
''مجھ پر واقعی غنودگی طاری ہو رہی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔
نوشین کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ شروع میں تو اس نے موسم کی اس ہنگامی صورت حال سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی تھی۔
اب باہر بھی مکمل تاریکی پھیل چکی تھی کیونکہ آٹھ بج چکے تھے۔
کوئلے اب واقعی چھوٹے سے الاؤ کی طرح دہک رہے تھے۔ اس الاؤ کی وجہ سے غار میں ٹھنڈک نہیں رہی تھی لیکن ایسے ماحول میں انسانی جسم بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ نوشین اور دانش کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ الاؤ کی گرمی ان دونوں ہی کے جسموں میں حلول کر گئی پھر غنودگی ہی کے عالم میں جب دانش کا ہاتھ نوشین کے پیٹ پر پڑا تو خود نوشین کے جسم میں ایک اجنبی آگ بھڑک اٹھی۔
اور پھر دونوں ہی طرف آگ بھڑکنے لگی جو بجھ تو گئی لیکن اس کے بعد نوشین آنکھیں نہ کھول سکی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دانش سے نظر نہیں ملا سکے گی۔
کچھ دیر بعد اس نے دانش کی دھیمی آواز سنی۔ ''بارش کا زور ٹوٹ گیا ہے۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ بھی سکوت سے گھبرانے کے باعث بولا تو تھا لیکن جھجک کے ساتھ۔
نوشین نے دوسری طرف کروٹ لی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔ ''کیا ہو گیا؟ یہ کیا ہو گیا؟''
اس کے دماغ میں ایک سوال جیسے آندھی بن گیا۔
کچھ دیر بعد اس نے دانش کی دھیمی آواز پھر سنی۔
''اب اٹھو نوشین ... بارش رک گئی ہے۔''
نوشین آہستگی سے اٹھ گئی۔ واپسی پر دونوں ہی خاموش اور اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ جو کچھ ہو گیا تھا، اسے ایک حد تک شاید ''حادثہ'' ہی کہا جا سکتا تھا جو اچانک ہو گیا تھا

جس کے اثرات ان دونوں ہی کے دماغ پر تھے۔ وہ ٹیکسی سے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہوٹل جب پانچ منٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو دانش نے نوشین سے کہا۔

"خاصی رات ہوگئی ہے۔ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم ساتھ ساتھ وہاں داخل ہوں۔ میں ٹیکسی سے اتر جاتا ہوں، تم چلی جاؤ۔ میں ٹہلتا ہوا آجاؤں گا۔"

نوشین نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ دانش نے ٹیکسی رکوائی اور اتر گیا۔

"چلو!" اسے نوشین کی مدھم آواز سنی۔ وہ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا ہوگا۔

ٹیکسی نکل گئی اور دانش پیدل آگے بڑھنے لگا۔

جب وہ ہوٹل پہنچا تو شیر خاں اور زمان خاں عمارت کے باہر ہی ٹہل رہے تھے اور خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔ شیر خاں لپک کر دانش کے پاس آیا۔

آپ کہاں چلے گئے تھے چھوٹے صاحب......؟ ہم نے آس پاس تو ہر جگہ ڈھونڈا تھا۔"

"میں کچھ دور نکل گیا تھا پھر بارش نے آلیا اس کی وجہ سے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ مجھے یہ دوسرے کپڑے خریدنے پڑے۔ سوٹ بالکل تباہ ہوگیا تھا۔ وہ میں نے کہیں پھینک دیا۔" یہ جواب دانش نے آگے بڑھتے ہوئے دیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس کا سوٹ غار میں کافی حد تک سوکھ گیا تھا اور چلتے وقت وہ نوشین نے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

"آپ کو اس طرح زیادہ دور نہیں جانا چاہیے تھا۔" شیر خاں نے خشک سے لہجے میں کہا۔ "اگر کوئی بات ہوجاتی تو ہم بڑے صاحب کو کیا جواب دیتے۔"

"انہیں میں خود جواب دے لیتا۔" دانش نے بھی خشک لہجے میں کہا۔

شیر خاں چپ تو ہوگیا لیکن اس کے چہرے پر اچھے تاثرات نہیں تھے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر دانش نے جمیل کو بے خبر سوتا ہوا پایا۔ غنیمت اس کی کمزوری تھی ورنہ معلوم تو ہوگیا ہوگا اسے کہ اس کا بھائی کہیں چلا گیا ہے اور باڈی گارڈز اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔

دانش نے شب خوابی کا لباس پہنا اور بستر پر لیٹ کر وہی سب کچھ سوچنے لگا جو رات بھر سوچتا رہا تھا۔

☆☆☆

نوشین اس رات سو ہی نہیں سکی۔ اس نے دانش کا سوٹ بہت اچھے انداز میں استری کرکے ایک طرف رکھ دیا اور بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔

صبح اس نے بے دلی سے ناشتا کیا اور اپنی ایک ادھوری پینٹنگ کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔

چونکی اس وقت جب کال بیل کی آواز سنی۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گئی اور آئی گلاس سے باہر دیکھا۔ اسے دانش نظر آیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

"رات جو کچھ ہوگیا، اس کے بعد مجھے تم سے اندر آنے کی اجازت لینے کی ضرورت باقی رہی ہے؟" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

خود نوشین اس کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ دانش کے اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور دانش کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہارا سوٹ استری کردیا ہے۔ سوچ رہی تھی کہ اب تمہیں کس طرح پہنچاؤں۔ تمہارے دو باڈی گارڈز......"

"جہنم میں جھونکو انہیں۔ اب مجھے ان کی پروا نہیں ہوگی۔"

"میرا مستقبل اب کیا ہوگا؟" نوشین روہانسی ہوگئی۔

"جو میرا مستقبل ہوگا۔" دانش نے کہا۔

نوشین چونکی۔

دانش نے مزید کہا۔ "جو کچھ ہوا، وہ بس ہوگیا لیکن اب اس کے علاوہ کوئی راہ نہیں کہ مناسب وقت پر میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں۔"

"فرہاد!" نوشین سسکتے ہوئے دانش کے سینے سے لگ گئی۔ اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

دانش نے اس کے آنسو پی لیے۔ "بس اب رونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ کچھ عرصہ گزارنا ہے یہاں۔ اب ہم یہاں ڈنکے کی چوٹ پر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ ایسی کی تیسی باڈی گارڈز کی۔"

"ظاہر ہے کہ وہ تمہارے ملازم ہیں۔"

"بس تھوڑا سا فرق ہے۔ وہ دراصل میرے والد کے باڈی گارڈز ہیں۔ انہیں یہاں دراصل اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ مجھے کسی نقصان سے بچا سکیں۔"

"کیسا نقصان؟" نوشین نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

اب وہ دونوں بیٹھ گئے تھے اور دانش اس کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے تھا۔

"خدشہ تھا کہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں مجھے مار ڈالا جائے گا۔ کسی سے میری دشمنی چل رہی ہے۔ میں اس سے بالکل نہیں گھبراتا لیکن مجھے زبردستی وہاں سے نکال کر یہاں

بھیجا گیا ہے۔ ان باڈی گارڈز کو ہدایت ہے کہ وہ مجھے یہاں کسی سے میل جول نہیں بڑھانے دیں گے۔"

"تمہیں خطرہ کس وجہ سے ہے؟" نوشین کچھ پریشان ہو گئی تھی۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت سناؤں گا۔"

نوشین جلدی سے اس کا سوٹ اٹھا کر لائی۔ "دیکھو! میں نے کتنا اچھا پریس کیا ہے۔" اس کا چلبلا پن اب اچانک رخصت ہو گیا تھا یا شاید یہ وقتی بات ہو۔ اس نے مزید کہا۔ "میں نے تم سے سوٹ مانگا تھا تا جب مجھ سے اس پر کافی گر گئی تھی۔ اب وہ بات پوری ہو گئی۔"

"اب یہ تم خود مجھے دینے کے لیے آنا تاکہ میرے بھائی کو بھی معلوم ہو جائے کہ تم سے میرے تعلقات بڑھ چکے ہیں۔ ابھی تو تم میرے ساتھ کافی شاپ میں چلو۔ میں نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے۔"

"میں نے بھی بس یوں ہی سا کیا ہے۔"

وہ کھڑی بھی ہو گئی۔ "اور تمہارے باڈی گارڈ کہاں ہیں؟"

"ابھی کہہ چکا ہوں کہ جہنم میں جھونکو انہیں۔"

"وہ تمہارے والد کو اطلاع دیں گے کہ تم ایک لڑکی کے بہت قریب ہو رہے ہو۔"

"کہہ تو چکا کہ اب میں اس کی پروا نہیں کروں گا۔ والد صاحب نے فون پر بات کرنی چاہی تو میں ان سے بھی صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں نے شادی کے لیے ایک لڑکی کو پسند کر لیا ہے۔"

نوشین اب بے حد خوش نظر آنے لگی۔ وہ دونوں اب کمرے سے نکل چکے تھے اور کافی شاپ کی طرف جا رہے تھے۔

ناشتا کرتے ہوئے نوشین نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہارے باڈی گارڈز بھی آ گئے ہیں۔ کچھ ہی فاصلے کی میز پر بیٹھے ہیں۔"

"تم ان کی طرف دیکھو ہی نہیں۔" دانش نے کہا پھر بولا۔ "آج کیا پروگرام ہے؟"

"اب پرسکون ہو گئی ہوں میں۔ جا کر ایک پینٹری پر کام کروں گی۔"

"کیا سارا دن کرو گی؟"

"نہیں۔ رات بھر جاگی ہوں اس لیے نیند تو آئے گی اب۔"

"تو آج کوئی پروگرام نہیں بن سکتا؟"

"بالکل بن سکتا ہے لیکن دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ کا نہیں۔ رات کو تو میں کام کروں گی۔ رات کا وہ منظر ابھی پورا نہیں ہوا۔ کام باقی ہے۔"

"دو ڈھائی گھنٹے بہت ہیں۔ میں اپنے باڈی گارڈز کو دکھانا چاہتا ہوں کہ اب مجھے ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ناشتا کر کے تم جاؤ اور اپنی پینٹری پر کام کرو یا سو جاؤ۔ شام کو تو فارغ ہو جاؤ گی......؟ میں آؤں گا تمہارے کمرے میں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ملوں گی۔"

ناشتا کرنے کے بعد چند باتیں اور ہوئیں پھر نوشین چلی گئی۔

☆☆☆

دو دن اور گزرے تھے کہ رات کے دس بجے دانش کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس وقت وہ نوشین کے ساتھ ایک کیسینو میں تھا اور اب وہ دونوں وہاں سے اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کیونکہ ہوٹل جا کر نوشین کو اپنا کام کرنا تھا۔

دانش موبائل کی اسکرین دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے نوشین کی طرف دیکھا۔

"والد صاحب کا فون ہے۔" اس نے کہا اور پھر کال ریسیو کرتے ہوئے سلام کیا۔

سلام کا جواب دے کر دوسری طرف سے کہا گیا۔ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ آج کل تم کسی لڑکی کے ساتھ بہت دیکھے جا رہے ہو اور اس وقت بھی ہوٹل میں نہیں ہو۔ غالباً اسی لڑکی کے ساتھ ہو گے؟"

"جی ہاں۔" دانش نے بے جھجک جواب دیا۔ "میں اس وقت اسی لڑکی کے ساتھ ہوں۔"

نوشین اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ سمجھ کر چونک گئی کہ ذکر اسی کا ہے۔

دانش نے مزید کہا۔ "ظاہر ہے کہ یہ اطلاع آپ کو شیر خاں اور زمان خاں ہی سے ملی ہو گی۔"

"ان کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ مجھے تمہاری نقل و حرکت سے آگاہ رکھیں۔ انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا ہے۔ دیکھو دانش! یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے کہ تم لڑکیوں کے ساتھ گھومو۔ وہ سجاد کی ایجنٹ بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ یہاں وہ ہم سے آٹھ دس دن پہلے سے تھی۔ وہ ایک پینٹر ہے۔ مجھے اس کا کام پسند آیا تھا اس لیے میں نے اسے اپنا دوست بنا لیا۔"

"یہ دوستی آگے چل کر کوئی اور رنگ بھی اختیار کر سکتی ہے۔"

"ایسا ہوا تو آپ کو اس کی اطلاع بھی مل ہی جائے گی۔"

"بہتر ہو گا کہ آہستہ آہستہ اس سے ملنا کم کر دو۔"

"یہاں میں تنہائی سے گھبراتا ہوں۔"

"تو کسی مرد کو دوست بناتے۔"

"اس قابل کسی شخص سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"بہرحال اس لڑکی سے میل جول کم کرو۔"

"یہ آپ کا حکم ہے تو کوشش کروں گا۔"

"یہ حکم بابا پیر کا ہے کہ تم وہاں کسی لڑکی سے اتنے قریب مت ہو جاؤ کہ اس سے شادی کرنا چاہو۔"

"بابا پیر کو میری نجی زندگی کی فکر کیوں ہے؟"

"مشرقی جاگیرداروں سے مصالحت کے سلسلے میں ان کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے اور اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنی مرضی سے کہیں کسی سے شادی نہ کر بیٹھو۔"

"ایسا کیا منصوبہ ہے کہ انہوں نے یہ شرط لگائی ہے؟"

"یہ انہوں نے ابھی نہیں بتایا۔"

"تو ان سے پوچھ کر مجھے بتایئے۔"

"تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"میں اپنی نجی زندگی میں کسی کی دخل اندازی کا سبب کیوں نہ جاننا چاہوں بابا؟"

"بابا پیر کی کوئی عزت نہیں تمہارے دل میں؟"

"یقیناً ہے لیکن ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جیے۔"

"اب مجھے تمہارے جواب سے کچھ اور ہی اندازہ ہو رہا ہے۔"

"اندازے بعض اوقات غلط بھی ثابت ہوتے ہیں۔"

"اب تمہارے لہجے سے گستاخی کی بو آ رہی ہے۔" کچھ غصے سے کہا گیا۔ "بہرحال! اگر تم نے کوئی ایسا ویسا فیصلہ کیا تو بابا پیر کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اس پر اچھی طرح غور کر لینا کہ مصالحت ضروری ہے یا نہیں۔ خون خرابا بند ہونا ضروری ہے یا نہیں..... بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

دانش کے کچھ بولنے سے پہلے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

دانش نے طویل سانس لے کر اپنا موبائل جیب میں ڈال لیا۔

"میرا ذکر کیوں آ گیا؟" نوشین نے بے چینی سے پوچھا۔

"انہی دونوں نے اطلاع دی ہوگی۔" دانش نے غصے سے کہا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے باڈی گارڈز کہاں بیٹھے ہیں۔ اس نے انہیں دیکھ بھی لیا۔

نوشین بولی۔ "تو کیا تمہارے والد کو یہ بھی برا لگ رہا ہے کہ تم نے مجھ سے دوستی کر لی ہے؟"

"تم بیٹھو! میں ابھی آتا ہوں۔" دانش نے کہا اور اٹھ کر تیر کی طرح باڈی گارڈز کی طرف بڑھا۔

وہ دونوں اسے قریب دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

"اس کیفینو میں بھی پہنچ گئے تم؟" دانش نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ سے باخبر رہیں۔" شیر خاں نے ادب سے جواب دیا۔

"یہ بھی فرض ہے کہ بابا سے میری شکایت کرو؟"

"ہم نے تو کوئی شکایت نہیں کی۔"

"پھر انہیں نوشین سے میری دوستی کا علم کیسے ہوا؟"

"میں نے ہی انہیں اطلاع دی تھی اور اطلاع دینا کوئی شکایت تو نہیں ہے چھوٹے صاحب!"

"اب میرا حکم ہے کہ تم دونوں میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو۔" دانش مشتعل تھا۔

"اس کے لیے ہمیں بڑے صاحب سے اجازت لینا ہوگی۔" شیر خاں نے نظریں جھکا کر کہا۔

زمان خاں اس دوران میں بالکل چپ رہا تھا۔

دانش نے شیر خاں کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر اب میرا پیچھا نہ چھوڑا گیا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔"

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر نوشین کی میز پر واپس لوٹا۔ اب بھی اس کے چہرے سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ شدید غصے میں تھا۔ نوشین کے استفسار پر اس نے بتا دیا کہ باڈی گارڈز سے کیا بات ہوئی تھی۔

"اس طرح تو حالات خراب ہو سکتے ہیں۔" نوشین کو تشویش ہوئی۔

"تم ان باتوں کا بوجھ مت لو اپنے دماغ پر..... مناسب وقت پر میں خود تمہیں والد صاحب کے سامنے پیش کر دوں گا۔ ان کو صاف صاف بتا دوں گا کہ اب تم سے شادی کرنا میری مجبوری ہے۔ ہم ایک ایسی رات گزار چکے ہیں کہ ہمارے تعلقات پر سند لگ چکی ہے۔"

اس جواب سے نوشین کو کچھ اطمینان ہوا۔

پھر ایک مہینا ایسا گزرا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ زمان خاں اور شیر خاں نے ان کا پیچھا بھی نہیں چھوڑا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دانش کے باپ نے ان دونوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دانش کی کوئی بات نہ مانیں۔

کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ نوشین حاملہ ہو چکی تھی۔

اس نے پریشانی کے عالم میں دانش کو بھی آگاہ کر دیا۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں۔" دانش نے اطمینان سے کہا۔ "ابھی ابتدائی دن ہیں۔ بچے کی آمد سے پہلے ہی

فیصلہ کرلیا جائے گا۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ خود تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایسا عین وقت پر کیا جائے۔ ہم اس سے پہلے بھی جا سکتے ہیں۔''

نوشین اس جواب سے بہ ظاہر مطمئن ہوگئی تھی لیکن گھبراتی رہی کہ حالات نہ جانے کیا رخ اختیار کریں۔

☆☆☆

شیر خاں نے رات کے وقت موبائل پر اپنی بیوی کی کال ریسیو کی۔

''کیا.. کیا؟'' دوسری طرف سے کچھ سن کر شیر خاں نے پریشان ہوکر کہا۔ زمان خاں ایک طرف بیٹھا نسوار کے مزے لے رہا تھا لیکن شیر خاں کے اس انداز پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''یہ ہوا کیسے؟'' شیر خاں نے پوچھا۔ وہ دونوں میاں بیوی پشتو میں بات کر رہے تھے اور یہ زبان زمان خاں کی بھی تھی لیکن وہ یہ نہیں جان سکا کہ دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا تھا۔

بات ختم کر کے شیر خاں نے اپنا موبائل اس طرح بند کیا جیسے اس کی گردن دبوچ رہا ہو۔

''کیا ہوا شیرے خاناں؟'' زمان خاں نے پوچھا۔ ''کس کا فون تھا؟''

''میری بیوی کا۔''

''کیا کچھ گڑبڑ ہوگئی وہاں؟''

''کوئی ایسی ویسی۔''

''کچھ بتا تو یارا!''

''سجاد کو معلوم ہوگیا ہے کہ چھوٹے صاحب اپنے بھائی اور ہم دونوں کے ساتھ یہاں ہیں۔'' شیر خاں نے نسوار کی ڈبیا بھی اس طرح کھولی جیسے کسی کی گردن مروڑ رہا ہو پھر غصے سے بولا۔ ''واپس جا کر اس کی خبر تو لوں گا۔''

''اپنی بیوی کی ...؟ مگر اس نے کیا کر دیا آخر ...؟ کیا اس نے بتایا ہے سجاد کو؟''

''اس نے نہیں، میری نو سالہ بچی نے بتایا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' زمان خاں کو حیرت ہوئی۔

''بچپن کہہ لیں یا بے وقوفی۔'' شیر خاں نے نسوار کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

''پوری بات بتا یارا!''

''سجاد مسلسل یہ جاننے کی کوشش میں لگا رہا ہوگا کہ چھوٹے صاحب اپنے بھائی کے ساتھ کہاں غائب ہوگئے۔ اب اچانک اسے خیال آیا کہ یہ بات میرے گھر سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک عورت کو سمجھا بجھا کر میرے گھر بھیجا۔ وہ عورت پہلے تو میری بیوی سے ادھر ادھر کی باتیں بناتی رہی پھر اس نے چھوٹے صاحب کا ذکر چھیڑ دیا۔ میری بیوی نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ وہ عورت سجاد کی بھیجی ہوئی ہے۔ وہ عورت کو حقیقت ہرگز نہ بتاتی لیکن میری بچی کے منہ سے اس ملک کا نام نکل گیا۔''

''یہ تو برا ہوا۔ سجاد کسی وقت بھی یہاں آ سکتا ہے۔''

''اگر اس نے یہاں بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کرنا چاہی تو بھگتے گا۔''

''وہ ایک نمبر کا پاگل ہے۔ اسے اس کی پروا نہیں ہوگی کہ اس کا کیا حشر ہوگا۔''

''تو یہاں سے کسی اور ملک نکل چلو لیکن بڑے صاحب کو خبر کرنا ضروری ہے۔''

''بات میرے گھر سے نکلی ہے اس لیے مجھے ہمت نہیں ہو رہی ہے ان سے بات کرنے کی۔''

''ہمت تو کرنا پڑے گی۔ انہیں بعد میں معلوم ہوگا تو زیادہ غصہ کریں گے۔''

شیر خاں نے کچھ سوچا پھر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''رات بھی خاصی ہوگئی ہے۔ سو نہ گئے ہوں۔''

''بات ایسی ہے کہ انہیں جگا کر بات کرنا ہوگی۔''

شیر خاں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ موبائل اٹھایا پھر رکھ دیا اور بولا۔ ''تم ہی کرو انہیں فون۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کیے دیتا ہوں۔'' زمان خاں نے اپنا موبائل سنبھالا اور قزلباش صاحب سے رابطہ کیا۔

''بے ہودہ انسان!'' قزلباش صاحب کال ریسیو کرتے ہی بگڑ کر بولے۔ ''یہ کوئی وقت ہے فون کرنے کا؟''

''بات بہت اہم ہے صاحب......! دیر ہونے کی صورت میں آپ کو ہم پر بہت ہی غصہ آتا۔''

''کوئی قصہ اس لڑکی کا ہے؟''

''اس سے بھی اہم ہے۔ سجاد نے معلوم کرلیا ہے کہ ہم لوگ سوئٹزرلینڈ میں ہیں۔''

''کیا؟'' قزلباش صاحب اچھل ہی گئے۔

''جی ہاں۔''

''پوری بات بتاؤ۔'' قزلباش صاحب کا لہجہ ہیجانی ہوگیا۔

زمان خاں نے انہیں پوری بات بتا دی۔

سب کچھ سن کر قزلباش صاحب نے پوچھا۔ ''شیر خاں کہاں ہے؟''

''یہیں، میرے پاس ہی ہے۔'' زمان خاں نے شیر

خاں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"تو فون اسی کو کرنا چاہیے تھا۔"
"وہ ڈر رہا ہے آپ سے بات کرتے ہوئے کیونکہ بات اس کے گھر سے نکلی ہے۔"
"کوئی اور بات تو نہیں نکلی اس کے گھر سے؟"
"اور کیا بات ہو سکتی ہے؟"
"شاہدہ کی شادی کے بارے میں۔"
"بی بی کی شادی!" زمان خاں چونکا۔ "وہ تو تیار ہی نہیں تھیں شادی کے لیے۔ کہہ رہی تھیں کہ جب تک بھائی جان نہیں ہوں گے، وہ شادی نہیں کریں گی۔"
"اس سے یہ جھوٹ بولنا پڑا ہے کہ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہ صرف ایک دن کے لیے، یعنی اس کی شادی کے دن آجائے گا۔ صبح آئے گا اور دوسرے دن واپس چلا جائے گا۔ بات سے بات نکلی اور میں تمہیں اس بارے میں بتا بیٹھا۔ اب اس کا علم دانش کو نہیں ہونا چاہیے۔"
"ٹھیک ہے صاحب!"
"سجاد کے بارے میں تم لوگ کیا سوچ رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ فوری طور پر سوئٹزرلینڈ چھوڑ دو۔ کسی اور قریبی ملک چلے جاؤ۔"
"ہم دونوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن کیا چھوٹے صاحب مان جائیں گے؟ وہ اس لڑکی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔"
"تم لوگ کوشش کر دیکھو ورنہ میں خود بات کروں گا۔ اور ہاں..... شاہدہ کی شادی کے بارے میں اسے ہوا بھی نہ لگے۔ اب ذرا فون شیر خاں کو دو۔"
زمان خاں نے اپنا موبائل شیر خاں کی طرف بڑھایا۔
"بڑے صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"
شیر خاں نے ہچکچاتے ہوئے فون اپنے ہاتھ میں لیا۔
پھر زمان خاں نے محسوس کیا کہ شیر خاں پر جھاڑ پھٹکار ہو رہی تھی۔ زمان خاں اسے نظر انداز کر کے سوچنے لگا کہ ادھر ادھر دھکے کھانے سے بہتر ہے کہ واپس جاگیر پہنچا جائے۔ وہ شروع ہی سے سوئٹزرلینڈ تو کیا، کسی بھی ملک میں جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ خاصا جوشیلا ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ جاگیر ہی میں رہ کر حالات کا مقابلہ کیا جائے۔
جھاڑ پھٹکار سننے کے بعد شیر خاں نے موبائل زمان خاں کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شاہدہ بی بی کا کیا قصہ چھڑ گیا تھا؟"
زمان خاں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اسے قزلباش صاحب سے معلوم ہوا تھا۔
شیر خاں نے سر ہلایا۔ "یہ بات تو چھوٹے صاحب سے چھپانی پڑے گی۔ وہ تو بہت پیار کرتے ہیں شاہدہ بی بی سے..... وہ تو جاگیر جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ ایک پل بھی ضائع کیے بغیر ہم چھوٹے صاحب کو حالات سے آگاہ کر دیں۔"
"وہ بھی سو ہی رہے ہوں گے۔"
"جب حالات کی نزاکت کے باعث بڑے صاحب کو جگا دیا تو انہیں کیوں نہیں جگایا جا سکتا۔"
"تو چلو۔"
وہ دونوں اپنے کمرے سے نکل کر دانش کے کمرے میں پہنچے۔ کال بیل سے دانش تو جاگ گیا لیکن جمیل سوتا رہا۔
"کیا مصیبت آگئی ہے آدھی رات کو۔" دانش نے دروازہ کھولتے ہی ان دونوں پر برسنا شروع کر دیا۔ "یا کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے اور ڈر کر آئے ہو۔"
"بھیانک تو نہیں لیکن کچھ ایسا ہی ہے چھوٹے صاحب۔" زمان خاں نے ہمت کر کے کہا۔
"اب بتاؤ کیا بات ہے؟" دانش نے ایک صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔
شیر خاں کو بتانا ہی پڑا۔
"باڈی گارڈ ہو تم!" سب کچھ سن کر دانش نے حقارت سے شیر خاں کو دیکھا۔ "باڈی گارڈ کو ہر بات اپنے گھر والوں سے بھی چھپانا پڑتی ہے۔ معلوم نہیں تھا تمہیں؟"
شیر خاں سر جھکائے کھڑا رہ گیا۔ کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔
"بڑے صاحب کو بھی اطلاع دے دی گئی ہے۔" زمان خاں بولا۔
"وہ کیا فرماتے ہیں؟" دانش کے لہجے میں طنز آگیا۔
"ہمیں یہاں سے قریب کے کسی ملک میں منتقل ہو جانا چاہیے۔"
"چوہوں کی طرح بھاگتے ہی پھریں۔"
"اب جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"
"جاؤ جا کر سو جاؤ۔" دانش نے کہا۔ "جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"
وہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔ آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ قزلباش صاحب کا فون آگیا۔ انہیں اس معاملے کی وجہ سے بے چینی تو ہونا ہی تھا۔

☆☆☆

دانش اس معاملے کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا

اس لیے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ غنودگی میں تھا کہ موبائل کی گھنٹی نے اس کی غنودگی توڑ دی۔ کال قزلباش صاحب کی تھی۔

''معلوم ہوا ہے کہ تم نے سوئٹزرلینڈ چھوڑنے سے انکار کردیا ہے۔'' وہ بولے۔

''مجھے یہ بہت برا لگے گا بابا کہ چوہوں کی طرح بھاگ پھروں۔''

''لو، اپنی ماں سے بات کرو۔''

دانش نے ایک طویل سانس لی۔ بی بی سکینہ اس کی کمزوری تھیں لہٰذا اب قزلباش صاحب اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ یہ تو انہوں نے سمجھ ہی لیا ہوگا کہ دانش ان کی بات نہیں مانے گا۔

''ہیلو!'' بی بی سکینہ کی آواز آئی۔

''جی......! میں بول رہا ہوں ماں۔'' دانش سپاٹ لہجے میں بولا۔ اس وقت وہ ماں کو سلام کرنا بھی بھول گیا تھا۔

''جو میں سن چکی ہوں، کیا وہ ٹھیک ہے؟'' بی بی سکینہ نے پوچھا۔

''جی...... ماں!'' دانش نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

بی بی سکینہ نے کہا۔ ''میں تم سے بحث تو کر نہیں سکتی بیٹا' بس ایک بات کہوں گی پھر تم جو چاہو کرنا۔ اگر تم نے وہ ملک نہ چھوڑا تو اپنی ماں کا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔''

یہ جملہ ماؤں کا سب سے خطرناک حربہ ہوتا ہے۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جاچکا تھا۔ دانش نے موبائل ہی اپنے سر پر مار لیا اور پھر کئی منٹ تک سکتے میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے موبائل پر نوشین کے نمبر ملائے۔ وہ جانتا تھا کہ نوشین جاگ رہی ہوگی۔ وہ رات ہی کو پینٹنگ کیا کرتی تھی۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں فرہاد!'' کال ریسیو کرتے ہی اس نے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم سو رہے ہوگے۔''

''ہم صبح دس بجے کے قریب کافی شاپ میں ناشتا کرتے ہیں نا؟''

''یہ بھی کوئی سوال ہوا؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم آٹھ بجے تک کافی شاپ میں آجاؤ۔''

''یہ جلدی کیوں؟''

''بس دل چاہ رہا ہے۔'' دانش زبردستی ہنسا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم کوئی بات چھپا رہے ہو۔''

''اگر تمہیں یہ لگتا ہے تو لگنے دو۔ بس آٹھ بجے کافی شاپ میں آجانا اور اب کوئی اور سوال کرنے کے لیے مجھے فون مت کرنا۔ اپنے کام میں مصروف ہوجاؤ۔''

دانش نے رابطہ منقطع کردیا۔ وہ فون پر نوشین کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اسے ملک چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ نوشین کو اس بات سے صدمہ ہوتا یا نہ ہوتا لیکن وہ خاصی پریشان تو ہوجاتی، اسی لیے دانش نے فیصلہ کیا تھا کہ بالمشافہ ملاقات میں نوشین کو صورت حال سمجھائے۔ وہ اپنی ماں کی بات نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔

باقی رات اس نے جاگتے ہوئے گزاری۔ بات ایسی تھی کہ اسے نیند نہیں آسکتی تھی۔ صبح وہ ٹھیک آٹھ بجے کافی شاپ میں پہنچ گیا۔ نوشین وہاں پہلے ہی سے موجود تھی اور فکرمند نظر آرہی تھی۔

''تم پہلے ہی سے موجود ہو۔'' دانش نے مسکرا کر کہا تاکہ نوشین کی قبل از فکرمندی دور کرسکے۔

''میں رات کو نہ تو کام کرسکی، نہ مجھے نیند آئی۔'' نوشین نے کہا۔ ''تم نے مجھے فون کرنے سے منع کردیا تھا اس لیے فون بھی نہیں کیا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ تمہارے گھر ہی میں پہنچ جاؤں لیکن جمیل کی وہاں موجودگی کی وجہ سے رک گئی۔''

''تو کیا تم اتنی پریشان ہوگئی تھیں شیریں!'' دانش نے کہا اور ویٹر کو بلا کر ناشتے کا آرڈر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوشین ناشتا سکون سے کرلے۔ اصل بات سامنے آنے کے بعد تو اس کا ہاتھ رک جاتا ہو سکتی تھی۔ لیکن نوشین ناشتا سکون سے کر ہی نہیں سکی۔ اس کے چہرے سے الجھن صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے صحیح طور پر ناشتا کیے بغیر ہاتھ اٹھا لیا۔ ''بس!'' اس نے کہا۔

''ہوں۔'' اب دانش بھی سنجیدہ ہوگیا۔

''بتاؤ فرہاد!'' وہ پھر بولی۔ ''اصل بات کیا ہے۔ تم مجھ سے اتنی جلدی ملنے کے لیے بے چین کیوں ہوگئے تھے۔ شاید کوئی خاص بات ہے جو تم فون پر نہیں کرسکتے تھے۔''

''ہاں شیریں!'' دانش نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''معاملہ خاصا گمبھیر ہوگیا ہے۔''

''بتاؤ تو سہی۔'' نوشین بے قراری سے بولی۔

اب دانش کو سب کچھ تفصیل سے بتانا پڑا۔ اس دوران میں نوشین کے چہرے کی رنگت بدلتی رہی۔ آخر میں دانش نے اپنی ماں کی بات بھی بتادی۔ شیریں پر ایک منٹ تک سکتہ سا طاری رہا پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تو کیا فیصلہ ہے تمہارا؟''

''مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔'' دانش کی نظریں جھک گئیں۔

''میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔'' نوشین کا انداز

فیصلہ کن تھا۔

"اس سے اور زیادہ خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ تم سے میرے تعلق پر والد صاحب پہلے ہی برگشتہ ہیں، پھر یہ کہ تمہیں اپنے کام پر بھی توجہ دینی چاہیے۔"

"جہنم میں گیا کام۔" نوشین کی آواز رندھ گئی۔ "میرا دھیان تو اب اس بچے کی طرف ہے جس کی میں ماں بننے والی ہوں۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا شیریں کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔"

"کب تک آؤ گے؟"

"اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کھیل کی ڈور میرے والد کے ہاتھ میں ہے۔" جبکہ وہ ڈور در اصل بابا پیر کے ہاتھ میں تھی جس کا دانش ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تو پھر .....؟" نوشین کی آواز رندھ گئی۔ "کوئی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ مجھے خودکشی کرنی پڑے۔"

"ایسی باتیں نہ نکالو زبان سے۔" دانش نے جلدی سے کہا۔

نوشین کی آنکھ سے آنسو ٹپکا تو وہ جھٹکے سے اٹھ کر کافی شاپ سے جانے لگی۔ دانش دم بخود سا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اس شخص کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکا جو قریب ہی کی میز پر بیٹھا بڑی توجہ سے ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

☆☆☆

"بہت خوب۔" سجاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "لڑکی کو حاملہ ہی کر دیا ہے اس نے۔"

"بالکل صاف بات ہوئی تھی۔" جواب دیا گیا۔

جواب دینے والا وہی آدمی تھا جس نے کافی شاپ میں دانش اور نوشین کی باتیں سنی تھیں۔

اس شخص کا نام ناصر تھا جس کا تعلق تو سجاد کی جاگیر سے لیکن برسوں پہلے شہر جا کر وہیں آباد ہو گیا تھا۔ سجاد نے سوئٹزرلینڈ کے لیے خاص طور پر اس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہ دانش کے لیے جانا پہچانا آدمی نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ سجاد کو کسی خاص قسم کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔

سجاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں کی باتوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دانش کو اس کا علم رات ہی کو ہوا ہو گا جبکہ مجھے پانچ دن پہلے پتا چل گیا تھا۔"

"تم نے بتایا تھا کہ یہ راز شیر خان کی لڑکی نے کھولا تھا۔"

"ہاں۔" سجاد نے کہا۔ "لیکن یہاں اطلاع دینے والی تو اس کی ماں ہی ہو گی۔"

"یقیناً وہی ہونی چاہیے۔"

"اب کرنا کیا ہے؟"

"سوئٹزرلینڈ ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کسی کو آسانی سے قتل کیا جا سکے۔ میں نے سوچا تھا کہ حالات دیکھ کر، سوچ سمجھ کر کوئی ایسا منصوبہ بنایا جائے کہ قتل کو خودکشی سمجھا جائے اور ہم کل ہی یہاں پہنچے ہیں۔ یہ مشکل تو یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ منصوبہ بنانے میں کچھ وقت تو لگتا لیکن وقت ہمیں مل نہیں رہا ہے۔ ممکن ہے وہ یہاں سے آج کل میں ہی بھاگ نکلے۔"

"یہ تو اچھی بات ہو گی۔ ممکن ہے وہ کسی ایسے ملک کا رخ کرے جہاں اسے قتل کرنا مشکل نہ ہو۔"

"ہاں، اس کا امکان تو ہے۔ تم ان لوگوں پر کڑی نظر رکھو۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اب وہ کہاں جائے گا۔"

"ٹکٹ کی خریداری ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں بھاگنے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ٹکٹ کی خریداری کے لیے شاید وہ اپنے باڈی گارڈ ہی سے کام لے۔"

"میں دیکھوں گا کہ کیا ہوتا ہے۔"

"میں نے تمہارا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ تم ناکام نہیں رہو گے۔"

ناصر مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

دوپہر سر پر آنے کو تھی۔ دانش بستر پر پڑا سوچ بچار میں اپنے سر کا درد بڑھا رہا تھا۔ جمیل اس وقت کمرے میں نہیں تھا۔

اس وقت زمان خاں اس کے کمرے میں آیا۔ وہ بڑی عجلت میں معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "شیرا ابھی باتھ روم میں گیا ہے جو آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں نکلتا۔ میں نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے یہی موقع غنیمت جانا۔"

"اب کیا اطلاع ہے؟" دانش نے بے دلی سے پوچھا۔

"میں تو شروع ہی سے اس کا مخالف رہا ہوں کہ ملکوں ملکوں کی خاک چھانی جائے۔ یہ بزدلی ہے اور اب موقع ہے کہ ہم سیدھے اپنی جاگیر چلیں۔"

"موقع؟" دانش نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

زمان خاں نے دھماکا کیا۔ "شاہدہ بی بی کی شادی ہو رہی ہے۔"

دانش اچھل پڑا۔

"اور ہم سے کہا گیا ہے کہ آپ کو اس کا پتا نہ چلے ورنہ آپ سیدھے جاگیر ہی پہنچیں گے۔ شاہدہ بی بی تو اس پر اڑ گئی

تھیں کہ وہ آپ کی موجودگی کے بغیر شادی نہیں کریں گی لیکن انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ دو دن بعد ہی ہے شادی۔"

زمان خاں نے ساری بات بتادی پھر کہا۔

"اب آپ فیصلہ کیجیے۔ میں تو جا رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیر ا باتھ روم سے نکلے تو مجھے نہ پائے۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" دانش نے کہا۔

زمان خاں کے جانے کے بعد دانش چند لمحے بیٹھا رہا، پھر کمرے سے نکل کر سیدھا نوشین کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ شیر خاں کی اب اسے پروا نہیں رہی تھی اور زمان خاں اس کا ہمدرد ثابت ہوا تھا۔

نوشین کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس نے کوئی کام نہیں کیا ہوگا۔ پڑی رو رہی ہوگی۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور بھیگی ہوئی پلکوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آنکھیں خشک کرتے ہوئے دروازے تک آئی تھی۔

"کوئی اور بری خبر؟" اس کی آواز رندھی ہوئی سی تھی۔

"بس ایک سوال کرنا ہے۔" دانش ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

وہ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے۔ دانش نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ نوشین جیسی بیٹھی تھی، ویسی ہی بیٹھی رہی۔

"ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔" دانش نے کہا۔ "اب مجھے زیادہ طویل عرصے کے لیے کہیں نہیں جانا۔ بس چوبیس گھنٹے کے لیے اپنے گھر جاؤں گا اور واپس آ جاؤں گا۔ اس میں بس آنے جانے کے سفر کا وقت اور شامل کر لو۔"

نوشین نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور بس دیکھتی رہی، کچھ بولی نہیں۔

"میری چھوٹی بہن کی شادی ہونے والی ہے اور مجھ سے یہ بات چھپائی گئی ہے۔" دانش نے بتایا۔ "اور مجھ سے یہ بات اس لیے چھپائی گئی ہے کہ میں شادی کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ جاؤں۔ والد صاحب میری واپسی نہیں چاہتے..... میری بہن مجھے بہت چاہتی ہے شیریں! اور میں بھی اس سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تم چند دن کے لیے تو میری جدائی برداشت کر لوگی نا میری جان!"

"چند دن بھی میرے لیے صدیوں کے برابر ہوں گے لیکن یہ تم نے مجھے کچھ اچھی خبر سنائی ہے۔" نوشین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی لیکن پھر وہ فوراً سنجیدہ بھی ہو گئی اور بولی۔ "تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو، مجھے بہلا تو نہیں رہے ہو؟"

"بہلانا ہوتا یا جھوٹ بولنا ہوتا تو پہلے ہی کر گزرتا۔" دانش نے اسے پیار کر کے کہا۔

"کب جاؤ گے؟" نوشین نے پوچھا۔ "میرا کام تو بس ختم ہونے والا ہے۔ ایک سینری کو فنشنگ ٹچ دینا ہے۔ اب تو میں یہاں اس لیے رکوں گی کہ تمہارے ہی ساتھ جاؤں۔ تمہارا وعدہ ہے کہ مجھے اپنے والد کے پاس لے چلو گے۔"

"یقیناً لے چلوں گا۔ بس تم تیار رہنا۔ شادی کے بعد آؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر فوراً واپس۔"

ان باتوں سے نوشین کا موڈ کچھ بحال ہوا۔ وہ دانش کے سینے سے لگ گئی۔ "مجھے بھول نہ جانا فرہاد!" اس کی آواز اس مرتبہ کچھ بھرائی۔

"میں اپنے ہونے والے بچے کی قسم کھاتا ہوں۔ میں ابھی تمہیں لے جاتا لیکن والد صاحب کو مجھے دیکھتے ہی غصہ آ جائے گا۔ ایسی صورت میں ان سے تمہاری بات کرنا مناسب نہیں رہے گا۔"

بات نوشین کی سمجھ میں آ گئی اور اس کا موڈ خاصی حد تک بحال ہو گیا۔

☆☆☆

شیر خاں دانش کے اس فیصلے سے بہت جز بز ہوا۔ اس نے فوراً فون پر قزلباش صاحب کو اطلاع دی۔

"اس نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟" قزلباش صاحب نے غصے سے پوچھا۔

"شاید انہیں کسی ذریعے سے شاہدہ بی بی کی شادی کا پتا چل گیا ہے۔"

دوسری طرف سے بہت غصے میں رابطہ ختم کر دیا گیا۔

شیر خاں نے احتیاط کے خیال سے قزلباش صاحب کو یہ اطلاع ہوٹل کے ایک کنج سے دی تھی۔ دراصل اسے زمان خاں پر شبہ ہو گیا تھا لیکن اس کی یہ احتیاط کام نہیں آ سکی۔ اسی کنج میں کچھ فاصلے پر دانش موجود تھا۔ وہ شبہے کے تحت شیر خاں کا تعاقب کر کے وہاں پہنچا تھا لیکن یہ بات جاننے سے دانش پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ نہ جانتا تو بھی اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ بس تھوڑی سی گڑبڑ یہ ہوئی تھی کہ اس کے باپ کو قبل از وقت اس کی واپسی کا علم ہو گیا تھا۔

اتفاق سے دانش کو ایسی فلائٹ ملی کہ وہ جس صبح اپنے گھر پہنچا، اسی رات شاہدہ کی شادی تھی۔

اس کی واپسی سے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ قزلباش

صاحب تو دانش پر بہت بگڑے پھر جب دانش و تنہائی نصیب ہوئی تو شاہدہ اس کے کمرے میں آئی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

”ارے پگلی!“ دانش نے کہا۔ ”اب تو میں آگیا ہوں نا۔“

”مجھے شک ہو رہا تھا کہ مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ غلط کہا گیا ہے کہ آپ شادی کے دن آجائیں گے۔“ شاہدہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں نے بھی فیصلہ کرلیا تھا آپ نہ آتے تو میں بابا کے غصے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔ نکاح سے ایک گھنٹے پہلے ہی شادی سے انکار کردیتی۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں رہی لیکن میری لاڈلی مجھے فوراً ہی واپس بھی جانا ہوگا۔ بابا کے غصے کو میں اسی طرح تو کم کرسکا کہ میں کل ہی واپس چلا جاؤں گا۔ میں نے انہیں کل کے ٹکٹ بھی دکھا دیے ہیں۔“

”اتنی جلدی؟“ شاہدہ کچھ افسردہ ہوئی۔

”حالات ہی ایسے ہیں میری لاڈو۔“ دانش نے کہا اور اسے حالات کی اونچ نیچ سمجھا کر اس کی افسردگی دور کی۔

ذرا دیر بعد ہی بی بی سکینہ کے ذریعے اسے اپنے والد کا حکم ملا کہ وہ اور جمیل ابھی واپسی تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھیں گے۔

”حد ہے بزدلی کی۔“ دانش زیرِ لب بڑبڑا کر رہ گیا۔

”یہ بزدلی نہیں ہے بیٹا۔“ بی بی سکینہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”خوشی کے اس موقع پر کوئی گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے ماں!“ دانش نے کہا۔ ”میں نے بابا کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے لیے کب کہا ہے؟“

بی بی سکینہ اس کے واری صدقے کرکے کمرے سے چلی گئیں۔

شام کو شادی تھی اس لیے تیاریاں زوروں پر تھیں۔ خود دانش سب سے بڑھ چڑھ کر ان تیاریوں میں حصہ لے رہا تھا۔ آخر اس کی بہت لاڈلی بہن کی شادی تھی۔ جمیل بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ لائٹس لگائی جارہی تھیں۔

قزلباش صاحب نے ان کو دیکھا تو بولے۔ ”تم دونوں گھر کے اندر ہی رہنا۔ بیرونی رخ پر روشنیاں کرنے باہر مت نکلنا۔ اتنے ملازم جو موجود ہیں۔“

دانش سر ہلا کے ٹال گیا۔ باہر تو اسے جانا ہی تھا۔ وہ سوئٹزرلینڈ سے کچھ ایسی روشنیاں لے کر آیا تھا جو اس نے پہلے کبھی دیکھی بھی نہیں تھیں۔ اس نے ان روشنیوں کی سجاوٹ کا طریقہ بھی وہیں سیکھ لیا تھا جسے سیکھنے میں اسے آدھا گھنٹا بھی نہیں لگا تھا۔ وہ سجاوٹ گھر کے ملازمین نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے بس مدد لی جاسکتی تھی۔

شام کی چائے پینے کے بعد اس نے جمیل کو بھی ساتھ لیا اور قزلباش صاحب کی نظر بچا کر باہر کا رخ کیا۔ تھوڑا بہت طریقہ اس نے جمیل کو بھی سمجھا دیا تھا لیکن ملازمین کی مدد بہرحال ضروری تھی۔ انہیں بھی ساتھ لیا گیا۔

وہ روشنیاں سیٹ کرنے میں خاصا وقت لگا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب کام ختم ہوا۔ برات آنے میں ایک گھنٹا رہ گیا تھا۔ دانش حویلی سے کچھ دور جانے لگا۔

”اُدھر کہاں جارہے ہیں بھائی جان!“ جمیل نے اسے ٹوکا۔ ”بابا نے تو باہر نکلنے ہی سے روکا تھا، آپ دور جارہے ہیں۔“

”زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ کچھ فاصلے ہی سے دیکھوں گا کہ روشنیاں کیسی لگ رہی ہیں۔ تم بھی آؤ۔“

جمیل بھی بزدل نہیں تھا۔ اس نے بھی قدم بڑھا دیے۔ دانش جہاں جا کر رکا، وہیں کچھ فاصلے پر ایک کالے لباس والا شخص گھنے درخت میں چھپا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے موبائل پر کسی کو اس کی خبر دی اور کہا۔ ”یہاں سے میں ان دونوں کو نشانہ بنا سکتا ہوں۔“

”نہیں۔“ سخت لہجے میں جواب دیا گیا۔ ”یہ کام مجھے اپنے ہاتھوں سے کرنا ہے۔“ اس طرح کا جواب دینے والا سجاد کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

سجاد کا بھی سوئٹزرلینڈ سے واپس آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اسے ناصر سے رپورٹ مل گئی ہوگی کہ دانش واپس لوٹ رہا ہے۔

مزید کہا گیا۔ ”میں نے تمہیں صرف ماحول کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ منصوبہ وہی ٹھیک رہے گا جو بتایا جاچکا ہے۔ تم موقع ملتے ہی واپس آؤ۔ ماحول کے بارے میں تم نے جو رپورٹ دی ہے، اس کی روشنی میں وہاں کچھ نہیں ہوسکتا۔ مستقل حرکت میں تو ہیں وہ دونوں۔“

کالے لباس والے سے بے خبر دانش اور جمیل نے حویلی کی کئی تصویریں اتاریں اور حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔

”شاندار لگ رہی ہے حویلی۔“ جمیل نے تبصرہ کیا۔

”ان لائٹس کی وجہ سے منفرد ہوگئی ہے جو میں سوئٹزرلینڈ سے لایا تھا ورنہ عام سی سجاوٹ ہوتی۔“

وہ دونوں حویلی کے پھاٹک پر پہنچ گئے اور وہیں قزلباش صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

’’منع کیا تھا تم دونوں کو۔‘‘ وہ بگڑ کر بولے۔

’’میرے بغیر یہ روشنیاں نہیں ہو سکتی تھیں بابا۔‘‘ دانش نے کہا۔ ’’آپ ذرا باہر نکل کر دیکھیے تو سہی۔‘‘

قزلباش صاحب نے کچھ باہر نکل کر دیکھا اور پھر واپس آ کر تعریف کرتے ہوئے کہا۔

’’ہاں...... اچھا انداز ہے لیکن تم کو یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔‘‘

’’اب تو ہم خطرے سے باہر نکل آئے ہیں بابا۔‘‘ جمیل بولا۔

’’چلو، اندر چلو۔‘‘

ان دونوں نے حویلی کی جو تصویریں لی تھیں وہ شاہدہ کو بھی دکھائی گئیں جو دلہن بنی بڑی پیاری لگ رہی تھی کیونکہ برات آنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔

آخر برات آ گئی۔ کچھ ہی دیر میں نکاح کے بعد مہمانوں کو کھانے پر بلایا گیا۔ رسوم ادا کی گئیں اور پھر دولہا میاں اپنی دلہن کو لے کر روانہ ہونے لگے تو ان کی کار پر نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ دانش نے سب سے زیادہ نوٹ نچھاور کیے۔ وہ کچھ دور تک کار کے ساتھ گیا تھا۔ وہ اور آگے تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قزلباش صاحب نے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے اسے ڈانٹ کر واپس بھیجا۔

’’سب ٹھیک ہو گیا۔‘‘ بی بی سکینہ نے تبصرہ کیا۔

اب دانش اور جمیل کے ساتھ باقی گھر والوں نے بھی کھانا کھایا۔

’’صبح کی فلائٹ پکڑنا ہے تم دونوں کو۔‘‘ قزلباش صاحب بولے۔ ’’سامان ٹھیک کر لو اپنا۔ منہ اندھیرے ہی نکلنا ہوگا۔‘‘

’’تیاری کیا کرنی ہے بابا!‘‘ جمیل بول پڑا۔ ’’ہم نے سامان کھولا ہی کب تھا۔ چھوٹی موٹی دو چار چیزیں ہیں، وہ بیگ میں ڈالنا ہوں گی۔ مشکل سے دس منٹ کا کام ہے۔‘‘

’’تو چل کر کچھ دیر آرام تو کر لو۔‘‘ بی بی سکینہ بول پڑیں۔

دانش اور جمیل نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

دانش اب کچھ افسردہ نظر آنے لگا۔ صرف ایک بہن کے نہ ہونے سے سارا گھر ہی اسے سنسان لگنے لگا تھا۔

باقی رات سو کوئی بھی نہ سکا کیونکہ منہ اندھیرے نکلنے کے باعث ناشتا بھی جلدی کرنا تھا۔

چار بجنے والے تھے جب تین کاروں کا قافلہ ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ آگے کی کار میں قزلباش صاحب اور ان کے باڈی گارڈز بیٹھے تھے۔ بیچ کی کار میں دانش، جمیل اور ان کے باڈی گارڈز تھے۔ پیچھے کی کار میں کچھ اعزا تھے۔

’’بابا دیر بہت ناراض رہے ہم دونوں کے آنے سے۔‘‘ جمیل نے ہنس کر کہا۔

’’اب تو وہ ٹھیک ہو گئے ہوں گے ہم لوگوں کی یہ خیریت روانگی سے۔‘‘ دانش نے باہر جھانکتے ہوئے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اور اسی وقت اس نے اندھیرے میں ایک شعلہ چمکتے دیکھا۔

اس وقت کاریں ایک ایسے مقام سے گزر رہی تھیں کہ ان کے دائیں جانب ٹیلے تھے۔ دانش نے اندھیرے میں وہ شعلہ ٹیلوں ہی کی طرف دیکھا تھا اور وہ شعلہ کسی آتشیں ہتھیار کی گولی کا تھا۔

فوراً ہی کاریں روک دی گئیں۔ باڈی گارڈز نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ ٹیلوں کی طرف سے صرف دو برسٹ چلائے گئے تھے جن کا نشانہ دانش کی کار کا پچھلا حصہ تھا۔

’’دیکھو، کون ہے ٹیلے کے پیچھے۔‘‘ قزلباش صاحب نے کار سے اترتے ہوئے اپنے باڈی گارڈز سے کہا اور دانش کی کار کی طرف دوڑے۔ پچھلی کار میں بیٹھے ہوئے عزیز بھی اتر کر اسی طرف دوڑے تھے۔

دانش کی کار میں خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ جمیل، دانش، ڈرائیور اور دونوں باڈی گارڈز بھی زخمی ہوئے تھے۔

قزلباش صاحب کے منہ سے بے اختیار گالیاں نکل گئیں جو ان لوگوں کے لیے تھیں جنہوں نے کار پر گولیاں برسائی تھیں۔

دونوں باڈی گارڈز پچھلی ہی سیٹ پر دانش اور جمیل کے ساتھ تھے لیکن بے ہوش معلوم ہوتے تھے۔ قزلباش صاحب نے فوری طور پر یہ بات چیک کی تھی۔ باڈی گارڈز بھی بے ہوش تھے اور ڈرائیور دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔

’’یہ کیا ہوا...... کس نے حملہ کیا؟‘‘ اعزا میں سے کئی بولے۔

’’سجاد ہوگا یا اس کے آدمی۔‘‘ قزلباش صاحب نے جواب دیتے ہوئے ڈرائیور کو دوسری سیٹ پر کرتے ہوئے مشتعل لہجے میں کہا اور ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی تھی۔ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے عزیزوں سے کہا۔

’’میرے پیچھے آئیے...... جلد از جلد اسپتال پہنچنا ہے۔‘‘

انہوں نے کار تیزی سے دوڑا دی۔ ان کے باڈی گارڈز کی کار تیزی سے ٹیلوں کے پیچھے جا کر غائب ہو چکی تھی۔

قزلباش صاحب نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ ایک گولی دانش کے ہونٹوں سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری تھی اور دوسری گولی جسم کے کسی حصے میں لگی تھی۔ جمیل کے بارے میں وہ

کوئی اندازہ نہیں کر سکے تھے۔ باڈی گارڈز کی حالت بھی ان سے پوشیدہ رہی تھی۔

قزلباش صاحب نے کار کی تیز رفتاری کے باوجود ایک ہاتھ سے موبائل نکال کر ایک اسپتال سے رابطہ کیا تھا اور اس وقت پل بھر کے لیے ان کے دماغ میں آیا تھا کہ انہیں اپنی جاگیر میں بھی کوئی اچھا اسپتال بنانا چاہیے تھا۔ جو اسپتال پہلے سے موجود تھا وہاں مکمل سہولیات حاصل نہیں تھیں۔

قزلباش صاحب نے فون کر کے فوری ایمبولینس طلب کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایمبولینس اسپتال سے روانہ ہو کر انہیں راستے ہی میں مل جائے تاکہ زخمیوں کو جلد از جلد اس میں منتقل کیا جا سکے۔

موبائل پر ہی انہوں نے پچھلی کار میں آنے والے ایک عزیز سے رابطہ کیا۔

”حویلی کو اطلاع تو نہیں دی گئی؟“

”مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔“ جواب آیا۔

”ٹھیک ہے۔ وہاں خبر کرنا بھی نہیں۔“ قزلباش صاحب کو خیال تھا کہ یہ خبر سن کر ان کی بیوی کی حالت غیر ہو جائے گی۔

ان کی کار شہر سے بیس منٹ کی دوری پر تھی کہ ایمبولینس آ گئی۔ ان کے ... کار والوں نے بہت پھرتی سے زخمیوں کو ایمبولینس میں منتقل کر دیا اور موڑ ... کر واپس شہر کی طرف چل دی۔

اسپتال پہنچتے ہی ان سب زخمیوں کو آپریشن تھیٹرز میں پہنچا دیا گیا۔

اعزا بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ دانش اور جمیل کے آپریشن تھیٹرز کے سامنے جمع ہوئے تھے۔

”دو ایک افراد باڈی گارڈز اور ڈرائیور کے آپریشن تھیٹرز کی طرف جائیں۔“ قزلباش صاحب نے ان سے کہا۔ وہ اپنے ملازموں کا بھی بہت خیال کرتے تھے۔

تین افراد وہاں سے چلے گئے، وہ تھے بھی کل پانچ۔

ڈرائیور کے بارے میں معلوم ہوا کہ اسے مرہم پٹی کر کے کسی وارڈ میں پہنچا دیا جائے گا۔ وہ زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔ فائرنگ کرنے والوں کی توجہ کار کی پچھلی سیٹ کی طرف رہی تھی۔ ڈرائیور معمولی سا زخمی ہوا تھا۔

ڈاکٹروں نے جمیل کے بارے میں بتایا تھا کہ اسے دو گولیاں لگی تھیں اور گولیاں خطرناک جگہ پر لگی تھیں اس لیے اس کی حالت ابھی تشویش ناک تھی البتہ دانش کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اس کے جسم سے گولی نکال لی گئی تھی لیکن اس کے ہونٹ خاصے زخمی ہوئے تھے لیکن اس معاملے میں بھی حالت تشویش ناک نہیں تھی۔ اسے جمیل سے پہلے ایک وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

”وہ جلد ہی ہوش میں آ جائیں گے۔“ ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا۔ باڈی گارڈز کو بھی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔

پھر دانش کو ہوش تو آ گیا لیکن وہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”کہا تھا نا میں نے کہ واپس نہ آؤ۔“ قزلباش صاحب نے اس سے کہا لیکن لہجہ بہت ہی نرم رکھا تھا۔ اس حالت میں اسے ڈانٹا تو نہیں جا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ جمیل کو آئی سی یو میں پہنچا دیا گیا تھا اور ابھی کسی کو اس کے پاس جانے کی ہدایت بھی نہیں تھی۔

قزلباش صاحب نے باڈی گارڈز وغیرہ کی بھی خبر لی۔ ایک عزیز دانش کے پاس ہی رکا رہا۔

قزلباش صاحب اور دیگر افراد جمیل کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ دعائیں کرتے ہوئے قزلباش صاحب پھر دانش کے کمرے میں پہنچے۔

”دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ۔“ انہوں نے دانش سے کہا۔

دانش نے، جو آنکھیں کھولے ہوئے تھا اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خود بولنے کے قابل تو تھا نہیں۔

ایک عزیز ... ”ڈاکٹر سے بات کی تھی میں نے...... اس کا کہنا ہے کہ منہ کی پٹیاں تو پرسوں تک تبدیل نہ کی جائیں گی لیکن گولی کی وجہ سے جو زخم لگا ہے، اس کی وجہ سے انہیں پندرہ دن سے پہلے ڈسچارج نہیں کیا جا سکتا۔“

”اور جمیل! اس کے بارے میں بھی پوچھا تھا؟“

”ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹے تک اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔“

قزلباش صاحب اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گئے۔

حویلی سے یہ بات ایک دن سے زیادہ چھپی نہ رہ سکی۔ نہ صرف بی بی سکینہ بلکہ بابا جی بھی اسپتال آ گئے۔ بی بی سکینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ قزلباش صاحب نے ان کو تسلی دی اور بتایا کہ جمیل کی زندگی اب خطرے سے باہر ہے۔ باڈی گارڈز بھی ٹھیک تھے۔ ڈرائیور کو اسپتال سے چھٹی دے دی گئی تھی کیونکہ وہ معمولی سا زخمی ہوا تھا۔

سکینہ بی بی کو دیکھ کر دانش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ اس طرح ماں کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اس سوال سے اس کا دل رو رہا تھا کہ اب وہ کبھی بول سکے گا یا نہیں۔ ڈاکٹر اسے اب بھی اطمینان دلا رہے تھے کہ وہ بول سکے گا لیکن اس

میں کچھ دن لگیں گے۔

بابا پیر نے آتے ہی قزلباش صاحب سے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ ابھی ان دونوں کا آنا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''میں کیا کرتا بابا!'' قزلباش صاحب نے نظریں جھکا کر جواب دیا تھا۔ ''ہم نے تو شادی کی بات چھپائی تھی۔ دانش کو نہ جانے کیسے معلوم ہوگیا۔ وہ اور جمیل خود ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ ان کو آنے سے روکنا تو میرے بس میں نہیں تھا۔''

''اسے پتا کیسے چلا؟''

''شیر خاں کو شبہ ہے کہ زمان خاں نے بتایا ہوگا۔ اسپتال سے بہ خیریت گھر لوٹیں تو زمان خاں کی زبان تو میں کھلوالوں گا اور اسے بہت سخت سزا دوں گا۔''

اسی دن شاہدہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ اسپتال آگئی تھی اور دانش کا ہاتھ پکڑے دیر تک روتی رہی تھی۔

اگلے دن دانش کے ہونٹوں سے پٹی ہٹا کر صرف دوا لگا دی گئی۔ ہونٹ ابھی اتنے سوجے ہوئے تھے کہ بات کرنا اس کے لیے محال تھا۔ وہ بس غوں غاں کرسکتا تھا۔ اسے بس نوشین کی فکر لگی ہوئی تھی۔ وہ موبائل پر اس سے رابطہ کرسکتا تھا لیکن اس سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بس ''غوں غاں'' کرکے رہ جاتا۔

جمیل ابھی آئی سی یو میں ہی تھا۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ اسے چار پانچ دن آئی سی یو میں ہی رکھا جائے گا۔ منٹ بھر کے لیے سب کو اس سے ملنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

بابا پیر سے قزلباش صاحب نے کہا۔ ''کیا دانش وغیرہ کو اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد پھر باہر بھیجا جائے؟''

''نہیں۔'' بابا پیر نے کہا۔ ''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میرے دماغ میں مصالحت کا جو منصوبہ تھا، اب اس پر عمل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے کم از کم دانش کا اسپتال سے ڈسچارج ہونا ضروری ہے۔''

انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کا منصوبہ کیا ہے اور قزلباش صاحب میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان سے کوئی سوال کرسکتے۔

دانش کا موبائل قزلباش صاحب کے پاس تھا کیونکہ دانش کو واپس دینا بے کار تھا۔ وہ کسی سے بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی گھنٹیاں بجتی تھیں لیکن قزلباش صاحب کال ریسیو ہی نہیں کرسکتے تھے۔ بس اسکرین پر فون کرنے والے کا نام دیکھ کر اپنے پاس نوٹ کرلیتے تھے۔ وہ بعد میں دانش کو بتادیتے کہ کس کا فون ہے۔ وہ سب اس کے صحت مند ہونے کے بعد ہوتا۔ وہ سب کالیں دانش کے جاننے والوں ہی کی ہوسکتی تھیں۔ ان میں ایک نام شیریں کا بھی تھا۔ قزلباش صاحب نے اسے بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

ایک مرتبہ فون کی گھنٹی بجی تو وہ دانش کے پاس ہی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ کال کرنے والی شیریں ہی تھی۔

قزلباش صاحب نے فون بند کردیا اور دانش سے کہا۔ ''تمہارے جاننے والوں کے فون آتے رہتے ہیں۔ میں انہیں نہیں بتانا چاہتا کہ تم اسپتال میں ہو۔ اسپتال آنے والوں کا آنا جانا شروع ہوجائے گا جبکہ تم ان سے بات بھی نہیں کرسکتے تھے۔ کسی عورت شیریں کو بھی جانتے ہو؟''

اسی وقت موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔ کال شیریں ہی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ قزلباش صاحب فون بند کردیتے، دانش نے بے تابانہ ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ان سے موبائل لینا چاہتا تھا۔ قزلباش صاحب نے کچھ سوچا اور پھر موبائل اسے دے دیا۔ اسکرین پر شیریں کا نام دیکھ کر دانش کا چہرہ کھل اٹھا۔

☆☆☆

نوشین بہت پریشان تھی۔ اس کے خیال میں فرہاد کو اب واپس آجانا چاہیے تھا۔ وہ فرہاد کو چار مرتبہ فون کرچکی تھی لیکن دوسری طرف سے لائن کاٹ دی جاتی تھی۔ نوشین کے دماغ میں یہ خیال جڑ پکڑتا چلا گیا کہ فرہاد اب اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔

کم از کم بتا تو دے کہ اب وہ اس سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ یہ بات مسلسل سوچتی رہی تھی۔ آخر اس نے پانچویں مرتبہ یہ سوچ کر فون کیا کہ اب مسلسل کرتی رہی تھی، فرہاد کو فون کرتی ہی رہے گی۔ وہ جواب تو دے کہ وہ اس سے اپنا ناتا توڑنا چاہتا ہے۔

ایک بار لائن کٹ جانے کے بعد اس نے اسی وقت پھر فون کیا۔ اس مرتبہ گھنٹی زیادہ دیر تک بجی اور پھر محسوس ہوا کہ کال ریسیو کرلی گئی تھی۔

''فرہاد!'' نوشین چیخ پڑی۔

جواب میں ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی گونگا بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''غاں غیں'' کی آوازیں تھیں۔

''صاف صاف بتاؤ فرہاد!'' نوشین نے التجا کی۔ ''کیا اب تم مجھے بھول جانا چاہتے ہو؟''

جواب میں پھر اسی قسم کی آوازیں آئیں۔ نوشین نے ایک بار پھر کچھ کہا لیکن وہی غوں غاں۔ نوشین نے رابطہ منقطع کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ دیر تک

موبائل کو سینے سے لگائے رہتی اگر اس کی گھنٹی نہ بج اٹھتی۔

کال کرنے والے کا نام فرہاد دیکھ کر اس نے جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''ہاں فرہاد ...! میں بول رہی ہوں۔ آخر تم.....''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ''تمہاں غاں'' کی آوازیں ابھرآنے لگیں۔

نوشین نے جھنجلا کر موبائل دیوار سے دے مارا۔

''بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔'' اس نے اس مرتبہ غصے سے سوچا اور پھر ایک فیصلہ کرلیا۔

وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔ تمام سینریز پیک کروا کے اپنے گھر کے پتے پر بھیج دی تھیں۔ اس نے دوسرے ہی دن اپنا حمل ضائع کروایا اور دو دن بعد کی فلائٹ سے اپنے وطن روانہ ہوگئی۔

غصہ تو اسے آیا تھا لیکن واپسی میں وہ اداس ہی رہی۔ فرہاد کی محبت اس کے دل سے نہیں جا سکی تھی۔

وہ اپنے گھر پہنچ گئی۔

''آ گئی میری بیٹی!'' باپ نے خوش ہو کر اسے سینے سے لگایا۔ ''سینریز تو مل گئی تھیں اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب تم آنے والی ہو۔''

نوشین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ارے!'' باپ کے منہ سے نکلا۔ ''خوشی کے موقع پر آنسو؟''

''خوشی کے آنسو ہیں پاپا۔'' نوشین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اتنے دن بعد ملی ہوں ناں آپ سے۔''

لیکن دراصل وہ اپنی محبت کی ناکامی کے خیال سے روئی تھی۔ وہ اسی دن صبیحہ سے ملی۔ صبیحہ نے اسے گلے لگا لیا۔

''اطلاع تو دی ہوتی آنے کی۔'' اس نے گلہ کیا۔

''بس اچانک چل پڑی تھی۔ پینٹنگز گھر بھجوا دیں، وہ منگوانی ہوں گی۔''

''ابھی بھجواتی ہوں گاڑی۔''

''ٹرک بھجوانا۔ بڑی بڑی پینٹنگز ہیں۔''

''ٹرک بھیج دیا جائے گا۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''اب کل سے ہی اپنا کام شروع کردو۔''

''میں کچھ دن آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

صبیحہ نے اس کو اصرار کر کے کھانے پر روک لیا۔

کھانے کے دوران میں نوشین نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری شادی اس سے ہونے والی ہے جسے تم نے پسند کیا تھا؟''

''امید تو ہے کہ ہو جائے گی۔ وہ اسپتال سے آ جائے۔''

''اوہ......! کیا کچھ بیمار ہے؟''

''ہاں، کچھ یوں ہی ہے۔''

صبیحہ نے حقیقت بتانا شاید مناسب نہیں سمجھا۔ ''کام کب سے شروع کرو گی؟''

''چند دن آرام کر کے آتی ہوں۔ کئی دن رکنا پڑے گا یہاں ...! ایک دن میں سارا کام نہیں ہو پائے گا۔''

''وہ تو بتایا تھا تم نے...... ملازموں کا بندوبست کردوں گی۔ تم نے شاید بتایا تھا کہ سیڑھی کی بھی ضرورت ہوگی؟''

''وہ سب سوچ لیا ہے میں نے۔''

پھر نوشین کھانا کھا کر اپنے گھر چلی آئی۔

ایک گھنٹے بعد ٹرک آیا اور پینٹنگز لے گیا۔

نوشین نے دس بارہ دن اپنے گھر پر ہی گزارے۔ ہر

وقت اپنے کمرے میں بند رہتی اور وہ چھوٹی سی البم دیکھتی رہتی جس میں اس کی اور دانش کی تصویریں تھیں۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دو محبت کرنے والوں کی تصویریں ہیں۔ ایسے موقعوں پر نوشین کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے تھے لیکن چہرے پر گہری اداسی رہتی تھی۔

کسی وقت گھر سے نکلتی تو قریب ہی کسی درخت کے نیچے بیٹھی خلا میں تکتی رہتی۔ اس کے باپ داؤد جان نے کئی بار اس سے پوچھا کہ سوئٹزر لینڈ سے آکر اس کی یہ حالت کیوں ہوگئی ہے۔ اس کا جواب ایک ہی ہوتا۔ ''کچھ بھی تو نہیں ہوا بابا!''

''جاگیر پر چلی جاؤ۔ دل کچھ بہل جائے گا۔''

نوشین جانتی تھی، محسوس کرتی تھی کہ اب اس کا دل کہیں نہیں بہلے گا لیکن اس نے باپ کی بات مان لی۔

حویلی پہنچی تو وہاں کچھ افراتفری کا عالم تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سبھی کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے ہوں۔ صبیحہ نے بھی عجلت سے کام لیا۔ اس نے نوشین کو ایک آدمی سے ملایا اور کہا۔ ''ہمارے سب ملازموں کا انچارج ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو، اس سے کہہ دینا۔ کام شروع کردو اپنا۔ یہ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھے گا۔''

''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں اتنی عجلت میں؟''

''زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔'' صبیحہ نے جاتے جاتے کہا۔ ''بابا پیر نے چوپال بلائی ہے۔''

اس سے پہلے کہ نوشین کوئی اور استفسار کرتی، صبیحہ چلی گئی۔

''آیئے!'' متعارف شخص نے نوشین سے کہا۔ ''میں آپ کو کئی کمرے دکھا دیتا ہوں۔ جو بھی آپ پسند کرلیں۔'' اس نے دو سوٹ کیس اٹھالیے جو نوشین لائی تھی۔ اس میں اس کے لباس اور ضروریات کی دیگر چیزیں رکھی تھیں۔

جو کمرا اسے پہلے دکھایا گیا، وہی اس نے منتخب کرلیا۔ اس کا دل اتنا بجھا ہوا تھا کہ اسے وہ سب کچھ قبول ہوتا جو سامنے آجاتا۔

اسی شخص کے ساتھ جاکر اس نے دیکھا کہ سینریاں کہاں رکھی گئی تھیں۔ پھر وہ اس ہال میں آئی جہاں وہ سینریاں لگائی تھیں۔ بہت بڑا ہال تھا۔ نوشین جائزہ لینے لگی کہ کون سی سینری کس جگہ بہتر رہے گی۔ پھر اس نے اس شخص کو کچھ ہدایات دیں پھر کمرے میں آگئی۔ وہ فوری طور پر بھی کام شروع کرسکتی تھی لیکن اس کا دماغ ''پیر صاحب کی چوپال'' میں الجھ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ چوپال ایک وسیع قطعۂ اراضی میں تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہاں بہت سی دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ مشرقی اور مغربی جاگیر، دونوں سے تعلق رکھنے والے وہاں جمع ہوتے جا رہے تھے۔ بابا پیر وہاں پہلے سے موجود تھے اور عجیب انداز میں تھے۔ وہ ایک قدرے بلند چبوترے پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے لکڑی کا وہ ٹکڑا رکھا تھا جس پر قصائی گوشت بناتے ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک اتنا بڑا کلہاڑا رکھا تھا جسے وہ آسانی سے اٹھا سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کلہاڑے سے کسی کا قیمہ بنائیں گے۔ ان کے قریب ہی قزلباش صاحب بھی آکر پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں جانب سجاد کا باپ بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ہی الجھی ہوئی نظروں سے بابا پیر کے ''سامان'' کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ بابا پیر کیا کرنا چاہتے ہیں اور بابا پیر سے کوئی سوال کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ سب لوگ آگئے ہیں۔

دونوں طرف سے چیدہ چیدہ شخصیتوں کو بلایا گیا تھا۔ بابا پیر نے گہری نظروں سے لوگوں کو دیکھا۔ وہ اپنا بھی اطمینان کرنا چاہتے ہوں گے کہ سب لوگ آگئے ہیں۔ انہوں نے خاص طور سے دانش اور سجاد کو دیکھا پھر ایک نظر خواتین کی طرف بھی دیکھا جو مردوں سے الگ بیٹھی تھیں۔ ان میں صبیحہ بھی شامل تھی۔

چند لمحے تک ایسا سناٹا رہا جیسے وہاں ایک بھی ذی روح نہ ہو پھر اس سکوت کو بابا پیر ہی نے توڑا۔

''دونوں جاگیروں کے باسیو! میں بہت دن سے خون خرابا رکوانے کے لیے دونوں ہی طرف کے لوگوں سے مذاکرات کر رہا تھا۔ جب مجھے اس میں ناکامی ہوئی تو مجھے ایک فیصلہ کرنا پڑا۔ آپ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہونے کے باوجود میرا احترام کرتے ہیں ناں؟''

جواب میں اکثریتی آوازیں اثبات میں تھیں۔

''ٹھیک!'' بابا پیر کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا جبکہ دونوں طرف کے لوگ بے چین اور کسی حد تک پریشان نظر آرہے تھے۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد بابا پیر نے کہا۔ ''کیا آپ لوگ پسند کریں گے کہ میں خودکشی کرلوں؟''

''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں'' کی صدائیں اکثریت سے بلند ہوئیں۔

نواب قزلباش بولے۔ ”یہ تو گناہ بھی ہوگا بابا!“

”ہاں۔“ بابا پیر نے کہا۔ ”میں بھی جانتا تھا۔ یہ بات ورنہ مصالحت نہ ہونے کی صورت میں تم لوگوں کو جمع کرتا اور ایک درخت کی رسی سے خود کو پھانسی دے دیتا۔“

”ہم ایسا نہیں ہونے دیتے۔“ کچھ آوازیں آئیں۔

”میں بھی اسے گناہ عظیم سمجھتا ہوں اس لیے الجھن میں رہا۔ جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آتا ہے جس کا کوئی حل نظر نہ آئے تو میں استخارہ کرتا ہوں۔ کم یا زیادہ عرصے کے بعد مجھے خواب میں اس کا حل نظر آجاتا ہے اور پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ مجھے ایسا ایک خواب نظر آگیا ہے۔ مسئلے کا حل مجھے مل گیا۔“

”وہ کیا ہے بابا؟“ سجاد کے باپ نے سوال کرنے کی ہمت کی۔

”اسی کے لیے میں نے آج تم سب کو جمع کیا ہے۔ مجھے اتنے دن تک انتظار اس لیے کرنا پڑا کہ دانش اسپتال میں تھا۔ اگرچہ اب بھی اس کے ہونٹ کچھ سوجے ہوئے ہیں لیکن یہ بول سکتا ہے۔ میری بات کے حق میں یا مخالفت میں بول سکتا ہے۔“

زیادہ تر نگاہیں دانش کی طرف اٹھیں جو سر جھکائے بہت اداس بیٹھا تھا۔

”اگر“ بابا پیر نے کہہ کر کلہاڑا اٹھایا اور اپنے سامنے رکھے لکڑی کے چوبے پر رکھ لیا۔

کلہاڑا دیکھ کر لوگ خاصے چونکے اور پریشان بھی دکھائی دیے۔

بابا پیر جو بات کہنا چاہتے تھے، اسے نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ ”میں اپنا بایاں ہاتھ اس لکڑی پر رکھوں گا اور دائیں ہاتھ سے کلہاڑا سنبھال کر اتنی زور سے کلائی پر ماروں گا کہ ہاتھ الگ ہوجائے گا۔“

”ہرگز نہیں۔“ بیک وقت دونوں حویلیوں کے لوگ چیخ پڑے۔

صرف ایک مدھم آواز سجاد کی تھی۔ ”دھمکی۔“

شاید وہ آواز بابا پیر نے بھی سنی ہو لیکن دھیان نہیں دیا اور بولے۔ ”اگر ہرگز نہیں تو پھر آپ لوگوں کو مصالحت کرنا ہوگی۔ خون خرابہ بند کرنا ہوگا۔“

”مصالحت کیسے ہوگی؟“ سجاد کے باپ نے پوچھا۔

”اس طرح کہ دو بڑے مخاصمین کے خاندان ایک ہوجائیں۔“

”وہ کیسے بابا؟“

”اس طرح کہ سجاد کی بہن کی شادی دانش سے ہوگی اور......“

دانش نے چونک کر بابا پیر کی طرف دیکھا۔ عورتوں میں بیٹھی ہوئی صبیحہ نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

سجاد مستہزانہ انداز میں مسکرایا۔

”اور“ بابا نے اپنا جملہ پورا کیا۔ ”اس کے چند دن بعد سجاد کی شادی دانش کی پھوپھی زاد بہن سے ہوگی۔“

”مجھے منظور نہیں۔“ سجاد نے کہا۔ ”میری بہن کی شادی دانش سے ہرگز نہیں ہوگی۔“ پھر وہ اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا چوپال سے چلا گیا۔

”کلہاڑا ابھی میرے ہاتھ ہی میں ہے۔“ بابا پیر نے سجاد کے باپ سے کہا۔ ”اور تم لوگ جانتے ہو گے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔“

”بابا!“ سجاد کے باپ نے کہا۔ ”آپ کا اپنا ہاتھ تو نہیں کاٹنے دیا جائے گا۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ دانش کی شادی صبیحہ ہی سے ہوگی۔“

”تو پھر!“ بابا پیر نے ایک تھیلا کھول کر اس میں سے دو ہار نکالے۔ ”ان میں سے ایک ہار ابھی قزلباش کے گلے میں ڈالو۔ ایسا ہی قزلباش کو بھی کرنا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے میں ہار ڈال کر ایک دوسرے کو سینے سے بھی لگائیں گے۔“

قزلباش اور سجاد کے باپ کھڑے ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہار پہنائے اور آپس میں گلے ملے۔

چوپال کے نوے فیصد لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ دشمنی کے باوجود وہ بھی اس خون خرابے سے عاجز تھے۔ تالیاں بجانے میں خواتین سب سے آگے تھیں۔

☆☆☆

نوشین جلدی ہی اپنے کام میں مصروف ہوگئی تھی۔

صبیحہ ڈیڑھ گھنٹے سے بھی کم میں واپس آگئی۔

”تم تو شاید ڈھائی تین گھنٹے کا کہہ کر گئی تھیں۔“ نوشین نے کہا۔ ”خوش بھی نظر آرہی ہو۔“

”چوپال جلدی ختم ہوگئی تھی اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اب میری شادی دانش سے ہی ہوگی۔“

”تم خود طے کر آئیں!“ نوشین خفیف سا مسکرائی۔ ”اور اتنی جلدی؟“

اب صبیحہ نے اسے چوپال اور بابا پیر کے بارے میں وضاحت سے بتایا اور اس کارروائی کے بارے میں بھی جو وہاں ہوئی تھی۔

سب کچھ سن کر نوشین نے کہا۔ ''تم بتا رہی ہو کہ دانش وہاں سے فوراً اٹھ کر چلے گئے تھے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ اس شادی کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''بابا پیر کا فیصلہ تو انہیں ماننا ہی پڑے گا۔''

''میں... نہیں مانوں گا۔'' کسی طرف سے سجاد آ گیا۔ اس نے نوشین پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔ سوئٹزرلینڈ میں وہ اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔

''بابا پیر کا فیصلہ ہے۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''بھائی جان...... ذرا سوچ لیجیے۔''

''دانش بھی نہیں مانے گا۔''

''وہ بابا پیر کے فیصلے کو ماننے کے لیے مجبور ہوگا۔''

''دیکھیں گے...... اور یہ کون ہے؟'' سجاد نے دوسری نظر نوشین کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ نوشین ہے۔'' صبیحہ نے تعارف کرایا۔ ''بہت اچھی پینٹر ہے۔ اسی کی پینٹنگز سے یہ ہال سجے گا۔''

''بہت خوشی کا اظہار کر رہی ہو۔'' سجاد نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اپنے بھائی کے سامنے ہی اپنی شادی پر خوشی کا اظہار کر رہی ہو۔''

''آپ سے بے تکلف جو ہوں بھائی جان! کسی اور کے سامنے تو مجھے شرم آتی۔''

''ہو سکتا ہے دباؤ کی وجہ سے تمہاری شادی ہو جائے لیکن دانش کی پھوپی کی لڑکی سے تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔''

''بابا پیر کا فیصلہ......''

سجاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔''

''ہمارے والد تک مان گئے ہیں۔''

''میں نے کہا نا کہ مجھے کسی کی پروا نہیں۔'' سجاد نے کہا اور مڑ کر تیزی سے جانے لگا۔

نوشین بولی۔ ''یہ کیوں خوش نہیں ہیں تمہاری شادی سے؟''

''دانش کو پسند نہیں کرتے۔ خیر! چھوڑو تم اس قصے کو...... یہ بتاؤ کہ اس ہال کو کب تک سجاؤ گی...... ؟ ہمارے خاندان کی سب شادیاں یہیں ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ میں نے پوچھا تھا کہ تم یہ ہال کب تک سجاؤ گی؟''

''آٹھ دس دن تو لگ جائیں گے۔''

''یہ تو بہت ہیں میری جان! مجھے یقین ہے کہ شادی جلدی ہوگی۔ تمہیں یہ کام جلدی کرنا چاہیے۔''

''میں کوشش کروں گی کہ کم وقت میں کام ہو جائے۔''

صبیحہ نے اس کا گال چوما اور ہال سے چلی گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔

''کاش ایسی ہی خوشی میرے مقدر میں بھی ہوتی۔'' نوشین نے بجھے ہوئے انداز میں سوچا۔ وہ فرہاد کی بے وفائی سے بہت دل گرفتہ تھی۔

وہ عموماً صبح سے چار بجے تک کام کرنے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی لیکن صبیحہ کی وجہ سے اس نے آٹھ بجے تک کام ختم نہیں کیا تو صبیحہ وہاں آ گئی۔

''ارے! تم ابھی تک مصروف ہو!'' وہ آتے ہی بولی۔

''تم ہی نے کہا ہے کہ کام جلدی ختم ہو۔ میں نے تو چار بجے تک کام کرنے کا سوچا تھا۔''

''بس اب ختم کرو۔ چل کر میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اتنا زیادہ کام کرو گی تو تھک کر بیمار ہو جاؤ گی۔ سارا ہی کام رک جائے گا۔''

نوشین کو اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ صبیحہ پہلے کی طرح اس بار بھی اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور وہیں کھانا کھاتے ہوئے نوشین سے مسکرا کر پوچھا۔

''تمہیں بھی اپنی تراش خراش کا آدمی ملا یا نہیں؟''

''ملا تو تھا۔'' نوشین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لیکن بے وفا نکلا۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔''

صبیحہ نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

''کیا نام تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''فرہاد۔''

''اس نام کی لاج بھی نہ رکھی اس نے۔''

نوشین کچھ نہیں بولی۔ اس کا دل بھر آیا تھا حالانکہ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ دانش ہی نے اپنا نام اسے فرہاد بتایا تھا۔ اگر وہ باخبر ہوتی تو صبیحہ کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اسی وقت حویلی سے چلی جاتی۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ فرہاد کی دشمنی اس سجاد سے تھی جو صبیحہ کا بھائی تھا۔

☆☆☆

دوسری طرف دانش اپنے باپ سے کہہ رہا تھا۔ ''میں یہ شادی نہیں کروں گا۔ میں کسی اور کو چاہتا ہوں بابا۔''

قزلباش صاحب نے کچھ غصے سے کہا۔ ''تمہیں اپنی چاہت عزیز ہے اور یہاں تم خون خرابا ہی دیکھنا چاہتے ہو؟''

''سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔''

''تم اسی لڑکی کی بات کر رہے ہو جس سے سوئٹزرلینڈ میں ملے تھے؟''

''جی!''

افشاں آفریدی اور نایاب جیلانی کے متاثر کن قسط وار ناول ایک نئے موڑ پر

سعدیہ رئیس کا مکمل ناول میں انمول کا خوب صورت اختتام

عورت کہانی میں پڑھیے فرحین اظفر کے قلم کا ایک دلکش شاہکار

روحلہ خان کے اچھوتے ناولٹ بوجھ کا اختتامی حصہ

شیریں حیدر کی خصوصی کاوش وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا کی صورت

نگہت سیما کے ماہرانہ
انداز بیاں سے مرصع مکمل ناول
میں اور فارہ

معروف اسکالر اختر شجاعت
کی زُھد و تقویٰ
پُر روح پرور تحریر

شائستہ زریں کی محنت اور لگن کا آئینہ دار سروے کورونا وائرس خدشات و توقعات

اس کے علاوہ

سال نو کی مناسبت سے دل پزیر افسانے تحریر نگاروں میں روبینہ یوسف،
قرۃ العین سکندر، تسلیم شیخ و دوسرے شامل ہیں

آپ کے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعر و شاعری، خوش ذائقہ حسن نکھار،
معلومات سے پر تراشے اور گوشہ ظرافت جیسے خوبصورت سلسلے

"اب وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" دانش نے جواب دیا۔ "میں موبائل پر اس سے بات نہیں کر سکا تھا کیونکہ میرے ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہوگی۔ میں نے اسے میسیج کیا تھا، وہ اسے نہیں ملا۔ شاید اس نے اپنا موبائل اور نمبر ہی تبدیل کر لیا ہو۔"

"تو اب تم کیا جنگل جنگل اسے ڈھونڈتے پھرو گے؟"

"میں نے کسی کے ہاتھوں ہوٹل کو پیغام بھیجا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہے۔"

"تو پھر وہی بات پھر آ گئی نا۔ تم اسے جنگل جنگل ڈھونڈنے نکل جاؤ گے یا یہاں کے حالات میں تبدیلی چاہو گے؟"

"میں بھی تو کہہ چکا ہوں کہ سوچ سوچ کر میرا دماغ تھک گیا ہے۔"

"تمہارے اس فیصلے سے میں بابا پیر کو بھی باخبر کروں گا۔"

دانش کچھ نہیں بولا۔

دوسرے دن بابا پیر بھی اسے سمجھانے آئے۔

"اس خون خرابے کو روکنے کے لیے تمہیں اپنی محبت قربان کرنا ہوگی دانش بیٹا۔" وہ بولے۔ "انسانیت کے ایک بڑے کام کے لیے چھوٹی موٹی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔"

"وہ مجھے نہیں ملی تو میں مر جاؤں گا بابا! میں اسے ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھی طرح سوچ لو...... کیا یہاں کے خون خرابے کو رکوانا تمہارا ایک عظیم کام نہ ہوگا؟"

اس موقع پر بھی اس نے خاموشی اختیار کی۔ بابا پیر چلے گئے۔

چند دن بعد قزلباش صاحب نے کہا۔ "پرسوں تمہاری شادی ہے۔ خود بابا پیر نے اس کام میں جلدی کی تھی۔ انہوں نے ہی تاریخ طے کی ہے۔"

"جی۔"

"تو کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"میں نے ہار مان لی ہے۔" جواب دیتے ہوئے دانش کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ قزلباش صاحب نے اسے سینے سے لگایا۔ "اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے۔"

دانش اپنی آنکھیں خشک کرنے لگا۔

☆☆☆

صبیحہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ نوشین کے گلے میں جھول گئی۔ "کل میری شادی ہے۔"

"میں نے آج اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ شام کو گھر چلی جاؤں گی۔"

"میری شادی میں شرکت نہیں کرو گی؟"

"اچھا۔" نوشین نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کل تک رک جاتی ہوں۔"

نوشین کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن صبیحہ کے محبت آمیز اصرار پر اسے رکنا پڑا۔ اس کی رات کانٹوں پر بسر ہوئی۔ شادی وہ اپنی دیکھنا چاہتی تھی لیکن اسے صبیحہ کی شادی کے لیے رکنا پڑا تھا۔ رات کو وہ دیر تک البم دیکھ کر روتی رہی۔

صبح اسے معلوم ہوا کہ برات شام ہوتے ہی آ جائے گی۔

وہ دن بھر اپنے کمرے میں پڑی رہی۔ اسے تیار کروانے کے لیے صبیحہ خود آئی لیکن وہ دلہن بنائی جا رہی تھی۔ آ ہی نہیں سکتی تھی۔ خواب آور گولیاں وہ اسی دن سے کھانے لگی تھی جب اسے فرہاد کی بے وفائی کا یقین ہوا تھا۔ اس دن بھی وہ اتنی دل برداشتہ رہی کہ وہ پیر کا کھانا کھانے کے بعد خواب آور گولیاں حلق سے اتار کر سو گئی۔ پھر اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب اس نے کچھ شور و غوغا سنا۔

رات کا اندھیرا اچھل چکا تھا لیکن کھڑکی سے کچھ روشنی آ رہی تھی۔

نوشین نے جلدی سے لائٹ جلائی اور سوٹ کیس کھولا۔ اس میں نئے کپڑے تو نہیں تھے لیکن نئے ان سلے ملبوسات بھی تھے۔ اس نے ایک لباس نکالا اور بہت جلدی تیار ہو گئی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ وہ اپنا البم لینا تو بھول ہی گئی تھی جو اس کے اتارے ہوئے لباس میں تھا۔ وہ پلٹی، البم نکالا اور اس کی تصویریں دیکھتی ہوئی پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے کئی تصویروں کو چوما بھی تھا۔ اسی طرح البم اس کے ہاتھ میں ہی تھی جب وہ کمرے سے نکلی تو کسی طرف سے سجاد آ رہا تھا۔ وہ اس سے ٹکرا گیا۔ البم نوشین کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھانی چاہی لیکن "سوری" کہہ کر سجاد نے البم اٹھالی۔ البم کھلی ہوئی گری تھی۔ سجاد نے اس کی ایک تصویر دیکھی اور چونک پڑا۔ تصویر ظاہر ہے کہ نوشین اور دانش کی تھی۔

"پلیز۔" نوشین نے البم لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

لیکن اب یہ کہاں ممکن تھا کہ سجاد اسے فوراً لوٹا دیتا۔ اس نے جلدی جلدی ساری تصویریں دیکھ ڈالیں۔

گیلری سے نیچے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ نوشین نے ایک مسند پر بیٹھے ہوئے فرہاد کو دیکھا جو دراصل دانش تھا۔

"فرہاد!" نوشین کے منہ سے بہت سرسری آواز نکلی۔

وہ وہی تو بنا ہوا تھا جس نے سہرا چہرے سے ہٹائے ہوئے تھا اور بہت اداس نظر آرہا تھا۔ نوشین کا دل بیٹھ گیا۔ اب اسے کوئی شبہ ہی نہیں رہا تھا کہ دانش نے اسے اپنا فرضی نام بتا کر ٹالا تھا۔

"بہت خوب!" سجاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "البم پر تمہارا نام شیریں لکھا ہوا ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی مجھے تمہارا یہی نام معلوم ہوا تھا۔ تم نوشین ہو یا شیریں؟"

نوشین کوئی جواب نہیں دے سکی۔ اس کے دماغ میں بھونچال سا آگیا تھا۔

"خیر!" سجاد پھر بولا۔ "تم نوشین ہو یا شیریں، لیکن تصویروں سے ثابت ہوا کہ وہاں اس نے تمہیں اپنے جال میں پھانسا تھا۔ یہ میرے لیے بہت اچھا موقع ہے۔ ابھی نکاح نہیں ہوا۔ دلہن اس دروازے سے اندر آرہی ہے۔ مصالحت نکاح کے بعد ہوگی۔ ابھی تو میں اس سے اپنا انتقام لے سکتا ہوں۔ اس کو نہیں تو اس کی محبوبہ کو ختم کرسکتا ہوں۔"

پھر اس نے دانش کو پکارا۔ دانش نے چونک کر گیلری کی طرف دیکھا۔ وہاں اسے سجاد کے ساتھ نوشین بھی دکھائی دی۔

"ابھی نکاح نہیں ہوا، اس لیے مصالحت کی ابتدا بھی نہیں ہوئی۔ میں تمہاری محبوبہ کو ختم کیے دیتا ہوں۔"

وہ البم پھینک کر نوشین کا گلا دبانے لگا۔

"فرہاد!" نوشین گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخ ہی پڑی لیکن وہ گھٹی گھٹی سی آواز بھی دانش نے سن لی۔ اس نے سہرا اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے جیب سے ریوالور بھی نکال لیا۔

"چھوڑ دو اسے ورنہ گولی مار دوں گا۔" دانش نے صرف دھمکی ہی نہیں دی تھی بلکہ ایک فائر بھی جھونک مارا تھا لیکن عجلت کے باعث نشانہ صحیح نہیں بیٹھا۔ سجاد اچھل کر گیلری کی ایک سیڑھی سے نیچے اتنی تیزی سے اترا کہ دانش کا اگلا فائر بھی نشانے پر نہ بیٹھ پایا۔

نوشین وہیں گر پڑی تھی جہاں اس کا گلا دبایا گیا تھا لیکن وہ ابھی مری نہیں تھی، بس نیم جان ہوئی تھی۔ وہ گھسٹتی ہوئی گیلری کے قریب گئی اور مردہ سی آواز میں بولی۔ "فرہاد۔"

دانش نے کئی فائر جھونک مارے لیکن سجاد کی تیز رفتاری کے باعث اس کا نشانہ ہر مرتبہ خطا گیا۔ ہال میں اس فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی تھی۔ سجاد ایک دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

"جمیل، زمان خان!" دانش چیخا۔ "شیریں کو دیکھو۔"

پھر وہ خود اس دروازے کی طرف دوڑا جہاں سے سجاد باہر گیا تھا۔ ریوالور اس کے پاس بھی ہوگا کیونکہ وہ ہر وقت ریوالور رکھنے کا عادی تھا لیکن اسے ریوالور نکالنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔

دانش ریوالور اس لیے لایا تھا کہ اسے سجاد سے کسی وقت بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کا خدشہ تھا۔

جمیل اور زمان خان گیلری کے ایک زینے کی طرف دوڑے۔

دانش، سجاد کے پیچھے دروازے سے نکلا۔ اس نے دیکھا کہ سجاد ایک کار میں بیٹھا انجن اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا۔

کار رکی ہوئی تھی اس لیے اس مرتبہ دانش کا نشانہ صحیح بیٹھا۔ کار کا ایک پہیہ برسٹ ہوگیا۔ دوسرا فائر وہ یقیناً سجاد پر کرتا لیکن سجاد پھرتی کے ساتھ دوسری طرف کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ دانش کار کی طرف دوڑا۔

☆☆☆

کچھ مہمان بھاگ رہے تھے اور کچھ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس خونی ڈرامے کا انجام کیا ہوگا۔ انہی لوگوں میں بابا پیر بھی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اب سجاد نے بھی ایک درخت کی پوزیشن لے لی تھی اور اپنے ریوالور سے دانش کی طرف فائر کررہا تھا جس نے کار کی آڑ لے لی تھی۔

"رک جاؤ۔" بابا پیر چیخے۔ "میں تم دونوں کے بیچ میں آرہا ہوں۔ کسی کی بھی گولی مجھے لگ سکتی ہے۔"

سجاد کے باپ اور قزلباش صاحب نے انہیں پکارا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بابا پیر ہلاک یا زخمی ہوجائیں۔

لیکن بابا پیر کے قدم بڑھتے رہے۔ "اب میں یہ خون خرابا نہیں دیکھ سکتا۔ بہتر ہے کہ اس سے پہلے میں ہی مر جاؤں اور یہ سب نہ دیکھ سکوں۔"

اسی وقت دانش نے پشت کی جانب سے کچھ آوازیں سنیں تو سر گھما کر دیکھا۔ جمیل اور زمان خان، نوشین کو سہارا دیے اس کی طرف لارہے تھے۔ ان دونوں کو ایسا کرنے کے لیے نوشین ہی نے کہا ہوگا۔

"ادھر مت آؤ شیریں۔" دانش چیخا۔ نوشین کو شیریں کہنا شاید اس کی عادت بن گئی تھی۔

نوشین نے زیر لب زمان خان اور جمیل سے کچھ کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تینوں آگے آتے رہے۔ یہ دانش کے لیے پریشان کن بات تھی۔ ایک طرف اسے سجاد کی فائرنگ سے بچنا تھا اور دوسری طرف اسے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ نوشین کو گولی نہ لگ جائے۔ وہ مر بھی سکتی تھی اور زخمی بھی ہوسکتی تھی۔

بابا پیر برابر آگے بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف سے دانش کے حامی بڑی احتیاط کے ساتھ اس درخت کو گھیرے

میں لینے کی کوشش کر رہے تھے جس کی آڑ سجاد نے لی تھی۔
بابا پیر مستقل حرانی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یکا یک وہ لڑکھڑائے۔ انہیں کہیں گولی لگی تھی اور گولی کیونکہ بائیں جانب سے آئی تھی اس لیے وہ فائر سجاد ہی نے کیا ہوگا۔ دانش نے پیر بابا کو بالکل سامنے دیکھ کر فائرنگ بند کردی تھی۔
بابا پیر گرنے لگے۔ درخت کی طرف سے ایسی آوازیں آئیں جیسے سجاد بھاگ رہا ہو۔ اسے گھیرنے کی کوشش کرنے والے اس کی طرف لپکے تو سجاد نے فائرنگ کا رخ ان کی طرف کردیا جس کے باعث ان لوگوں کو رکنا پڑا۔
نوشین نے قریب آکر دانش کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
دانش نے فوراً پلٹ کر اسے سنبھالا۔ ''کیا حماقت کر رہی تھیں تم؟''
نوشین رک، رک کر بہ مشکل بتا سکی کہ وہ دانش کے سامنے آکر سجاد کی گولی سے مر کر اس کی جان بچانا چاہتی تھی۔ اسی طرح دانش جان سکتا تھا کہ وہ اسے کتنا چاہتی تھی ...... اور پھر وہ بے ہوش ہو کر دانش کی بانہوں میں جھول گئی۔ سجاد نے اس کا گلا اتنا دبایا تھا کہ وہ ادھ مری سی ہو گئی تھی۔ اسے اس کی قوت ارادی کہا جا سکتا تھا کہ اس نے دانش تک پہنچنے کی کوشش کی تھی اور کامیاب ہونے کے بعد اپنی قوت ارادی کھو بیٹھی تھی۔
جب اسے ہوش آیا تو وہ صبیحہ کی خواب گاہ میں تھی اور اس کے قریب ہی ایک ڈاکٹر موجود تھا جس نے اسے پے در پے دو انجکشن لگائے تھے۔
صبیحہ اس وقت سادہ لباس میں تھی۔ زیورات اور شادی کے کپڑے اس نے اتار پھینکے تھے۔
''کیا پوزیشن ہے ڈاکٹر؟'' صبیحہ نے پوچھا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔
ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ دیکھ رہی ہیں کہ انہوں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ جلد ہی ان کی حالت پوری طرح سنبھل جائے گی۔''
''فر ...... فرہاد۔'' نوشین کے منہ سے مدھم آواز نکلی۔
''میں یہاں ہوں شیریں۔'' پشت سے آواز آئی۔
نوشین نے سر گھما کر دیکھا۔ فرہاد پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
اب نوشین نے دیکھا کہ وہاں دو چار ملازمائیں بھی تھیں۔
صبیحہ نے ان سے کہا۔ ''ذرا دیر بعد تم سب اسے دلہن بناؤ گی۔''
''کیا مطلب؟'' فرہاد چونکا۔

''تمہاری برات یوں ہی واپس نہیں لوٹے گی۔'' صبیحہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، پھر نوشین کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ ''یہ دلہن تمہارے ساتھ جائے گی۔''
دانش کے چہرے سے ایسا لگا جیسے ہکا بکا رہ گیا ہو۔
اب صبیحہ نے نوشین سے کہا۔ ''تمہارے والد کو لینے کے لیے میں نے ایک تیز رفتار کار بھیج دی ہے۔ بیٹی کا نکاح باپ کی موجودگی میں ہونا چاہیے۔''
''لیکن ... لیکن ......'' نوشین اتنا ہی بول سکی۔ اس نے صبیحہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔
صبیحہ نے اس کے ہاتھ تھپکے۔ ''میں سب معلومات حاصل کر چکی ہوں۔ تمہارا البم مجھے ایک ملازم سے ملا۔ تمہیں تمہارا فرہاد مبارک ہو۔ میں تو دانش کو چاہتی تھی جسے میں نے کھو دیا ہے۔''
اس وقت دانش کی نظریں جھک گئیں۔
ایک ملازم نے اندر آکر صبیحہ کو بتایا۔ ''بابا پیر کو شہر کے کسی اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ ان کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔''
''یہاں کی حویلی کے لوگوں کا کیا حال ہے؟''
''شادی نہ ہونے کے باوجود سب شیر و شکر ہوگئے ہیں۔''
مطمئن انداز میں سر ہلایا۔
''فی الحال آپ باہر جائیں۔'' صبیحہ نے دانش سے کہا۔ ''ابھی یہاں آپ کی شیریں کو دلہن بنایا جائے گا۔''
''تم بہت عظیم ہو صبیحہ۔'' دانش نے آہستہ سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
''سجاد کے بارے میں معلوم ہوا فی الحال وہ فرار ہو گیا ہے۔'' یہ جملہ سجاد کے باپ نے بھی سن لیا جو اسی وقت کمرے میں داخل ہوا تھا۔
''میں اسے عاق کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اب وہ زندگی بھر اس جاگیر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔''
صبیحہ نے باپ کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔
دادو جان کے آنے کے بعد دانش اور نوشین کا نکاح ہوا۔ ایک بجے کے قریب برات روانگی کے لیے تیار تھی۔ صبیحہ نے اپنے ہاتھوں سے نوشین کو دانش کی کار میں بٹھا کر رخصت کیا۔
اس رات صبیحہ کتنا روئی تھی؟ یہ کوئی نہیں جان سکا۔
✖✖✖

مشہور ہے کہ جس نے سبق یاد کیا اسے چھٹی نہ ملی... وہ بھی تمام اصولوں سے واقف بہت سنبھل سنبھل کر چلنے والی تھی لیکن... راستے میں بکھرے کانٹے کب کسی کا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ بھی زخمی ہوئی اور لڑکھڑاگئی۔ ایسے میں منزل کا نشان گم کر بیٹھی تو اس میں عجب کیا...

محبت کی ریت نبھانے والی ایک حسینہ کی کارگزاریاں

وفاپرست

منظر امام

ایک چھوٹا سا مکان وہ چھوٹا سا مکان ایک چھوٹے سے علاقے میں تھا۔

وہ بہت پُرسکون محلہ تھا۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے واقف تھا۔ ایک دوسرے کی خبر رکھتا تھا۔ خیریت معلوم کیا کرتا۔ عام طور پر پرانے ہی لوگ آباد تھے۔ برسوں سے رہ رہے تھے۔ اسی لیے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اسٹیٹ ایجنٹ قسم کے لوگوں کو یہاں بہت مایوسی ہوا کرتی۔ ”ارے بھائی! اس علاقے میں کیا کام ہوتا ہے۔ نہ تو کوئی گھر خالی ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کرائے دار آتا ہے۔ بس جو لوگ جہاں بیٹھ گئے وہیں بیٹھ گئے۔“

دوسرا کہا کرتا۔ ”یار! بوڑھوں کو چھوڑ دو۔ اس علاقے کے نوجوان بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اس علاقے سے جاتا

ہی نہیں چاہیے۔ ایک گھر ہے، ہر سال اسی کی مرمت کروالی، چونا پھروالیا۔ بس چھٹی ہوگئی۔"

ایسا نہیں تھا کہ زندگی کے آثار نہ ہوں۔ زندگی بھی اپنی سرمستی میں ہوا کرتی تھی۔ دکانیں بھی تھیں، جہاں لوگ خرید و فروخت کے لیے آیا کرتے۔ چہل پہل رہتی تھی۔ عید بقرعید کو خوب رونق رہا کرتی۔ بچے گائے اور بکروں کے ساتھ شور مچاتے دوڑتے دکھائی دیتے۔ ہر طرف سے نارمل زندگی تھی لیکن جسے پُرجوش قسم کی چہل کہتے ہیں، وہ نہیں تھی۔ اس علاقے میں ایک اسکول بھی تھا۔ بچے اپنے اپنے بستے اٹھائے آتے جاتے دکھائی دیتے۔ بس خرابی یہ تھی کہ لوگ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔

کہتے تھے کہ اس علاقے میں بہت سکون ہے۔ وہ جب دفتروں سے یا اپنے کام کاج سے گھر واپس آتے ہیں تو اپنے علاقے میں آتے ہی سکون مل جاتا ہے۔ لگتا ہے امان کی جگہ واپس آگئے ہیں۔ اب رات تک یہیں رہنا ہے۔

ایک دن اس علاقے میں ایک اجنبی دکھائی دیا۔ وہ ایک معقول سا بندہ لگتا تھا۔ اس کے بال سفید ہوچکے تھے لیکن چہرہ تر و تازہ تھا۔ اس کا لباس بھی بہت مناسب تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک حجام کا رخ کیا تھا۔

نائی نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ "تشریف رکھیں جی۔" نائی نے احترام سے کہا۔ "بس میں ان صاحب کو فارغ کر رہا ہوں پھر آپ کی خدمت کرتا ہوں۔"

اجنبی مسکرایا۔ "سلیقے کی گفتگو کر لیتے ہو۔" اس نے کہا۔

"ارے جناب! کیا سلیقہ۔ بس آپ جیسوں سے سیکھ کر تھوڑا بہت بول لیتا ہوں۔"

اجنبی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائی اس کی طرف متوجہ ہوگیا جس کے بال بنا رہا تھا۔ "اس بار بہت دنوں کے بعد چکر لگایا ہے تم نے۔" نائی نے اس سے کہا جو بال بنوا رہا تھا۔

"ہاں بھئی! تم کو تو معلوم ہے کہ میں اپنی بیٹی کے پاس چلا گیا تھا۔ وہ کہہ بھی رہی تھی کہ ابو آپ کہاں واپس جائیں گے۔ وہاں ہے کون۔ یہیں رہ جائیں...... لیکن تم تو جانتے ہو کہ مجھے یہیں رہنا اچھا لگتا ہے۔ اسی لیے دو مہینے رہ کر واپس آگیا۔"

"یہ بات تو ہے قدیر صاحب۔ جو یہاں رہ گیا وہ کہیں نہیں جاتا۔"

"ہاں بھائی، یہ خوبی تو ہے۔ وہ اپنے منظور صاحب امریکا تک چلے گئے لیکن وہاں بھی دل نہیں لگا، واپس آگئے۔ بیٹا بھی اسی بات پر ناراض ہوگیا ہے۔"

"ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے۔" اس بار اس اجنبی نے بات کی۔ "لوگ یہاں برسوں سے رہ رہے ہیں۔"

"جی جناب! برسوں ہوگئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ بہت سکون ہے یہاں۔ اب جیسے میں ہوں۔ پچیس سال پرانی دکان چلا رہا ہوں۔ کہیں اور جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ خدا میرے حصے کا رزق یہیں دے دیتا ہے تو کہیں اور جانے کا کیا فائدہ؟"

بال بنوانے والا گاہک بال بنوا کر جا چکا تھا۔ نائی اب اس اجنبی کی طرف متوجہ ہوا۔ "جی جناب! اب فرمائیں کیا خدمت کروں؟"

"ارے بھائی، مجھے اپنے خط بنوانے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تشریف رکھیں۔" نائی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا جو پہلے گاہک کے جانے کے بعد خالی ہوچکی تھی۔

"ویسے یہ جگہ مجھے بھی پسند آگئی ہے۔" اجنبی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

حجام اس کا خط بنانے لگا۔

"کیوں جناب! کیا آپ اس علاقے میں نئے آئے ہیں؟" نائی نے پوچھا۔

"ہاں [illegible]"

"[illegible]"

"ارے بھائی، میں ایک حکیم ہوں۔" اس نے بتایا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں کوئی سلیقے کی دکان لے کر اپنا مطب شروع کر دوں اور اگر کام چل پڑا تو رہائش بھی رکھ لوں۔"

"جناب! مطب تو شاید کہیں مل جائے لیکن رہائش مشکل ہو جائے گی۔" نائی نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"بات یہ ہے جناب کہ اس علاقے میں کوئی گھر خالی نہیں ہوتا۔ جو رہتے ہیں وہ کہیں جاتے نہیں ہیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں لیکن مطب کی جگہ تو مل جائے گی؟"

"ہاں، وہ مل سکتی ہے۔ اسی روڈ پر آگے ایک چھوٹی سی دکان ہے جس پر گلفام کریانہ اسٹور لکھا ہے۔ وہ بہت بڑی دکان ہے۔ دکان کا مالک اس کا آدھا حصہ کسی اور کو دینے کی بات کر رہا تھا۔ آپ بات کر لیں۔ ہوسکتا ہے کہ دے دے۔ اور ویسے بھی اس علاقے میں کسی حکیم کی ضرورت تو ہے نا۔"

"تمہارا شکریہ بھائی، میں جا کر معلوم کرتا ہوں۔"

خط بنوا لینے کے بعد اس نے نائی کو اس کی مزدوری

دی اور کریانہ اسٹور کی طرف چل پڑا۔

کریانہ اسٹور کچھ فاصلے پر تھا۔ کریانہ اسٹور کا مالک خلیل اپنی دکان پر تنہا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک بوڑھا آدمی تھا۔ حکیم نے سلام کیا اور خلیل سے کہا۔ ''میں آپ کے پاس کچھ پوچھنے آیا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔''

''میں ایک حکیم ہوں۔ آپ کے علاقے میں اپنا مطب کھولنے کا ارادہ ہے۔ مناسب جگہ کی تلاش میں ہوں۔ مجھے نائی نے آپ کے بارے میں بتایا تھا، اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''یہ تو اچھا ارادہ ہے آپ کا۔'' خلیل خوش ہو گیا۔ ''جگہ کی پروا نہ کریں۔ یہ دکان حاضر ہے۔''

''ارے نہیں۔ آپ کی دکان میں کیسے مطب کر سکتا ہوں؟''

''حکیم صاحب! میں اپنی دکان کو آدھا کر رہا ہوں۔ آدھی دکان میں آپ مطب کر سکتے ہیں۔ آدھی میرے کام آتی رہے گی۔''

حکیم نے دکان کا جائزہ لیا۔ دکان اچھی خاصی بڑی تھی۔ اس میں ان کا مطب آسانی سے بن سکتا تھا۔

''چلیں جی۔ مجھے دکان تو پسند آئی ہے۔'' حکیم نے کہا۔ ''آپ بتائیں اس کا کرایہ کیا ہوگا؟''

''ارے آپ سے کرایہ لیا جائے۔'' خلیل نے کہا۔

''نہیں، یہ میرے مزاج اور اصول کے خلاف ہوگا۔'' حکیم مسکرا کر بولا۔ ''آپ بتا دیں۔''

''چلیں پانچ ہزار ماہانہ دے دیجیے گا، ٹھیک ہے؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں کل سے ہی اپنا سامان لانا شروع کر دوں گا۔''

ایک ہفتے کے اندر سب ہو گیا تھا۔ خلیل نے اپنی دکان کے دو حصے کر لیے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنا مطب شروع کر دیا تھا۔ اس علاقے میں اس نوعیت کی یہ پہلی دکان تھی۔ اسی لیے لوگوں کو خوشی بھی ہو رہی تھی۔

لوگ خوش تھے کہ ان کے علاقے میں بھی علاج کی سہولت میسر ہو چکی ہے۔

حکیم صاحب کے یہاں مریضوں نے آنا شروع کر دیا تھا۔ عام مریض ہی ہوا کرتے۔ نزلہ، بخار، کھانسی یا جوڑوں کا درد، سر کا درد وغیرہ۔ اس علاقے کا مریض سیریس ہوتا تو اسے علاقے والے کسی اسپتال کی طرف لے جاتے تھے۔

حکیم صاحب کے مطب کا مسئلہ تو حل ہو چکا تھا لیکن آنے جانے کی پریشانی ابھی تک تھی۔ انہیں مطب بند کر کے اپنے گھر جانا پڑتا تھا۔ وہ گھر اس علاقے سے بہت فاصلے پر امین آباد میں تھا۔

حکیم صاحب نے کئی لوگوں سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کر رکھا تھا۔ ایک دن ایک آدمی مطب پر آیا۔ وہ بخار میں مبتلا تھا۔

حکیم صاحب نے اس کا حال پوچھ کر اسے دوائیں دے دیں۔ ''گھبراؤ نہیں، موسمی بخار ہے۔ دو دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''حکیم صاحب!'' اس آدمی نے حکیم کو مخاطب کیا۔ ''خلیفہ بتا رہا تھا کہ آپ اسی علاقے میں کوئی مکان ڈھونڈ رہے ہیں۔'' اس آدمی نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھائی، تلاش تو کر رہا ہوں لیکن نہیں مل رہا۔ بات یہ ہے کہ میری رہائش یہاں سے بہت دور ہے۔ آنے جانے کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔''

''حکیم صاحب! پریشان نہ ہوں۔ میرا گھر حاضر ہے۔ میں ایک اکیلا انسان ہوں۔ کئی کمرے ہیں میرے پاس، آپ بھی رہ جائیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''ارے بھائی، یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔'' حکیم صاحب خوش ہو گئے۔ ''میرے لیے تو یہ بہت اچھی بات ہوگی لیکن میری ایک شرط ہوگی۔''

''میں آپ کی شرط مانتا ہوں۔''

''میں کرایہ دوں گا۔''

''ارے، آپ سے کرایہ کون لے گا؟''

''نہیں بھائی، میں کرایہ ضرور دوں گا۔''

''تو پھر چلیں۔ پانچ ہزار دے دیجیے گا۔'' اس نے کہا۔

حکیم صاحب کا یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ وہ اس آدمی کے مکان میں شفٹ ہو گئے تھے، جس کا نام کبیر تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا۔

کبیر کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی حکیم کے پاس آنا شروع کر دیا۔

کبیر کو اس بات کی خوشی تھی کہ حکیم جیسا آدمی اس کے گھر میں رہ رہا تھا۔ اس کی علاقے میں بڑی عزت ہو گئی تھی۔ اب وہ خلیفہ کی دکان پر جاتا تو اس کی عزت ہوتی۔

ایک دن حکیم نے خلیفہ سے کہا۔ ''جانتے ہو بھائی! اس علاقے میں علاج تک کی سہولت تو ہے نہیں۔ ایک میں ہوں تو میں بھی ان بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا جو زیادہ بڑی ہوں۔ اس کے باوجود لوگ یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''حکیم صاحب! مٹی میں بہت کشش ہوتی ہے۔ لوگ اگر مٹی سے پیار کرنے لگیں تو یہ پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ یہی حال ہمارے علاقے کا ہے۔ ہم یہاں برسوں سے آباد ہیں اور ہمارا مرنا جینا یہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بہت سے لوگ اس علاقے کو چھوڑ کر کسی اور ملک میں جا کر بس گئے ہیں لیکن ابھی تک اس علاقے کی محبت ان کی رگوں میں ہے۔ اتنی سی بات ہے حکیم صاحب۔''

حکیم نے گردن ہلا دی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ لوگوں کو یہ علاقہ کیوں پسند ہے۔ کیونکہ یہاں سکون تھا، اطمینان تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لوگ برسوں سے رہ رہے تھے۔ اسی لیے وہ اس علاقے کی زمین کا حصہ بن کر پیوست ہو گئے تھے۔ جس طرح کوئی تناور درخت زمین میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا ہے، لوگوں کی جڑیں اسی زمین میں تھیں۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

کبیر اب صحت یاب ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب کا مطب اسی طرح چل رہا تھا۔ اب پورا علاقہ ان کے پاس علاج کے لیے آنے لگا تھا۔

ایک شام جب وہ کچھ مریضوں کو دیکھ رہے تھے تو ایک عورت مطب میں داخل ہوئی۔ وہ ایک طرف ٹوٹی سی پرانی بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ یہ بینچ بھی کبیر ہی نے حکیم کو دی تھی۔

ایک بار ایک آدمی سلام کر کے حکیم کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ چونکا چونکا سا دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی کو محسوس کر رہا ہو۔

''میں بھی اپنا علاج کرانے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک زخم ہو گیا ہے جو بہت دنوں سے تنگ کر رہا ہے۔''

''کہاں ہے زخم؟''

اس نے اپنی شلوار کا پائنچہ اٹھا دیا۔ حکیم کو ایک نظر میں زخم کی نوعیت معلوم ہو گئی تھی۔

''یہ بھگندر ہے۔'' حکیم نے بتایا۔ ''موذی مرض ہے۔ بہت دنوں میں جاتا ہے لیکن فکر مت کرو، چلا جائے گا۔''

''شکریہ جی۔'' اس نے شکریہ ادا کرنے کے بعد پھر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ حکیم صاحب سے اس کی بے چینی دیکھی نہیں گئی۔

''کیا بات ہے جناب!'' حکیم نے پوچھا۔ ''آپ کچھ بے چین سے لگ رہے ہیں؟''

''جی حکیم صاحب! ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کسی کی آمد ہے۔'' اس نے کہا۔

''آمد؟ میں سمجھا نہیں۔ کس کی آمد؟''

''کسی غیر مخلوق کی۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے احساس ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھ وظیفے وغیرہ کر رکھے ہیں۔ ان سے مجھے پتا چل جاتا ہے۔''

''ارے نہیں بھائی۔'' حکیم ہنس دیے۔ ''بے فکر رہیں، یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے، یہ میرا وہم ہی ہو۔ ایک بات بتائیں۔'' اس نے بینچ پر بیٹھی عورت کی طرف دیکھا۔ ''نہ جانے کیوں مجھے اس عورت کو دیکھ کر کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔''

''جناب! یہ سب آپ کا وہم ہے۔''

حکیم نے اس کو دوائیں دیں۔ اس وقت حکیم صاحب کو ایک بار پھر خیال آیا کہ دوائیں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور شہر سے جا کر لانا ہوں گی۔

اس آدمی کے جانے کے بعد وہ عورت بینچ سے اٹھ کر حکیم کے پاس آ گئی اور سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ وہ ایک قبول صورت عورت تھی۔ اس کے چہرے کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی دونوں بھنوؤں کے درمیان ایک خوبصورت سا تل تھا، جیسے کالا ٹیکا لگا دیا گیا ہو۔

''ہاں، کیا شکایت ہے؟'' حکیم نے پوچھا۔

''کل سے بخار ہے اور کھانسی ہے۔ بار بار کھانس رہے تھے۔''

''کیا مطلب؟ کون کھانس رہا ہے؟''

''میرے شوہر۔ وہ بیمار ہیں۔ ہاں ایک بات اور بتا دوں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتی۔''

''کوئی بات نہیں۔ دوائیں لے جاؤ پھر کبھی آ کر دے جانا۔''

''شکریہ حکیم صاحب! ورنہ یہاں کے لوگ تو میرے ساتھ بھی بھلائی نہیں کرتے۔''

''کیوں؟'' حکیم کے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔ ''لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کیوں نہیں کرتے؟''

''بات یہ ہے حکیم صاحب کہ میں جب شادی کر کے آئی تو میرے شوہر بیمار پڑ گئے۔ سب کا یہ خیال ہے کہ میں ایک منحوس عورت ہوں جس نے آتے ہی شوہر کو بیمار کر دیا ہے۔''

''لاحول ولا۔ یہ ہندوؤں کا طریقہ یہاں کہاں سے آ گیا؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا لیکن ہوتا یہی

ہے۔ اب میں چلوں گی۔''

اس عورت کے جانے کے بعد ایک مریض اور آیا۔ اس کے جانے کے بعد سناٹا ہو گیا۔

کبیر حکیم کے لیے چائے لے کر آ گیا۔

''کبیر! ایک بات بتاؤ۔ کیا یہاں بیوہ عورتوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔'' حکیم نے پوچھا۔

''ہاں جی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔''

''کیا سلوک ہوتا ہے ان کے ساتھ؟''

''ان کا کھانا پینا الگ کر دیتے ہیں۔'' کبیر نے بتایا۔ ''برادری سے کاٹ دیتے ہیں۔''

''کیا ہمیشہ ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے؟''

''زیادہ تر تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ تو جاہلوں والی رسم ہے۔''

''اب کیا کیا جائے۔ ایسا ہی ہے۔ لیکن حکیم صاحب! آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے ایک عورت میرے پاس آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہے۔ اس کا شوہر مرا نہیں ہے، بس بیمار ہے لیکن اس علاقے کے لوگ اسے منحوس سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس منحوس عورت نے آتے ہی اپنے شوہر کو بیمار کر دیا ہے۔''

''جی حکیم صاحب! ایسا ہوا تو تھا لیکن یہ تو برسوں پہلے کی بات ہے۔'' کبیر نے کہا۔

''نہیں بھائی! وہ عورت ابھی کچھ دیر پہلے ہو کر گئی ہے۔'' حکیم نے بتایا۔ ''اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے شوہر کو کھانسی اور بخار ہے۔''

''جی حکیم صاحب! اس کے شوہر کو کھانسی اور بخار ہی ہوا تھا۔ اس کا بہت علاج کروایا گیا۔ خود اس کی بیوی کے پاس تھوڑے بہت پیسے تھے، وہ بھی اس بے چاری نے اپنے میاں کی بیماری پر خرچ کر دیے لیکن وہ ٹھیک نہیں ہو سکا۔''

''ٹھیک نہیں ہو سکا سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ بیمار ہے۔ خدا نے چاہا تو ٹھیک ہو ہی جائے گا۔''

''نہیں حکیم صاحب! اب کہاں سے ٹھیک ہوگا۔ اس کو تو مرے ہوئے بھی دس بارہ برس گزر چکے ہیں۔'' کبیر نے بتایا۔

''کمال ہے۔'' حکیم بڑبڑایا۔ ''ہو سکتا ہے یہ کوئی دوسری عورت ہو۔''

''ہو سکتا ہے۔ اچھا آپ کے پاس آنے والی عورت کیسی تھی۔ میرا مطلب ہے صورت شکل کیسی تھی؟''

میں اور سسپنس

ہماری رفاقت کا عرصہ چوالیس سال پر محیط ہے۔ یہ عمر میں مجھ سے دس سال چھوٹا ہے مگر میرے لیے یہ ایک رفیق دیرینہ، مونس تنہائی اور یار غار کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا ابتدائی تعارف لاہور میں سرِراہ ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں میٹرک کا طالب علم تھا اور یہ محض چھ سال کا ایک چلبلا، شوخ و شریر بچہ...... میں نے اسے ایک بک اسٹال پر آویزاں دیکھا تو مجھے اس کی معصومیت بھری دل کشی پر پیار آ گیا۔ میں نے بے ساختہ اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لے آیا۔ اس نے میرے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ پھر یہ نہایت پابندی کے ساتھ ہر ماہ مجھ سے ملنے چلا آتا۔ رفتہ رفتہ ہماری بے تکلفی بڑھنے لگی۔ پہلی نظر کی محبت سے شروع ہونے والا یہ سفر بارہ سال کے تال میل کے بعد ایک پُراعتماد رشتے میں بدل گیا۔ تب 1989ء میں اس نے مجھے اپنے دولت کدے پر آنے کی دعوت دی۔ میں اس کی فیملی سے ملنے لاہور سے کراچی چلا آیا پھر اس نے مجھے کہیں جانے نہیں دیا۔ گزشتہ بتیس سال سے میں ایک فیملی ممبر کے مانند اس کے یہاں قیام پذیر ہوں۔ اس نے میری نگاہ میں اپنی زندگی کے مختلف مدارج طے کیے ہیں۔ بچپن سے لڑکپن اور جوانی سے پختہ عمری تک میں نے اس کا ہر رنگ، ہر ڈھنگ اور ہر روپ دیکھا ہے۔ اس نے ہر قدم پر خود کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ میں اس کی روز افزوں ترقی کا بھی شاہد ہوں۔ بیاں محبت کا ہو یا عشق کا، معاملہ تاریخ کا ہو یا تصوف کا، ذکر معیشت کا ہو یا معاشرت کا، یہ اپنے ہر انداز میں دل کو لبھاتا، طبیعت کو بھاتا اور دماغ کو گرماتا ہے۔ انسانی جذبات کا سفیر اور احساسات کا ترجمان بن کر یہ اپنے قاری کے تسکین ذوق اور تکمیلِ شوق کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا کوزہ ہے جس میں تفریح، علم و ادب کے سات سمندر قید ہیں۔ یہ اپنی ذات میں انجمن ہے۔ میرا یہ رازدار، غم گسار دوست اب پورے پچاس سال کا ہو گیا ہے۔ ماشاء اللہ! اس کی گولڈن جوبلی تہِ دل سے منائی جا رہی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ یہ اسی آن بان اور طمطراق کے ساتھ اپنی ڈائمنڈ اور پلاٹینم جوبلی بھی منائے ... آمین!

راقم الحروف

حسام بٹ

"اچھی قبول صورت تھی۔ ہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی دونوں بھوؤں کے درمیان ایک تل تھا..... بہت واضح۔"

"او خدا، تو پھر یہ وہی تھی۔" کبیر بری طرح چونک گیا۔ "حکیم صاحب! یہ وہی تھی، وہی عورت۔"

"ایک اور بات یاد آرہی ہے۔ اس عورت کی موجودگی میں ایک مریض میرے پاس آیا تھا۔ اس کو زخم ہو گیا تھا۔ وہ اس عورت کو دیکھ کر خوفزدہ ہوا جا رہا تھا۔"

"کیوں؟ خوفزدہ کیوں ہو رہا تھا؟" کبیر نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔ وہ اس عورت سے خوفزدہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کمرے میں کوئی غیر انسانی مخلوق بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا اشارہ اسی عورت کی طرف تھا۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ شبیر نام ہوگا اس آدمی کا؟"

"ہاں! اس نے شاید یہی بتایا تھا۔"

"حکیم صاحب! وہ ایک نمازی پرہیزگار انسان ہے۔ یہ سمجھیں کہ روحانی عامل قسم کی چیز ہے۔"

"اس نے بھی بتایا تھا کہ اس نے وظیفے کیے ہیں۔ اسے احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔"

"بھائی، اب تو خود مجھے بھی یقین آنے لگا ہے۔"

"پھر کوئی وظیفہ پڑھ کر سو جائیں۔ خدا خیر کرے گا۔"

حکیم صاحب اور کبیر بہت دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے تھے۔

کئی دن گزر گئے۔ اس کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ ایک دوپہر کو حکیم اپنے مطب میں تھا کہ کبیر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"خیریت تو ہے، کبیر؟" حکیم نے پوچھا۔

"نہیں حکیم صاحب! آج میرے سر سے سایہ چلا گیا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"حکیم صاحب! میرے ابا کا تو بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ایک چاچا تھے، وہ میرے لیے سائے کی طرح تھے۔ اسی علاقے میں رہتے تھے، ان کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"افسوس ہوا سن کر۔"

"حکیم صاحب! عصر کے بعد تدفین ہونی ہے۔"

"مجھے بھی لے چلنا۔" حکیم نے کہا۔

قبرستان کچھ فاصلے پر تھا۔ حکیم صاحب کبیر کے ساتھ ہی گئے تھے۔ تدفین کے بعد جب دعاؤں سے فارغ ہو کر سب واپس آنے لگے تو حکیم کچھ دیکھ کر رک گئے۔ ان کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا حکیم صاحب؟" کبیر نے ان کو جھنجوڑ کر پوچھا۔ "کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"کبیر!" حکیم صاحب نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھ رہے ہو؟"

"کیا دکھا رہے ہیں، حکیم صاحب؟"

"وہ دوا کی بوتل دیکھ رہے ہو، جو ایک طرف ایک قبر کے پاس پڑی ہوئی ہے؟"

"ہاں ایسا ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ قبرستانوں میں اس قسم کی چیزیں پھینک جاتے ہیں۔"

"یہ وہی بوتل ہے جو میں نے اس عورت کو دی تھی۔ اس بوتل کے پاس ایک خاکی لفافہ بھی پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس میں دوائیں دی تھیں۔ دیکھو اس میں میرے مطب کی دوائیں ہوں گی۔"

کبیر نے آگے بڑھ کر خالی بوتل کے ساتھ گرا ہوا لفافہ اٹھا کر دیکھا۔ "جی حکیم صاحب! اس میں دوائیں ہیں۔"

"بس اب اس کو وہیں رکھ دو اور واپس چلو۔"

کبیر، حکیم کے پاس آ گیا۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ "حکیم صاحب جانتے ہیں آپ کی چیزیں کس کی قبر کے پاس ہیں؟"

"نہیں۔"

"یہ قبر اسی عورت کے شوہر کی ہے جس کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے برابر میں اس کی بیوی کی قبر ہے۔"

"بس بھائی۔ ان دونوں کی قبر پر فاتحہ پڑھ دو اور دعا کرو کہ خدا انہیں چین دے دے۔"

"حکیم صاحب! یہ سب کیا ہے؟"

"کبیر! اللہ کے بھید تو اللہ ہی جانتا ہے۔ میری سمجھ میں تو بس ایک بات آئی ہے کہ اس وفادار عورت نے اپنی وفاداری کی مثال قائم کر دی ہے۔ اس سے بڑی وفاداری اور شوہر کی خدمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ موت کے بعد بھی اس کی خدمت کیے جا رہی ہے۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔"

"لیکن حکیم صاحب! یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"ہم اس کے سارے بھید نہیں جان سکتے لیکن اپنے علاقے کے لوگوں کو جا کر یہ بتا دو کہ منحوس وہ عورت نہیں تھی بلکہ منحوس تم لوگ ہو جنہوں نے ایسی عورت کی قدر نہیں کی۔"

کبیر خاموش رہا۔ قبرستان کی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہو رہی تھی۔

※※※

اس کا تعلق جس ڈیپارٹمنٹ سے تھا... اسے جرائم کی بیخ کنی کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے تھے مگر وہ ذرا سے مفاد کی خاطر ایک ایسی غلطی کر بیٹھا تھا جس کے عوض تمام عمر کی نیک نامی اور جہد مسلسل بالآخر سب رائگاں چلی گئی... جس عمل کو اس نے امداد باہمی کا نام دیا تھا اس نے خود سے بھی باہم مربوط نہ رہنے دیا۔

سسپنس کلاسک کے عنوان تلے مرحوم
مصنف کی تحریر کا جادو

امدادِ باہمی

عبدالقیوم شاد

سارجنٹ سام کاؤنٹر سے ملحقہ ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ موسم خلاف معمول گرم تھا اور ہال کے اندر لگا ہوا پرانا ائرکنڈیشنر گرمی کی شدت گھٹانے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ سوئچ بورڈ کے سامنے بیٹھا ہوا آپریٹر مستعدی کے ساتھ گشتی گاڑیوں کے پیغامات وصول کر رہا تھا۔ چند قدم پرے لیفٹیننٹ میراللہ کے آفس کا دروازہ کھلا تھا جس کے اندر سے ملی جلی آوازوں اور بے ہنگم قہقہوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

سام نے قدرے بے چینی کے ساتھ ایک گہرا سانس لیا اور کاؤنٹر پر جھک کر ڈیسک سارجنٹ کریر کی طرف دیکھنے لگا جو نوجوان لڑکے سے بے خبر جلدی جلدی اپنا کام ختم کرنے میں معروف تھا۔ ہال کے عقب میں حوالات کا کمرا نظر آتا تھا جو

نفسف بھرا ہوا تھا۔

سام نے سوچا کہ یہ عمارت نہایت بے ہنگم اور پولیس کے لیے قطعی غیر موزوں ہے۔ دراصل وہ ایک رہائشی عمارت تھی جسے پولیس اسٹیشن میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس کے گرد و نواح کا سارا علاقہ ہی بے ہنگم تھا۔ سام ایک مستعد اور بااصول افسر تھا۔ اس کی عمر چونتیس سال تھی۔ عمدہ کارکردگی کے باعث اس کی ابتدائی ترقی خاصی تیز رفتار تھی پھر یکایک اس کی ترقی رک گئی اور افسران بالا ذمے داری کے کام اس کے سپرد کرنے سے گریز کرنے لگے۔ کئی کم تجربہ کار اور جونیئر افسر اس سے آگے نکل گئے۔ دفعتاً آپریٹر کی تیز آواز کے باعث اس کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔

"یونٹ ایٹ۔" آپریٹر کہہ رہا تھا۔ "538، چیمبر اسٹریٹ پر واردات کی اطلاع ملی ہے۔ فوراً جا کر تفتیش کرو۔"

'ہونہہ... میرے لیے کوئی کام نہیں۔' سارجنٹ سام نے سوچا۔ اسے محض ایک ڈکیتی کی واردات کی تفصیلات تیار کرنے کا کام ملا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لیفٹیننٹ ہیراللہ اپنے دفتر کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ملاقاتی رخصت ہو رہے تھے۔ اس نے سگار کا کش لیتے ہوئے ہال پر ایک فاتحانہ نگاہ دوڑائی۔ پھر اس نے ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہوئے سام کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

"تمہارا کام کیسا جا رہا ہے؟" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سام سے پوچھا۔

"میرے خیال میں اچھا ہی جا رہا ہے۔" سام نے جواب دیا۔

"سنو سام۔" ہیراللہ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری بھلائی کے لیے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے کام کی رپورٹ اچھی نہیں ہے۔ تمہیں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"فریڈ برائنٹ روپوش ہو گیا ہے۔" ہیراللہ نے کہا۔ "اور ہم آج تک اس کا سراغ نہ لگا سکے۔"

سام کے خیالات کی رو ہوفمین ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں ہونے والی ڈکیتی کی طرف پھر گئی جس کے ضمن میں فریڈ برائنٹ پر شبہ کیا جا رہا تھا بلکہ پولیس حتمی طور پر فریڈ ہی کو اس واردات کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ اس ڈکیتی کی تفاصیل اور شواہد جمع کرنے کا کام سام کے سپرد تھا۔

"میرا قیاس ہے کہ وہ زیادہ دنوں تک روپوش نہیں رہے گا۔" سام نے کہا۔

"اب وہ ہرگز واپس نہیں آئے گا۔" ہیراللہ نے کہا۔ "کسی شخص نے اسے بتا دیا تھا کہ تم اس کے خلاف تفتیش کر رہے ہو۔ اس بات کا انکشاف تمہارے بے ڈھنگے سوالات سے ہوا جو تم اس کیس کے سلسلے میں کرتے پھر رہے ہو۔"

سام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی مبینہ غلطی پر اظہار افسوس کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"تمہاری تفتیش کا طریقہ نہایت احمقانہ تھا۔" ہیراللہ نے جیسے اس کے دل کی بات سن لی۔ "اتنی عجلت دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"جناب! میری طرح آپ بھی جانتے تھے کہ فریڈ ہی اصل مجرم ہے۔" سام نے کہا۔ "لہٰذا اس کی نگرانی کا انتظام کرنا چاہیے تھا۔"

چند لمحوں تک ہیراللہ سام کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" اس نے تیزی کے ساتھ کہا۔ "ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ وہی مجرم ہے لیکن جج یہ بات نہیں جانتا۔ جیوری بھی نہیں جانتی۔ ان کی نظروں میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہم کیا سوچتے اور جانتے ہیں۔ ہم کسی کو مجرم یا بے گناہ قرار نہیں دے سکتے۔ ہمارا کام شواہد اور ثبوت اکٹھے کر کے عدالت کے سپرد کرنا ہے۔"

"مجھے اپنے کام کے ابتدائی اصول سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ہر بات اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" سام سلگنے لگا تھا۔

ہیراللہ نے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا اور گہری نظروں سے سام کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار ابھرنے لگے۔

"میں نے تمہیں مذاکرے کے لیے نہیں بلایا۔" ہیراللہ نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ میں کہتا ہوں اسے غور سے سنو اور زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس آئندہ کے لیے محتاط رہو۔"

سام نے ہولے سے سر کو اثبات میں ہلایا۔ "جی بہتر۔"

"میرا خیال ہے کہ سردست تم راجر کے دفتر کی ذمے داری سنبھال لو کیونکہ آج کل وہ عدالت کے کاموں میں زیادہ مصروف ہے۔" ہیراللہ نے کہا۔

"بہتر جناب۔" سام نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

راجر کے دفتر کا کام معمولی نوعیت کا تھا جو ایک کلرک بھی کر سکتا تھا پھر ہیراللہ میز پر پڑے ہوئے کاغذات کی

طرف متوجہ ہو گیا اور سام جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

ڈیسک ڈیوٹی یا یوں کہیے کہ کلرکی کرتے ہوئے اسے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ایک صبح وہ دفتر جانے کے لیے روانہ ہوا۔ عقب میں آتی ہوئی ایک بھورے رنگ کی کار کو دیکھ کر چونک سا گیا۔ گزشتہ روز بھی یہ کار اس کے پیچھے تھی۔ بلکہ کئی اور مواقع پر بھی وہ اس کار کو تعاقب کرتے دیکھ چکا تھا۔ جب پولیس اسٹیشن تھوڑے فاصلے پر رہ گیا تو عقب میں آنے والی گاڑی ایک موڑ مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اگلے ہفتے کے دوران بھورے رنگ کی کار صرف ایک آدھ مرتبہ ہی نظر آئی۔ ہفتے کی شام وہ سپر مارکیٹ میں خریداری کرتا پھر رہا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ اسی بھورے رنگ کی گاڑی پر پڑی جو کھڑکی سے پرے پارکنگ کے مقام پر کھڑی تھی۔ گویا گاڑی کا مالک مارکیٹ کے اندر بھی اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عقب سے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ ایک دم گھوم کر مخاطب کرنے والے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ درمیانے قد کا خوش پوش شخص تھا۔ اس نے اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بظاہر وہ ایک اجنبی تھا اور سام کے اندازے کے مطابق پہلی مرتبہ اس سے ملا تھا۔

”میرا نام مل گرنڈلے ہے۔“ اجنبی نے کہا۔

تب سام کو یاد آیا کہ وہ پہلے بھی اس سے مل چکا ہے۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔“ سام نے تنقیدی نظروں سے گرنڈلے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”چوری کی ایک واردات کے سلسلے میں میری تم سے ملاقات ہو چکی ہے۔“

”بالکل ٹھیک!“ گرنڈلے نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”تین آدمی گرفتار ہوئے تھے لیکن سزا صرف ایک کو ملی تھی۔“

”میں بہت دنوں سے تمہاری گاڑی دیکھ رہا ہوں۔“ سام نے کہا۔ ”تم کس خوشی میں میرا تعاقب کرتے پھر رہے ہو؟“

”آج بھی تعاقب کرتا ہوا ہی یہاں تک پہنچا ہوں۔“ گرنڈلے نے کہا۔ ”تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ سام نے حیرت سے اسے دیکھا کیونکہ وہ کبھی بھی پولیس کا مخبر نہیں رہا تھا۔ گرنڈلے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہنا شروع کیا۔ ”سارجنٹ سام! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری کارکردگی کچھ اچھی نہیں جا رہی۔ ترقی کے بجائے تمہارا قدم مائل بہ تنزل ہے۔ تمہارے افسر بھی تمہارے کام سے خوش نہیں۔ اگر تم ذرا ہوشیاری سے کام لیتے تو پس پردہ ہونے والی کارروائیوں کو سمجھ کر اپنا راستہ خود متعین کر لیتے۔“

”پس پردہ کارروائیاں؟“

”میرا اشارہ تمہارے محکمے میں ہونے والی بدعنوانیوں کی طرف ہے۔“ گرنڈلے نے کہا۔

سام نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم مجھے بغاوت پر اکسانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”سارجنٹ! تم ایک مخلص اور با اصول انسان ہو۔“ گرنڈلے پلک جھپکائے بغیر بولا۔ ”میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ بغاوت کرو اور نہ ہی تمہیں اپنے افسروں کے خلاف کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اپنے اصول اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرو۔ تمہارے ساتھیوں نے بہت پہلے اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ ذمے دار اور کامیاب افسر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ دونوں طرف رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بروقت اطلاعات مل جاتی ہیں۔“

سام ابھی تک اس کی گفتگو کا مقصد نہیں سمجھا تھا۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی قیمتی معلومات معاوضہ لے کر اسے فروخت کرنا چاہتا ہے تاہم یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔ گرنڈلے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگلے مہینے ڈکیتی کی ایک واردات کا معاملہ حل کرنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں اس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں۔“ سام نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ ”کھل کر بات کرو۔“

”اگلے مہینے جنوبی علاقے کی ایک عمارت میں ڈاکا پڑنے والا ہے۔ منصوبہ دو عادی مجرموں نے بنایا ہے۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو گرفتار کر لیا جائے تو گزشتہ سال کے دوران ہونے والی کئی چوریوں کا سراغ مل سکتا ہے۔“

”غالباً تم معاوضے پر یہ معلومات فراہم کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”میں معلومات سے بڑھ کر مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ گرنڈلے نے کہا۔ ”جہاں تک معاوضے کا تعلق ہے، ضروری نہیں کہ وہ پیسوں کی شکل میں ہی ہو۔ ہم یہ تعاون امداد باہمی کی بنیاد پر بھی کر سکتے ہیں۔“

”فلسفہ نہیں جھاڑو۔ کام کی بات کرو یا چلتے پھرتے نظر آؤ۔“

”محترم! ڈکیتی کا منصوبہ طے ہو چکا ہے۔“ گرنڈلے نے کہا۔ ”اور واردات بہر صورت ہو کر رہے گی

جس کے بعد میں ایک خطیر رقم کا مالک بن جاؤں گا۔"
"کیا کہا.....؟"
"یہ منصوبہ میں نے تیار کیا ہے۔ میرے ساتھ ایک شخص اور ہے اور میں بخوشی اپنے ساتھی کو گرفتار کروا سکتا ہوں۔ میرے تعاون کے ذریعے تم اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر سکتے ہو اور اسے سزا دلوا سکتے ہو۔"
"اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" سام نے پوچھا۔
"تمہارے تعاون کے ذریعے میں بہ آسانی فرار ہو جاؤں گا۔" گرنڈلے نے مسکرا کر کہا۔
"مال مسروقہ کے ساتھ.....؟"
"بالکل درست۔" گرنڈلے نے ایک بار پھر اس کا کندھا پکڑ کر سرگوشی کی۔ "نصف کے بجائے پورا مال میرا ہوگا اور تمہاری وردی میں ایک اسٹار کا اضافہ ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے؟"
"اوہ! تم ایک بااصول افسر کو قانون کے ساتھ غداری کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔" سام نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی۔ میں تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔ کیا سمجھے۔"
"طیش میں آئے بغیر بھی تم مجھے گرفتاری کی دھمکی دے سکتے ہو۔" گرنڈلے نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ثبوت فراہم نہیں کر سکو گے۔ شاید اپنی پوزیشن مزید خراب کر لو۔ دوست! سچی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہمدردی کر رہا ہوں۔ درحقیقت یہ تمہارا فرض ہے کہ جرم کے سلسلے میں میرا تعاون حاصل کرو۔"
"تاکہ بعد میں تم ساری ذمے داری میرے سر تھوپ دو۔" سام نے کہا۔ "تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔"
"کیسی بات کرتے ہو دوست۔" گرنڈلے نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ایسی بات کہنے کے ساتھ ہی پہلے تو میں سیدھا جیل میں چلا جاؤں گا۔ یوں بھی ایک مجرم کی بات پر اعتبار ہی کون کرے گا۔"
سام نے سوچا وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ بظاہر اس کے ساتھ ساز باز کر لی جائے اور درپردہ محکمے کو پوری صورتِ حال سے آگاہ کر کے دونوں کو گرفتار کروا دیا جائے۔
"تمہارا ساتھی کون ہے؟" سام نے پوچھا۔
"ٹیڈ ڈیوس۔"
سام کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ ڈیوس انتہائی بدنام شخص تھا۔ اس کی گرفتاری خاصی سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔

"کیا تم اس سے کسی بات کا بدلہ لینا چاہتے ہو؟" سام نے پوچھا۔
"کچھ نہ کچھ ضرور ہے لیکن تمہیں نہیں بتا سکتا۔" گرنڈلے نے شانے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "وہ بڑی آسانی سے گرفتار ہو جائے گا اور اسے زندگی بھر مجھ پر شبہ نہیں ہوگا۔"
"فی الوقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" سام نے کہا۔ "میں اس معاملے پر غور کروں گا۔"
"ضرور، ضرور..... پھر میں تم سے کب ملوں؟"
"چند روز کے بعد مجھ سے ملو۔" سام نے کہا۔ "اور سنو! آج کے بعد سے تمہاری بے ہودہ گاڑی میرے پیچھے نظر نہ آئے۔"
"اچھی بات ہے۔" گرنڈلے نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ امداد باہمی والا نکتہ تمہاری سمجھ میں آچکا ہوگا۔" سام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس مسئلے پر اچھی طرح غور و فکر کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

کئی روز تک سام گرنڈلے کی پیشکش پر غور کرتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ گرنڈلے صرف ایک شخص کو قانون کے حوالے کرنے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ اپنے کئی پرانے ساتھیوں کو بند کروا دے گا تاکہ اس کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ محفوظ اور مستحکم ہو جائے۔ کیوں نہ..... گرنڈلے کو بھی گرفتار کروا دیا جائے؟ سام نے سوچا تاکہ قانون اور انصاف کا تقاضا پورا ہو جائے تاہم گزشتہ کئی سالوں کا تجربہ ثابت کر رہا تھا کہ دنیا میں سچائی اور ایمانداری ہی سب کچھ نہیں۔ ترقی کرنے کے لیے آدمی کو جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہرچند وہ ایک مخلص اور محنتی افسر تھا لیکن اس کے باوجود اس کی ترقی رک گئی تھی اور افسرانِ بالا اس پر اعتماد کرنے سے گریز کرنے لگے تھے پھر محدود آمدنی کے سبب اس کی بیوی کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی اور وہ وقت سے پہلے بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔
یقیناً گرنڈلے سے معاملہ کرنے کے بعد اس کی کارکردگی میں نمایاں اضافہ ہو سکتا تھا اور وہ مزید ترقی حاصل کر سکتا تھا۔ گویا نہ صرف اسے ذہنی آسودگی حاصل ہو جائے گی بلکہ معاشرہ چند ناپسندیدہ افراد سے پاک بھی ہو جائے گا۔ آج تک اس کا اخلاص اور اصول پسندی ترقی کی راہ میں حائل رہی تھی پھر بھی وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے میں خاصا متامل تھا مگر کب تک..... بالآخر اس نے کچھ سوچ لیا۔

☆☆☆

اگلے روز سام اور گرنڈلے بینکاک۔ ہوٹل کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھے مجوزہ منصوبے کی تفاصیل طے کر رہے تھے۔ ''منصوبہ بہت سیدھا سادہ ہے۔'' گرنڈلے نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''چوری فارنہام روڈ پر واقع ایک عمارت میں کی جائے گی۔ اس کا نام گرے ہاؤس ہے اور وہ خاصے وسیع رقبے پر بنی ہوئی ہے۔ یہ جگہ سڑک سے کافی ہٹ کر نسبتاً ایک غیر آباد مقام پر واقع ہے۔ ہم عمارت کا اچھی طرح جائزہ لے چکے ہیں۔ وقتِ مقررہ پر میں اور ایلس ایک کار میں بیٹھ کر وہاں جائیں گے۔ کار کو سڑک کے قریب درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا کر دیں گے پھر ہم درختوں کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کمپاؤنڈ کے اندر داخل ہوں گے اور ایک بغلی کھڑکی کی راہ سے عمارت کے اندر گھس جائیں گے۔ مطلوبہ شے کی چوری کرنے کے بعد ہم اسی کھڑکی کے راستے سے واپس ہوں گے۔ منصوبہ نہایت احتیاط سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کے ناکام ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔''

''چوری کے لیے کس چیز کا انتخاب کیا ہے؟'' سام نے پوچھا۔

''پرانے سکے اور نقدی۔'' گرنڈلے نے جواب دیا۔ ''عمارت کا مالک مسٹر جیکسن گرے پرانے سکوں کا بہت شوقین ہے۔ اس نے ایک بڑی تعداد پرانے سکوں کی جمع کر رکھی ہے۔ نقدی اور سکوں کا تھیلا میرے ہاتھ میں ہوگا۔

''ہمارے اندر گھسنے کے فوراً بعد تم بیرونی دیوار کے غربی کونے کے قریب چھپ کر ہمارا انتظار کرنا۔ جیسے ہی ہم مالِ مسروقہ لیے ہوئے تمہارے قریب سے گزریں، تم فوراً ہمیں رکنے کا حکم دینا۔ میں تھیلا لیے ہوئے بھاگ نکلوں گا۔ تم بطور وارننگ ایک ہوائی فائر کرنا۔ میں بدستور بھاگتا چلا جاؤں گا پھر تم دوسرا فائر کرنا جو خطا جائے گا۔''

قدرے توقف کے بعد اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یاد رکھو، اگر میں تمہاری گولی کا شکار ہو گیا تو میری بیوی ہمارے گٹھ جوڑ کی اطلاع پولیس کو کر دے گی۔ میں نے سارا منصوبہ ایک کاغذ پر لکھ کر اس کے حوالے کر دیا ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ صرف میری بیوی اس منصوبے کو جانتی ہے۔ وہ ایک خاندانی عورت ہے اور کبھی میرے ساتھ دھوکا نہیں کرے گی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ یہ زندگی اور موت کا کاروبار ہے۔''

''اگر ڈیوس بھی بھاگ کھڑا ہوا تو...؟'' سام نے پوچھا۔

''تو پھر تمہارا نشانہ خطا نہیں ہونا چاہیے۔'' گرنڈلے نے شراب کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔
یوں بھی یہ بات سام کے لیے کسی تشویش کا باعث نہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ ڈیوس جیسا کہنہ مشق بھرے ہوئے پستول کے سامنے بھاگنے کی حماقت نہیں کرے گا۔

☆☆☆

واردات سے دو روز قبل سام نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اسے ایک نامعلوم شخص نے فون پر اطلاع دی ہے کہ گرے ہاؤس میں عنقریب ڈاکا پڑنے والا ہے۔ تاہم انہوں نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا کیونکہ پولیس کو عموماً اس قسم کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں جن میں سے بیشتر جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔ واردات والی رات کو سام نے لیفٹیننٹ ہیر اللہ سے گرے ہاؤس کے قرب و جوار میں گشت کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور ایک نوجوان افسر فلیچر کو ساتھ لے لیا۔ سام نے فلیچر کو گرے ہاؤس کے عقبی حصے کی نگرانی پر مامور کر دیا اور خود صدر دروازے کے سامنے ایک تاریک مقام پر چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے اور پروگرام کے مطابق گرنڈلے ٹھیک گیارہ بجے وہاں پہنچنے والا تھا۔ عمارت کے برآمدے میں ایک پرانی وضع کی آرائشی بتی جل رہی تھی جو غالباً چوروں کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔ نچلی منزل کے [illegible] البتہ [illegible] کے ایک کمرے میں مدھم روشنی نظر آ رہی تھی۔ عمارت کا بیرونی حصہ مکمل تاریکی میں تھا۔

رات سنسان تھی۔ قرب و جوار میں پراسرار سناٹا مسلط تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے کسی کار کی مدھم آواز رات کی خاموشی کو قطع کرتی سنائی دی جو بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ہیڈ لائٹس کی روشنیاں نظر آئیں جو قریب آ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں معدوم ہو گئیں۔ چند لمحوں کے بعد ماحول پر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ سام آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً بیرونی دیوار کے غربی کونے پر کوئی شے حرکت کرتی نظر آئی جو ایک موہوم لمحے کے بعد غائب ہو گئی۔ سام تیزی اور خاموشی کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گیا۔ ایک جگہ سے بیرونی دیوار کا کچھ حصہ شکستہ تھا جس کی انتہائی بلندی تین فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ سام کمپاؤنڈ کے اندر جھانکنے لگا مگر وہاں پر بہت تاریکی اور خاموشی مسلط تھی۔ وہ اس شکستہ دیوار کے قریب چھپ کر انتظار کرنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال گزرا کہ کہیں فلیچر اپنی جگہ چھوڑ کر واپس نہ آ جائے تاہم اس نے جلد ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ فلیچر ان نوجوان افسروں

میں سے تھا جو آخری دم تک حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔

چند ساعتوں کے بعد عمارت کے پہلو میں ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ پھر ایک دوسرا سایہ نمودار ہوا۔ دونوں تیز رفتاری کے ساتھ درختوں کی تاریکی میں چھپتے ہوئے شکستہ دیوار کی طرف بڑھنے لگے۔ سام نے بھرا ہوا پستول مضبوطی سے پکڑ لیا اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے اعصاب پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور حلق خشک ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں پر مدھم سی آواز پیدا ہوئی اور دونوں چور شکستہ دیوار پھلانگ کر باہر آ گئے۔

"ہالٹ۔" سام نے گرجتے ہوئے کہا۔

دونوں ایک دم رک گئے۔

"ہلنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔" سام نے سامنے آتے ہوئے کہا۔

دفعتاً دونوں میں سے ایک بائیں طرف گھوم کر تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سوٹ کیس تھا جو اس نے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ سام نے وارننگ کے طور پر ایک ہوائی فائر کیا لیکن وہ بدستور بھاگتا رہا۔

"ہالٹ۔" اس نے دوبارہ چیخ کر کہا۔ اس کے پستول کی نالی کا رخ گرنڈلے کی جھکی ہوئی کمر کی طرف تھا اور وہ بہ آسانی اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا جی چاہا کہ وہ گرنڈلے کی کمر پر فائر کر دے لیکن پھر اس نے نالی کا رخ قدرے اوپر کی جانب کر کے دو اور فائر کر دیے اور نشانہ "خطا" ہو گیا۔ ایک ثانیے کے بعد رات کی تاریکی میں کار اسٹارٹ ہونے اور ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک کار تیزی کے ساتھ شفاف سڑک پر دوڑتی چلی جارہی تھی۔

اب سام کے پستول کا رخ دوسرے مجرم کی طرف تھا۔ اس کے سامنے اشتہاری مجرم ہیڈ ڈیوس کھڑا تھا جس کے چہرے پر غصے اور الجھن کے ملے جلے تاثرات پائے جاتے تھے۔ دریں اثنا گلیشر بھی وہاں پہنچ گیا۔ بھاگنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"کیا ہوا سر؟" اس نے پوچھا۔ "بھاگ گیا؟"

"ہاں، ایک بھاگ گیا۔" سام نے جواب دیا۔ "نشانہ خطا ہو گیا۔"

"میں نے اسے گاڑی میں فرار ہوتے دیکھا ہے۔" گلیشر نے کہا۔ "اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔ اگر حکم ہو تو وائرلیس پر مدد طلب کروں؟"

"فوراً کرو۔" سام نے کہا۔ "کیا تم گاڑی کا نمبر یا نیک نوٹ کر سکے؟"

"نہیں جناب۔ تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آسکا۔"

"اچھی بات ہے۔ گشتی پولیس کو بھی اطلاع کر دو۔" سام نے ڈیوس کو ہتھکڑی لگاتے ہوئے کہا۔ "تم چلو، میں اسے لے کر آرہا ہوں۔"

اور یوں اس رات کا ڈراما ختم ہوا۔

☆☆☆

چھ مہینوں کے دوران سام نے اس طریقہ کار کے ذریعے تین اور نامی مجرموں کو گرفتار کیا اور گرنڈلے کی مدد سے کئی پرانے کیس حل کر دیے تاہم وہ ہر کیس کی رپورٹ مختلف تیار کرتا رہا تاکہ افسران بالا کو شبہ نہ ہو۔ کچھ عرصے کے بعد گرنڈلے کے پاس ایک خطیر رقم جمع ہو گئی اور اس نے مزید کارروائیوں کا سلسلہ بند کر دیا لیکن اس نے "امداد باہمی" کا سلسلہ جاری رکھا اور وقتاً فوقتاً سام کو ایسی معلومات مہیا کرتا جو عادی مجرموں کو پکڑنے میں مددگار ثابت ہوتیں۔ افسران کی نظروں میں سام کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی۔ اخباری تشہیر کی وجہ سے وہ ایک روایتی ہیرو کی طرح پبلک میں مشہور ہو گیا۔ ایک سال کے بعد وہ ترقی کر کے فرسٹ کلاس سارجنٹ بن گیا۔

اس کی بیوی بڑی خوش تھی۔ اس کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی کیونکہ سام کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ آسودہ حالی کی زندگی گزارنے لگے تھے۔

گرنڈلے سے اس کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا بلکہ اس کا خیال بھی اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ اب وہ پوری تندہی اور ایمانداری سے اپنا کام انجام دیتا تھا۔ چند سالوں کے بعد لیفٹیننٹ ہیرالڈ کو ترقی دے کر کیپٹن بنا دیا گیا اور سام کو اس کی جگہ پر لیفٹیننٹ کی پوسٹ مل گئی۔

☆☆☆

اچانک ایک روز مل گرنڈلے نے اسے فون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سام کو اسے ملاقات کا وقت دینا پڑا۔ گرنڈلے نے اسے اگلے روز تین بجے پبلک لائبریری میں ملنے کے لیے کہا۔

اگلے روز ٹھیک وقت پر لیفٹیننٹ سام سادہ کپڑوں میں ملبوس لائبریری کے جرائم سیکشن میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے جنسی جرائم کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب کھلی پڑی تھی۔ تین بج کر پانچ منٹ پر گرنڈلے بھی وہاں پہنچ گیا اور ایک کرسی گھسیٹ کر سام کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بہت عرصے کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔"

گرنڈلے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی پرانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''ہاں۔'' سام نے سردمہری سے جواب دیا۔ ''تقریباً پانچ سال بعد۔''

''کیا بات ہے لیفٹیننٹ سام۔'' گرنڈلے نے گہری نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ میری بدولت آج تم سارجنٹ کے بجائے لیفٹیننٹ بن چکے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' سام نے کہا۔ ''لیکن میں ان باتوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری ذات سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا ہے۔''

''میں ایک صاف دل انسان ہوں۔'' گرنڈلے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارے ساتھ دھوکا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ہم جیسے دیرینہ دوستوں کو ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے آپس میں امداد باہمی کا عہد کر رکھا ہے اور آج میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔''

''سیدھی بات کرو۔'' سام نے خشک لہجے میں کہا۔

''تم نے بائن کارپوریشن کا نام سنا ہوگا۔'' گرنڈلے نے کہا۔ ''ان کی فیکٹری اور گودام پامر روڈ پر واقع ہے۔''

''بائن کارپوریشن؟'' سام نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''غالباً یہ لوگ ادویات تیار کرتے ہیں؟''

''ٹھیک سمجھے۔'' گرنڈلے نے کہا۔ ''اس وقت ان کے گودام میں اسی ہزار ڈالر کی نشہ آور دوا... موجود ہے۔''

تب سام کو بائن کارپوریشن کی فیکٹری کے بارے میں یاد آیا جہاں تین سال قبل چوری کی واردات ہوئی تھی۔ فیکٹری ایک سنسان علاقے میں واقع تھی۔

''میں تمہاری باتوں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکا۔'' سام نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ گرنڈلے کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔

''میں یہ قیمتی دوا... چوری کرنا چاہتا ہوں۔'' گرنڈلے نے کہا۔ ''اور تم میری مدد کرو گے۔''

''ہرگز نہیں۔'' سام نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تم ہرگز یہ پسند نہیں کرو گے کہ حکام تمہاری پس پردہ سرگرمیوں سے آگاہ ہوں۔'' گرنڈلے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا خیال ہے؟ میرے پاس کچھ دلچسپ ٹیپس بھی ہیں جنہیں سن کر تمہارے افسروں کے چودہ طبق روشن ہوجائیں گے۔''

''کیا تم اپنا گلا کاٹنا چاہتے ہو۔'' سام نے دھمکی دی۔

''لیفٹیننٹ سام! ہم لوگ جیل کے اندر بھی اتنے ہی خوش رہتے ہیں جتنے باہر۔'' گرنڈلے پر دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ''چوری کے جرم میں مجھے زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی سزا ہوسکتی ہے لیکن اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تم ایک باعزت پولیس افسر ہو۔ اس انکشاف کے بعد...... نہ صرف تمہاری عزت اور مستقبل تباہ ہوجائے گا بلکہ سبکدوشی کے بعد ملنے والی تمام مراعات سے بھی محروم ہوجاؤ گے۔''

گرنڈلے کی چمک دار اور پرسکون آنکھیں سام کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ سام غصے سے تلملا اٹھا لیکن گرنڈلے کے چہرے پر کوئی تبدیلی ظاہر نہ ہوئی۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیفٹیننٹ سام! تم بخوبی جانتے ہو کہ

شہیدانِ کوچۂ چیلان

1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے نتیجے میں جو مصیبت دلی کے کوچۂ چیلان پر ٹوٹی وہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ اسی محلے میں بڑے بڑے شرفاء اور نامور شاہ رہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کا گھرانا اسی محلے میں آباد تھا۔ سرسید کا گھر بھی اسی محلے کے ایک حصے میں تھا۔ مولانا صہبائی بھی اسی محلے کے باشندے تھے۔ اس مصیبت کی وجہ یہ تھی کہ نواب شمشیر جنگ کے بیٹے محمد علی خاں نے یا حکیم فتح اللہ خاں نے کسی گورے فوجی کو زخمی کردیا تھا کیونکہ وہ ان کے زنانہ مکان میں کسی برے ارادے سے جانا چاہتا تھا۔ انگریز افسر نے حکم دیا کہ اس محلے کے تمام مردوں کو قتل کردو یا گرفتار کرکے لے آؤ۔ انگریز فوج نے محلے کو گھیرے میں لے لیا۔ سپاہی گھروں میں گھس گئے اور تمام مرد چن چن کر قتل کردیے گئے۔ ان مظلومین میں مولانا امام بخش صہبائی اور برصغیر کے مشہور خوش نویس میر پنجہ کش بھی تھے۔ کوچۂ چیلان کے شہیدوں کی صحیح تعداد کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف مولانا صہبائی کے کنبے کے اکیس افراد مارے گئے۔ ظہیر الدین ظہیر دہلوی لکھتے ہیں۔

''سنا ہے اس محلے کے چودہ سو آدمیوں کو دریا پر لے جاکر قتل کردیا گیا اور لاشیں دریا میں پھینک دی گئیں۔ عورتوں کا یہ حال ہوا کہ گھروں سے نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جاگریں۔ کوچۂ چیلان کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔''

(واقعاتِ غدرِ دہلی)

مرسلہ: عائشہ ڈلی، حیدرآباد

چوری میرا ذریعۂ معاش ہے تاہم میں تمہیں یقین دلاتا ہوں یہ میرا آخری معرکہ ہوگا۔ اس کے بعد میں ریٹائر ہو جاؤں گا پھر تم میری شکل نہیں دیکھو گے۔"

اتنی دیر میں سام نے اپنے اوپر قابو پالیا۔ مرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم اس چوری کے بعد تائب ہو جاؤ گے؟"

"اس نشہ آور دوا... کو فروخت کرنے کے لیے مجھے ملک سے باہر جانا پڑے گا۔" گرنڈلے نے سمجھایا۔ "اور کم از کم پانچ سال سے پہلے واپس نہیں آؤں گا۔ اس وقت تک تم کیپٹن بن کر ریٹائر ہو چکے ہو گے، کیوں؟"

"جن لوگوں کو تم نے جیلوں میں بند کروایا ہے، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟" سام نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "اگر ان کو تمہاری چالبازی کا علم ہو جائے تو جانتے ہو وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"میں اپنے دشمنوں سے نمٹنے کا ڈھنگ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" گرنڈلے نے جواب دیا۔ "میری نظر میں ان کی حیثیت حقیر کیڑوں سے زیادہ نہیں لہٰذا مجھے خوفزدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

سام نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اس مرتبہ تمہارا کیا منصوبہ ہے؟"

گرنڈلے نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اس کے چہرے پر مسرت کے آثار ابھر آئے۔ غالباً وہ لائبریری کے جرائم سیکشن میں بیٹھ کر جرم کا منصوبہ تیار کرنے پر خاصا مسرور تھا۔

"سادہ اور بے ضرر۔" اس نے ایک لفافے کی پشت پر بائن فیکٹری کا خاکہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے ہم الارم لائن عبور کریں گے۔ پھر اس دروازے سے گودام کے اندر داخل ہوں گے۔ کارروائی کا آغاز صبح کے چار بجے ہوگا۔"

"اس مرتبہ قربانی کا بکرا کون ہوگا؟" سام نے پوچھا۔

"رچ کوسٹا۔"

رچ کوسٹا علاقے کا بدنام ترین شخص تھا لیکن وہ نہایت محتاط طریقے سے کام کرتا تھا اس لیے مشکل سے ہی پولیس کے ہتھے چڑھتا تھا تاہم اس مرتبہ وہ مفت میں پھنسنے والا تھا۔ گرنڈلے نے پنسل کی نوک سے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں وہ نشہ آور دوا رکھی تھی۔ پروگرام کے مطابق دوا کے تمام ڈبے دروازے کے قریب رکھنے کے بعد گرانڈلے باہر جا کر اپنی گاڑی دروازے کے قریب لائے گا۔ پھر تمام دوا ڈکی کے اندر رکھ دی جائے گی۔

"چوکیدار کا کیا بندوبست کرو گے؟"

"تم فکر کیوں کرتے ہو۔" گرنڈلے نے کہا۔ "ہم اس قسم کے انتظامات کرنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ چوکیدار اس آفس میں ہوتا ہے۔" اس نے ایک جگہ کراس لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک بڈھا آدمی ہے، زیادہ مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ اس کارروائی کے دوران ہمارے چہروں پر نقاب چڑھی ہوگی تاکہ چوکیدار کو ہمیں شناخت کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرنی پڑے۔"

"اور میں حسب معمول کوسٹا کو گرفتار کرلوں گا۔" سام نے کہا۔ "اور تم اسی ہزار ڈالر کی دوا کے ساتھ نو دو گیارہ ہو جاؤ گے۔"

"گرفتار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" گرنڈلے نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔ "شوٹ کر دو۔"

"شوٹ؟" سام نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... شوٹ۔" گرنڈلے نے کہا۔ "کوسٹا ایک ہوشیار آدمی ہے۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ اس کی گرفتاری کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ بعد میں پیرول پر رہا ہو کر وہ میرے لیے مصیبت بن جائے گا۔ یہ میرا آخری کارنامہ ہے اور میں کسی قسم کی دردسری مول نہیں لینا چاہتا۔"

"ذرا سوچ کر بات کرو۔" سام نے کہا۔ "تم ایک پولیس افسر کو قتل کرنے کی ترغیب دے رہے ہو۔"

"میں تمہیں ایک بھاگتے ہوئے مجرم پر فائر کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔" گرنڈلے نے کہا۔ "اور یقیناً اس کارنامے پر تمہاری تعریف کی جائے گی۔ نشہ آور دوا کی کچھ مقدار پاؤڈر کی شکل میں ہے۔ میں جانے سے قبل پاؤڈر کی ایک تھیلی کوسٹا کے قریب پھینک دوں گا تاکہ واردات کی اصلیت میں مزید اضافہ ہو جائے۔ تم دو چار فائر کار کی ڈکی پر بھی کر دینا تاکہ اگر گاڑی پولیس کے ہاتھ لگ جائے تو وہاں بھی تمہاری اعلیٰ کارکردگی کے نشانات نظر آئیں۔ گولیوں سے دوا... کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا البتہ یہ خیال رہے کہ ٹائر یا پیٹرول ٹینک پر گولی نہ لگے۔"

سام اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"یہ سب ٹھیک ہے مگر میں قاتل بننا نہیں چاہتا۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

"میں بھی تمہیں قاتل بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" گرنڈلے نے کہا۔ "اگر تم معاملے کو ایک پولیس افسر کے نقطۂ نظر سے دیکھو گے تو تمہیں اس کے اندر کوئی قباحت محسوس نہیں

ہوگی۔ تم اپنے فرائض کی ادائیگی کرتے وقت ایک شخص کو چوری کرتے دیکھتے ہو۔ تمہارے للکارنے پر وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور وارننگ کے باوجود نہیں رکتا لہٰذا تم مجبوراً اس کو گولی کا نشانہ بنا دیتے ہو۔ کوئی بھی اسے قتل نہیں کہہ سکتا۔ یہ آخری موقع ہے، یہ کام تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔''

قدرے تامل کے بعد سام دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ قائل ہوتا نظر آرہا تھا۔ عزت اور مستقبل کے تحفظ کے لیے ایک مجرم کا قتل بُرا سودا ہرگز نہیں ہے۔ وہ خاموش رہا تب کچھ دیر بعد گرنڈلے نے اس سے پوچھا۔ ''اس علاقے میں پولیس کی کوئی گاڑی گشت پر تو نہیں ہوتی ؟''

''معلوم نہیں۔'' سام نے آہستگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''پتا کرلوں گا۔''

''ضرور کرلینا۔'' گرنڈلے نے کہا۔ ''اور مجھے فون پر مطلع کردینا تاکہ گشت کرنے والی گاڑی کی توجہ کسی اور جانب موڑ دی جائے۔''

پھر اس نے اپنا فون نمبر ایک پرزے پر لکھ کر سام کے ہاتھ میں تھما دیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

منگل کی رات کو سام خلاف معمول جلدی بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے آڈرے سے کہہ دیا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اس لیے وہ جلدی سوجانا چاہتا ہے۔ رات بھر وہ بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ محض خودغرضی کی بنا پر گرنڈلے سے گٹھ جوڑ کرتا رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کی نگاہیں سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی گھڑی کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ تین بج کر پندرہ منٹ پر فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف گرنڈلے ہی تھا۔ وہ اسے جائے واردات پر پہنچنے کے لیے کہہ رہا تھا اور سام جائے واردات پر پہنچنے کے لیے مجبور تھا۔ ایک چور نے پولیس والے کو کیسا پھنسایا تھا۔

☆☆☆

رات کی تاریکی میں بائن کارپوریشن کی فیکٹری کسی چھوٹے سے جزیرے کے مانند معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چاروں طرف چمک دار روشنی والے بلب جل رہے تھے۔ سام نے دو بلاک پیچھے ہی اپنی گاڑی روک دی اور پیدل فیکٹری کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ حتی الامکان تاریکی میں چلنے کی کوشش کررہا تھا۔ دائیں جانب واقع ایک زیرِ تعمیر عمارت کے ستون پُرہیبت انداز میں اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ وہ عقبی جانب سے فیکٹری کی طرف بڑھنے لگا۔ احاطے کے اندر چند وہیکل ٹریلر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک ٹریلر گودام کے دروازے کے قریب کچھ اس طرح سے کھڑا کیا گیا تھا کہ دروازہ بالکل تاریکی میں آگیا تھا اور یہ وہی دروازہ تھا جو گرنڈلے نے چوری کے لیے منتخب کیا تھا۔ سام نے گھڑی دیکھی، پونے چار بج چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ پروگرام کے مطابق گرنڈلے پولیس کو الیکٹرک کمپنی میں ہونے والی چوری کی اطلاع دے رہا ہوگا جو وہاں سے دو میل کے فاصلے پر تھی تاکہ گشتی پولیس کا دھیان دوسری طرف ہوجائے۔ سام دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگیا اور گودام کے دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک بڑی سی مشین کے سائے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

چند ساعتوں کے بعد گرنڈلے اور کوسٹا دبے پاؤں گودام کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ دونوں فیکٹری کے دفتر کی طرف سے آرہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چوکیدار کا بندوبست کرچکے تھے۔ سام نے اپنا بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ ایک ثانیے کے بعد دروازے کے قریب سے ہلکی سی کلک کی آواز آئی پھر لوہے کا بھاری دروازہ مدھم آواز کے ساتھ کھل گیا۔ سام آنکھیں پھاڑ کر دروازے کی جانب گھورنے لگا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ دونوں آدمی اندر داخل ہوچکے تھے اور اندر سے دروازہ بند کرلیا گیا تھا۔

سام نہایت بے تابی سے ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جوش اور ہیجان کے باعث اس کا گلا خشک ہورہا تھا۔ ناگہاں اس کے ہونٹوں پر پُراعتماد مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اس کارروائی میں یک گونہ لذت محسوس کرنے لگا۔ لذت کا یہ احساس اس کے شعور پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ احساسِ فرض، خودغرضی پر غالب آگیا تھا۔ پھر وہ ایک مستعد اور فرض شناس پولیس افسر کی طرح عمارت کے سامنے کے حصے کی جانب بھاگتا چلا گیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ ایک بغلی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر عمارت کے اندر داخل ہوگیا اور مختلف کمروں سے ہوتا ہوا چوکیدار کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اندر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ ریڈیو پر ہلکی موسیقی نشر ہورہی تھی، قریب ہی چوکیدار کی لاش پڑی تھی جس کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔ سام نے فی الفور ریسیور اٹھایا اور پولیس ہیڈکوارٹرز کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے سارجنٹ کریمر کی خوشگوار آواز سنائی دی۔

''میں لیفٹیننٹ سام بول رہا ہوں، کریمر۔ پامر روڈ پر واقع بائن کارپوریشن کے گودام میں اس وقت چوری کی واردات ہورہی ہے۔ فی الفور کچھ آدمی یہاں بھجوادو۔''

”اوکے سر!“ کریمر نے تیزی سے جواب دیا۔
”واردات دو نامی گرامی چور بل گرنڈلے اور رچ کوستا کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں مال مسروقہ کے ساتھ پامر روڈ کے مشرق میں روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کے پاس چوری کی ایک کار ہے جس کی ڈکی میں نشہ آور دوا بھری ہوئی ہوگی۔ گرد و نواح کی تمام سڑکوں کو گھیرے میں لینے کا انتظام بھی کرو۔“
”یس سر...“ سارجنٹ نے فرمانبرداری کے ساتھ کہا۔
سام نے ریسیور رکھ دیا اور ایک نظر چوکیدار کی لاش پر ڈال کر تاریکی میں لپٹے ہوئے گودام کی طرف بھاگا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور وہ بے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ گرنڈلے اور کوستا اپنا کام مکمل کر چکے تھے اور دروازے سے باہر نکلنے ہی والے تھے۔ دونوں نے بیک وقت سام کو دیکھ لیا۔
”جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔“ سام نے گرج کر کہا۔ ”ورنہ میں تم دونوں کو بھون کر رکھ دوں گا۔“
سام بڑے ڈرامائی انداز میں قدم جماتا ہوا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ گرنڈلے کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے اور کوستا حیرت زدہ سا تھا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے پولیس کے چنگل میں آجائے گا۔
”لیفٹیننٹ سام! تم کیا کرنے والے ہو؟“ گرنڈلے نے پوچھا۔
”تم دونوں کو گرفتار کروں گا۔ پھر بعد میں تمہارا شکریہ ادا کروں گا کہ تم نے کوستا کو گرفتار کروانے میں میری مدد کی۔“ سام نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”سازشی کتے۔“ کوستا نے بڑی پھرتی سے کمر میں چھپا ہوا بڑا سا چھرا نکال لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پانچ چھ کاری ضربیں لگا کر گرنڈلے کو ٹھنڈا کر دیا اور اس سے پہلے کہ کوستا فرار ہونے کی کوشش کرتا، سام نے گولی چلا کر اسے زمین چومنے کے لیے مجبور کر دیا۔
اتنے میں کہیں سے سائرن کی آواز سنائی دی۔ شاید سارجنٹ کریمر اس کی مدد کو آپہنچا تھا۔ لیفٹیننٹ سام مطمئن ہو کر ان دونوں لاشوں کے درمیان کھڑا ہو گیا اور سارجنٹ کریمر کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ سام کاؤنٹر سے ملحقہ ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صبح شائع ہونے والے ایک اخبار کا ضمیمہ تھا جس میں اس چوری کی واردات اور لیفٹیننٹ سام کے کارنامے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ سام آج کے دن بہت خوش تھا۔ ایک طرف اس نے گرنڈلے جیسے بلیک میلر سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اگر وہ زندہ رہتا تو ایک نہ ایک دن اسے ضرور ہتھکڑی پہنوا دیتا۔ دوسری طرف اس کے اس کارنامے کو سب نے سراہا تھا اور اس کے کیپٹن بننے کے بڑے روشن امکانات تھے۔
اچانک ہیر اللہ کے آفس کا دروازہ کھلا۔ کیپٹن ہیر اللہ دروازے سے باہر نکلا اور لیفٹیننٹ سام کو ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھ کر رک گیا۔ اس نے اشارے سے سام کو اپنے آفس میں آنے کو کہا۔ سام تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہیر اللہ کے آفس میں داخل ہو گیا۔
”یس سر“ وہ بڑے مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہو کر بولا۔
کمرے میں سارجنٹ کریمر کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی جس پر لیفٹیننٹ سام نے نظر ڈالنے کی کوشش نہ کی البتہ سارجنٹ کریمر کے پاس ہتھکڑی دیکھ کر وہ چونکا ضرور۔
کیپٹن ہیر اللہ نے ریوالور نکال کر میز پر رکھا۔ میز پر ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی رکھا ہوا تھا پھر اس نے بڑی تیز نظروں سے لیفٹیننٹ سام کی طرف دیکھا اور سارجنٹ کریمر کو اشارہ کیا۔
”لیفٹیننٹ سام تم گرفتار کیے جاتے ہو۔ مجرموں سے تعاون کرنے کے سلسلے میں۔“ کیپٹن نے ریوالور ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔
”لیکن ...“ لیفٹیننٹ سام ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سارجنٹ کریمر نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔
”یہ سب جھوٹ ہے۔ لوگ میری ترقی دیکھ کر جل گئے ہیں۔“ سام نے جھلا کر کہا۔
”سام، ان سے ملو۔“ کیپٹن ہیر اللہ نے ادھیڑ عمر عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مقتول گرنڈلے کی بیوی ہیں اور یہ اپنے ساتھ کچھ ایسے ثبوت لائی ہیں کہ ہم تمہیں گرفتار کرنے پر مجبور ہیں۔“
گرنڈلے کی بیوی کا نام سن کر لیفٹیننٹ سام پر بجلی سی گری۔ وہ گرنڈلے کی بیوی پر ایک نظر ڈالنا چاہتا تھا لیکن نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور پانچ سال قبل کہے گرنڈلے کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔
”یاد رکھو...... اگر میں تمہاری گولی کا شکار ہو گیا تو میری بیوی ہمارے گٹھ جوڑ کی اطلاع پولیس کو کر دے گی......“

✖✖✖

مرد ہے

عبدالرب بھٹی

حسنِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ... اس حقیقت سے اگرچہ انکار نہیں ہے مگر جب کوئی ایک دوسرے کی ذات کی نفی کا عہد کرلے تو نہ رنگ باقی رہتا ہے نہ تصویر کے نقش... اور جب بصارت ہی دھندلی ہوجائے تو کوئی منظر صاف کیسے نظر آسکتا ہے۔

زمانے کی دھوپ پر سایا کرنے والے رشتے کا الگ انداز

سیما، ہاؤس وائف ہی نہیں بلکہ ایک "ورکنگ لیڈی" بھی تھی۔

وہ ایک پرائیویٹ ادارے میں معمولی سی پوسٹ پر ملازم تھی۔ اس کا کام فائلنگ، ٹائپنگ اور نوٹس لینا اور انھیں کمپوز کرنا ہوتا تھا۔ پھر ان سب کی ڈسک بنا کر نمبرنگ اور ترتیب دے کر سنبھالنا اور بعد میں ان کے پرنٹس نکال کر ان سب کو "ہارڈ کاپی" کے طور پر بھی ریکارڈ کے لیے رکھنا ہوتا تھا۔ یوں ان سارے امور کے علاوہ اسے کچھ اضافی ذمے داریاں

بھی نمٹانا پڑتی تھیں۔

دفتر کا وقت صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک کا ہوتا اور دو بسیں بدل کر جب وہ تھکی ٹوٹی گھر آتی تو چھ، ساڑھے چھ بج ہی جاتے تھے۔ اکثر اسے راستے میں اتر کر کچھ سودا سلف بھی لینا پڑتا۔ یا کچھ ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں۔ یہ سب ڈھوتی ہوئی جب وہ گھر پہنچتی تو کافی دیر تک کسی زندہ لاش کی طرح ایک ہی جگہ بیٹھی رہتی۔

گیارہ سالہ نیہا اسے پانی کا گلاس لا کر تھما دیتی، دس سالہ منیر ماں کو دیکھتے ہی اس کی جانب بڑھتا، ماں سے لگ کر ذرا دیر گول مول ہوتا۔ سیما بے چاری خود تھکن سے چور ہوتی، وہ اسے بس ایک ذرا چھو لیتی۔ منیر بھی اسے ایک ذرا "چھو" لینے کا عادی ہو چکا تھا اور پھر وہ گود سے اتر کر دوبارہ اپنے بوسیدہ کھلونوں سے کھیلنے میں مگن ہو جاتا۔

کسی ریلوے اسٹیشن کے قریب میں ہی ایک آٹھ منزلہ بوسیدہ اور سیم کی ماری، جگہ جگہ سے پلاستر اکھڑی بلڈنگ تھی اور اس میں بنے کبوتر کی کابک جیسے چھوٹے چھوٹے سستے فلیٹس...... اسی سیلن زدہ بلڈنگ میں کرائے کا یہ چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ فقط دو کمرے تھے اور ایک چھوٹا سا لاؤنج ساتھ ہی کچن۔ پاس ہی ریلوے اسٹیشن ہونے کی وجہ سے ہر وقت انجنوں کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں، لوگوں کا شور اور ریل گاڑی کی گھڑ گھڑاتا شور۔

وہ اس وقت بھی تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ دروازہ ظہیر نے کھولا تھا۔ بیوی کا تھکا ہارا چہرہ اور اس کی نڈھال سی حالت دیکھتے ہی وہ اندر ہی اندر کڑھتا اور اس سے شاپر لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا، مگر سیما اس پر توجہ دیے بغیر اندر آ جاتی اور شاپر پاس ہی دھری پڑی ایک پرانی سی چھوٹی تپائی پر پھینکنے کے انداز میں رکھتی تو کچھ چیزیں نیچے گر جاتیں۔ ایسے میں نیہا لپک کر انہیں سنبھالنے لگتی۔

ظہیر اسے پانی کا گلاس بھر کے دے دیتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ بیوی سے بات نہ کرے اور اس کے سامنے بھی زیادہ نہ رہے...... یوں وہ...... اندر کمرے میں جانے لگا تو سیما نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اندر جا چکا تھا۔ اس کا پارہ تو چڑھ جاتا تھا مگر اس میں اتنی ہمت ہی کہاں تھی کہ اسے کچھ کہتی۔ یہ کام وہ تھکن اتارنے اور گھر کے کام نمٹانے کے بعد جم کے کیا کرتی تھی۔

"ہونہہ...... ہر وقت گھر پر پڑا رہتا ہے، کیسا مرد ہے میرا......" وہ ہونٹ سکوڑ کر خود سے ہی بھڑاس نکالنے لگتی۔

"مہینے میں صرف دس بارہ دن کام پر جائے گا اور چند نوٹ پکڑ کے بڑا تیر مارے گا۔ اس کے بعد آرام ہی آرام......

اور میں پورا مہینا باہر بھی کھپتی رہوں اور گھر آ کر بھی...... یہ سب کیا ہے؟ آخر میرے لیے ہی کیوں دنیا کا آرام اور سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے اور یہ میرا شوہر ہے...... یا ہمیشہ کا مہمان۔ میں کتنی بھی تھکوں، اسے بھلا اس سے کیا سروکار...... اسے ناشتے میں یہ چاہیے تو کھانے میں وہ...... اس نے تو میرے ساتھ بیاہ کیا تھا...... میری دیکھ ریکھ کا، کاروبار وفا کا بار اپنے ہو پر اٹھایا تھا۔ میرا ہاتھ تھام کر ساری عمر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا مگر یہاں تو گویا الٹ کر میرے ہی کاندھوں پر آن دھرا ہے سب کچھ۔"

جہاں سیما کی "میں" آ جاتی وہاں اس کا پارہ بھی ہائی ہونے لگتا۔ کبھی تو وہ اسی وقت ہی بھڑاس نکال لیتی تھی۔ گھر میں شور ہوتا، دو چھوٹے معصوم بچے خوف زدہ ہو کر رونے لگتے۔ ظہیر ہی انہیں سنبھالتا اور بہلانے کی کوشش کرتا۔ بیوی کو اس نے ہر طرح کا بولنے کا حق دے رکھا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی سنتا رہتا۔

اس بار جب ظہیر اس سے کترا کر کمرے میں چلا گیا، تو سیما کا جی چاہا اسی وقت اس کے لتے لینے شروع کر دے، لیکن آج وہ بہت زیادہ ہی تھکی ہوئی تھی، اس میں ہمت ہی نہ ہو سکی۔ اس نے بھی ادھار رکھ لیا اور ذرا سستانے کے بعد گھر کے کام میں لگ گئی۔

کھانا وہ دو دن کا شام میں ہی پکا لیتی تھی۔ کپڑے اتوار کو پرانی واشنگ مشین لگا کر دھوتی۔

شام میں وہ ہانڈی بنا رہی تھی۔ ظہیر کمرے سے نکلا اور اسے خاموش نظروں سے دیکھتا رہا، تب ہی سیما کی نگاہ اس پر پڑی۔ اس کا دماغ گرم ہونے لگا۔

"کچھ پیسے دو گی؟"

"اب کیا ہوا؟"

"بائیک کا تھوڑا کام کروانا ہے۔" اس نے کہا۔

"کام پر تو کہیں تم جاتے نہیں ہو، بائیک کا کام کروانے کی ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی؟" سیما نے غصے سے کہا۔

"کل جانا ہے، اسکریپ کا کام ملا ہے ڈیلی ویجز پر...... تین دنوں کے لیے......"

"بس، یہی کرتے رہنا تم...... دو دن کام اور باقی سات دن آرام......"

"میں کیا کروں، کوشش کرتا ہوں کہ کام زیادہ ملے مگر......"

"میں کیا کروں۔" سیما نے جل کر اس کی نقل اتاری۔

"بس، جو کچھ کروں میں ہی کروں......"
"تمہیں بھی تو کہا ہے کہ اپنے آفس میں چپڑاسی ہی لگوا دو۔" ظہیر نے ہولے سے کہا۔
"چپڑاسی بن کر تم کتنا کما لو گے، چند ہزار...... اور پھر مجھ پر ہی اینٹھتے پھرو گے...... تنخواہ تو مجھ سے بھی کم ملے گی۔ تمہیں کم از کم ایسی نوکری یا ایسا کام کرنا چاہیے جس سے تمہیں مجھ سے دگنی تنخواہ ملے۔" سیما بھڑاس نکالنے کے لیے تو آمادہ ہو گئی تھی۔
"مجھے اس کا پورا احساس ہے سیما کہ تم مجھ سے زیادہ کماتی ہو، زیادہ محنتی ہو، لیکن میں بھی اپنی سی پوری کوشش کرتا ہی ہوں، کبھی ادھر کبھی ادھر...... پھر بچوں کو بھی واپسی میں اسکول سے لانا لے جانا کرتا ہوں، بائیک انہی کے کام زیادہ آتی ہے۔"
"اچھا اب بچوں کا نام لے کر مجھے بلیک میل کرو گے، رعب جماؤ گے مجھ پر......" سیما نے چولہے کی آگ کم کر کے اسے آنکھیں دکھائیں۔
"تم غلط سمجھ رہی ہو۔" ظہیر حسب سابق ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں خود بھی دکھی ہوتا ہوں تمہیں اس قدر محنت کرتے دیکھتے ہوئے...... میں بھی انسان ہوں سیما! کیا میں تمہارا درد نہیں سمجھتا؟"
"درد...... ہونہہ۔" وہ شوہر کی بات پر زہر بھرے انداز سے بولی۔
"اتنا ہی میرے دکھوں کا تمہیں احساس ہوتا تو...... آج کہیں ڈھنگ کا کام کر رہے ہوتے۔"
"لاک ڈاؤن کی مصیبت کے سبب مجھے تو اب ڈیلی ویجز پر بھی زیادہ کام نہیں مل پا رہا، میں تو مزدوری بھی کرنے کو تیار ہوں مگر ملے تو......" ظہیر بھی جھلانے لگا۔
سیما جب خاموش نہ ہوتی تو ظہیر کا بھی دماغ خراب ہونے لگتا۔ دونوں میں پھر زیادہ تو تو میں میں ہونے لگتی تو...... بچے رونے لگتے یا پھر کسی ٹرین کی تیز کوکتی آواز اور پھر اس کے گزرنے کا وہی بیزار کن شور۔
دونوں کو خاموش ہونا پڑتا۔ ظہیر غصے سے پاؤں پٹختا ہوا کمرے میں چلا جاتا۔ وہ کتنا برداشت کرتا، بیوی کی ہر روز کی چخ چخ...... اسے بھی غصہ آ جاتا، حالانکہ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔
سیما لاؤنج میں ہی بیٹھی رہ جاتی...... شوہر کو کوسنے کے بعد وہ ٹرین کو کوستی رہتی۔ اسے یوں لگتا جیسے یہ روز گزرنے والی منحوس ٹرینیں بھی اس کے ارمانوں کو کچلتی ہوئی گزرتی ہوں۔

☆☆☆

اگلا دن شروع ہوتا اور اس کی وہی مشینی زندگی شروع ہو جاتی۔ دونوں بچوں کو وہ ظہیر کی ذمے داری میں دے کر گھر سے نکل جاتی تھی۔ خواہ ظہیر کو اس روز کام پر جانا ہوتا یا نہیں، پیچھے سے بچے سنبھالنا اس کا درد سر ہوتا۔
وہ خود پیدل چلتی ہوئی اسٹاپ تک آتی جہاں ہر روز اسی کی طرح کام پر جانے والے مرد و عورتوں کا ہجوم ہوتا جو اپنی اپنی بسوں کے روٹ کے منتظر ہوتے۔ اکثر اسے سیٹ نہیں ملتی تھی اور وہ...... ہینڈل تھامے کھڑے ہو کر سفر کرتی۔
بہرکیف...... اس وقت بھی وہ اپنی تقدیر کو کوستی ہوئی ریلوے ٹریک کراس کرتی جا رہی تھی۔ سامنے ایک پٹری پر مال گاڑی کی تین بوگیاں کھڑی تھیں، ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں اسے چند آوارہ لڑکے کھڑے نظر آئے۔ یہ وہی بیکار اور اوباش نوجوان تھے جو پلیٹ فارم، چائے کے اسٹال اور...... ٹریک پر آوارہ گھومتے رہتے اور آتی جاتی لڑکیوں اور عورتوں کو گھورا کرتے تھے، بلکہ اکثر تو آوازیں بھی کسنے لگتے۔
انہی میں ایک لمبا اور تگڑا سا لڑکا بھی تھا جو درمیانی عمر کا ایک اوباش نوجوان تھا۔ نہ جانے اس کا کیا نام تھا مگر وہ اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ ضرور اس کے راستے پر کسی نہ کسی آوارہ کھڑی بوگی کے دروازے پر پاؤں جھلائے بیٹھا نظر آتا اور سیما کو دیکھتے ہی جملے بازی شروع کر دیتا۔
اس کا نام شوکت عرف شوکا تھا۔ وہ سیما کو تنگ کیا کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ سیما اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی...... وہ بھی ڈھیٹ تھا اور اوباشانہ انداز میں تیسرے درجے کے گانوں کے عشقیہ شعر گنگناتا۔ سیما کو اس سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ تاہم شوکے کو ابھی تک اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہ ہوئی تھی، اس کی وجہ سیما کا اسے منہ نہ لگانا تھا۔
وہ اسٹاپ تک خاموشی سے مگر تیز تیز قدموں سے چل کر پہنچ گئی۔ اس کے بعد حسب معمول دو بسیں بدل کر وہ دفتر پہنچی اور اپنی سیٹ سنبھالی تو اس نے دیکھا کہ اس کے بازو والی میز کی کرسی خالی تھی، وہاں اس کی دوست نجمہ ہوتی تھی۔
"پتا نہیں شاید آئی نہیں ہے آج......" سیما نے سوچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی اس نے نجمہ کو آتے دیکھا اور دروازے سے نہیں بلکہ 'صاحب' کے کمرے سے...... اس کا چہرہ اترا ہوا اور پریشان بھی نظر آ رہا تھا۔
دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ دونوں کے حالات ہی نہیں بلکہ 'درد' بھی مشترک تھے، اسی لیے ان میں خوب جمتی تھی، تاہم خیالات مشترک نہیں تھے۔ اسی سبب دونوں میں بھی کبھار بحث و مباحثہ بھی ہو جاتا تھا مگر یہ دوستانہ طرز کا جھگڑا ہوتا۔ اگلے دن 'رات گئی بات گئی' والی بات ہوتی اور دونوں ہنس

ہنس کر باتیں کر رہی ہوتیں۔

رسمی سی ہائے، ہیلو کے بعد سیما نے ہی اس کی خیریت دریافت کی۔

''کیا ہوا...... تم پریشان نظر آرہی ہو؟ کیا صاحب نے ڈانٹ دیا؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے مگر یار......! میں کسی اور وجہ سے پریشان ہوں۔'' نجمہ یہ کہتی ہوئی اپنی کرسی پر براجمان ہوگئی۔

''کیا پریشانی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ آصف بہت بیمار ہے آج کل ...... اسی کی فکر کھائے جارہی ہے۔''

''کیوں، کیا ہوا اسے ......؟ بھلا گھر بیٹھے مرد کو کیا بیماری ہوسکتی ہے؟'' سیما کے لہجے میں طنز تھا۔ ایسے میں اس کے چشم تصور میں اپنے شوہر ظہیر کا چہرہ گردش کرنے لگا تھا۔

آصف، نجمہ کا شوہر تھا۔ اسی کی زبانی سیما کو معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی ...... بس موسمی تیتروں کی طرح ...... کمایا کرتا تھا، بلکہ کمانے سے زیادہ وہ کمائی تلاشنے میں پورا مہینا گزار دیتا۔

''یہ بات نہیں یار ......!'' نجمہ نے اس کے طنز کو نظر انداز کردیا اور آگے بولی۔ ''بے چارے کو تو جو بھی کام ملتا ہے، وہ کرتا ہی ہے۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ وہ عزت نفس کے معاملے میں کس قدر حساس ہے، مگر ......''

''تو اب تم کیا اس کی خدمت گزاری کے لیے چھٹیاں لینا چاہتی تھیں؟'' سیما نے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں! مگر باس تو چھٹی کے نام پر ہی برہم ہوگئے، کہنے لگے، تنخواہ کٹوا لینا۔'' نجمہ بولی۔ ''مجبوراً جب میں نے اس کی بھی ہامی بھری تو پھر بھی انکار کردیا۔''

''ہوا کیا ہے آصف کو؟'' سیما نے تکلفاً پوچھ لیا۔

''موسمی۔ بخار ہے۔ دوا لا یا تو تھا بے چارہ ...... مگر میں سمجھتی ہوں کہ میرا اس کے پاس ہونا بھی ضروری ہے۔''

''چھوڑو بھی ...... وہ بچہ تھوڑا ہی ہے، کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو اور پھر تنخواہ بھی کٹے گی۔''

''پھر بھی ......''

''کیا پھر بھی......! میرا مرد بھی ایسا ہی ہے، سارا دن گھر پڑا اینڈتا رہتا ہے۔ انہیں تو بیماری کا بہانہ ملے، اپنی بیکاری اور ہڈحرامی کی کوفت چھپانے کا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتی ہوں کہ ہماری جیسی بیویوں کے شوہروں کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔''

''توبہ کرو، کیا بک رہی ہو۔'' نجمہ تڑخ کر بولی۔ ''شوہر جیسا بھی ہو، وہ صرف شوہر ہی نہیں ایک مرد بھی ہوتا ہے سیما!''

''مرد ...... ہونہہ ......''

''شوہر جیسا بھی ہو اسے مجازی خدا کا درجہ حاصل ہے سیما! خدا ...... ایک تحفظ کا نام ہے ...... ایک روحانی تحفظ کا۔ سر پر قائم ہے تو دنیا ہے، نہیں تو کچھ بھی نہیں ...... اور پھر ہمارے مردوں میں برائی کیا ہے؟ بس، ایک کام نہ کرنے کی ہی تو خرابی ہے، دیکھا جائے تو وہ بھی سسٹم کی خرابی ہے ان کی نہیں ......''

''اچھا بس! تم سدا کی ستی ساوتری ہی رہنا۔ ہم تو کولہو میں جتی ہوئی تب۔'' سیما چڑ کر کہتی۔

''یہ بات نہیں، ہم خواتین دراصل شوہروں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھنے کی عادی ہوچکی ہیں اور وہ ہے، کمائی کرنے والا بیل ...... بس، وہ کمائی کرکے لائے تو ٹھیک ہے، لیکن شوہر کو صرف اسی ایک تناظر میں دیکھنا غلط ہے۔ وہ اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔''

اس کی بات پر سیما نے بیزاری سے اپنے سر کو جھٹکا۔

''اچھا ایک بات بتاؤ سیما!'' نجمہ کچھ سوچ کر دوبارہ بولی۔ ''جب تم دفتر آتی ہو تو تمہیں گھر اور بچوں کی فکر ہوتی ہے؟''

''مجھے کیوں فکر ہونے لگی بھئی؟'' سیما اس کی بات کا مطلب سمجھے بغیر بولی۔ ''گھر میں میاں ...... مشٹنڈے جو ہوتے ہیں۔''

''یعنی تمہیں اس طرف سے بے فکری ہوتی ہے نا!'' نجمہ بولی۔

''ظاہر ہے، اب وہاں کی فکر بھی کروں کیا۔'' سیما کے جواب نے نجمہ کو اپنا ماتھا پیٹنے پر مجبور کردیا اور وہ چپ ہورہی۔

☆☆☆

اس روز سیما دفتر سے واپس لوٹ رہی تھی۔ جمعہ تھا اور ڈیوٹی کا ہاف ڈے بھی۔ آخری بس سے اتر کر وہ حسب معمول گھر کو پیدل لوٹ رہی تھی۔ ٹریک پار کرنے کے دوران اس کا سامنا پھر اسی لوفر شوکے سے ہوگیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنے تین چار بدمعاش ساتھیوں سمیت اس کے پیچھے ہولیا۔ اس مقام پر ستاتا تھا۔

سیما کو لگا آج اس بدمعاش کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں، وہ گھبرا گئی تھی کیونکہ شوکے نے اس بار اس کا نام تک لے کر پکار لیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب بڑھنے لگی، خوف سے اب اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ شوکا اس کا راستہ روکنے کی کوشش میں تھا اور اس کے تیوروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آج سیما کو ہاتھ ضرور لگانے کی کوشش کرے گا کہ اچانک سیما کو سامنے سے ظہیر آتا نظر آیا اور اس نے سکون کی گہری سانس

لی۔ اس کے ہمراہ...... نیہا اور منیر بھی تھے۔ وہ شاید انہیں اسکول سے واپس لا رہا تھا۔ آج شاید انہیں کچھ دیر ہو گئی تھی۔

دونوں بچے ماں کو دیکھتے ہی خوشی سے شور مچا کے اس کی جانب لپکے۔

”امی آ گئیں...... امی آ گئیں۔“ ظہیر بھی اس کی جانب بڑھا۔ ادھر شوکا اور اس کے ساتھی سیما کے خاصے قریب آ چکے تھے۔ تب ہی سیما کو اپنے کانوں میں شوکے کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”لے باپ، چلو ادھر سے...... اس کا مرد آ گیا۔“ اور پھر سیما نے دیکھا کہ اوباش غنڈوں کا ٹولا فوراً ہی اپنا راستہ بدل گیا۔

ایسے میں سیما کے دماغ کو ہی نہیں بلکہ دل کو بھی ایک جھٹکا لگا تھا۔

☆☆☆

اس روز بھی وہی پرانی باتوں پر بہت جھگڑا ہوا اس قدر کہ ظہیر اسے خودکشی کی دھمکی دے کر گھر سے نکل گیا۔

”میں اب تنگ آ گیا ہوں اس روز کی چخ چخ سے...... بہتر یہی ہے کہ کسی ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لوں......“

سیما نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ جاتے وقت اس نے پھر بھی اس کا دل جلانے کے لیے یہ تک بھی کہہ دیا۔

”تمہارا میرے لیے ہونا نہ ہونا برابر ہے۔“

اس دن چھٹی تھی اور اسی لیے جھگڑے کی ابتدا صبح میں ہی ہو گئی تھی۔ سیما نے ظہیر کی دھمکی کی کوئی پروا نہ کی تھی اور گھر کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

دونوں بچے سہمے ہوئے تھے۔ وہ بار بار ماں سے باپ کے بارے میں پوچھتے کہ ابا کدھر چلے گئے؟ سیما انہیں کوئی جواب نہ دیتی۔

اسی طرح دوپہر ہو گئی۔ دو بار وہ ٹرین گزرنے کی آوازیں سن چکی تھی۔ سہ پہر ہو گئی مگر ظہیر نہیں آیا۔ سیما کو تھوڑی فکر ہوئی لیکن پھر بھی اس نے کوئی خاص پروا نہ کی۔ آخر شام ہوئی تو اس کے اندر ہول سا اٹھنے لگا، پھر جب تیسری اور چوتھی دفعہ ٹرین گزرنے کی مخصوص خراش آواز ابھری تو...... کئی بار سیما کا دل کسی خدشے تلے کانپ کر رہ گیا۔

”امی، ابو کہاں گئے؟ ابھی تک نہیں آئے۔ کل صبح ہمیں کون اسکول لے جائے گا، کون ہم سے ملنے گا؟ آپ تو سارا دن...... دفتر میں ہوتی ہیں، شام کو گھر آتی ہیں۔“ یہ بڑی نیہا تھی۔ سیما کے پاس اس کے معصوم سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

پھر شام گہری ہو کے رات میں بدلنے کے تیور دکھانے لگی تو سیما...... کو اچانک قریب کے فلیٹوں سے عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”اری بھاگو...... ارے کیا ہوا؟ کیا کہا، کوئی ٹرین کے نیچے آ گیا ہے۔ اف اللہ رحم کرے یہاں تو آئے روز یہ حادثے ہوتے ہیں۔“

یہ سن کر سیما کا دل بری طرح دہل کر رہ گیا۔ ایکا ایکی اسے یوں لگا جیسے...... اس کے سر کی چادر چھن گئی ہو، اس کے گھر میں تاریکی اتر آئی ہو...... اس کا سائبان جل کر خاکستر ہو گیا ہو...... سہاگ کی لالی خوں رنگ ہو گئی ہو۔ ایک ہی وار سے وجود دو ٹکڑے کر دیا گیا ہو، گھر سونا ہو گیا ہو اور...... اور...... وہ جیسے بے آسرا ہیر بازار کھڑی ہو، ایسے میں اسے غنڈے شوکے اور اس کے اوباش ساتھیوں کے قہقہے سنائی دے رہے ہوں۔

اسے یوں لگا جیسے کوئی پہاڑ سا بوجھ اس کے ناتواں کاندھوں پر آن گرا ہو...... اور جس کے تلے وہ دبتی جا رہی تھی۔

تب اس نے نہ دوپٹا لیا، نہ پاؤں میں جوتی پہنی اور ہراساں سی باہر نکلی تو عورتوں مردوں کے ہجوم کو کھڑے پایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوا اور آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”کک...... کون ٹرین کے نیچے آ گیا...... ہم...... مجھے بتاؤ...... کون تھا وہ......“ اس نے ہراساں اور دیوانگی کے عالم میں ہر ایک سے پوچھنا شروع کر دیا۔

تب ہی اسے عقب سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔

”کوئی نہیں آیا...... کالج ہاؤس کی کوئی گائے ٹرین کی زد میں آئی ہے۔“

اس نے تیزی سے مڑ کے دیکھا، اس کے پیچھے ظہیر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

شوہر کو زندہ سلامت دیکھتے ہی سیما کو یوں لگا جیسے اس کی جنت خاکستر ہونے سے بچ گئی ہو، پہاڑ سا ان دیکھا بوجھ سرک گیا ہو، اس کے اندر دور تک سکون ہی سکون پھیل گیا۔

”چلو اندر...... اچھا نہیں لگ رہا، نہ دوپٹا اور نہ جوتی......“ ظہیر نے اسے پیار سے تھام کے کہا اور دونوں اندر آ گئے۔

بچے باپ کو دیکھتے ہی اس کی جانب خوشی سے چیخیں مار کے لپکے۔ سیما نے سر جھکا رکھا تھا۔ ظہیر نے اس کا چہرہ اٹھایا تو وہ نمناک ہو رہا تھا۔ ظہیر ہولے سے اس کا شانہ تھپتھپا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔“ پیچھے سے سیما نے آواز دی تو وہ محبت بھرے جذبات تلے لرز رہی تھی۔

⌘⌘⌘

ساشا

[illegible]

دسواں حصہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کی "آگاہ" رہنے کی صلاحیت کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور آنکھوں میں سنہرے خواب تھے' جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

طاقت کے گھمنڈ [illegible] کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے [illegible] سنسنی خیز سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ساشا کا تعلق ڈاکوؤں کے ایک ایسے گروہ سے ہے جس کا سردار اس کا اپنا باپ تھا۔ ساشا کا باپ ڈاکو بننے سے قبل ایک عرب امیر کے دربار سے وابستہ تھا اور امیر کے بیٹے کے اتالیق کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے دوران ہی اسے کچھ ایسے بدترین حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ عزت دار زندگی چھوڑ کر ڈاکو بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ مختلف قومیتوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ایسا گروہ ترتیب دیتا ہے جو طویل عرصے کے لیے کسی ایک جگہ سکونت اختیار نہیں کرتا۔ ایسے گروہ کے درمیان رہ کر جنگلوں اور بیابانوں میں پرورش پانے والا ساشا ایک ایسے نوجوان کے طور پر سامنے آتا ہے جسے فنون حرب اور سخت جانی میں کمال حاصل ہے اور جو طرح طرح کی زبانیں بولنے اور سمجھنے میں مہارت رکھتا ہے۔ گروہ کے بیشتر افراد کی رائے کے مطابق وہ اپنے باپ کا بہترین جانشین ہے لیکن اس منظم گروہ میں ایک ایسا سازشی ٹولہ بھی موجود ہے جو ساشا کی جگہ اپنے آدمی کو سردار دیکھنا چاہتا ہے۔ ساشا کے باپ کی موت پر اس ٹولے کو سر اٹھانے کا موقع ملتا ہے اور سرداری پر قبضے کے لیے پورا زور لگایا جاتا ہے۔ ان نامساعد حالات میں ساشا کو اپنی زندگی بچانے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ دشمنوں سے چھپتا چھپاتا اور بھاگتا ہوا وہ ایک بااثر امیر کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اسے مشکوک جان کر قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس قید خانے میں اپنی زبان دانی کی صلاحیت کی بنیاد پر وہ ایک اتفاق کا فائدہ اٹھا کر امیر کی نظروں میں سرخرو ہونے کا موقع حاصل کر لیتا ہے۔ امیر کا قرب حاصل کرنے کے بعد جہاں وہ کچھ اہم رازوں سے واقف ہوتا ہے، وہیں امیر کی خوبصورت بیٹی کا بھی اسیر ہو جاتا ہے۔ امیر کی اپنے چھوٹے بھائی سے شدید دشمنی اور اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ اس پراسرار خزانے کا راز ہے جو انہیں نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اپنے باپ سے ملا ہے۔ ایک معین مدت مکمل ہونے کے بعد اس خزانے کا راز کھلنے والا ہے اور امیر بڑا بھائی ہونے کے ناتے خود کو خزانے کے راز کا حق دار سمجھتا ہے لیکن حقیقتاً اس کی بے راہ روی اور بداخلاقی کے باعث اس کا باپ اسے اس حق سے محروم کر کے چھوٹے بیٹے کو یہ حق تفویض کر دیتا ہے۔ خزانے کی تلاش میں پیش آنے والی دشواریوں اور پیچیدگیوں سے گزرتا ساشا کئی ذیلی معاملات میں بھی الجھا رہتا ہے۔ ادھر غار سے برسرِ پیکار مسلمانوں کا ایک قافلہ بہادر داؤد کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ داؤد ساتھیوں سمیت ایک بستی میں پڑاؤ ڈال دیتا ہے تاہم چند گڑبڑوں میں شامل سارہ نامی لڑکی اور راہباؤں کے پیچھے کچھ لوگ انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش میں ہیں۔ بستی میں قیام کے دوران بھی انہیں کافی نقصان اٹھانا پڑا جس کی وجہ سے وہ سردار پر شک کرتے ہیں۔ ادھر ساشا پڑاؤ کے دوران انسانی آنکھ سے مشابہ ایک غار کی طرف بڑھتا ہے مگر وہاں اسے سانپ ڈس لیتا ہے اور باہر سے کوئی غار کا دہانہ بند کر دیتا ہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے اور اسے ہوش آتا ہے تو اسے تلاوت قرآن سنائی دیتی ہے۔ سلیمان اور فیرس اس کی تیمارداری کر رہے ہوتے ہیں۔ ادھر داؤد قافلے سمیت بستی میں پھنس جاتا ہے۔ سردار کو قتل کر دیا جاتا ہے اور سردار زادی اسے مخالف لوگوں کی سرکوبی کے لیے اپنا کردار ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ داؤد مخالف گروہ کے پاس ان کا ہمدرد بن کر پہنچ جاتا ہے۔ داؤد کے ساتھی لطیف کو مار دیا جاتا ہے۔ داؤد وہاں سے نکل کر سردار زادی کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ادھر ساشا اسلام قبول کر لیتا ہے۔ سارہ اپنے پاس موجود ہیرا داؤد کے حوالے کر کے ان کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ حاطب ہیرا پہچان کر اسے سارہ کو طلب کرنے کا کہتا ہے داؤد انجانے خوف سے لرز جاتا ہے۔ وہ سارہ کو مجرم کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

قہوہ خانے میں ایک میز پر تنہا بیٹھ کر قہوہ پیتا وہ شخص محمد صالح تھا لیکن اپنی موجودہ وضع قطع کے باعث پہلی نظر میں شناخت نہ کیا جاتا تھا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی تراش کر اس قدر مختصر کر لی تھی کہ ٹھوڑی اور رخساروں پر موجود بال کنگھی کے دانتوں کی طرح بکھرے نظر آتے تھے۔ گلے میں صلیب لٹکی ہوئی تھی اور سر کے الجھے ہوئے اور قدرے گرد آلود بال اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ کہیں سے سفر کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہے۔ اس کے قدموں میں رکھا سفری تھیلا بھی اس کے مسافر ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ظاہراً وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز سر جھکائے خاموشی سے قہوہ پی رہا تھا لیکن اس کی تمام تر حسیات پوری طرح چوکنا تھیں۔ وہ واقف تھا کہ قہوہ خانے میں اس کے اردگرد کی میزوں پر موجود گاہکوں میں سے بیشتر بوڑھے اور ناتواں مرد شامل تھے جو سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے

گفتگو کر رہے تھے۔

''سنا ہے سردار مراد کی بیٹی اپنے جانبازوں کے ساتھ مل کر ثوبان کے خلاف سخت مزاحمت کر رہی ہے۔'' صالح نے اپنے قریب ترین میز پر موجود چار بوڑھوں میں سے ایک کی سرگوشی سنی۔

''اس کی مزاحمت جلد دم توڑ جائے گی۔ ہمارے لوگوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا ہے۔ وہ تیروں اور تلواروں کا نشانہ بننے سے بچ بھی گئے تو بھوک کا عفریت انہیں کھا جائے گا۔'' جوش سے بولتے دوسرے بوڑھے کی آواز قدرے بلند تھی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ ثوبان اصل میں حاکم قابوس کا وفادار ہے اور مسلمانوں کے درمیان گھس کر ان کی جڑیں کاٹ رہا ہے؟'' اس بار آواز اتنی مدھم تھی کہ اسے سننے کے لیے صالح نے اپنی سانس تک روک لی۔

''یقیناً یہ سچ ہے۔ اس علاقے میں جتنی بھی مسلمان بستیاں موجود ہیں اس میں سردار مراد کی بستی کے لوگ ہی سب سے اچھی حالت میں ہیں۔ ہم نے ان لوگوں پر فتح حاصل کر لی تو سمجھو اردگرد کی کسی دوسری مسلمان بستی کے لوگوں میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہو سکے گی۔'' یہ وہی پرجوش بوڑھا تھا جس کی آواز صالح کے کانوں میں سب سے صاف پہنچی تھی۔

''لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مسلمانوں کے زیر ہونے سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ ہم یہاں اتنی قلیل تعداد میں ہیں کہ کتنی بھی کوشش کر لیں بہرحال ان پر حکمرانی تو نہیں کر سکتے۔'' اس چوتھے بوڑھے نے گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا تھا۔ صالح نے اپنی خالی ہو جانے والی پیالی میں قہوہ خانے کے ملازم کو مزید قہوہ انڈیلتے دیکھ کر اس کا یہ سوال سنا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جب تک اپنی پیالی میز پر الٹ کر نہیں رکھے گا ملازم ہر بار اس کی خالی ہو جانے والی پیالی کو بھرتا رہے گا۔

''براہ راست حکمرانی کرنا ضروری بھی نہیں ہے۔ ہم ہندوؤں کو بھی ان پر مسلط کر سکتے ہیں۔'' رعونت سے ادا کیے گئے اس جملے پر صالح نے پیالی میں قہوہ انڈیلتے ملازم کے چہرے کی رنگت کا تغیر صاف محسوس کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے بہت مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا ہو۔

''اس طرح تو اصل فائدہ ہندو حاصل کر لیں گے۔''

''نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔ ہمارے احسان کے بدلے انہیں حاصل ہونے والے فوائد میں ہمیں شریک رکھنا ہوگا۔''

وہاں پوری منصوبہ بندی کی جا چکی تھی۔

''ہوں... اچھی حکمت عملی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اس مقام پر بیٹھ کر مزید اس موضوع پر گفتگو سے پرہیز کرنا چاہیے۔'' کم گو بوڑھے نے اپنے سوال کا جواب پا کر اطمینان کا اظہار کیا اور ساتھ ہی ساتھیوں کو موضوع کی حساسیت کا بھی احساس دلایا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی بات کو سمجھا اور ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اب وہ آپس میں خوش مذاق کر رہے تھے۔ صالح پہلے کی طرح اب بھی بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنی پیالی میں موجود قہوے کی چسکیاں لیتا رہا۔ پیالی میں قہوہ ختم ہونے کے بعد بھی اس نے پیالی کو میز پر الٹ کر نہ رکھا۔ قہوہ خانے کا پھرتیلا ملازم اس کی پیالی خالی دیکھ کر لپکا آیا۔ ابھی وہ پیالی میں قہوہ ڈالنے کے لیے ہاتھ بلند ہی کر رہا تھا کہ صالح نے اشارے سے اسے روک دیا۔

''مسافر ہوں اور آرام کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہو؟'' خالی پیالی کو الٹ کر رکھتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں... آپ یہاں سے نکل کر بائیں جانب چلیں گے تو بیس پچیس قدم کے فاصلے پر ہی آپ کو یوشع کی سرائے نظر آ جائے گی۔'' اس نے اطلاع فراہم کی اور پلٹنے لگا۔

''اصل میں بات یہ ہے دوست کہ میرے پاس کسی سرائے یا مسافر خانے میں رہائش کی گنجائش نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس بستی کے کسی رحم دل اور فیاض شخص سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع مل جائے۔'' اس نے جھکی آنکھوں سے یوں اپنا مدعا بیان کیا جیسے اپنی مفلسی کے اظہار پر بے حد شرمندہ ہو۔ نوجوان اس کی بات سن کر ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا، پھر آہستہ سے بولا۔

''اس قہوہ خانے کی بالائی منزل پر میرے لیے ایک کمرا مختص ہے۔ وہ کمرا زیادہ آرام دہ نہیں ہے لیکن آپ جب تک چاہیں وہاں قیام کر سکتے ہیں۔''

''شکریہ دوست! کمرے کے آرام دہ نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے بس اتنا کافی ہے کہ مجھے ایک چھت کے نیچے پناہ مل جائے۔'' صالح نے خوش دلی سے جواب دیا لیکن اب ملازم اس کے بجائے کسی اور طرف متوجہ تھا۔ اس نے اشارے سے ایک کونے میں بیٹھے دس گیارہ سالہ لڑکے کو قریب بلایا اور اپنے ہاتھ میں موجود ساوار اسے تھما کر ہدایات دینے لگا۔

''میرے ساتھ آیئے۔ میں آپ کو کمرے تک پہنچا دیتا ہوں۔'' بااخلاق لہجے میں کہتے ہوئے اس نے خود ہی جھک کر صالح کے قدموں کے پاس پڑا اس کا تھیلا اٹھالیا۔

''تم زحمت نہ کرو۔ میں خود اٹھالیتا ہوں۔'' صالح نے اسے ٹوکا۔

''اب آپ میرے مہمان ہیں اور مہمان کی خدمت مجھ پر فرض ہے۔'' ملازم نے جواب دیا اور چل پڑا۔ اس کی ٹانگ میں لنگ تھا اور وہ دائیں جانب قدرے جھک کر چل رہا تھا لیکن انداز ایسا تھا جیسے اسے اپنے اس جسمانی نقص سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ صالح خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا ہوا لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر پہنچ گیا۔

''یہ میرا غریب خانہ ہے۔ آپ یہاں اطمینان سے آرام کیجیے۔'' ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اپنے ساتھ اندر لے جانے کے بعد ملازم نوجوان نے اس سے کہا۔

''کیا میں اپنے میزبان کا نام جان سکتا ہوں؟'' صالح نے مختصر اسباب والے صاف ستھرے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

''سارس اور آپ.....؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے صالح کی طرف دیکھا۔

''محمد صالح......'' اسے بوڑھوں کی گفتگو کے دوران نوجوان کی رنگت کا تغیر یاد تھا اس لیے جوا کھیلنے کا فیصلہ کر ڈالا۔

''تو میرا اندازہ درست تھا۔'' نوجوان نے چونکنے کے بجائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جو بات کہی اسے سن کر صالح حیران رہ گیا۔

''کیا مطلب..... کیسے..... میں سمجھا نہیں؟''

''سمجھنا زیادہ مشکل نہیں۔ آپ نے بے شک عیسائیوں کا روپ دھار رکھا ہے لیکن کچھ عادتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اظہار کر جاتا ہے۔ آپ نے نیچے قہوہ خانے میں قہوہ پینے سے قبل یقیناً حسب عادت بسم اللہ پڑھی تھی۔ آپ کا یہ عمل بے آواز تھا لیکن میں نے آپ کے ہونٹوں کی جنبش سے بھانپ لیا تھا۔'' وہ آنکھوں میں شوخ سی چمک لیے اسے بتا رہا تھا۔

''تم بہت خطرناک ہو۔''

''لیکن آپ کے لیے نہیں کہ دین کے رشتے سے ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔''

''یعنی تم بھی......''

''جی ہاں، میں بھی مسلمان ہوں لیکن عرصے سے سارس بنا ان کے درمیان رہ رہا ہوں۔ تفصیلات سے پھر کسی وقت آگاہ کروں گا، فی الحال تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور کس مقصد کے لیے یہاں وارد ہوئے ہیں؟''

''میں امیر ارغل کے قافلے کا مسافر ہوں۔ یہاں کے حکمران قابوس نے امیر کے چھوٹے بھائی کی بیوہ کو اغوا کروالیا ہے اور ان کی رہائی کے بدلے زرِ کثیر کا مطالبہ کیا ہے۔ امیر کو شک ہے کہ تاوان کی ادائیگی کے باوجود ان کے ساتھ کوئی دھوکا ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں حالات کا درست اندازہ لگانے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔'' اس نے اپنے بارے میں مختصراً اسے آگاہ کیا۔

''قابوس حکمران سے زیادہ ایک لٹیرا ہے جس کے لالچ نے سیکڑوں زندگیوں کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ مجھے اپنی قوم کے ساتھ ساتھ ان عیسائی نوجوانوں سے بھی ہمدردی ہے جو زبردستی قابوس کی ہوس کے جہنم میں دھکیل دیے گئے ہیں۔'' اس نے نفرت زدہ لہجے میں تبصرہ کیا اور پھر صالح کو علاقائی صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔

''تم یقیناً اپنی ٹانگ کے نقص کے باعث قابوس کے سپاہیوں میں شامل ہونے سے بچ گئے ہو؟''

''بالکل یہی بات ہے۔'' اس نے تصدیق کی اور کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ صالح خاموشی سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

''میرا خیال ہے میں تم لوگوں کی مدد کرسکتا ہوں۔'' ذرا دیر کی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا سر اٹھایا اور پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''وہ کیسے؟'' صالح پُرجوش ہوا۔

''غور سے سنو! قابوس نے اپنے سپاہیوں سمیت بستی کے ہر جوان اور صحت مند مرد کو لڑائی کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اس کے پاس اپنی قیام گاہ کی حفاظت کے لیے بھی محض چند بوڑھے اور نمائشی سپاہی ہی موجود ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اتنی اہلیت بھی نہیں رکھتا کہ تم لوگوں کو دھوکا دینے کے باوجود تمہارے قافلے کی بھرپور نگرانی کروا سکے۔ اس لیے سب سے پہلے تو تم اس اندیشے کو ذہن سے نکال دو کہ تمہاری طرف سے فوری طور پر تاوان کی ادائیگی نہ ہونے پر وہ تمہارے قافلے کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جن افراد نے شب کی تاریکی میں تمہارے قافلے پر نقب لگائی تھی، وہ بھی اب یہاں موجود نہیں ہوں گے اور انہیں بھی لڑائی میں حصہ لینے کے لیے آگے روانہ کر دیا گیا ہوگا۔''

''اس صورت حال میں یقیناً قافلے کے لیے کوئی

پریشانی نہیں ہے لیکن قابوس امیر کے بھائی کی بیوہ کو تو نقصان پہنچا سکتا ہے؟" صالح نے اسے اپنے اندیشے سے آگاہ کیا۔

"اس سلسلے میں تھوڑی سی جرأت سے کام لے کر بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں میرا بھرپور تعاون حاصل رہے گا۔"

"تم ہم پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو؟ اپنے بارے میں کچھ تو بتاؤ۔" صالح نے اصرار کیا۔

"میں سردار مراد کے دوست کا بیٹا ہوں۔ سردار مراد نے ایک زمانے میں میرے بابا کا مشکل حالات میں بہت ساتھ دیا تھا چنانچہ جب مجھے سردار کی مشکلات کا علم ہوا تو میں اپنے گھر اور علاقے کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا اور ان نصرانیوں کے درمیان رہ کر سردار کے لیے جاسوسی کرنے لگا لیکن بدقسمتی سے کچھ عرصہ قبل وہ شخص گرفتار ہو گیا جو یہاں سے سردار تک خبر پہنچاتا تھا۔ اس شخص کا حوصلہ تھا کہ اس نے شدید تشدد کے باوجود کسی پر میرا نام ظاہر نہ ہونے دیا اور خود موت قبول کر لی۔ یہاں کے مشکل حالات اور اپنے جسمانی عیب کی وجہ سے میں اس لائق نہیں رہا کہ بروقت سردار تک خبریں پہنچا سکوں لیکن بہرحال میرا دل اپنے محسن اور اپنی قوم کی مشکلات اور تکالیف پر کڑھتا رہتا ہے اور ہر اس شخص کو اپنا دوست سمجھتا ہوں جو قابوس کا دشمن ہے۔" اس نے اپنی وضاحت سے صالح کے ذہن کی ساری الجھن دور کر دی اور اس نے دوبارہ سارس کی پیشکش کی طرف گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

"تم امیر کی بیوہ کی رہائی کے سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں قابوس کی رہائش گاہ کے اندرونی نقشے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ گھریلو خدمات انجام دینے والی ایک ملازمہ میری مٹھی میں ہے جس سے رابطہ کر کے مزید معلومات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اگر تم حوصلے سے کام لو تو خود اندر جا کر خاتون کو وہاں سے رہائی دلا سکتے ہو۔ مجھے پہرے داروں کی محدود تعداد کسی بہادر کا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔" اس نے مختصراً اپنا سارا منصوبہ صالح کے سامنے رکھ دیا۔

"اگر تم اس سلسلے میں اتنے پُراعتماد ہو تو یقین رکھو کہ میں بھی قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" صالح نے اسے اپنے متعلق یقین دہانی کروائی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر رات کے کھانے پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ ابھی مجھے نیچے جا کر کام سنبھالنا ہوگا۔" وہ صالح سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔

صالح اس کے انتظار میں وقت کاٹتے ہوئے اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس نے بہت تیزی سے سارس پر اعتماد کیا تھا اور کچھ یہی حال سارس کا تھا۔ شاید حالات نے دونوں ہی فریقین کو چھان پھٹک کی الجھن میں پڑنے کے بجائے دل کی گواہی پر اعتبار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بستر میسر آجانے کے باوجود وہ سکون سے سو تو نہ سکتا تھا اس لیے ایک صاف چادر بچھا کر اپنے رب کے حضور کھڑا ہو گیا اور اسی سے مدد طلب کرنے لگا۔ اس عمل میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور دروازے پر دی جانے والی دستک پر ہی ہوش آیا۔

"کون؟" چادر سمیٹتے ہوئے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

"میں ہوں سارس..... دروازہ کھولیے۔" اس نے باہر سے جواب دیا تو صالح نے آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔

"آپ کے لیے کھانا لایا ہوں۔ کھانا کھا کر کچھ کام کی باتیں کریں گے۔" اس نے اندر آکر ایک بار پھر اپنے پیچھے دروازے کو بند کر دیا اور ہاتھ میں موجود تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ذرا دیر میں وہ دسترخوان بچھا کر اس پر کھانا چن چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ کر خاموشی سے کھانا کھایا۔ دونوں ہی اعصابی تناؤ کا شکار تھے اس لیے کھانا لذیذ ہونے کے باوجود زیادہ رغبت سے نہ کھا سکے۔

"پھر... اب کیا ارادہ ہے؟" دسترخوان سے انگلیاں صاف کرتے ہوئے اس نے قدرے بے چینی سے دریافت کیا۔

"میں تمام ممکنہ انتظامات کر چکا ہوں۔ ہم آدھی رات کے قریب قابوس کی رہائش گاہ پر جائیں گے۔ میری واقف کار خادمہ اس وقت تک شمالی دروازے پر تعینات پہرے داروں کو غافل کرنے کا انتظام کر دے گی۔ اس لیے آپ کو اندر داخل ہونے میں قطعی پریشانی نہیں ہوگی۔ اندر داخل ہونے کے بعد آپ کو صرف اتنی احتیاط کرنا ہوگی کہ اندرونی احاطے میں گشت کرنے والے کسی پہرے دار کی نظروں میں نہ آسکیں۔ وہاں سے آگے مغوی خاتون کے لیے مخصوص کیے جانے والے کمرے تک کا راستہ میں آپ کو سمجھا دیتا ہوں۔" وہ اسے زمین پر کوئلے کی مدد سے لکیریں کھینچ کر نقشہ سمجھانے لگا۔

"کیا اس تعاون کے بدلے تمہارا ہم سے کوئی مطالبہ ہے؟" سب کچھ اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد صالح

نے اس سے دریافت کیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نوجوان بہت افسردہ اور پریشان ہے اور شاید اس سے کچھ کہنے کی خواہش بھی رکھتا ہے لیکن جھجک کے باعث کہہ نہیں پا رہا۔

"مطالبہ نہیں، بس ایک خواہش ہے جسے رد کرنے کا آپ کو پورا حق حاصل ہوگا۔ انکار کی صورت میں بھی آپ خود کو میرے تعاون سے محروم نہ پائیں گے۔"

"بلاجھجک اپنی خواہش کا اظہار کر دو۔ اگرچہ میں صاحب اختیار نہیں ہوں لیکن کوشش کروں گا کہ تمہاری بہترین وکالت کر سکوں۔" صالح نے اس کی ہمت بندھائی۔

"میری معلومات کے مطابق آپ کے قافلے میں کثیر تعداد جوان اور توانا مردوں پر مشتمل ہے اور آپ سب ہی بھی مسلمان۔ مسلمانوں پر اپنے مصیبت زدہ مسلمان بھائیوں کی مدد کرنا فرض ہے تو کیا میں امید رکھ سکتا ہوں کہ آپ مصیبت میں گھرے اپنے ہم مذہبوں کے لیے کوئی قدم اٹھائیں گے؟" سارس کے اس سوال نے اسے چپ لگا دی۔ وہ سارس کو کوئی اچھی امید کیسے دلاتا جبکہ وہ جانتا تھا کہ ان کے قافلے کے امیر، امیر ارغل کا مقصد سفر صرف اور صرف دولت کا حصول ہے اور وہ کسی دوسرے مسئلے میں الجھ کر اپنی راہ کھوٹی کرنا قطعی قبول نہیں کرے گا لیکن وہ اس نوجوان کو بالکل ناامید بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے خود کو ذرا سنبھال کر کھنکھارتے ہوئے بولا۔

"دیکھو دوست! میں تمہیں کسی بڑی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا لیکن اتنی امید دلا سکتا ہوں کہ مجھ سمیت میرے چند ساتھی ایسے ضرور ہیں جو دنیا کے بجائے آخرت کے نفع و نقصان کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ تمہیں بس ان مٹھی بھر ساتھیوں کا ہی ساتھ حاصل ہو سکے گا۔"

"ایمان کی طاقت والے ہیں تو مٹھی بھر بھی کافی ہیں۔ آخر بدر میں بھی تو صرف تین سو تیرہ نے کافروں کی کثیر فوج کو خاک چٹوائی تھی۔" سارس جس کا اصل نام جانے کیا تھا، بغیر مایوس ہوئے بولا تو صالح کی شرمندگی قدرے کم ہوئی ورنہ وہ سخت پشیمان تھا کہ اس نوجوان کی بے لوث خدمت کے جواب میں اس کے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

باقی کا وقت ان دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے گزارا۔ اس دورافتادہ علاقے میں جاری سیاست اور سازش کے تانوں بانوں نے صالح کو بہت حیران کیا تھا اس لیے وہی زیادہ سوالات کر رہا تھا۔ ان سوالات کے نتیجے میں اس کے پاس بہت سی معلومات جمع ہو گئی تھیں۔

"اب ہمیں نکلنا ہوگا۔" سارس نے کھڑکی پر پڑا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولا تو صالح تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ ہتھیار سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اس نے عبادت کے دوران اتار کر ایک طرف رکھ دی جانے والی صلیب بھی دوبارہ اپنے گلے میں ڈال لی۔ یہ صلیب اس کے بہروپ کا سب سے اہم حصہ تھی۔ نصرانیوں کی اس بستی میں اس صلیب کے سبب وہ اجنبی ہونے کے باوجود ان لوگوں سے اپنائیت کا احساس پا سکتا تھا۔

"ویسے تو کسی کے ملنے کا امکان بہت کم ہے لیکن اگر راستے میں کوئی مل گیا تو میں اس سے کہوں گا کہ کمرے کے اندر میرے مہمان کا دم گھٹ رہا تھا اس لیے میں اسے ہوا خوری کے لیے لے کر نکلا ہوں۔" نکلنے سے پہلے اس نے ایک اور ہدایت کی۔

"بے فکر رہو۔ میں کہہ دوں گا کہ میں دمے کا مریض ہوں اور اکثر وقت بے وقت مجھے سانس رکنے اور دم گھٹنے کی شکایت ہونے لگتی ہے۔" صالح نے اسے تسلی دی پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے سیڑھیاں اتر کر باہر نکل گئے۔ دن بھر آباد رہنے والا قہوہ خانہ اس وقت خالی پڑا تھا۔ باہر بستی کا بھی یہی حال تھا۔ ویران راستوں پر کسی ذی روح کا سایہ تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ بس کہیں کہیں گھروں میں جلتے دیوں کی ٹمٹماتی روشنیاں تھیں جو زندگی کا احساس دلاتی تھیں ورنہ ان کے اطراف میں سب کچھ گویا ساکت تھا۔ ایک ایسی بستی جس کے تمام جوان اور توانا مرد جنگ کا ایندھن بننے چلے گئے ہوں اور پیچھے رہ جانے والے ان کے بیوی بچوں اور بوڑھے والدین کو بے بسی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو، زندوں کا قبرستان دکھائی نہ دیتی تو اور کیا ہوتا۔

"وہ دیکھو۔ وہ قابوس کی رہائش گاہ ہے۔ قید خانہ اور اسلحہ خانہ دونوں اسی رہائش گاہ کے احاطے کے جنوب میں موجود ہیں لیکن تمہاری ساتھی عورت کو قید خانے میں نہیں رکھا گیا ہے اس لیے تم شمالی حصے سے اندر داخل ہونا۔" خاصی دور تک چلنے کے بعد سارس نے ایک وسیع احاطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں اسے آگاہ کیا۔

"تم ...... تم کیا کرو گے؟"

"میں باہر ہی رک کر انتظار کروں گا تاکہ اگر تمہیں کوئی مشکل پیش آئے تو تمہاری مدد کر سکوں۔"

"جاؤ...... دروازے کی کنڈی اندر سے کھلی ہوئی ہے اور اوپر چوکی پر موجود پہرے دار بھی نشہ آور کھانا کھا کر

غافل پڑے ہوئے ہیں۔'' شمالی دروازے کے قریب پہنچ کر سارکس نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور خود ایک تاریک گوشے میں سمٹ گیا۔

صالح پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا دروازے تک پہنچا اور اس کے آہنی پٹ کو دھیرے سے دھکیلا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ پہرے دار حسب اطلاع غیر موجود تھے۔ شاید وہ کسی تاریک گوشے میں بے ہوش پڑے تھے۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے احاطے کا جائزہ لیا۔ دروازے سے اصل عمارت کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا اور ایک جلتی مشعل نے اگرچہ اس وسیع احاطے کی تاریکی کو مکمل ختم نہیں کیا تھا لیکن اتنی روشنی بہرحال تھی کہ اگر گشتی پہرے دار اس جانب آجاتے تو وہ احاطہ پار کرتے ہوئے ان کی نظروں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے چند ثانیوں میں اس نے اس مسئلے کا حل سوچا اور اپنی کمان شانے سے اتار کر مہارت سے نشانہ باندھا۔ کمان سے نکلنے والا تیر ہلکی سی سنسناہٹ کے ساتھ یوں مشعل سے جا کر ٹکرایا کہ وہ ایک جھٹکے سے نیچے گری اور اس کا شعلہ بجھ گیا۔ روشنی بجھتے ہی اس نے پنجوں کے بل دوڑ لگا دی اور نہایت تیزی سے احاطہ پار کر کے رہائشی عمارت تک پہنچ گیا۔ اس عمارت کا داخلی دروازہ بھی اندر سے بند تھا اور یہ دروازہ اسے خود کھلوانا تھا۔ اس موقع پر کمال اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے بنا کسی جھجک کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

''کون ہے اور کیا بات ہے؟'' اندر سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

''ایک پیامبر آیا ہے اور حاکم قابوس کو فوری طور پر کوئی اہم اطلاع دینا چاہتا ہے۔'' اس نے قدرے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کا بہانہ کارگر ثابت ہوا اور دروازہ فوری طور پر کھل گیا۔ اس سے قبل کہ دروازہ کھولنے والا پہرے دار اسے نظر بھر کر دیکھتا اور پہچان کے مراحل طے کرتا وہ کسی عقاب کی طرح اس پر جھپٹا اور اسے آواز نکالنے کا موقع دیے بغیر اس کا منہ دبوچ لیا۔ پہرے دار زیادہ طاقتور نہیں تھا اور اس اچانک حملے پر بوکھلا بھی گیا تھا اس لیے اس کے مضبوط بازوؤں میں پھڑکنے اور مچلنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اس نے کمر سے بندھا تیز دھار خنجر کھینچا اور یوں پہرے دار کے پہلو میں اتارا کہ اس کا دل سیدھا اس کے نشانے پر تھا۔ پہرے دار کو تڑپنے اور پھڑکنے کی بھی مہلت نہیں ملی اور روح جسم سے پرواز کر گئی۔ صالح نے کھینچ کر اسے ایک گوشے میں ڈالا اور خود دبے قدموں برآمدے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

''ایک، دو، تین۔۔۔'' وہ دائیں جانب کی قطار میں موجود دروازوں کو شمار کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چھٹے دروازے پر آ کر اس کے قدم رک گئے۔ اطلاع کے مطابق صفیہ بیگم کو اسی کمرے میں رکھا گیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر ایک قیدی عورت کے کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل نہیں تھا۔ اسے شک گزرا کہ اسے ملنے والی اطلاع غلط ہے لیکن بغیر تصدیق کے حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تصدیق کے لیے اس نے دروازے کے پٹوں پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے وا کرنے کی کوشش کی لیکن اس پر انکشاف ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور ذہن پر زور دے کر غور کرنے لگا کہ سارکس نے اسے دائیں جانب کے چھٹے کمرے کے متعلق ہی بتایا تھا یا وہ غلطی کر رہا ہے۔

''تم کمال کی عورت ہو صفیہ! میں نے اپنی زندگی میں تم جیسی دوسری عورت نہیں دیکھی۔ تم تو شراب سے بھرے جام سے بھی زیادہ نشہ آور ہو۔'' اندر سے سنائی دینے والی تیز اور مخمور سرگوشی نے اسے سارے شکوک و شبہات سے نکال دیا اور اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ آوارہ مزاج صفیہ نے یہاں بھی اپنے عشووں اور جلووں کا جال پھیلا ڈالا تھا اور شاید اسی لیے کسی قید خانے کی تاریکی کے بجائے قابوس کی رہائش گاہ کی ایک آراستہ خواب گاہ میں موجود تھی۔

''نشہ تو آپ نے مجھ پر کر دیا ہے محترم! آپ بہت شاندار مرد ہیں اور آپ کی بہادری اور ذہانت بھی مثالی ہے لیکن مجھے آپ کی جس خوبی نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ آپ کی اپنی قوم کی سربلندی کے لیے تڑپ ہے۔ آپ محدود پیمانے پر ہی سہی ان رذیل مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ قابل تحسین ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ ایک عرصے تک ایک بدبودار مسلمان کی بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنا میرے لیے کتنا تکلیف دہ تجربہ تھا اور اس شخص کے مرنے کے بعد بھی میں کیسے ابھی تک ان مردودوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ یہ تو خداوند کی مہربانی تھی کہ میں اتنا قان کی قید سے نکل کر آپ کی پناہ میں پہنچ گئی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ ان بدبختوں سے میری اتنے برسوں کی اذیت کا بدلہ ضرور لیجیے گا۔'' وہ مکار عورت خود مظلوم بنی قابوس کو شیشے میں اتارنے کے ساتھ ساتھ اسے ان لوگوں کے خلاف اکسا رہی تھی جن کے مال و زر پر اس نے ایک عرصہ عیش و عشرت کی زندگی گزاری تھی۔

''فکر مت کرو میری جان! میرے ہاتھوں ان

بدبختوں کا ایسا برا حال ہوگا کہ یہ دنیا میں ہی جہنم کا مزہ چکھ لیں گے۔ تمہاری اذیت کا سبب بننے والوں کو بھی میں یہاں سے بچ کر نہیں جانے دوں گا۔ بس ذرا میرے سپاہی سردار مراد کی بیٹی اور اس کے چاہنے والوں کو قابو کر لیں اور میرے عقل مند ساتھی اردگرد کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف متحد کر کے لڑنے کے لیے آمادہ کر لیں تو پھر دیکھنا کہ یہاں کیسے سب کچھ بدل جائے گا۔'' قابوس کے شیطانی ارادے سن کر صالح نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔ جذبات میں وہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرسکتا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ اس لڑائی میں ہندو بھی آپ کے اتحادی بننے جارہے ہیں؟'' صفیہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔ میرے دانا ساتھی کافی عرصے سے آس پاس کے علاقے کے ہندوؤں کی رائے اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کرچکے تھے لیکن کچھ دراندازوں کی آمد کی وجہ سے ہمیں اچانک ہی لڑائی شروع کرنی پڑی اس لیے ہمارے دوست فوری طور پر ہمارے ساتھ شامل نہ ہوسکے۔ اب میرے ساتھی ان کے پاس میرا پیغام لے کر گئے ہیں۔ خداوند کی مہربانی سے وہ بھی جلد ہمارے ساتھ شامل ہوجائیں گے۔'' قابوس اپنی کامیابی کے لیے بہت پُرامید دکھائی دیتا تھا۔

''لیکن اس سب کا کیا فائدہ ہوگا محترم! اس چھوٹے سے علاقے کی حکمرانی کب تک آپ کے ہاتھوں میں رہ سکے گی۔ ہندوستان کا حکمران مسلمان ہے۔ اسے جیسے ہی یہاں کے حالات کی خبر ملے گی وہ اپنی فوج کے ساتھ حملہ آور ہوجائے گا۔'' صفیہ نے اپنے اندیشوں کو زبان دی۔

''تم نے سنا ہوگا کہ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ میں بھی ایک قطرہ ہوں جو اپنے حصے کا کام کررہا ہوں۔ میری طرح میرے دوسرے ساتھی بھی مختلف مقامات پر اپنی ذمے داریاں ادا کررہے ہیں اور ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب اس دنیا کے ہر گوشے میں کلیسا کی حکمرانی ہوگی اور یسوع کے چاہنے والے اس دنیا پر راج کریں گے۔''

''خداوند آپ کو آپ کے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔''

''اللہ ہرگز بھی تم مشرکوں کو تمہارے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں کرے گا۔ ہم اپنے دین اور زمین پر اللہ وحدہٗ لاشریک کی حکمرانی کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔'' صفیہ کی دعا پر اس نے تڑپ کر سوچا اور کوئی ایسی راہ سوچنے لگا کہ کسی طرح اس کمرے میں داخل ہوجائے اور قابوس جیسے شیطان کو جہنم واصل کردے۔ اندر سے بند مضبوط دروازے کو توڑ کر اندر داخل ہونے کی اس کے پاس کوئی تدبیر نہیں تھی۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ کوئی کھڑکی یا دریچہ کھل جائے تو وہاں سے اندر کود جائے لیکن اس کے لیے اسے باہر نکل کر عقبی جانب جانا پڑتا۔ وہ اس ارادے سے پلٹا ہی تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ تیزی سے ایک قریبی ستون کی آڑ میں سمٹ گیا۔ آنے والے تعداد میں دو تھے اور خاصی عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔ اسی عجلت میں انہوں نے اس خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی جہاں صفیہ اور قابوس موجود تھے۔

''کون گستاخ ہے جس نے میری خلوت میں مخل ہونے کی جرأت کی۔ کیا تمہیں اس گستاخی کا انجام نہیں معلوم؟'' دستک کے جواب میں اندر سے قابوس کی دہاڑ سنائی دی۔

''گستاخی کی معافی چاہتے ہیں جناب، لیکن معاملہ بہت نازک ہے اور آپ کے علم میں لانا ضروری ہے۔'' ایک پہرے دار نے مؤدبانہ جواب دیا تو اندر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھاگئی پھر ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد دروازہ کھلا۔ اس وقفے میں پہرے دار پوری طرح چوکنے رہے تھے اور یوں اپنے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے جیسے انہیں کسی نادیدہ ہستی کی طرف سے اچانک حملے کا اندیشہ ہو۔ ان کے اس قدر چوکنا ہونے کی وجہ سے صالح کو ان پر حملہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔

''اب بولو، کیا مسئلہ ہے؟'' قابوس نے باہر آکر اپنے سامنے گھٹنوں کے بل جھک جانے والے پہرے داروں سے پُررعونت لہجے میں پوچھا۔

''عالی جناب! شمالی دروازے کے پہرے دار غائب ہیں اور رہائشی حصے کا پہرے دار بھی مردہ حالت میں پایا گیا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے آپ کو یہاں منڈلاتے خطرے سے آگاہ کردیں۔''

''کیا بکواس کررہے ہو؟ کیا اوپر چوکی پر موجود پہرے داروں نے کچھ نہیں دیکھا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ان کی نظروں میں آئے بغیر اندر آجائے؟'' قابوس نے غصے میں دھاڑتے ہوئے پہرے دار کا گریبان پکڑلیا۔

''ایک آدمی کو اوپر چوکی پر بھیجا ہے جناب اور باقی پہرے دار بھی ہر طرف تلاشی لینے کے لیے بھیج دیے گئے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہماری تعداد محدود ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ سب سے پہلے آپ خود کو محفوظ کرلیں۔'' پہرے

دار نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

قابوس نے اس کا مشورہ قبول کرلیا۔ دونوں پہرے دار اسے تلواروں کے سائے میں اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ صالح کے پاس چلنے کا موقع نہیں تھا، دوسرے وہ پہلے صفیہ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا چنانچہ جیسے ہی قابوس اور پہرے دار نظروں سے اوجھل ہوئے، وہ صفیہ کے زیرِ استعمال خواب گاہ میں جا گھسا۔ اندر گھستے ہی اس نے دروازے کی چٹخنی لگائی۔ صفیہ جو دریچے سے باہر جھانک کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کررہی تھی، آواز سن کر تیزی سے پلٹی اور اسے تلوار بدست اپنے سامنے کھڑے پا کر اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی لیکن وہ شاطر عورت تھی اس لیے تیزی سے سنبھالا لے لیا اور نہایت جذباتی لہجے میں بولی۔

"صالح تم...... تم آگئے مجھے بچانے۔ شکر ہے اللہ کا جو اس نے مجھے ان ظالموں کے قبضے سے نکالنے کا انتظام کردیا۔"

صالح جواب دینے کے بجائے اسے شرر بار نظروں سے گھورتا رہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ میرے مسلمان بھائی ان مشکل حالات میں مجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے اور امیر اپنے بہادروں کو ضرور میری رہائی کے لیے بھیجیں گے۔" جذباتی اداکاری میں مصروف اسے صالح کی نظروں کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا خاتون! میں تمہاری رہائی کے لیے ہی آیا ہوں۔ زندگی کی قید سے رہائی کے لیے۔"

"کک...... کیا مطلب! یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟" وہ اس کے لہجے کی خوف ناکی پر چونکی۔

"تم نے بہت عرصہ دھوکا دے لیا لیکن اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔ میں جان چکا ہوں کہ تم نے محض امیر سالک کی دولت کی خاطر اسلام قبول کیا تھا لیکن دل سے تم اب بھی کافر ہی ہو اور اس نازک وقت میں ہمارے بجائے اپنی کافر قوم کا ساتھ دے رہی ہو۔ میں نے تمہیں اپنی ایک مسلمان بہن سمجھ کر تمہارے لیے اپنے سردھڑ کی بازی لگائی تھی لیکن اب میں تمہاری اصلیت سے واقف ہوچکا ہوں اس لیے گوارا نہیں کرسکتا کہ کسی فتنے کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں اور اپنے دینی بھائیوں کی بربادی کا سامان کروں۔" اس نے نیام سے تلوار کھینچ لی۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو صالح! خدارا مجھ پر رحم کرو۔ میں صرف اور صرف قابوس کو دھوکا دے رہی تھی تاکہ یہاں سے نکلنے کی راہ ہموار کرسکوں۔ میرا یقین کرو میں کافر نہیں، مسلمان ہوں۔" اس چالاک عورت نے بھانپ لیا کہ صالح اس کے اور قابوس کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکا ہے اس لیے تیزی سے اپنے بچاؤ کے لیے جھوٹ گھڑنے لگی۔

"عزت کی حفاظت اور حیا مسلمان عورت کے ایمان کا جزو لازم ہے۔ جو عورت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے جسم کو ریوڑیوں کی طرح مردوں میں بانٹتی پھرے، میں اس کے مسلمان ہونے پر یقین نہیں کرسکتا۔" اس نے نفرت سے جواب دیا اور صفیہ کو مزید بولنے کا موقع دیے بغیر تلوار کے ایک ہی بھرپور وار سے اس کا کام تمام کردیا۔

اسے اطمینان تھا کہ اس نے کوئی ظلم نہیں کیا اور اس کے اس اقدام سے اس کے ہم قافلہ ایک فضول پریشانی سے بچ گئے۔ وہ صفیہ کے اغوا سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے یہاں آیا تھا اور اب وہ مسئلہ مکمل طور پر حل ہوچکا تھا۔ اسے اب حاصل شدہ معلومات اپنے دوستوں تک پہنچانے کی فکر تھی اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کا یہاں سے زندہ سلامت نکلنا ضروری تھا۔ باہر سے سنائی دینے والی قدموں کی چاپوں اور دروازوں پر دی جانے والی دستکوں کی آوازوں سے واضح تھا کہ اس طرف پہرے دار موجود ہیں اور وہ جہاں سے آیا تھا وہاں سے واپس نہیں جاسکتا۔ اس نے ایک نظر زمین پر پڑی صفیہ کی خون اگلتی لاش کی طرف ڈالی اور پھر اس دریچے تک گیا جہاں سے کچھ دیر قبل صفیہ باہر جھانک رہی تھی۔ دریچے سے نظر آنے والا احاطے کا منظر روشن تھا اور اب ایک کے بجائے تین چار مشعلیں جلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اتنی تیز روشنی میں وہ پہرے داروں کی نظروں میں آئے بغیر بیرونی دروازے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پہنچ بھی جاتا تو وہ پہرے دار اسے کیسے جانے دیتے جو اب آتے وقت خالی ملنے والے شمالی پھاٹک پر تعینات ہوچکے تھے۔ ایک نظر میں ساری صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنی کمان تھامی اور اللہ کا نام لے کر پہلا تیر چلایا۔ سنسناتا ہوا تیر سیدھا ایک مشعل سے جا کر ٹکرایا اور اسے زمین بوس کردیا۔

"بھاگو، دوڑو، دیکھو وہ فرار کی کوشش میں ہے۔"

ایک ہنگامہ سا جاگ اٹھا لیکن اس نے کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر اپنے کام پر توجہ مرکوز رکھی اور یکے بعد دیگرے تیر چلاتا چلا گیا۔

"وہ رہا...... اس دریچے میں۔" کسی نے اس کی موجودگی کا مقام بھانپ کر ہانک لگائی۔ عین اس وقت اس

کے تیر نے آخری مشعل کو نشانہ بنایا۔ مشعل گری لیکن گر کر بجھنے کے بجائے اس نے ایک الاؤ سا بھڑکا دیا۔ دراصل مشعل جس جگہ گری تھی وہاں خشک چارا رکھا ہوا تھا۔ اس چارے نے فوراً ہی آگ پکڑ لی اور ماحول پہلے سے کئی گنا زیادہ روشن ہو گیا۔ صالح جو اپنی موجودگی کے مقام کی نشاندہی ہونے کے بعد آخری تیر چلاتے ہی دریچے سے ہٹ گیا تھا، یہ نتیجہ دیکھ کر دانت پر دانت جما کر رہ گیا۔ اتنی تیز روشنی میں اس کا کسی کی نظروں میں آئے بغیر بچ نکلنا ناممکنات میں سے تھا اور وہ اس کمرے میں کسی چوہے کی طرح پھنس کر رہ گیا تھا۔

"پانی لاؤ، جلدی سے آگ بجھاؤ۔ دیکھو آگ تیزی سے اصطبل کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔" ابھی وہ اپنی الجھن میں ہی تھا کہ باہر سے سنائی دیتی پکاروں پر کان کھڑے ہو گئے۔

"اگر ایک بھی گھوڑا جلا تو تم سب کی چمڑی ادھیڑ دی جائے گی۔ کام چور، ونگ حرامو... تمہاری غفلت سب کچھ برباد کر کے رکھ دے گی۔" کوئی تھا جو بری طرح دہاڑ رہا تھا۔ صالح نے احتیاط سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی اور بھاگتے دوڑتے لوگوں کی چیخ و پکار کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کے تیز آواز میں ہنہنانے اور بلبلانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً آگ نے چند گھوڑوں تک رسائی حاصل کر لی تھی جبکہ باقی دہشت زدہ ہو کر شور مچا رہے تھے۔

"ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔" صالح نے دل میں خود سے کہا اور ایک دوسرے دریچے کا پٹ کھول کر باہر کود گیا۔ اس جانب سے پھاٹک دکھائی نہیں دے رہا تھا، نہ ہی وہ پھاٹک کی طرف جا سکتا تھا۔ اس کا رخ احاطے کی بلند دیوار کی طرف تھا۔ ہاتھ میں ننگی تلوار لہراتا وہ سرپٹ دیوار کی طرف دوڑ پڑا۔ ابھی آدھا فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ ایک تیغ زن اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ صالح دہشت زدہ جانور کی طرح اس بری طرح مشتعل تھا کہ درندے کی طرح غراتا ہوا اس تیغ زن پر جھپٹا اور اپنی تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کا تلوار والا ہاتھ کٹ کر دور جا گرا اور وہ بری طرح چیختا ہوا گھٹنوں کے بل زمین پر گر کر اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے دبا کر ابلتے ہوئے خون کو روکنے کی بے سود کوشش کرنے لگا۔ صالح یہ منظر دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا۔ اس نے کسی آندھی کی طرح دیوار تک کا درمیانی فاصلہ طے کیا اور اپنی کمر سے لگی رسی کھینچ کر اس کا آنکڑے والا سرا دیوار کی طرف اچھالا۔ پہلی ہی کوشش میں آنکڑا دیوار کی منڈیر پر اٹک گیا۔ اس نے رسے کی مدد سے دیوار پر چڑھنا شروع کر دیا۔ آدھے سے کچھ زیادہ فاصلہ طے ہو چکا تھا کہ اس نے ایک وحشت ناک چیخ سنی اور ساتھ ہی ایک خنجر سنسناتا ہوا اس کی طرف آیا۔ اس نے لٹکے ہی لٹکے پہلو بدل کر خود کو اس کی زد میں آنے سے بچانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے نتیجے میں وہ جان لیوا وار سے تو بچ گیا لیکن خنجر نے پھر بھی اس کے بازو تک رسائی حاصل کر لی۔

"یا اللہ رحم!" اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سسکاری نکلی پھر اس نے بے دردی سے بازو میں پیوست خنجر کھینچا اور پلٹ کر حملہ آور کو دے مارا۔ حسنِ اتفاق سے خنجر سیدھا اس کے دل کے مقام پر جا کر لگا اور وہ وہیں زمین بوس ہو گیا۔

"میری مدد کر میرے مالک! میں جینے کی آرزو میں نہیں بس اپنی قوم کو ان کافروں کی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے زندہ سلامت یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی اور بازو سے بہتے خون کی پروا نہ کرتے ہوئے باقی ماندہ فاصلہ طے کر کے دیوار کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف اترنے سے قبل اس نے اپنے عقب میں شور سنا۔

"وہ بھاگ رہا ہے۔ اسے پکڑو۔ جانے نہ پائے۔" کچھ لوگ تھے جو شور مچاتے ہوئے اسی جانب بھاگے چلے آرہے تھے۔ انہیں روکنے کی تدبیر کرنے کے بجائے وہ تیزی سے دوسری طرف اترنے کے لیے کوشاں ہو گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے پیچھے آنے والوں پر اچانک ہی کہیں سے تیروں کی بارش ہوئی اور وہ اسے بھول کر اپنی جانیں بچانے اور نئے حملہ آور سے نمٹنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ اسے فرار میں کامیاب کروانے کی خاطر خود کو مصیبت میں مبتلا کر لینے والا وہ شخص سارس تھا۔

قدم زمین پر ٹکتے ہی صالح نے ایک مخصوص سمت میں دوڑنا شروع کر دیا۔ اسے تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنا تھا۔ سارس نے اس کے اور صفیہ کے لیے گھوڑوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک باغ کے قریب بندھے ان دو گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف جاتے ہوئے اسے اس بات کا کوئی افسوس نہیں تھا کہ صفیہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ ایک فتنے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے پر مطمئن تھا۔ اسی اطمینان کے ساتھ وہ واپس اپنے قافلے تک پہنچا تو رات کے پہرے داروں نے اس کا استقبال کیا اور شناخت کا مرحلہ طے ہونے پر خیمے تک پہنچا دیا۔

"صالح تم...... اوہ میرے خدا! تم تو زخمی ہو۔ کافی خون بہہ گیا ہے۔ لاؤ مجھے اپنا زخم دکھاؤ۔" خیمے میں سلیمان موجود تھا۔ وہ اسے زخمی دیکھ کر پریشان ہو گیا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"پریشان نہ ہوں جناب! میرا اندازہ ہے کہ ہڈی بچ گئی ہے۔ انشاء اللہ زخم جلد بھر جائے گا۔" صالح نے اسے تسلی دی اور خیمے کے ایک گوشے میں نماز تہجد کی ادائیگی میں مصروف ساشا کو دیکھنے لگا۔ وہ بہت خشوع و خضوع سے نماز ادا کر رہا تھا اور جس اطمینان سے نماز کا ہر رکن ادا کر رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی جسمانی حالت کافی بہتر ہے۔ اسے روبہ صحت دیکھ کر صالح کا اپنا دل مسرت سے بھر گیا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ خوش قسمتی سے ہڈی بچ گئی ہے۔ البتہ گھاؤ گہرا ہے اس لیے تمہیں کچھ دن احتیاط سے کام لینا ہوگا۔" اس کے زخم کا معائنہ کرنے میں مصروف سلیمان نے اس سے کہا اور پھر زخم صاف کر کے اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے اس سے فوری طور پر کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"السلام علیکم صالح...... میرے بھائی! اللہ کا شکر ہے تم بخیریت واپس آ گئے ہو۔" نماز سے فارغ ہو کر ساشا اس سے مخاطب ہوا تو اس کے لہجے میں حقیقی مسرت تھی۔

"وعلیکم السلام میرے آقا! میں بھی آپ کو روبہ صحت دیکھ کر بہت خوش ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ بیٹھا۔ سلیمان جو اس کی مرہم پٹی سے فارغ ہو چکا تھا، اپنا سامان سمیٹ کر ہاتھ دھونے چلا گیا۔

"ہم تمہاری اتنی جلدی واپسی کی امید نہیں رکھتے تھے۔ تم جلد واپس آ گئے ہو اور بے شک زخمی حالت میں واپس آئے ہو اس کے باوجود تمہارے چہرے کا اطمینان بتا رہا ہے کہ تم ناکام واپس نہیں آئے۔" اب وہ اس کے قریب اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا ہوا تھا اور نہایت محبت سے اس سے مخاطب تھا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے میرے آقا! اللہ نے غیب سے میری مدد کی اور بالکل غیر متوقع طور پر ایک فرشتہ میری مدد کے لیے بھیج دیا۔ اس فرشتے کا نام سائرس تھا۔ سائرس کی مدد کے باعث میں نے قلیل وقت میں وہ کر ڈالا جو خود میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔"

"کون تھا سائرس اور تمہیں کیسے ملا؟" ساشا نے دلچسپی سے پوچھا۔ یخنی کی ابلتی دیگچی کے قریب آ کھڑا ہونے والا سلیمان بھی اس گفتگو کی طرف متوجہ تھا۔ جتنی دیر میں صالح نے سائرس کے بارے میں بتایا، وہ یخنی پیالوں میں ڈال کر ان کے قریب لے آیا۔

"گفتگو کے دوران اسے بھی نوش کرتے جاؤ۔ تمہارے زخموں کو بھرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے جسموں کو مسلسل طاقت اور توانائی ملتی رہے۔" اس نے یخنی کے بھاپ اڑاتے پیالے ان کے سامنے رکھ دیے۔

"شکریہ دوست! اللہ تمہیں تمہاری اس مہربانی کا اجر دے گا۔" ساشا نے اس سے کہا اور پھر دوبارہ صالح کی طرف متوجہ ہو گیا۔ صالح کی داستان سننے کی ان دونوں ہی کو بے چینی تھی۔ تھکن اور تکلیف کے باوجود صالح نے الف تا ب انہیں سارا قصہ کہہ سنایا۔

"صفیہ کا قتل معمولی واقعہ نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ امیر کی طرف سے اس کا شدید ردعمل ظاہر ہوگا۔" پوری تفصیل سن کر سلیمان نے تشویش سے تبصرہ کیا۔

"صالح نے جو کیا ٹھیک کیا۔ ایسی بدکردار اور فتنہ ساز عورت سے نجات حاصل کر لینا ہی بہتر تھا۔" ساشا نے فوراً صالح کی حمایت کی۔

"مجھے صالح کے عمل سے اختلاف نہیں لیکن امیر کے ردعمل کا سوچ کر اندیشے میں مبتلا ہوں۔"

"امیر کو ہر بات بتائی جائے، یہ ضروری نہیں۔ صالح صرف سائرس سے ملاقات اور قابوس کی رہائش گاہ میں داخل ہو کر اس کے اور صفیہ کے مابین ہونے والی گفتگو سننے کی حد تک ہی امیر کو بتائے گا۔ صفیہ کا قتل کب اور کیسے ہوا، یہ نہیں جانتا۔ یہ تو پہرے داروں سے اپنی جان بچا کر فرار ہونے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔" ساشا کے معنی خیز لہجے میں کہنے پر وہ دونوں چونک گئے۔

"لیکن یہ جھوٹ......" صالح نے کہنے کی کوشش کی۔

"کسی بڑے فتنے میں مبتلا ہونے سے یہ جھوٹ بہتر ہے صالح! اب بات صرف اپنے قافلے کو بچانے کی نہیں رہی ہے۔ یہ امت مسلمہ کے خلاف کی جانے والی ایک سازش کو قلع قمع کرنے کا وقت ہے۔ ایسے نازک وقت میں ہم امیر ارغل جیسی موٹی عقل رکھنے والے آدمی کی برہمی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ غصے میں تمہارے قتل کا بھی حکم دے سکتا ہے اور ہمیں جن لوگوں کا مقابلہ کرنا ہے اس کے لیے تم جیسے سچے مسلمان اور جانباز سپاہی کا ساتھ بہت اہم ہے۔" سلیمان نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اسے سمجھایا تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

"فجر کا وقت ہو رہا ہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد تم

کچھ دیر آرام کر لینا۔ پہرے داروں سے امیر کو تمہاری واپسی کی اطلاع مل جائے گی۔ امیر کے بلاوے سے قبل ہم کوشش کریں گے کہ قافلے کے اہم افراد کی رائے اپنے حق میں ہموار کر سکیں۔ امیر پر دباؤ پڑے گا تو وہ ہمیں اس بات کی اجازت دینے پر مجبور ہو جائیں گے کہ خزانے کی تلاش میں جانے سے قبل اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کی جائے۔" ساشا نے اسے اپنے آگے کے ارادوں سے آگاہ کیا تو اسے قائل ہونا ہی پڑا۔

"شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ امیر کا مقصد سفر جو بھی ہے اللہ نے ہم سب کو اس قافلے میں شامل کر کے یہاں تک یقیناً اس لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کفار کو جہنم واصل کر سکیں۔"

"انشاء اللہ، اللہ اس نیک کام میں ہماری مدد کرے گا اور قلیل کو کثیر پر ویسے ہی فتح دے گا جیسے اس نے بدر کے تین سو تیرہ مجاہدین کو کفار مکہ کی کثیر تعداد پر فتح دی تھی۔" سلیمان نے اس کے خیال کی تائید کی۔

"انشاء اللہ۔" تینوں کی زبان سے بیک وقت نکلنے والے ان الفاظ نے کہاں تک رسائی حاصل کی ہے، یہ انہیں خود بھی معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

"خیریت ہے داؤد! آپ نے مجھے کیسے یاد کیا؟" وہ عبدالمالک کے ساتھ حاطب کے خیمے میں کھڑی حیرت سے دریافت کر رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو اس کی داؤد سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایسے میں یہ بلاوا اس کے لیے باعث حیرت ہی تھا۔

"جناب حاطب تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔" اس نے سارہ کے معصوم چہرے پہ ایک نظر ڈالی اور بمشکل بول سکا۔

"فرمایئے بزرگوار......!" اسے داؤد کے انداز میں کچھ کھٹکا لیکن نظر انداز کر کے حاطب سے مخاطب ہوئی۔

"اس کے ساتھ کے مزید دو ہیرے کہاں ہیں؟" حاطب نے بغیر کسی تمہید کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں سوال کیا کہ اس کی کھلی ہتھیلی پر وہ ہیرا جگمگا رہا تھا جو اس نے کچھ دیر پہلے ہی داؤد کو دیا تھا۔

"مم...... میں...... کچھ نہیں جناب۔" سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو نہیں پا سکی۔

"سوال بہت سیدھا ہے لڑکی! میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اس ہیرے کے ساتھ کے مزید دو ہیرے کہاں ہیں؟" حاطب کا لہجہ مزید کڑا ہو گیا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ اس ہیرے جیسے مزید دو ہیرے اور بھی موجود ہیں؟" اس بار اس نے خود کو سنبھال لیا اور خود بھی قدرے تیکھے لہجے میں بولی۔

"مجھ سے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں لڑکی۔ تمہاری عمر سے کہیں زیادہ تجربے کا مالک ہوں میں اور میرے سینے میں وہ راز دفن ہیں جن کی تمہیں ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔" حاطب کے لہجے کی سختی میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"آخر آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟" وہ بے بس سی دکھائی دینے لگی پھر داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے احتجاجی لہجے میں بولی۔

"میں نے تو یہ ہیرا نیک نیتی سے آپ کے حوالے کیا تھا داؤد! میں اپنے ساتھ اس سلوک کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"حاطب کے سوالوں کے پس منظر سے میں خود بھی واقف نہیں ہوں سارہ! لیکن میرے خیال میں اگر تم ان کے سوالات کے جواب دے دو تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔" اس نے ایک نظر سارہ پر ڈالی اور دوبارہ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا تو اس کے پاس گویا ہر کشمکش ختم ہو گئی۔

"پوچھیے! آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" اس نے ہارے ہوئے انداز میں حاطب سے کہا۔

"تمہارے پاس یہ ہیرا کہاں سے آیا؟"

"مجھے یہ ہیرا کسی نے تحفتاً عنایت کیا تھا۔" وہ سچ نہیں بول رہی تھی اس لیے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"ناقابل یقین۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا آپ کے خیال میں، میں نے اسے چوری کیا ہے؟" اسے حاطب کے تبصرے نے طیش دلایا۔

"اتنا قیمتی تحفہ دینے والے سے یقیناً تعلق خاص رہا ہوگا؟" حاطب پر اس کی ناراضی کا اثر نہ ہوا۔

"جی ہاں۔ ہم بچپن کے ساتھی تھے اور بچپن سے جوانی تک کی منازل ایک ساتھ ہی طے کی تھیں۔ اگر کچھ نامساعد حالات پیش نہ آ جاتے تو آج ہم ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی ہوتے۔" اس بار وہ سچ بول رہی تھی اس لیے اس کا سر اور نظریں دونوں اٹھی ہوئی تھیں البتہ توجہ کا مرکز حاطب کی ذات ہونے کے باعث وہ نہیں دیکھ سکی تھی کہ اس کے اس جملے نے داؤد کے چہرے کی رنگت کو کیسے متغیر کیا تھا۔

"کیا نام ہے اس کا؟ وہ کس کا بیٹا ہے؟ تم یقیناً اس کے باپ کو جانتی ہوگی۔" حاطب کی بے قراری اس کے لہجے

سے عیاں تھی۔

''یقیناً میں جانتی ہوں لیکن ضروری نہیں سمجھتی کہ آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔'' اب اس کا اعتماد مکمل طور پر بحال ہو چکا تھا اس لیے نہایت بے نیازی سے حاطب کو جواب دیا۔

''تمہیں جواب دینا ہوگا لڑکی!'' حاطب ایک بار پھر طیش میں آیا اور اس طیش کے باعث اس کا بوڑھا وجود لرز اٹھا۔

''آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔'' اس کی بے نیازی میں مزید اضافہ ہوا۔

''تم ایسا اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم اس ہیرے سے وابستہ ایک عظیم راز سے ناواقف ہو اور میرے خیال میں تمہیں یہ ہیرا تحفتاً پیش کرنے والا بھی اس راز سے واقف نہیں ہوگا ورنہ وہ ہرگز بھی اسے تمہیں تحفے میں نہ دیتا۔'' حاطب کا لہجہ ذرا پست ہو گیا۔

''وہ مجھ پر پوری دنیا کی دولت لٹا سکتا تھا۔'' اس کے انداز میں ایک ناز بھرا تیقن تھا۔ داؤد کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کر بمشکل ابھرا۔

''مجھے بتاؤ کہ جب اس نے تمہیں یہ ہیرا تحفے میں دیا تو کیا اس کا باپ زندہ تھا؟ یقیناً وہ زندہ نہیں ہوگا ورنہ یہ سب نہ ہوتا۔'' حاطب کی آواز لرز رہی تھی۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔ وہ اس وقت زندہ نہیں تھے اور ان کے بیٹے کو بھی ایسے کسی راز کا علم نہیں تھا جو اس ہیرے سے جڑا ہو۔'' حاطب کے سوالات نے اس پر یہ تو واضح کر دیا تھا کہ وہ یونہی اس سے تفتیش نہیں کر رہا بلکہ ماضی کے کچھ راز اس کے سینے میں دفن ہیں اس لیے خودبخود اس کا لہجہ پست ہو گیا اور ذہن میں غار کے رخنے سے برآمد ہونے والی وہ شے لہرانے لگی جو اب بھی اس کے پاس ایک امانت کی حیثیت سے محفوظ تھی۔

''کاش کہ تم مجھے میرے سوالات کے تسلی بخش جوابات دے دیتیں تو یہ تمہارے محبوب کے حق میں ہی بہتر ہوتا اور وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا کہ تمہیں اس کے ساتھ پر ناز ہوتا۔'' حاطب نے بے بسی سے ہاتھ مسلے۔

''نصیب میں ہمارا ساتھ لکھا ہوتا تو میرے لیے یہی ایک بات ناز کرنے کے لیے کافی تھی لیکن میری بدنصیبی کہ میں نے اسے کھو دیا۔ ایک کھوئے ہوئے کے متعلق میں آپ کو کیسے کچھ بتا سکتی ہوں؟'' اس کے دل پر عرصے سے بوجھ تھا چنانچہ ضبط کا بندھن ٹوٹا تو آنسو ایک تواتر سے آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس کے آنسوؤں نے ایک بار پھر داؤد کے ضبط کا امتحان لیا۔ بے شک وہ کسی اور کی محبت میں مبتلا تھی لیکن وہ اس کا رونا برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

''میرے خیال میں اب بہت ہو چکا۔ ہمیں سارہ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ حاطب سے مخاطب ہوا تو اس کا لہجہ بہت روکھا تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی لیکن میں آپ پر واضح کر دوں کہ آپ سارہ کے دیے ہوئے تحفے سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ آس پاس کے علاقوں میں آپ ایسے کسی قدر دان کو تلاش نہیں کر سکتے جو اس قیمتی ہیرے کی قیمت چکا سکے۔'' حاطب کا انداز ہار ماننے والا تھا۔

''اب میں اس ہیرے کو بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے نزدیک یہ ہیرا صرف قیمتی نہیں، انمول ہے کیونکہ اس کے ساتھ کسی کے انمول جذبات جڑے ہوئے ہیں۔ یہ سارہ کا بے لوث خلوص تھا کہ وہ ہماری پریشانیوں کے حل کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی لیکن میری غیرت ان سے ایسی قربانی لینا گوارا نہیں کر سکتی۔ آپ سارہ کو یہ ہیرا واپس کر دیں۔'' داؤد نے دوٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''واپس کر دوں؟'' حاطب کو اس کے فیصلے نے ششدر کر دیا۔

''جی ہاں۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔ حاطب کو بادل نخواستہ ہیرا سارہ کی طرف بڑھانا پڑا۔

''امید ہے کہ آپ کسی روز مجھے اس لائق سمجھیں گی کہ مجھ سے اس معاملے پر تفصیلی گفتگو کریں۔ یقیناً ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کو بتانے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔'' حاطب ہیرا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تو اس کا انداز اور طرزِ تخاطب بدل چکا تھا لیکن وہ نہ تو اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف متوجہ تھی اور نہ ہی اس کے بدلے ہوئے لہجے کی طرف۔ وہ تو بس شکوہ بھری نظروں سے داؤد کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ اس کی جانب دیکھنے سے گریزاں تھا۔

''میں اسے واپس نہیں لینا چاہتی داؤد! بے شک آپ کو اس ہیرے کے بارے میں حقائق کا ابھی علم ہوا ہے لیکن میں نے تو سب جانتے بوجھتے بہت سوچ سمجھ کر اسے آپ کے حوالے کیا تھا تاکہ اپنے محسنوں کے احسان کے بدلے مشکل وقت میں ان کے کام آ سکوں۔ بے شک اس علاقے میں آپ کو اس ہیرے کے مناسب دام نہیں مل سکیں گے لیکن اتنا تو ہوگا کہ ہماری بہت سی مشکلات کا حل مل جائے گا۔'' اس کے گریز کو محسوس کرنے کے باوجود وہ اس

سے مخاطب ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"معاف کیجیے گا سارہ! لیکن سچ یہ ہے کہ ہم اپنے چھوٹے سے احسان کا اتنا بھاری صلہ حاصل کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم اللہ کے نام پر لڑنے والے لوگ ہیں اور امید ہے کہ اللہ ہی اس مشکل وقت میں ہماری مدد کرے گا۔ آپ بس ہماری کامیابی کے لیے دعا کرتی رہیے گا۔"

"لیکن داؤد....."

"بس...." داؤد نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روکا اور اب تک خاموش تماشائی بنے سارہ کے عقب میں کھڑے عبدالمالک کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ "سارہ کو واپس چھوڑ کر آجاؤ عبدالمالک! تمہارے واپس آنے کے بعد میں چند اہم امور پر تم سے مشاورت کروں گا۔"

"جو حکم آقا!" عبدالمالک نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور واپسی کے لیے مڑا۔ سارہ کے پاس بھی واپس پلٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

رات تاریک تھی اور سیاہ آسمان پر کہیں کہیں ہی کوئی تارا دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑوں کی پناہ میں موجود عورتوں اور بچوں کی بیشتر تعداد محو خواب تھی لیکن مردوں میں سے اکثریت کو نیند نصیب نہیں تھی۔ انہیں اپنے پیاروں کی حفاظت کے لیے جاگتے رہنا تھا۔ جاگنے والے اپنے اپنے حصے کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دشمن کی طرف سے شب خون مارے جانے کے اندیشے کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سردارزادی لیلیٰ بذات خود ادھر ادھر گھوم کر اپنے جانبازوں کی مستعدی اور کارکردگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ سامنے کے رخ پر اس کے چند سپاہی نہایت خاموشی اور رازداری سے زمین پر جھکے کوئی کام انجام دے رہے تھے۔ وہ ان سپاہیوں کی وہاں موجودگی سے واقف نہ ہوتی تو اس اندھیرے میں ان کے تاریک سایوں کا تحرک اس کی نظر میں بھی نہ آتا۔

"ان کا کتنا کام باقی ہے عبید اللہ؟" اس نے کام کی نگرانی کرنے والے سے پوچھا۔

"تقریباً فارغ ہو چکے ہیں۔ آپ ان کی طرف سے اطمینان رکھیے۔ میں ان کی نگرانی کے لیے موجود ہوں گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔" عبید اللہ نے اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ مشورہ دیا۔

"داؤد اور تیمور اپنے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ انہیں رخصت کر دوں تو پھر کچھ دیر کمر ٹکا لوں گی۔ حالات سازگار دیکھ کر تم لوگ بھی باری باری آرام کر لینا۔" لیلیٰ نے اسے جواب دیا اور واپس پلٹ گئی۔ اس کے پیچھے اس کا ایک محافظ بھی موجود تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں داؤد اور تیمور سفر کی مکمل تیاری کے ساتھ اس سے اجازت لینے کے منتظر کھڑے تھے۔

"اللہ رب العزت آپ لوگوں کو کامیاب و کامران کرے۔ آپ کی کامیابی پر ہی ہماری بقا کا انحصار ہے۔"

"بے فکر رہیے سردارزادی! اللہ حق کی راہ میں لڑنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ انشاء اللہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہیں گے۔" داؤد نے اسے تسلی دی۔

"ہمارے مسلمان بھائیوں کو بتانا کہ ہمارے پاس جو کچھ تھا، ہم نے ان کی نذر کرنے کے لیے بھیج دیا ہے اور اب ہمارے لوگ اپنے پیٹ پر پتھر باندھے منتظر ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائی امت مسلمہ کے ایک جسم کے مانند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اس درد کو محسوس کریں گے جس سے ہم آج گزر رہے ہیں۔" وہ جو ہمیشہ اپنے مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کا ثبوت دیتی تھی، فرط جذبات کے باعث خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور اس کی آواز بھرا گئی۔

"آپ بے فکر رہیے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی اپنی بہن کی اس پکار کو ہرگز بھی نظر انداز نہیں کریں گے۔ میں انہیں قائل کرنے کے لیے اپنا سارا زور خطابت صرف کر دوں گا اور مجھے پوری امید ہے کہ میری یہ کوشش ہرگز بھی رائیگاں نہیں جائے گی۔" سردار مراد کی بہادر اور نڈر بیٹی کو یہ دلاسہ دیتے ہوئے اس نے وہی دکھ محسوس کیا جو اپنے وطن کی ماؤں بہنوں کی حفاظت کے لیے لڑتے ہوئے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ دراصل حقیقی رشتہ دین کا تھا۔ مشرق سے مغرب تک اس زمین کے طول و عرض میں جتنے بھی مسلمان آباد تھے ان سب سے اس کا ایک گہرا رشتہ تھا اور یہ رشتہ لا الہ الا اللہ کا رشتہ تھا۔

"اچھا تو پھر روانہ ہو جایئے۔ فی امان اللہ۔ اللہ آپ لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔" اس نے الوداعی الفاظ ادا کیے۔

"اجازت کے لیے شکریہ۔ اللہ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"اجازت دیجیے سردارزادی! انشاء اللہ اس مہم میں کامیابی حاصل کر کے میں روز حشر اللہ، اس کے رسول ﷺ اور سردار مراد کی روح کے سامنے سرخرو کھڑا ہوں گا۔" تیمور

نے بھی اس سے اجازت طلب کی۔

"انشاء اللہ۔ اللہ تمہارا مددگار ہو۔" نقاب کے پیچھے اس کی سیاہ آنکھیں جگمگائیں اور پھر وہ دھیرے سے مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ دونوں روانہ ہو چکے تو پہلے محافظ کے ساتھ پورے پڑاؤ کا ایک بار پھر چکر لگایا پھر حسب ارادہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنے لیے نصب کیے گئے چھوٹے سے خیمے میں آ گئی۔ ابھی چہرے سے نقاب ہٹا کر جسم پر سجے ہتھیار اتار ہی رہی تھی کہ ایک شور سا سنائی دیا۔

"لگتا ہے اندیشے سچ ثابت ہوئے اور وہ ملعون شب خون مارنے کے لیے آ پہنچے ہیں۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے دوبارہ پھرتی سے نقاب لگایا اور تلوار کے دستے پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے ہوئے باہر نکلی۔

"حملہ ہوا ہے سردار زادی.... لیکن آپ اطمینان رکھیے۔ ان میں سے ایک بھی سلامت واپس نہ جا سکے گا۔ داؤد بن معیز کی پیش کردہ تجویز ان حالات میں بے حد کارگر ثابت ہو رہی ہے۔" باہر نکلتے ہی اس کا اپنے ایک جانباز سے سامنا ہو گیا جس نے اسے تازہ ترین اطلاع فراہم کی۔

"شکر الحمدللہ! میں ان کافروں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنا پسند کروں گی۔" وہ جذباتی لہجے میں بولتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ جلد وہ پہاڑی بلندی پر موجود تھی اور اس کی نظریں سامنے پھیلی آگ اور بلبلا کر فرار کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ان ظالموں کو دیکھ رہی تھیں جنہیں آج دنیا میں ہی جہنم کا مزہ چکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نظارے کو دیکھتے ہوئے اس کا دل داؤد بن معیز کو بھی دعائیں دے رہا تھا کیونکہ یہ اسی کی تجویز تھی جس نے انہیں قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود دشمنوں کے بھاری حملے سے بچا لیا تھا۔

داؤد نے شب خون کے خطرے کے پیش نظر انہیں ایک انوکھی تدبیر بتائی تھی۔ اس کی ہدایت پر سردار زادی کے سپاہیوں نے رسیوں سے منسلک لکڑی اور لوہے کی میخیں راستے میں اس طرح گاڑ دی تھیں کہ راستے میں تنی ہوئی رسیوں کی ایک رکاوٹ سی کھڑی ہو گئی تھی۔ ان رسیوں کے ساتھ فاصلے سے مٹی کے ہنڈولے جھول رہے تھے اور ارد گرد خشک بھوسا اور جھاڑیاں وغیرہ بچھا دی گئی تھیں۔ مٹی کے ان ہنڈولوں میں مٹی کا تیل اور کچھ دوسرا آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا۔ تاریکی میں آنے والا دشمن جو اپنی آمد کو خفیہ رکھنے کے لیے بغیر روشنی کے آیا تھا، اپنے لیے بچھائے جانے والے اس جال میں بری طرح پھنس گیا۔ پہلے انجانے میں رسیوں سے ٹکرا جانے کے باعث ان کے گھوڑے توازن کھو بیٹھے اور لڑکھڑا کر اپنے سواروں کو بھی گرا ڈالا پھر رسے ٹوٹ کر زمین پر گرنے کے باعث مٹی کے ہنڈولے پھوٹے تو ان میں موجود آتش گیر مادہ ادھر ادھر پھیل گیا۔ پہاڑ پر پوری طرح چوکنا بیٹھے تیر اندازوں کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ جلتے سروں والے بس چند تیروں نے ہی ان کا مقصد پورا کر دیا۔ حملہ آور ٹولا اتنی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آیا کہ کسی کے دل میں لڑنے کا خیال ہی نہیں رہا اور ہر ایک سعی کرنے لگا کہ کسی طرح آگ کے ان شعلوں سے بچ کر واپس اپنی پناہ گاہ کی طرف دوڑ سکے۔ ان کی اس کوشش کو ناکام بنانے میں تیروں کی برسات کے ساتھ ساتھ آگ کے باعث بدحواس ہو جانے والے گھوڑوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ گھوڑے خود کو بچانے کے لیے بھاگے تو اپنے سموں تلے کئی انسانی جسموں کو بھی کچل ڈالا۔

"دشمن پر پہلی فتح مبارک ہو سردار زادی۔" وہ سامنے جلتے شعلوں کا رقص دیکھنے میں اتنی کھوئی تھی کہ خبر ہی نہیں ہو سکی کہ کب بابا قادر اس کی داہنی جانب آ کھڑا ہوا ہے۔

"فتح مبارک بابا! اتنے عرصے میں آج پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ میرے عزم اور حوصلے کے سوا بھی کوئی شے ہے جو مجھے اس لڑائی میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔" اس نے سامنے کے منظر سے نظر ہٹائے بغیر سرخوشی کے عالم میں جواب دیا۔

"درست فرمایا آپ نے سردار زادی! داؤد بن معیز پر اعتماد کرنا ہمارے لیے سودمند ثابت ہوا ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ ابتدا میں، میں نے اس بہادر نوجوان سے اختلاف کیا۔"

"آپ بھی اپنی جگہ درست ہی تھے کیونکہ آپ سامنے کے حقائق دیکھ کر رائے دے رہے تھے اور داؤد بن معیز نے اپنے اندر کی روشنی سے کام لیا تھا۔ وہ ایک مجاہد ہے بابا! جس کی تلوار نے کئی اسلام دشمنوں کے سر تن سے جدا کیے ہیں اور دنیا پر دہشت بن کر چھا جانے والے تاتاریوں سے لڑتا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم اور ہماری یہ مصیبت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے گیا ہے، اس میں ضرور کامیاب لوٹے گا اور ہم جلد اس مصیبت سے نجات حاصل کر لیں گے۔ بس اللہ میرے ساتھیوں کو اتنا صبر دے دے کہ وہ مصیبت کے یہ چند دن حوصلے سے گزار لیں۔" وہ اس وقت بہت جذباتی ہو رہی

تھی۔

"اتنی فکرمند نہ ہوں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔" اسے تسلی دیتے ہوئے بابا قادر کی نظریں آگ کے شعلوں پر تھیں اور ان شعلوں کا عکس اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔

"انشاءاللہ۔" آج جتنا یقین پہلے کبھی لیلیٰ کے لہجے میں نہ اترا تھا۔

"مخل ہونے پر معذرت چاہتا ہوں سردارزادی! لیکن آپ کو ایک نہایت اہم اطلاع دینی تھی۔" اچانک ہی سنائی دینے والی اس آواز نے لیلیٰ اور بابا قادر دونوں کو شعلوں پر سے نظریں ہٹا کر اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کردیا۔

"کیا بات ہے عبید اللہ! کیا اطلاع لے کر آئے ہو؟" اس نے آنے والے کو پہچان کر نرمی سے دریافت کیا۔

"ایک شخص کو فرار ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہے۔ اس نے اعتراف کرلیا ہے کہ وہ ثوبان کو داؤد اور تیمور کی روانگی کی اطلاع دینے جارہا تھا۔"

"اوہ..... تو داؤد کا یہ اندازہ بھی درست نکلا کہ ہماری صفوں میں دشمن کا کوئی جاسوس موجود ہوسکتا ہے اس لیے ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ یہاں سے کوئی بھی شخص باہر نہ نکل سکے۔" وہ اطلاع سن کر چونکی۔

"بدقسمتی سے ایسا ہی ہے۔" عبید اللہ نے جواب دیا۔

"کون ہے وہ بدبخت شخص؟" اب تک خاموش کھڑے بابا قادر نے گرج کر پوچھا۔

"مناسب ہے کہ آپ خود چل کر دیکھ لیں۔ عبدالمالک اس سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔" عبید اللہ نے براہ راست جواب دینے سے گریز کیا۔

"ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں۔" اس کے لہجے سے کچھ خاص محسوس کرتے ہوئے لیلیٰ فوراً اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ بابا قادر بھی ان کا ہم قدم تھا۔

"کون ہے یہ؟" ایک نسبتاً الگ تھلگ گوشے میں پہنچ کر لیلیٰ نے عبدالمالک کے زیر عتاب ایک نوجوان لڑکے کو دیکھا تو تاسف سے پوچھا۔

"یہ گرفتار ہونے والے قیدیوں میں شامل تھا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے اس کو باندھتے ہوئے رعایت برتی گئی تھی۔ اس رعایت کا فائدہ اٹھا کر یہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ عبدالمالک نے اس کی انگلی میں موجود انگوٹھی بروقت اتار لی ورنہ یہ انگوٹھی میں موجود زہر کھا کر کچھ بھی بتانے سے قبل خودکشی کرلیتا۔"

"اس قیدی کی انگلی میں انگوٹھی رہ کیسے گئی تھی؟ کیا

قلمی سفر

"سسپنس" میں میری پہلی کہانی اگست 2002ء کے شمارے میں تھی۔ عنوان تھا "خونِ عجب"۔ ملک کے کسی بڑے ڈائجسٹ کے لیے یہ میری پہلی کاوش تھی۔ یہ وہ دور تھا جب بڑے بڑے مصنفین کا طوطی بولتا تھا۔ ایسے میں پہلی ہی کاوش کا بارآور ہونا میرے لیے اس قدر حوصلہ افزا ثابت ہوا کہ پھر یہ سلسلہ اللہ کے فضل سے اب تک جاری ہے۔ اپنے بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن بقول محی الدین نواب مرحوم کے انسان فطرتاً بڑبولا ہے، لہٰذا اگر کہیں میری کوئی "بڑ" آجائے تو پیشگی معذرت۔

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے مصنفین کو جس قدر احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے اس کی مثال کہیں اور کم ہی ملتی ہے۔ "سسپنس ڈائجسٹ" میں میری پہلی کہانی کیا لگی کہ مجھے تب سے آج تک اس ادارے کے سسپنس ڈائجسٹ سمیت دیگر موقر پرچوں "جاسوسی ڈائجسٹ" اور "ماہنامہ سرگزشت" میں بھی [illegible] لکھنے کا [illegible] سلسلہ رہا، بلکہ ایک وقت ایسا بھی [illegible] ایک وقت میں تینوں پرچوں کے [illegible] کیونکہ مجھے [illegible] [illegible] [illegible] "سب اچھا" رہتا تو آج [illegible] نہ رہتا۔ سسپنس نے ہمیشہ اپنے مصنفین کی بہت مالی اور معنوی آبیاری کی ہے اور آج کے اس "سخت" دور میں بھی کررہا ہے جبکہ ڈائجسٹ ورسائل پر آج کل بڑا کڑا وقت ہے۔ سسپنس میں مجھے "دیوتا" اور "موت کے سوداگر" اور آخری صفحات میں چھپنے والی کہانیوں کے علاوہ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانیوں، عبدالقیوم شاد کی، مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ اور ریٹائرڈ ڈی ایس پی ملک منظور حیات نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ سسپنس کی کہانیوں نے ہی مجھے لکھنے پر مائل کیا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس کی مختصر کہانیوں میں بھی زندگی کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یوں زمانہ طالب علمی میں ہی..... لکھنے لکھانے سے شغف رہا۔ ایم بی بی ایس کی تعلیم کے دوران مطالعہ بھی جاری رہتا تھا۔ پھر 1993ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور عملی زندگی کا دور شروع ہوا۔ زندگی کا تنہا سفر میرا 1998ء اپریل تک رہا پھر میرے ساتھ کوئی شریک سفر ٹھہرا۔ اللہ نے اس پاکیزہ رشتے میں خیروبرکت دی اور تین پھولوں کی شکل میں، ماشاءاللہ دو بیٹے اور ایک بیٹی سے بھی نواز دیا۔ اس پاک پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ بس آخر میں یہی کہوں گا کہ "بات بنی رہے"۔ آمین۔ سسپنس کے پچاس سال ہم سب کو مبارک ہوں۔

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ثوبان کے لوگ پکڑے جانے پر سب سے پہلے خودکشی کی کوشش کرتے ہیں اسی لیے میں نے بطور خاص قیدیوں کی مکمل تلاشی لینے اور لباس کے سوا ان کی ہر شے قبضے میں لے لینے کی ہدایت کی تھی۔" عبیداللہ کی بات سن کر اس نے برہمی سے پوچھا۔

ابھی وہ اس کی بات کا جواب دے پاتا اس سے قبل ہی بابا قادر دل دہلا دینے والی آواز میں چیخ اور کسی کے کچھ سمجھنے تک اپنے خنجر سمیت زخمی حالت میں زمین پر پڑے قیدی پر جا گرا۔

"یہ کیا کیا آپ نے، دور ہٹیں۔" عبدالمالک نے شدید طیش کے عالم میں بابا قادر کو نوجوان کے اوپر سے دھکیلا لیکن پھر وہ یہ دیکھ کر گہرا سانس لے کر رہ گیا کہ خنجر دستے تک نوجوان کے سینے میں اترا ہوا ہے اور وہ بس اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

"چھوڑ دو مجھے۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس بدبخت کو۔ میں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلاؤں گا۔" بابا قادر ابھی تک باچھوں سے کف اڑا رہا تھا۔

"یہ مر چکا ہے۔ آپ اس کا اب مزید کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن آپ نے ہمارا بنا بنایا کام خراب کر دیا ہے۔" عبدالمالک نے مضبوطی سے اس کا بازو تھام کر سرد لہجے میں کہا تو وہ گویا ٹھنڈا ہو کر رہ گیا اور ندامت سے بولا۔

"معاف کرنا بیٹا! جذبات کی شدت کے باعث میں اندازہ نہیں کر سکا کہ مجھ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے لیکن اس وقت میں غم و غصے کی جس کیفیت سے گزر رہا ہوں تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔" دھیمی آواز میں اپنی بات مکمل کر کے اس نے مرنے والے نوجوان پر ایک نظر ڈالی اور ڈھلکے ہوئے کندھوں کے ساتھ مرے مرے قدم اٹھاتا وہاں سے جانے لگا۔

"یہ سب کیا ہے عبیداللہ؟" لیلیٰ نے جاتے ہوئے بابا قادر کی پشت دیکھی اور حیرت سے سوال کیا۔

"یہ بابا قادر کی بہن کا لڑکا تھا۔" عبیداللہ نے آہستہ سے بتایا۔

"یا میرے اللہ۔" لیلیٰ نے بے ساختہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا پھر سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ یہ لڑکا بھی ثوبان کے ساتھیوں میں شامل ہو چکا ہے؟"

"افسوس کہ ہمیں علم نہیں تھا۔ شاید یہ حال ہی میں ثوبان کا شاگرد بنا تھا یا پھر بے حد چالاک تھا کیونکہ بستی میں کسی نے اس کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کی۔" عبیداللہ نے شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا۔

"ایسا ہی ہوگا ورنہ بابا قادر کو اسے دیکھ کر اتنا شدید صدمہ نہیں ہوتا۔" لیلیٰ نے تبصرہ کیا پھر قدرے جھجکتے ہوئے انداز میں بولی۔

"بہرحال جو بھی تھا اب تو یہ مر چکا ہے۔ تم اس کی تدفین وغیرہ کا کام کسی کے ذمے لگا دو۔"

"جو حکم۔" عبیداللہ فوراً تعمیل حکم کے لیے حرکت میں آ گیا۔

"کاش! بابا قادر نے اسے ہلاک نہیں کیا ہوتا تو میں اس سے اس شخص کا نام اگلوا لیتا جس نے اسے مخبری کی ذمے داری سونپی تھی۔ یہ تو بالکل واضح ہے کہ قیدیوں میں سے کسی کو اخی اور تیمور کے ارادے کا علم نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا جس نے اس لڑکے کو اطلاع فراہم کی۔ ہم اس شخص تک پہنچ جاتے تو اپنی صفوں میں موجود غداروں کی سرکوبی آسان ہو جاتی۔" عبدالمالک نے لڑکے کی لاش پر نظریں جمائے افسوس سے کہا۔

"واقعی، اس کی موت سے بڑا نقصان ہو گیا لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ بابا قادر شروع ہی سے بڑے جذباتی آدمی ہیں۔ انہوں نے غصے میں سوچا ہی نہیں کہ ان کے عمل سے ہمیں کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"اور مجھے لگتا ہے کہ شاید انہوں نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔" عبدالمالک کے انداز میں دبا دبا غصہ تھا۔

"کیا مطلب؟" لیلیٰ چونکی۔

"اخی سے مجھے پتا چلا تھا کہ مشاورت کے وقت سب سے زیادہ بابا قادر نے ہی ان کی مخالفت کی تھی۔ اگر اس وقت اسفندیار صاحب ان کا ساتھ نہ دیتے تو بابا قادر اور ان کے ہمنوا حاوی ہو جاتے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ بابا قادر" لیلیٰ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکی اور سر کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ بابا قادر میرے والد سردار مراد کے قریبی ساتھی اور دوست رہے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے۔"

"بے شک آپ اپنے لوگوں کو ہم سے بہتر جانتی ہیں لیکن تاریخ کی اس اٹل حقیقت کو یاد رکھیے گا کہ غدار اور جاسوس ہمیشہ ہمارے قریبی دوستوں کی صف میں ہی پائے جاتے ہیں۔" عبدالمالک اپنی بات کہہ کر مزید رکنے کے بجائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''یا اللہ میری مدد کر! میں تیری بہت ادنیٰ بندی ہوں۔ اگر تُو نے میرا ہاتھ نہ تھاما تو میں ان اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاؤں گی۔'' نہایت رقت سے دعا مانگتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو وہ پہلے جتنا تاریک نہیں رہا تھا۔ رات بھر کے آرام کے بعد انگڑائی لے کر جاگتے سورج کی پہلی کرن چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی۔

''ان اندھیروں سے نہ گھبراؤ۔ اجالا نمودار ہونے کو ہے۔''

☆☆☆

''تو یہ آپ سب کا حتمی فیصلہ ہے؟'' امیر ارغل نے اپنے سامنے موجود لوگوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔ یہ اس کے وہ قابلِ اعتماد ساتھی تھے جنہیں وہ اس اہم مہم پر اپنے ساتھ لایا تھا اور ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ دورانِ سفر تمام امور سلیقے سے انجام پاتے رہے تھے لیکن اب یہ لوگ اس کے سامنے ایک غیر متوقع مطالبہ لے کر آ کھڑے ہوئے تھے۔

''بالکل امیر محترم! کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہم ایک درست مطالبے کے ساتھ آپ کے سامنے حاضر ہیں اور آپ سے امید رکھتے ہیں کہ آپ بطور مسلمان اس موقع پر ہمارا ساتھ ضرور دیں گے۔'' وہ مسلح افراد کی نگرانی، ترتیب و تنظیم پر مامور عہدے دار تھا جو نہایت احترام سے امیر کے سامنے فوراً اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

''لیکن ہم اس سب کی تیاری کے ساتھ نہیں نکلے تھے۔ ہم ایک سادہ سے کام کے لیے نکلے تھے۔ تم جس کام میں شامل ہونے کا مطالبہ کر رہے ہو، اس کے لیے ہمارے پاس نہ تو مناسب نفری ہے اور نہ ہی ہتھیاروں کی بڑی تعداد۔'' امیر نے جز بز سا ہو کر دلیل دی۔

''تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان اپنی تعداد اور ہتھیاروں سے زیادہ جذبے کے زور پر لڑتے ہیں۔'' ساشا کو اس کی ٹال مٹول اچھی نہیں لگی اس لیے بے ساختہ ہی بول پڑا۔

''اب جمعہ جمعہ آٹھ دن کا مسلمان ہونے والا شخص ہمیں اسلامی تاریخ سے آگاہ کرے گا۔'' امیر ارغل کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''اللہ کو اس سے غرض نہیں کہ کون پیدائشی مسلمان ہے اور کون نومسلم! اس کے ہاں تو فقط ایمان کی پختگی جانچی جاتی ہے۔'' امیر کے طنز کا اثر لیے بغیر مضبوط لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے اس نے ایک نظر حاضرین پر ڈالی۔ ان میں سے بیشتر چہروں کا تاثر بتا رہا تھا کہ وہ اس سے متفق ہیں۔ ان کے متفق نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ایک نئے مسلمان کی [illegible]''

امیر کے دربار میں حاضری سے پہلے سلیمان، صالح اور خود اس نے مل کر انہیں اس امر پر قائل کیا تھا کہ وہ اپنے مسلمان بہنوں کو قابوس اور قوبان جیسے مکار کافروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آگے بڑھنے کا نہیں سوچیں گے چنانچہ اب وہ ان کے ہمنوا بنے امیر کے سامنے کھڑے تھے۔

''یقیناً یہ تم ہو جس نے میرے لوگوں کو پرائی جنگ میں جھونکنے کی تجویز پیش کی ہے۔'' تجربہ کار امیر کے لیے درست اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

''یہ پرائی جنگ نہیں ہے امیر محترم! اس مشکل میں گرفتار لوگ ہمارے دینی بھائی ہیں اور یہی ایک وجہ ان کا ساتھ دینے کے لیے کافی ہے لیکن اگر آپ اس وجہ کو کافی نہ سمجھتے ہوں تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے مرحوم بھائی کی بیوہ کو اغوا کرنے کے بعد انہیں قتل کرنے والوں سے انتقام لینا آپ کی روایات کا حصہ ہے۔ اگر دولت کے حصول کی راہ سیدھی رکھنے کے لیے آپ اس انتقام کو بھول بھی جائیں تو آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو یہ آسانی یہاں سے نکل جانے دیں گے۔ وہ جان چکے ہیں کہ آپ ایک دولت مند انسان ہیں اور اس قافلے سے وہ اپنی جنگ جاری رکھنے کے لیے کافی کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے لامحالہ ان سے لڑنا پڑے گا تو پھر ہم صرف اپنی بقا کی جنگ کیوں لڑیں۔ ہم اپنے دینی بھائیوں اور حق کا ساتھ دے کر اس لڑائی کو جہاد میں کیوں نہ بدلیں تاکہ مرنے کی صورت میں شہادت کا رتبہ حاصل کر سکیں۔''

''ساشا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم حرام موت مرنے

کے مقابلے میں شہادت کی موت کو ترجیح دیں گے۔'' امیر کے ساتھ اس کے دلائل سنتے لوگوں نے فوراً ہی اس کی حمایت شروع کر دی۔

''ہم کچھ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آخر تم لوگوں کے دماغ میں یہ کیسا سودا سما گیا ہے۔ پہلے ہمیں قابوس سے بات چیت تو کرنے دو۔ اس کی طرف سے بھیجا گیا ایلچی ہم سے ملاقات کا منتظر ہے اور تم لوگ اپنی الگ راگنی چھیڑ کر بیٹھ گئے ہو۔ ہم ایلچی کے ذریعے قابوس سے صفیہ کے قتل کے بارے میں باز پرس کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس قتل کا قصاص ادا کر کے ہمیں اس علاقے سے بحفاظت جانے کی اجازت دے دے۔'' امیر ہر ممکن پہلو تہی کی کوشش کر رہا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ ایلچی آپ کے سامنے صفیہ بیگم کے قتل کا ذکر تک نہیں کرے گا کیونکہ انہیں زندہ ظاہر کر کے ہی آپ سے تاوان کی وصولی ممکن ہے۔ اگر آپ نے خود اس قتل کا معاملہ چھیڑا تو بہت ممکن ہے کہ وہ الٹا ہمیں ہی قاتل ٹھہرا دے۔ ایسے میں آپ قصاص کا مطالبہ کیونکر کر سکیں گے؟'' وہ امیر کے سامنے اتنا کچھ بولنے کے قابل تھا تو اس میں سلیمان اور صالح کا بھی بڑا ہاتھ تھا جنہوں نے اسے اس معاملے سے متعلق دینی اصطلاحات سے آگاہ کیا تھا اور اس نے اپنی فطری ذہانت کے باعث فوراً ہر شے ذہن نشین کر لی تھی۔

''ہم مانتے ہیں کہ تم بہت بڑے سورما ہو اور تم نے ہماری بیٹی کو اغوا ہونے سے بچا کر ہم پر ایک احسان بھی کیا ہے لیکن ایسی حالت میں جبکہ تم خود گھوڑے پر سوار ہو کر لڑنے کے لائق نہیں ہو، کیا تمہیں زیب دیتا ہے کہ ہمارے آدمیوں کو ہماری مرضی کے خلاف اکسا کر میدان جنگ میں دھکیل دو۔'' امیر کا غصہ اس کی زبان پر آ گیا۔

''صالح نے مجھے سیف اللہ کا نام دیا ہے اور وقت آنے پر آپ دیکھ لیں گے کہ اللہ کی یہ تلوار، اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں کبھی زنگ آلود نہیں ہو گی۔ میں مانتا ہوں کہ اس وقت میں زخمی اور کمزور ہوں لیکن میرے جذبے کی طاقت مجھے میرے ساتھیوں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔ بالکل رسول اللہ ﷺ کے ان صحابی کی طرح جنہوں نے میدان جنگ میں اپنا ایک ہاتھ کٹنے پر پرچم اسلام کو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا تھا اور دوسرا ہاتھ کٹنے پر اسے دانتوں سے پکڑ لیا تھا لیکن علم کو نیچے نہیں گرنے دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ادنیٰ سا امتی اگر ان کے ایک پیارے صحابی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنی جان گنوا بیٹھا تو یقین جانیے مجھے اپنی موت پر فخر ہو گا۔'' اس کی زندگی میں یہ یقیناً پہلا موقع تھا کہ سر عام آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ صالح کی سنگت میں کی جانے والی شب بیداریاں اپنا رنگ دکھا رہی تھیں۔

''سیف اللہ..... زندہ باد۔'' جذبات کی گرمی نے سلیمان کو حوصلہ دیا کہ وہ امیر ارغل کے دربار میں موجود ہوتے ہوئے یہ نعرہ بلند کر سکے۔ اگلا پل خود اس کے لیے حیران کن تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی یہی نعرہ لگا رہے تھے اور امیر ارغل کا سر شکست خوردہ ہو کر جھک گیا تھا۔ حقیقتاً اب باہر منتظر قابوس کے ایلچی سے ملاقات کرنا یا نہ کرنا بے معنی ہو چکا تھا۔ خود سا شادم بخود سا اپنی دھندلائی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ یقیناً قبول اسلام کا اعجاز تھا کہ وہ جو کل تک ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا سرغنہ تھا، آج سیف اللہ بن کر ایک امیر کے دربار میں اس سے زیادہ باعزت مقام پر موجود تھا۔ (اور وہ جسے چاہے ذلت دے اور جسے چاہے عزت دے)۔

☆☆☆

''کیا صورت حال ہے کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟'' چمکتی دھوپ میں پہاڑ کی بلندی پر موجود لیلیٰ نے قریب کھڑے عبید اللہ سے سوال کیا تو اس کے لہجے میں اس پریشانی کا عکس نہیں تھا جس نے نیند کو اس کی آنکھوں سے دور رکھا تھا۔ نیند سے محروم نقاب سے جھانکتی آنکھوں کی سرخی البتہ نمایاں تھی لیکن عبید اللہ کی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس بابت اس سے کوئی سوال کر سکے۔

''الحمدللہ! سب ٹھیک ہے۔ ہم نے ان کافروں کو ایسا سبق سکھایا ہے کہ کئی دنوں تک بیٹھ کر اپنے زخم چاٹتے رہیں گے اور دوبارہ اس طرف آنے کی ہمت نہیں کریں گے، انشاءاللہ۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ ذرا سا سنبھالا لیتے ہی وہ دوبارہ ہم پر چڑھائی ضرور کریں گے۔'' تشویش زدہ لہجے میں بولتے ہوئے وہ کنارے کی طرف آ کھڑی ہوئی اور سامنے موجود منظر کا جائزہ لینے لگی۔ آگ سے جل جانے والا سوکھا بھوسا خاک بن کر ہوا کے زور سے ادھر ادھر بکھر چکا تھا لیکن رات کے معرکے میں جل کر مر جانے والے ایک گھوڑے اور دو افراد کی لاشیں ابھی تک وہیں پڑی ہوئی تھیں۔

''اگر انہوں نے ایسا کیا تو انہیں ایک بار پھر ہزیمت کی کھانی پڑے گی۔ ہمارے تیر انہیں آگے آنے کا موقع نہیں دیں گے۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا کہ ان میں اتنی بھی ہمت نہیں کہ آ کر اپنے

مرنے والے ساتھیوں کی لاشیں ہی اٹھا کر لے جائیں۔"

"دشمن کو کمزور نہیں سمجھو عبید اللہ! وہ صرف انتظار کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہم ان پہاڑوں میں محصور ہو چکے ہیں اور ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ چند دن سے زیادہ یہاں ٹھہر سکیں۔ چند دن بعد ہمارے لوگ بھوک سے گھبرا کر شاید خود ہی ان کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔" اس کی نظریں پہاڑوں سے بہت دور نظر آتے دشمنوں کی نقل و حرکت کو دیکھ رہی تھیں۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ دونوں ہی فریق ایک دوسرے کو اپنے تیروں کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

"شاید آپ پر رات والے واقعے کا اثر ہے۔ مجھے بھی اس واقعے پر تشویش ہے اس لیے میں نے اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کو تاکید کر دی ہے کہ یہاں موجود ہر شخص کو نظروں میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ یہاں سے کوئی شخص نکل کر نہ جا سکے۔ انشاء اللہ یہاں سے ایسی کوئی خبر دشمنوں تک نہیں جائے گی جو ہمیں نقصان پہنچا سکے۔" عبید اللہ اسے تسلی دینے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

"اللہ کرے داؤد اور تیمور اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔ ان کی کامیابی ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتی ہے۔" وہ جانتی تھی کہ اشیائے ضرورت کے علاوہ ان کے پاس ہتھیاروں کی بھی قلت ہے۔ اگر دشمن بے جگری سے کام لیتے ہوئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان پر ہلا بول دیتا تو تیروں کے محدود ذخیرے اور لڑنے والوں کی قلیل تعداد کے ساتھ ان کے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا اسی لیے اپنی فطری بہادری اور بے باکی کے باوجود اس کی تشویش کم نہیں ہو رہی تھی۔

"انشاء اللہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ خاص طور پر مجھے داؤد بن معیز سے بہت امید ہے۔ اس شخص میں دلوں کو تسخیر کر لینے کی صلاحیت ہے۔ جیسے اتنے مختصر عرصے میں اس نے ہم سے اپنا آپ منوا لیا ہے ویسے ہی وہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو بھی ہماری مدد کے لیے قائل کر لے گا۔" عبید اللہ کے جواب نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا اور ہلکے پھلکے خوشگوار لہجے میں بولی۔

"تم میں یہ بات اچھی ہے عبید اللہ کہ تم خوش گمان ہو اور دوسروں کو بھی مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبنے نہیں دیتے۔"

"تعریف کے لیے شکریہ۔" عبید اللہ نے سر کو ذرا سا خم کیا۔

"ہاں بیٹا! تم اپنے دوست کو کھانے پر بلا سکتے ہو۔ تم بھی خوش اور میں بھی۔"

"اب میں چلتی ہوں۔ ذرا خواتین اور بچوں کا بھی حال دریافت کر لوں۔ اس مشکل وقت میں ان کی ثابت قدمی اور صبر ہمارا بہت بڑا سہارا ثابت ہوں گی۔" وہ وہاں سے پلٹ گئی۔

خواتین والے حصے میں سب سے پہلے اس کا طیبہ سے سامنا ہوا۔ وہ کچھ بچوں کو اپنے سامنے بٹھائے انہیں اسلامی تاریخ کا کوئی قصہ سنا رہی تھی۔

"بہت خوب، پیاری لڑکی۔ ہمیں اس وقت ایسی ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔" اس نے خوش ہو کر طیبہ کو سراہا۔

"میں سارہ اور ثریا بہن کی طرح تلوار سونت کر دشمنوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی اس لیے یہ چھوٹی سی خدمت اپنے ذمے لے لی ہے۔" وہ ملکہ کے احترام میں کھڑی ہو گئی اور شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"جو تم کر رہی ہو یہ کوئی چھوٹا کام نہیں ہے۔ کاش! ہماری ساری مسلمان مائیں اپنے بچوں کو یہی قصے سنا سنا کر پروان چڑھائیں تو اس بات کی نوبت ہی نہ آ سکے کہ ذوبان جیسے مکار ہماری جڑیں کھوکھلی کر سکیں اور معصوم ذہنوں کو بہکا کر ہمارے ہی خلاف کھڑا کر سکیں۔" وہ طیبہ کا شانہ تھپک کر آگے بڑھ گئی۔ دوسری چند خواتین سے مختلف نوعیت کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے آگے بڑھی تو ایک جگہ سر جوڑے بیٹھی سارہ اور ثریا نظر آ گئیں۔

"کیا کسی گمبھیر مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے؟" وہ خود بھی ان کے قریب بیٹھ گئی اور مسکرا کر پوچھا۔

"ہم غور کر رہے تھے کہ ہمیں دوسری عورتوں کے ساتھ

یہاں فارغ بیٹھنے کے بجائے مردوں کے شانہ بشانہ فرائض انجام دینے چاہئیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی پہرے کے فرائض انجام دے کر مردوں پر سے تھوڑا بوجھ کم کر سکتے ہیں۔" ثریا نے زیرِ گفتگو معاملہ فوراً اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تم لوگوں کا جذبہ قابلِ تعریف ہے لیکن فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم لوگوں کو اپنی محفوظ پناہ کے طور پر بچا کر رکھنا زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔ ویسے بھی رات جیسے ہم نے دشمنوں کے قدم اکھاڑے ہیں، وہ جلد دوبارہ ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔"

"واقعی! رات بہت خوب رہی۔ اخی کی تجویز پر اتنی عمدگی سے عمل درآمد کیا گیا کہ دل خوش ہو گیا۔" ثریا چہک کر بولی۔ بہن ہونے کی حیثیت سے فطری طور پر اسے اپنے بھائی کی تعریف کرنا اچھا لگتا تھا۔

"تمہارے بھائی بہت باصلاحیت انسان ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی صلاحیتیں آگے بھی ہمارے لیے آسانیاں پیدا کریں گی۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" ثریا خاصی پُرجوش تھی۔ لیلیٰ نے اس کا یہ انداز دیکھا اور سارہ کی طرف متوجہ ہوئی جو اب تک ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

"کیا بات ہے سارہ! تم بہت خاموش نظر آ رہی ہو؟"

"دیکھا، آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں نا لیکن جب بھی بات میں کہتی ہوں تو یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔" سارہ کے جواب دینے سے قبل ثریا بول پڑی۔

"ان محترمہ کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی دوسرے کے بولنے کی گنجائش نظر آ رہی ہے؟" سارہ نے قصداً ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر شوخ لہجے میں کہا تو لیلیٰ ہنس پڑی پھر رسانیت سے بولی۔

"اچھے دوست اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ثریا جیسی بے لوث سہیلی کا ساتھ ملا ہوا ہے۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں ہے، بس کبھی کبھار اس کی سوئی غلط جگہ اٹک جاتی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں مسلسل دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ الجھی ہوئی ہو اور کل رات سے تو اس کیفیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے لیکن مجھے اس بارے میں کچھ بتانے کے بجائے اسے مسلسل میری غلط فہمی قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" ثریا کے انداز میں اس بار خفگی تھی۔

"میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔ تم دونوں سہیلیاں خود ہی مل کر اس مسئلے کو سلجھا لینا۔" لیلیٰ کو لگا کہ اگر سارہ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو یقیناً وہ اس کی موجودگی میں ثریا کو بتانے میں جھجک محسوس کرے گی اس لیے اپنا وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی اس کے شانوں پر بھاری ذمے داری تھی اور اسے بہت سے امور کی نگرانی کرنی تھی۔

"کل تم عبدالمالک کے ساتھ اخی کے بلاوے پر ان سے ملنے گئی تھیں اور جب وہاں سے واپس آئیں تو تمہارے چہرے کی رنگت بدلی ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد ہی تمہاری کھوئی کھوئی کیفیت میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ کیا وہاں کوئی مسئلہ ہوا تھا؟" لیلیٰ کے چلے جانے کے بعد ثریا نے یوں اپنی تفتیش کا ازسرِنو آغاز کیا جیسے اس سے سچ اگلوائے بغیر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

"ہم ہر طرف سے مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایسے میں داؤد کا ایک نازک کام کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ یقیناً پریشانی کی ہی بات تھی۔ کیا تم خود اپنے بھائی کے لیے پریشان نہیں ہو؟" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"میں ایک عرصے سے اخی کو خطروں سے کھیلتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ وہ جہاں بھی ہوتے ہیں، میری دعائیں ان کے ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔ میں اپنی ہر سانس کے ساتھ ان کی سلامتی کی دعا کرتی ہوں لیکن تمہاری طرح یوں اپنی سدھ بدھ نہیں کھو دیتی۔" اس نے ایک طرح سے سارہ کا استدلال رد کر دیا لیکن پھر کوئی رگ پھڑکی اور شرارت سے بولی۔

"تم..... اور اخی کے لیے ایسی پریشانی؟ اللہ اللہ کہیں میں دن میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟ کہیں اخی کا جذبہ رنگ تو نہیں لے آیا ہے جو پتھر میں جونک لگ گئی ہے۔"

"شروع ہو گئی تمہاری بکواس۔ شکر ہے تمہارے اخی تمہارے جیسے فضول انسان نہیں ہیں۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"وہ تو ہے۔ میرے اخی جیسا جوان چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گی تو خوارزم سے ہندوستان تک ایک بھی نہیں ملے گا لیکن یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ محبت کرنا فضول لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ تو آفاقی جذبہ ہے محترمہ جو کسی کے بھی دل میں جگہ بنا سکتا ہے۔ کیا تم نے کبھی اخی کی آنکھوں کے رنگ نہیں دیکھے جن میں تمہارے لیے محبت ہی محبت جھلک رہی ہوتی ہے۔" ثریا کی ذہنی رو بھٹک کر دوسرے ایسے موضوع کی طرف جا پہنچی تھی جس پر بات کرنا اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے ثریا کہ میں اس موضوع پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی پھر کیوں بار بار اسے چھیڑ کر مجھے پریشان

کرتی ہو۔'' ایک تو وہ ویسے ہی اُلجھی ہوئی تھی اس پر یہ موضوع چھیڑنے پر مزید زچ ہوگئی اور چڑچڑے پن سے بولی تو ثریا کا چہرہ اتر گیا۔

''معذرت چاہتی ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔'' اس کا لہجہ بے حد پست تھا۔

''مجھے افسوس ہے ثریا! میں تم سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن......'' سارہ کو احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ سخت لہجے میں بول گئی ہے تو شرمندہ سی ہوکر وضاحت پیش کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن ثریا نے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔

''تمہاری غلطی نہیں ہے۔ مجھے خود ہی احتیاط کرنی چاہیے تھی۔'' باوجود اس ہونے کے اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور زبردستی آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''ارے میں تو بھول ہی گئی تھی کہ مجھے روٹیاں پکانے والی خواتین کی مدد کرنی تھی۔ وہ میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ مجھے فوراً جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' سارہ نے اس کا بہانہ قبول کرلینے میں ہی عافیت جانی اور اداسی سے اس کے جاتے ہوئے قدموں کو دیکھنے لگی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو آہستہ سے اپنے لباس کے نیچے موجود شے کو چھوا۔

''مخاطب نے تمہارے متعلق جس راز کا تذکرہ کیا ہے، وہ شاید میں بھی جان سکتی ہوں لیکن میں اسے کھول کر تمہارے ساتھ بددیانتی نہیں کرنا چاہتی۔ تمہارے بابا نے اسے صرف تمہارے لیے لکھا تھا اس لیے اسے کھولنا تمہارا ہی حق ہے۔'' انگلیوں کی پوروں سے اس لمبی اور سخت شے کو چھوتے ہوئے وہ اس سے مخاطب تھی جو اسے سن ہی نہیں سکتا تھا۔

''لگتا ہے مجھے حاطب کی پیشکش پر ہی غور کرنا ہوگا۔ یقیناً وہ تمہارے بارے میں کچھ ایسا جانتا ہے جس سے تم خود بھی واقف نہیں اور جسے جاننا تمہارے لیے ضروری ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ یہاں سے نکل جانے کے بعد میں خود تمہیں تلاش کروں گی اور تمہاری امانتیں تم تک پہنچا کر اپنی ساری خطاؤں کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گی۔''

ثریا سے ہونے والی ناخوشگوار گفتگو نے اسے شدت سے احساس دلایا تھا کہ بچھڑنے والے سے اس کے تعلق کی نوعیت میں کتنی گہرائی تھی کہ وہ داؤد بن معیز جیسے شاندار انسان کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ جب اس کے سوا کوئی قابلِ قبول نہیں تھا تو پھر سفر بھی اسی کی جانب ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہاں تھا، بے شک وہ نہیں جانتی تھی لیکن امید کرسکتی تھی کہ اس کا جذبۂ دل ایک نہ ایک دن اسے اس تک ضرور لے جائے گا۔

☆☆☆

''تو سائرس شہید ہوگیا؟'' صالح کی دی گئی اطلاع سن کر ساشا نے افسردگی سے کہا۔ اس کی طرح باقی تمام حاضرینِ مجلس نے بھی اس اطلاع پر دکھ محسوس کیا تھا۔

''اس بہادر نوجوان نے میری جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرکے مجھے قرض دار کردیا ہے۔ اب اگر آپ میں سے کوئی اپنے قدم پیچھے ہٹا بھی لیتا ہے تو میرے لیے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں ہوگا۔ میں اپنے خون کے آخری قطرے تک اس مقصد کے لیے لڑوں گا جس کے لیے سائرس نے اپنی جان کی قربانی دی۔'' صالح اس وقت بہت جذباتی ہورہا تھا۔ سائرس کی شہادت کی اطلاع اسے اسی گڈریے سے ملی تھی جو اپنے جانور چراتا چراتا اس طرف آنکلتا تھا۔ اس طرف آنے میں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اسے دودھ اور گوشت کے عوض اچھی خاصی معقول آمدنی ہوجاتی تھی۔ قافلے کے لیے ان اشیاء کی خریداری کی ذمے داری صالح ہی ادا کررہا تھا اس لیے اس کو گڈریے سے باتوں باتوں میں معلومات حاصل کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ قابوس کی رہائش گاہ میں کسی کے داخل ہوکر تباہی پھیلانے اور پھر کامیابی سے فرار ہوجانے کی داستان اس نے ایک حیرت کے ساتھ سنانے کے ساتھ ساتھ یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ حملہ آور کے بچ سلامت نکل بھاگنے میں مقامی قہوہ خانے کے ملازم سائرس کا بنیادی کردار تھا۔ اس کی دخل اندازی کی وجہ سے محافظ فرار ہوتے حملہ آور پر اپنی توجہ مرکوز نہیں رکھ سکے تھے اور وہ خاصا سخت مقابلہ کرنے کے بعد محافظوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

''بے فکر رہو صالح! ہم میں سے کوئی اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے گا۔ کم از کم میں تو بالکل نہیں۔ میں تمہیں عہد دیتا ہوں کہ تم مجھے ہر موقع پر صفِ اول میں پاؤ گے۔'' ساشا اس کے جذبات کو سمجھ رہا تھا اس لیے فوری طور پر حلف دینے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔

''میں بھی اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ دینے کے لیے قسم اٹھاتا ہوں۔'' ساشا کے فوراً بعد اٹھنے والا دوسرا ہاتھ سلیمان کا تھا۔

''میں بھی...... میں بھی۔'' سلیمان کے بعد حلف اٹھانے والوں کی قطار لگ گئی اور حاضرین میں سے کوئی

ایک ایسا نہ رہا جس نے حلف نہ دیا ہو۔

"آپ سب کا بہت شکریہ قابلِ احترام اصحاب۔ میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے اس غلام کو اتنی عزت دی۔" فرطِ جذبات سے صالح کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"میرے خیال میں اب ہمیں رسمی اور جذباتی باتیں چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آجانا چاہیے۔" ساشا نے پہلے مسکرا کر صالح کی طرف دیکھا پھر سب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر باوقار لہجے میں بولا۔ یہاں موجود افراد میں سے بیشتر افراد اس سے عمر اور عہدے میں بالاتر تھے لیکن اس کے فطری اعتماد اور قائدانہ صلاحیتوں نے اسے ایسی حیثیت دے دی تھی جیسے وہ ان کا سردار پیدا ہوا ہو۔

"ہم یہاں اپنا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ہی جمع ہوئے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟" سبکتگین نامی ایک سردار نے اپنے باقی ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

"اس پر بھی بات کرتے ہیں لیکن اس سے قبل میں صالح سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنا رخ صالح کی طرف کر دیا۔

"حاضر ہوں آقا۔" وہ پورے دل و جان سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"گذریے سے تمہیں صفیہ بیگم کے قتل کے سلسلے میں بھی کوئی سن گن ملی تھی یا نہیں؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ حملہ آور آخر کس مقصد کے تحت قابوس کی رہائش گاہ میں داخل ہوا تھا لیکن اسے کوئی علم نہیں تھا۔ بس اندازے قائم کر رہا تھا کہ وہ جو بھی تھا اسے محافظوں کی بروقت مداخلت کے باعث اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی اور وہ بیرونی احاطے میں ہی تباہی پھیلا کر بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گیا۔" صالح نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"امیرِ محترم سے ملاقات کے لیے آنے والے قابوس کے ایلچی نے بھی اس سلسلے میں منہ سے بھاپ نہیں نکالی۔ ہاں اس نے دبے لفظوں میں یہ الزام ضرور لگایا کہ شاید قافلے والوں میں سے کسی نے رہائش گاہ میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی ثبوت نہ ہونے کے باعث اس نے امیرِ محترم کو زبانی کلامی دھمکیاں دینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اس کا اصل زور تاوان کی جلد از جلد ادائیگی پر تھا۔" سلیمان نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔

"امیرِ محترم نے اسے کیا جواب دیا؟" ایک شخص نے دلچسپی سے پوچھا۔ ایلچی سے ہونے والی ملاقات کا احوال امیر نے صرف سلیمان کو سنایا تھا اس لیے اسے ہی معلومات حاصل تھیں۔

"فی الحال تو امیر نے اسے ٹال دیا ہے لیکن وہ دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا گیا تو صفیہ بیگم کو قتل کرنے کے ساتھ ساتھ پڑاؤ پر حملہ بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے یقین نہیں کہ امیرِ محترم نے اس دھمکی کو خاموشی سے سن لیا ہوگا۔"

"بالکل۔ انہوں نے ایلچی کو جواب دیا کہ قابوس چاہے تو اپنا یہ شوق پورا کر لے۔ وہ ہمارے پہرے داروں کو اپنے استقبال کے لیے تیار پائے گا۔"

"بہت خوب! صلیبیوں کی بستی میں لڑنے والے مردوں کی غیر موجودگی کی اطلاع نے امیرِ محترم کو کم از کم اتنی جرأت تو دی کہ وہ کوئی منہ توڑ جواب دے سکیں۔" ساشا کے اس بے ساختہ تبصرے نے کئی افراد کو دھیرے سے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

"بہرحال ہم بالکل درست سمت میں جا رہے ہیں۔ امیر کے اس جواب نے قابوس پر یہ تو واضح کر دیا ہوگا کہ ایک بار دھوکے سے پڑاؤ سے کسی عورت کو اغوا کر لے جانے کا مطلب نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ آسانی سے ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ امیر کی اس جرأت سے وہ سمجھ گیا ہوگا کہ اپنے گنے چنے ناکارہ ساتھیوں کے ساتھ پڑاؤ پر حملے کی غلطی اسے بہت مہنگی پڑے گی۔"

"بالکل جناب! اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہاں چڑیا کا بچہ بھی پر مار سکے۔" مسلح افراد کے نگران سفیر اللہ نے سینہ ٹھونک کر دعویٰ کیا۔

"ہمیں جاسوسوں کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا ہوگا۔ وہ گذریا اور دوسری اشیائے ضرورت فروخت کرنے کے لیے پڑاؤ تک آنے والی خواتین میں سے کوئی بھی جاسوس ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں دھیان رکھنا ہوگا کہ بے دھیانی میں بھی ہماری زبان سے ایسا کوئی لفظ ادا نہ ہو جو انہیں ہمارے ارادوں کی معمولی سی بھی بھنک دے سکے۔" اس نے سنجیدہ کر دینے والے انداز میں ہر فرد کا چہرہ دیکھا۔

"ہم میں سے ہر ایک خیال رکھے گا اور دیگر کو بھی اس سلسلے میں متنبہ کردے گا۔" یقین دہانی کروائی گئی۔

"تم بتاؤ صالح! کیا صلیبیوں کی بستی میں سارس کے علاوہ بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس کا ساتھی ہو اور جو سردار مراد کی بستی والوں سے ہمارا رابطہ کروا سکے کیونکہ ان سے رابطہ

ہو جانے کی صورت میں ہم زیادہ بہتر لائحہ عمل طے کر سکیں گے۔" اس نے روئے سخن دوبارہ صالح کی طرف کر دیا۔

"یقیناً ایسا کوئی شخص موجود ہوگا کیونکہ سارس نے مختصر وقت میں ہمارے فرار کے لیے دو گھوڑوں کا انتظام کر دیا تھا۔ قہوہ خانے کا معمولی ملازم سارس تو گھوڑوں کا مالک ہو نہیں سکتا اس لیے یقینی طور پر اس نے کسی سے مدد لی تھی۔"

"تمہارے الفاظ سے ظاہر ہے کہ تم اس شخص سے واقف نہیں ہو۔" ساشا کے ماتھے پر بل پڑے۔

"افسوس کہ مجھے معلوم کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی لیکن میرے خیال میں قابوس کی ملازمہ شیبا جس نے اس کی رہائش گاہ میں داخلے کے انتظامات کیے تھے، ضرور اس شخص سے واقف ہوگی۔ وہ سارس سے بہت نزدیک تھی اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کے قریبی میل جول کے افراد کو نہ جانتی ہو۔"

"وہ ملازمہ اب تک گرفت میں آنے سے بچ گئی ہوگی تو میں اسے ایک معجزہ سمجھوں گا۔ قابوس جو آس پاس کی ہندو آبادیوں کو اپنے ساتھ شامل کر کے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور در پردہ اس پورے علاقے میں صلیبیوں کی حکمرانی کی گھناؤنی سازش کر رہا ہے، اتنی عقل تو رکھتا ہوگا کہ اس اہم مہرے کو فوری طور پر گرفت میں لے کر اس سے سچ اگلوا لے۔"

"آپ کی بات قرین از قیاس ہے لیکن میں دعا کروں گا کہ وہ لڑکی خوش قسمت ثابت ہوئی ہو اور قابوس کے زیرِ عتاب آنے سے بچ گئی ہو۔" صالح نے اتنی سادگی سے جواب دیا کہ اس کا سارا غصہ فرو ہو گیا اور ہنس کر بولا۔ "آمین۔"

"اچھا جناب! یہ معاملہ تو ہم قسمت پر چھوڑتے ہیں اور اب آ جاتے ہیں ایک دوسرے اہم معاملے پر۔ صالح کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس نے قابوس کی رہائش گاہ کے احاطے کے بڑے حصے میں گھوڑوں کی کثیر تعداد دیکھی تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ اس کے جنگجو سردار مراد کی بستی کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں، وہاں اتنی بڑی تعداد میں گھوڑے پائے جانا کیا حیران کن بات نہیں ہے؟" اس نے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ سب کے چہروں کا جائزہ لیا۔

"یقیناً اس نے اتنے گھوڑے اپنے حلیفوں کے لیے جمع کر رکھے ہوں گے۔ صالح نے بتایا تھا کہ قابوس کے آدمی قریبی ہندو بستیوں سے مدد مانگنے گئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے گھوڑے ان ہندوؤں کو دے گا کہ یہ لو اور جاؤ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑو۔" ایک جوان نے پُرجوش لہجے میں خیال آرائی کی۔

"ذرا وہ سوٹ تو دکھانا جس میں ایک کوٹ کے ساتھ دو پتلونیں ہوتی ہیں......"

"بالکل درست۔ میرا بھی یہی اندازہ ہے۔" اس نے جوش سے دی گئی رائے کی پُرجوش تائید کی اور بلند آواز میں بولا۔

"کسی جنگجو کے لیے تلوار، تیر کمان اور گھوڑے کی بے پناہ اہمیت ہوتی ہے۔ ہمیں قابوس کے جنگجوؤں کو ان گھوڑوں سے محروم کرنا ہے۔ ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان گھوڑوں میں سے بڑی تعداد ہم خود حاصل کر سکیں تاکہ ہمارے جو ساتھی گھوڑوں سے محروم ہیں، انہیں سواری مہیا ہو جائے۔ بالفرض ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے تو ہمیں مجبوراً ان گھوڑوں کو ناکارہ کرنا ہوگا۔ کیا آپ میں سے کوئی اس اہم کام کی ذمے داری اپنے سر لینے کو تیار ہے؟"

"میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ مہم سر کروں گا۔" اسے اپنے سوال کا جواب پانے کے لیے لمحہ بھر بھی انتظار نہیں کرنا پڑا اور گھوڑے جمع کرنے سے متعلق درست اندازہ لگانے والے جوان العمر شخص نے جوش سے اعلان کیا۔

"یہ اعزاز الدین ہے۔ امیر زادی حورم کا ننھیالی عزیز۔ سنا ہے یہ امیر زادی سے نکاح کے خواہش مندوں میں سے ایک ہے۔" ساشا کے دائیں جانب بیٹھے سلیمان نے اتنی دھیمی سرگوشی میں اسے آگاہ کیا کہ اس کی آواز کا ساشا کے علاوہ کسی دوسرے کے کانوں تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔

"بہت خوب! تمہارا یہ کارنامہ ہماری کامیابی میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔ جاؤ اور یہ اعزاز اپنے نام لکھوا لو۔" اس نے سلیمان کی سرگوشی کا کوئی ردعمل اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور اعزاز الدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے جوش دلانے والے انداز میں بولا۔

"میرا مشورہ ہے کہ آج ہی گھوڑوں کی خوراک کے لیے چارے وغیرہ کا انتظام کرلیا جائے تاکہ یہاں موجود ہمارے گھوڑوں کو اپنے نئے آنے والے ساتھیوں سے اپنی خوراک بانٹنی نہ پڑے۔" اعزازالدین کا حوصلہ آسمان تک پہنچا ہوا تھا۔

"شاندار...... بہت خوب۔ ہمارے ہر ساتھی کے اندر یہی جذبہ اور جوش و ولولہ ہونا چاہیے۔" اعزازالدین کے جواب نے اسے خوش کر دیا۔

"ہمیں مالی معاملات پر بھی توجہ رکھنی ہوگی۔ کوئی بھی لڑائی لڑنے کے لیے وسائل کا ہونا ضروری ہے۔" ایک شخص نے توجہ دلائی۔

"عام لڑائی اور جہاد میں فرق ہوتا ہے۔ جذبۂ جہاد ہو تو مومن بے تیغ بھی لڑتا ہے اور پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی لیکن بہرحال آپ کی بات کو مکمل نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اس لیے سب سے پہلے میں اعلان کرتا ہوں کہ میں زادِ راہ کے طور پر جو رقم اپنے ساتھ لایا تھا، وہ اس جہاد کے لیے عطیہ کرتا ہوں۔" اس بار بولنے والا سلیمان تھا جس نے اپنی بات کے اختتام کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی پوٹلی نکالی اور سب کے درمیان رکھ دی۔

"میں بھی امیر محترم کی طرف سے دیے گئے تمام انعامات و اکرام کو اس نیک مقصد کے لیے ہدیہ کرتا ہوں۔" ساشا نے سلیمان کی تقلید کرنے میں دیر نہیں کی۔ اصل میں وہ پہلے ہی ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار ہو کر بیٹھے تھے۔ یہ تو اتفاق تھا کہ انہیں اس سلسلے میں درخواست کرنے کی ضرورت نہیں پڑی اور خود ہی یہ مسئلہ چھڑ گیا۔ ان کی طرف سے عطیات کی ادائیگی میں پہل کے بعد دوسرے لوگوں کے لیے بھی پیچھے رہنا ممکن نہیں رہا۔

"اگرچہ سفر میں، میں بہت زیادہ مال و متاع اپنے ساتھ لے کر نہیں چلا ہوں لیکن جو کچھ پاس ہے حاضر ہے۔" اس موقع پر بھی اعزازالدین نے اپنے ساتھیوں پر سبقت حاصل کرلی۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک اعلان کرتا چلا گیا اور ایک بڑا مسئلہ دیکھتے ہی دیکھتے حل ہو گیا۔

"آپ سب معززین کا بے حد شکریہ۔ اس مال و اسباب سے پہلے ہم ضروری اشیاء کا انتظام کریں گے پھر باقی رقم ان غریب سپاہیوں میں تقسیم کردی جائے گی جو ہم سب سے زیادہ محنت کرتے ہیں لیکن ان کا معاوضہ بے حد قلیل ہے۔ ان سپاہیوں میں بھی امیر سفیان کے ان آدمیوں کو ترجیح دی جائے گی جو گرفتاری کے بعد خون کے پیالے پر ہمارے امیر محترم سے وفاداری کا عہد کر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پسے ہوئے اور مسلے ہوئے لوگ ہماری تھوڑی سی فیاضی کے مظاہرے پر ہمارے بہتر جانثار ثابت ہوں گے۔" اس کے ہر فیصلے سے ثابت تھا کہ صرف جذبات میں لڑنے کی نہیں ٹھانی بلکہ لڑائی کے لیے پہلے ہی سے سارا لائحہ عمل طے کر چکا ہے۔ اس اعلان کے بعد اس نے چند دیگر امور پر بھی گفتگو کی اور باہمی مشاورت سے ان سے متعلق بھی فیصلے کر لیے گئے۔

"محترم سفیر اللہ صاحب! مجھ سمیت ہر سپاہی کی کمان آپ کے ہاتھ میں ہوگی اور ہم سب کو آپ کے فیصلوں کی پابندی کرنی ہوگی۔ بس آپ کو اپنے سپاہیوں کو ایک بات باور کروانی ہوگی کہ اب وہ محض پہرے دار نہیں رہے ہیں بلکہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے مجاہدین بن چکے ہیں اس لیے انہیں اپنی کارکردگی میں بھی اسی حساب سے اضافہ کرنا ہوگا۔" سب معاملات طے کر چکنے کے بعد جب اس نے سفیر اللہ سے یہ بات کہی تو ان سمیت ہر شخص دنگ رہ گیا۔ اب تک جس طرح وہ گفتگو کرتا رہا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ کمان اپنے ہی ہاتھ میں رکھے گا لیکن خلاف توقع یہ اعلان سن کر سب ہی ششدر رہ گئے تھے۔

"میرا تو خیال تھا کہ سلیمان اور تم......" سفیر اللہ جو اسے اور سلیمان کو یوں تمام معاملات پر حاوی دیکھ کر دل میں ہلکی سی تلخی اور شکوہ محسوس کر رہے تھے، ندامت سے آدھا ادھورا جملہ ہی ادا کر سکے۔

"آپ ہم میں سب سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ آپ کے تجربے سے فائدہ نہ اٹھانا ہماری بدقسمتی ہوگی۔ ہاں مشورے اور دیگر خدمات کے لیے ہم ہر وقت حاضر ہیں۔" اس جیسا زیرک شخص بھلا یہ غلطی کیسے کرسکتا تھا کہ ایک کمان دار کی موجودگی میں خود کمان سنبھالنے کا اعلان کر کے اس کی اور اس کے دوستوں کی مخالفت مول لیتا اس لیے سارے بنیادی فیصلے کر چکنے کے بعد نہایت ہوشیاری سے کمان سفیر اللہ کو سونپ دی۔ اسے معلوم تھا کہ فرمانبرداری کے اس مظاہرے پر سفیر اللہ اتنا خوش ہوگا کہ وہ اور سلیمان لازماً اس کے قریبی ساتھیوں میں شامل رہیں گے۔ قریب رہ کر سفیر اللہ سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

پُرخطر جزیروں اور بغاوتوں کے جنگل
میں بھٹکتے مسافر کی داستان کے
مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

شادی کی تقریب تھی اور اس خوشی میں ورائٹی پروگرام پیش کیا جارہا تھا یعنی وہاں ناچ گانا بھی تھا، لطیفہ گوئی بھی تھی، چٹکلے بھی چھوڑے جارہے تھے لیکن ورائٹی پروگرام کی ایک خرابی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس پروگرام کا ہر آئٹم پسند نہیں آتا کیونکہ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہر کی سب سے مشہور طوائف نے مجرا شروع کیا تو بوڑھوں کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔

ایک بزرگ نے واہ واہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ طوائفوں کے کوٹھے تہذیب کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے۔ شہزادے اور نوابزادے ان کے ہاں نشست و برخاست کے آداب سیکھنے جاتے تھے......“

درست ہے، سیکھنے جاتے ہوں گے لیکن آج کل کے شریف زادے مجرا شروع ہوتے ہی ہوٹنگ کرنے لگتے ہیں۔ جبکہ موجودہ دور کے مطابق طوائفوں کی ضرورت بھی

سسپنس کلاسک

مقبول اور ناقابل فراموش تحریر کا انتخاب

آنکھوں میں طوفان چھپائے دل سے غم لگانے والی ایک آبلہ پا حسینہ کا قصہ

ہمیشہ سے سفلی خواہشوں اور جذبات نے انسان کو وحشی کی صف میں لا کھڑا کیا ہے... وحشت اور ہوس نے انسان کو ہمیشہ بلندی سے پستی کی طرف دھکیلا ہے۔ اسے جانتے سب ہیں مگر مانے کون... یہی حال اس بے حال کا ہوا جو پیار کے دو بول سن کر ایسے جی اٹھی جیسے مُردے میں جان پڑگئی ہو مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ وقت سے پہلے جان لینا بھی کیسے جان کا عذاب بن جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ صحرا کے سفر میں ساون کو ڈھونڈنے نکلے گی اور تپتی دھوپ سے واسطہ پڑجائے گا۔

زندہ خودکشی

محی الدین نواب

نہیں رہی تھی۔ وہ خود اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ رقص کر چکے تھے اسی لیے وہ آوازیں کس رہے تھے اور موسیقی کی تال پر مضحکہ اڑانے کے انداز میں سب باجماعت تالیاں بجا رہے تھے۔

بزرگوں نے ادھر ادھر پھیلے ہوئے نوجوانوں کو گھور کر دیکھا۔ مگر کم بختوں کو ان کے جذبات کا احساس نہیں تھا۔ انہیں اتنا تو سوچنا چاہیے تھا کہ جوان بیٹے بیٹی والے عزت دار لوگ بدنامی کے خوف سے چکلے میں نہیں جا سکتے۔ ایک یہی شادی بیاہ کا مبارک موقع ہوتا ہے کہ وہ طوائفوں کو گھر بلا کر بوڑھی حسرتوں کو جوان کر لیتے ہیں۔ جب ان کے گھورنے کا نوجوانوں پر اثر نہ ہوا تو ایک دانا بزرگ نے مصلحت اندیشی سے کام لیا اور پروگرام کو ازسرنو اس طرح مرتب کیا کہ ایک بار مجرا ہو، دوسری بار نوجوان اپنا آئٹم پیش کریں پھر تیسری بار مجرا ہو، اس کے بعد ترتیب وار نوجوانوں کی باری آئے۔

نوجوانوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ پھر اس ترتیب سے مجرا ختم ہوتے ہی جوان لڑکے اور لڑکیاں گٹار اور دف لے کر اسٹیج پر آ گئے۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہی ان کے باپ محفل سے اٹھ کر جانے لگے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی بچیاں کلبوں میں جاتی ہیں لیکن کلبوں میں ڈانس کرنا اور بات ہے۔ وہاں طوائفیں نہیں جاتیں اس لیے شریف زادیوں کو مجرے والی محفل میں ڈانس کا آئٹم پیش نہیں کرنا چاہیے۔ اس طبقاتی سماج میں ہر ایک کے لیے الگ الگ چکلا مخصوص ہے۔ چکلوں کی بھی کیٹگریز ہو گئی ہیں۔

اس نئی نسل کو کہاں تک سمجھ کر کے سمجھایا جائے اور نئی نسل کو شکایت ہے کہ سمجھانے والے بزرگ خود نہیں سمجھتے۔ چنانچہ رنگ میں بھنگ پڑنے لگا۔ نوجوانوں نے مجرے کا بائیکاٹ کیا اور بوڑھوں نے ان کے آئٹم پر لعنت بھیجی۔ دولہا کے باپ نے سمجھایا کہ شادی کی خوشی میں کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ کسی کی طرف سے رقص کا آئٹم پیش نہ کیا جائے۔ صرف گانے کی محفل ہو۔

دولہا کا باپ ان کا میزبان تھا لہٰذا میزبان کی بات مان لی گئی۔ اسٹیج پر یکے بعد دیگرے دو گانے والے آئے مگر وہ سامعین کو متاثر نہ کر سکے۔ ان کے بعد انور جمال اسٹیج پر آیا۔ اس نے میر اور غالب کا کلام پیش کیا۔ اس لیے بزرگوں نے بڑھ چڑھ کر داد دی۔ چونکہ اس کی گائیکی کا انداز نیا تھا اس لیے نوجوانوں نے بھی اسے پسند کیا۔ اس میں ایک خوبی اور تھی۔ وہ اٹھاون برس کا بوڑھا تھا لیکن جوان نظر آتا تھا۔ فکر اور پریشانی ایسی بیماریاں ہیں کہ آج کل کے چھوکروں کے بال سفید ہو جاتے ہیں لیکن انور جمال کے سر کے اور مونچھوں کے سیاہ بالوں کو دیکھ کر پتا چل جاتا تھا کہ وہ فارغ البال ہے۔ اس کی بوڑھی جوانی ایسی تھی کہ وہاں بوڑھے اور جوان سب ہی اسے پسند کر رہے تھے۔

شبانہ اسٹیج سے ذرا دور ادھر سے ادھر پھدکتی پھر رہی تھی۔ گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں اس کی گوری اور گلابی رنگت کھل رہی تھی۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ اس کے والدین کے خیال کے مطابق ابھی اس کی عمر دوپٹا پہننے کی نہیں تھی۔ وہ تھی چڑیا کی طرح پھدکتی ہوئی اسٹیج کے قریب آئی۔ اس وقت تمام لوگ انور جمال کی ایک غزل پر دل کھول کر داد دے رہے تھے۔ شبانہ دوڑتی ہوئی زنان خانے میں صفیہ باجی کے پاس آئی پھر ہانپتی ہوئی بولی۔

”باجی، باجی! باہر دولہا بھائی کی خوب تعریف ہو رہی ہے۔ سب لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔“

صفیہ اپنے شوہر کی تعریف سن کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ ان کی آواز یہاں تک آ رہی ہے مگر اس شور وغل ..... میں پتا نہیں چلتا کہ لوگ تعریف کر رہے ہیں یا آوازیں کس رہے ہیں۔“

”اب تو پتا چل گیا نا باجی؟“

”ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔“

”باجی! میں پھر دولہا بھائی کو دیکھ کر آتی ہوں۔“

وہ دوڑتی ہوئی پھر زنان خانے سے باہر چلی گئی۔

صفیہ کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت نے پوچھا۔

”صفیہ! تمہاری تو کوئی بہن نہیں ہے پھر یہ لڑکی کس رشتے سے تمہارے میاں کو دولہا بھائی کہتی ہے؟“

صفیہ نے جواب دیا۔ ”یہ دور کے رشتے سے خالہ زاد بہن ہے۔“

”تو پھر اسی رشتے سے سمجھاؤ کہ وہ دوپٹا اوڑھ کر رہے۔ اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟“

”ماں کچھ بیمار ہے۔ باپ دبئی میں ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔“

”تو دوپٹے میں لپیٹ کر لاتیں.....“

”آپ تو دوپٹے کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ ابھی وہ معصوم لڑکی ہے۔ جب تک اس میں بچپنا ہے میں اس پر دوپٹے کا بوجھ ڈال کر اسے جوانی کا احساس نہیں دلاؤں گی۔“

”بھلا یہ کیا بات ہوئی؟“

”بات یہ ہوئی کہ لڑکیاں جب جوان ہونے لگتی ہیں تو

اپنی جسمانی تبدیلیوں کو خوب سمجھتی ہیں مگر صرف سمجھنے سے وہ جوان نہیں ہو جاتیں۔ جوانی کا احساس ہم دلاتے ہیں کہ بدن کا یہ حصہ چھپاؤ، دیکھو وہ حصہ جھلک رہا ہے، ایسے بیٹھو، ویسے نہ بیٹھو، مردوں کی نظروں سے بچ کر رہو۔ تب انہیں اپنے بدن کی تبدیلیوں کی اہمیت کا پتا چل جاتا ہے۔ ہم غیر شعوری طور پر انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو چھپا چھپا کر کس طرح مردوں کی نظروں سے آنکھ مچولی کھیل سکتی ہیں۔"

"اونہہ رہنے دو بی بی! مجھے نفسیات نہ پڑھاؤ......"

وہ عورت دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

شبانہ دوڑتی ہوئی اسٹیج کی طرف آئی۔ وہاں سامعین انور جمال کو پھر اسٹیج پر آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اس کی غزلیں اور گائیکی کا انداز بہت پسند کیا جا رہا تھا۔ شبانہ نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک چھوٹی سی بچی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے غرور سے کہا۔

"جانتی ہو یہ میرے دولہا بھائی ہیں۔ میں تو روز ان کا گانا سنتی ہوں۔"

ایسا کہتے وقت اس کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ کاش یہ سچ مچ میرے دولہا بھائی ہوتے اور یہ اسٹیج پر آ کر ساری دنیا سے کہتے کہ شبانہ میری سالی ہے۔

وہ انور جمال کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ انور جمال ایک بار پھر اسٹیج پر گانے کے لیے آیا لیکن گانا شروع ہونے سے پہلے ہی خسروں کی ایک ٹولی تالیاں بجاتی اور اپنے ناز و انداز دکھاتی قناتوں کے اندر محفل میں آ گئی۔ ایک ہیجڑے نے تالی کا تھپکا دے کر کہا۔

"اے حضور! شادی مبارک، ہم بھی سہرا گائیں گے۔"

دوسرے نے تالی کا تھپکا دیا۔ "گائیں گے اور ٹھمکے لگائیں گے۔"

انور جمال کا گانا سننے والے شائقین نے زنخوں کو دیکھتے ہی برا سا منہ بنایا اور دھتکار کر بھگانے لگے۔ لیکن خسرے جہاں پہنچتے ہیں، کمبل بن جاتے ہیں۔ ایک نے تالی بجا کر کہا۔

"اے ہم بھی عزت والے ہیں۔ تمہاری خوشی میں خوش ہونے آئے ہیں۔"

ایک ہیجڑے نے دوسرے ہیجڑے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے پھپھو بیگم! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔ آؤ ہم بہنیں مل کر دہائی دیں گی۔"

سب مل کر تالیوں کی تال اور ڈھولک کی تھاپ پر دہائی دینے لگے۔

"اے دولہے کے ابا ...... ہائے ہائے
وے دولہے کی اماں ...... ہائے ہائے
تیرے بچے کا سہرا ...... ہائے ہائے
مرجھائے نہ کھِل کے ...... ہائے ہائے
دولہن کی خوشیاں ...... ہائے ہائے
میری جان کی دشمن ...... ہائے ہائے"

زنان خانے سے دولہا کی ماں نے گھبرا کر دولہا کے باپ کو بلایا اور کہا۔

"ان خسروں میں سدا سہاگن بھی ہوتی ہیں۔ ان کی ہائے میرے بچے پر پڑے گی۔ آپ فوراً ہی ان کی خوشی پوری کر دیں۔"

عورتوں کو بڑی جلدی بددعاؤں کے ذریعے بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ خسروں نے اس طرح اپنی بات منوالی۔ انور جمال گیت سنائے بغیر اسٹیج سے اتر آیا تو شبانہ کو بہت دکھ پہنچا۔ اسے خسروں پر غصہ آ رہا تھا۔ غصے کے ساتھ وہ سوچ رہی تھی۔

"آخر یہ خسرے ہوتے کیا ہیں؟ اماں بی تو کہہ رہی تھیں کہ یہ نہ مرد ہوتے ہیں نہ عورت۔ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ ان پر خدا کی مار ہوتی ہے۔"

آدھی رات کے بعد ناچ رنگ کی محفل ختم ہو گئی۔ بہت سے مہمان رخصت ہو گئے۔ اس کے باوجود شادی کا گھر قریبی رشتے داروں سے بھرا تھا۔ جس کو جہاں سونے کی جگہ مل رہی تھی وہ وہیں بستر لگا رہا تھا۔ صفیہ کو ایک چھوٹا سا کمرا مل گیا۔ انور جمال نے صفیہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"چلو اچھا ہے۔ ہمیں ایک جگہ سونے کا موقع ملے گا۔"

صفیہ نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔

"کچھ تو اپنی عمر کا خیال کریں۔ ہمیں یہ کمرا اپنی بیٹی اور داماد کو دینا ہے۔"

انور جمال اپنے اندر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ پھر چادر اور تکیہ لے کر برآمدے کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "بیٹی داماد، نواسے نواسیاں ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی خوامخواہ بوڑھا بن جائے۔ کیا اس عمر میں سینے کے اندر دل نہیں ہوتا۔"

اس سوال کا جواب دینے کے لیے صفیہ موجود نہیں تھی۔ وہ کمرے میں بیٹی، داماد اور نواسے نواسیوں کے آرام کے لیے بستر لگا رہی تھی۔ ایسے حالات میں یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ مرد اس عمر میں بھی صرف اپنے لیے بستر

بچھاتا ہے اور عورت اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے رت جگا کرتی ہے۔

برآمدے میں نیم تاریکی تھی۔ وہاں دو چار لوگ اور بھی تھے جو دور تک اپنے خراٹے نشر کر رہے تھے۔ بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے سو رہے تھے۔ وہیں ایک طرف ننگے فرش پر شبانہ پڑی ہوئی تھی۔ اس نے انور جمال کو دیکھ کر کہا۔

''دولہا بھائی! آج تو آپ نے کمال کر دیا۔ سب لوگ آپ کی تعریفیں کر رہے تھے۔''

انور جمال نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی اپنا سر کھجاتی ہوئی بڑی معصومیت سے اس کی تعریف کر رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''کیا تم غسل نہیں کرتیں؟ تمہارے سر میں جوئیں پڑ گئی ہیں۔ اچھی بچیوں کو صفائی کا خیال رکھنا چاہیے۔''

''میں تو روز غسل کرتی ہوں مگر اماں جی کے سر کی جوئیں لگ جاتی ہیں۔ میں جس کے ساتھ سوتی ہوں، اسی کا روگ لگ جاتا ہے۔''

''مگر تم سوتی کب ہو؟ اتنی رات ہو گئی اور اب تک جاگ رہی ہو۔ دیکھو دوسرے بچے کیسے سو رہے ہیں۔ چلو تم بھی سو جاؤ۔''

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ انور جمال دیوار کی طرف کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کے سر میں بھی کھجلی ہو رہی تھی حالانکہ جوئیں نہیں تھیں۔ بعض لوگوں کی کھوپڑی اندر سے کھجاتی ہے۔ وہ جس دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا تھا اس دیوار کی اسکرین پر ایک طوائف مجرا پیش کر رہی تھی اور دنیا والے بوڑھوں پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ انہیں جوانی کی دہلیز سے دھکے دے کر باہر پھینک رہے تھے کہ اب زندگی کی رنگینیوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ کیسا ظلم ہے؟ کیا انسان بوڑھا ہوتے ہی مر جاتا ہے؟ وہ بے چینی سے کروٹ بدلنے لگا۔ دوسری کروٹ پر دیوار نہیں تھی۔ لان سے ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں۔ کھجور کے اونچے درخت خاموش کھڑے تھے۔ صرف ان کے پتے ادھر ادھر جھوم رہے تھے جیسے بڑھاپا خاموش رہتا ہے صرف آرزوؤں کے پتے ہوا دیتے رہتے ہیں۔ بوڑھے برگد کے درخت کی مضبوطی اور پائیداری بھی دیدۂ بینا کو سمجھاتی ہے کہ بڑھاپے میں کتنا استحکام ہوتا ہے مگر یہ دنیا سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔

وہ پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ ہر رات یہی ہوتا تھا۔ صفیہ گہری نیند سو جاتی تھی اور وہ جاگتا رہتا تھا۔ اس کی نظریں جھجکتی ہوئی شبانہ کی طرف گئیں۔ وہ اپنا سر کھجا رہی تھی۔ انور جمال نے اپنے رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے، ابھی تک تم نہیں سوئیں؟ تین بج رہے ہیں۔''

''اوں۔ ہونہہ۔ نیند نہیں آ رہی ہے۔''

انور جمال نے برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا۔ سب سو رہے تھے۔ نیم تاریکی میں سونے والے صرف سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے کھسکتا ہوا اس کے پاس آ گیا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''آؤ، زانو پر سر رکھو، میں سلا دیتا ہوں۔''

وہ زانو پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

''آپ گانا سنائیں گے؟''

''نہیں، گانے کی آواز سن کر سونے والے اٹھ جائیں گے پھر میرے زانو پر تمہیں سر رکھے دیکھ کر وہ باتیں بنائیں گے۔''

اس لڑکی نے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ زانو پر سر رکھنا بری بات ہے۔ انور جمال کی بات نے سر رکھنے کے اس انداز کو پراسرار بنا دیا۔ شبانہ نے آہستگی سے پوچھا۔

''باتیں کیوں بنائیں گے؟''

''آں...'' وہ اس سوال پر ہچکچانے لگا۔

''بتائیے نا۔ آپ تو اتنے اچھے ہیں۔ آپ کی تعریفیں ہوتی ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے اسی طرح سر رکھ کر آپ کے پاس بیٹھی رہوں۔''

''اگر تمہارا جی چاہتا ہے تو میں اسی طرح تھپک کر سلایا کروں گا مگر تم اپنی باجی سے کبھی نہ کہنا۔''

تجسس ...... کہ کیوں نہ کہنا؟

سنسنی ...... کہ کسی بھید کی پرورش کرتے رہنے سے دماغ میں کیسی سنسناہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔

شبانہ کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے اور ایک نئی دنیا کے دریافت ہونے کے تحیر میں گم رہی اور یہاں سے وہاں تک رات کی آغوش میں بے حیا سناٹا چھایا رہا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند سوتی رہی۔ اگر اپنا گھر ہوتا تو وہ صبح سے شام تک سوتی ہی رہ جاتی لیکن وہ شادی والے گھر کے برآمدے میں بچوں کے درمیان فرش پر پڑی تھی اس لیے ملازمہ نے اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔ بڑی دیر تک کسمسانے کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے چند لمحوں تک وہ سوچتی رہی کہ کہاں ہے؟ پھر اس نے جلدی سے سر اٹھا کر دیوار کی جانب دیکھا۔ اب وہاں انور جمال کا بستر نہیں تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر برآمدے کے زینے پر آ کر بیٹھ گئی۔ باہر لان میں ہریالی تھی۔ رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پھول تو رنگ برنگے ہوتے ہی ہیں لیکن شبانہ کو پہلی بار ہر پھول کا الگ الگ رنگ اور الگ الگ حسن نظر آ رہا تھا۔ لان کے سبزے کی ٹھنڈک آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ سورج پچھلے تمام دنوں سے زیادہ روشن تھا اور آسمان کے سائے میں پرندے جیسے پہلی بار پرواز کر رہے تھے۔

یا تو دنیا پہلے اتنی خوبصورت نہیں تھی اور اگر تھی تو پھر اس خوبصورتی کو دل میں اتارنے کے لیے شبانہ کو نئی آنکھیں ملی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی سوچ کا انداز کچھ بدل گیا تھا۔ وہ ہر آہٹ پر چونک کر گزرنے والوں کو دیکھتی تھی مگر وہ نظر نہیں آتا تھا۔ دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ جتنی محبت سے اس نے نیند کی آغوش میں اسے پہنچایا تھا، اتنے ہی پیار سے وہ اسے زینے پر سے اٹھانے آئے گا۔

مگر وہ نہیں آیا۔ رات گزرتی ہے تو خواب بھی گزر جاتے ہیں۔ شبانہ کو ڈر لگا کہ پچھلی شب بیداری کہیں خواب نہ ہو۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی پاس والے کمرے میں گئی۔ وہاں انور جمال کی بیٹی اپنے بچوں کو کپڑے پہنا رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

”دولہا بھائی کہاں ہیں؟“

”امی اور ابو اس کمرے میں ہیں۔“

وہ اس کمرے میں دوڑتی ہوئی گئی پھر دروازے پر ٹھٹک گئی۔ اس کی صفیہ باجی، انور جمال کے بازوؤں کے حصار میں کھڑی اس کی قمیص کا بٹن لگا رہی تھیں۔ ایک ساعت کے لیے منظر بدل گیا۔ شبانہ نے دیکھا کہ وہ بازوؤں کی قید میں کھڑی انور جمال کی قمیص کے بٹن لگا رہی ہے۔ دوسرے ہی لمحے صفیہ چونک کر اپنے شوہر سے دور ہو گئی پھر جھینپتی ہوئی بولی۔

”اری شبانہ! وہاں کیوں کھڑی ہو؟ آجاؤ۔“

انور جمال نے فوراً ہی دروازے کی طرف یوں دیکھا جیسے شبانہ شکایت کرنے آئی ہو لیکن اس کے چہرے پر وہی بچوں کی سی معصومیت تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایسے چور بدن کی لڑکی تھی کہ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں سب ہی اسے بچی سمجھتے تھے..... انور جمال اس کی ہمت افزائی کے لیے مسکرایا۔ وہ بھی بے اختیار مسکرانے لگی۔ صفیہ نے کہا۔

”تم شاید ابھی تک سو رہی تھیں۔ جاؤ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ اور لباس بدل لو۔ ہم ناشتا کرنے کے بعد اپنے گھر جائیں گے۔“

وہ باتھ روم نہیں جانا چاہتی تھی دوسرے لفظوں میں انور جمال کو دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔ وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔

”باجی! یہاں تو کنگھی نہیں ہوگا۔ میں کلیاں کر کے آجاتی ہوں۔“

”اری آئینے میں اپنا حلیہ تو دیکھ۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے رات بھر خوب پٹائی کی ہے۔“

انور جمال نے چونک کر صفیہ کو دیکھا۔ وہ اپنی دھن میں کہتی جا رہی تھی۔ ”جو لڑکیاں صاف ستھری نہیں رہتیں، شیطان رات کو آ کر انہیں خوب مارتا ہے۔ تمہارا بھی حلیہ ایسا ہی ہے۔ اب جاؤ یہاں سے.....“

انور جمال نے ذرا گھوم کر آئینے میں دیکھا۔ وہ کسی پہلو سے شیطان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیطان کا کوئی مخصوص چہرہ نہیں ہے۔ اس کا چہرہ بے شمار ذروں میں بکھر کر انسانوں میں تقسیم ہو گیا ہے اسی لیے وہ آئینے میں خود کو نہیں دیکھ سکتا......

انور نے اپنی بیوی کی زبان بند کرنے کے لیے شبانہ سے کہا۔

”مجھے بھی ایسی بچیاں پسند ہیں جو روزانہ غسل کرتی ہیں۔ اپنے سر میں جوئیں نہیں پالتیں۔ بالوں میں کنگھی کرتی ہیں اور چہرے پر تھوڑا پاؤڈر لگا کر گڑیا جیسی بن جاتی ہیں۔“

اس کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔ صفیہ نے خوش ہو کر کہا۔

”یہ لڑکی آپ کی بڑی عزت کرتی ہے۔ دیکھیے کس طرح آپ کی بات مان کر چلی گئی۔“

”زندگی کے بعض مقامات پر مجبوراً بزرگ بننا پڑتا ہے۔“ اس نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ میاں بیوی اپنی بیٹی، داماد اور نواسے نواسیوں کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھے تو وہ لباس بدل کر گیلے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے باتھ روم سے باہر آ گئی۔ غسل کرنے کے بعد اس کی گوری رنگت گلابی گلابی سی ہو گئی تھی۔ کالی کالی آنکھیں کاجل کی کٹوریاں لگ رہی تھیں۔ لبوں پر قدرتی گلاب کھلے ہوئے تھے۔ بالوں سے پانی جھک کر ہونٹوں پر آیا تو شبنم کے بوجھ سے گلاب کی پتیاں کانپنے لگیں۔

صفیہ نے کہا۔ ”آؤ شبانہ! جلدی سے ناشتا کر لو۔“

انور جمال کے ایک طرف صفیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف اس کی بیٹی صائمہ تھی۔ شبانہ نے ایک بار پلک جھپک کر دیکھا تو صفیہ کی جگہ وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ انور جمال اپنے ہاتھ سے لقمہ بنا کر اسے کھلا رہا تھا۔ دوسری بار پلک

جھپکتے ہی صفیہ اس کی جگہ چھین کر پھر سے انور جمال کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ صفیہ نے پوچھا۔

''کیا ہوا، ناشتا نہیں کرو گی؟''

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''عجیب لڑکی ہے۔ کھانے کے وقت نہیں کھاتی اسی لیے تو بدن نہیں پکڑتی۔ چل ادھر آ۔ میرے پاس بیٹھ۔ میں تجھے کھلاؤں گی۔''

وہ پاس آکر بولی۔ ''میں دولہا بھائی کے پاس بیٹھوں گی۔''

صفیہ نے ہنستے ہوئے اسے اپنے شوہر کے پاس جگہ دے دی۔ ایک عورت نادانستگی میں کتنی بڑی قربانی دے دیتی ہے یہ بات صفیہ نہیں سمجھتی تھی۔ اس لیے نہیں سمجھتی تھی کہ اس کے سامنے جتنے رشتے تھے، وہ صرف پاکیزہ محبت اور عقیدت کے رشتے تھے۔ شوہر، بیٹی، داماد، نواسے اور نواسیاں حتیٰ کہ شبانہ، جس سے خون کا رشتہ نہیں تھا لیکن اپنی صائمہ بیٹی کے سامنے وہ بھی بیٹی جیسی تھی۔

انور جمال کی سوچ کچھ اور تھی۔ اگر انسان اتنی بڑی دنیا میں قدم قدم پر مقدس رشتے بناتا جائے تو تفریحی رشتے کے لیے کوئی نہ رہے گا۔

بے شک ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے اخلاقیات کا پاس رکھنا چاہیے لیکن کوئی ایسی خواہش جو اچانک ہی شب خون مارتی ہے، اس کے حملے سے ایک شریف آدمی کیسے بچ سکتا ہے؟ اگر وہ ٹھوکر کھا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اندھا ہے۔ اس ٹھوکر کے بعد وہ سنبھلنا چاہتا ہے۔ انور جمال نے بھی جب اپنے ایک طرف اپنی بیٹی صائمہ کو اور دوسری طرف شبانہ کو دیکھا تو اسے اوندھے منہ گرنے کا احساس ہوگیا۔

اس نے سوچا ایسی خواہش مذہب اور قانون کے مطابق پوری ہوسکتی ہے۔ وہ دوسری شادی کرسکتا ہے لیکن کیسے کرسکتا ہے؟

شبانہ اور اس کی عمر میں زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔ شبانہ نے ابھی پندرہ برس کی زندگی دیکھی تھی اور وہ آدھی صدی گزارنے والا تھا۔ وہ صائمہ سے بھی دس برس چھوٹی تھی۔ یہ حساب کرتے ہی اسے پسینا آنے لگا۔ اس نے پریشان ہوکر شبانہ کو دیکھا۔ وہ ناشتے کے دوران اس سے لگی بیٹھی تھی۔ بچہ گود کی گرمی تلاش کرتا ہے یا پھر جس سے مانوس ہوجاتا ہے اس سے چپک کر رہتا ہے۔ انور جمال گھبرا کر اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ صفیہ نے کہا۔

''آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ یہ چائے تو پی لیں۔''

''نہیں، بہت گرمی ہے۔ چائے نہیں پیوں گا۔ یوں بھی دیر ہو رہی ہے۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔''

چھوٹی نواسی نے نانی کی گود سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نانا، بے بی نکلوں گی۔ (نانا! میں بھی چلوں گی)۔''

انور جمال نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

''باہر دھوپ ہے۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں، پھر بیٹھ کر چلنا۔''

صفیہ نے کہا۔ ''لے جائیے نا، بچی ضد کر رہی ہے۔''

شبانہ نے اپنی جگہ سے فوراً ہی اٹھ کر بچی کو گود میں لیتے ہوئے انور جمال سے کہا۔

''میں اسے گود میں لے کر چلتی ہوں۔ آپ کو تکلیف نہیں ہوگی۔''

اس سے پہلے کہ وہ اعتراض کرتا، وہ بچی کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ پہلے بھی وہ اس طرح آگے نہیں جاتی تھی۔ کوئی مصیبت جو ہمارے پیچھے نہیں ہوتی ہے اور آگے آنے کی جرأت نہیں کرتی، اسے ہم خود اپنے آگے کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتا ہوا باہر آیا۔ شبانہ کوٹھی کے احاطے سے باہر بچی کو گود میں لیے کھڑی تھی اور اسے دور سے آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یوں تو وہ پہلے بھی اسے دیکھتی تھی۔ اب یہ فرق پیدا ہوگیا تھا کہ وہ اسے اپنی چیز نظر آتا تھا۔ دل کہتا تھا کہ صرف اسے دیکھتی رہے۔ وہ قریب آکر بولا۔

''شبانہ! تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہاری باجی کیا سوچیں گی؟''

وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر وہی بچوں کی سی معصومیت تھی اور آنکھوں سے ایسا مطالبہ جھلک رہا تھا جیسے اپنا کھلونا مانگ رہی ہو۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ غلطی اس کی اپنی تھی۔ اسے خود سوچنا چاہیے تھا کہ صفیہ کیا سوچے گی اور دنیا کیا کہے گی؟

ذرا دور چل کر وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا۔ آتی جاتی ہوئی گاڑیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ کوئی خالی ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی۔ شبانہ اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ بچی کو دھوپ لگ رہی تھی۔ انور جمال نے بچی کو اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگالیا۔

''اوں ہوں۔ ہوں......'' شبانہ کے منہ سے آواز نکلی۔ وہ کبھی بچی کو اور کبھی اس چٹان جیسے پھیلے ہوئے سینے کو دیکھنے لگی اور بے زبان اداؤں سے کہنے لگی۔ ''میں بھی تو بچی ہوں۔ مجھے سینے میں چھپالو۔''

انور جمال کو بے اختیار اس پر پیار آنے لگا۔ اس نے

ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر کہا۔

"شبانہ اب تم بچی نہیں ہو۔"

"کیوں نہیں ہوں؟ اماں بی کہتی ہیں، محلے والے کہتے ہیں کہ میں بچی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تمہیں ابھی پڑھنا اور کھیلنا چاہیے۔"

"آپ میرے ساتھ کھیلیں گے نا؟"

"آں۔" وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ جب وہ قریب آ کر رک گئی تو شبانہ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ میرے پاس بیٹھے رہیں گے نا؟"

"کیسی بات کرتی ہو، یہاں پچھلی سیٹ پر تم، تمہاری باجی، صائمہ اور توفیق میاں بیٹھیں گے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھوں گا۔"

"اچھا تو آپ باجی سے کہیں کہ مجھے اپنے گھر لے چلیں۔"

"نہیں، تمہاری اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم اپنے گھر چلی جانا۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ مجھے نیند نہیں آئے گی تو آپ سلا دیا کریں گے۔"

وہ ایک ہاتھ کی آستین سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔

"ابھی بچیاں ضد نہیں کرتیں۔ وقت پر خود ہی سو جاتی ہیں۔"

وہ ضد کرتی رہی۔ وہ سمجھاتا رہا اور خود سمجھتا رہا کہ ٹھوکر کھا کر انسان سنبھلتا ضرور ہے مگر ٹھوکر سے لگی ہوئی چوٹ سنبھلنے کے بعد بھی تکلیف پہنچاتی ہے۔

☆☆☆

شبانہ شاید کبھی ساتھ نہ چھوڑتی لیکن صفیہ اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ اماں بی کی طبیعت ٹھیک تھی۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا پکایا تھا لیکن شبانہ نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ جب من مزاج ہی ٹھکانے نہ ہو تو بھوک بھی ٹھکانے سے نہیں لگتی۔ ماں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ تو چپ چپ سی کیوں ہے؟"

چپ چپ رہنے سے وہ نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ اماں بی کے بولتے ہی گڑبڑ ہو جاتی۔ وہ جھلا کر بولی۔ "اماں بی! کبھی تو چپ رہا کریں۔ جب دیکھو بڑبڑ کرتی رہتی ہیں۔"

"یہ لو۔ میں تیرے بھلے کے لیے کھانے کو کہہ رہی ہوں۔"

"مجھے بھوک لگے گی تو خود کھا لوں گی۔ خدا کے لیے چپ رہیں۔"

"وقت پر نہ کھانے والی لڑکیاں عمر کے مطابق پھلتی پھولتی نہیں۔ تو بدن نہیں پکڑے گی تو کوئی تجھے پسند نہیں کرے گا۔"

وہ چونک کر اماں بی کو دیکھنے لگی۔ "آں! کوئی پسند نہیں کرے گا۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر چولھے کے پاس گئی پھر روٹیوں کا چھابا سامنے رکھ کر پودینے کی چٹنی سے کھانے لگی۔ نوالہ حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ وہ پانی پی کر نگل رہی تھی۔ وہ اپنے لیے نہیں، انور جمال کے سامنے کھلنے پھولنے کے لیے کھا رہی تھی۔ انور جمال نے یہ بھی تو کہا تھا کہ رات وقت پر سو جانا چاہیے لیکن جب رات آئی تو ہمیشہ کی طرح نیند لے کر نہیں آئی۔

اس کے پاس ایک پرانا کیسٹ ریکارڈر تھا اور کتنے ہی کیسٹ تھے جنہیں وہ کتنی ہی بار سن چکی تھی۔ ایسے وقت جب کہ ساری دنیا سوتی رہتی تھی، صرف پرانے کیسٹ ہی پرانے ساتھیوں کی طرح شبانہ کے ساتھ جاگتے تھے اور اسے اپنی آواز سناتے تھے۔

"ساری ساری رات تیری یاد ستائے۔

یاد ستائے تیری دل تڑپائے رے۔ ساری ساری رات......"

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ گیت وہ سیکڑوں بار سن چکی تھی لیکن آج وہ گانے والی اس کے دل کی تڑپ کو سمجھ کر رات کے سناٹے میں فریاد کر رہی تھی کہ تمام رات تیری یاد ستاتی ہے۔ اسے یوں لگا کہ انور جمال اسے یاد کر رہا ہے۔ وہ بھی اپنے گھر میں جاگ رہا ہے اور اس کی طرح کروٹیں بدل رہا ہے۔ اس نے بستر سے اٹھ کر کیسٹ کو ری وائنڈ کیا۔ پھر اپنی آواز میں سنانے لگی کہ "ساری ساری رات تیری یاد ستاتی ہے۔" اس گیت کے اختتام میں انور جمال نے پھر کہا۔ "تم بہت یاد آتی ہو......" اس طرح تمام رات وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے دل کی صدا سناتے رہے۔

انور جمال کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کیسے رات گزار رہی ہے۔ جب وہ سونے کے لیے آیا تو صفیہ اپنی عادت کے مطابق پہلے ہی سو چکی تھی۔ اسے اپنی جوانی کے دن یاد آ گئے جب صفیہ ساری ساری رات اس کے لیے جاگتی تھی۔ اب یہ وقت آیا تھا کہ رات کے دس بجتے ہی سو جاتی تھی۔ وہ شکایت کرتا تو جواب ملتا۔ "آپ اس عمر میں بے شرمی کی باتیں نہ کریں۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔"

انور جمال کے دماغ میں پھر لاوا پکنے لگا۔ نئی سوچ ابھرنے لگی کہ اس عمر میں رات صرف سونے کے لیے کیوں ہوتی ہے؟ اصل بات تھکن کی ہے۔ عمر نے صفیہ کو تھکا دیا ہے اس لیے وہ سو جاتی ہے مگر میں تو تازہ دم ہوں۔ تھک کر سونا چاہتا ہوں۔

تب اسے شبانہ یاد آنے لگی۔ حالانکہ دن کے

وقت...... اس نے توبہ کی تھی۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ جب اپنے گھر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو دوسرے گھر کے دروازے پر توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔ شبانہ کو یاد کرتے وقت کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اسے اس لڑکی کی والہانہ محبت کی ایک ایک ادا یاد آرہی تھی۔ اس کی اداؤں میں بے حیائی نہیں تھی بلکہ ایسا کچا پن تھا جو حیا کے مفہوم کو پوری طرح نہیں سمجھتا۔ اسے سمجھانے والے نے جو سمجھایا، وہ وہی کہتی رہی۔

انور جمال بہت دیر تک سوچتا رہا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ ایک توبہ کے بعد بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔ انور نے صاف طور سے محسوس کیا کہ وہ اسے چاہنے لگا ہے۔

دوسرے دن اپنے دفتر جاتے وقت اس نے ہوش مندی سے سوچا کہ رات بڑی گمراہ کن ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ خیالات کو گمراہ کر کے کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ اب وہ شبانہ کے متعلق بالکل نہیں سوچے گا۔ رات آئی تو اس کی ہوش مندی سورج کے ساتھ غروب ہو گئی۔ پھر یہ خیال مستحکم ہوا کہ جب تک دل جوان ہے، اسے جوانوں کی طرح جذبات کے سینے میں دھڑکتے رہنا چاہیے مگر یہ سب سوچ ہی سوچ تھی۔ اس نے عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ نہ تو اس نے صفیہ سے شبانہ کا کوئی ذکر چھیڑا اور نہ ہی اس کے گھر کا رخ کیا۔

تیسرے دن شام کو صفیہ اس کے گھر گئی تو وہ بخار کی حالت میں بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ صفیہ نے تعجب سے کہا۔

”ارے! یہ تو اچھی بھلی تھی۔ یہ بخار کیسے آگیا؟“

اماں بی نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔

”بیٹی کیا بتاؤں، یہ لڑکی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ رات بھر جاگتی اور کیسٹ کے گانے سنتی رہتی ہے۔ دن کو گھڑی دو گھڑی کے لیے آنکھ بند کرتی ہے پھر چونک کر اٹھ جاتی ہے۔ میں اسے پیر صاحب کے پاس لے جاؤں گی۔“

شبانہ نے انکار میں سر جھٹک کر کہا۔

”میں نہیں جاؤں گی پیر فقیر کے پاس... باجی میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلیں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں تمہیں ڈاکٹر کو دکھا کر گھر لے چلوں گی۔“

اماں بی نے احسان مندی سے صفیہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”بیٹی! تم ہمارا کتنا بوجھ اٹھاؤ گی۔ ہمارے راشن کے لیے پیسے دیتی ہو، ہمارے ہر دکھ میں کام آتی ہو۔ اس کا باپ تو دبئی جا کر ہمیں بھول گیا۔ کبھی ایک خط سے بھی خبر نہیں لی۔ میں اس کے باپ کو کہاں تلاش کروں؟ تم نہ ہوتیں تو میں گھبرا کر مر جاتی۔“

صفیہ نے بوڑھی عورت کے شانے کو تھپک کر تسلیاں دیں پھر شبانہ کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ جب شام کو انور جمال گھر میں داخل ہوا تو بستر پر پڑی ہوئی شبانہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ بڑھتے ہوئے قدم تو رک گئے لیکن دل کی دھڑکنیں بڑھتی چلی گئیں۔ وہ جوئیں نوچنے کے انداز میں اپنا سر کھجا رہی تھی۔ صفیہ نے کہا۔

”اسے کل سے بخار ہے۔ اماں جی بتا رہی تھیں کہ یہ رات بھر جاگتی رہتی ہے۔“

انور جمال نے جھینپتے ہوئے شبانہ کو دیکھا۔ شبانہ کی کالی آنکھوں میں کالی رات جاگ رہی تھی۔ اس کی خاموش نگاہیں اس سے کہہ رہی تھیں۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ نیند نہیں آئے گی تو آپ سلا دیا کریں گے۔“

وہ ڈر گیا۔ حالانکہ شبانہ زبان سے نہیں کہہ رہی تھی لیکن چور دل کی آواز بھی دھماکے کی طرح لگتی ہے۔ اس نے چور نظروں سے صفیہ کو دیکھا۔ وہ بے چاری کیا سمجھتی کہ چوری کس انداز میں ہو رہی ہے۔ انور جمال نے آگے بڑھ کر شبانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”گھبراؤ نہیں! دوا پی لو۔ جلد اچھی ہو جاؤ گی۔“

شبانہ نے اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو تھاما۔ پھر دھیرے سے ہاتھ سر سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

”آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے دوا پلائیں گے نا؟“

اس کی محبت بھری التجا سن کر ممتا کی ماری صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا۔

”پتا نہیں اس کے ابا کہاں گم ہو گئے ہیں۔ بے چاری محبت کی بھوکی ہے۔ کیا آپ شیخ صاحب کا پتا نہیں لگا سکتے؟“

”بہت مشکل ہے۔ شیخ صاحب نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ شبانہ اور اماں بی کے زیورات بیچ کر نہ جانے کس ایجنسی کے ذریعے دبئی چلے گئے۔ کیا جانے وہاں پہنچے بھی ہیں یا نہیں؟ اگر کوئی دبئی سے آنے والا ہماری جان پہچان کا آدمی ملا تو ہم اس سے پوچھیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آیا اور لباس بدلنے لگا۔ صفیہ نے آکر بڑی رازداری سے کہا۔

”میں شبانہ کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ ڈاکٹر کرید کرید کر پوچھ رہی تھی کہ اس کی عمر کیا ہے؟ بالغ ہے یا نہیں؟ ساری رات کیوں جاگتی ہے۔ کیا سوچتی رہتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے ابا کو یاد کرتی رہتی ہے۔“

انور جمال نے جلا کر پوچھا۔

"کیا تمہیں الہام ہوا ہے کہ وہ اپنے باپ کو یاد کرتی ہے۔ تم اتنا نہیں سمجھتیں کہ لیڈی ڈاکٹر اس کی عمر اور بلوغت کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھی۔ اگر تم بچی اور نواسیوں والی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی تمام لڑکیوں کو ننھی بچیاں سمجھتی رہو۔"

صفیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ کم عمر بچیوں کو تو ہم بچے ہی کہیں گے۔"

"صفیہ بیگم! تم مجھ سے آٹھ برس چھوٹی ہو۔ پھر کیوں نہ میں تمہیں بھی بچی ہی سمجھوں۔"

صفیہ کو ہنسی آ گئی۔ انور جمال بھی یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ چلو گفتگو کا ایک خطرناک موضوع ٹل گیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد کھانے کی میز پر صفیہ نے کہا۔

"ڈاکٹر نے شبانہ کو دودھ اور ڈبل روٹی کھانے کے لیے کہا ہے مگر وہ کھانے سے انکار کر رہی ہے۔ آپ ذرا بہلا پھسلا کر اسے کھلا دیں۔"

وہ اپنا کھانا ختم کرنے کے بعد دودھ اور ڈبل روٹی لے کر اس کمرے میں چلا گیا جو شبانہ کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ صفیہ اس دوران باورچی خانے میں مصروف رہی۔ آدھے گھنٹے بعد انور جمال خالی برتن لے کر واپس آیا تو صفیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ پیٹ کی نہیں، محبت کی بھوکی ہے۔ آپ کے ہاتھ سے کھا لے گی۔"

انور جمال نے پوچھا۔ "اسے دوا کی دوسری خوراک کب دو گی؟ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہا ہوں۔"

"آپ سو جائیں۔ میں اسے دوا پلانے تک جاگتی رہوں گی۔"

انور جمال چلا گیا۔ جب وہ کام ختم کر کے اپنے شوہر کے پاس آئی تو وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ وہ بھی تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گرتے ہوئے بولی۔

"میں جانتی ہوں آپ اتنی جلدی نہیں سوتے ہیں۔"

وہ آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم شبانہ کے لیے کس طرح جاگتی ہو۔"

"تو یہ ہے۔ مجھے تو زور کی نیند آ رہی ہے اور دوا ایک گھنٹے بعد پلانی ہے۔"

ایک گھنٹا بہت ہوتا ہے۔ وہ شروع سے نیند کی بندی تھی۔ بیس منٹ کے بعد ہی گہری نیند سو گئی۔ انور جمال نے اسے ایک دو بار آواز دی پھر مریضہ کو دوا پلانے چلا گیا۔

دوسرے ہی دن شبانہ کا بخار اتر گیا۔ وقت اور حالات لڑکیوں کو اپنی عمر سے زیادہ چالاکی سکھا دیتے ہیں۔ شبانہ کے دماغ میں بات آئی کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو صفیہ باجی اسے گھر بھیج دیں گی یا اماں بی آ کر لے جائیں گی اس لیے اس نے کمزوری کا بہانہ کیا۔ صفیہ نے ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے کہا تو وہ بولی۔

"کیسے چلوں۔ بستر سے اٹھتی ہوں تو سر گھومنے لگتا ہے۔"

وہ اپنا سر کھجانے لگی۔ سر گھومے نہ گھومے، جوئیں ضرور سر پر گھومتی تھیں۔ صفیہ اسے چھوڑ کر ڈاکٹر کے پاس گئی اور اسے مریضہ کا حال بتا کر دوا لے آئی۔ دو روز تک خود ساختہ کمزوری کا علاج ہوتا رہا پھر پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ اس طرح اس نے ایک ہفتہ وہاں گزار لیا۔ ایک دن اماں بی آ کر اسے زبردستی لے گئیں۔

اس کے جانے کے بعد صفیہ نے اپنے شوہر کے پاس آ کر اسے جھنجوڑتے ہوئے اٹھایا۔

"اب اٹھ بھی جائیے۔ آج کل آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنی عادت کے خلاف دن چڑھے تک سوتے رہتے ہیں؟"

انور جمال نیند میں جواب تو نہ دے سکا البتہ اپنا سر کھجانے لگا۔ اسی لمحے صفیہ نے چونک کر دیکھا اس کے سر تاج کے سر سے دو موٹی جوئیں گر کر تکیے کے سفید غلاف پر پہنچ گئی تھیں اور بڑے آرام سے چہل قدمی کر رہی تھیں۔

☆☆☆

صفیہ کا دماغ غصے کے آخری درجۂ حرارت سے کھول رہا تھا پھر بھی اس نے یہ سوچ کر تحمل سے کام لیا کہ پہلے جوؤں کے متعلق تفتیش کرنا چاہیے۔ جب انور جمال دفتر چلا گیا تو وہ غور کرنے بیٹھ گئی۔ پہلا سوال تھا۔ جوئیں کہاں سے آئیں؟

صفیہ کا جواب تھا۔ "میرے سر میں جوئیں نہیں ہیں اور دفتر میں وہ کسی کے ساتھ سر جوڑ کر نہیں بیٹھتے۔ یہ شبانہ کے سر کی جوئیں ہیں۔"

دوسرا سوال تھا۔ "ایک سر کی جوں دوسرے سر میں کیسے منتقل ہوتی ہے؟"

صفیہ نے پہلے تو خود کو دلاسا دیا کہ تکیہ بدل گیا ہوگا مگر اس کمزور سے دلاسے نے سہارا نہیں دیا کیونکہ جب تک شبانہ وہاں رہی، ہر ایک کا تکیہ اپنے اپنے بستر پر رہا۔ بے جان تکیہ اپنی جگہ نہیں بدل سکتا۔ آدمی کا سر اور اس کی سوچ اپنی جگہ بدل دیتی ہے۔

ایک بیوی یہ صدمہ برداشت نہیں کرتی کہ اس کے سر کا تاج کسی دوسرے کے لیے سجایا جائے۔ وہ غصے میں گھر سے نکلی۔ دروازے پر تالا ڈالا پھر سیدھی شبانہ کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں کیسٹ ریکارڈر بج رہا تھا۔

"نہ جھٹکو زلف سے پانی...... یہ موتی ٹوٹ جائیں گے......"

شبانہ فرش پر بیٹھی، زلفوں کو جھٹکنے کے بعد کنگھی کر رہی تھی اور جو بوندیں موتی کی طرح سر سے ٹپک رہی تھیں۔ وہ صفیہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور خوش ہو کر بولی۔

"ہائے باجی! میں آپ ہی کو یاد کر رہی تھی۔ یہاں میرا دل نہیں لگتا۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔"

صفیہ ایسی ہی بچوں والی ضد سے مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ اب یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ بالشت بھر کی چھوکری سے کیسا دھوکا کھا رہی تھی۔ وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"یہاں تمہارا دل نہیں لگتا وہاں تمہارے دولہا بھائی کا دل نہیں لگتا۔ وہ تمام رات تمہیں یاد کرتے ہیں اور کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتے ہیں۔"

شبانہ یہ سن کر خوش ہوئی کہ وہ اس کی یاد میں جاگتا ہے اور یہ سوچ کر دکھ بھی ہوا کہ پہلے جو آرام سے سو جاتا تھا اب اسے نیند نہیں آتی۔ وہ بے اختیار بولی۔

"وہ مجھے سنایا کرتے تھے۔ انہیں میری جاگنے والی بیماری لگ گئی۔ اب میں انہیں......" وہ کہتے کہتے رک گئی پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "مگر میں کچھ نہیں کہوں گی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اپنی باجی کو نہ بتانا۔"

صفیہ نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم کیا چھپاؤ گی۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"سچ باجی؟ مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کو معلوم ہوگا تو آپ غصہ کریں گی۔"

"واہ، مجھے غصہ آتا تو کیا میں تمہارے پاس آتی؟"

"ہائے باجی! آپ کتنی اچھی ہیں۔"

وہ خوش ہو کر لپٹ گئی۔ صفیہ کو یوں لگا جیسے ایک شعلہ اس سے لپٹ گیا ہو اور اسے اپنی لپیٹ میں لے کر اس کے گھر کو پھونک ڈالنے والا ہو۔ اس نے بڑے تحمل سے اسے پرے ہٹا کر کہا۔

"اب گھر چلو۔ میں انہیں فون کروں گی کہ تم واپس آ گئی ہو۔"

اس روز شام کو انور جمال مقررہ وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا۔ صفیہ سر میں رومال باندھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

انور جمال ادھر اُدھر دیکھتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر بولا۔

"تم نے فون پر کہا تھا کہ شبانہ واپس آ گئی ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

صفیہ نے کہا۔ "میں نے فون پر یہ بھی کہا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے سر پر پٹی بندھی دیکھ کر بھی آپ نے میرا حال نہیں پوچھا اور جو نظر نہیں آ رہی ہے اسے پوچھ رہے ہیں۔"

"صفیہ! کیا آج تم نئی بن گئی ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ پہلے میں جوتے اتارتا ہوں، لباس بدلتا ہوں پھر تمہارے پاس آ کر اطمینان سے باتیں کرتا ہوں۔ شکایت کرنے سے بہتر تھا کہ ذرا انتظار کر لیتیں۔"

"بس رہنے دیجیے۔ جسے دیکھنا چاہتے ہیں، اسے بلا دیتی ہوں۔"

اس نے شبانہ کو آواز دی۔ انور جمال نے کہا۔

"میں اسے کیوں دیکھنا چاہوں گا۔ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"آج ہی تو سچی باتیں کر رہی ہوں۔ آپ بھی سچ بتا دیں کہ اس لڑکی سے آپ کا اور کیا رشتہ ہے؟"

"اوں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ "کچھ نہیں۔ بھئی وہ ایک معصوم بچی ہے۔"

"ہاں۔ ایسی ہی معصوم ہے جیسے آپ ہیں۔"

اتنے میں شبانہ کمرے میں آئی۔ اس نے انور جمال کو دیکھتے ہی صفیہ سے کہا۔

"باجی! آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ انور صاحب آج وقت سے پہلے گھر آئیں گے۔"

انور جمال نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔ "اے تم مجھے انور صاحب کیوں کہہ رہی ہو؟"

شبانہ نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بے باکی سے کہا۔ "آپ نے تو باجی کو سب کچھ بتا دیا ہے اسی لیے باجی کہتی ہیں کہ اب میں آپ کو دولہا بھائی نہ کہوں۔"

انور جمال کو ایک ساعت کے لیے یوں لگا جیسے جسم کا تمام خون خشک ہو گیا ہو۔ اس نے مجرم کی طرح نظریں اٹھائیں تو صفیہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ صبح سے اس کے دل میں پکنے والا لاوا پھٹ پڑا۔ وہ غصے سے کانپتی ہوئی بولی۔

"آپ مجھے اس طرح دیکھ کر یہ تاثر دے رہے ہیں کہ آپ شرمندہ ہیں۔ کیا آپ کو اس وقت شرم نہیں آئی تھی جب آپ نے پہلی بار اس لڑکی کو ہاتھ لگایا تھا؟ کیا آپ نے اپنی اور اس کی عمر کا بھی حساب نہیں کیا؟ آپ نے اس کی بھی

پروا نہیں کی کہ میرے دل پر کیسی قیامت گزرے گی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شبانہ کی سمجھ میں آ گیا کہ صفیہ اس سے حقیقت اگلوانے کے لیے اسے یہاں لائی ہے اور اب ان کی چوری کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اسے پہلے تو ڈر لگا پھر اس نے سوچا۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے۔ انور صاحب تو میرے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ جب بھی مجھے نیند نہیں آئے گی تو وہ مجھے چپکے سے آ کر سلا دیا کریں گے۔''

اس نے سہارا پانے کے لیے انور جمال کی طرف دیکھا۔ وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صفیہ کے پاس گیا۔ شبانہ کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ وہ مجبور تھی کہ وہ اس کے پاس آئے گا لیکن وہ تو رونے والی کے آنسو پونچھنے جا رہا تھا۔ صفیہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

''ان ناپاک ہاتھوں کو مجھ سے دور رکھیں۔ مجھے آپ کی ہمدردی نہیں چاہیے۔''

''صفیہ! مجھے معاف کر دو۔ تم جس طرح کہو گی، میں اس غلطی کی تلافی کروں گا۔''

''آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ جب تک یہ راز نہیں کھلا تھا آپ اپنی غلطی کو جائز سمجھ کر مجھے دھوکا دیتے رہے۔ اب آپ کس غلطی کی تلافی کریں گے؟''

''میں اپنے گھر کے ماحول کو پر سکون اور خوشگوار بناؤں گا۔ اب شبانہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔''

شبانہ کی آنکھوں میں اچانک ہی آنسو آ گئے۔ وہ روتی ہوئی بولی۔ ''میں آؤں گی باجی! میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو صرف سونے کے لیے آتی ہوں۔ اگر نہیں آؤں گی تو نیند نہیں آئے گی۔''

صفیہ نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''چپ بے شرم، بدذات۔ سونے کی بات ایسے کرتی ہے جیسے کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ کیا تو یہ نہیں جانتی کہ یہ گناہ ہے؟''

اس نے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں باجی! انور صاحب نے مجھے یہی بتایا ہے کہ محبت میں جو کچھ ہوتا ہے اسے گناہ نہیں کہتے''

انور نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ ''شبانہ! تم کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے کب ایسا کہا تھا؟''

صفیہ نے کہا۔ ''آپ خاموش رہیں... ہاں تو شبانہ انہوں نے اور کیا سمجھایا تھا؟''

''یہ بہت اچھے ہیں باجی! ان کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ اسی لیے میں ہر بات مان لیتی ہوں۔ پیار کرنے والے لوگ تو اچھے ہوتے ہیں۔ آپ بھی مجھے پیار کرتی ہیں تو یہ گناہ نہیں ہے۔ انور صاحب بھی پیار کرتے کرتے مجھے سلا دیتے ہیں۔ اچھی باجی! آپ اسے گناہ کیوں کہتی ہیں؟''

یہ معصوم سا سوال صفیہ کے دل میں اتر گیا۔ اتنی دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ غصے میں ایک معصوم لڑکی سے لڑ رہی ہے جسے کسی نے اب تک ایک مرد کی قربت کی اونچ نیچ نہیں سمجھائی تھی۔ جب وہ تیرہ برس کی تھی تو باپ اسے ادھوری شفقت سے آشنا کر کے دبئی چلا گیا۔ اماں بی دو برس سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ بیٹی کی طرف دھیان نہ دیا۔ اکثر مائیں بیٹیوں کی طرف سے غافل رہتی ہیں۔ ان کی معصومانہ سوچ کو نہیں سمجھتیں کہ زندگی کے موڑ پر کوئی اچانک آئے گا اور گناہ کو محبت کے خوبصورت ریپر میں لپیٹ کر ان کی معصومیت سے کھیلتا رہے گا۔

صفیہ بھی جوان بیٹی کی ماں تھی۔ اس نے ممتا کے ترازو میں شبانہ کو تولا تو ترازو کی ڈنڈی مارنے والا مجرم انور جمال نکلا۔ وہ شبانہ کو سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے بولی۔

''تمہارا قصور نہیں ہے۔ میں ناحق تم پر ناراض ہو رہی تھی مگر شبانہ! اب تمہیں اچھی لڑکیوں کی طرح اچھے برے کی تمیز کرنا چاہیے۔ اب تک جو کچھ ہوا برا ہوا اسے بھول جاؤ۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔''

''اوں ہوں، ہوں۔ باجی! مجھے وہاں نیند نہیں آئے گی۔''

''پھر وہی بات۔ کیا تم اچھی لڑکی نہیں بنو گی؟ چلو یہاں سے......''

وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے گئی۔ انور جمال نے سر اٹھا کر اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن اس کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ اسے نیند نہیں آئے گی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر پڑا اور اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ بات کھل گئی تو کیا ہوا؟ یہ بات بیوی تک محدود رہے گی اور وہ آئندہ ایسی غلطیوں سے بچتا رہے گا۔

صفیہ نے اسے گھر پہنچایا پھر اماں بی کے پاس آ کر بولی۔

''اماں بی! آپ کب تک اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہیں گی۔ آپ کو شبانہ کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔ اب وہ کمسن بچی نہیں ہے کہ باپ کے انتظار میں بیٹھی رہے۔''

اماں بی نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ ''کیوں بیٹی! کیا شبانہ سے کچھ اونچ نیچ ہو گئی ہے۔''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے مگر مجھے سے کوئی بات سمجھ میں ...... آتی ہے۔ آخر یہ راتوں کو جاگتی کیوں ہے۔ کیا سوچتی رہتی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی مشورہ دیا ہے

کہ اس کی شادی جلد سے جلد کر دی جائے۔"

شبانہ دوسرے کمرے سے یہی باتیں سن رہی تھی۔ اب ہر بات اس کی سمجھ میں آ جاتی تھی کہ اس کی شادی کے مشورے کیوں ہو رہے ہیں؟ اسے انور جمال سے چھڑا کر کسی اور کے پالنے میں ڈالا جائے گا تا کہ وہاں نیند آ جایا کرے۔ اس میں صفیہ باجی کا بھی فائدہ تھا۔ وہ جھوٹ موٹ لیڈی ڈاکٹر کا حوالہ دے کر شادی کی جلدی کر رہی تھیں۔

اس کے تصور میں کتنے ہی دولہا سہرا باندھ کر آئے لیکن وہ انور جمال جس کے سر پر سہرا نہیں تھا، وہی سب سے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دروازے پر آ کر بولی۔

"باجی! میں شادی نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔"

اس سے پہلے کہ صفیہ کچھ کہتی، اس نے دروازے کو زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔

☆☆☆

کچھ دنوں کے لیے صفیہ اور انور جمال کے درمیان سے شبانہ کی دیوار ہٹ گئی۔ اس کے باوجود میاں بیوی کا اعتماد والا رشتہ کمزور پڑ گیا۔ اگر انور کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا تو صفیہ کو شبہ ہوتا کہ وہ شبانہ کی یاد میں کھویا ہوا ہے۔ وہ طنزیہ لہجے میں پوچھتی تھی۔

"کیا وہ بہت یاد آ رہی ہے؟"

"آں۔ کون؟" وہ خیالات سے چونک کر پوچھتا پھر بیگم کا طنز سمجھ میں آ جاتا۔

"صفیہ! سوچنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کو یاد کیا جا رہا ہے۔ میں اپنے کاروبار کے متعلق سوچ رہا ہوں۔"

اس نے صفیہ سے جھوٹ نہیں کہا۔ وہ سچ مچ کاروبار کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سوچ کا سلسلہ کچھ یوں ہوتا تھا۔

"ہمارے ٹارگٹ سگریٹ کی مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے لیکن صرف مانگ بڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دام بھی بڑھنے چاہئیں۔ اگر ہم سگریٹ کی سپلائی روک دیں تو لوگ بازار میں سگریٹ تلاش کرتے پھریں گے پھر ہم دام بڑھا کر سپلائی بڑھائیں گے تو منافع کی شرح میں پچیس فیصد کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایسا صرف کاروبار میں نہیں ہوتا۔ انسانی سماج میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ بوڑھوں کی زندگی میں اس دنیا کے حسن اور رنگینیوں کی سپلائی روک دی جاتی ہے ایسے وقت جس بوڑھے کی قوت خرید زیادہ ہوتی ہے، وہ سماج کے چور دروازے سے کوئی خوبصورتی خرید لیتا ہے۔ خریدنے کے لیے پیسا ضروری نہیں ہوتا۔ میں نے تو شبانہ کے آگے نیند لانے کا سکہ پھینک کر اسے حاصل کر لیا ہے۔ جب میں نے شادی کے گھر والے برآمدے میں اسے بچوں کے درمیان لیٹے ہوئے دیکھا۔ جب میں کھسک کر اس کے پاس گیا۔ جب میں نے اسے زانو پر سلایا۔ جب میں نے اس سے یہ کہا"

وہ سوچتے سوچتے چونک جاتا کیونکہ وہ تو کاروبار کی باتیں سوچ رہا تھا پھر شبانہ کیسے ہیرا پھیری سے اس کی سوچ میں آ جاتی تھی؟ صفیہ کا شبہ درست تھا اور انور بھی سچا تھا کہ وہ کام کی بات سوچتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ شبانہ بھی آپ ہی آپ کام کی بات بن جاتی تھی۔

انور جمال کی کار ورکشاپ سے آ گئی تھی۔ ایک صبح وہ دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر گول چکر کے پاس شبانہ نظر آئی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ انور نے قریب پہنچ کر گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ کار کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں وہ کب سے دھوپ میں کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے جھکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں کہ میں یہاں کیا کر رہی تھی۔ آپ خود کیوں نہیں سمجھتے ....."

"آں۔ ہاں سمجھ گیا۔ تم میرا انتظار کر رہی تھیں۔"

"آج ہی نہیں، میں روز انتظار کرتی ہوں۔ پہلے میں یہاں فٹ پاتھ پر کھڑی رہتی تھی مگر آپ تیزی سے کار چلاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ جب آپ نے پانچ دنوں تک میری طرف نہیں دیکھا تو میں ادھر جا کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ آپ کو دیکھتے ہی ہاتھ ہلاتی تھی۔ ایک ہفتے بعد سمجھ میں آیا کہ آپ گاڑی موڑتے وقت سیدھے راستے کی طرف دیکھتے ہیں اس لیے آج میں گول چکر کے پاس کھڑی رہی کیونکہ گاڑی موڑنے سے پہلے گول چکر سامنے آتا ہے۔"

انور جمال اس کی باتیں سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ دو ماہ تک دور رہنے کے باوجود وہ اس لڑکی کے دماغ سے مٹ نہ سکا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ پاگل پن ہے۔ تم تنہا وہاں کھڑی رہتی تھیں۔ لوگ کیا سوچتے ہوں گے؟"

"آپ لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں، میرے

بیٹے میں کیا نہیں سوچتے؟"

اس نے اعتراف کیا۔ "ہاں سوچتا ہوں۔ نہ سوچتا ہوتا تب بھی تمہارے حسن نے سوچنے پہ مجبور کر دیا ہے۔"

"جی؟" وہ خوش ہوگئی۔ "پھر آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"کیسے آسکتا ہوں۔ اب صفیہ کو معلوم ہوگا تو گھریلو زندگی عذاب ہوجائے گی۔"

"باجی کو نہیں معلوم ہوگا۔"

"نہیں شبانہ! تمہاری اماں بی بتادیں گی پھر گھر والے سوچیں گے کہ پہلے میں بیوی کے ساتھ بھی تمہارے گھر نہیں آتا تھا اب تنہا کیوں آتا ہوں۔"

وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ کہیں بھی ملیں۔ مجھے نیند نہیں آتی ہے۔ میں کل رات بھی نہیں سوئی۔ ابھی تک جاگ رہی ہوں۔"

انور جمال کے دل میں اس کے لیے محبت اور ہمدردی کے جذبات مچلنے لگے۔ اس نے عہد کیا تھا کہ آئندہ غلطی نہیں کرے گا۔ یہ بھی ایک غلطی ہوتی کہ وہ اسے راتوں کو جاگنے اور دن کو اپنی راہ پر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ وہ تو پیار کی پیاسی تھی۔

انور نے کولڈ اسپاٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔

ملازم آرڈر لینے آیا تو اس نے کہا۔

"کوک لے آؤ۔"

ملازم نے شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"صاحب! بے بی کے لیے آئس کریم لے آؤں؟"

"لے آؤ۔" یہ دو لفظ کہتے وقت انور کا گلا خشک ہوگیا۔ جب آئس کریم اور ٹھنڈی بوتل آگئی تو اس نے ایک گھونٹ پی کر کہا۔

"شبانہ! ملازم تمہیں بے بی کہہ رہا تھا۔ وہ کیا، سب ہی تمہیں بچی کہیں گے۔ میں بہت عمر والا ہوں تمہیں کسی نوجوان سے محبت کرنی چاہیے۔"

"محبت کیسے کروں؟ میں نے تو آپ سے بھی محبت نہیں کی تھی۔ یہ تو آپ ہی آپ ہوگئی اور کسی سے آپوں آپ نہیں ہوتی۔"

"تم کوشش تو کرو۔"

"میں نے کی تھی مگر نہیں ہوئی۔"

"کب؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جب باجی نے آپ سے الگ کردیا تو میں روز اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتی تھی اور ایک نوجوان مجھے دیکھتا رہتا تھا۔ پہلے تو میں نے نخرہ دکھایا پھر ڈھیل دکھائی مگر وہ اپنے عشق سے باز نہ آیا۔ کتنے ہی رت جگوں کے بعد میں نے سوچا آپ باجی سے ڈرتے ہیں اور یہ نوجوان کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہ ساری زندگی ساتھ نبھائے گا۔ میری سوچ بدلی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تو ایک رات وہ میرے پاس آگیا۔"

انور جمال نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے رقابت سے پوچھا۔ "پھر؟"

"پھر کیا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو چھو کر دیکھا۔ وہ آپ کے نہیں تھے۔ میں نے اس کے سینے پر سر رکھا۔ آپ کی مہک مل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرکے آپ کا خیال کیا پھر بھی ایسا لگا کہ مجھے بھیک مانگنے پر کھوٹا سکہ مل رہا ہے۔ میں نے اسے زور کا دھکا دے کر کہا۔ تمہیں میرے گھر آنے کی جرأت کیسے ہوئی اگر خیریت چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ ورنہ ابھی شور مچاتی ہوں۔ میرے تیور بدلتے ہی وہ کھڑکی سے کود کر بھاگتا چلا گیا....."

انور جمال دل کھول کر یوں ہنسنے لگا جیسے دماغ سے بوجھ اتر گیا ہو۔ یہ سوچ کر اتنی مسرت اور اتنا فخر محسوس ہوتا ہے کہ جو سامنے بیٹھی ہے سر سے پاؤں تک دیوانی ہے۔ اسے کوئی نہیں چرا سکتا۔ یہ ہماری جاگیر ہے۔ مرد بھی عجیب ہیں، دنیا کی ہر چیز کو اپنی جاگیر اور جائداد بنا کر رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے۔

انور جمال کے دل نے سمجھایا کہ اس عمر میں ایسی... حسین محبوبہ نصیب سے ہی ملتی ہے۔ یعنی شبانہ جیسی پیار کی دیوانی جو راتوں کو اس کے لیے جاگتی تھی۔ دن کو اس کی تلاش میں بھٹکتی رہتی تھی۔ اس کی یاد میں بھوکی رہتی تھی۔ اس کی جدائی میں سنگار نہیں کرتی تھی اور اس کے لیے بچپن کو چھوڑ کر پھول جیسی جوانی کے کانٹوں بھرے راستے پر آگئی تھی۔ ایسے وقت وہ اس کے راستے سے کانٹے نہ چنتا تو پھر اس شکایت کا بھی حق نہ ہوتا کہ بوڑھوں کو اس دنیا کی خوبصورتی میں حصہ نہیں ملتا ہے۔

وہ شبانہ کو اپنے دفتر میں لے آیا۔ اپنے چپراسی کو سمجھا دیا کہ کوئی ملنے آئے یا ٹیلی فون آئے تو کہہ دینا آج صاحب دفتر نہیں آئیں گے اور جنرل منیجر سے بھی کہہ دیا کہ ضروری کام وہ خود نمٹالے اور اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ اس طرح باہر کی دنیا سے رابطہ ختم کرکے اس نے اپنے ائرکنڈیشنڈ دفتر کی دنیا کا دروازہ بند کرلیا۔

اس دن سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کبھی دفتر، کبھی

ماکس ہے اور یہ وہ جگہ جہاں دونوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ہوتی لیکن کبھی نہ کبھی تو چوری پکڑی ہی جاتی ہے۔ ایک ہفتے بعد صفیہ نے بڑے چین کے ساتھ اپنے شوہر سے کہا۔

"آج کل آپ شبانہ سے پھر ملنے لگے ہیں۔"

"کون کہتا ہے۔ جب سے تم نے اسے یہاں سے نکالا ہے، میں نے اس کی صورت تک نہیں دیکھی ہے۔"

"آپ مردوں میں یہ بڑی خوبی ہے۔ جھوٹ بولتے وقت ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ میں پچھلے تین دن سے آپ کو سر کھجاتے دیکھ رہی ہوں۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں سر کھجانے لگا۔ وہ غصے سے بولنے لگی۔

"آپ کو اپنی عزت کا ذرا خیال نہیں ہے۔ معزز لوگوں میں بیٹھ کر اسی طرح سر کھجاتے ہوں گے۔ یہ بڑھاپے کا عشق آپ کو جگہ جگہ بدنام کرے گا۔"

اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ "صفیہ! میں اس کے پیچھے نہیں جاتا۔ وہ میرے پیچھے آتی ہے۔ میں کیا کروں؟"

"اگر آپ بے قصور ہوتے تو خفیہ ملاقاتوں کو مجھ سے نہ چھپاتے۔ اب آپ سچ سچ بتادیں کہ وہ کب اور کہاں ملتی ہے؟"

وہ تمام خفیہ اڈے نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"دفتر جانے کے راستے میں کہیں نہ کہیں مل جاتی ہے۔"

"آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ وہ آپ سے راستے میں ملتی ہے۔ آپ اسے دعائیں دیتے ہیں، وہ آپ کو جوئیں دے کر چلی جاتی ہے۔ کیا آپ سچ نہیں بولیں گے؟"

سوکن والی سچائی عورت کب برداشت کرتی ہے اس لیے صفیہ کو ٹالنے لگا۔ آخر صفیہ نے تنگ آکر کہا۔

"میں اسے اپنا گھر برباد نہیں کرنے دوں گی۔ کل سے میں آپ کے ساتھ دفتر جاؤں گی۔ آپ کو وہاں چھوڑ کر گھر کا کام کروں گی پھر شام کو دفتر جا کر آپ کو ساتھ لے آؤں گی۔"

"کیا میں مجرم ہوں کہ تم مجھے قیدی بنا کر رکھو گی؟"

"اگر آپ مجرم نہیں ہیں تو اعتراض نہ کریں، میں تو شبانہ کا راستہ روکنے کے لیے ایسا کر رہی ہوں۔"

وہ مزید بحث کرتا تو مجرم کہلاتا اس لیے خاموش رہا۔

دوسرے دن سے صفیہ اس کے ساتھ دفتر جانے اور آنے لگی۔ وہ دو دنوں تک شبانہ کو راستے کے کنارے کہیں نہ کہیں دیکھتی رہی۔ شبانہ نے بھی اسے انور کے ساتھ کار میں بیٹھے دیکھ لیا تھا اس لیے راستہ نہ روک سکی۔ تیسرے دن وہ نظر نہیں آئی۔ صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھا آپ نے؟ اب وہ سمجھ گئی ہے کہ دال نہیں گلے گی۔"

وہ شوہر کو دفتر میں چھوڑ کر گھر کے کاموں سے نمٹنے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی سہ دیواری میز کے پیچھے سے شبانہ نکل آئی۔

"تم ....؟" انور جمال اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں میں...... آپ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اب باجی کے ساتھ آنے جانے لگے ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ دراصل صفیہ کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا ہے اسی لیے وہ میری پہرے دار بن گئی ہے۔"

"جھوٹ... باجی کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم ملتے رہتے ہیں؟"

انور جمال نے اپنے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ سر کھجانے کی وجہ سے... میں نے تمہیں ہزار بار سمجھایا کہ روز اپنا سر دھویا کرو۔ کسی طرح جوئیں ختم کرو مگر تم خود ہی بے پروائی سے راز فاش کر دیتی ہو۔"

وہ شرمندہ سی ہو کر سر کھجاتے ہوئے بولی۔ "میں نے تو پیچھے سے بھی سر دھو کر دیکھ لیا۔ کچھ نہیں ہوتا۔ پتا نہیں یہ جوئیں کہاں سے آجاتی ہیں؟ ہائے میرے پیار کے دشمن بن گئے ہیں۔ آپ سے ملنے کے لیے میں سر منڈوا ڈالوں گی۔"

اس کے لہجے میں ارادے کی پختگی تھی۔ انور اس کی دیوانگی کو سمجھتا تھا کہ اس کی خاطر وہ اپنے بال کاٹ کر پھینک دے گی۔ اس نے کہا۔

"ایسی حماقت نہ کرنا۔ عورت کا حسن اس کے بالوں سے ہوتا ہے خواہ اس میں جوئیں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ لو پیسے رکھو اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ شاید وہ جوئیں مارنے کی دوا بتا سکے۔"

اس نے پیسے دیے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اسی لمحے کھلنے والے دروازے سے آواز آئی۔

"میں تو آپ سے یہ کہنا بھول ہی گئی......"

صفیہ دروازے پر ٹھٹک گئی۔ انور جمال اچھل کر شبانہ سے الگ ہوا مگر صفیہ کو جو کچھ دیکھنا تھا، وہ دیکھ چکی تھی اور اب دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر غصے سے لرز رہی تھی۔ اس کے ہونٹ یوں کانپ رہے تھے جیسے بہت ساری گالیاں ایک ساتھ نکلنا چاہتی ہوں اور وہ انہیں تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے روک رہی ہو۔

انور جمال نے پھر ایک بار اپنی صفائی پیش کی۔
''بس...... صفیہ ...... یہ ...... یہ تمہارے جانے کے بعد آئی ہے۔ میں نے نہیں بلایا ہے۔''
وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ ''آپ نے نہیں بلایا۔ آپ ابھی شریف آدمی کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ سب کچھ یہ کررہی تھی۔ آپ کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے جو اپنی بیوی کے ساتھ باعزت ازدواجی زندگی نہیں گزار سکتا اس سے زیادہ ذلیل اور کمینہ شخص کوئی نہیں ہوسکتا۔''
''صفیہ!'' انور جمال نے گرج کر کہا۔ ''کیا تم ہوش میں ہو کہ نہیں۔ یہ گالی کسے دے رہی ہو؟''
''ہاں۔ میں آج ہی ہوش میں آئی ہوں۔ آپ یہ گالیاں دینے والی زبان کھینچ لیں۔ اس لیے کہ آپ مجازی خدا بنے بیٹھے ہیں لیکن آپ جو اپنے عمل سے ایک بیوی کے رشتے کو گالیاں دے رہے ہیں، ایک مہذب انسان ہو کر انسانی تہذیب کو گالیاں دے رہے ہیں تو آپ کو اس کی سزا کون دے گا؟ کوئی نہیں۔ کوئی آپ کا گریبان پکڑنے والا نہیں ہے اسی لیے آپ کھل کر یہ کھیل کھیلتے ہیں......''
انور جمال نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صفیہ! آہستہ بولو۔ دفتر کے لوگ سن رہے ہوں گے۔''
''دفتر کے لوگ اندھے بہرے نہیں ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے اور سمجھتے ہوں گے کہ یہ لڑکی یہاں کیوں آتی ہے؟ اور ذرا دیکھو تو یہ کمینی کتنے اطمینان سے ہمارا جھگڑا دیکھ رہی ہے۔'' اس نے شبانہ کے بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چل نکل یہاں سے۔ کیا یہ تیرے باپ کا دفتر ہے......''
شبانہ نے ایک جھٹکے سے اپنے بالوں کو چھڑا کر صفیہ کو زور کا دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''نہ میرے باپ کا دفتر ہے نہ تمہارے باپ کا...... بس میں تمہاری بہت عزت کرچکی۔ میں سمجھاتی ہوں کہ میرے منہ نہ لگنا ورنہ......''
اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انور جمال نے ایک زور کا تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ ''تم صفیہ سے بدتمیزی کررہی ہو۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ چلو نکلو یہاں سے......''
اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا مگر شبانہ فرش پر گر کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ''میں نہیں جاؤں گی۔ یہاں سے نہیں جاؤں گی......''
''یہ نہیں جائے گی۔ میں ہی چلی جاتی ہوں۔'' صفیہ روتی ہوئی اپنے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی دروازہ کھول کر جانے لگی۔
''صفیہ رک جاؤ۔ میری بات سنو......''

وہ دروازے پر آیا تو باہر چپراسی، کلرک، منیجر اور جنرل منیجر وغیرہ ایک مجمع لگائے کھڑے تھے۔ اس نے گرج کر کہا۔
''یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا تماشا ہو رہا ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو۔''
بھیڑ چھٹنے لگی۔ اتنی سی دیر میں صفیہ جاچکی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک گم صم کھڑا رہا۔ اس نے ملازموں سے غصے میں کہا تھا۔ کیا یہاں تماشا ہو رہا ہے؟ اب یہ سمجھ میں آگیا کہ واقعی دلچسپ اور شرمناک تماشا ہوچکا ہے۔ دفتر کے ہر شخص کو معلوم ہوچکا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے گالیاں سنتا ہے اور وہ خود گالیاں سننے کے کام کرتا ہے اور یہ حقیقت کھل چکی ہے کہ اوپر سے شریف اور صاف ستھرے نظر آنے والے لوگ اندر سے کتنے میلے اور گھناؤنے ہوتے ہیں۔
اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ شبانہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تیزی سے قریب آکر اسے ایک ٹھوکر ماری۔
''کمینی، بدذات۔ تیری وجہ سے میرا گھر برباد ہو رہا ہے۔ باہر والوں کے سامنے بھی میری بے عزتی ہو رہی ہے۔ آخر تو میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی؟''
وہ اس کے بال پکڑ کر اسے تڑاتڑ مارتا رہا۔ اس نے منہ سے اف تک نہ کی۔ مار کھاتی رہی اور اس کے قدموں سے لپٹی رہی۔ بعض اوقات پتا نہیں چلتا کہ قدموں سے خوش نصیبی لپٹ رہی ہے یا بدنصیبی؟ کیونکہ وہ اسے خوش نصیبی سمجھ کر گلے لگاتا تھا اور بدنصیبی سمجھ کر مار رہا تھا...... اور بدنصیبی کے لیے یہ بات مشہور ہے کہ نہ وہ زر سے جاتی ہے نہ زور سے جاتی ہے۔ ایسے وقت آدمی اسے مار کر دراصل خود کو جوتے مارتا رہتا ہے۔
جب وہ مارتے مارتے تھک گیا تو صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ جوانی کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ بڑھاپا خود ہی تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔ شبانہ اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے اٹھی۔ دوپٹے سے اپنے چہرے اور گردن کو پونچھا پھر میز کی دراز سے آئینہ کنگھی نکال کر بکھری ہوئی زلفیں سنوارنے لگی۔ وہ غصے سے بولا۔
''کیا تمہارے پاس ذرا سی بھی شرم و حیا نہیں ہے؟''
''ہے......'' اس نے آئینے سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر اب آپ کے پاس آکر شرمانے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟''
وہ تلملاتا ہوا صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آیا پھر

اس کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "تم تو جیت چکی ہو۔ کوئی دوسری ہوتی تو اتنی مار کھانے کے بعد یہاں ایک منٹ کے لیے بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرتی۔"

"دوسری ہوتی تو گوارا نہ کرتی۔ میں تو آپ کی اپنی ہوں۔"

وہ اسے بے بسی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں نے تمہیں مارا ہے۔ مجھ سے نفرت کرو۔"

"کیسی نفرت؟ میرا آدمی مجھے نہیں مارے گا تو کیا دوسرا کوئی مارنے آئے گا؟"

وہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ شبانہ قریب آکر اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولی۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔ پہلے باجی مجھے آپ سے دور بھگاتی تھیں آج میں نے انہیں بھگا دیا۔ آج مجھے پتا چل گیا کہ مار کھا کر بھی میدان میں جمے رہو تو جیت اپنی ہی ہوتی ہے۔ اب تک باجی کا ڈر تھا اور دنیا والوں کا ڈر تھا۔ اب وہ میرے دل سے نکل گیا ہے......"

وہ بولتی رہی اور بالوں کو ٹٹول ٹٹول کر اپنے محبوب کے سر سے جوئیں نکالتی رہی۔

☆☆☆

وہ شام کو دفتر سے واپس آیا تو گھر میں نواسے نواسیاں کھیل رہے تھے۔ وہ بچوں کو باری باری گود میں لے کر پیار کرنے لگا۔ ایسے وقت میں اس کا ضمیر ملامت کررہا تھا کہ وہ اپنے گھر کی جنت کو اپنے ہاتھوں سے جہنم بنا رہا ہے۔ اب وہ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر رہا تھا کیونکہ بچے آئے ہیں تو صائمہ بیٹی بھی آئی ہوگی۔ وہ گناہ گار بن کر بیوی کا سامنا کرچکا تھا مگر بیٹی سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ صفیہ سمجھدار ہے۔ اس نے بیٹی سے بات چھپائی ہوگی اور یہ بھی خیال آیا کہ وہ بہت غصے میں تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی گستاخی نہیں کی لیکن اب اس کے منہ سے گالی بھی نکل چکی ہے۔ دل کا بوجھ گالیاں دینے سے بھی ہلکا نہ ہو تو اولاد کے سامنے دکھڑا رونے سے کچھ کم ہوجاتا ہے۔ اس نے اپنی بڑی نواسی سے پوچھا۔

"تمہاری امی اور ابو بھی آئے ہیں؟"

"ابو نہیں، امی آئی ہیں۔"

"وہ کیا کررہی ہیں؟"

"وہ نانی اماں کے ساتھ رو رہی ہیں۔ ہمیں کمرے سے بھگا دیا۔ نانا! وہ کیوں رو رہی ہیں؟"

بڑا چبھتا ہوا سوال تھا۔ صائمہ بھی یہی سوال کرتی کہ آپ امی کو کیوں رلا رہے ہیں؟

اس نے جی میں تو یہ کہا کہ گھر سے بھاگ جائے مگر بھاگ کر کہاں جاتے؟ کیا اپنا گھر، اپنی بیوی بچے، اپنا کاروبار سب چھوڑ دے؟ [illegible] ہے۔ [illegible] وہ تو کھانی ہی پڑے گا۔ وہ نواسی کو گود سے اتار کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ وہ دونوں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ صفیہ اپنی بیٹی کے سینے پر سر رکھے رو رہی تھی اور بیٹی اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

ایک وقت تھا جب ننھی صائمہ روتی تھی تو صفیہ اسے گود میں لے کر پچکارتی اور اس کے آنسو پونچھتی تھی۔ آنسو پونچھنے والی محبت جو اولاد پر قرض ہوتی ہے، وہ قرض آج بیٹی ادا کررہی تھی کیونکہ شوہر کا رومال پرایا ہوگیا تھا۔

صائمہ کی نظر دروازے پر گئی تو اس نے باپ کو دیکھتے ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سلام کیا۔ انور جمال شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ بیٹی اپنی ماں کی مظلومیت کا حساب باپ سے لے گی۔ شکایتیں کرے گی یا ماں کی حمایت میں باپ سے منہ پھیر لے گی لیکن جو لڑکیاں مشرقی آداب سے واقف ہوتی ہیں وہ ظالم باپ کو بھی ادب سے سلام کرتی ہیں اور یہ سلام غیر مشرقی باپ کے لیے طمانچہ بن جاتا ہے۔ اس نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔

"بیٹی! میں اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میری ایک غلطی سے تمہاری ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ جب میں غلطی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں تو تمہاری امی کو آنسو نہیں بہانا چاہئیں۔"

صفیہ روتے ہوئے بولی۔ "جی ہاں۔ مجھے رونا نہیں چاہیے۔ جشن منانا چاہیے کہ آپ اس کلموہی کو دفتر میں چھپا کر رکھتے ہیں۔"

"صفیہ! تم مجھے الزام دے رہی ہو۔ میں تمہارے ساتھ گھر سے دفتر گیا تھا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ وہاں جاکر چھپ گئی تھی۔"

"اگر چھپ گئی تھی تو آپ نے اسے مار کر کیوں نہ بھگایا؟ مگر آپ کیسے بھگائیں گے۔ آپ پر تو پھر سے جوانی آئی ہے۔"

"بیٹی کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم آنا چاہیے۔"

"آپ کو شرم نہیں آئی تو پھر مجھے کیوں آئے؟"

"امی!" صائمہ نے صفیہ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "آپ ابو سے کیسی باتیں کررہی ہیں۔ کیا آپ مہذب انداز اختیار نہیں کرسکتیں۔"

"صائمہ!" انور جمال نے کہا۔ "میں تمہارے سامنے تمہاری امی سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔"

صفیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ سے بدکلامی کی ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔"

انور اس کے پاس آکر بیٹھ گیا پھر اس کے آنسو پونچھنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو یاد آیا کہ رومال تو شبانہ کے پاس رہ گیا ہے۔ ایسے وقت بیوی کے پاس صرف اپنا ہی آنچل رہ جاتا ہے۔ اس نے اسی کے آنچل سے کام نکالتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرے خدا نے تمہیں معاف کیا۔ اب تم بھی انصاف سے کہو کیا میں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش نہیں کرتا ہوں؟"

"ہاں، میں نے آپ کو ناحق الزام دیا۔ آپ اس سے بچنے کے لیے میرے ساتھ دفتر آتے جاتے رہے۔ آج آپ نے میرے سامنے اسے مارا بھی ہے۔"

"صفیہ! میں نے تمہارے جانے کے بعد بھی اس کی خوب پٹائی کی ہے۔"

صائمہ نے پوچھا۔ "ابو پھر تو وہ مار کھا کر بھاگ گئی ہوگی؟"

انور جمال نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"نہیں بیٹے! مصیبت اتنی جلدی نہیں بھاگتی؟"

صفیہ نے چونک کر پوچھا۔

"کیا میرے جانے کے بعد وہ آپ کے پاس رہ گئی تھی؟"

"میں کیا کرتا؟ وہ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔"

"اسی لیے آپ نے اسے کلیجے سے لگا کر رکھ لیا۔"

"تم پھر غصہ دکھا رہی ہو۔ کیا مجھے طعنے دینے سے بگڑی بات بن جائے گی؟"

"میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔"

"امی! آپ ہی نے تو مجھے سمجھایا تھا کہ عورت خود جل جاتی ہے مگر اپنے گھر کو جلنے نہیں دیتی۔ آپ کی یہ دانشمندانہ نصیحتیں کیا ہو گئیں؟"

انور جمال وہاں سے اٹھ کر دور چلا گیا پھر وہاں سے پلٹ کر بولا۔

"شیشے میں بال پڑ جائے تو وہ نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ جاتا ہے۔ میں اپنی ایک غلطی کی ہزار بار معافی مانگوں تب بھی تمہاری امی کے دل میں بے اعتمادی کا نہ مٹنے والا داغ رہے گا۔ بیٹی! یہ جاننے کے باوجود میں آخری سانس تک تمہاری امی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

صفیہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔

"اعتماد اسی طرح بحال ہو سکتا ہے کہ میں جو کہوں آپ وہی کریں۔"

"میں وہی کروں گا۔"

"تو پھر آپ کل سے دفتر نہیں جائیں گے۔"

"نہیں جاؤں گا لیکن کاروبار کا کیا ہوگا؟"

"کاروبار کے لیے دفتر جانا ضروری نہیں ہے۔ آپ گھر میں بیٹھ کر فون پر پارٹیوں سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور یہیں بیٹھ کر آمد و خرچ کا حساب کر سکتے ہیں۔ کسی پارٹی سے ملنا ہوگا تو میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔ مگر تم یہ دیکھ چکی ہو کہ اب وہ تم سے بھی نہیں ڈرتی ہے۔"

"اس کا تو باپ بھی ڈرے گا۔ ایسے جوتے لگاؤں گی کہ سر کی ساری جوئیں جھڑ جائیں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل سے دفتر نہیں جاؤں گا۔ فون پر بہانہ کر دوں گا کہ بیمار ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ بیماری کی خبر سن کر آپ کی وہ لگی عیادت کے لیے یہاں آجائے گی۔ توبہ ہے۔ ایسی بے شرم لڑکی تو میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ زبردستی گلے پڑتی ہے۔"

صائمہ نے کہا۔ "اگر ہم اس سے ڈریں گے تو وہ اور سر چڑھے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ کوئی ہنگامہ نہیں کرے گی۔ آخر اسے بھی اپنی عزت کا خیال ہوگا۔ امی! اگر ہم اس کے گھر جا کر اس کی ماں کو سمجھا دیں کہ شبانہ اپنی حرکتوں سے بدنام ہوگی تو پھر کہیں سے اس کا رشتہ نہیں آئے گا۔"

"میں تو اماں بی کو سمجھا چکی ہوں۔ تم کہتی ہو تو چلو۔ ہم بڑی بی کو پھر ایک بار سمجھا دیں گے۔"

میاں بیوی کے درمیان سمجھوتا ہو گیا۔ بیٹی خوش ہو گئی۔ ایسے موقع پر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اپنا گھر بچا کر دوسرے کے گھر میں آگ لگائی جا چکی ہے۔ اب شبانہ جلے، مرے یا زندہ رہے۔ ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ کسی دوشیزہ کو مکھی بنا کر خود ہی دودھ میں ڈالا جاتا ہے پھر گھر کے افراد متحد ہو کر اس مکھی کو نکال پھینکتے ہیں تاکہ گھر کا کمانے والا مرد مکھی کی بیماریوں سے محفوظ رہے۔

دونوں ماں بیٹی شبانہ کے گھر پہنچیں تو وہ انور سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اپنے سر سے جوئیں صاف کر رہی تھی۔ اماں بی چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ شبانہ انہیں دیکھتے ہی چونک گئی۔ صفیہ اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے اماں بی کے پاس پہنچ کر بولی۔

"میں آپ سے صاف صاف بات کرنے آئی ہوں۔ آپ اس لڑکی کو گھر میں تالا ڈال کر رکھیں ورنہ یہ ایسے بدنام ہوگی کہ کوئی رشتہ مانگنے تو کیا، یہاں تھوکنے بھی نہیں آئے گا۔"

اماں بی نے کہا۔ "اے بی بی! ذرا آہستہ بولو۔ تو بتاؤ! میری بچی کو بدنام کیوں کر رہی ہو؟"

"میں کیا بدنام کروں گی جبکہ یہ خود بدنام ہو رہی ہے۔ آپ بیٹی سے یہ نہیں پوچھتیں کہ صبح لوگوں کے دفتر جانے کا وقت ہوتا ہے تو یہ کہاں جاتی ہے؟ کون سے دفتر میں کام کرتی ہے؟"

"بیٹی! یہ تو اپنی سہیلیوں کے گھر جاتی ہے۔"

"اماں بی! یہ کسی سہیلی سے نہیں۔ کسی یار سے ملنے جاتی ہے۔"

اماں بی ایک دم سے گھبرا کر شبانہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ شبانہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے صفیہ کو دیکھا پھر شیشی ایک طرف پھینک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"میں تمہیں باجی کہتی رہی۔ تمہاری عزت کرتی رہی۔ کبھی تمہارے گھر میں ڈاکا نہیں ڈالا بلکہ تمہارے گھر کے شریف لٹیرے نے مجھے لوٹا ہے۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے اسے بدنام نہیں کیا۔ یہ تمہاری ذلالت ہے کہ تم مجھے بدنام کرنے یہاں آگئیں۔ جب مجھے کسی یار سے منسوب کر رہی ہو تو پھر کیوں نہیں بتاتیں کہ اس کا نام انور جمال ہے......"

اماں بی اپنے سینے پر دوہتھڑ مار کر بولیں۔

"اری حرافہ! کیسی بے شرمی سے بولے جا رہی ہے۔ ایسا ہونے سے پہلے تجھے موت آجاتی تو اچھا تھا۔ ہائے بی بی صفیہ! تم نے ہم پر اتنے احسانات کیے ہیں۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے میاں احسانات کا بدلہ میری بچی سے لیں گے۔ میں غریب عورت، جس کا شوہر گم ہو گیا ہو، جس کا کوئی عزیز رشتے دار نہ ہو، وہ کس کے سامنے فریاد کرنے جائے۔"

صفیہ نے کہا۔ "اماں بی! اس طرح رونے سے سارا محلہ اکٹھا ہو جائے گا۔ میں آپ کی بھلائی کے لیے سمجھانے آئی ہوں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ دنیا والے کچھ نہیں جانتے۔ ہم جلد از جلد کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کر کے اس بدنامی کو سہاگ کا جوڑا پہنا دیں گے۔"

شبانہ نے کہا۔ "تمہیں شوق ہے تو تم پہن لو۔"

صائمہ نے قریب آکر پیار سے سمجھایا۔

"شبانہ! امی سے ایسی بات نہ کرو۔ تم کنواری ہو اس لیے تمہاری شادی کی بات کر رہی ہیں۔"

"مگر صائمہ! تمہارے ابو نے تو مجھے سمجھایا ہے کہ شادی صرف دنیا کو دکھانے کی رسم ہے۔ وہ شادی کے بغیر بھی مجھے ساری عمر چاہتے رہیں گے۔"

اس کی باتیں سن کر دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ اماں بی نے روتے ہوئے کہا۔

"سن لو صفیہ! تمہارے میاں میری نادان بچی کو کیسی باتیں سمجھاتے ہیں۔ تمہارے پاس ایمان ہے تو تم خود ہی انصاف کرو کہ میری بچی کتنی مظلوم ہے اور تمہارے میاں کتنے ظالم ہیں......"

"اماں بی! میں نے اپنے شوہر سے کتنا جھگڑا کیا ہے اور انہیں کیسی شرم دلائی ہے، یہ میرا خدا ہی جانتا ہے لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس کا ہم ماتم کرتے رہیں گے تو بگڑی ہوئی بات بھی نہیں بنے گی۔ دانش مندی یہی ہے کہ آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیں، منائیں اور زبردستی سے گھر کی چار دیواری میں بند رکھیں۔ میں نے بھی اپنے شوہر کو دفتر جانے سے روک دیا ہے۔ اب وہ گھر میں رہا کریں گے۔"

شبانہ نے چونک کر پوچھا۔

"کیا وہ گھر میں رہیں گے۔ کیا تم انہیں چوڑیاں پہنا کر بٹھا دوگی؟"

صفیہ نے کہا۔ "میں کیا کروں گی، یہ تو تمہیں اب پتا چلے گا کہ تم ان کے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکوگی۔"

شبانہ اسے گھورتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب کیا ہوگا۔ وہ انور کے سینے پر سر رکھ کر کیسے سوئے گی۔ یوں تو وہ اب بھی راتوں کو جاتی تھی مگر اس یقین کے ساتھ کہ اگلے دن اس کے جانے پہچانے بازو کا تکیہ مل جائے گا اور صفیہ پھر اس تکیے کو اس کے سرہانے سے کھینچ رہی تھی اور اس کی ماں سے کہہ رہی تھی۔

"مرد ہزار غلطیاں کر کے نیک نام رہتا ہے۔ میرے شوہر کا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میں آپ کا بھی کچھ بگاڑنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے سمجھا رہی ہوں کہ اپنی بیٹی کو فوراً ہی شادی کے لیے راضی کر لیں۔"

صائمہ سمجھانے کے لیے دوسری طرف گھوم گئی مگر دوسری طرف اب شبانہ نہیں تھی۔

"شبانہ! کہاں ہو تم......؟" وہ آوازیں دیتی ہوئی کمرے میں گئی۔ غسل خانے میں جھانک کر دیکھا، اسٹور روم کا دروازہ کھولا پھر واپس آکر بولی۔

"امی! شبانہ نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟ یہ اچانک کہاں غائب ہوگئی؟" صفیہ

نے پوچھا پھر چونک کر چیخ پڑی۔ ”ہائے صائمہ! وہ چڑیل تمہارے ابو کے پاس گئی ہوگی۔ جلدی چلو۔“

دونوں ماں بیٹی تیزی سے چلتے ہوئے مکان سے باہر آئیں۔ باہر گلی بہت تنگ تھی اس لیے وہ کشادہ گلی میں کار چھوڑ کر آئی تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچیں تو کار بھی غائب تھی۔ صفیہ نے جھلا کر کہا۔

”یہ ڈرائیور گاڑی لے کر کہاں چلا گیا ہے۔ میں اسے ملازمت سے نکال دوں گی۔“

صائمہ نے ایک قریبی چائے خانے کی طرف اشارہ کیا۔

”امی! شاید وہ چائے پینے گیا ہے۔“

”ارے تو کیا گاڑی بھی چائے خانے کے اندر لے گیا ہے؟“

صائمہ نے آگے بڑھ کر چائے خانے کے ایک آدمی سے پوچھا۔

”ہاں بی بی جی! ابھی ہمارے محلے کی ایک لڑکی شبانہ اس گاڑی میں بیٹھ کر گئی ہے۔“

صفیہ نے جب سنا تو وہیں کھڑے کھڑے شبانہ کو گالیاں دینے لگی۔ اس کے شوہر سے زیادہ غصہ اسے اس بات پر تھا کہ وہ اس کی گاڑی لے کر گئی تھی۔ اس وقت صفیہ کو پاگل پن کی حد تک غصہ آرہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے شاہراہ پاکستان تک پہنچیں۔ وہاں رکشے اور ٹیکسیاں آندھی طوفان کی طرح گزر رہی تھیں مگر کسی کو رکنے کی فرصت نہیں تھی۔ آخر صائمہ نے لفٹ لینے کے لیے ایک کار کی جانب ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کار قریب آکر رک گئی۔ وہاں اسٹیئرنگ سیٹ پر ایک خوش پوش ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ صائمہ نے کہا۔

”پلیز! مجھے اور میری امی کو ذرا سوسائٹی تک ......“

”امی؟“ کار والے نے ناگواری سے کہا۔ ”سوری! میں سمجھا تھا تم اکیلی ہو ......“

ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھی پھر فراٹے بھرتے ہوئے دور چلی گئی۔ صائمہ کے منہ تک گالی آتے آتے رہ گئی۔ اسے اچانک ہی سمجھ آگئی کہ وہ گالی اس کے باپ کو بھی پڑے گی۔

دوسری طرف صفیہ ایک کار والے کو گالیاں دیتی آرہی تھی۔ صائمہ نے پوچھا۔ ”کیا ہوا امی؟“

”کیا بتاؤں یہ دولت انسان کو حیوان بنادیتی ہے۔ میں نے اس کمینے سے کہا مجھے اور میری بیٹی کو ذرا سوسائٹی تک پہنچادو تو وہ حیرانی سے بولا۔ بیٹی کیسی بیٹی میں تو تمہیں کنواری سمجھ رہا تھا۔ ذلیل، کمینہ۔“

صائمہ سر اٹھا کر تاریک آسمان کو تکنے لگی۔ ایک گھنٹے بعد خدا خدا کرکے ایک ٹیکسی ملی۔ جب وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کے احاطے میں پہنچیں تو ڈرائیور کار کی صفائی کر رہا تھا۔ صفیہ نے غصے سے پوچھا۔

”تم کس کی اجازت سے گاڑی یہاں لائے ہو؟“

”جی بیگم صاحبہ! اجازت کون دیتا جی۔ شبانہ بی بی جی نے کہا کہ آپ ان کے ہاں رات کا کھانا کھائیں گی جی اور آپ نے صاحب جی کو بھی وہاں بلایا ہے۔ بس جی میں شبانہ بی بی کے ساتھ صاحب جی کو یہاں لینے آگیا۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں جی ......“

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی مکان میں داخل ہوئی۔ اس کا غصہ ایسا تھا جیسے ابھی شبانہ کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گی لیکن ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی ٹھٹک گئی۔ وہاں اس کا داماد، صائمہ کا شوہر توفیق بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ داماد کی موجودگی میں نہ تو شبانہ کی چوٹی پکڑ سکتی تھی نہ ہی شوہر کا گریبان پکڑ سکتی تھی۔ توفیق نے پوچھا۔

”آنٹی! آپ پریشان نظر آرہی ہیں۔ یہ گڑیا کہہ رہی تھی کہ امی اور نانی اماں رو رہی تھیں۔“

صفیہ نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے وہ ...... وہ صائمہ نے ایک لطیفہ سنایا تھا۔ ہنستے ہنستے آنسو آگئے۔ بچے سمجھ رہے ہیں کہ ہم رو رہے تھے۔ البتہ ابھی سر کے درد سے پریشان ہوں۔ تم صائمہ سے باتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ داماد کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ توفیق نے اپنی بیوی سے کہا۔

”صائمہ! یہاں آکر بیٹھو۔ وہ لطیفہ مجھے بھی سناؤ تاکہ ہنستے ہنستے آنسو آجائیں۔ ابھی دس منٹ پہلے میں نے تمہارے ابو کے کمرے میں شبانہ کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی دیکھیں۔ شاید تمہارے ابو بھی اسے کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں۔“

صائمہ نے کہا۔ ”آپ طنز نہ کریں۔ امی اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ اس لیے اپنی پریشانیاں چھپانے کے لیے الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہیں۔“

”تم تو ہوش میں ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آنٹی کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”میں گھر پہنچ کر آپ کو سب کچھ بتادوں گی۔ ابھی ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ امی

ہمیں ڈنر کے لیے کہیں، ہمیں یہاں سے چپ چاپ نکل جانا چاہیے۔"

توفیق اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسری طرف صفیہ تیزی سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچی تو انور جمال وہاں تنہا نظر آیا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے اور داماد کے خیال سے اپنی آواز کو دباتے ہوئے بولی۔

"وہ کمینی بدذات کہاں ہے؟"

انور جمال کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔

"صفیہ! ذرا صبر سے۔ توفیق میاں کو چلے جانے دو پھر تم میری گردن پر چھری پھیر دینا۔"

"میں خود مر رہی ہوں۔ آپ کو کیا ماروں گی۔ مرتے مرتے بھی آپ کی عزت کا خیال کرتی ہوں۔ اپنی آواز کو دباتی ہوں، اپنے غصے کو پیتی ہوں۔ دو کوڑی کی ایک لڑکی کے آگے میرے ازدواجی حقوق مٹی میں مل رہے ہیں پھر بھی میں شور نہیں مچا رہی ہوں۔ بیٹی میرے آنسو کب تک پونچھے گی؟ میں توفیق میاں سے کب تک حقیقت چھپاؤں گی؟"

"تم یقین کرو صفیہ! تھوڑی دیر پہلے میں شبانہ کو یہی سمجھا رہا تھا کہ وہ میری عزت کا خیال کرے۔ میرے اپنے گھر میں عزت نہ رہی، میں دفتر میں بدنام ہو گیا۔ اب یہ بدنامی آگے بڑھے گی تو میں توفیق میاں سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔ میں نے اسے ہر طرح سے سمجھایا مگر وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔"

"اسے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ وہ تنہائی میں آپ کو اچھی طرح سمجھا کر بہلا دیتی ہے۔ اسے تو میں یہاں سے دھکے دے کر نکالوں گی۔ کہاں ہے وہ؟"

"میں یہاں ہوں....." شبانہ باتھ روم کے دروازے سے باہر آ کر کھڑی ہو گئی پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔ "تم انہیں اپنا قیدی بنا کر رکھو گی تو میں یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"کیسے نہیں جائے گی۔ یہ میرا گھر ہے۔" صفیہ نے آگے بڑھ کر اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ اس نے صفیہ کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ انور جمال دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ایک دوسرے کو مار رہی تھیں اور بیچ بیچ میں کھسوٹ رہی تھیں۔ انور جمال کو بھی کتنے ہی ہاتھ پڑ گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا پھر شبانہ کو ڈانٹ کر کہا۔

"تم کب تک مصیبت بنی رہو گی۔ تمہاری وجہ سے میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔"

شبانہ نے کہا۔ "یہی تو میں اتنی دیر سے سمجھا رہی تھی کہ ہم کہیں بھاگ جائیں گے مگر آپ ہمت نہیں کرتے ....."

"میں تمہارے ساتھ نہیں، تنہا بھاگنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے آپ تنہا بھاگ جائیں۔ میں بعد میں آ جاؤں گی۔"

"اُف!" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

صفیہ کو اس پر ترس آ گیا۔ وہ ذرا نرم پڑ کر شبانہ سے بولی۔ "کیا تمہیں ان پر ترس نہیں آتا۔ اس طرح تو یہ پاگل ہو جائیں گے۔"

شبانہ نے پوچھا۔ "ہو جائیں گے کیا مطلب؟ یہ تو بہت پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ شبانہ میں تمہارے لیے پاگل ہو گیا ہوں۔"

صفیہ نے گھور کر انور کو دیکھا۔ انور نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کی قسم یہ بات میں نے دو ماہ پہلے کہی تھی۔ اب تو میں پچھتا رہا ہوں۔"

"اگر پچھتا رہے ہیں تو پھر اسے جوتے مار کر یہاں سے نکالیں۔ یہ باتوں سے نہیں مانے گی۔"

انور جمال نے شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "تم کچھ باتوں سے نہیں مانو گی۔ میں تمہیں دھکے دے کر نکالوں گا۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ صفیہ نے پوچھا۔

"آپ اسے مارتے کیوں نہیں؟"

انور نے تڑاخ سے ایک طمانچہ رسید کیا۔ شبانہ نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ اپنی مردانگی دکھانے کے لیے ماریں گے تو میں خوشی سے مار کھا لوں گی اور اگر بیوی کے کہنے سے ماریں گے تو پھر میں آپ کی عزت کا خیال نہیں کروں گی۔ شور مچانا شروع کر دوں گی۔"

صفیہ نے کہا۔ "آپ اس کی دھمکیوں میں نہ آئیں۔ اس کی ہڈی پسلیاں توڑ کر رکھ دیں۔"

انور نے اسے دو چار ہاتھ جمائے پھر اسے بالوں سے پکڑ کر فرش پر گرا دیا اور لاتیں مارنے لگا۔ اسی لمحے شبانہ نے زور کی چیخ ماری۔ چیخ کی آواز آس پاس کی کوٹھیوں تک ضرور پہنچی ہو گی۔ انور جمال سہم گیا کیونکہ چیخ کے ذریعے بدنامی نشر ہو رہی تھی۔ شبانہ نے ہذیانی انداز میں دوسری بار چیخ ماری۔

انور نے فرش پر بیٹھ کر اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیا تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو؟"

شبانہ نے اپنے منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا۔

''آپ میرے ساتھ کون سی بھلائی کر رہے ہیں۔ میں اب بھی سمجھاتی ہوں کہ آپ مجھے اپنا سمجھ کر مار رہے ہیں۔ دوسروں کے کہنے پر دشمن بن کر ماریں گے تو میں بھی دشمن بن جاؤں گی۔''

''کیا یہ دشمنی نہیں ہے کہ تم مجھے پریشان کر رہی ہو؟''

''جب آپ نے مجھے محبت کا سبق سکھایا تو وہ دشمنی نہیں تھی۔ اب میں محبت سے مجبور ہو کر آپ کے قدموں سے لپٹ رہی ہوں تو آپ اسے دشمنی کہہ رہے ہیں۔ آپ کیسی دوغلی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے سمجھائیے کہ جو پہلے محبت تھی وہ اب دشمنی کیسے ہوگئی؟''

وہ بڑی بے بسی سے بولا۔

''میں کیسے سمجھاؤں؟ دراصل پہلے میں نے غلط کہا تھا۔ ہم نے جو کچھ کیا وہ محبت نہیں تھی، بے شرمی تھی۔''

''اچھا تو اب آپ شرم کریں اس بے شرمی کو محبت میں بدل دیں۔ مجھ سے شادی کرلیں۔''

صفیہ ایسے ہی وقت کے لیے ڈر رہی تھی کہ وہ چھوکری بھی سوکن بننے کی ضد نہ کرے۔ اسی لیے وہ اپنے شوہر سے اسے دور بھگاتی رہی تھی مگر وہ تو جونک کی طرح چمٹ گئی تھی اور اب شادی کا مطالبہ شروع کردیا تھا۔ صفیہ اسے مارنے کے لیے آگے بڑھی۔

''کمینی! تو میری سوکن بننا چاہتی ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

شبانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''تم خود ہی کہہ رہی تھیں کہ مجھے شادی کرنا چاہیے۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی تو ہوں نہیں کہ شادی کا سبق تمہارے میاں سے پڑھ کر آموختہ کسی دوسرے مرد کو سناؤں۔ کیا تم بھی انور صاحب سے شادی کرنے سے پہلے کہیں سے سبق پڑھ کر آئی تھیں؟''

''ارے او حرافہ! میں تیری زبان کھینچ لوں گی۔''

''یعنی میری یہ بات اتنی بری ہے کہ تم میری زبان کھینچ لوگی اور تم جو یہ شرمناک مشورہ مجھے دے رہی ہو تو ایسے وقت ایک عورت ہو کر تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ کیا تم ذرا بھی انصاف سے نہیں سوچتیں کہ میں غریب ہوں تو کیا ہوا، بازاری نہیں ہوں۔ ہر شریف لڑکی کی طرح میرا خدا ایک ہے۔ میرا مرد بھی ایک ہی ہوگا۔ میں اپنی جان دے دوں گی مگر کسی دوسرے کا منہ نہیں دیکھوں گی۔''

''بڑی آئی شریف زادی۔ میں تجھے اپنی سوکن نہیں بننے دوں گی۔'' پھر وہ انور جمال سے بولی۔ ''آپ خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ کیا آپ بھی اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

انور نے کہا۔ ''شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا شبانہ! میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ ہماری عمر کے درمیان زمین آسمان کا فاصلہ ہے۔ ہمیں میاں بیوی کے روپ میں دیکھ کر دنیا والے مذاق اڑائیں گے۔ پھر یہ کہ میرا بڑھاپا ایک ایسا پرانا شکستہ سا پلنگ ہے، جو زیادہ عرصے تک جوانی کا بوجھ نہیں برداشت کرسکے گا، کسی وقت بھی ٹوٹ جائے گا۔''

شبانہ نے کہا۔ ''میں بھی آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میں آپ کے لیے بھری جوانی میں بوڑھی بن جاؤں گی لیکن آپ سے دور نہیں رہوں گی۔''

صفیہ اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر پاگل ہوجانے کے انداز میں چیخنے لگی۔

''یہ مصیبت کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑے گی اور میں اپنے اوپر سوکن بھی برداشت نہیں کروں گی۔ میرے سرتاج! میرے مجازی خدا! جب آپ ہی نے اسے گلے لگا کر مجھ سے دشمنی کی ہے تو میں کسی کو کیا الزام دوں؟ اب آپ اس سے بیاہ رچائیں، میں یہ گھر چھوڑ کر جارہی ہوں۔ کہیں جا کر اپنی جان دے دوں گی۔''

وہ غصے میں تنتناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ انور جمال نے آگے بڑھ کر آواز دی۔

''صفیہ! ٹھہر جاؤ۔ پاگل نہ بنو۔ اتنی رات کو تنہا کہاں جاؤ گی۔''

شبانہ نے پیچھے سے قمیص کا دامن پکڑ کر پوچھا۔ ''آپ مجھے چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں؟'' اس نے بڑی نرمی سے التجا کی۔

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جارہا ہوں۔ مجھے صفیہ کو روکنے دو۔ اگر وہ غم و غصے کی حالت میں جان پر کھیل جائے گی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔''

وہ جلدی سے پیچھا چھڑا کر کمرے سے باہر آیا پھر دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم سے گزرتا ہوا کوٹھی کے باہر پورچ میں آیا۔ صفیہ کوٹھی کے احاطے سے باہر جارہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا پھر ہانپتے ہوئے بولا۔

''وہ نادانی کررہی ہے۔ خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ اتنی رات کو باہر نہ نکلو......''

''تو کیا اسے سوکن بنا کر بٹھالوں؟ اس سے پہلے کہیں جا کر مر جاؤں گی۔''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ اس سے نجات پانے کی ایک تدبیر ہے۔ اگر تم میرا

ساتھ دو.....“

”کیا تدبیر ہے؟ جلدی بتایئے۔“

”صفیہ! آج رات تم شبانہ کو اپنے گھر میں برداشت کرلو۔ کل تم ہنستے بولتے اسے رخصت کرتے وقت کہنا کہ وہ ہر رات ہماری کوٹھی میں آجایا کرے۔ اس طرح وہ شادی کے لیے ضد نہیں کرے گی۔“

”آخر آپ مرد ہیں نا، اپنے فائدے والی تدبیر سوچیں گے۔ میں اسے ایک منٹ کے لیے برداشت نہیں کروں گی۔“

”صفیہ! پہلے تم میری بات تو سن لو۔ میری تدبیر یہ ہے کہ کل وہ اپنے گھر چلی جائے گی تو ہم اپنا سامان باندھیں گے۔ کوٹھی لاک کریں گے پھر کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے اور جب تک شبانہ کی شادی کی خبر نہ ملے، واپس نہیں آئیں گے۔ ٹھیک ہے؟“

صفیہ نے خوش ہوکر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ کراچی چھوڑ کر صفیہ کے ساتھ حیدر آباد آگیا اور وہاں چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ یہ بات صرف اس کی بیٹی اور داماد اور اس کے جنرل منیجر کو معلوم تھی۔ جنرل منیجر دفتری معاملات کے سلسلے میں رابطہ قائم رکھتا تھا اور صائمہ اور توفیق یہ خبری کرتے تھے کہ شبانہ کس حال میں ہے اور شادی کے لیے راضی ہو رہی ہے یا نہیں۔

پہلے دو ہفتوں تک خبر ملتی رہی کہ شبانہ بولائی بولائی سی پھرتی رہتی ہے۔ صبح شام انور جمال کی کوٹھی کے چکر لگاتی ہے۔ کبھی کبھی صائمہ کے پاس آکر پوچھتی ہے اور کبھی دفتر کے آس پاس گھومتی رہتی ہے۔

صفیہ نے کہا۔ ”کب تک ماری ماری پھرے گی۔ ہار کر پچھتا کر شادی کرلے گی۔ جوان لڑکی ہے۔ اسی طرح گھومتی رہی تو غنڈے بدمعاش اٹھا کر لے جائیں گے۔“

انور جمال اس سے پیچھا چھڑا کر تو آگیا تھا مگر اس کا ضمیر ملامت کررہا تھا کہ ایک لڑکی کو بچپن کی ٹھنڈی چھاؤں سے نکال کر اس نے جوانی کی دھوپ میں اسے جلنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ شبانہ نے کون سی غلطی کی تھی؟ اس نے اپنی معصوم راتوں میں اسے بلایا نہیں تھا۔ وہ خود محبت کا فریب دینے اور اس کی نیند کا سودا کرنے پہنچا تھا۔

جب سودا طے ہوگیا تو اب وہ قیمت ادا کرتے رہنے سے کترا رہا تھا۔ اپنا گھر، اپنی بیوی اور اپنی عزت کی سلامتی کے لیے ایک مجبور لڑکی کو بے عزتی کی راہوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ آیا تھا اور اب چپ چاپ پچھتا رہا تھا۔ کمانے کے لیے بیٹھتا تو نوالہ حلق سے نہ اترتا، نگاہوں کے سامنے گلی گلی اسے پکارتی نظر آتی تھی۔

صفیہ اپنے شوہر کی گونگی پریشانیوں کو سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کی دلجوئی کرتی تھی۔ اس کے لیے دیر تک راتوں کو جاگنے لگی تھی۔ بیوی کی خدمت گزاری دیکھ کر وہ سوچتا کہ صفیہ کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے شبانہ سے جھگڑا کرلائی ہے اور اپنے حقوق کی بحالی..... کی خاطر اپنے فرائض ادا کررہی ہے۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا، اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ خود ہی خطاوار تھا۔ دو ماہ گزر گئے خبر ملی کہ جس کوٹھی کو لاک کرکے آئے تھے اس میں ٹی وی، ریڈیو، گھڑی اور دوسری قیمتی چیزیں چوری ہوگئیں۔ پانچ ماہ بعد ایسٹرن تبسا کو کمپنی سے نوٹس ملا کہ انور جمال ایجنسی کی کارکردگی مایوس کن ہے۔ اگر کاروبار پر توجہ نہ دی گئی تو سگریٹوں کی ایجنسی ختم کردی جائے گی۔

انور جمال نے صرف ایک غلطی کی تھی اور اس کا ردعمل چاروں طرف سے نقصان اور تباہی کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک روز صائمہ اور توفیق ان سے ملنے حیدر آباد آئے۔ توفیق نے کہا۔

”انکل! آپ اس لڑکی کی وجہ سے کس طرح تباہ ہورہے ہیں یہ آپ خود سمجھ رہے ہیں مگر وہ نہیں سمجھی۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی۔ آپ کب تک اپنا گھر اور کاروبار چھوڑ کر یہاں بیٹھے رہیں گے؟“

انور جمال اس سلسلے میں اپنے داماد سے باتیں کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ ایسے وقت شدت سے احساس ہوتا تھا کہ سسر اور داماد کے درمیان یہ موضوع انتہائی شرمناک ہے۔ اسے کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ توفیق نے پوچھا۔

”انکل! آپ نے جواب نہیں دیا؟“

”کیا جواب دوں۔ بس ایک ہی راستہ ہے کہ میں مر جاؤں۔“

صفیہ بولی۔ ”مریں آپ کے دشمن..... آپ ہمیشہ مجھے دکھ پہنچانے والی باتیں سوچتے ہیں۔ اس حرافہ کا کیا جائے گا۔ آپ کے بعد وہ کسی سے شادی کرلے گی۔ میں کس کے سہارے جیوں گی؟“

وہ ایک دم سے جھلا گیا۔ ”میں کیا جانوں کہ تم کس طرح جیو گی۔ جس طرح تم مجھے کہہ رہی ہو، میں اسی طرح مر مر کر جی رہا ہوں۔ میری بھوک مر گئی، میری نیند اڑ گئی، میری عزت خاک میں مل گئی، میرا کاروبار تباہ ہوگیا۔ اب زندہ رہنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ کچھ نہیں..... جب کچھ نہیں رہا تو مجھے جلد از جلد اپنی موت کا آخری فیصلہ کرنا چاہیے۔“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکلا۔ وہاں سے ایک وریڈور میں آیا پھر کوریڈور سے گزرتا ہوا اپنے روم میں پہنچ گیا۔ کمرے کے اندر کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس شبانہ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بچپن کی شاخ سے ٹوٹی ہوئی کلی، جوانی کی بہار میں آکر اجڑ گئی تھی۔ اس کے لانبے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ شکن آلود لباس کتنی ہی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ ننگے پاؤں میں تلاش کے چھالے پڑے ہوئے تھے جو اب پھوٹ کر زخم بن گئے تھے۔

انور نے سوچا۔ اب یہ میری بے وفائی پر طعنے دے گی، صفیہ کی طرح منہ سے گالیاں بھی نکالے گی اور پھر سے ہنگامے کھڑے کرے گی... لیکن جب اس نے دونوں بازو پھیلائے تو وہ دوڑتی ہوئی آکر اس کے سینے سے چپک گئی۔

انور نے پھر سوچا کہ اب یہ روئے گی اور اسے چھوڑ کر آنے کی شکایتیں کرے گی...... لیکن وہ بالکل چپ تھی۔ اس نے کچھ پوچھنے کے لیے اپنے بازوؤں کی گرفت ذرا ڈھیلی کی تو وہ فرش پر گرنے لگی۔ تب پتا چلا کہ وہ بے ہوش ہوگئی ہے۔ اس نے اسے سنبھال کر فرش پر لٹایا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ایسی معصوم اور مظلوم نظر آرہی تھی کہ انور جمال مارے شرم کے رونے لگا۔

رونے کی کیا ضرورت تھی؟ اس لڑکی نے تو شکایت نہیں کی۔ اس کے پاؤں کے چھالے کہہ رہے تھے کہ وہ سات ماہ سے دوڑتے دوڑتے آج منزل پر پہنچ کر بے ہوش ہوگئی ہے۔ اس کی دوڑ بے ہوش ہونے کی حد تک نہیں تھی۔ اگر وہ نہ ملتا تو وہ باؤلی زندگی کی انتہا اور موت کی ابتدا تک دوڑتی رہتی۔

انور جمال نے تڑپ کر سوچا کہ اسے کاندھے پر لاد کر کہیں دور بھاگ جائے۔ ساری دنیا سے ناتے توڑ لے۔ سوچنا تو بہت آسان ہوتا ہے لیکن اس پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو پاؤں میں پرانے رشتوں کی زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ سوسائٹی سے حاصل کی ہوئی عزت ہاتھ تھام لیتی ہے اور سب سے بڑی بزدلی ہوتی ہے جو ڈانٹ کر ایک طرف بٹھا دیتی ہے۔

وہ سوچنے کے دوران اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتا رہا۔ وہ ہوش میں آئی تو نگاہوں کے سامنے اپنے محبوب کو دیکھتے ہی رونے لگی۔ انور جمال نے اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

”میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔“

"آپ کیوں شرمندہ ہوتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ باجی نے آپ کو مجھ سے چھڑایا ہے۔"

اسے اطمینان ہوا کہ وہ اسے فرشتی نہیں مجبوری ہے۔ اس نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟"

"جب سے آپ غائب ہوئے ہیں میں ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی۔ صائمہ تو کبھی نہ بتاتی۔ اس لیے میں دفتر کے لوگوں کے پیچھے پڑ گئی۔ وہاں بھی کسی نے نہیں بتایا۔ آخر تھک ہار کر مجھے ذرا بے شرم بننا پڑا۔ میں نے چپڑاسی کو مسکرا کر دیکھا تو اس نے مجھے بتایا کہ جنرل منیجر کے سوا کوئی بھی صاحب کا پتا نہیں جانتا پھر میں نے آپ کے نوجوان منیجر سے عشق شروع کر دیا۔ میں ایک دن اس کے ساتھ پارک میں گئی۔ دوسرے دن سینما دیکھا۔ آج تیسرے دن مجھے اس نے اپنے گھر میں بلایا۔ میں نے کہا صرف ایک شرط پر آؤں گی، پہلے اپنے صاحب کا پتا بتا دو۔ بے چارے عاشق نے بتا دیا۔ میں یہاں آ گئی۔ وہ وہاں اپنے گھر میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

انور جمال اسے یک ٹک دیکھنے لگا۔ پھر بھی اسے کچھ نہ سکا کہ جو لڑکی صرف سر کھجانے اور جوتیں مارنے کے سوا کچھ نہیں جانتی تھی، اسے انور جمال کے عشق نے اتنا چالاک بنا دیا ہے کہ اب وہ دوسروں کو عشق کا فریب دے کر اپنی منزل کا سراغ لگاتی ہے۔ کوئی عورت چالاک بن کر پیدا نہیں ہوتی۔ مرد کے ہاتھوں میں کھیلنے کے بعد مکاری سے جینے کے ڈھنگ سیکھتی ہے۔

انور جمال کو مزید کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں ملا۔ صفیہ، صائمہ اور توفیق وہاں پہنچ گئے۔ شبانہ کو دیکھتے ہی پھر ہنگامہ شروع ہو گیا کہ وہ کیوں آئی؟ کیسے آ گئی؟ اسے مار پیٹ کر گھر سے نکالو۔ شبانہ تھکن سے نڈھال تھی پھر بھی میدان میں جم کر کھڑی ہو گئی۔ توفیق نے کہا۔

"لڑائی جھگڑے سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ ہم یہاں بھی بدنام ہو جائیں گے۔"

صفیہ نے غصے سے پوچھا۔ "کیا میں بدنامی کے ڈر سے اسے اپنی سوکن بنا لوں؟"

شبانہ نے عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"باجی! میں لڑنا بھی جانتی ہوں اور مجھے جھکنا بھی آتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے آپ کی عالیشان کوٹھی نہیں چاہیے۔ آپ کے شوہر کی دولت کا ایک پیسا بھی نہیں چاہیے۔ میں آپ کی سوکن بھی نہیں بننا چاہتی۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ انور صاحب کو مجھ سے دور نہ کریں..... نہ کریں باجی! نہیں تو میں مرتے دم تک اسی طرح لڑتی رہوں گی۔"

توفیق نے انور جمال سے کہا۔

"انکل! آپ اس لڑکی کو اپنا آخری فیصلہ سنا دیں کہ یہ ساری عمر لڑتی رہے گی تب بھی آپ اسے دھتکارتے رہیں گے۔"

کمرے میں ایک طرف شبانہ تنہا کھڑی تھی دوسری طرف بیوی، بیٹی اور داماد تھے۔ ان کے ساتھ خاندانی عزت اور سماجی نیک نامی تھی۔ شبانہ کے ساتھ صرف اس کی دیوانگی تھی لہٰذا اسے داماد کی بات ماننا پڑی۔ اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"شبانہ! تم کیا چاہتی ہو کہ میں بیٹی اور داماد کی نظروں سے بھی گر جاؤں؟ تم خود سوچو کہ تم نے مجھے کہاں کہاں بدنام نہیں کیا۔ تمہاری وجہ سے میرا کاروبار تباہ ہو گیا۔ میرا گھر جہنم بن گیا اور میں خانہ بدوش کی طرح بے گھر ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں تم سے آخری بار کہتا ہوں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ ورنہ...."

شبانہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"ورنہ آپ یہاں سے بھاگ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔ آپ کیسے مرد ہیں۔ بیوی کہتی ہے مارو تو آپ مجھے مارنے لگتے ہیں۔ داماد کہتا ہے چھوڑ دو تو آپ مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ آپ کے پاس اپنا دماغ اور اپنے ارادے نہیں ہیں؟"

انور جمال نے کہا۔ "ہر انسان کے پاس اپنا دماغ ہوتا ہے لیکن سوسائٹی میں اپنا مقام بنانے کے لیے اور خاندان میں اپنی عزت کو قائم رکھنے کے لیے اسے دوسروں کی خواہش کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ تم مجھ سے بحث نہ کرو۔ یہاں سے چپ چاپ چلی جاؤ۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "آپ نے کہا اور میں چلی گئی۔ واہ میری بے غرض محبت کا بہت اچھا صلہ دے رہے ہیں۔"

"مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔

"ہے۔" وہ بھی چیخ کر بولی۔ "آپ بیوی اور داماد کے ڈر سے انکار کر رہے ہیں۔ آج آپ کو ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرنا ہوگا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں ورنہ میں یہیں اپنی جان دے دوں گی۔"

"تم مر جاؤ مگر میں یہی کہتا رہوں گا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

"اچھا تو میں مر کر دکھاؤں؟"

وہ کمرے میں چاروں طرف یوں نظریں دوڑانے لگی جیسے مرنے کے لیے کوئی ہتھیار تلاش کر رہی ہو پھر وہ

تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ صفیہ نے کہا۔
''خس کم جہاں پاک۔ اچھا ہے کہیں جا کر مر جائے۔''
صائمہ نے پریشان ہو کر کہا۔
''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ سچ مچ جان دینے نہ گئی ہو۔''
توفیق نے کمرے سے جاتے ہوئے کہا۔
''اگر اس نے یہاں خودکشی کی تو ہم سب بری طرح پھنس جائیں گے۔ اسے یہاں سے دور بھگانا ہوگا۔''
اس نے معقول بات کہی تھی۔ سب ہی کمرے سے نکل کر اسے تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے دوسرے بیڈروم اور ڈرائنگ روم میں دیکھا۔ پھر کوٹھی سے باہر آئے۔ کچن میں کسی نے نہیں دیکھا۔ باہر بھی اسے نہ پا کر انہیں اطمینان ہو گیا کہ وہ ان کی رہائش گاہ سے دور جا کر مرے گی۔
وہ سب باتیں کرتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہوئے پھر ڈرائنگ روم میں آئے۔ وہاں شبانہ کو دیکھتے ہی ان کا اطمینان غارت ہو گیا۔ وہ کراہوں کے انداز میں ایک صوفے پر نیم دراز تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ بوتل شراب کی نہیں، مٹی کے تیل کی تھی۔ اس نے بوتل کو بلند کرتے ہوئے انور جمال سے کہا۔
''میں آپ کی خواہش کے مطابق مر رہی ہوں۔ آدھی بوتل پی لی ہے۔ آدھی اور پینے سے پہلے آپ ایک بار ان سب کے سامنے ذرا جرأت سے کہہ دیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔''
اس کی خودکشی کا انداز دیکھ کر سب ہی لرز گئے۔ توفیق نے گھبرا کر کہا۔
''یہ یہاں مرے گی تو ہم سب تھانے میں نظر آئیں گے۔''
وہ بوتل کو منہ لگانے جا رہی تھی۔ انور جمال نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بوتل چھینتے ہوئے کہا۔
''توفیق میاں! فوراً کار گیراج سے نکالیں۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔''
توفیق باہر چلا گیا۔ صفیہ نے کہا۔
''آپ کیوں اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ کار میں لے جا کر کہیں چھوڑ آئیے۔ اس کے مرنے کے بعد کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق تھا۔''
''بکواس مت کرو۔ میں تم سب لوگوں کی خاطر مجبور ہو کر شبانہ سے بے وفائی تو کر سکتا ہوں مگر اس کا قاتل نہیں بن سکتا۔''
وہ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر لے جانے لگا۔

''ہم کو ڈر ہے کہ تیری باہوں میں، ہم خوشی سے مر نہ جائیں''

مٹی کے تیل کی گرمی سے شبانہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ نے زبان سے نہیں کہا مگر عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ مجھ سے محبت ہے۔ بس میں جیت گئی.....''
اتنا کہہ کر اس نے اپنا سر بوڑھے محبوب کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر بڑی آسودگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

طبی امداد بروقت پہنچائی گئی تھی اس لیے وہ مرتے مرتے بچ گئی اور بچنے کے بعد پھر مصیبت بن گئی۔ انور جمال نے جب اسے اسپتال سے لے جانے کی اجازت مانگی تو ڈاکٹر نے کہا۔
''سوری! ابھی نہیں۔ میں ذرا ایک کیس سے نمٹ کر پولیس انسپکٹر کو کال کروں گا۔ آپ کو یہ بیان دینا ہوگا کہ لڑکی خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھی۔''
انور جمال، صفیہ، صائمہ اور توفیق سب ہی بوکھلا گئے۔ صفیہ نے کہا۔
''ڈاکٹر صاحب! ہم شریف لوگ ہیں۔ تھانہ کچہری سے دور ہی رہتے ہیں۔ پلیز آپ مریضہ کو چھٹی دے دیں۔''
''محترمہ! میں مجبور ہوں۔ یہ اسپتال والوں کا نہیں، پولیس والوں کا کیس ہے۔ آپ میرا وقت ضائع نہ کریں۔''
وہ سب باری باری خوشامدیں کرتے رہے مگر ڈاکٹر نے ایک نہ سنی۔ توفیق نے وارڈ بوائے کو ایک طرف لے جا کر معلوم کیا کہ ڈاکٹر کو رشوت دے کر کام چل سکتا ہے یا

نہیں؟ وارڈ بوائے نے اپنا کان پکڑ کر کہا۔
"ڈاکٹر صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔ آپ بھولے سے بھی ان کے سامنے رشوت کا نام نہ لیں۔"
صفیہ نے کہا۔ "پتا نہیں وہ پولیس انسپکٹر کس مزاج کا ہوگا۔ اگر اس نے بھی رشوت لینے سے انکار کیا تو یہ بدنامی عدالت اور اخبارات تک پہنچے گی۔"
پھر وہ انور جمال سے بولی۔ "اسی دن کے لیے سمجھایا جاتا تھا کہ انسان کو ہوس میں اندھا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کے ایک گناہ کی سزا ہم سب کو مل رہی ہے......"
انور جمال سر جھکا کر اپنے داماد کے سامنے سے گزر گیا۔ اب وہ ایسا نادم تھا کہ خود اپنی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ زنانہ وارڈ کے قریب سے گزرتے وقت دل نے کہا کہ شبانہ کو ایک نظر دیکھ لے مگر وہ دل پر جبر کرتا ہوا اسپتال سے باہر آگیا۔ اپنی کار اس نے صفیہ وغیرہ کے لیے چھوڑ دی۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کوٹھی میں واپس آگیا۔ اب اسپتال میں جو ہوتا ہے، وہ ہوتا رہے۔ اس میں اب مزید بدنامیاں برداشت کرنے کا حوصلہ نہ رہا۔ وہ گھر پہنچتے ہی کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ پھر لکھنے لگا۔
"صفیہ ...... ! بہت ہو چکا۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ بھی ہو چکا۔ میں یہ شکایت نہیں کروں گا کہ تم نے مجھے گالیاں دیں اور داماد کے سامنے طعنے بھی دیے۔ میں اسی سزا کے قابل تھا۔
میں کسی سے یہ فریاد بھی نہیں کر سکتا کہ میرا کاروبار تباہ ہو گیا اور میں گھر سے دفتر اور دفتر سے تھانے کچہری تک بدنام ہونے جا رہا ہوں کیونکہ تباہی اور بدنامی کے راستے میں نے خود اپنائے ہیں۔
میں مجرم بھی ہوں اور ظالم بھی۔ میں نے شبانہ جیسی معصوم لڑکی پر ظلم کیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے کسی نوجوان محبوب کے سپنے نوچ کر اس کے دماغ میں ایک بوڑھے آئیڈیل کو بٹھا دیا۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا، وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ مجھے اب اس کے دماغ میں مر جانا ہوگا۔
ایک بار میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سے شادی کر لوں گا مگر وہ جذباتی فیصلہ تھا۔ مجھے عقل آگئی کہ میری بوڑھی جوانی ایک دن کا گناہ بننے کا سبب ہے۔
بیٹی کا باپ ہو کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں میری تقلید میں میرا داماد بھی میری بیٹی پر سوکن نہ لے آئے۔ میں کیا بتاؤں کہ ہر طرف سے کیسی کیسی بات کھا رہا ہوں۔
ایسی مات کسی نے نہ کھائی ہوگی۔ بیوی کا اعتماد، بیٹی کی محبت، نواسے نواسیوں کا پیار، اپنا گھر، اپنا کاروبار، اپنی عزت اور نیک نامی سب کچھ ہار کر جا رہا ہوں۔ بے شک اس دنیا کی خوبصورتی میں سب کا حصہ ہوتا ہے مگر بوڑھے اس لیے حصہ نہیں لے سکتے کہ انہیں ساری عمر کی کمائی ہوئی محبت اور عزت کی پونجی ہارنی پڑتی ہے۔
صفیہ! مجھے تمہاری فکر نہیں ہے۔ کاروبار ختم ہونے کے بعد بھی تمہارے پاس بقیہ زندگی گزارنے کے لیے کافی دولت اور اولاد کی محبت ہوگی۔ اب میں شبانہ کے کام آکر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں ایسی راہ سے گزرنے والا ہوں جہاں سے گزرنے کے بعد شبانہ مجبور ہو کر جوانی کی کڑی دھوپ میں کوئی اور سایہ ڈھونڈ لے گی۔
فقط ...... ہو سکے تو اب مجھے گالیاں نہ دینا......
تم سب کا مجرم انور جمال۔"
اس نے خط مکمل کر کے پلنگ کے سرہانے رکھ دیا۔ پھر گھر کے دروازوں کو بند کرتا ہوا باہر آگیا۔ گہری تاریکی تھی جو گناہوں کو اور گناہ گاروں کو چھپاتی ہے۔ وہ بہت دور تاریکی میں چھپتا چلا گیا۔
جب گھڑی بننے پر آتی ہے تو بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسپتال میں شبانہ کا بیان لینے والا پولیس انسپکٹر اتفاق سے توفیق کا جاننے والا نکل آیا۔ اقدام خودکشی کے اندراج کا وہ کیس اسپتال سے باہر ہی ختم کروا دیا گیا۔ وہ لوگ شبانہ کو لے کر کوٹھی میں واپس آئے تو انور کے بجائے ایک خط نظر آیا۔ اسے پڑھتے ہی پھر ایک کہرام مچ گیا۔ صفیہ رونے اور شبانہ کو گالیاں دینے لگی۔
شبانہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ جس کے لیے وہ جان دے رہی تھی، وہ خود جان پر کھیلنے کہیں چلا گیا ہے ...... وہ سب اسے تلاش کرتے ہوئے مختلف جگہوں کی خاک چھانتے رہے۔ تیسرے دن اخبارات میں اشتہار دیا گیا...... ریڈیو پر اسے پکارا گیا۔ دور دور کے شہروں میں ڈھونڈا گیا ...... آخر صفیہ نے دھاڑیں مار مار کر اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔
شبانہ کے پاس توڑنے کے لیے چوڑیاں نہیں تھیں۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ پہلے کچھ دنوں تک کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ وہ رات میں جاگتی تھی کیونکہ پہلے اسے یقین نہیں آتا تھا کہ انور اس کے لیے گم ہو گیا ہے۔ وہ چھپ چھپ کر صفیہ اور صائمہ کے کمرے کے چکر لگاتی تھی کہ شاید انور بھی چھپ کر اپنی بیوی سے ملنے آئے تو وہ اس کے قدموں سے لپٹ جائے گی۔ کچھ ماہ بعد اسے یقین کرنا پڑا کیونکہ جہاں انور جمال کا دفتر تھا اب وہاں دوسرا دفتر کھل گیا تھا۔ جنرل منیجر

شبانہ سے دھوکا کھا چکا تھا۔ اس نے کہا۔

"میری جان! وہ جو بچے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ سب ختم ہو چکا ہے اور انور صاحب شاید اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میرے پاس آجاؤ۔ میں خوش کر دوں گا۔"

وہ نفرت سے تھوک کر صفیہ کی کوٹھی کی طرف گئی۔ وہ ..... اپنی کار میں بیٹھنے جا رہی تھی۔ شبانہ کو دیکھ کر اس نے خلاف توقع نرمی سے کہا۔

"شبانہ! اب میں تم سے شکایت نہیں کروں گی۔ جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ میں پہلے ایک وقت کی نماز نہیں پڑھتی تھی، اب پانچوں وقت کی پڑھتی ہوں۔ نماز پڑھ کر سکون ملتا ہے۔ کل صبح کی فلائٹ سے میں حج کرنے جا رہی ہوں۔ جانے سے پہلے میں ایک بار پھر تمہیں نصیحت کرتی ہوں کہ بیٹی اب ضد سے باز آجاؤ اور شادی کرلو۔ اپنے ..... انور صاحب کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے شادی کرلو۔"

شبانہ سر جھکا کر گھر واپس آئی تو اماں بی نے روتے ہوئے کہا۔ "کب تک مرنے والے کو تلاش کرتی رہے گی۔ بیٹی!..... شریف زادیوں کے یہ چلن نہیں ہیں۔ میں تیری ماں ہو کر تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے شادی کے لیے ہاں کر دے....."

اماں بی نے ہاتھ جوڑے تھے، وہ اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی پھر ماں کے پاس بیٹھ کر اور اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اس دن کے بعد اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ وہ رفتہ رفتہ وقت پر کھانے اور وقت پر سونے لگی۔ پہلے اس فکر میں بھوک مر جاتی تھی کہ انور اس کا ہوتے ہوئے بھی اس کا نہیں ہے اور اس انتظار میں نیند نہیں آتی تھی کہ وہ تھپک کر سلانے والا شاید کسی وقت آجائے۔ جس چیز کی تمنا ہو اور وہ فنا ہو جائے تو تمنا کرنے والے کو رفتہ رفتہ صبر آجاتا ہے۔

شبانہ کے دل و دماغ میں اب بھی بچھڑے ہوئے پیار کی خوشبو تھی۔ مگر صرف یاد کرنے کی حد تک۔ جو دکھائی نہ دے، جس کی آواز سنائی نہ دے اور جو بھی حاصل نہ ہو سکے اس کی محبت صرف یادوں تک محدود ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت دوسروں کی نصیحتیں سمجھ میں بھی آتی ہیں اور اثر بھی کرتی ہیں۔ جوان بیوائیں بھی دل و جان سے چاہنے والے خاوند کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لیتی ہیں اور وہ تو نہ بیوی تھی اور نہ بیوہ تھی۔ اپنے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ تو فیصلہ کرنا ہی تھا۔ یوں بھی زمانہ خراب ہے۔ اگر وہ جوانی کے

طب:

اسلام نے طب کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ چنانچہ مسلمان علماء نے اپنے دوسرے علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ طب اور جراحت میں بھی کمال پیدا کیا اور دوا سازی کے فن میں نئے نئے راستے نکالے۔

ذکریا رازی۔ (865ء تا 925ء)، اس عہد کا سب سے بڑا معالج ہے جس سے یورپ نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ جراحی میں بھی کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے پٹی باندھنے کا ایک نیا طریقہ نکالا۔ سب سے پہلے چیچک پر بھی اسی نے ایک رسالہ لکھا۔ اس کی سب سے اہم تصنیف الحاوی ہے۔ اس کی ایک اور کتاب 'کتاب الاسرار' ہے جو کیمیا سے تعلق رکھتی ہے۔ لاطینی اور یورپ کی کئی اور زبانوں میں ان کتابوں کا ترجمہ ہوا۔

عباسی عہد کا ایک اور نامور طبیب شیخ بوعلی سینا (980ء تا 1037ء) ہے جو دنیا کے بڑے بڑے طبیبوں اور فلسفیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے طب کے علاوہ فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، علم اللسان اور فنونِ لطیفہ پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی تصنیفات میں کتاب الشفا اور قانون الطب سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ قانون بڑی جامع کتاب ہے اور پانچ سو برس تک یورپ کے طبیب اس سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ ابن سینا غالباً پہلا شخص ہے جس نے زلزلے کے اسباب معلوم کیے لیکن اس سلسلے میں اس نے جو تحقیقات کی ہے، اس میں آج تک فرق نہیں آنے پایا۔

"تاریخ اسلام" سے انتخاب: محمد اقبال، کراچی

سکوں کو اپنی پسند سے خرچ نہ کرتی تو کوئی اس بھرے خزانے کو زبردستی اٹھا کر لے جاتا۔

آخر ایک دن اس نے گھبرا کر کہا۔

"اماں بی! میں تمہاری ہر بات مان لیا کروں گی مگر اب اس شہر میں نہیں رہوں گی۔ ہر دم گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ ہم کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے۔"

اماں بی کی پڑوسن بہت دنوں سے اپنے بھائی کے لیے شبانہ کا رشتہ مانگ رہی تھی۔ اس کا بھائی لاہور میں ایک بہت بڑے جنرل اسٹور کا مالک تھا۔ اماں بی نے فوراً ہی بات پکی کر دی اور یہ طے کر لیا کہ شادی لاہور میں ہوگی۔ وہ ہفتے کے بعد ہی ماں بیٹی گھر کا سارا سامان بیچ کر لاہور آگئیں۔ اماں بی نے ایک کمرے کا مکان کرائے پر لیا پھر

شادی کی تیاریاں کرنے لگیں۔

شادی کے گھر میں خوشی تھی مگر شبانہ کے دل میں کوئی خوشی نہیں تھی۔ اسے انور جمال کی یہ بات یاد تھی کہ شادی محض ایک دنیاوی رسم ہے اس لیے وہ دنیا میں رہنے کے لیے یہ رسم ادا کر رہی تھی۔ چونکہ اسے کوئی خوشی نہیں تھی اس لیے وہ شادی کے کسی کام میں ماں کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھی۔ بازار سے کچھ خریدنا ہوتا تو اماں بی سر پر چادر ڈال کر خود ہی باہر نکلتی تھیں۔

ایک روز اچانک ہی وہ بازار میں انور جمال سے ٹکرا گئیں۔

"ارے تم؟" وہ پریشان ہو کر بولیں۔ "تم انور ہو نا؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "جی ہاں۔"

"وہی کراچی والے انور یعنی صفیہ کے شوہر؟"

"جی ہاں۔"

"تو تم..... تم ابھی تک زندہ ہو؟"

"جی ہاں۔ شبانہ کیسی ہے؟ کیا شادی ہو گئی؟"

"اگلے جمعے کو شادی ہے مگر وہ تمہیں دیکھے گی تو گھونگھٹ پھینک کر پھر تمہارے پیچھے بھاگنے لگے گی۔"

"اماں بی! آپ ناحق پریشان ہوتی ہیں۔ میرا یہ روپ دیکھ کر اب وہ میرے پاس پھٹکنے نہیں آئے گی۔"

اماں بی نے اسے احسان مندی سے دیکھ کر پوچھا۔

"تم نے یہ کیا بہروپ بنا رکھا ہے؟" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

"میں بہت بزدل ہوں۔ اس لیے خودکشی نہ کر سکا لیکن میرا ضمیر مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ ضمیر کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں خود کو سزا دوں۔ ایسی سزا جو میرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی عبرت ناک ہو۔ ایسی سزا جو جوانی کو کاٹ کر بڑھاپے سے الگ کر دے اور آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں اس حلیے میں یہ سزا پا رہا ہوں۔"

اماں بی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ صاف طور پر پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

اگلے جمعے کو شبانہ دلہن بن کر رخصت ہو گئی۔ دوسرے دن سسرال میں ولیمے کی تقریب تھی۔ کوٹھی دلہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ رنگ برنگے قمقمے جل بجھ رہے تھے اور مہمانوں کی تفریح کے لیے ورائٹی پروگرام پیش کیا جا رہا تھا۔ ایک طوائف مجرا پیش کر رہی تھی۔ وہاں جتنے بوڑھے تھے، وہ طوائف کی ایک ایک ادا پر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔

اس کے بعد نوجوان لڑکے لڑکیاں گٹار اور دف لے کر ناچ گانا پیش کرنے لگے۔ ان میں ایک شخص کے گانے کا انداز بہت مقبول ہو رہا تھا۔ اسے بار بار اسٹیج پر بلایا جا رہا تھا۔ پندرہ برس کی ایک لڑکی اسٹیج کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اسے ابھی عمر کا اندازہ نہیں تھا اسی لیے دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی زنان خانے میں گئی۔ وہاں نئی نویلی دلہن شبانہ ولیمے کا سبز جوڑا پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"بھابی بھابی! آپ نے بھائی جان کا گانا سنا؟ سب ہی ان کی خوب تعریفیں کر رہے ہیں۔"

"ہاں۔ یہاں تک آواز آ رہی ہے۔"

"صرف آواز سے کیا ہوتا ہے۔ آپ میرے ساتھ چل کر انہیں دیکھیں۔ کتنے اسٹائل سے گاتے ہیں۔"

وہ شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ شبانہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی ساس نے کہا۔

"چلی جاؤ بیٹی! بچی ضد کر رہی ہے۔"

جانے کیسے شبانہ کو وہ رات یاد آ گئی جب اس نے صفیہ باجی کے پاس آ کر انور جمال کے گانے کی تعریفیں کی تھیں۔ وہ اپنی چھوٹی نند کے ساتھ زنان خانے سے نکل کر اسٹیج کی طرف جانے لگی۔ اسی وقت ہیجڑوں کی ایک ٹولی تالیاں بجاتی وہاں پہنچ گئی۔ ایک ہیجڑے نے تالی بجا کر تال پر کہا۔

"اے حضور! شادی مبارک۔ تمہاری خوشی میں ہم بھی ناچیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ناچیں گے اور بدھائی دیں گے۔"

تیسرے نے کہا۔ "بدھائی دیں گے اور دوا لیں گے اور ہاں انعام بھی لیں گے۔"

نوجوانوں نے رنگ میں بھنگ پڑتے دیکھ کر انہیں بھگانے کی کوشش کی مگر خسرے ایسی محفلوں میں پہنچ کر کمبل بن جاتے ہیں، ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک خسرے نے دوسرے سے کہا۔

"اے انوری بیگم! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔ آؤ ہم سب مل کر دہائی دیں....."

مگر انوری بیگم چپ تھی (تھا) وہ یک ٹک شبانہ کو دیکھ رہی تھی (تھا)۔ شبانہ جس نوجوان کے پاس کھڑی تھی وہ نوجوان اپنا سر کھجا رہا تھا۔

انوری بیگم نے ایک گہری سانس لے کر سوچا، 'اب میرا سر بھی نہیں کھجائے گا۔'

اس نے ڈوبتے ہوئے دل سے ڈھولک اٹھا کر اپنے کاندھے سے لٹکائی۔ سر پر دوپٹے کو درست کیا۔ پھر اس محفل سے منہ پھیر کر جانے لگی۔ (جانے لگا)۔

✖✖✖

ناہید سلطانہ اختر

اس کی دلگداز محبت جب محض خواہشوں اور ہوس میں ڈھلی تو روح کا سارا سکون تباہ کرگئی... اسے خبر نہ تھی کہ ایک دن اسے اپنے انتخاب پر اتنا ملال اور بین کرنا پڑے گا حالانکہ راہنماؤں نے اس کی رہبری بھی کی لیکن... اس کی محبت تو ایک ضدبن چکی تھی جسے ہر حال میں پانا تھا اور اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے عوض اسے خود کو کھودینا تھا۔

خلوص ووفا کی پرکھ اور...... جذبوں کا کھوٹا پن

گم صم سی حالت میں کمرے کے دروازے پر کھڑا وہ نہایت خوفزدہ انداز میں عائزہ کو دیکھ رہا تھا جو اپنی آغوش میں لیٹے نوزائدہ بیٹے کی ننھی منی انگلیوں کو نہایت محویت سے دیکھتے ہوئے دروازے پر آہٹ سن کر چونک گئی تھی۔

طارق کو اس کیفیت میں کھڑے دیکھ کر اس کا تشویش میں مبتلا ہوجانا یقینی تھا۔

''عائزہ!'' طارق کی آواز اسے میلوں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''ہاں۔'' عائزہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اتنا پریشان اور خوفزدہ تو وہ پہلے کبھی بھی کسی بات پر نہ ہوا تھا۔

اپنی پیشانی پر نہایت اضطراب سے ہاتھ پھیرتا وہ ڈگمگاتی چال سے اس کی طرف آیا اور کمرے کے فرش پر دیوار تا دیوار بچھے قالین پر بیڈ کے نزدیک آبیٹھا۔ عائزہ نے نوزائیدہ بچے کو آہستگی سے اپنی آغوش سے نکال کر بیڈ پر بچھے اس کے گدے پر لٹادیا اور طارق کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بیڈ کی عمودی پٹی کے ساتھ فوم کے گدے کے کنارے سے اپنا سر لگائے چہرہ نیچے جھکائے بیٹھا تھا۔

''کیا بات ہے طارق؟'' عائزہ نے اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے تشویش آمیز ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی عائزہ!'' اس کی آواز کے ساتھ لہجہ بھی عائزہ کو نامانوس لگا۔

''کیا ہوا؟''

وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

''طارق!'' عائزہ مزید پریشان ہوئی۔

''مجھے معاف کردو... مجھے معاف کردو عائزہ...... مجھ سے بھول ہوگئی...... بہت بڑی بھول ہوگئی۔'' وہ گڑگڑایا۔

''کچھ بتاؤ گے بھی۔'' عائزہ نے اپنی ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکا لیں۔

طارق نے سر اٹھایا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر عائزہ کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں کیا ہوگیا تھا مجھے... مجھے معاف کردینا۔''

''کیا معاف کردینا؟'' عائزہ کی تشویش ہیجان میں بدل گئی۔

طارق اس کے چلّانے پر یک لخت سیدھا ہو بیٹھا۔

''آہستہ!'' اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی دھرتے ہوئے خوفزدہ نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

عائزہ کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ ''کیا بات ہے...... ؟ کچھ بتاؤ تو۔'' وہ نرمی سے بولی۔

''وہ...... وہ...... سرونٹ میں...... تم...... خود دیکھ لو۔'' اس نے آخری تین الفاظ عجلت میں ادا کیے اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھ کر نہایت خوفزدہ سی کیفیت میں بیٹھ گیا۔

عائزہ حیران ہوئی۔

'سرونٹ میں!'

'سرونٹ میں بھلا کیا چیز تھی دیکھنے والی!'

جاڑے کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ تو، سوا نو بجے کے لگ بھگ نسرین اس کی ملازمہ، تمام کاموں سے فارغ ہو کر سونے کے لیے سرونٹ کوارٹر میں چلی جاتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے حسب معمول عائزہ کو اللہ حافظ کہا تھا۔ طارق حسب عادت رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنے گھر سے باہر نکلا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے گھر کا گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے وہ سمجھ گئی تھی کہ طارق واک سے واپس آگیا تھا اور حسب معمول باہر کی ایک کے علاوہ تمام بتیاں گل کرنے کے بعد کمرے میں آجائے گا مگر اسے آنے میں خاصی دیر ہوگئی تھی اور آیا تو اس کیفیت میں جس نے عائزہ کو بھی پریشان کردیا۔

''چلو۔'' اس نے طارق سے کہا۔

''نہیں۔'' وہ گھبرا کر بولا۔ ''تم جاؤ۔''

عائزہ کو کوئی کیفیت میں اٹھی۔ باہر روزانہ جلنے والی اکلوتی لائٹ بھی گل تھی البتہ ہمسائے کے گھروں سے روشنی اس کے گھر کے پورچ، لان اور صحن کو گل رہی تھی۔ اس نے اپنے گھر کی لائٹ بھی روشن کی اور بے دھڑک سرونٹ کوارٹر کی طرف چل دی۔

''ہوسکتا ہے طارق نے نسرین کو کوئی معیوب حرکت کرتے دیکھ کر ایک دو ہاتھ جڑ دیے ہوں اور اب وہ بیٹھی رو رہی ہو۔'' عائزہ نے سرونٹ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

کچھ دنوں سے نسرین کا محلے کے ایک گھر میں کام کرنے والے نوجوان نوکر سے چکر بھی چل گیا تھا۔ جس کے بعد نسرین کے رنگ ڈھنگ ہی بدلنے لگے تھے۔ یا تو اسے کئی کئی دن نہانے دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کا ہوش نہ ہوتا تھا، اب ہر دوسرے دن دھلا جوڑا مٹک کر کھڑی ہوجاتی۔ آنکھوں میں کاجل کے ڈورے لگاتی، دنداسے سے ہونٹ رنگتی، دھلے کپڑے الگنی پر لٹکانے کے بہانے چھت پر جاتی اور دیر تک اوپر ہی ٹنگی رہتی۔ عائزہ نے اسے دو تین مرتبہ چھت کی منڈیر کے نزدیک کھڑے دو گھر چھوڑ کر تیسرے ہمسایہ گھر کی چھت پر ٹکٹکی باندھے دیکھ کر ٹوکا بھی تھا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے۔

''کچھ نہیں باجی...... پتنگ اڑتے دیکھ رہی تھی۔'' ایک روز نسرین نے سٹپٹا کر کہا تھا۔

''کہاں ہے پتنگ؟'' عائزہ نے آسمان پر نظر دوڑائی۔

''شاید کٹ گئی۔'' نسرین تیزی سے بولی۔

''دیکھو نسرین...... تمہارے اماں ابا نے تمہیں ہماری ذمے داری پر یہاں چھوڑا ہوا ہے۔'' عائزہ نے اسے سمجھایا۔

''مجھے معلوم ہے جی۔''

سختی کا سوال نہ تھا۔ عائزہ جانتی تھی زیادہ کہا سنا تو نسرین نوکری چھوڑ جائے گی اور اسے ملازمہ نہ ہونے سے پریشانی ہوگی۔ بچی اسکرین موبائل جو عائزہ نے اس کی کارکردگی سے خوش ہوکر موبائل کے لیے اس کا شوق دیکھ کر اسے خرید کر دے دیا تھا، ہمزاد کی طرح اس کے ساتھ رہتا۔ گھر میں کام کے دوران اس پر گانے سنتی رہتی۔ اسی کے ذریعے اپنے گھر والوں سے بھی رابطہ رکھتی اور اب وہی موبائل اس کے اور پڑوس کے نوجوان نوکر کے درمیان رابطے کا ذریعہ بھی بنا ہوا تھا۔ اسے مشکوک انداز میں چھپکے چھپکے باتیں کرتے دیکھ کر عائزہ سمجھ جاتی کہ اس کے گھر والوں کی کال نہیں تھی بلکہ کچھ اور ہی معاملہ تھا۔ اس پر وہ اسے بارہا تنبیہہ کر چکی تھی۔

''باجی! ایسی کوئی بات نہیں۔'' نسرین جوتوں سمیت اس کی آنکھوں میں اتر جاتی۔

''دیکھو نسرین...... میں کوئی بچی نہیں ہوں...... اڑتی چڑیا کے پر گن سکتی ہوں۔ تم تو میرے سامنے کی بچی ہو...... یہ اچھی بات نہیں ہے...... کوئی اونچ نیچ ہوگئی تمہارے ساتھ تو تمہارے گھر والے ہمیں پکڑلیں گے۔''

''باجی جی! نہیں ہوتی کوئی اونچ نیچ...... میری مانگ اپنی پھوپی کے گھر ہے...... میری بڑی باجی کی شادی ہوجائے گی تو میں بھی اپنے گھر چلی جاؤں گی...... اماں نے میری تنخواہ سے بیسی ڈال رکھی ہے...... ہم دونوں بہنوں کا جہیز ہماری تنخواہوں سے بن رہا ہے۔''

نسرین کی بہن عائزہ کی بڑی بہن کے ہاں کام کر رہی تھی۔ ماں اور باپ برسہا برس سے اس کے میکے میں نوکر لگے ہوئے تھے۔

سرونٹ کوارٹر میں اندھیرا تھا۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے سے قبل عائزہ نے دروازے کے ساتھ ہی دیوار میں نصب الیکٹرک بورڈ کا متعلقہ سوئچ بٹن تلاش کر دبایا تو کوارٹر میں روشنی ہوگئی مگر کوارٹر کا اندرونی منظر عائزہ کو متوحش کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کی نوجوان ملازمہ نسرین کوارٹر کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون آلود تھا۔ ایک ہاتھ اس کے سینے پر دھرا تھا، دوسرا فرش پر تھا۔ دوپٹا نزدیک ہی پڑا تھا۔ اس کے سر کے نیچے تازہ خون جمع تھا جس کا قطر لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نسرین کے قریب ہی لکڑی کا وہ بلا پڑا تھا جو اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اتوار بازار سے دلوایا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی مہینے، پندرہ دن بعد اس سے ملنے آتا اور ایک دو دن اس کے ساتھ رہ کر چلا جاتا۔ کرکٹ کھیلنے کا شوقین تھا۔ آتا تو عائزہ کے محلے کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ نسرین کا دلوایا ہوا گیند بلا اس نے سرونٹ کوارٹر میں ہی رکھ چھوڑا تھا۔

سرونٹ کوارٹر کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی نسرین کی آنکھیں کھلی ہوئی اور کمرے کی چھت سے لگی تھیں۔ عائزہ نے اسے پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔

عائزہ کو یوں لگا جیسے وہ چند ثانیے اور وہاں کھڑی رہی تو گر پڑے گی اور نسرین ہی کی طرح بے حس و حرکت ہوجائے گی۔ وہ خوف کے عالم میں پلٹی اور ڈگمگاتے قدموں سے گرتی پڑتی اپنے کمرے کی طرف بھاگی جہاں طارق بدستور اسی طرح بیٹھا تھا جیسے وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔

''طا...... رق۔'' عائزہ نے اسے بہ مشکل مخاطب کیا۔

وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے جوں کا توں بیٹھا رہا۔

''طارق!'' عائزہ نے پھر کہا۔

وہ دونوں ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے اور رونے لگا۔

''مجھے معاف کر دو...... غلطی ہوگئی...... شیطان سوار ہوگیا تھا مجھ پر...... وہ مر گئی ہے۔''

''اوہ تو...... تم!'' عائزہ نے اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا۔

''سوری!'' وہ گڑگڑا کر بولا۔

''مائی گاڈ!'' عائزہ گہرے اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی اور چکرا کر بیڈ پر گر گئی۔

''عائزہ! عائزہ!'' طارق اسے ہیجانی کیفیت میں ٹٹولنے لگا۔

عائزہ کچھ سنبھلی تو اس نے طارق کو اپنے پاؤں پکڑے کہتے سنا۔ ''کچھ کرو عائزہ پلیز۔''

عائزہ اٹھ بیٹھی تھی...... چپ تھی...... دم بخود تھی...... ناقابل بیان صدمے میں تھی...... طارق کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی...... اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ طارق اس حد تک گر سکتا ہے...... مگر وہ گر چکا تھا...... اس کے گمان سے بھی زیادہ۔

ایسی بھیانک، ڈراؤنی اور درد انگیز رات عائزہ کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ اس نے کمرے میں سوئے اپنے دونوں بچوں پر نہایت دکھ سے نظر ڈالی۔ تین سالہ بڑا بیٹا شارق جس نے ابھی دو ماہ قبل ہی کنڈر گارٹن جانا شروع کیا تھا، بیڈ پر سو رہا تھا۔ دوسرا چند دن کا نوزائیدہ بیٹا اپنے گدیلے پر محو خواب تھا۔ ان معصوموں کو خبر بھی نہیں تھی کہ ان

کی دنیا تباہی کے کس دہانے پر تھی۔ عائزہ اور طارق دونوں یوں چپ تھے جیسے ان کے درمیان خاموشی ٹوٹی تو دنیا تہ و بالا ہو جائے گی۔ اسی مہیب خاموشی میں طارق نے عائزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ عائزہ نے تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''عائزہ پلیز!''

عائزہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''آہستہ! کوئی سن لے گا۔'' طارق بولا۔

''سن لے... سننا بھی چاہیے۔'' عائزہ نے اسے غصے اور نفرت سے دیکھا۔

''معاف کردو۔'' وہ پھر گڑگڑایا۔ ''تھوکو میرے منہ پر۔''

''میرے معاف کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' عائزہ چیخی۔

طارق نے پھر سر جھکالیا۔

''ان معصوموں کا بھی نہیں سوچا تم نے۔'' عائزہ نے دونوں بچوں کی طرف انگلی اٹھائی اور پھر سسکنے لگی۔

''یہ رونے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت ہے۔''

''وہ تو تم کر چکے!'' عائزہ نے تڑپ کر کہا۔

''میں نے... اس کے ساتھ... کوئی غلط حرکت نہیں کی۔''

''بہت ڈھیٹ ہو... اور غلط حرکت کسے کہتے ہیں؟''

''میری مدد کرو، عائزہ!''

''کیا مدد کروں... بولو؟''

''تم چاہتی ہو... میں جیل چلا جاؤں... اور... تم اور بچے رل جائیں۔'' طارق اب گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔ اسے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہم تو اب بھی رل ہی گئے ہیں۔'' عائزہ دل گرفتگی سے بولی۔

''نہیں... کچھ نہیں ہوگا... بس تم میری مدد کرو۔''

بالآخر عائزہ کو اٹھنا پڑا۔

رات کی تاریکی میں وہ دونوں نسرین کی لاش گاڑی میں ڈال کر ایک ویرانے میں جنگلی جھاڑیوں کے درمیان پھینک آئے۔ سرونٹ کوارٹر کو دھو دھلا کر نسرین کے استعمال میں رہنے والے سستے باڈی اسپرے کا چھڑکاؤ کر دیا گیا کہ خون کی بو کو دبانا ضروری تھا۔

صبح طارق حسب معمول اپنے دفتر چلا گیا اور عائزہ نے اپنے میکے فون کر کے ماں سے پوچھا۔ ''امی! نسرین کی ماں کام پر آئی ہے؟''

''ہاں... خیریت؟''

''اس سے پوچھیں... نسرین تو اپنے گھر نہیں پہنچی؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''وہ گھر میں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ گھر سے غائب ہے امی... ہوسکتا ہے ہمیں بتائے بغیر اپنے گھر چلی گئی ہو۔''

''میں پوچھ کر بتاتی ہوں تمہیں۔''

نسرین کے ماں باپ پریشان ہو گئے۔ نسرین گھر تو نہیں آئی تھی۔

عائزہ کی امی نے اسے فون کیا اور بتایا کہ نسرین اپنے گھر نہیں پہنچی تھی۔ ''کب سے نہیں ہے گھر میں؟'' انہوں نے عائزہ سے پوچھا۔

''امی! رات کو نو بجے کے بعد وہ سرونٹ کوارٹر میں چلی گئی تھی۔ روزانہ کی طرح صبح سویرے اٹھ کر ناشتا بنانے نہیں آئی تو میں اسے بلانے کے لیے سرونٹ کوارٹر میں گئی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ سارا گھر چھان مارا۔ طارق گھر کے آس پاس دیکھ آئے، وہ کہیں بھی نہیں ملی۔''

''اللہ رحم کرے۔''

''پڑوس کے ایک نوکر سے کچھ دنوں سے اس کا چکر چل رہا تھا... مجھے لگ رہا ہے وہی کہیں بہکا کر نہ لے گیا ہو اسے۔''

''اسی سے پوچھ لیا ہوتا تم نے۔'' عائزہ کی امی بولیں۔

''امی جی! لڑکی کا معاملہ ہے... ذرا سی بات پر بدنامی ہو جاتی ہے... پہلے خود تلاش کرلیں اسے... طارق کو تو دفتر جانا ضروری تھا... میں اکیلی کہاں تلاش کروں اسے۔''

نسرین کی ماں رونے پیٹنے لگی۔ ماں، باپ اور بھائی عائزہ کے گھر پہنچے اور دھرنا دے دیا کہ جب تک نسرین مل نہیں جاتی، وہ بیٹھے ہیں۔ عائزہ پریشان تو ہوئی مگر طارق کی عدم موجودگی میں تنہائی کا جو احساس اسے خوفزدہ کر رہا تھا، اس میں کچھ افاقہ ہوا۔ عائزہ ان کی خاطر داری میں لگ گئی۔ نسرین کے بھائی نے عائزہ سے ہمسایہ گھر کے نوکر کے بارے میں معلومات لیں اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ موجود تھا یا نہیں، ہمسایہ گھر جانے کا ارادہ کیا تو سوئے اتفاق وہ اس گھر کی چھت پر کھڑا دکھائی دیا، جہاں وہ ملازم تھا۔ نسرین کے باپ اور بھائی نے تھانے میں رپورٹ درج کروانے کے لیے جانا چاہا تو عائزہ نے سمجھایا کہ لڑکی کا معاملہ ہے، تھانہ کچہری سے لڑکی کی بدنامی ہوگی اور نہ صرف وہ بلکہ گھر والے بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

اس نے انہیں طارق کی واپسی پر اس سے مشورہ کرنے کی رائے دی۔ طارق آیا تو اس نے کہا دو چار دن دیکھ لیں کسی کے ساتھ گئی ہے تو لٹ لٹا کر واپس آجائے گی۔ عائزہ کے گھر والے بھی خیر خبر لینے اس کے گھر آپہنچے تھے۔ نسرین کے گھر والے پریشان تو تھے مگر شرمندہ بھی۔ انہیں یہ امید نہ تھی کہ نسرین انہیں یوں ذلیل و رسوا کر جائے گی۔ عائزہ ان کی ہمدردی میں بچھی جا رہی تھی۔ طارق نے انہیں ہر طرح سے اپنی مدد کا یقین دلایا۔ عائزہ بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر بباطن ہراساں تھی۔ طارق نے کہا تھا ویرانے میں جنگلی جھاڑیوں میں چھپی نسرین کی لاش دو چار دن میں گل سڑ کر ناقابل شناخت ہو جائے گی۔ اس کے جسم پہ عائزہ کی اترن کو بھلا کس نے شناخت کرنا تھا۔ کسی کو پتا بھی نہ چلنا تھا کہ نسرین کہاں گئی؟

☆☆☆

عائزہ کے گھر نسرین تقریباً ڈھائی سال قبل عائزہ کے میکے کے توسط سے آئی تھی۔ اس کے ماں باپ عائزہ کے میکے میں نوکر تھے۔ نسرین کی ماں عائزہ کی امی کے ہاں گھر کی صفائی ستھرائی، برتنوں اور میلے کپڑوں کی دھلائی پر مامور تھی۔ اس کا باپ گھر میں بیک وقت مالی بھی تھا، چوکیدار بھی۔ عائزہ کا میکا معاشی اور معاشرتی اعتبار سے نہایت مستحکم گھرانا تھا۔ جدی پشتی زمیندار خاندان تھا۔ آبائی گاؤں میں عائزہ کے باپ کی وسیع زرعی اراضی تھی جس پر مزارعین کام کرتے۔ شہر میں کپڑے کی دو ملیں تھیں جن میں ایکسپورٹ کوالٹی کپڑا بنتا۔ عائزہ کے میکے میں نسرین کے ماں باپ کے علاوہ دو خدمت گار اور بھی تھے۔ ایک خانساماں اور دوسرا شوفر۔

عائزہ کا باپ بارسوخ آدمی تھا۔ عائزہ کی دو بڑی بہنیں تھیں اور ایک بھائی۔ چار بہن بھائیوں میں عائزہ سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی دونوں بہنوں کی شادی خاندان ہی میں قریبی رشتے داروں میں ہوئی تھی۔ بھائی کی شادی باپ کے ایک دوست کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران عائزہ کی دوستی اپنے سے ایک سمسٹر سینئر یونیورسٹی فیلو طارق سے ہوئی۔ طارق مڈل کلاس گھرانے کا نوجوان تھا۔ ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ شارٹ کٹ سے زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش رکھتا تھا۔ عائزہ شکل و صورت کی تو اتنی اچھی نہ تھی کہ طارق جیسا ہینڈسم نوجوان محض اس کی ظاہری خوبصورتی پر فدا ہو جاتا مگر وہ امیر باپ کی بیٹی تھی۔ شاندار گاڑی میں یونیورسٹی آتی جسے اکثر شوفر چلا رہا ہوتا لیکن کبھی کبھی وہ خود بھی گاڑی ڈرائیو کر کے یونیورسٹی آتی اور پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کر کے نہایت شان سے گاڑی سے اترتی۔ اس کا لباس، بیگ، جوتے، میک اپ اس کے باپ کی امارت کے آئینہ دار ہوتے۔ ہم جماعت لڑکیاں اس سے دوستی رکھنے میں فخر محسوس کرتیں۔ لڑکے اسے للچائی نظروں سے دیکھتے۔ وہ کسی کو لفٹ نہ کراتی۔ قرعۂ فال کھلا تو سینئر ساتھی طارق سجاد کے نام!

طارق کو عائزہ سے زیادہ اس کے باپ کی گاڑی اچھی لگتی تھی۔ جو اس کے عمدہ لباس سے مرعوب ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کینٹین میں اسے بے محابا پیسے خرچ کرتے دیکھ کر للچا جاتا تھا۔ عائزہ سے اس کی دوستی یونیورسٹی کینٹین ہی میں ہوئی۔ وہ اکیلی بیٹھی تھی اور طارق اس سے اجازت لے کر اسی میز کے گرد پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا جہاں عائزہ بیٹھی ہوئی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کی دوستی محبت میں بدل گئی۔ اس محبت میں زیادہ حصہ عائزہ ہی کا تھا۔ طارق اپنی وجاہت اور خوش پوشی کے باعث اسے متاثر کر گیا تھا۔ طارق کو تعلیم ختم کرتے ہی ایک نجی ادارے میں ملازمت مل گئی۔

عائزہ کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس کی شادی کا مرحلہ آیا تو والدین نے اس کے رشتے کے لیے خاندان اور دوستوں ہی میں نظر دوڑانی شروع کی۔ عائزہ نے گھر والوں پر بے تکلف اپنی پسند کا اظہار کر دیا۔ اس کی امی نے سمجھایا کہ اپنے جانے بوجھے گھرانوں میں نئے رشتے ناتے کرنے سے آئندہ کے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہوتا۔ لڑکا ہو یا لڑکی، اس کی اچھائیاں، برائیاں سب عیاں ہوتی ہیں...... ایک دوسرے کو زیادہ کھنگالنا نہیں پڑتا...... مگر عائزہ کو کوئی دلیل قائل نہ کر سکی...... وہ طارق کے سوا کسی اور کا نام بھی سننے کو تیار نہیں تھی...... ناچار عائزہ کے والد کو طارق اور اس کے گھر والوں کو اپنے ہاں مدعو کرنا پڑا...... طارق بہت ٹپ ٹاپ سے آیا مگر عائزہ کے وسیع و عریض گھر کے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس کی ساری ٹپ ٹاپ خس ہو کر رہ گئی۔ اس کے پاؤں دبیز قالین میں دھنس گئے اور آنکھیں چوڑی چوڑی ڈرائنگ روم کے قیمتی فرنیچر اور آرائشی اشیا کا جائزہ لینے لگیں۔ گفتگو شروع ہوئی تو عائزہ کے والد نے نوٹ کیا طارق بولنے سے زیادہ دیکھنے میں دلچسپی لے رہا تھا۔

طارق کے باپ نے کہا۔ ”ہم سوالی بن کر آپ کے

پاس آئے ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "آپ کی بیٹی کو ہم اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔"

"میرا بیٹا بہت شریف، بہت فرمانبردار اور نہایت لائق ہے۔" طارق کا باپ، بیٹے کی تعریف میں رطب اللسان ہوا۔

"اتنا شریف ہے کہ کبھی کسی کی بہن بیٹی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔" ماں نے مزید قلابے ملائے۔

"اور صاحب فرمانبردار اتنا کہ جب سے نوکر ہوا ہے، پوری کی پوری تنخواہ ماں کے ہاتھ میں دیتا ہے...... بس پٹرول کے پیسے لے کر جاتا ہے روزانہ۔" باپ نے بتایا۔

"لائق ایسا کہ محلے کی نچھر لڑکیوں کو پڑھاتا ہے...... جب کہیں اٹکیں گی، طارق بھائی سے پوچھنے آجاتی ہیں۔" ماں نے فخریہ کہا۔

"صاحب زادے! آپ بھی تو کچھ بولیں۔" عائزہ کے باپ نے طارق کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر! میں کیا بولوں...... بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ...... اگر آپ ہمیں عزت کا شرف بخشتے ہیں تو میں آپ کی صاحب زادی کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کروں گا۔" طارق نے نہایت نیازمندی سے کہا۔

عائزہ کے والد نے بجبراً انہیں محض آزمانے کو طارق سے کہا۔ "میری بیٹی سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والوں میں سے ہے...... نازو نعم میں پلی بڑھی ہے...... کیا اسے خوش رکھنے کے لیے تمہارے وسائل کافی ہیں؟"

طارق نے صوفے پر پہلو بدلا۔ "سر! چھوٹا سا ایک گھر ہے ہمارے پاس اور پرانی گاڑی...... باقی...... بس تنخواہ...... کھینچ تان کر گزارہ کر لیتے ہیں...... مہنگائی نے ہم جیسوں کی تو کمر توڑ دی ہے۔" طارق نے آئی ایم ایف سے امداد مانگنے والے غریب ملکوں کی سی مسکینی اپنائی۔

طارق اور اس کے گھر والوں سے ملاقات کے بعد عائزہ کے والد نے عائزہ سے کہا۔ "میں اس لڑکے سے مل کر نہ خوش ہوا ہوں، نہ مطمئن۔"

"کیوں ڈیڈی؟"

"وہ خودداری سے محروم ہے...... میرا تجربہ زندگی کہتا ہے...... اسے صرف تمہارے اسٹیٹس سے مطلب ہے...... میں نے اس سے پوچھا...... کیا میری بیٹی کو خوش رکھنے کے لیے تمہارے وسائل کافی ہیں...... اگر وہ خوددار ہوتا تو کہتا...... میں اپنے وسائل میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا...... اس کے برعکس اس نے اپنا گھر چھوٹا اور گاڑی پرانی ہونے کا نوحہ پڑھا۔"

"اس نے جھوٹ تو نہیں بولا...... آپ اس کی سچائی کو اپریشیئٹ کریں نا۔" عائزہ بولی۔

عائزہ کے والد جو جہاندیدہ ہونے کے ساتھ ادب سے شغف رکھنے والے پڑھے لکھے آدمی تھے، برجستہ گویا ہوئے۔ "سچائی تو یہ بھی تھی کہ کوہ بے ستون کھود کر آ جوئے شیر نہیں نکالی جا سکتی تھی، مگر کوہ کن یہ کارنامہ کر دکھا گیا کہ نہیں۔"

"سوری ڈیڈی۔ یہ سب غیر حقیقی داستانیں ہیں۔"

"مگر حوصلہ دیتی ہیں۔"

عائزہ چپ رہی۔

"میں اس نوجوان کو تمہارے لیے مناسب نہیں سمجھتا...... میرے پاس زندگی کا وسیع اور گہرا تجربہ ہے...... میرا خیال ہے تمہیں جذباتی ہونے کے بجائے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہم تمہارے لیے زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

عائزہ خاموش رہی۔

بعد میں اس نے اپنی امی سے کہا۔ "زندگی مجھے گزارنی ہے...... جب طارق مجھے پسند ہے تو ڈیڈی خوامخواہ مجھ پر دباؤ کیوں ڈال رہے ہیں؟"

"بیٹا! وہ تمہارا بھلا چاہتے ہیں...... زندگی لوگوں سے ملنے اور انہیں پرکھتے گزاری ہے تمہارے ڈیڈی نے...... وہ آدمی کا چہرہ دیکھ کر ہی اس کے دل کا بھید پا لیتے ہیں...... چہرہ تو خالی دکھتی ہوتی ہے انہوں نے اس لڑکے میں۔ سنا نہیں تم نے...... وہ کہہ رہے تھے اس میں خودداری نہیں...... جس میں خودداری نہ ہو وہ سونے کا بھی ہو تو بے کار ہے۔"

"امی پلیز! آپ تو میری مخالفت نہ کریں۔"

عائزہ کی ضد سے مجبور ہو کر طارق سے اس کا رشتہ طے کر دیا گیا۔ شادی ہوئی تو عائزہ کے والد نے عائزہ کو عروسی ملبوسات، زیورات و جواہرات اور دیگر لوازم کے علاوہ ایک فرنشڈ گھر اور گاڑی بھی جہیز میں دی۔ طارق اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر عائزہ کے ساتھ نئے گھر میں رہنے لگا۔

امور خانہ داری عائزہ کی لغت سے ہمیشہ خارج رہے تھے لہٰذا شادی کے بعد فوری ضرورت نوکر کی ہوئی۔ عائزہ کی امی نے ایک ادھیڑ عمر عورت کام کاج کے لیے اس کے ہاں بھیج دی جو دن چڑھے آتی، شام کو اپنے گھر چلی جاتی۔ اس کی تنخواہ عائزہ کے میکے کے ذمے تھی۔ طارق نے اوپر کے کام کے لیے ایک لڑکا رکھ لیا جو سودا سلف لاتا، اس کی گاڑی دھوتا اور چمکاتا۔ گھر میں موجود پودوں کو پانی دیتا، ان کی دیکھ بھال کرتا۔ عائزہ کی امی کی بھجوائی ہوئی نوکرانی زیادہ عرصہ نہ چلی۔ ادھیڑ عمر اور کمزور سی عورت تھی۔ چند ماہ

کام کر کے جواب دے گئی۔ گھر کی جھاڑو پونچھ، برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے ایک اور عورت رکھ لی گئی جو صبح دس بجے آتی اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کام نمٹا کر چلی جاتی۔ طارق کا رکھا ہوا لڑکا بھی کچھ عرصے بعد دغا دے گیا۔ عارضی نوکروں پر کام چلنے لگا۔ عائزہ کو غصہ آتا کہ کام والی ماسیوں اور اوپر کے کام کرنے والے نوعمر لڑکوں کے بھی اتنے نخرے اور حیلے ہو گئے تھے۔ آئے دن بہانے بہانے چھٹی اور مراعات پوری مانگتے۔

اچھا نوکر نہ ملنا عائزہ کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ بالآخر اس کی امی نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ ان کے اپنے ہاں ملازم میاں بیوی کی دو بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک عائزہ کی بڑی بہن کے ہاں کل وقتی کام کر رہی تھی۔ ماں باپ اس کی شادی کے لیے وسائل اکٹھے کر رہے تھے۔ دوسری بیٹی جو سولہ سترہ برس کی رہی ہوگی، فارغ تھی۔ ماں باپ کی عدم موجودگی میں اپنا گھر وہی سنبھالتی۔ ہانڈی روٹی بھی کر لیتی تھی۔ عائزہ کی امی نے اس کے ماں باپ کو راضی کر کے اسے عائزہ کے گھر ملازم رکھوا دیا۔ اسے دن رات عائزہ کے ہاں رہنا تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار چھٹی۔

عائزہ کو کھانے پکانے کے کام کی زیادہ فکر نہ تھی۔ طارق صبح دفتر چلا جاتا۔ عائزہ فگر برقرار رکھنے کی خاطر دوپہر کا کھانا نہ کھاتی۔ کچھ فروٹ، جوس یا پھر سینڈوچ۔ رات کا کھانا وہ اور طارق کچھ باہر کھاتے۔ ویسے منہ چلانے کے لیے اس کے گھر کا فریج ہر وقت طرح بطرح چیزوں سے بھرا رہتا تھا۔

عائزہ کے ہاں آنے والی نئی ملازمہ نسرین خاصی پھرتیلی لڑکی تھی۔ منٹوں میں کام نمٹاتی۔ عائزہ اس کی کارکردگی سے بہت خوش ہوئی۔ سرونٹ کوارٹر جو ایک کمرا، اٹیچڈ باتھ اور چھوٹی سی گیلری پر مشتمل تھا نسرین کو دے دیا گیا۔ نسرین جو اپنے گھر میں ایک ہی کمرے میں ماں باپ اور اپنے علاوہ چار اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہنے کی عادی تھی، سرونٹ کوارٹر میں رہائش ملنے پر بہت خوش ہوئی۔ عائزہ کی دی ہوئی چیزوں اور اپنی محنت سے اس نے جلد ہی سرونٹ کوارٹر کو اپنے لیے ایک آرام دہ کمرا بنا لیا۔ صبح سویرے وہ سرونٹ کوارٹر کی صفائی کر کے دروازے کی کنڈی چڑھاتی اور گھر کے اس حصے میں چلی جاتی جہاں طارق اور عائزہ رہائش پذیر تھے۔ وہ حصہ ڈرائنگ، ڈائننگ، لاؤنج، دو بیڈ رومز، اسٹڈی، کچن اور گیسٹ روم پر مشتمل تھا۔ گھر میں پورچ بھی تھا لان بھی۔ سرونٹ کوارٹر گھر کے اس حصے سے بالکل الگ تھلگ مین گیٹ کے نزدیک غربی گوشے میں تعمیر تھا۔

سرونٹ کوارٹر میں نسرین کے آنے سے پہلے ہی ایک پرانا سنگل بیڈ پڑا تھا۔ نسرین آئی تو عائزہ نے اسے ایک پورٹیبل الماری بھی دے دی جو طارق شادی کے بعد اپنے گھر سے نئے گھر میں منتقل ہوتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا۔ نسرین حیران ہوئی کہ دھاتی سانچے اور ریگزین سے بھی الماریاں بن جاتی ہیں۔ عائزہ کے پاس یہ الماری بیکار پڑی تھی۔ نسرین اسے اپنے استعمال کے لیے لے کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے اپنی پوٹلی کھول کر اپنی چیزیں جو وہ ساتھ لائی تھی، اس الماری میں رکھ لیں۔ عائزہ کے استعمال شدہ کپڑے، جوتے اور دوسری بعض چیزوں کے ملنے سے اس الماری کی شان ہی بڑھ گئی۔ عائزہ اپنے استعمال میں نہ رہنے والی پرانی کاسمیٹکس اور پرفیومز بھی اسے بخش دیتی۔ نسرین کی تنخواہ عائزہ کی امی اس کے ماں باپ کو دے دیتیں۔ ماں نے بیٹیوں کو نمٹانے کے لیے بیسیاں ڈال رکھی تھیں۔ بڑی بیٹی کی تنخواہ سے اس کے جہیز کے لیے اور نسرین کی تنخواہ سے اس کے نام کی چیزیں جمع ہونے لگیں۔ عائزہ اور طارق اور کبھی کبھار ان کے گھر آیا کوئی مہمان بھی نسرین کو بخشش دے دیتا۔ نسرین اسے جمع کیے جاتی۔ ان پیسوں سے وہ موبائل فون خریدنے کی خواہش مند تھی اور وہ بھی ٹچ موبائل۔ عائزہ نے اس کی خدمت گزاری سے خوش ہو کر خود ہی اسے ایک سستا سا ٹچ موبائل خرید دیا۔ وہ اس کے کہنے بہت سے کام کرتی تھی...... گھر کے کاموں کے علاوہ ذاتی کام...... اس کے بالوں میں تیل لگاتی، بال سلجھاتی، پاؤں دباتی۔ اسے محلے بھر کی خبروں سے آگاہ رکھتی۔ عائزہ اس سے بہت خوش تھی۔ موبائل فون لے کر نسرین یوں خوش ہوئی جیسے دنیا جہان کے خزانے ہاتھ آگئے ہوں...... موبائل فون کی وجہ سے اسے رات کو جلدی جلدی سارے کام نمٹا کر سرونٹ کوارٹر میں جانے کی عجلت ہوتی، جہاں وہ مزے سے اپنے بستر پر لیٹ کر موبائل پر گانے سنتی، ڈرامے دیکھتی اور نہ جانے کیا کچھ! دن میں بھی موبائل فون ہر وقت اس کے ساتھ ہوتا۔

نسرین کو عائزہ کے ہاں آئے تقریباً ڈھائی برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ عائزہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ انہی دنوں اس نے نسرین کو دو ہمسایہ گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی چھت پر کھڑے ایک نوجوان سے کچھ تیز اشارے بازی کرتے دیکھا۔

"کیا ہو رہا ہے نسرین؟" عائزہ نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔

"کچھ نہیں باجی۔" وہ گھبرا گئی۔

"کون ہے یہ؟"

"کون!" اس نے جوتوں سمیت عائزہ کی آنکھوں میں گھستے چاہا۔

"یہی جسے تم اشارے کر رہی تھیں ابھی۔"

"اچھا! وہ...... وہ تو جی ہمسایوں کا نوکر ہے۔"

"مگر تم اسے اشارے کیوں کر رہی تھیں؟"

"باجی جی! میں اس سے کہہ رہی تھی بازار جائے تو میرے فون میں لوڈ کرا دے۔"

"جھوٹ مت بولو۔"

"سچ بول رہی ہوں جی۔"

"آج کل کے مرد سیدھی سادی لڑکیوں کو سنہرے سپنے دکھا کر کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔"

"باجی! ایمان سے میں نے کہیں نہیں جانا...... میں تو مروں گی بھی آپ کے گھر ہی میں۔" وہ ہنسی۔

کبھی کبھی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بات کس طرح سچ ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

اگلے دن کے اخبارات میں نسرین کے مُردہ چہرے کی تصویر اس خبر کے ساتھ شائع ہوئی کہ ایک ویران علاقے میں جھاڑیوں کے درمیان ایک نامعلوم دوشیزہ کی لاش ملی ہے جس کے سر پر کاری ضرب لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اخبار عائزہ کے گھر سمیت محلے کے بہت سے گھرانوں میں آتا تھا۔ کیا محلہ، کیا عائزہ کے رشتے دار اور کیا نسرین کے برادری والے، جس جس نے اخبار میں نسرین کی تصویر دیکھی، اسے پہچان لیا۔ کہرام مچ گیا۔ عائزہ کے گھر میں محلے داروں کا تانتا بندھ گیا۔ عائزہ کے ماں باپ اور بھائی جو ابھی عائزہ کے گھر ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے، بین کرنے لگے۔ عائزہ کے اپنے میکے اور سسرال میں سراسیمگی پھیل گئی۔ طارق کے دفتر میں بھی یہ خبر عام ہو گئی کہ اس کی گھریلو ملازمہ قتل کر دی گئی تھی۔

پولیس حرکت میں آ گئی تھی۔

نسرین کے باپ کی مدعیت میں نامعلوم قاتلوں کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا گیا۔ متوفیہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس کے ساتھ زیادتی ثابت نہ ہوئی تھی۔

قانون نسرین کے قاتل کی تلاش میں سرگرداں ہوا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد نسرین کے گھر والے میت کی تدفین کے لیے اپنے آبائی علاقے چلے گئے۔ طارق نے ایمبولینس کا بندوبست کیا، نسرین کی تکفین و تدفین کے لیے اس کے ماں باپ کو اچھی خاصی رقم دی۔ آئندہ بھی مدد دینے کا یقین دلایا۔

عائزہ کے بیان کی روشنی میں پولیس تفتیش کاروں کا پہلا شبہ محلے کے اسی نوجوان ملازم پر کیا گیا جسے نہ صرف عائزہ بلکہ محلے کے چند لوگوں نے بھی نسرین سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا تھا۔ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی۔ مار مار کر ادھ موا کر دیا مگر وہ کسی صورت یہ قبول کر کے نہ دیا کہ نسرین کی موت میں اس کا کچھ ہاتھ تھا۔ عائزہ اور طارق دونوں تمام صورت حال کا نہایت اعتماد سے سامنا کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کے دل گہرے خوف میں ڈوبے ہوئے تھے۔

پڑوس کے مشتبہ نوجوان کے مسلسل انکار جرم نے پولیس کو دائرۂ تفتیش بڑھانے پر مجبور کر دیا...... طارق اور عائزہ کو بھی شامل تفتیش کر لیا گیا۔ گھر کے سرونٹ کوارٹر سے نسرین کے قتل کے تمام شواہد مٹا دیے اور آلۂ قتل کو راستے میں ایک گہرے نالے میں پھینک دیا گیا اس کے باوجود سرونٹ کوارٹر کی دیوار پر خون کی ایک دو چھینٹوں نے طارق اور عائزہ کو مشکوک ٹھہرا دیا۔ طارق نے اقرار جرم کر لیا اور میاں بیوی دونوں حوالات جا پہنچے۔ نوجوان ملازم کی جان بخشی ہوئی۔

حوالات میں ڈرامائی صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب عائزہ نے طارق کو بدنامی اور سزا سے بچانے کے لیے جرم اپنے سر لے لیا۔ اس نے بیان دیا کہ نسرین کے پڑوس کے ایک نوجوان سے تعلقات ہو گئے تھے اور وہ بار بار تنبیہ کے باوجود باز نہ آ رہی تھی، سو اس نے غصے میں سرونٹ کوارٹر میں رکھا نسرین کے چھوٹے بھائی کا بلا اس کے سر پر دے مارا جس سے اس کے سر پر شدید ضرب لگی اور زیادہ خون بہہ جانے سے وہ ہلاک ہو گئی۔ عائزہ نے مزید کہا کہ اس کا شوہر طارق اسے سزا سے بچانے کے لیے جرم اپنے سر لینا چاہتا ہے ورنہ بقول اس کے اگر اس کی نیت متوفیہ سے زیادتی کرنے کی تھی تو اس کے شوہر جیسے چھ فٹ دو انچ قامت کے قوی الجثہ مرد کے لیے متوفیہ جیسی دبلی پتلی کمزور لڑکی کو زیر کرنا کیا مشکل تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہو ہی چکا تھا کہ مرنے والی کے ساتھ زیادتی نہیں کی گئی تھی۔

طارق کا جرم اپنے سر لے کر عائزہ اسے ذلت و رسوائی سے بچانے کے علاوہ وہ اپنے والدین کے منع کرنے

کے باوجود طارق سے شادی کے فیصلے پر قابلِ ملامت نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی...... جبکہ میڈیا نے ایک شوہر کی اپنی بیوی سے غیر معمولی محبت کے اس واقعے کو غیر معمولی کوریج دی۔ عائزہ کے معصوم بچے حالات سے بے خبر، ماں کی گرم آغوش سے محروم اپنی نانی کے پاس تھے۔

معاملہ عدالت میں پہنچا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ طارق لوئر مڈل کلاس گھرانے کا فرد مگر عائزہ کا میکا امارت اور اثر و رسوخ دونوں اعتبار سے مضبوط تھا۔ نسرین کے گھر والوں سے یک سر کا ہوا۔ عائزہ کے وکیل نے کہا اس کی موکلہ مرنے والی کو قتل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے تنبیہ کی خاطر مارنا چاہتی تھی مگر کرکٹ کے چوبی بلے کا وار کاری ہوا اور متوفیہ جان سے جاتی رہی۔ نسرین کے والدین دیت پر آمادہ ہو گئے۔ خطیر رقم انہیں پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ دیت کی رقم عدالت کے روبرو دی گئی۔ غریب کا خون ویسے بھی حقیر اور ارزاں! طارق اور عائزہ سلاخوں کے پیچھے سے نکل آئے۔

☆☆☆

عائزہ اور طارق دونوں کے لیے زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ طارق کو احترام سے دیکھا جاتا کہ وہ ایسا شخص تھا جس نے بیوی کا جرم اپنے سر لینے کی کوشش کی تھی اور عائزہ کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا کہ اس کے تشدد نے ایک جوان لڑکی سے زندگی چھین لی تھی۔ اسے کیا حق تھا نسرین کو تشدد کا نشانہ بنانے کا۔ وہ اگر کسی نوجوان سے پینگیں بڑھا رہی تھی اور عائزہ کو نسرین کے گمراہ ہو جانے کا خدشہ تھا تو بہتر یہی تھا کہ اسے اس کے ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیتی۔ اسے مار دینا تو درندگی تھی۔ عائزہ کو اپنے پرایوں میں ایک قاتلہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا۔ عائزہ کے والدین اور بھائی بہنوں کی تو مجبوری تھی کہ وہ عائزہ سے پھر پہلے کا سا تعلق رکھنے اور محبت نبھانے پر مجبور تھے۔ طارق کے گھر والے عائزہ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے بلکہ بعض نے تو نہ صرف عائزہ بلکہ طارق سے بھی رابطہ ختم کر دیا۔ بعض نے تو طارق کو ایسی عورت سے اپنا رشتہ منقطع کر دینے کی بھی ترغیب دی جو ایک لڑکی کو قتل کرنے کا داغ ماتھے پر لگا کر تھانہ کچہری تک دیکھ آئی تھی۔ تھانہ کچہری سے ہو آنے والی عورتوں کو تو ویسے ہی بے توقیری سے دیکھا جاتا ہے۔

اہلِ محلہ عائزہ کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتے۔ اس سے ملنے سے کتراتے، دور دور رہتے۔ عائزہ باہر نکلتی تو محلے کے لوگ اسے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے۔ بعض لوفر لڑکے اور مرد آوازے بھی کس دیتے۔

”دیکھ کے، کہیں اب کسی اور کی باری نہ ہو۔“ راہ چلتے بچے عائزہ کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے۔ مائیں اپنے بچوں سے کہتیں۔ ”عائزہ آنٹی کے گھر نہ جانا... وہ بندے کو مار دیتی ہے۔“ عائزہ نے لوگوں کی چبھتی نگاہوں اور طنزیہ فقروں سے بچنے کی خاطر گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا۔ گھر کے تمام کام اب وہ خود ہی کرتی۔ سرونٹ کوارٹر کے دروازے پر تالا ڈال دیا۔ سرونٹ کوارٹر کی طرف جانے سے بھی اسے خوف آنے لگا تھا۔ نسرین کے قتل کا اصل قصہ اس نے اپنے دل ہی میں دفن کر لیا تھا۔ اپنے ماں باپ، بھائی اور بہنوں کو بھی اس نے اصل حقیقت سے لاعلم رکھا تھا۔ وہ طارق کو رسوا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی تو اسے طارق کے ساتھ ہی گزارنا تھی۔ اس کی امی نے یہ دیکھ کر کہ دو بچوں کی ہمہ وقت دیکھ بھال کے ساتھ تمام امورِ خانہ داری اکیلے ہی سرانجام دینا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے، ایک نوعمر لڑکا اس کے ہاں ملازم رکھنا چاہا مگر عائزہ نے انکار کر دیا۔ وہ تو اب کوئی جزوقتی ملازم بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ زندگی خود کام کر کے ہی بہل گئی۔

طارق بندۂ بے دام بن گیا تھا عائزہ کا۔ وہ اس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا۔ جانتا تھا کہ اس کا جرم اپنے سر لے لینے کی وہ کیا قیمت ادا کر رہی تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ گھر ہی میں رہتا۔ گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ شام کو اسے اور بچوں کو بلاناغہ باہر لے جاتا۔ رات کا کھانا پہلے کی طرح عموماً باہر ہی کھایا جاتا۔ اپنی عدم موجودگی میں کسی ضرورت کے تحت عائزہ کے باہر آنے جانے کے لیے اس نے عائزہ کے لیے ایک چھوٹی گاڑی خرید دی تھی۔ ڈرائیونگ عائزہ اپنے زمانۂ طالب علمی سے کر رہی تھی۔ گاڑی میں باہر نکلتی تو بھی اسے لوگوں کی چبھتی ہوئی نظروں اور کبھی کبھی تضحیک آمیز آوازوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک روز وہ اپنی گاڑی گھر کی گلی سے نکال کر مین اسٹریٹ پر لائی ہی تھی کہ ایک بچہ بھاگتا ہوا اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ عائزہ ایمرجنسی بریک نہ لگا دیتی تو یقیناً حادثہ ہو جاتا۔ بچے کا باپ نزدیک ہی تھا۔ لپک کر آیا اور بچے کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھی عائزہ کو غصے اور حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں تو انسانوں کو مار دینے کی عادت ہے۔“ عائزہ دم بخود رہ گئی۔ بندوں کی غلطیاں اور گناہ خدا معاف کر دیتا ہے مگر بندے معاف نہیں کرتے۔ عائزہ اپنے ناکردہ اور طارق کے کردہ گناہ کی اذیت جھیل رہی تھی۔

☆☆☆

عائزہ کی زندگی میں آنے والے اس غیر معمولی بحران سے لاعلم اس کے دونوں بچے بڑے ہو رہے تھے۔ بڑا بیٹا شارق اب اکثر محلے کے بچوں کے ساتھ گلی میں کھیلنے کے لیے باہر نکلنے لگا تھا۔ عائزہ اسے باہر جانے سے روکنے کی کوشش کرتی تو وہ مچل مچل جاتا۔ ''مجھے باہر کھیلنے جانا ہے۔'' وہ ضد کرتا۔

''گھر میں کھیلو۔'' عائزہ کہتی۔

''گھر میں نہیں کھیلنا۔''

''کیوں نہیں کھیلنا۔''

''بال کون کرائے گا؟''

''آؤ... میں باؤلنگ کراتی ہوں۔''

''آپ کو نہیں آتی۔''

''آتی ہے بیٹا...... تم آؤ تو سہی۔''

شارق بلا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ عائزہ گیند پھینکتی مگر دو چار گیندوں کے بعد ہی شارق اوب جاتا۔ ''مجھے باہر جانا ہے۔''

''بیٹا باہر دھول مٹی ہے...... بیمار ہو جاؤ گے۔''

''نہیں ہوں گا۔''

''گلی کے بچے بدتمیز ہیں۔''

''نہیں ہیں۔''

شارق مچلنے لگتا... ایڑیاں رگڑنے لگتا...... عائزہ مجبور ہو جاتی... جب تک شارق باہر رہتا، وہ بار بار گیٹ سے باہر جھانکتی رہتی۔

شارق سے چھوٹا واثق کھیلنے کے لائق ہوا تو عائزہ نے شارق کو بھائی کے ساتھ کھیلنے کی ترغیب دینا شروع کی۔

''وہ چھوٹا ہے۔'' شارق کہتا۔

کنڈرگارٹن کے بعد شارق جونیئر اسکول جانے لگا۔ محلے کے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے سے بچانے کو عائزہ نے اسے گھر کے نزدیک کسی اسکول میں داخل کرانے سے گریز کیا۔ شارق کا اسکول گھر سے بہت دور تھا۔ کوئی وین ڈرائیور ایک بچے کی خاطر اتنی دور پک اینڈ ڈراپ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ ناچار عائزہ کو یہ ذمے داری اپنے سر لینا پڑی۔ تقریباً بیس منٹ اسے صبح کے وقت شارق کو اسکول تک پہنچانے میں لگتے، بیس منٹ واپسی پر اور دوپہر کو پھر اسے اسکول سے واپس لینے جانے اور گھر آنے میں تقریباً اتنا ہی وقت لگتا۔ راستے میں عائزہ اپنے کئی کام نمٹاتی ہوئی آتی۔

☆☆☆

گھر سے باہر محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ایک روز شارق اور اس کے دوستوں کی دوسری گلی کے چند بچوں سے کسی معمولی بات پر لڑائی ہو گئی...... ویسی ہی جیسی عموماً بچوں میں ہو جایا کرتی ہے۔ دوسری گلی کے بچوں نے شارق اور اس کے دوستوں کے بارے میں کہا۔ ''یہ گندے بچے ہیں...... یہ جو شارق ہے، اس کی ماما نے اپنی نوکرانی کو اس کے سر پر بیٹ مار کر قتل کر دیا تھا۔''

شارق گھر آیا تو اس نے عائزہ سے کہا۔ ''ماما! آپ نے نوکرانی کو قتل کیا تھا؟''

عائزہ نے بڑبڑا کر اسے دیکھا اور بولی۔ ''کس نے کہا؟''

''وہ جو دوسری گلی میں ریحان لڑکا رہتا ہے، وہ مجھے اور میرے فرینڈز کو گندا بول رہا تھا اور اس نے یہ بھی کہا ماما کہ شارق کی ماما نے اپنی نوکرانی کو سر پہ بیٹ مار کر قتل کر دیا تھا...... قتل کسے کہتے ہیں ماما؟'' شارق نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

عائزہ سن رہ گئی اور اسے اپنی اور طارق کی شدید غفلت اور غلطی کا احساس ہوا کہ وہ اب تک اسی علاقے میں کیوں رہ رہے تھے۔ انہوں نے یہ کیوں نہیں سوچا تھا اب تک کہ بچے بڑے اور سمجھ دار ہوں گے۔ نسرین والے واقعے کی بات ان کے کانوں میں ضرور پڑے گی۔ اہل محلہ انہیں گہری نظروں سے دیکھیں گے۔ انہیں طعن و تشنیع کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔

''بیٹا! اس لیے منع کرتی ہوں تمہیں باہر نکلنے سے اور گندے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے۔'' عائزہ نے شارق کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

''ممی! میرے فرینڈز گندے تھوڑی ہیں...... وہ تو اچھے ہیں۔'' شارق بولا۔

''لیکن دوسری گلی کے گندے بچے تو تم لوگوں سے لڑائی کرنے آ گئے نا...... کل سے تمہارا باہر کھیلنا بند۔''

''نہیں...... میں جاؤں گا۔''

رات کو عائزہ نے طارق سے یہ سارا قصہ بیان کیا اور کہا۔ ''ہمیں کہیں اور شفٹ کر جانا چاہیے طارق...... بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ محلے کے لوگ تو انہیں نشانہ بنا لیں گے۔''

''کہاں شفٹ کریں؟'' طارق بولا۔

''کہیں بھی...... اس علاقے سے دور۔''

''اور اس گھر کا کیا ہوگا؟''

''اسے کرائے پر چڑھا دیں گے یا فروخت کر دیں گے۔''

''پراپرٹی کی قیمتیں آج کل بہت نیچے آئی ہوئی ہیں۔''

''اسے کرائے پر چڑھا کر ہم کہیں اور کرائے پر گھر لے لیتے ہیں۔''

''دیکھتے ہیں۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ دو چار دن میں عائزہ کے ذہن سے اس واقعے کی شدت میں کمی آگئی۔ شارق باہر گلی میں جاکر کھیلنے سے باز نہ آیا۔ اب جتنی دیر وہ باہر کھیلتا، عائزہ اپنے گھر کے گیٹ کے نزدیک کھڑی رہتی۔ غنیمت تھا کہ پڑوس کا وہ نوجوان ملازم، جس پر سب سے پہلے نسرین کے قتل کا شبہ کر کے حوالات میں کئی دن اس کی دھنائی کی گئی تھی، کچھ دنوں بعد ہی نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا ورنہ شاید عائزہ کو سب سے زیادہ خطرہ تو اسی کی طرف سے ہوتا۔

تاہم عائزہ گاہے بگاہے طارق کو یہ احساس دلاتی تھی کہ انہیں بچوں کے مستقبل کی خاطر اس علاقے کو چھوڑ دینا چاہیے۔ طارق 'ہاں ہوں' کرتا رہا۔ اسے کیا مسئلہ تھا۔ اسے تو توقیر سے دیکھا جاتا کہ اس شخص نے بیوی کا جرم اپنے سر لینا چاہا تھا۔ دفتر میں بھی کبھی کبھار کوئی کہہ دیتا۔ ''طارق صاحب! آپ تو مثالی شوہر ہیں بھئی!''

☆☆☆

عائزہ نے خاندانی تقاریب میں آنا جانا بھی بہت کم کر دیا تھا پھر بھی بعض مواقع ایسے ہوتے کہ جانا ضروری ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی بہن کی بیٹی کی شادی ہوئی تو شرکت لازمی ٹھہری۔ سارا خاندان اس تقریب میں اکٹھا تھا۔ عائزہ کو اکثر رشتے داروں نے جس نظر سے دیکھا، وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ دل ہی دل میں نہ جانے کتنی مرتبہ روئی۔ اس کے دونوں بچے خاندان کے بچوں کے ساتھ مگن رہے۔ شارق اب سات سال کا ہو چکا تھا اور واثق کی چوتھی سالگرہ میں چند دن باقی تھے۔

سوئے اتفاق دُلہا کی رشتے دار خواتین میں عائزہ کی ایک یونیورسٹی فیلو بھی شامل تھی جو خود اب تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس نے عائزہ کو دیکھا تو خوشی کا اظہار کیا مگر عائزہ کو اس کی نگاہوں میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ موقع پاتے ہی اس نے عائزہ سے رازداری سے کہا۔ ''میں نے کئی سال پہلے اخبار میں تمہاری اور تمہارے ہسبینڈ کی تصویر دیکھی تھی۔''

عائزہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کی دوست جس تصویر کی بات کر رہی تھی، وہ تو وہی تصویر تھی جو نسرین والے واقعے کے بعد اس کی اور طارق کی گرفتاری کے موقع پر کھینچی گئی تھی اور اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی...... لوگ بھولتے تھوڑی ہیں۔

بھانجی کی سسرال کا معاملہ تھا۔ عائزہ چکرا کے رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، چہرہ زرد ہوگیا۔

رب کی مہربانی

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز سے میری وابستگی بہت پرانی بات ہے۔ اس وابستگی کا آغاز پاکیزہ ڈائجسٹ سے ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد سسپنس کے آخری صفحات کے لیے معاشرتی کہانیاں لکھنے کا آغاز بھی ہوگیا۔ پھر یہ ساتھ نہیں چھوٹا۔ لگتا ہے آخر عمر تک برقرار رہے گا۔ طویل وابستگی نے ادارے کو میرا گھر بنا دیا ہے۔ یاد نہیں اور شمار بھی نہیں کہ اب تک کتنی کہانیاں لکھ ڈالیں۔ محبت میں شمار کا رواج ہی نہیں۔ قارئین کی جانب سے ملنے والے اعتماد اور ستائش کو اپنے رب کی مہربانی سمجھتی ہوں۔ نصف صدی میں دنیا کے تیور کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اس بدلی ہوئی دنیا میں جہاں ٹچ اسکرین موبائل پر انگلی کی خفیف سی حرکت سے دنیا بھر کی کہانیاں آپ کی نظروں کے سامنے آموجود ہوتی ہیں وہاں قارئین کا ہر ماہ سسپنس ڈائجسٹ کا انتظار کرنا یقیناً ایک بڑا اعزاز ہے۔ نصف صدی کا یہ کامیاب سفر مبارک سسپنس!

ناہید سلطانہ اختر

یونیورسٹی فیلو سمجھدار تھی۔ اس کی کیفیت بھانپ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ''ڈونٹ وری عائزہ...... میں تو ایسے ہی کہہ بیٹھی...... سمجھ سکتی ہوں تمہارے پریشان ہوجانے کا سبب...... یہ موقع ایسی بات کرنے کا تھوڑی تھا...... سوری...... غلطی ہوگئی...... تم مطمئن رہو، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی...... دُلہا میری نند کی جیٹھانی کی بہن کا بیٹا ہے۔''

تقریب میں بقیہ وقت عائزہ نے کس مشکل سے گزارا وہی جانتی تھی۔ گھر واپسی پر واثق اس کی گود میں سو چکا تھا۔ شارق کو سلانے کے بعد اس نے طارق کو اپنی یونیورسٹی فیلو سے ملاقات کا قصہ سنایا اور کہا۔ ''طارق! ہمیں اب اس محلے میں ہی نہیں، اس ملک میں بھی نہیں رہنا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''دوسروں کی غلطی لوگ بھولتے نہیں، یاد رکھتے ہیں اور یاد رکھنے والے نہ جانے کہاں کہاں مل جاتے ہیں...... میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ عائزہ کی

شادی میں مجھے یونیورسٹی کی دوست مل جائے گی اور وہ بھی عائمہ کے دلہا کے رشتے داروں میں ہوگی...... اور اس نے میری اور تمہاری تصویر بھی اخبار میں دیکھ رکھی ہوگی...... اخبار والے بھی ہماری زندگی کو کبھی کبھی بہت عذاب بنادیتے ہیں۔ اخبار میں ہم دونوں کی تصویر نہ چھپی ہوتی تو شاید کسی کو پتا بھی نہ چلتا کہ وہ ہم تھے۔''
عائزہ نہایت دل گرفتہ ہورہی تھی۔
''دفع کرو...... کسی کے یاد رکھنے سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔'' طارق نے خاصی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔
''پڑتا ہے طارق...... تمہیں فرق نہ پڑتا ہو شاید مگر مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔'' عائزہ نے دلگیر لہجے میں کہا۔
''جب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تو تمہیں کیوں پڑتا ہے۔'' طارق بولا۔
''کیونکہ دنیا کی نظر میں تو میں ہی مجرم ہوں۔''
''مگر...... میری نظر میں...... تم میری بیوی ہو...... میری محسن ہو۔'' طارق نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ ''دنیا کچھ بھی کہے...... میں جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے...... اور تمہارے اطمینان کے لیے میرا جاننا ہی کافی ہونا چاہیے...... آئی لو یو عائزہ...... آئی لو یو بیونڈ اینی تھنگ۔''
''یہاں سے چلیں...... دور...... اتنی دور طارق، جہاں کوئی ہمارے ماضی سے واقف نہ ہو...... کوئی مجھے ایک قاتل کی حیثیت سے نہ دیکھے...... اور ہمارے بچوں کو اس تمام قصے کی بھنک بھی نہ ملے۔''
''یہاں میری والدہ ہیں...... بہن بھائی ہیں...... ان کے بچے ہیں...... باقی رشتے دار ہیں...... مجھے ان کو چھوڑ کر دور جانا ہوتا تو میں کسی بھی فارن نیشنل لڑکی سے شادی کر کے آرام سے جاسکتا تھا...... نہیں عائزہ...... میں اپنے لوگوں کو چھوڑ کر کہیں دور نہیں جاؤں گا۔''
عائزہ دم بخود اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ طارق اسے بہت خودغرض سا لگا۔
''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' طارق بولا۔
''دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں اپنے رشتے دار مجھ سے اور بچوں سے زیادہ عزیز ہیں۔'' عائزہ نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔
''ہر رشتے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔
''ہاں...... ہر رشتے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے...... اسی لیے...... اسی لیے میں نے اپنی اور اپنے ماں باپ، بہنوں، بھائی اور ان کے بچوں کی عزت اور وقار تم پر قربان کردیا...... کیونکہ تم میرے شریک حیات...... میرے لائف پارٹنر تھے۔ میں نے سوچا...... میری اور میرے خاندان کی عزت جاتی ہے جائے، میرے شریک زندگی کی عزت اور وقار پر داغ نہ لگے۔''
''احسان جتا رہی ہو۔'' طارق نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔
''نہیں...... بلکہ تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ...... ہم دونوں کے لیے ہمارے بچوں کی عزت اور وقار اب ہر دوسری بات سے زیادہ اہم ہونا چاہیے...... کیا وہ ایک قاتل ماں کے بچے بن کر جئیں گے۔ اس بے رحم معاشرے میں، جہاں انسان دوسرے انسان کی غلطیاں درگزر نہیں کرتے۔''
''دیکھتے ہیں۔'' طارق نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

عائزہ کی بھانجی عائمہ کی شادی کو چند دن ہی گزرے تھے کہ عائزہ کی امی نے اس کے گھر آکر بتایا کہ نسرین کے قتل کا قصہ عائمہ کی سسرال میں جا پہنچا تھا۔ پھیلانے والی وہی تھی...... عائزہ کی یونیورسٹی کی ساتھی...... عائزہ کی بڑی بہن اور بہنوئی نہایت بھنائے ہوئے اس کے والدین کے پاس آئے تھے اور انہوں نے عائزہ کی عدم موجودگی میں اسے بے نقط سنائی تھیں کہ اس کی وجہ سے ان کی نو بیاہتا بیٹی کو اپنی سسرال میں ذلت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ اس کی ساس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ''توبہ توبہ! ہمیں رخصتی سے پہلے بھی پتا چل جاتا تو ہم برات کو دلہن کے بغیر ہی واپس لے آتے۔''
عائزہ کی امی بہت دل گرفتہ تھیں۔ انہوں نے عائزہ سے کہا۔ ''تم نے دیکھا انسان کی ایک غلطی کیسے کیسے عذابوں کا سبب بن جاتی ہے...... تمہارا بھائی اپنی بیوی سے نظریں نہیں ملا سکتا...... ذرا سی کوئی بات ہو، وہ فوراً طعنہ دیتی ہے کہ اپنی بہن کو تو دیکھو کیا گل کھلا کر بیٹھی ہوئی ہے...... تمہاری دونوں بہنیں گلہ کرتی ہیں کہ عائزہ کی وجہ سے ہم اپنی سسرالوں میں ذلیل ہوگئے ہیں...... رہی سہی کسر عائمہ کی سسرال میں بات پہنچنے سے پوری ہوگئی۔''
نسرین کی موت کے قصے کے بعد پہلی بار عائزہ کی امی نے اس سے یہ سب کہا تھا ورنہ وہ تو اب بھی اسے پہلے کی طرح اپنے سینے سے لگاتی تھیں۔ عائزہ سمجھ گئی کہ عائمہ کی سسرال میں بات پہنچنے سے امی غیر معمولی دل شکستہ ہوئی

تھیں۔ ہوسکتا ہے بڑے داماد نے ان کے ہاں پہنچ کر کچھ زیادہ ہی کہہ سن لیا ہو۔

عائزہ نے طارق سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''تم ساتھ چلو یا نہ چلو...... میں اپنے بچوں کو لے کر کسی دوسرے ملک چلی جاؤں گی...... کسی ایسی جگہ جہاں کوئی مجھے جانتا نہ ہو...... جہاں مجھے اپنے کسی جاننے والے کے ملنے کا اندیشہ نہ ہو...... اور دوبارہ کبھی پلٹ کر اپنی صورت یہاں نہیں دکھاؤں گی۔'' اس نے طارق سے کہا۔

''کہاں جاؤ گی؟'' طارق نے اس سے پوچھا۔

''کہیں بھی...... اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔'' عائزہ انتہائی دلبرداشتہ تھی۔

''اللہ کی زمین تو وسیع ہے مگر کسی دوسرے ملک میں جانے کے لیے ویزا وغیرہ کی پابندیاں بھی تو ہوتی ہیں...... ہمارے ملک کے لوگوں کو تو کسی دوسرے ملک کا ویزا ویسے ہی مشکل سے ملتا ہے...... ایسا کرتے ہیں ہم کینیڈا امیگریشن کے لیے اپلائی کردیتے ہیں۔''

''نہیں طارق...... میں زیادہ انتظار نہیں کرسکتی...... مجھے نکلنا ہے یہاں سے جلد از جلد...... میں نے سنا ہے کچھ ممالک ہیں ایسے جن کا ویزا ملنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی بشرطیکہ آپ انہیں اپنا بینک بیلنس اور اثاثے دکھا کر مطمئن کرسکیں۔''

''ہاں تو کیا دکھاؤ گی؟''

''یہ گھر ہے...... گاڑیاں ہیں...... میری جیولری ہے...... بینک بیلنس کے لیے میں ڈیڈی سے مدد لوں گی بلکہ جانے سے پہلے بینک بیلنس کے بدلے میں یہ گھر اور گاڑیاں ڈیڈی کے نام کر جاؤں گی۔''

''اور اگر ہمیں واپس آنا پڑا تو؟''

''میں واپس آنے کے لیے نہیں جاؤں گی...... جہاں جاؤں گی، وہ چاہے مجھے جان سے ماردیں، میں وہاں سے نہیں آؤں گی...... جو ذلت مجھے یہاں مل رہی ہے اس سے موت اچھی۔'' عائزہ کی آواز شدت جذبات سے بھرا رہی تھی۔

''سوچ لو عائزہ......''

''سوچ لیا ہے۔''

''بہت مشکل فیصلہ ہے۔''

''اس مشکل سے زیادہ مشکل نہیں جس کا میں سامنا کررہی ہوں۔'' عائزہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''عائزہ! تم پریشان زیادہ ہورہی ہو...... وقت کے ساتھ لوگ بڑی بڑی باتیں بھول جاتے ہیں...... یہ وقت بھی گزر جائے گا...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''نہیں ہوگا۔'' عائزہ بھبک اٹھی۔ ''تمہیں نہیں جانا، مت جاؤ...... تمہیں فرق بھی کیا پڑا ہے...... میں اپنے بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔'' عائزہ کا لہجہ اٹل تھا۔ طارق کو کوئی چارہ نہ رہا۔

☆☆☆

عائزہ نے اپنے والدین اور بھائی کو اعتماد میں لیا۔ وہ انہی پر بھروسا کرسکتی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر ایک ترک وطن کا انتخاب کیا جہاں کا ویزا ملنا بھی نسبتاً آسان تھا اور مادی وسائل اور مناسب تدبیر سے مستقل قیام بھی ممکن تھا۔ نیز اسے اور طارق کو اپنے کسی شناسا کے ملنے کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ عائزہ کے والد نے اس کے اور طارق کے مشترکہ بینک اکاؤنٹ میں خطیر رقم جمع کرائی اور انہوں نے بچوں سمیت ویزا کے لیے اپلائی کردیا۔ حسب امید ویزا مل گیا۔ عائزہ نے گھر والد کے نام کیا۔ دونوں گاڑیاں انہیں سونپیں اور دل پر پتھر رکھ کر اپنے پیاروں سے دور ایک اجنبی دیس کو ہجرت کی۔

نئے دیس کی انجانی رتوں سے آشنا ہونے میں عائزہ کو کچھ وقت لگا۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی عائزہ کے لیے زندگی بہت بدل گئی تھی...... زندگی تو اس کے لیے نسرین کی موت کے بعد بھی بدل گئی تھی...... مگر یہ زندگی نسرین والے واقعے کے بعد والی زندگی سے نسبتاً بہتر تھی...... اپنوں سے دوری تھی مگر ذلت کا احساس نہ تھا...... پہلا سا عیش و عشرت نہ تھا۔ ہر کام خود

''بائیں آنکھ بند کرلو...... پھر تم جس چیز کو بھی ٹکر مارنا چاہو گی، نشانہ صحیح لگے گا......''

کرنا پڑتا مگر اس مشقت میں بھی سکون تھا۔ نہ ہر وقت یہ خوف رہتا کہ اس کے بچوں کے کان میں نسرین والے واقعے کی بازگشت پڑ گئی تو کیا ہوگا۔ نہ ہی اجنبی دیس کے انجانے لوگوں سے نظریں چرانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ طارق اور بچوں کے ساتھ وہ آزادانہ باہر جاتی آتی اور بچے اس کی روک ٹوک کے بغیر مزے سے اپنے نئے دوستوں کے ساتھ کھیلتے کودتے۔ بچوں کی تعلیم بھی شروع ہوگئی تھی۔ طارق بھی کسی قدر خوش ہی تھا کہ اب اسے نہ دفتر جانے کی فکر ہوتی نہ فرائض منصبی کی انجام دہی کی..... کھاتا پیتا، گھومتا پھرتا اور عیش کرتا...... لیکن بہر حال کچھ کرنا تو تھا...... بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کے خزانے بھی ختم ہو جاتے ہیں...... عائزہ اور طارق اسی سوچ بچار میں تھے کہ نئی جگہ قیام کی اجازت تو مل گئی تھی، معاملات زندگی اور بہتر طور پر جاری رکھنے کے لیے کیا کیا جائے۔ دونوں اکثر اپنے اپنے گھر والوں سے بھی فون پر بات کر لیتے۔

عائزہ اور طارق کے گھر والے بھی مطمئن تھے کہ ان کے باہر چلے جانے سے دونوں خاندانوں پر لگا بدنامی اور رسوائی کا داغ اگر پورے طور پر مٹا نہیں تھا تو کچھ ماند ضرور پڑ گیا تھا...... آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل...... عائزہ اور طارق دونوں ہی نے اپنے اپنے گھر والوں کو ہدایت کردی تھی کہ سوائے ان دو گھرانوں کے افراد کے کسی کو ان کا اتا پتا نہ بتایا جائے اور دونوں گھرانے ان کی اس ہدایت کی پاسداری کر رہے تھے۔ عائزہ خوش تھی کہ ایک انجان معاشرے میں وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مطعون ہوئے بغیر جی سکتی تھی۔

☆☆☆

عائزہ اور طارق نے ساحل سمندر کے نزدیک آباد ایک شہر میں ایسا گھر خریدا جس کی نچلی منزل پر فاسٹ فوڈ فیک اوے بنا ہوا تھا اور بالائی منزل پر رہائشی یونٹ تھا جو ان کی فیملی کے لیے کافی تھا۔ یہ جائداد ایک معمر جوڑے کی ملکیت تھی جو اسے فروخت کر کے اپنے آبائی علاقے میں رہائش اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ٹیک اوے ان کا بیٹا اور بہو چلاتے تھے۔ لیکن تین چار برس پہلے وہ اسے بند کر کے امریکا نقل مکانی کر گئے تھے۔ بوڑھے میاں بیوی کے لیے کاروبار چلانا ممکن نہ تھا اور بیٹے بہو کے جانے کے بعد ان کی ترجیح اپنے آبائی علاقے میں جا کر رہنا تھا جہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔

مذکورہ جائداد خریدنے کے بعد عائزہ اور طارق نے ٹیک اوے کو نئے سرے سے کھولنے کا ارادہ کیا۔ چیزیں سب موجود تھیں، بس ان کو حالت کار میں لانے کے لیے تھوڑی بہت مرمت اور صفائی درکار تھی۔ موقع کی جگہ تھی۔ آس پاس والوں کا کہنا تھا تھوڑی سی محنت سے یہاں اچھا کاروبار جمایا جا سکتا تھا۔ عائزہ کو وقت اور حالات نے خوابوں کی دنیا سے کڑی حقیقتوں کی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ اب تعیشات میں جینے والی عورت نہیں رہی تھی۔ عمل کو زندگی سمجھتی تھی...... بے عملی تو موت کا دوسرا نام تھی۔ اس نے ٹیک اوے کو از سر نو چالو کرنے کے اقدامات کرنا شروع کر دیے۔ دیواروں پر خود رنگ و روغن کیا۔ وال پیپرز لگائے، فرش کو رگڑ رگڑ کر چمکایا، میلے برتنوں کو دھویا، گرد آلود برقی آلات کی صفائی کی اور ٹیک اوے میں پکائی کا کام کرنے کے لیے ایک شیف اور اس کی مدد کے لیے ایک عورت ملازم رکھ لی۔ شیف کا نام ڈونلڈ تھا مگر اسے ڈونی پکارا جاتا۔ عورت کا نام نینسی تھا۔ ڈونی ادھیڑ عمر تھا۔ اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا۔ نینسی چالیس بیالیس کے لگ بھگ تھی۔ تین نوجوان بچوں کی ماں تھی۔ شوہر نکما اور نشے باز تھا۔ نینسی ایک ڈونٹ شاپ پر کام کرتی تھی۔ وہاں حالات کار اچھے نہ تھے۔ ڈونٹ شاپ میں اپنی ملازمت چھوڑ کر عائزہ کے پاس آئی تھی۔ خوش مزاج عورت تھی۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی۔ اپنی نجی زندگی کے مسائل اس نے عائزہ سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں اس کے گوش گزار کر دیے تھے۔ بڑا بیٹا آوارہ تھا۔ چھوٹا بڑی عمر کی ایک عورت کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ بیٹی آئے دن گھر سے بھاگی رہتی۔ نینسی کے ملازمت پر آ جانے کے کافی دن بعد ایک روز عائزہ نے اس سے کہا۔ ”نینسی! تم اپنی ذاتی زندگی میں اتنے بہت سے مسائل میں گھری ہونے کے باوجود یہاں ہم سب سے اور ٹیک اوے میں آنے والے گاہکوں سے اتنی خوش دلی اور خوش مزاجی سے ہنس کر کیسے باتیں کر لیتی ہو؟“ نینسی کے لبوں پر بڑی کرب آمیز مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا۔

”کبھی کبھی انسان کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ میرے پاس بھی یہی ایک راستہ ہے۔“

عائزہ نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی...... اس کے پاس بھی تو ایک ہی راستہ رہ گیا تھا...... سارے رشتے ناتے پیچھے چھوڑ کر وہ اپنے پیاروں سے دور ایک غیر دیس میں آبسی تھی...... اور اب مڑ کر پیچھے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

طارق ٹیک اوے چلانے میں عائزہ کی مدد کرتا۔ کاؤنٹر پر اپنی سہولت کے حساب سے وہ دونوں باری باری بیٹھتے۔ خدا کا شکر کہ کام اچھا چل پڑا تھا۔ ساحلی تفریح گاہ ہونے کے باعث اس علاقے میں نہ صرف مقامی افراد بلکہ بڑی تعداد میں ادھر ادھر سے بھی لوگ بغرض سیر و تفریح آتے اور خاصی رونق رہتی۔ عائزہ کے دونوں بچے بھی اسکول سے گھر آنے کے بعد زیادہ تر ٹیک اوے ہی میں منڈلاتے رہتے۔ زندگی ایک مخصوص ڈگر پر آ گئی تھی۔

عائزہ کو کبھی کبھی اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں اور ان کے بچوں کی یاد بری طرح ستاتی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اتنی بدل جائے گی کہ وہ اپنے پیاروں کی ایک جھلک دیکھنے کو ترسے گی۔

ٹیک اوے شروع کرنے کے چند ماہ بعد برف باری کا موسم آیا تو طارق نے اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے وطن جانے کا پروگرام بنایا۔ وہ عائزہ اور بچوں کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر عائزہ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ نہ خود جانا چاہتی تھی نہ دونوں بچوں میں سے کسی کو بھیجنے کے حق میں تھی۔ طارق اکیلا ہی چلا گیا اور چھ ہفتے بعد نہایت خوش اور تازہ دم ہو کر واپس لوٹا۔

☆☆☆

عائزہ نے اپنے والدین کو کچھ دنوں کے لیے اپنے پاس بلانے کی دعوت دی۔ اس کے دونوں بچے اپنے ان رشتے داروں کے بارے میں نہایت متجسس ہوتے تھے جن کا عائزہ اکثر ذکر کرتی تھی۔ دونوں بچے پریوں کی کہانی کی طرح اس ذکر سے محظوظ ہوتے۔

”ممی ہمارے کتنے کزنز ہیں سب ملا کر؟“

”اٹھارہ۔“

”کاش کزنز ہم کبھی ایک سے بھی نہیں ملے۔“

”ممی ابھی کزنز سے ملنے چلیں نا۔“

”بیٹا! ہم انہیں یہیں بلا لیں گے۔“

”تو بلا لیں نا۔“

عائزہ خود بھی اپنے والدین کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔ اس کے والدین اس سے ملنے کے لیے آنے کی تیاری میں تھے کہ اس کی امی کو برین ہیمرج ہوا اور وہ فوت ہو گئیں۔ عائزہ کے لیے یہ ایک جانکاہ صدمہ تھا۔ وہ تو خوش تھی کہ جلد ہی اپنے ماں باپ سے مل پائے گی۔ امی کے سینے سے لگ کر ان کی ممتا کی حدت کو اپنے دل میں اتارے گی...... مگر اللہ کی مرضی کچھ اور ہی تھی۔

ماں کی دائمی جدائی کا صدمہ عائزہ کو پردیس میں تنہا سہنا پڑا۔ وہ دونوں بے حد اداس رہی۔ نینسی اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتی۔ اس سے کہتی۔ ”کچھ دنوں کو اپنے لوگوں میں چلی جاؤ تمہارا غم بٹ جائے گا۔“ عائزہ اسے کیا بتاتی۔

طارق دوبارہ وطن گیا اور اپنے گھر والوں سے مل آیا۔

عائزہ کی امی کی موت کو برس بھی نہ گزرا تھا کہ ان کی پہلی برسی سے چند ہفتے قبل اس کے والد کو دل کا دورہ پڑا۔ تین شریانیں بند تھیں۔ معالجین نے ہارٹ بائی پاس تجویز کیا۔ عائزہ کا بہت جی تڑپا باپ کو دیکھنے کو۔ طارق نے اس سے کہا کہ وہ اکیلی جا کر باپ سے مل آئے مگر عائزہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جائے اور لوگوں کو بھولی بسری کہانی دوبارہ تازہ کرا آئے۔ اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور طارق سے کہا۔ ”خدا کرے ڈیڈی کا آپریشن کامیاب ہو اور وہ جلد اچھے ہو کر ہمارے پاس آئیں۔“

آپریشن کامیاب ہوا مگر بعد میں کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں کہ عائزہ کے والد بستر سے نہ اٹھ سکے، انتقال کر گئے۔ اس روز عائزہ کو یوں لگا جیسے اس کی دنیا اندھیر ہو گئی ہو...... دنیا میں اس کے آنے کا ذریعہ بننے والی اس کی دو عزیز از جان ہستیاں ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلی گئی تھیں اور وہ مرنے کے بعد بھی ان کا چہرہ دیکھنے سے محروم رہی تھی۔ ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں وہ کیسا عذاب بھگت رہی تھی۔ اپنے شوہر کو سزا اور رسوائی سے بچانے کے لیے اس نے کتنی اذیت ناک قربانی دی تھی۔

☆☆☆

برف باری کا موسم تھا۔

عائزہ بیمار ہو گئی۔ فلو نے اس کے جسم کی ہڈی ہڈی کو بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔ ایسا شدید درد کہ سہا نہ جائے۔ بستر پر پڑی ہائے ہائے کرتی۔ بچے بھی نہ جا پاتی...... اسپتال میں داخل کیے جانے کے خوف سے اس نے اپنے فیملی فزیشن ہی کو دکھا کر دوائیں لے لی تھیں۔ ٹیک اوے کا انتظام ان دنوں کلی طور پر طارق کے ذمے تھا۔ نینسی دن بھر میں تین چار مرتبہ اوپر آتی اور عائزہ کو کبھی چائے، کبھی کافی، کبھی دوا دے جاتی۔

”تم محنت بھی تو حد سے زیادہ کرتی ہو۔“ وہ عائزہ سے کہتی پھر سمجھاتی۔ ”انسان کو اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے...... مائی لو!“

عائزہ کو نینسی کا ”مائی لو“ کہنا ہمیشہ اچھا لگتا۔

عجیب بات تھی، اپنوں سے جدا ہو کر ایک انجانے

واپس میں آ رہنے کے بعد عائزہ کو غیر ہی اپنے محسوس ہونے لگے تھے...... شاید اس لیے کہ غیر ہی اب اس کے دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے تھے۔ اس کی امی اور ڈیڈی کی موت پر اس کے شیف ہی نے تو اسے دلاسا دیا تھا۔ نینسی کے گلے لگ کر ہی تو اس نے اپنے پیاروں کی موت پر آنسو بہائے تھے۔

☆☆☆

عائزہ کو بیمار ہوئے چوتھا یا پانچواں دن تھا۔ اس کی طبیعت اب کچھ بہتر ہو رہی تھی تاہم بستر سے اٹھنے کی ہمت اب بھی نہ تھی۔ کھڑی ہوتی تو چکر آنے لگتے۔

بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ طارق نیچے لیک اوے میں تھا۔ نینسی کچھ دیر پہلے اسے کافی پہنچانے اور ''گیٹ ویل سون مائی لو'' کہنے کے بعد نیچے واپس چلی گئی تھی۔ اس نے دو گھونٹ کافی کے لیے پھر جی نہ چاہا۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی...... دل دکھنے لگا کہ بیماری میں بھی ماں جایوں میں سے کوئی اس کا حال چال پوچھنے کو اس کے نزدیک نہ تھا۔ ماں اور باپ کے چہرے پلکوں تلے اس کی بند آنکھوں میں گھومنے لگے۔ ان کی یاد آنسو بن کر بند آنکھوں سے بہہ نکلی۔

کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے یہ جانا کہ نینسی پھر آئی تھی۔ شاید کافی کا خالی مگ واپس لے جانے کے لیے...... مگر نینسی نہیں تھی...... طارق تھا۔

''عائزہ!'' طارق کی آواز نے اسے بند آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔

وہ اس کے بیڈ کی طرف آ رہا تھا۔

''غلطی ہو گئی عائزہ......!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے بیڈ کے نزدیک آ بیٹھا۔

عائزہ بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھی۔

''اسے روک لو عائزہ۔'' طارق پریشان تھا، روہانسا ہو رہا تھا۔

''کسے؟'' عائزہ نے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔

''نے...... نینسی کو...... وہ پولیس کو رپورٹ کرنے جا رہی ہے۔''

''کیا!'' عائزہ ہکابکا تھی۔

تب ہی نینسی کمرے کے دروازے پر وارد ہوئی...... ڈونی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''اس نے......'' نینسی نے نہایت حقارت سے طارق کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''تمہارے اس غلیظ شوہر نے مجھ سے دست درازی کی کوشش کی...... یہ پتا نہیں کیا سمجھا تھا مجھے...... میں پولیس کو رپورٹ کرنے جا رہی ہوں...... آئی ایم سوری مائی لو۔''

نینسی پلٹ گئی اور اس کے پیچھے ڈونلڈ بھی۔

''اسے روک لو عائزہ...... پلیز روک لو...... ورنہ میرے ساتھ تم بھی مشکل میں پڑ جاؤ گی۔'' طارق گڑگڑایا۔

عائزہ اپنی بیماری، نقاہت، دکھ سب کچھ بھول کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں روکوں گی۔'' اس نے طارق کو نفرت سے دیکھا۔

طارق اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اسے حیرت و بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

''مجھ سے غلطی ہوئی تھی جو میں نے تمہیں بچانے کو تمہارا جرم اپنے سر لیا...... مجرم کو اس کے جرم کی سزا نہ ملے تو وہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے...... تمہاری طرح!''

طارق ہکابکا اسے دیکھ رہا تھا۔

''آج مجھے ڈیڈی یاد آ رہے ہیں...... شادی سے پہلے وہ تم سے مل کر مطمئن نہیں ہوئے تھے...... وہ انسان کو پہچاننے والے آدمی تھے...... میں نہیں جانتی کہ اس وقت انہوں نے تم میں ایسا کیا دیکھا تھا...... مگر...... میری ضد کے سامنے وہ بے بس ہو گئے...... آج مجھے یقین آ گیا ہے کہ اولاد کے لیے والدین بہتر سوچتے ہیں۔''

''یہ فضول باتوں کا وقت نہیں ہے عائزہ...... اسے روکو پلیز!'' طارق بولا۔

''میں نے کہا نا...... نہیں روکوں گی۔'' عائزہ کڑے تیوروں کے ساتھ بولی۔

''ہم برباد ہو جائیں گے۔'' وہ ہیجانی کیفیت میں چلایا۔

''اس سے زیادہ کیا ہوں گے؟'' عائزہ مجسم سوال بنی اس کے روبرو تن کر کھڑی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''نینسی رکے یا نہ رکے، میں ...... کل اپنے وکیل سے مل کر تم سے طلاق حاصل کرنے کے کاغذات تیار کروانے جا رہی ہوں۔''

''عائزہ!'' طارق نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

''ہاں!'' عائزہ کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ''اور ہاں...... شاید تمہیں یاد ہو نسرین کو قتل کرنے کے بعد تم نے مجھ سے کہا تھا، میرے منہ پر تھوکو...... نہ میں اس وقت ایسا کر سکی تھی نہ آج کروں گی مگر...... اتنا ضرور کہوں گی...... تم جیسے سارے مردوں پر...... آخ تھو! تم ہماری پرکھ پر محض ایک کھوٹا سکہ بن کر اترے ہو۔''

xxx
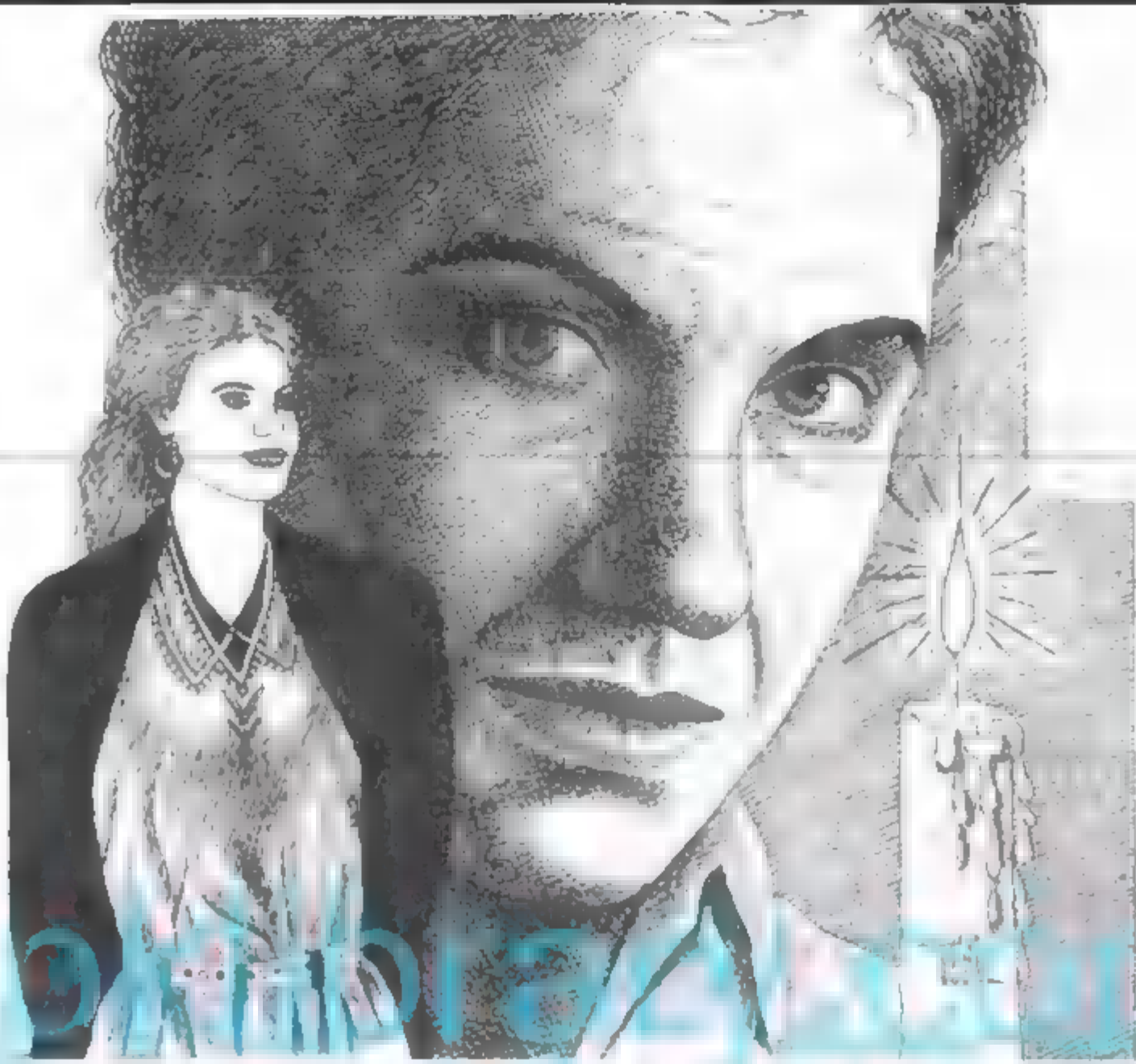
ماہرِ فن

شمس اجمیل

اپنی خاموش طبع کے باوجود وہ ایک ایسی فنکارہ ثابت ہوئی تھی جس نے ایسا تہلکہ مچایا کہ شوبز کے طبقے میں بے چینی پھیل گئی... اور جب بات زندگی اور موت تک آپہنچی تو تمام کردار اپنے انجام کی طرف گامزن ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سسپنس کے پچاس سال پورے ہونے کے موقع پر مرحوم مصنف کا انتخاب

میں اپنی بہن کیرول کی موت کے تین ہفتے بعد ہالی ووڈ پہنچی۔ اسے قتل کیا گیا تھا جبکہ سرکاری طور پر اسے لاپتا قرار دیا گیا تھا۔ بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سمندر میں ڈوب گئی ہے۔ ممکن ہے اس کی لاش سمندر کی تہ میں کسی جگہ موجود ہو اور وہ واقعی ڈوب کر ہلاک ہوئی ہو لیکن میں یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی کہ اس کی موت اتفاقیہ تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے اور میرا ہالی ووڈ آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ پولیس کی غلط فہمی دور کی جائے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کیرول کی گمشدگی کو کسی طرح قتل کی واردات ثابت کروں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن قاتل سے جرم کا اعتراف کرانا میرے لیے انتہائی اہم تھا۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر

منصوبہ بنایا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میرا منصوبہ ہالی ووڈ جیسے شہر کے لیے بھی ڈرامائی تھا جہاں ہر وقت مختلف قسم کے ڈرامے جنم لیتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے اپنے منصوبے کی کامیابی کا بہت یقین تھا۔ درجنوں فلموں میں کیرول کو دیکھا گیا ہوگا لیکن شاید ہی کسی فلم بین کو اس کے نام کا علم ہو جس کی وجہ یہ ہے کہ کیرول کا نام کبھی کسی فلم کی کاسٹ میں شامل نہیں کیا گیا۔ جو کردار چند منٹ کے لیے کسی فلم میں آتے ہیں ان کا نام کاسٹ میں شامل نہیں کیا جاتا۔ وہ اداکارہ نہیں تھی لیکن میں اس کے لیے ایکسٹرا کا لفظ بھی استعمال نہیں کرسکتی کیونکہ کسی ایکسٹرا کی اتنی زیادہ مانگ نہیں ہوتی کہ فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز اسے اپنی فلم میں پیش کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہوں۔ بس وہ اچانک پردۂ سیمیں پر نمودار ہوتی، چند مکالمے ادا کرتی اور خاصی بڑی رقم کا چیک جیب میں ڈال کر غائب ہوجاتی تھی۔

کیرول میں ایک نامور اداکارہ بننے کے سوا تمام خوبیاں موجود تھیں۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ لفظ ''خوب صورت'' ہمیشہ متنازعہ رہا ہے لیکن کیرول کو کوئی مرد نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اسے بھرپور نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور بہت لمبے تھے۔ چمک دار ایسے جیسے پورا چاند نکلا ہوا ہو۔ آنکھیں بڑی بڑی، جن سے معصومیت جھلکتی تھی اور بدن کے نشیب و فراز انتہائی دلکش۔ جو کچھ کیرول کے پاس تھا ایک عورت اس سے زیادہ کی تمنا نہیں کرسکتی۔ جب سرکاری طور پر اسے گمشدہ قرار دیا گیا اس وقت اس کی عمر 23 سال تھی۔

میں اس کی جڑواں بہن ہوں۔ ہمارے درمیان اتنی مشابہت ہے جتنی آئینے میں نظر آتی ہے۔ اگر کیرول میرے سامنے کھڑی ہوجائے اور ہم دونوں کے لباس ایک جیسے ہوں تو تیسرا فرد یہی سمجھے گا کہ کیرول آئینے کے سامنے کھڑی ہے۔

اگر کیرول میں اداکاری کی صلاحیت ہوتی تو وہ اپنے وقت کی مشہور ترین اداکارہ ہوتی لیکن اس کے پاس صرف حسن اور ایک الجھا ہوا ذہن تھا جو ہر وقت اپنے مفاد اور انا کی تسکین کے لیے نئی نئی سازشیں سوچنے میں معروف رہتا تھا۔ اس کا حسن اسکرین پر بھی اتنا ہی مقناطیسی اور دلفریب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز اسے اسکرین پر پیش کرنے کے لیے مواقع تلاش کرتے تھے۔ وہ زندگی سے لطف اندوز ہونے کا کوئی موقع کھونا پسند نہیں کرتی تھی اسی لیے وہ تقریبات کی جان تھی۔ لوگ اسے اپنے قریب دیکھنا پسند کرتے تھے لیکن وہ خود صرف ان لوگوں کی رفاقت قبول کرتی تھی جس سے اس کا کوئی مقصد حل ہوتا ہو۔ بلا مقصد وہ کسی کو اپنی قربت مہیا نہیں کرتی تھی اور اس کی مانگ فلمی حلقوں کے سب سے اونچے طبقے میں بھی تھی جہاں کوئی ایکسٹرا کبھی نہیں پہنچ پاتی۔

جس رات کیرول کو سرکاری طور پر لاپتا قرار دیا گیا، اس رات وہ جزیرہ کتالینا میں ایک پارٹی میں شریک تھی۔ یہ جزیرہ لاس اینجلس سے 22 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ پارٹی ایک فلم پروڈیوسر وارڈ پچمان نے فلم کی تکمیل پر دی تھی جس میں کیرول بھی چند منٹ کے لیے اسکرین پر آئی تھی۔ یہ فلم جیمس بانڈ قسم کی جاسوسی فلم تھی۔ گرمیوں کے موسم میں اس جزیرے کے ساحل پر سمندر پُرسکون رہتا تھا جو پیراکی کے لیے بہت موزوں ہوتا ہے۔ پارٹی میں شریک بہت سے مہمانوں نے سمندر میں پیراکی کی تھی اور کیرول بھی پیراکی کی بہت شوقین تھی اور بہترین پیراک تھی لہٰذا جب مجھے اطلاع ملی کہ وہ کتالینا جزیرے پر پیراکی کرتے ڈوب گئی تو میرے لیے اس اطلاع پر یقین کرنا ناممکن امر تھا۔ اس کے علاوہ اگر وہ واقعی ڈوب گئی تھی تو اس کی لاش دوسرے دن صبح کیوں ساحل پر دستیاب نہیں ہوئی جیسا کہ اس قسم کے حادثات میں ہوتا ہے۔ اس نام نہاد حادثے کو تین ہفتے گزر چکے تھے اور کیرول کی لاش غائب تھی۔

حادثے کی تفصیلات کے مطابق کیرول کو آخری بار رات گیارہ بجے زندہ دیکھا گیا تھا۔ تقریب میں شریک مہمانوں کے بیانات ظاہر کرتے تھے کہ کیرول اس روز شام ہی سے بے تحاشا شراب پی رہی تھی۔ کبھی وہ بے تحاشا ہنسنے لگتی تھی اور بہت خوش نظر آتی تھی اور کبھی اچانک خاموش ہوجاتی اور افسردہ افسردہ سی الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھی نظر آتی۔ وہ پیراکی کا لباس پہنے ہوئے ننگے پیر رقص کررہی تھی۔ اچانک وہ چپ ہوگئی اور سب سے الگ پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ کر خلا میں کچھ تکنے لگی۔ رات گیارہ بجے اسے ساحل پر ٹہلتا ہوا دیکھا گیا۔ وہ تنہا تھی۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آئی۔

کیا وہ پیراکی کرتے ہوئے ڈوب گئی؟ اس نے ڈوب کر خودکشی کرلی؟ کیرول مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتی تھی۔ میں اس کے تمام رازوں سے واقف تھی اور اسی لیے مجھے یقین تھا کہ کیرول کو قتل کیا گیا ہے۔ میرے پاس کچھ نام بھی تھے۔ قاتل ان میں سے ہی کوئی ایک تھا۔ کیرول کی گمشدگی میں ایک ٹیلی فون کال کا بھی ذکر آتا

ہے جسے کسی نے بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ کال ہالی ووڈ سے آئی تھی۔ کسی کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ شام کے وقت جب وہ کال آئی تو دوسری طرف بولنے والا کون تھا۔ وہ کوئی مرد تھا یا عورت؟ خود کیرول نے بھی کسی سے اس کال کے بارے میں گفتگو نہیں کی۔ وہ چونکہ مردوں میں بے پناہ مقبول تھی اس لیے یہ فرض کرلیا گیا کہ اس کے کسی دوست کا فون ہوگا۔ کیونکہ مجھے کیرول کے تمام رازوں کا علم تھا اس لیے میں اس کال کو نظر انداز نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری بہن کی نام نہاد گمشدگی میں اس ٹیلی فون کال کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور کیرول کو قتل کیا گیا ہے لیکن میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ثبوت حاصل کرنے کے لیے میں نے وہ خطرناک منصوبہ بنایا تھا اور ٹیکساس میں واقع اپنے قصبے سے چل کر ہالی ووڈ آئی تھی۔

میرا منصوبہ سیدھا سادہ لیکن خطرناک تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں کیرول بن کر اچانک ہالی ووڈ میں نمودار ہو جاؤں۔ میری یہ حرکت حیرت انگیز نتائج برآمد کرسکتی تھی۔ کسی کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ کیرول کی کوئی جڑواں ہم شکل بہن بھی موجود ہے اس لیے قاتل کے علاوہ سب مجھے کیرول تسلیم کرلیں گے۔ صرف قاتل میرے کیرول ہونے پر یقین نہیں کرے گا بلکہ وہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرے گا جس سے اس کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے گا۔ یہ ایک خطرناک منصوبہ تھا جس پر عمل کرنے سے خود میں بھی قتل ہو سکتی تھی۔

ہم دونوں ٹیکساس کے ایک غیر معروف قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ ہم جڑواں بہنیں بالکل ہم شکل تھیں۔ ہمارے والد کاروبار کرتے تھے۔ جب ہماری عمر سولہ سال ہوئی تو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت کیرول ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر چکی تھی۔ اس نے قصبے کے ایک لڑکے سے شادی کرلی اور جب وہ اس سے اکتا گئی تو اس کے شوہر نے ایک چھوٹا طیارہ کرائے پر حاصل کیا اور اسے پہاڑ سے ٹکرا کر خودکشی کرلی۔ شوہر کی موت کے بعد کیرول ہالی ووڈ چلی گئی۔

ہالی ووڈ میں اس کے حسن اور شباب کی خوب قدر کی گئی اور بہت جلد اس نے ایک مقام بنالیا۔ وہ دولت میں کھیلنے لگی لیکن وہ مہینے میں ایک بار مجھ سے ملنے ٹیکساس ضرور آتی تھی۔ چند سال بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ میری محبت میں نہیں بلکہ اپنی انا کی تسکین کے لیے ہر مہینے اتنا لمبا سفر کرتی ہے۔

ہم شکل اور جڑواں بچے عام طور پر ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں۔ ویسے تو بچوں میں مقابلے کا جذبہ ہوتا ہی ہے لیکن ہم شکل بچوں میں یہ جذبہ بے حد شدید ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی یہ جذبہ شدید تھا۔ میرے مقابلے میں کیرول کے اندر نمائش اور اپنی کامیابیوں کا ڈنکا پیٹنے کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ جب بھی وہ مجھ سے ملنے آتی تھی، گھنٹوں بلا تکان بولتی رہتی تھی جس کا ایک ہی موضوع ہوتا تھا.... ہالی ووڈ میں اس کی کامیابیاں...... وہ ہر فلم کے بارے میں اداکاری کرکے باقاعدہ مکالمے سناتی تھی۔ اپنے تمام رومانس چٹخارے لے کر بیان کرتی تھی جن میں مکالمے اور حرکات و سکنات کا بیان بھی شامل ہوتا تھا۔ وہ مجھے اپنے منصوبوں سے آگاہ کرتی تھی کہ وہ کس پروڈیوسر، کس ڈائریکٹر کو کس طرح بلیک میل کرے گی۔ اس کا ذہن ہر وقت ایسے منصوبوں اور سازشوں کے تانے بانے بنتا رہتا تھا جو کسی طرح اسے ایکسٹرا کی فہرست سے نکال کر اداکاروں کی فہرست میں شامل کردے۔ اس کے منصوبے اور سازشیں مجھے سحر زدہ کردیتے تھے۔ میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی تاکہ وہ جلد از جلد اداکارہ بن جائے۔

اس طرح میں کیرول کے تمام رازوں سے واقف ہوگئی اور ہالی ووڈ کی مشہور شخصیتوں کے جو راز اس کے سینے میں دفن تھے، وہ مجھ تک منتقل ہوگئے۔ اس کی پوری زندگی میرے سامنے کھلی کتاب کے مانند تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے لیے کیرول بن کر ہالی ووڈ میں نمودار ہونا بہت آسان تھا۔ مجھے اس کے متعدد احباب کے بارے میں پورا علم تھا اور ہر ایک کے ساتھ کیرول کے جو تعلقات قائم تھے، ان کا بھی علم تھا۔ میں کوئی غلطی نہیں کرسکتی تھی جس کی بنا پر کیرول کا بہت قریبی دوست بھی مجھ پر کیرول نہ ہونے کا شک کرسکے۔ اس کے علاوہ ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کے لب و لہجہ، چال ڈھال اور حرکات و سکنات کی صحیح نقل اتارنے میں ماہر تھیں جن کی مدد سے ہم نے بہت سے ڈرامے کھیلے تھے اور لطف اندوز ہوئے تھے۔

ہم دونوں کے مزاجوں میں خاصا تفاوت تھا۔ کیرول کے برعکس میں خاموش طبع اور سوچ سمجھ کر ہر کام کرتی تھی۔ میں بولنے سے زیادہ سنتی تھی۔ میری فطرت جارحیت پسند نہ تھی۔ میرا مشاہدہ بھی تیز تھا اور دماغ بھی ٹھنڈا تھا۔ کیرول کے مقابلے میں ان باتوں نے مجھے اس سے بہت پیچھے دھکیل دیا۔ میں قناعت پسند ہرگز نہیں تھی لیکن اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ حاصل نہیں کر پاتی تھی۔

کیرول کی زبانی ہالی ووڈ کے رنگین قصے سن کر کئی بار میں نے اس سے ہالی ووڈ جانے کی فرمائش کی تاکہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں لیکن ہر مرتبہ کیرول ٹال گئی۔ کوئی

عذر تراش کر اس نے ہمیشہ مناسب وقت آنے پر میری فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کر دیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ کیرول مجھے ہالی ووڈ لے جانا نہیں چاہتی۔ وہ ہالی ووڈ کو اپنی ملکیت تصور کرتی تھی جو اس کی فتوحات کے لیے ایک ایسا میدان تھا جسے وہ صرف اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتی تھی۔ ایک بار جب میں نے زیادہ اصرار کیا اور اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں اکیلی ہالی ووڈ پہنچ جاؤں گی تو کیرول نے غصے سے بے قابو ہو کر وہ سب کچھ اگل دیا جو میں پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہالی ووڈ میں کسی فرد کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس کی کوئی جڑواں ہم شکل بہن موجود ہے اور اگر میں نے کبھی اس کے مفتوح علاقے میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو وہ زندگی بھر مجھے معاف نہیں کرے گی اور مرتے دم تک میری صورت نہیں دیکھے گی۔ مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ میں کبھی ایسی جسارت نہیں کروں گی۔

لیکن میں نے ایک بار وعدہ خلافی کی۔ کیرول شوٹنگ پر کئی روز کے لیے کینالیا جزیرے پر گئی ہوئی تھی جس کا مجھے علم تھا۔ میں چپکے سے ہالی ووڈ پہنچ گئی اور چوبیس گھنٹے قیام کیا۔ اس وعدہ خلافی کا کیرول کو بھی علم نہیں ہو سکا اور ہالی ووڈ میں کسی کو شک نہیں ہوا کہ میں کیرول نہیں ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہالی ووڈ میں کسی کو بھی کیرول کی ہم شکل جڑواں بہن کا علم نہیں تھا۔ یہی میرے منصوبے کی بنیاد تھی اور اسی پر میری کامیابی کا دارومدار تھا۔

میں نے بہت غور و فکر کے بعد منصوبہ بنایا اور کیرول کی گمشدگی کے تین ہفتے بعد ہالی ووڈ پہنچ گئی۔ مجھے علم تھا کہ جیسے ہی میں کیرول بن کر نمودار ہوں گی، پولیس سب سے پہلے مداخلت کرے گی۔ مجھے اپنے منصوبے کی کامیابی کے لیے پولیس کے تعاون کی بھی ضرورت تھی اس لیے میں نے سب سے پہلے پولیس کو اپنے منصوبے میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا اور سیدھی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ جو آفیسر کیرول کی گمشدگی کی تفتیش کر رہا تھا اس نے میرے منصوبے کی شدت سے مخالفت کی لیکن اعلیٰ افسران میرے ہم خیال بن گئے۔ انہیں یقین تھا کہ میرا منصوبہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی اجازت دے دی اور ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

پولیس نے کیرول کے اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی جو انہیں کیرول کے پرس سے دستیاب ہوئی تھی۔ میری حفاظت کے لیے سادہ لباس والے سراغ رساں متعین کر دیے گئے جنہیں خفیہ طریقے سے میرا تعاقب کرنا تھا اور اتنا قریب رہنا تھا کہ میرے ذرا سے اشارے پر فوراً مدد کو پہنچ سکیں۔ میں رات کے طیارے سے ہالی ووڈ پہنچی تھی اور جب پولیس ہیڈ کوارٹر سے باہر نکلی تو سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ میں ایک ٹیکسی کے ذریعے اس عمارت تک پہنچی جس میں کیرول کا فلیٹ واقع تھا۔ وہ ایک عمدہ قسم کا رہائشی ہوٹل تھا جس میں ماہانہ کرائے کی بنیاد پر فلیٹ کرائے پر دیے جاتے ہیں۔ میرے لابی میں قدم رکھتے ہی استقبالیہ کلرک کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس پر سکتے جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ ایسا بدحواس ہوا کہ مجھ سے کوئی سوال بھی نہ کر سکا۔ میں کیرول کے انداز میں ہاتھ ہلاتی ہوئی لفٹ میں سوار ہو گئی۔

کیرول کے فلیٹ میں پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کا ایک خوب صورت لباس پہنا اور پھر اپنا سوٹ کیس خالی کیا۔ میں اپنے ساتھ دو قابل ذکر چیزیں لائی تھی۔ ایک تو چھوٹا سا ریوالور اور دوسرا ہتھیار اس سے زیادہ خطرناک اور مہلک تھا۔ وہ کیرول کی خفیہ ڈائری تھی جسے وہ میرے پاس لیکساس میں رکھتی تھی۔ ہر ماہ جب وہ مجھ سے ملنے آتی تھی، اس کے پرس میں بہت سارے کاغذ کے پرزے ہوتے تھے جن پر وہ خفیہ زبان میں یادداشتیں لکھ لیتی تھی اور بعد میں ان یادداشتوں کو سلیس انگریزی میں ڈائری پر منتقل کر دیتی تھی۔ کیرول نے ڈائری میں جتنے واقعات تحریر کیے تھے ان میں خوبی یہ تھی کہ ہر واقعے میں ملوث تمام کرداروں کے نام (اگر وہ غیر معروف ہیں تو ان کے پتے بھی)، دن، تاریخ اور جس جگہ اس واقعے نے جنم لیا، اس مقام کا پتا درج کر دیتی تھی۔ ان میں بڑے بڑے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور اداکاروں کے نام تھے اور ایسے ایسے شرمناک واقعات ان ناموں کے ساتھ منسلک تھے جن کی تشہیر ان افراد کا مستقبل تباہ کر سکتی تھی اور ایک صاحب کو تو لمبے عرصے کے لیے جیل کی ہوا کھانی پڑتی۔ کیرول وہ ڈائری اپنے فلیٹ میں رکھتے ہوئے ڈرتی تھی جہاں بہت سے لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی اور اتفاقیہ طور پر ڈائری کسی کے ہاتھ لگ سکتی تھی اس لیے وہ اپنی ڈائری میری حفاظت میں رکھتی تھی۔

کیرول چاہتی تھی کہ اگر کبھی ہالی ووڈ میں ناکام ہو جائے تو ان یادداشتوں کی مدد سے ایک ایسی کتاب لکھے جو پوری دنیا میں تہلکہ مچا دے اور جس کی بے تحاشا آمدنی کے سہارے وہ بقیہ زندگی عیش و آرام سے گزار سکے۔ اس ڈائری میں کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جو کیرول نے خود مجھے نہ بتایا ہو۔ میں اپنی یادداشت تازہ کرنے کے لیے ڈائری ساتھ لے آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس ڈائری میں جن

افراد کا ذکر ہے وہ ضرور مجھ سے ملاقات کریں گے اور اس موقع پر مجھے ان کے بارے میں وہ سب کچھ یاد ہونا چاہیے جو کیرول کے علم میں تھا اور جسے اس نے اپنی ڈائری پر منتقل کیا ہوا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ میں نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے ان کا کوئی راز تو نہیں کھولا۔

ریوالور میں نے اپنے پرس میں رکھا۔ ڈائری ایک جگہ چھپائی اور پھر میں نے ایک اخبار کے دفتر میں فون کرکے انہیں اپنی واپسی کی اطلاع دی۔ جس اخباری نمائندے سے میری بات ہوئی اس نے مجھ پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ نیچے استقبالیہ کلرک کو فون کرکے میری واپسی کی تصدیق کرسکتا ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور ایک منٹ بعد میرے فون کی گھنٹی بجی۔ وہی اخباری نمائندہ تھا اور اس مرتبہ وہ بڑے خوشامدانہ انداز میں مجھ سے انٹرویو لینے کی درخواست کر رہا تھا۔ میں نے اس کی درخواست منظور کرلی اور ایک خبر رساں ادارے کو فون کیا۔

دس منٹ بعد کیرول کا ڈرائنگ روم اخباری نمائندوں اور فوٹوگرافروں سے بھر گیا۔ فلش بلب چمک رہے تھے اور دھڑا دھڑ میری تصویریں اتاری جارہی تھیں۔ میں نے انہیں مختصر محتاط الفاظ میں کہانی سنائی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایک گمنام آدمی کی طرف سے ٹیلی فون پر دھمکیاں مل رہی تھیں کہ اگر میں ہالی ووڈ چھوڑ کر نہیں گئی تو مجھے قتل کردیا جائے گا۔ مجھے اس کا قطعی علم نہیں ہے کہ وہ شخص آخر کیوں مجھے دھمکیاں دے رہا تھا نہ ہی میں نے ان دھمکیوں کی پروا کی۔ جس رات میں غائب ہوئی اس شام کو بھی جزیرے پر اس شخص نے فون کرکے دھمکی دہرائی۔ مجھے کچھ تشویش ہوئی کیونکہ میری اس تقریب میں شرکت کا صرف میرے قریبی دوستوں کو علم تھا۔ رات گیارہ بجے میں ٹہلنے کے لیے ساحل پر نکل گئی جو اس وقت سنسان تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کیا اور سمندر میں مجھے ڈبونے کی کوشش کی۔ میں اندھیرے کی وجہ سے حملہ آور کو تو نہیں پہچان سکی البتہ بڑی جدوجہد کے بعد میں اس کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ میں پانی کے اندر تیرتی ہوئی دور نکل گئی اور جب پانی سے باہر آئی تو مجھے کچھ فاصلے پر ایک کاٹیج نظر آیا جس کا مالک میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ میں نے اس کاٹیج سے ہالی ووڈ میں اپنے ایک دوست کو فون کرکے مدد کی درخواست کی۔ وہ دوست مجھے جزیرے سے لے گیا اور ایک جگہ چھپا دیا تاکہ جب تک اس معاملے کی تفتیش ہو، میں مجرم کے دوسرے قاتلانہ حملے سے محفوظ رہوں۔

یہ کہانی سنا کر میں نے اخباری نمائندوں سے وعدہ کیا کہ چند روز بعد میں انہیں دوبارہ طلب کروں گی اور ایک ایسی خبر دوں گی جو ان کے اخبار کی سب سے بڑی سرخی ثابت ہوگی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میری کہانی جھوٹ پر مبنی نہیں ہے، نہ ہی یہ شہرت حاصل کرنے کا کوئی منصوبہ ہے جس کے ایک ایک لفظ کی تصدیق وہ پولیس سے کرسکتے ہیں۔

میرے خاموش ہوتے ہی اخباری نمائندوں نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی جن کا مقصد بالواسطہ طور پر مجھ سے مزید معلومات اگلوانا تھا۔ میں نے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور تھک ہار کر وہ واپس چلے گئے۔

میں دوپہر تک آرام کرتی رہی اور ڈائری کے اندراجات دہراتی رہی۔ سہ پہر کو جب شام کے اخبارات شائع ہوئے تو کیرول کے خصوصی ٹیلی فون پر کالوں کی قطار لگ گئی۔ میں ایک سے گفتگو کرکے ریسیور کریڈل پر رکھتی ہی تھی کہ گھنٹی فوراً بجنے لگتی تھی۔ فون کرنے والوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ کچھ خیریت معلوم کرنا چاہتے تھے، کچھ حملہ آور کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ بہت سوں نے میرے ساتھ ہمدردی کی اور ہر قسم کی مدد کی پیشکش کی۔ میں نے کیرول کا کردار ادا کرتے ہوئے کسی پیشکش کا حتمی جواب نہیں دیا۔

ٹیلی فون کرنے والوں میں ہالی ووڈ کے وہ ناخدا بھی شامل تھے جن کے نام کیرول کی ڈائری میں موجود تھے۔ انہیں میری واپسی پر بے انتہا مسرت ہوئی تھی۔ ان کے لب ولہجوں اور آوازوں میں خوف کا عنصر شامل تھا۔ وہ فوری طور پر مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان میں سے ہر ایک کو ملاقات کا وقت دیا لیکن درمیان میں ایک ایک گھنٹے کا وقفہ رکھا۔ شام کو مجھ سے ملاقات کرنے والوں میں ایک مشہور ڈائریکٹر، ایک اداکار اور ایک کہانی نویس شامل تھا۔ وہ ملاقات کے لیے کیرول کے فلیٹ پر آئے تھے۔

کیرول کو زندہ دیکھ کر انہیں بے پناہ (مصنوعی) مسرت ہوئی۔ رسمی گرمجوشی کے اظہار کے بعد وہ اپنے مطلب پر آگئے۔ پولیس کی تفتیش کے دوران میں نے ان کا کوئی راز تو منکشف نہیں کر دیا جو ان کے مستقبل کو خطرے میں ڈال سکتا ہو یا ان کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہو؟ ”ہرگز نہیں۔“ میں نے انہیں جواب دیا۔ ”میں مرتے دم تک ان رازوں کی حفاظت کروں گی۔“ وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر میں نے ان میں سے ہر ایک کو یاد دلایا کہ میری اس وفاداری

کے سلسلے میں انہیں بھی میرے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ اس قسم کے اقدامات کیرول کی فطرت کے عین مطابق تھے جس پر کسی نے بھی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔

جب وہ واپس گئے تو وہ سب بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ ان کی نیک نامی اور مستقبل دونوں محفوظ تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی میری شخصیت پر ذرا سا بھی شک کا اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے کیرول تسلیم کر لیا اور یہی بات ان کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی کیرول کا قاتل نہیں تھا کیونکہ قاتل مجھے بھی کیرول تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔

رات دس بجے کے قریب وارڈ پچنان کا فون آیا۔ یہ ہالی ووڈ کا ایک آزاد اور بڑا پروڈیوسر تھا۔ اس کی جاسوسی فلم میں کیرول نے کام کیا تھا جو اس کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ اسی فلم کی شوٹنگ کے اختتام پر کنٹیلا جزیرے پر وہ تقریب منعقد ہوئی تھی جو کیرول کی زندگی کی آخری تقریب ثابت ہوئی۔ کیرول کی زبانی مجھے وارڈ پچنان کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا جو سب ڈائری میں لکھا ہوا تھا۔

ہالی ووڈ میں سب کو علم تھا کہ اس کی بیوی نے خودکشی کر لی تھی۔ ایک رات وہ گیوانا بیچ والے کاٹیج میں گئی اور گولی مار کر خود کو ہلاک کر لیا۔ کیرول کی زبانی مجھے اس واقعے کے بارے میں مکمل تفصیل معلوم ہوئی تھی جس کا اندراج اس نے اپنی ڈائری میں بھی کر دیا تھا۔

”ہیلو... میں...... میں وارڈ پچنان بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟“

”میں کون ہو سکتی ہوں ڈارلنگ؟“ میں نے لہک کر جواب دیا۔

”کیرول؟“

”اور کون ہو سکتا ہے ڈارلنگ۔ دنیا میں صرف ایک ہی بےبی کیرول ہے۔“

دوسری طرف گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وارڈ نے کہا۔ ”کیرول ہی معلوم ہوتی ہو، خیر... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں کیرول۔“

”کب؟“

”ایک ٹیکسی پکڑو اور فوراً میرے گھر آ جاؤ۔“

”سوری ڈارلنگ! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ اس خوفناک تجربے نے مجھے بے جان کر دیا ہے بالکل سی۔“

دوسری جانب دوبارہ سکوت طاری ہو گیا۔ ”آج ملاقات ضروری ہے کیرول۔“

”ہاں! کا مجھے پورا احساس ہے لیکن آج رات میں کہیں نہیں جا سکتی۔“

”تو میں آپ آ جاتا ہوں۔ ٹھیک ہے؟ بس ابھی پہنچا۔“

”تم زیادہ دیر تو نہیں ٹھہرو گے؟“

”نہیں۔“

”بہت اچھا، آ جاؤ۔“

میں نے ٹیپ ریکارڈر میں نئی کیسٹ لگائی اور اسے دوبارہ چھپا دیا۔ یہ ایک مختصر سا ٹیپ ریکارڈر تھا جسے پرس میں بھی رکھا جا سکتا تھا۔ اسے میں اپنے ساتھ لائی تھی تاکہ فرصت کے اوقات میں کیرول کی آواز سن کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کر سکوں۔ وارڈ سے پہلے جو تین اہم افراد مجھ سے ملنے آئے تھے، میں نے ان کی پوری گفتگو ریکارڈ کر لی تھی اور اب وارڈ کی باری تھی۔ پھر میں نے نیچے استقبالیہ میں بیٹھے ہوئے پولیس سراغ رساں کو فون پر وارڈ کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ وارڈ پچنان کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے استقبالیہ کلرک کو ہدایت کی کہ جیسے ہی وارڈ عمارت میں داخل ہو، وہ پولیس سراغ رساں کو اشارہ کر دے پھر میں نے سراغ رساں کو یاد دہانی کرائی کہ وارڈ سے ملاقات کے دوران وہ ایک بار مجھے کمرے میں ضرور فون کرے، یہ جاننے کے لیے کہ میں محفوظ ہوں۔ ویسے تو میرے پاس ریوالور تھا لیکن میں خوف زدہ تھی اور تردد بھی زیادہ تھی۔ جب استقبالیہ کلرک نے فون پر مجھے اطلاع دی کہ وارڈ مجھ سے ملنے آ رہا ہے تو میں نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ چند لمحوں بعد اطلاعی گھنٹی بجی اور میں نے دروازہ کھولا۔

”ہیلو ڈارلنگ! تم بہت پیارے ہو۔ تم نے یہاں آنے کی زحمت کی، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ کیرول زندہ ہے اور تندرست ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کیرول کو زندہ دیکھ کر تمہیں بے حد مسرت ہوئی ہو گی۔“

مجھے دیکھ کر وارڈ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ خاموش رہا اور میرے خدوخال پر نظریں دوڑاتا رہا۔ میں نے اسے اشارہ کیا اور نشست گاہ میں آ گئی۔ وارڈ کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دہرے اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں باریک بینی سے میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان میں غیر یقینی کیفیت موجود تھی جسے پڑھنے کے لیے قیافہ شناسی کی مہارت ضروری نہیں تھی۔ میں اسے پہچان گئی۔ وہی کیرول کا قاتل ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے ٹیپ ریکارڈر سے قریب ترین کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گئی۔ ہمارے درمیان ایک چھوٹی

میز تھی جس پر کئی فلمی رسالے بے ترتیب پڑے تھے۔ ان رسالوں کے نیچے میرا ریوالور پوشیدہ تھا۔ اندر سے میرا وجود لرز رہا تھا لیکن میں نے چہرے پر بے پروائی طاری کی ہوئی تھی۔ میرے لبوں پر مضحکہ اڑانے والی مسکراہٹ جمی ہوئی تھی اور میں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وارڈ نے کھنکار کر گلا صاف کیا، سگریٹ سلگایا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”کیرول!“ اس نے خاموشی کا طلسم توڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔“

”مجھے زندہ دیکھ کر تمہیں خوشی ہوئی....“ میں نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ ”تم تو ایسا نہ کہو وارڈ۔ اس جھوٹ کی سفیدی تمہاری آواز، تمہارے چہرے سے جھلک رہی ہے۔“

”آخر مجھے کیوں نہیں خوش ہونا چاہیے؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

”اس لیے کہ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔“

اپنے جواب کا ردعمل دیکھ کر مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ جواب غلط تھا۔

”یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔ تمہارے علاوہ اور دوسرے لوگ بھی میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کے تنے ہوئے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ”ہر شخص کی بھی زندگی میں ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جن کی تشہیر اسے بدنام کر سکتی ہے۔ تم میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ میں تمہارے سامنے لرزنے لگوں؟“

گفتگو کا یہ انداز ظاہر کرتا تھا کہ اسے یقین ہو گیا ہے کہ میں کیرول نہیں ہوں اور اب وہ میری شخصیت بے نقاب کرنے کے چکر میں ہے۔

”جس رات میں عارضی طور پر لاپتا ہوئی تھی، اس سے ایک رات قبل میں تمہیں اس سوال کا جواب دے چکی ہوں وارڈ۔ کیا تم اتنی جلدی بھول گئے؟“

”میں بہت مصروف آدمی ہوں اور احمقانہ باتیں بھول جاتا ہوں۔ تم میری یادداشت تازہ کر سکتی ہو، میں غور سے تمہاری باتیں سن رہا ہوں۔“ وہ مسکرانے لگا اور کرسی کی نشست سے پشت ٹکا کر بڑے اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گیا۔ میں نے جس رات کا ذکر کیا تھا، اس کا احوال مجھے کیرول سے معلوم نہیں ہوا تھا، نہ میں وہ رات بھول سکی

کلام: علامہ محمد اقبال

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح پھولوں پہ رو اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی حرم بھی کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

[illegible] سب سے اقبال یہ پوچھے کوئی
[illegible] زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں!

تھی۔ یہ وہی دن تھا جس روز میں دوبارہ واپسی کرتے ہوئے ہال ووڈ آئی تھی اور رات کو میں وارڈ سے بھی ملی تھی۔ اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ مجھے یاد تھا۔

”تمہاری فرمائش انتہائی بچکانہ ہے۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو میں تمہارے تھپڑ مار دیتی۔“ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا اور تیوریوں پر بل ڈال لیے۔ ”میں تمہاری یادداشت ضرور تازہ کروں گی۔ اس رات میں آٹھ بجے کے قریب تمہارے گھر پہنچی تھی۔ آٹھ بج کر چند منٹ ہوئے تھے، تم اس وقت اپنی ایک خاتون دوست کے ساتھ گہرے راز و نیاز میں مشغول تھے۔ مجھے دیکھ کر تم ذرا بھی خوش نہیں ہوئے۔ یہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والی بات تھی۔“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”میرے اصرار پر تم نے مجھے اندر آنے کی اجازت دی اور مجھے لائبریری میں لے گئے جہاں ہمارے درمیان گرما گرمی ہوئی۔ یہ گفتگو تمہارے ناپسندیدہ موضوع پر ہوئی تھی۔“

”اچھا۔“ اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی تھی پھر اس نے ایک انتہائی غیر متوقع سوال کیا۔ ”تمہارے کہنے کے مطابق اگر اس رات تم نے مجھ سے ملاقات کی تھی تو یہ بتاؤ کہ اس

وقت میں کیا لباس پہنے ہوئے تھی؟"

"گہرے سرخ رنگ کی جیکٹ، سبز رنگ کی ریشمی اسپورٹ شرٹ اور سلیٹی پتلون۔" میں نے جواب دیا جسے سن کر وارڈ کے چہرے پر پھیلتی وہی مسکراہٹ تاریک ہوگئی۔ "تم نے یہ سوال پوچھ کر مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے وارڈ۔" میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں یقین ہے کہ میں کیرول نہیں ہوں، کوئی اداکارہ ہوں اور کیرول کا کردار ادا کررہی ہوں اور یہ سب کچھ تمہیں پھانسنے کے لیے کیا گیا ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا وارڈ؟ شاید تمہیں ذاتی طور پر اس بات کا مکمل یقین ہے کہ کیرول زندہ نہیں ہے۔ کیا میں اس یقین کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

میرے سوال نے اس پر بجلی گرادی اور مجھے یقین ہوگیا کہ وہی کیرول کا قاتل ہے۔

"تم پر شک کرنا بالکل فطری امر ہے۔" چند لمحوں بعد وارڈ نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک لڑکی میرا ای کا لباس پہنے ہوئے غائب ہوجاتی ہے اور پھر اچانک نمودار ہوجاتی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ میرے شک کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔"

"پھر بھی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟ تمہیں اس بات کا یقین کیوں ہے کہ کیرول زندہ نہیں ہے، اس لیے میں کیرول نہیں ہوسکتی؟"

اس کا ذہن تیزی سے کوئی معقول جواز تلاش کرنے میں مصروف تھا لیکن وہ ناکام رہا اور خاموش رہا۔

"اگر تمہیں اب بھی یقین ہے کہ میں کیرول نہیں ہوں تو میں تمہارے سامنے وہ گفتگو دہراسکتی ہوں جو اس رات ہمارے درمیان ہوئی تھی۔"

"اگر اس سے تمہاری انا کو تسکین مل سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"جیسا کہ تمہیں بخوبی علم ہے، اس رات ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو دو موضوع پر تھی۔ ایک تو ہماری شادی اور دوسرا موضوع تمہاری نئی فلم کی ہیروئن کا تھا۔ میں فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کرنا چاہتی تھی۔"

"میں پھر بھی کہوں گا کہ تمہارے دونوں مطالبے احمقانہ تھے۔ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتا اور تم میں ہیروئن بننے کی کوئی صلاحیت بھی نہیں ہے۔"

"اور میں تم سے ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گی کہ تم میرے دونوں مطالبے پورے کروگے۔ اگر تم انکار کروگے تو مجھے پولیس کے پاس جانا پڑے گا اور انہیں بتانا پڑے گا کہ جس رات تمہاری بیوی نے لیکوانا بیچ والے مکان میں خودکشی کی تھی اس رات میں اس مکان میں تمہارے ساتھ وہاں موجود تھی۔ اس نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑلیا تھا اور یہ کہ تمہاری بیوی نے خودکشی نہیں کی تھی۔ اس نام نہاد خودکشی میں تمہارا بہت بڑا ہاتھ تھا۔"

وہ چونک کر کرسی پر آگے کی طرف جھک گیا۔ "یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ یہ سب کس نے تمہیں بتایا؟"

"مجھے کون بتائے گا؟ اس رات میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

کچھ دیر وہ بالکل خاموش رہا پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں کیرول کی جڑواں بہن ریٹا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ جب تم کیرول کے دونوں مطالبات پورے کرنے پر تیار ہوگئے تھے اس کے بعد تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

اس کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔ مجھے ڈر ہوا کہ شاید اس کا سر ہمیشہ اسی طرح ہلتا رہے۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی۔

"کیرول کی ہم شکل بہن!" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "یہی ہوسکتا ہے۔ صرف یہی ایک صحیح جواب ہے۔"

وارڈ اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے جھپٹ کر رسالے کے نیچے سے ریوالور نکالا اور اس پر تان لیا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"اس کے علاوہ....." میں نے کہا۔ "نیچے ایک پولیس سارجنٹ بھی موجود ہے۔ تم نے شاید اسے دیکھا نہیں۔ وہ اخبار چہرے کے سامنے پھیلائے کرسی پر بیٹھا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس وقت تم یہاں میرے کمرے میں موجود ہو۔ استقبالیہ کلرک نے تمہاری نشاندہی کردی تھی اس لیے مجھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہاری بیوی ریوالور پاس رکھتے ہوئے بھی تم سے مات کھاگئی تھی لیکن مجھ سے ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ میں نے پہلے ہی سارا انتظام کیا ہوا ہے۔ واپس اپنی نشست پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ پلٹا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ "خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے کوئی اعتراف نہیں کیا۔"

"تم غلطی پر ہو وارڈ۔ تم نے یہ سوال پوچھ کر کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتی ہوں، کیرول کو قتل کرنے کا اعتراف

کرلیا ہے۔ صرف قاتل کو اس حقیقت کا علم ہے کہ کیرول زندہ نہیں ہے اس لیے میں کیرول نہیں ہوسکتی۔ تم سے پہلے تین خوف زدہ افراد اور آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کہیں میں نے پولیس کو ان کے متعلق کوئی بات تو نہیں بتائی۔ ان میں سے کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کسی نے ذرا سے بھی شک کا اظہار نہیں کیا۔ تمہارا، سوال اعتراف جرم کے مترادف ہے۔"

"اگر اسے اعتراف جرم سمجھ لیا جائے جیسا کہ تمہارا خیال ہے، تب بھی اس جملے کی بنیاد پر کوئی عدالت مجھے مجرم تسلیم نہیں کرے گی۔"

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس یقین کے ساتھ یہ بات نہ کہتی۔ پولیس جب تفتیش کرنے پر آتی ہے تو گڑے مردے تک اکھاڑ لیتی ہے اور جب مقدمہ چلے گا تو تمہاری بھی زندگی منظر عام پر آجائے گی جو اتنی گھناؤنی ہے کہ تم نے سرے سے زندگی شروع نہیں کرسکو گے۔ جہاں تک تمہاری بیوی کے قتل کا معاملہ ہے تو کیرول نے وہ پورا واقعہ اپنی تحریر میں اپنی ڈائری میں لکھا ہوا ہے اس کے علاوہ میں بھی یہ شہادت دے سکتی ہوں کہ جس رات کیرول غائب ہوئی اس سے ایک رات قبل میں کیرول کے روپ میں تم سے ملی تھی اور یہ حقیقت بھی ہے اور تم نے خود میرے سامنے اپنی بیوی کو قتل کرنے کا اعتراف کیا تھا۔"

"اس رات واقعی وہ تم تھیں، کیرول نہیں تھی؟"

"نہیں، مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم تھا اور میں کیرول کے تمام دوستوں کو جانتی تھی پھر ایک روز کیرول نے مجھے فون کیا کہ وہ شوٹنگ پر جارہی ہے تو میں نے فوراً فیصلہ کرلیا کہ میں اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر خود کیرول کے روپ میں ہالی ووڈ پہنچ جاتی ہوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ کیرول کے غائب ہونے سے ایک روز قبل میں ہالی ووڈ پہنچی اور میں کیرول کے تمام دوستوں سے ملی اور میں نے کیرول کا انداز اختیار کرتے ہوئے ان سے [illegible] بلیک میل کیا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے ایسے سخت مطالبات ان کے سامنے رکھے جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ کبھی پورے نہیں کریں گے۔ کیرول ایسے مطالبات پیش نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے اس کے دوستوں پر یہ بھی واضح کردیا کہ آئندہ بھی میرے مطالبات ایسے ہی سخت اور ناممکن العمل ہوں گے۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میری بہن خوف زدہ رہتی ہے۔ اسے ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کوئی شخص اس کے مطالبات سے تنگ آکر کسی روز اسے قتل نہ کردے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نرم اور آسان مطالبے پیش کرتی تھی۔ میں نے اس روز سخت مطالبات پیش کیے۔ مجھے کسی بات کا ڈر نہیں تھا۔ ان مطالبات کے نتیجے میں اگر کوئی کیرول کو قتل کرنے کا فیصلہ کرتا تو میرا کیا بگڑتا۔ کیرول اپنی جان سے جاتی۔ میں بہرحال محفوظ رہتی اور پھر یہی ہوا۔ میں نے تمہارے سامنے شادی کرنے اور نئی فلم میں ہیروئن کا کردار دینے کا مطالبہ کیا۔ تم نے اس وقت تو جان چھڑانے کے لیے میرے مطالبات تسلیم کرلیے لیکن دوسرے ہی دن میری بہن کو قتل کردیا۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ میں نے تمہاری بہن کو قتل کیا ہے؟"

"اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"کیسے؟ کیرول اس رات کٹالینا جزیرے پر تھی اور میں یہاں ہالی ووڈ میں تھا۔ ہمارے درمیان پچیس میل کا سمندر حائل تھا۔"

"اس کے لیے میں صرف قیاس آرائی کرسکتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہارے پاس ایک کشتی ہے جس میں طاقت ور انجن نصب ہیں۔ تم نے شام کو جزیرے پر کیرول سے فون پر بات کی۔ تم نے کوئی بہانہ بنا کر اس سے خفیہ ملاقات کے لیے کہا ہوگا اور رات گیارہ بجے کا وقت رکھا ہوگا۔ ہوسکتا ہے تم نے اس سے کہا ہو کہ پولیس کو تمہاری بیوی کی خودکشی پر شک ہوگیا ہے اور انہوں نے دوبارہ تفتیش شروع کردی ہے اور اس سلسلے میں تمہیں اس سے فوراً گفتگو کرنی ہے یا ہوسکتا ہے تم نے کوئی دوسرا بہانہ تراشا ہو۔ بہرحال تم اپنی کشتی میں رات گیارہ بجے جزیرے پر پہنچے۔ ادھر کیرول طے شدہ مقام پر گیارہ بجے پہنچ گئی اور پھر تم نے اسے قتل کرکے اس کی لاش میں پتھر وغیرہ باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا۔"

وارڈ اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا اور سگریٹ کے کش لیتے ہوئے قالین پر ٹہلنے لگا۔ "اب ہم اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کیرول کو دراصل قتل کس نے کیا ہے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے تمہارا قیاس درست ہو۔ میں نے اس رات کیرول سے خفیہ ملاقات کی ہو لیکن اس کمرے سے باہر میں کبھی یہ بات نہیں دہراؤں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کیرول ملاقات کے لیے تیرتی ہوئی میری کشتی تک پہنچی ہو اور جب اس نے اس بات کا مجھے پورا یقین دلادیا ہو کہ اس نے کسی سے بھی اس ملاقات کا ذکر نہیں کیا تو کیرول کے سر پر کوئی وزنی چیز گر پڑی ہو جس سے وہ بے ہوش ہوگئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعد میں کسی نامعلوم

طرح تھے پر میری کشتی کے لنگر کی آہنی زنجیر میں بری طرح پھنس گئی ہو اور زنجیر کے ساتھ سمندر میں گر گئی ہو اور ایک ہزار فٹ گہری سمندر کی تہ اس کی قبر بن گئی ہو۔ یہ سب باتیں ممکن تھیں ریٹا! اور تم یہ کہانی پولیس کو سنا سکتی ہو لیکن وہ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکیں گے مگر سوال یہ ہے کہ کیرول کا اصل قاتل کون ہے؟''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وارڈ خاموش ہو گیا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف پولیس سراغ رساں تھا جو نیچے انتظار گاہ سے میری خیریت دریافت کر رہا تھا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ میں اب تک تو ٹھیک ہوں۔ فون بند کر کے میں نے وارڈ کے عقب میں پوشیدہ ٹیپ ریکارڈر نکالا اور اسے بند کر کے اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔ ٹیپ ریکارڈر دیکھ کر وارڈ پیلا پڑ گیا۔

''فکر مت کرو وارڈ! اب ہمارے درمیان جو گفتگو ہو گی وہ خفیہ رہے گی۔ ویسے اس ٹیپ میں اب تک کی جتنی گفتگو موجود ہے وہ تمہیں قتل کے جرم میں پھانسی پر چڑھ جانے کے لیے کافی ہے۔ اگر تم اپنی بیوی کے قتل کا اعتراف نہیں کرو گے تو کیرول کے قتل کے جرم میں نہیں بچ سکتے۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے صاف صاف گفتگو کرنی چاہیے۔''

اس نے شکست خوردہ انداز میں ایک گہرا سانس لیا۔ ''بہت اچھا ریٹا! پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کیرول کی جس ڈائری کا ذکر کیا تھا، کیا واقعی ایسی کوئی ڈائری موجود ہے اور کیرول نے اس میں وہ واقعہ درج کیا ہے؟''

''اب مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں ایسی ڈائری کا وجود ہے اور وہ میرے پاس ہے جس میں کیرول نے اپنی تحریر میں پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ کیرول تو مر گئی ہے لیکن اس کی تحریر تینی شہادت کا درجہ اختیار کر گئی ہے جسے دنیا کی کوئی عدالت نہیں جھٹلا سکتی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم مجھے بتا رہے تھے کہ کیرول کا اصل قاتل کون ہے؟ میں اس کا نام جاننا پسند کروں گی۔''

''تم اس کی قاتل ہو ریٹا!'' اس نے جواب دیا۔

''اس سے زیادہ لغویات میں نے کبھی نہیں سنی۔ جس وقت کیرول کو قتل کیا گیا تھا اس وقت میں جائے وقوع سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تھی۔ میں بھلا اس کی قاتل کیسے ہو سکتی ہوں؟''

''بے شک تم نے کیرول کو اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا۔ یہ کام تم نے میرے ذریعے انجام دیا۔ ایک روز پہلے تم نے کیرول کے روپ میں میرے سامنے دو ایسے مطالبے پیش کیے جنہیں تسلیم کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرا مستقبل اور میری زندگی داؤ پر تھی۔ تم نے یہ حرکت اسی لیے کی تھی کہ میں مجبور ہو کر کیرول کو قتل کر دوں۔ یہی حرکت تم نے اس کے دوسرے دوستوں کے ساتھ بھی کی لیکن ان کا صرف مستقبل داؤ پر تھا، زندگی محفوظ تھی اس لیے کسی نے بھی کیرول کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ میرا معاملہ مختلف تھا۔ تم نے مجھے اسے ہلاک کرنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی بہن کی اصل قاتل تم ہو۔ میں تو صرف ایک آلۂ کار تھا۔''

''تم نے جو قیاس آرائی کی ہے وہ درست نظر آتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا ریٹا؟ تم کیوں اپنی بہن کو قتل کروانا چاہتی تھیں؟''

''میں اس سے نفرت کرتی تھی، شدید نفرت جس کے پیچھے حسد اور نفرت دونوں جذبے کارفرما تھے۔ جب بھی کوئی اچھی چیز میرے ہاتھ آئی، کیرول نے اسے خراب کر دیا یا تباہ کر دیا یا وہ چیز مجھ سے چھین لی۔''

''بس؟ بس یہی وجہ تھی؟''

''نہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ وہ بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک لڑکا تھا جس سے میں شدید محبت کرتی تھی۔ ایک رات وہ غیر متوقع طور پر ہمارے گھر آیا۔ اس روز میں ماں کے ساتھ فلم دیکھنے چلی گئی تھی۔ کیرول کو معلوم تھا کہ میں اس لڑکے سے شدید محبت کرتی ہوں۔ وہ محبت کرنے کے قابل تھا۔ اس کے باوجود کیرول نے ایک ظالمانہ مذاق کیا۔ اس نے خود کو ریٹا ظاہر کرتے ہوئے میری طرح شرم وحیا کا مظاہرہ کیا پر کچھ دیر بعد وہ اس سے کھل گئی اور اس کے ساتھ اس کے مکان پر چلی گئی۔ اس نے اپنی فطری کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو یہ راز کھل گیا کہ وہ میں نہیں تھی، کیرول تھی۔ وہ بہت شرمندہ ہوا لیکن اس کے بعد میں اسے نہیں پا سکی۔ کیرول نے اس سے شادی کر لی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس لڑکے سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس شادی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ وہ اسے مجھ سے چھیننا چاہتی تھی جس میں وہ کامیاب ہو گئی لیکن کچھ عرصے بعد وہ اس سے اکتا گئی اور اسے چھوڑ کر ہالی ووڈ بھاگ گئی۔ اس نے کیرول کے نام ایک خط لکھا۔ ایک چھوٹا سا طیارہ کرائے پر حاصل کیا اور اسے پہاڑ سے ٹکرا کر خودکشی کر لی۔''

کمرے میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ وارڈ ہیجان کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''کیرول کا جو حشر ہوا وہ اس کی مستحق

1971 To 1996

سلور جوبلی کے ساتھی

تھی اور تمہارا اندازہ درست ہو سکتا ہے۔ تم شوٹنگ [illegible] یہ حقیقت ہے کہ کیرول کی قاتل تم ہو لیکن اب تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے بارے [illegible] میں [illegible]۔ ٹھیک ہے نا؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "تم ذہین ہو مسٹر وارڈ۔ اس کارنامے پر تم سزا کے نہیں تمغے کے مستحق ہو۔ تمہیں سزا کون دلوا سکتا ہے؟ میں اور صرف میں کیونکہ پولیس کو نہ تو کیرول کی ڈائری کا علم ہے اور نہ اس ٹیپ کا جس میں ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو محفوظ ہے۔ میں دونوں چیزیں بینک کے لاکر میں رکھ دوں گی اور اپنے وکیل کو ہدایت کر دوں گی کہ اگر میری موت غیر فطری انداز میں واقع ہو تو دونوں چیزیں بینک لاکر سے نکال کر پولیس کے حوالے کر دے۔"

میرے ارادے بھانپ کر وارڈ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ "تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! آج سے میں تمہارا محافظ ہوں۔ میں تمہیں غیر فطری انداز میں مرنے نہیں دوں گا لیکن تم پولیس کو کیا جواب دو گی۔ وہ تم سے پوچھیں گے کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کا ٹیپ کہاں گیا۔ اگر تم نے پولیس کو کیرول کی ڈائری کے متعلق کچھ نہیں بتایا ہے جس کا مجھے یقین ہے تو اس ٹیپ ریکارڈر والے منصوبے کا ضرور ذکر کیا ہوگا۔ وہ تم سے ٹیپ کا مطالبہ کریں گے۔ تم کیا جواب دو گی؟ اس کے علاوہ میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے قانون سے بچانے کے عوض تمہارے کیا مطالبات ہیں؟ ظاہر ہے تم یہ کام میرے عشق سے مجبور ہو کر نہیں کر رہی ہو۔ تمہارا کوئی مقصد ہوگا؟"

"درست ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہارے سوالوں کا جواب دیتی ہوں۔ ٹیپ کے بارے میں مجھے پولیس سے یہ جھوٹ بولنا پڑے گا کہ جب میں نے تمہاری گفتگو محفوظ کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر چلایا تو اندر موجود کیسٹ ختم ہو گئی تھی جس کا مجھے غلطی احساس نہیں ہو سکا۔ تمہارے جانے کے بعد جب میں نے ٹیپ چلا کر گفتگو سننے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ کیسٹ ختم ہو چکی تھی اور اس میں ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں تھا پھر میں زبانی اس گفتگو کا احوال بیان کروں گی۔ ہمارے درمیان پہلے کیرول کے متعلق باتیں ہوئیں پھر تم نے میرے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھا، وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ تم نے میری شخصیت کے بارے میں ذرا بھی شک کا اظہار نہیں کیا لیکن پھر مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوئی جس نے تمہارے سامنے میری شخصیت بے نقاب کر دی۔ میں بہت نروس تھی اور سگریٹ کی طلب محسوس کر رہی تھی۔ میں نے گفتگو کے دوران لاشعوری طور پر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ تم مجھے سگریٹ پیتا دیکھ کر چونک گئے کیونکہ کیرول کبھی سگریٹ نہیں پیتی تھی۔ وہ کبھی شوقیہ بھی نہیں پیتی تھی جبکہ میرے پرس میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر موجود تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں تمباکو نوشی کی عادی ہوں۔ یہ دیکھ کر تمہیں شک ہو گیا اور تمہارے تابڑ توڑ سوالوں سے گھبرا کر مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ میں کیرول نہیں ہوں بلکہ اس کی ہم شکل جڑواں بہن ہوں۔ میرے اعتراف پر تم رنجیدہ ہو گئے۔ تمہیں کیرول سے قلبی لگاؤ تھا۔ تم نے کہا کہ اگر کیرول جلد ہی واپس نہیں آئی تو اسے مردہ تصور کرنا پڑے گا۔ تم نے یہ بھی بتایا کہ تم اپنی نئی فلم میں کیرول کو ہیروئن کا کردار دینا چاہتے تھے اور پھر تم نے مجھ سے سوال کیا کہ اگر کیرول واپس نہیں آئی تو کیا میں اس کی جگہ نئی فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کر سکوں گی؟"

"اور پھر.....؟"

"پھر میں نے کہا کہ مجھے بچپن ہی سے اداکاری کا شوق ہے اور میں کیرول سے بدرجہا بہتر اداکاری کر سکتی ہوں۔ اس پر مسٹر وارڈ نے فوراً مجھے اپنی نئی فلم میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کی۔ ہمارے درمیان معاہدے کی تفصیلات طے کی گئیں جو میرے لیے بہت اطمینان بخش تھیں اور پھر مسٹر وارڈ یہ کہہ کر چلے گئے کہ چند روز کے اندر اندر ان کا وکیل معاہدے کے کاغذات تیار کر دے گا جس پر مجھے دستخط کرنا ہوں گے۔ اس کے بعد میں ایک گہرا سانس لے کر سوچوں گی شاید کیرول زندہ ہو اور جلد ہی واپس آ جائے اور جب اسے اس معاہدے کا علم ہوگا تو وہ بہت خوش ہوگی۔ اس کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ ہالی ووڈ میں آ جاؤں لیکن میں نے اپنی فطری شرم کی وجہ سے ہمیشہ اس کی خواہش کو ٹال دیا تھا۔"

وارڈ بچتان میرے خاموش ہونے پر زور زور سے ہنسنے لگا۔ "تم کیرول سے زیادہ ذہین ہو اور مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں ایک بڑی اداکارہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا کیونکہ تم میں اداکاری کی صلاحیت موجود ہے۔"

میں نے اس پر ریوالور تان لیا۔ "ٹھیک ہے باس..... اب تم دفع ہو جاؤ اور معاہدے کے کاغذات جب تک تیار نہ ہوں مجھے اپنی صورت مت دکھانا اور یہی تمہارے دوسرے سوال کا جواب ہے۔ سمجھ گئے؟"

"یس مس۔" وارڈ نے ہنستے ہوئے کہا اور جانے کے لیے اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

✱✱✱

اسماء قادری

محض ظاہری جسامت میں مکمل لوگ اندر سے کتنے ادھورے ہوتے ہیں اس کا احساس ہمیں زندگی کے کئی مقام پر ہوتا رہتا ہے لیکن ہم ان نامکمل انسانوں کے اندر چھپے مضبوط حوصلوں اور عزم سے کس قدر ناواقف رہتے ہیں اس کا اندازہ اس خوب صورت تحریر کو پڑھ کر ہوگا جسے گولڈن جوبلی کے لیے خاص طور پر مصنفہ نے موضوع بنایا۔

مخالف سمت میں محوِ سفر مسافروں کے لیے ایک خوب صورت پیغام..... اگر کوئی سمجھے تو......

''پچاس برس..... پورے پچاس برس بیت گئے۔'' کیلنڈر کے سامنے کھڑے ہو کر ایک دائرہ لگی تاریخ کو دیکھتے ہوئے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ وہاں انہیں ایک قدرے بھدے نقوش اور سر کے بیشتر سفید بالوں والا ایک شخص کھڑا دکھائی دیا۔

''سفید بالوں کی تعداد عمر کے برسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔'' آئینے نے انہیں ٹوکا تو وہ دھیرے سے ہنس دیے۔

''تمہیں کیا خبر کہ ان پچاس برسوں کو میں نے کس جدوجہد میں بتایا ہے۔ میں تو اس لباس کی طرح ہوں جسے زندگی نے ضرورت سے زیادہ پہن کر شکن شکن کر دیا ہے۔
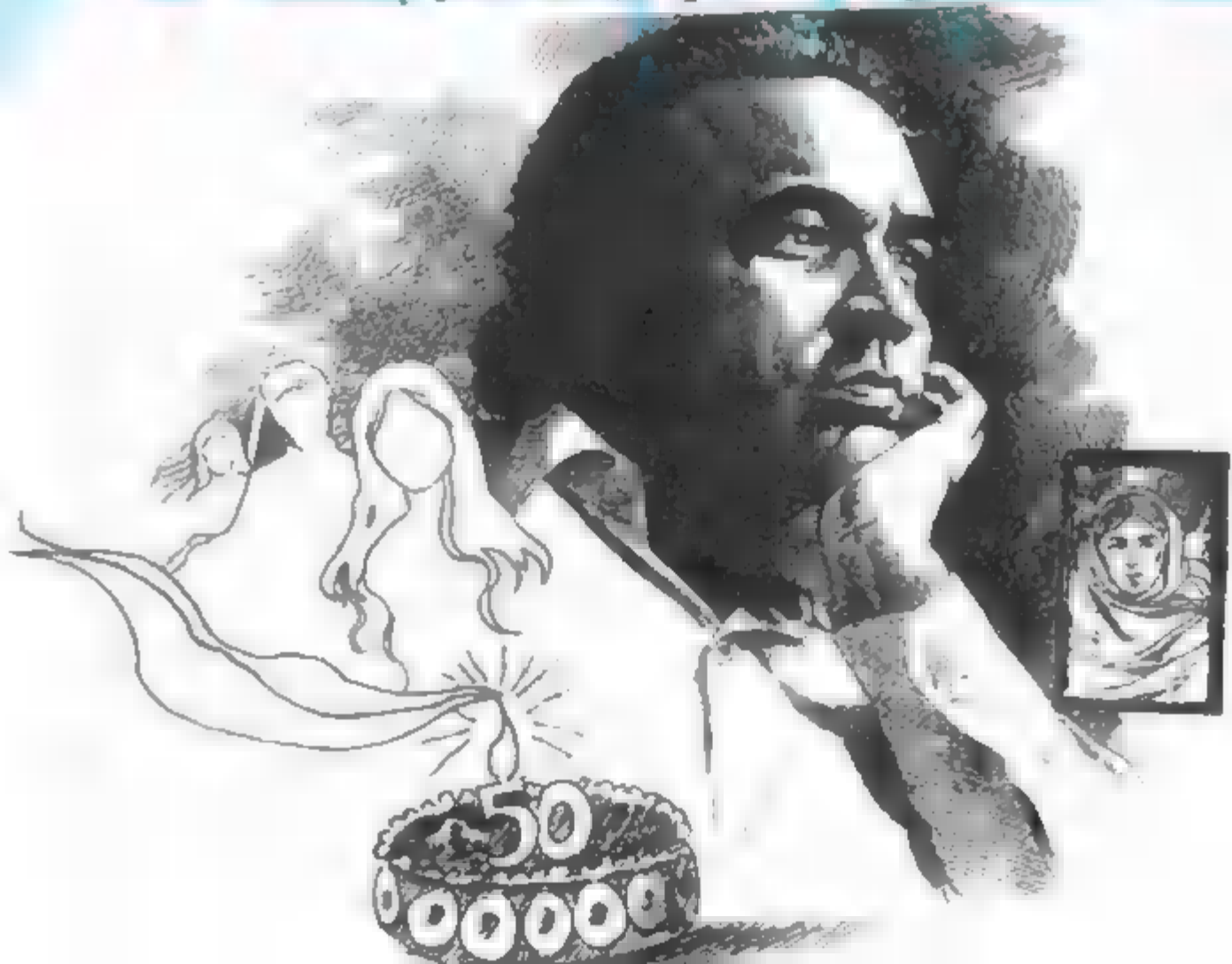
عمر کے بس دو چار برس ہی تو تھے جو بے فکری میں گزر گئے۔
اس کے بعد تو بس خوف، کرب اور آزمائشیں ہی تھیں جن
سے لڑتے لڑتے مجھے کبھی فرصت ہی نہیں ملی کہ کبھی تم سے
روبرو کھڑے ہو کر اپنے سفید بالوں کا شمار کر پاتا۔'' آئینے کو
جواب دیتے ہوئے ان کی نظریں خود بخود ہی فریم میں جڑی
ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر پر جا ٹھہریں۔

''اماں....'' انہوں نے سفید دوپٹے کے ہالے میں
جگمگاتے چہرے کو بے پناہ محبت سے دیکھتے ہوئے یوں پکارا
جیسے یقین ہو کہ وہ تصویر ان کی آواز سن سکتی ہے۔

''آپ نہ ہوتیں میری زندگی میں تو آج میں اس
آرام دہ گھر کے بجائے خس و خاشاک کی طرح اڑتا نہ
جانے وقت کی دھول میں کہاں کھو گیا ہوتا۔'' ماں سے باتیں
کرتے ہوئے وہ آئینے کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

''عمر کے جو دو چار برس میں نے بے فکری میں کاٹے
وہ بس آپ ہی کے مرہون منت تھے۔ بے فکری کے وہ چند
سال بھی مجھے اس لیے نصیب ہو گئے کہ آپ نے کسی بے
بال و پر چوزے کی طرح مجھے اپنی آغوش میں چھپائے رکھا
اور دنیا کے زہریلے تیروں کو میری طرف نہ آنے دیا۔'' اب
وہ تصویر کے فریم پر سے ان دیکھی گرد کو اپنے رومال سے
صاف کر رہے تھے۔ یہ فریم دن میں کئی بار اتنی باقاعدگی
سے پونچھا جاتا تھا کہ اس پر گرد جمع ہونے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا تھا۔

''بے شک عمر کے یہ پچاس برس کڑی مشقت میں
گزرے، پر اس لیے کامیابی سے گزر گئے کہ آپ کی تھپکی
ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے میرے ساتھ تھی۔''

ماں کی تصویر کو واپس اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے
انہوں نے برابر میں رکھے دوسرے فریم پر نظر ڈالی۔ یہاں
بائیس سالہ ثمرہ، انیس سالہ خیام اور چودہ سالہ سیف کے
چہرے جگمگا رہے تھے۔ ثمرہ اور خیام نے سیف کو دائیں اور
بائیں سے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ محبت
کے اس اظہار پر خوشی سے مسکراتا سیف معمول سے بھی
زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ ثمرہ اور خیام اسی کی طرح عام
سے نین نقش کے مالک تھے لیکن سیف کی خوبصورتی متوجہ
کر لینے والی تھی۔

''شاید اپنی ماں پر گیا ہے۔'' انہوں نے سیکڑوں بار
کی سوچی بات ایک بار پھر سوچی اور تصویر میں موجود سیف
کے چہرے کو انگلی کی پور سے چھوا۔ کبھی کبھی اس کی خوبصورتی
انہیں خائف بھی کر دیتی تھی۔ اب بھی انہوں نے اسے
''نظر بد'' سے بچانے کے لیے کچھ قرآنی آیات اور دعائیں
پڑھ کر تصویر پر پھونک ماری اور کمرے سے باہر نکل آئے۔

گھر میں حسب معمول صبح کا مخصوص سناٹا پھیلا ہوا
تھا۔ ان کے سونے کے دوران وہ تینوں معمول کی طرح
روانہ ہو چکے تھے اور معمول ہی کی طرح گھر صاف ستھرا اور
چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچن اریا کی طرف آ گئے۔

''آپ کے لیے سینڈوچز اور بغیر زردی کا آملیٹ
تیار کر کے ہاٹ پاٹ میں رکھ دیا ہے۔ تھرماس میں قہوہ
موجود ہے۔ اچھے بچوں کی طرح ناشتا کر کے اخبار کا مطالعہ
کریں اور اس کے بعد دوسرے تھرماس میں موجود فریش
جوس کے ساتھ دوا کھائیں۔ خبردار! فریج سے دور رہیے
گا۔ قریب گئے بھی تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نے اسے تالا
لگا دیا ہے۔'' مائکرو ویو پر چسپاں ثمرہ کے ہاتھ کا لکھا نوٹ
پڑھ کر وہ بے ساختہ ہی ہنس دیے۔

جب سے انہیں انجائنا کی تکلیف ہوئی تھی، تینوں بچے
ان کا حد سے زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔ اس تکلیف سے
قبل وہ صبح سویرے اٹھ کر خود بچوں کے لیے ناشتا تیار کرتے
تھے لیکن اب انہیں اتنی صبح وہ بھی خصوصاً سردی کے موسم میں
بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اور وہ تینوں ان
کے سونے کے دوران ہی خاموشی سے سارے کام نمٹا کر گھر
سے نکل جاتے تھے۔ جانے سے قبل ثمرہ ہر روز اسی طرح
ناشتا تیار کر کے رکھ جاتی تھی اور اگر کچھ کہنا ہوتا تو ایک ہدایتی
نوٹ مائکرو ویو پر چسپاں ہو جاتا تھا۔

''نوٹ: اگر چاہیں تو دس بجے کے بعد اس ناک میں
بولنے والی میزبان کا مارننگ شو دیکھ لیں۔ امید ہے آپ کو
اچھا لگے گا۔'' مائکرو ویو پر چسپاں نوٹ کے آخر میں لکھا یہ
جملہ ثمرہ کی طرف سے بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش
کے باوجود انہیں قابل توجہ محسوس ہوا۔ اگر اس کی اہمیت نہ
ہوتی تو وہ جملہ وہاں لکھا ہی نہیں جاتا۔

انہوں نے ثمرہ کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرتے
ہوئے ناشتا، اخبار اور پھر جوس مع میڈیسن نمٹایا اور لاؤنج
میں آ کر ٹی وی کا ریموٹ سنبھال لیا۔ مارننگ شو میں کمرشل
بریک کا وقت تھا۔ بریک ختم ہونے سے قبل ہی فون کی گھنٹی
بجنے لگی۔

''ہیلو!'' انہوں نے قدرے بیزاری سے ریسیور اٹھایا۔

''السلام علیکم کاکا! اختر بات کر رہا ہوں۔'' دوسری
طرف ان کا سب سے خاص بندہ موجود تھا۔

''خیریت ہے اختر! صبح صبح کیوں کال کی ہے؟''

انہیں قدرے تشویش ہوئی۔

"خیریت ہی ہے کاکا! بس آپ کو یہ بتانا تھا کہ آج کوئی آرڈر نہیں ہے اس لیے آپ کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج گھر پر ہی رہ کر آرام کریں۔" اختر کی دی گئی اطلاع ان کے لیے باعث حیرت تھی۔

"کیا کہا، کوئی آرڈر نہیں ہے؟ ابھی تو شادیوں کا سیزن چل رہا ہے۔ اس سیزن میں کیسے ہمارے پاس آرڈر نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں کاکا! کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ آپ ٹینشن نہ لیں اور سکون سے گھر پر آرام کریں۔ میں شام میں آپ کی طرف چکر لگاؤں گا۔" اختر کو جیسے پروا ہی نہیں تھی۔

"کوئی آرڈر نہیں ہے۔ کمال ہے! شادی بیاہ نہ سہی، کسی عقیقے، آمین یا سالگرہ کا چھوٹا موٹا آرڈر ہی مل جاتا ہے۔ اس گدھے اختر کو دیکھو، مجھے پہلے بتایا تک نہیں۔" وہ جھنجلاہٹ محسوس کر رہے تھے اور موڈ بھی قدرے آف ہو گیا تھا لیکن پھر ٹاک میں بولنے والی مارننگ شو کی میزبان کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ ثمرہ کا نام پکار رہی تھی۔ انہوں نے مڑ کر ٹی وی کی طرف دیکھا تو تالیوں کی گونج میں ثمرہ کو اسٹیج پر آتے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ اسٹیج پر پہلے سے موجود ایک ٹی وی ایکٹریس اور مشہور سماجی کارکن اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ثمرہ کا استقبال کر رہے تھے۔ ثمرہ نے نہایت وقار سے ان دونوں سے باری باری مصافحہ کیا اور ایک صوفے پر براجمان ہو گئی۔ اب وہ مسکراتے ہوئے وہ تعارفی کلمات سن رہی تھی جن کے ذریعے میزبان اس کے بارے میں معلومات ناظرین کو منتقل کر رہی تھی۔

"ثمرہ اس معاشرے کے لیے ایک بہترین مثال ہیں۔ انہوں نے جن نامساعد حالات میں جدوجہد کر کے کامیابی حاصل کی، اس کے لیے ان کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ میں نہایت مسرت سے اپنے دیکھنے والوں کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہوں کہ اب ہر پیر اور بدھ کی شام پانچ بجے ثمرہ ہمارے چینل پر ایک کوکنگ شو کریں گی اور آپ کو مزے مزے کے یونیک کھانے بنانا سکھائیں گی، تو پلیز یہ شو ضرور دیکھیے گا اور ثمرہ کو یہ شو دے کر ہمارے چینل نے جو ایک اچھا قدم اٹھایا ہے، اس کی اور ثمرہ کے فن کی حوصلہ افزائی ضرور کیجیے گا۔"

ٹاک میں بولنے والی وہ میزبان جس کی آواز ثمرہ کو کبھی پسند نہیں رہی تھی، اس کے لیے اتنے خلوص اور جوش سے بول رہی تھی کہ ہال میں موجود لوگوں کے ہاتھ تالیاں پیٹ پیٹ کر سرخ ہو گئے تھے۔ ایسے وقت میں کیمرا مین نے ثمرہ کے چہرے کو فوکس کیا اور انہوں نے ٹی وی اسکرین پر اس کی آنکھوں میں موجود وہ نمی دیکھی جو خوشی کی انتہا پر نمودار ہو جاتی ہے۔ اس پل خود ان کی اپنی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

"اچھا ثمرہ! ایک بات تو بتایئے۔ جیسا کہ ہم نے سنا ہے اور عموماً دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ ہر کامیاب انسان کی کامیابی کے پیچھے کسی دوسرے انسان کا ہاتھ ہوتا ہے تو آپ کی کامیابی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"

"جی نہیں۔ میری کامیابی کے پیچھے کسی انسان کا ہاتھ نہیں ہے۔" وہ جو اس سوال کے جواب میں ثمرہ کے ہونٹوں سے اپنا نام ادا ہونے کا یقین رکھتے تھے، اس کے جواب پر ساکت رہ گئے۔

"میری کامیابی کے پیچھے تو ایک فرشتے کا ہاتھ ہے۔ میرے کاکا میرے لیے کسی مہربان فرشتے سے کم نہیں ہیں۔ ایک ایسی بچی جسے اس کی سگی ماں کی آغوش میں پناہ نہیں مل سکی تھی، اگر آج آپ کے سامنے پورے قد سے کھڑی ہے تو بس یہ میرے فرشتہ صفت کاکا کی مہربانی ہے جو میرے لیے ماں اور باپ دونوں ہیں۔" ثمرہ کے جملے نے اگر انہیں سکتے میں مبتلا کیا تھا تو اس دوسری بات نے ایسی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا جو سکتے سے بھی شاید کئی قدم آگے کی تھی۔ بولتے ہوئے ثمرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو وہ بھی اس کیفیت سے باہر آئے اور زاروقطار رونے لگے۔ مارننگ شو کے اس دوسرے ہاف میں خوبصورت ٹی وی ایکٹریس اور مشہور سماجی کارکن کی موجودگی کے باوجود بس ثمرہ ہی چھائی رہی۔ اس کی باتوں نے جتنے لوگوں کو تالیاں بجانے پر مجبور کیا تو کہیں ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ خود اس پروگرام کو دیکھتے ہوئے کئی بار بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن اس رونے میں غم سے زیادہ خوشی کے جذبات شامل تھے۔

پچاس برس..... زندگی کے پورے پچاس برس گزار کر انہیں وہ خوشی ملی تھی جس نے اس طویل سفر کی صعوبتوں کو ماند کر دیا تھا۔

☆☆☆

"جیک مائی سن۔" ہنری نے بے حد تشویش کے ساتھ روتے بلکتے بیٹے کو اپنی باہوں میں لیا۔

"کیا بات ہے! تم کیوں رو رہے ہو؟" وہ اس کے رخساروں پر بہتے آنسو ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے بہت پیار سے دریافت کر رہا تھا۔

"میں اب کبھی اسکول نہیں جاؤں گا۔ وہ جگہ میرے

لیے نہیں ہے۔" جیک نے ہچکیوں کے درمیان باپ سے کہا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے! تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟" ہنری کو جھٹکا لگا۔

"وہاں سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے لیے میں ایک تماشا ہوں۔" وہ اب بھی سسکیاں لے رہا تھا۔

"تم دوسروں کی ذرا سی باتوں کی وجہ سے اپنی زندگی تباہ کرلوگے، نان سینس۔" ہنری نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اپنے سامنے کھڑا کیا اور اس کے دونوں شانے تھام کر جھنجوڑتے ہوئے غصے سے بولا۔

"وہ ذرا سی باتیں نہیں ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ وہاں میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔" وہ خفگی سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ وہ ذرا سی باتیں نہیں ہیں۔ بہت بڑی بڑی باتیں ہیں۔ تو کیا وہ اتنی بڑی ہیں کہ تم انہیں اپنے لیے چرچ سے بھی بڑھ کر بڑا سمجھتے ہو؟" ہنری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پوچھا۔

"میں ان جیسا نہیں ہوں ڈیڈ! میں ان کے درمیان عجوبہ ہوں۔" وہ جز بز سا ہوا۔

"ٹھیک ہے تم ان سے تھوڑے سے مختلف ہو لیکن اتنے زیادہ بھی نہیں۔ ان کی طرح تمہارے پاس بھی دو ہاتھ، دو ہیں۔ تم دیکھ سکتے ہو، سن سکتے ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمہارا دماغ پوری طرح کام کرتا ہے۔ اتنی ساری خوبیوں کے ہوتے ہوئے صرف ایک فرق کی بنیاد پر تم یہ کیسے سوچ سکتے ہو کہ تم ان کی طرح تعلیم حاصل نہیں کرسکتے۔"

"میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ! مجھے پڑھنا اچھا لگتا ہے لیکن میں ان کے طنز و تضحیک میں ڈوبی ہوئی باتیں نہیں سننا چاہتا۔" وہ باپ کی باتیں سن کر کچھ پسپا سا ہوگیا تھا اور رونا بھول کر اپنے احساسات کو بیان کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"زندگی میں ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں۔ زندگی کو ہمیں اسی صورت میں قبول کرنا پڑتا ہے جس صورت میں یہ ہمیں ملی ہے۔ ہاں ہم اپنی کوشش اور محنت سے اس زندگی کو بہتر اور بہترین بنا سکتے ہیں۔ تمہیں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو آنے والا کل تمہارے لیے اور بھی زیادہ مشکل ہوگا۔ آج میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہیں زندہ رہنے کی سہولیات فراہم کررہا ہوں۔ آنے والے کل میں ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں اپنی زندگی خود جینی ہوگی اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ تم آج خود کو مضبوط کرلو۔" ہنری نے اس کی دلیل کو رد کردیا۔

"ان کی باتوں سے میرا دل بہت دکھتا ہے ڈیڈ!" اس کے چہرے پر دنیا بھر کی اداسی چھا گئی۔ ہنری نے اپنے دل میں شدید کرب محسوس کیا لیکن اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہ آنے دیا اور سخت لہجے میں بولا۔

"دل دکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی خراب کرلو۔ خدا نے تمہیں اس دنیا میں بھیجا ہے تو تم پر وہ سارے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جو انسانوں کی تخلیق کا مقصد ہیں۔ تم اپنے حصے کے فرائض ادا کرتے رہو۔ ایک دن دنیا تمہیں تمہارے حقوق دینے پر بھی مجبور ہوجائے گی۔ اس روز تم دل کی خوشی بھی حاصل کرلوگے۔" ہنری کا انداز دوٹوک تھا۔

"لیکن ڈیڈ......"

"کوئی لیکن ویکن نہیں ... یہ دنیا تمہارے سامنے ہے۔ جاؤ اور اسے تسخیر کرکے اپنے حصے کی کامیابی سمیٹ لو۔ یاد رکھنا دنیا صرف کامیاب لوگوں کے لیے ہے۔ اگر تم اس کے لیے کوشش کرنے کے بجائے ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش کروگے تو پستی میں گرجاؤ گے۔" ہنری اسے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"لوگوں کی فضول باتوں کے لیے اپنے کان بند کرلو اور صرف اپنی آنکھیں کھلی رکھو تاکہ دیکھ سکو کہ تمہاری منزل تم سے کتنی دور ہے اور تمہیں اس تک پہنچنے کے لیے کتنی قوت سے دوڑنا ہے۔" اس نے لہجے کو نرم کیے بغیر جیک کو ایک اور نصیحت کی۔ وہ باپ تھا۔ اس کا دکھ پوری طرح محسوس کرسکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ خود اس کی طرف سے کسی دکھ یا افسوس کا اظہار جیک کو مزید کمزور کردے گا۔ وہ اپنی اکلوتی اولاد کو ایک کمزور فرد کے بجائے کامیاب شخصیت کے طور پر دیکھنا چاہتا تھا اس لیے دکھ کو آنسو بن کر آنکھوں میں نہ آنے دیا۔

☆☆☆

"لکھو...... اللہ نے سارے انسانوں کو برابر بنایا ہے۔ اس کے نزدیک کالے گورے، عربی عجمی، امیر غریب کسی میں کوئی فرق نہیں......" شاہدہ پتیلی میں ڈوئی چلانے کے ساتھ ساتھ باورچی خانے میں ہی ایک چوکی پر بیٹھی شمی کو املا لکھوانے میں مصروف تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے اپنا جملہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

"یہ کون آگیا اس وقت؟" پتیلی میں پانی ختم ہوچکا تھا اور اب وہ گوشت کی بھنائی کرنے لگی تھی اس لیے دستک کی آواز پر کوفت سی محسوس کی۔

"میں جاکر دیکھوں امی......!" نو سالہ شمی نے چپل

کاپی کے درمیان میں رکھ کر اسے بند کرتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں، تُو ادھر ہی بیٹھ۔ میں دیکھتی ہوں۔'' دستک دوبارہ ابھری تھی اور ساتھ ہی دستک دینے والے نے آواز بھی لگائی تھی چنانچہ شاہدہ نے فوراً ہی سمٹا کر چولہا بند کیا اور اسے سختی سے منع کر کے خود لشتم پشتم دروازے کی طرف لپکی۔
''سلام باجی!'' سامنے وہ دانت نکالے کھڑی تھی۔ شاہدہ کو دیکھتے ہی پورے جوش و خروش سے سلام جھاڑا۔
''وعلیکم!'' شاہدہ نے سلام کا پورا جواب دینا بھی گوارا نہ کیا اور دوپٹے کے پلو سے بندھا پانچ کا نوٹ گرہ کھول کر نکالتے ہی اس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔
''رب بھلی کرے باجی! تسی وڈے تھی دل والے ہو، پر وہ کب دو گے جو مجھے چاہیے۔'' اس نے اپنا دسویں بار کا کیا مطالبہ ایک بار پھر دہرایا۔
''ہٹ، دفع ہو۔ پرے مر۔'' شاہدہ اتنے تیز مزاج کی عورت نہیں تھی لیکن اس مطالبے پر خود پر قابو رکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔
''غصہ کیوں کرتی ہو باجی! تمہارے بھلے کی ہی بات کرتی ہوں۔'' وہ بھی ایک ڈھیٹ تھی۔ مجال ہے جو شاہدہ کے غصے کا ذرا بھی اثر لیا ہو۔
''زیادہ بکواس نہ کر۔ سب پتا ہے مجھے کہ تجھے میرے بھلے کی کتنی فکر ہے۔ یہ کیوں نہیں بولتی کہ تیرا اپنا مطلب ہے۔'' شاہدہ نے غصے سے جواب دیا۔ اگر وہ دروازے کی چوکھٹ میں اپنا ہاتھ رکھے نہ کھڑی ہوتی تو وہ اس سے اتنی بات کرنے کے بجائے اب تک دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی ہوتی۔
''چلو یہی سمجھ لو، پر اپنی مشکل تو آسان کرو۔ بعد کو پچھتاؤ گی کہ میری گل کیوں نہ مانی تھی۔'' وہ یونہی اپنی بات کے درمیان میں کہیں کہیں پنجابی کا تڑکا لگایا کرتی تھی لیکن جب آتی تھی، شاہدہ کا دل ادھیڑ کر رکھ دیتی تھی۔
''خدا تجھے غارت کرے، کلموہی! پچھتائیں تیرے ہوتے سوتے۔'' اس بار شاہدہ کا ضبط بالکل ہی جواب دے گیا اور اس نے اس کا ہاتھ زخمی ہونے کی پروا کیے بغیر دروازہ دھڑ سے بند کیا۔
''رب راکھا باجی! ابھی تسی غصے میں ہو۔ میں فیر آؤں گی۔'' اس نے پھرتی کا مظاہرہ کر کے اپنے ہاتھ کو دروازے کے بیچ میں آ کر زخمی ہونے سے بچالیا تھا لیکن بند دروازے کے پیچھے سے ہانک لگا کر جاتی گئی تھی۔
''کم بخت نے جینا حرام کر دیا ہے۔ اب آئے تو کبھی

اخلاقی جرأت

نیویارک یونیورسٹی کے فلسفے کے 70 سالہ پروفیسر سڈنی ہک نے 45 سال پڑھانے کے بعد آخری لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ وہ آج اپنا ایک اصول توڑ دیں گے اور خود اپنے فلسفے کی وضاحت کریں گے۔ ''گو ذہانت کا کوئی متبادل نہیں ہے لیکن ذہانت بذات خود کافی نہیں ہے۔'' ہک نے کہا۔ ''ایسے بھی انسان ہیں جن میں ذہانت بدرجہ اتم موجود ہے مگر اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ ذہانت سے فائدہ اٹھاسکیں جبکہ ذہانت کے بغیر اخلاقی جرأت بہت خطرناک ہوتی ہے۔ وہ جنون کی طرف لے جاتی ہے...... تعلیم کا فرض ہے کہ وہ ذہانت اور جرأت دونوں کی نشوونما کرے۔''

مرسلہ: زبیدہ خان، لیہ

دروازہ ہی نہیں کھولوں گی۔'' بڑبڑاتے ہوئے اندر کا رخ کرتی شاہدہ نے اپنا کئی بار کا عزم دہرایا۔ یہ وہ ارادہ تھا جس پر وہ کبھی عمل نہیں کر سکی تھی کیونکہ فطری طور پر اسے اس سے ہمدردی تھی اور اس کے دل کو کبھی گوارا نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے در سے خالی ہاتھ لوٹا دے۔
''امی......'' اپنے آپ سے الجھتی وہ شمیم عرف شمی کی پکار پر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ کاپی سینے سے لگائے کچھ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔
''باقی پڑھائی کل کریں گے شمی۔ تُو ایسا کر، ذرا آٹا تو گوندھ دے۔ میں ذرا کمر سیدھی کر لوں، پھر روٹی ڈال دوں گی۔'' شاہدہ کو اس وقت تکیے میں منہ دے کر آنسو بہانے کی شدت سے خواہش ہو رہی تھی اس لیے بہانہ بنایا۔
''آپ تھک گئی ہیں امی تو تھوڑی دیر سو جائیں۔ میں روٹیاں بنا دوں گی اور گوشت بھی بھون دوں گی۔'' شمی نے پورے خلوص سے پیشکش کی۔ نو سال کی عمر میں وہ روٹیاں بنانے سے لے کر باورچی خانے کے دوسرے چھوٹے موٹے کام خاصی مشاقی سے کر لیتی تھی اور ایسا شاہدہ کی سخت تربیت کی وجہ سے تھا۔ وہ شمی سے جتنی محبت کرتی تھی، کام لینے کے معاملے میں اتنی ہی بے مروت اور سخت تھی۔ اگر شمی کو اس کی محبت کا یقین نہیں ہوتا تو اس کی سختی کے باعث

اسے سوتیلی ماں سمجھنے لگتی، لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اس کی سگی ماں تھی جب ہی تو اس پر اتنی سختی کرتی تھی۔

☆☆☆

''آج اس وقت کیسے آن لائن ہو؟'' کیٹ نے اپنی سنہری لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے دوڑ کر سیڑھیوں کی طرف جاتے اپنے دو سالہ بیٹے کو پکڑا اور ایک کرسی پر بٹھا کر اسے بیلٹ سے جکڑ دیا۔

''آج کوئی آرڈر نہیں تھا تو میں گھر پر ہی رک گیا، پھر سوچا تمہیں تھینکس بول دوں۔ تم نے برتھ ڈے وشز کا جو خوبصورت پیغام بھیجا تھا اس نے صبح صبح میرا موڈ بہت اچھا کر دیا۔ تمہارا ابھی آج آف ہے نا؟'' وہ اتنی باقاعدگی سے ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے کے معمولات کے بارے میں پوری خبر ہوتی تھی۔

''تم ان وشز کے لیے ڈیزرو کرتے ہو۔ یقیناً تمہارے بچوں نے بھی آج کے دن تمہارے لیے اپنے بہترین جذبات کا مظاہرہ کیا ہوگا۔'' وہ اپنے بیٹے کو چمچ کی مدد سے پیالے میں موجود کوئی شے کھلانے میں مصروف تھی اس لیے ویڈیو کیم آن ہونے کے باوجود اپنی بات کے جواب میں ان کے چہرے کی متغیر ہو جانے والی رنگت نہ دیکھ سکی۔ وہ اپنا رخ کیمرے کی طرف کرتی، اس سے قبل ہی وہ خود پر قابو پا چکے تھے اور اب بہت عام سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''بچوں کی لائف بہت بزی ہے کیٹ! انہیں اپنی ٹف روٹین میں شاید یاد بھی نہیں رہا کہ آج میری سالگرہ ہے اور مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور میری ہر توقع پر پورا اتر رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے آج ثمرہ ایک مارننگ شو میں مدعو تھی۔ اسے اس چینل پر ایک مستقل کلنک شامل کیا ہے۔ وہ بہت خوش تھی اور اس نے سب کے سامنے کہا کہ میری اس کامیابی کے پیچھے میرے کاکا کا ہاتھ ہے۔'' وہ خوشی خوشی کیٹ کو شو کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔ اس پچاس سالہ زندگی میں اللہ نے انہیں جن نعمتوں سے نوازا تھا ان میں سے ایک نعمت کیٹ سے دوستی بھی تھی۔ دو سال قبل سوشل میڈیا کے ذریعے پروان چڑھنے والی یہ دوستی اب اس نہج پر تھی کہ وہ دونوں بلاتکلف خود کو ایک دوسرے کا بیسٹ فرینڈ قرار دے سکتے تھے۔ چونتیس سالہ کیٹ ایک ماہر نفسیات تھی اور جتنی اچھی ڈاکٹر تھی، اس سے بڑھ کر اچھی انسان بھی تھی۔ کیٹ کی انسان دوستی اور ذہانت نے انہیں ہمیشہ متاثر کیا تھا۔ یہ اس کی ذہانت اور انسانوں سے زیادہ سے زیادہ جڑے رہنے کی خواہش ہی تھی کہ اس نے اپنی مادری زبان کے علاوہ بھی کئی زبانیں سیکھ رکھی تھیں۔ ان سے وہ ہمیشہ اردو میں ہی بات کرتی تھی۔

''بہت مبارک ہو دوست! تمہارے باغ کا ایک پودا تو تناور درخت بننے کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ تم نے جس توجہ سے ان کی آبیاری کی ہے، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ہر ایک کامیابی کے آسمان کو چھوئے گا۔'' کیٹ نے اسے سراہتے ہوئے اپنے بیٹے کے گال کو آہستہ سے چھوا۔ سنہری بالوں والا یہ بچہ اس سے خاصی مشابہت رکھتا تھا اور اسے دیکھتے ہی کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔

''آمین...... اللہ نے چاہا تو تم بھی اپنے جیک کی بہت سی خوشیاں دیکھو گی۔'' انہوں نے تو کبھی دشمن کا بھی برا نہ چاہا تھا پھر دور بیٹھی اس کی دوست کو کیسے دعا نہ دیتے جس کا ہونا ایک نعمت کے طور پر شمار کرتے تھے۔

''اس دعا کے بدلے تو تم مجھ سے میری ساری دولت لے سکتے ہو۔ پتا ہے اینڈریو کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے تم جیک سے اتنی محبت کرتی ہو کہ کبھی کبھی میں اس سے جیلس ہونے لگتا ہوں۔'' کیٹ نے ان کی دعا پر بے ساختہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے لائف پارٹنر کے بارے میں بتایا۔

''تم اینڈریو سے کہو کہ محبت کے علاوہ یہ پیارا بچہ کسی دوسرے جذبے کو ڈیزرو نہیں کرتا۔'' وہ بے ساختہ ہی بولے۔

''وہ بھی جیک سے بہت محبت کرتا ہے لیکن بس کبھی کبھی مجھے چھیڑنے کے لیے ایسی باتیں کرنے لگتا ہے۔'' وہ مسکرا کر بتاتے ہوئے نیپکن سے جیک کا منہ صاف کرنے لگی۔

''اچھا اب اجازت دو۔ مجھے لگتا ہے کہ سیف اسکول سے واپس آ گیا ہے۔'' انہوں نے بیرونی گیٹ کے کھلنے کی آواز سنی تو فوراً کیٹ سے رخصت لے لی اور کمرے سے باہر نکلے۔ حسب توقع سیف ہی تھا۔

''السلام علیکم کاکا!'' اس نے انہیں سلام کیا اور سیدھے کچن میں جا کر ہاٹ پاٹ میں کچھ رکھنے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ انہیں لگا کہ سیف کا موڈ کچھ خراب ہے لیکن فوری طور پر اس کے پیچھے جانے کے بجائے وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں وہ تازہ دم ہو کر گھر کے آرام دہ کپڑوں میں نمودار ہوا۔

''میں چپاتیاں لے کر آیا ہوں۔ آپ ہاتھ دھو کر ٹیبل پر آ جائیں۔ میں سالن گرم کر کے کھانا لگاتا ہوں۔'' وہ اب بھی کچھ ڈسٹرب لگ رہا تھا لیکن اس فرض کو نہیں بھولا تھا جو

یقیناً ثمرہ اس کے ذمے لگا کر گئی تھی۔ روزانہ وہ اس وقت اپنے پکوان سینٹر پر ہوتے تھے اور اختر ان کے کھانے کا انتظام کرتا تھا لیکن آج وہ گھر پر تھے تو بھی ان کے لیے انتظام موجود تھا۔ انہیں بے ساختہ ہی اپنے بچوں پر ڈھیروں پیار آیا اور وہ تھوڑی سی اداسی جو ان میں سے کسی کی طرف سے برتھ ڈے وش نہ کرنے پر غیر اختیاری طور پر دل میں محسوس کررہے تھے، وہ بھی دور ہونے لگی۔ ایک برتھ ڈے وش نہ کرنے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ اصل اہمیت تو اس خیال اور فکر کی تھی جو ان کے بچے ڈھیروں کے حساب سے کرتے تھے۔

گرم گرم چپاتیاں، مکس سبزی کا سالن جس میں تیل اور نمک کا استعمال بہت احتیاط سے کیا گیا تھا اور بغیر ملائی کے دہی میں تیار کردہ لوکی کا رائتہ...... کھانا سادہ تھا لیکن انہیں بہت مزے کا لگا کہ بڑے خلوص سے تیار کیا گیا تھا۔ سیف بھی ان کے ساتھ ہی کھانا کھا رہا تھا۔

"تو فریج کی چابی تمہارے پاس تھی؟" انہوں نے سیف کی خاموشی کو محسوس کیا اور اسے بولنے کے لیے اکسانے کو گفتگو چھیڑی۔

"ثمرہ نے دی تھی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ثمرہ نے تمہیں بتایا تھا کہ آج وہ کسی مارننگ شو میں شریک ہونے والی ہے؟" انہوں نے دوسرا موضوع چھیڑا۔

"جی!" اس بار جواب پہلے سے بھی مختصر تھا۔

"پرابلم کیا ہے؟" اس بار انہوں نے براہ راست سوال کیا۔

"جی......؟" وہ چونک گیا۔

"موڈ کیوں خراب ہے؟ اسکول میں کوئی مسئلہ ہوا ہے؟" انہوں نے تھوڑا سا رائتہ اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے سوال کو مزید واضح کیا۔ سیف جواب میں خاموش رہا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات مزید بگڑ گئے۔

"مطلب...... اسکول میں ہی کچھ ہوا ہے۔ اب فوراً بتادو کہ کیا ہوا ہے؟" انہوں نے حکمیہ انداز اختیار کیا۔

"اسکول کا سالانہ فنکشن ہونے والا ہے۔ اس میں ہماری کلاس "انارکلی" ڈراما پرفارم کرے گی۔ آج ڈرامے کی کاسٹ سلیکٹ کی جارہی تھی۔ سر نوید نے انارکلی کے رول کے لیے میرا نام پیش کردیا۔" اس نے آخری جملہ ادا کرتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔

"تو......؟" انہوں نے اسے گھورا۔

"آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے؟" سیف جھنجلایا۔

"واقعی...... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس میں کیا مسئلہ ہے۔ تمہارا بوائز اسکول ہے اور انارکلی کے رول کے لیے کلاس کے لڑکوں میں سے ہی کسی کو منتخب کیا جانا تھا۔ سر نوید کو تم موزوں لگے، اس لیے انہوں نے تمہارا نام تجویز کردیا۔ یقیناً کلاس کے دوسرے کئی لڑکے بھی فی میل کیریکٹرز پرفارم کررہے ہوں گے تو تمہیں کیا ایشو ہے؟" وہ اب کھانے کا سلسلہ روک کر اسے براہ راست دیکھ رہے تھے۔

"آپ نہیں سمجھیں گے کاکا! میں نہیں کرنا چاہتا یہ رول۔" وہ اب بھی جھنجلایا ہوا تھا۔

"تم نہیں کرنا چاہتے تو انکار کردو۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے لیکن یہ مت کہو کہ میں نہیں سمجھوں گا۔ میں نے اس دنیا میں پچاس برس گزارے ہیں اور میں اس کے ہر انداز کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" ان کی سنجیدگی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ دنیا انسان کو بہت ٹھوکریں لگاتی ہے اور طنز کے پتھر برسا برسا کر زخمی کرنے کا ہنر بھی اسے خوب آتا ہے لیکن کیا میں نے تم تینوں کو یہ بات نہیں سکھائی تھی کہ ہر طرف سے کان بند کرکے صرف اپنی منزل پر نگاہ رکھو۔ اگر تم ذرا ذرا سی باتوں کو دل پر لے کر اپنا موڈ خراب کرلوگے تو اس کا صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ تمہاری کارکردگی خراب ہوجائے گی لیکن دنیا پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ دنیا پر اثر صرف اس صورت میں پڑے گا کہ تم خود کو منفرد کرو اور اسے کامیاب ہوکر دکھاؤ۔ تمہارا کامیاب ہونا لوگوں کی سوچ بدلنے کا سبب بنے گا اور تمہارے جیسے دوسرے بچوں کو بہتر زندگی گزارنے کے مواقع میسر آسکیں گے۔ کیا تم ایک ناکارہ انسان کے بجائے دوسروں کے لیے آسانیاں بانٹنے والے نہیں بننا چاہتے؟" انہوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

"میں بننا چاہتا ہوں کاکا! لیکن میں اتنا مضبوط نہیں ہوں۔" سیف شرمندہ سا ہوگیا۔

"اپنی خواہش کو اپنا مقصدِ حیات بنالوگے تو مضبوطی خودبخود آجائے گی۔ میں، ثمرہ، خیام...... ہم سب ہیں تمہاری راہنمائی کے لیے۔ کوئی مسئلہ ہو تو ہم سے آکر کہہ دیا کرو لیکن ذہن پر بیکار بوجھ لے کر خود کو تباہ کرنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ جو یہ غلطی کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔" وہ بہت دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ ان کے سمجھانے کا سیف پر بہت مثبت اثر پڑا۔ وہ اس کے پاس

سے اٹھ کر دوبارہ اپنے کمرے میں آئے تو ایک گہری اداسی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گو کہ آج وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھے اور بجا طور پر ایک کامیاب انسان کہلانے کے حقدار بھی تھے لیکن یہ سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں ہو گیا تھا۔ عمر کے پچاس برسوں کے اس سفر میں ان کی روح پر بے شمار زخم لگے تھے اور یہ زخم آج بھی کبھی کبھی تکلیف دینے لگتے تھے۔ اس وقت بھی وہ خود کو ایک شدید کرب میں محسوس کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیف جو کہ انہیں ان تینوں بچوں میں سب سے زیادہ عزیز تھا، کوشش کے باوجود ان زخموں سے نہیں بچ سکے گا جو زمانے کے ہاتھوں اسے لگیں گے۔

☆☆☆

”ڈیڈ....“ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے کمرے میں موجود بستر پر لیٹے اس شخص کو دیکھ کر کیٹ کے لیے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا ممکن نہ رہا اور وہ ان کا ہاتھ تھام کر رو پڑی۔ اس کے ساتھ موجود اینڈریو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”اچھی ماہر نفسیات ہو۔ مریض کے سامنے مسکرا کر اس کا حوصلہ بڑھانے کے بجائے رو کر دہلا رہی ہو۔“ تکلیف میں ہونے کے باوجود انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”آپ ٹھیک ہو جائیں گے ڈیڈ! اور پھر اس خوشی میں، میں اور اینڈریو ایک بہت بڑی پارٹی رکھیں گے۔ اس پارٹی میں ہم آپ کی فیورٹ ٹی وی آرٹسٹ کو بھی انوائٹ کریں گے۔“ اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے اور وہ بولنے لگی جس کے ہونے کا اسے یقین نہیں تھا۔ ان کی ساری میڈیکل رپورٹس صاف صاف کہہ رہی تھیں کہ زندگی کی ڈور تیزی سے ان کے ہاتھوں سے پھسلی جا رہی ہے۔

”میں نے زندگی میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے سوئی!! اور مجھے اب مزید جینے کی ہوس نہیں ہے۔ میں خوش ہوں کہ میں نے تمہیں اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی میں سیٹلڈ ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور میرے بعد اینڈریو جیسا اچھا انسان تمہارا خیال رکھنے کے لیے موجود ہے لیکن......“ وہ بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ کو جیک کی فکر ہے لیکن آپ کو اس کے لیے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ہمیشہ میری ذمے داری رہے گا۔“ اس نے ان کی خاموشی کی وجہ سمجھتے ہوئے فوراً انہیں یقین دہانی کروائی۔

”تھینک یو کیٹ!! اگر اس کی ماں اس کی ذمے داری اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتی تو میں تم پر یہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جیک بہت چھوٹا اور معصوم ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد وہ بے سہارا بچوں کے کسی مرکز میں پلے۔“ وہ کچھ اداس سے ہو گئے۔

”میرے ہوتے ہوئے ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ میں تو آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ دوسری بار اپنا جیک میرے حوالے کر رہے ہیں۔“

”پہلے جیک کے معاملے میں بھی مجھے تم پر بھروسا تھا اور اس دوسرے جیک کے لیے بھی میں پُر امید ہوں کہ تم اسے ایک اچھا اور کامیاب انسان بننے میں مدد دو گی۔“ ہنری کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

”آئی ایم سوری ڈیڈ.... مجھے افسوس ہے کہ میری خواہش پر آپ ایک ایسے رشتے میں بندھے جس نے آپ کو کوئی خوشی نہیں دی۔“

”تم جیک نامی خوشی کو کیوں بھول رہی ہو؟“ ہنری نے اس کی اداسی اور شرمندگی دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ کیٹ ہی تھی جس نے اس کی تنہا زندگی کو دیکھ کر اس پر زور ڈالا تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی لائف پارٹنر چن لے۔ اینڈریو سے رشتہ قائم کرنے کے بعد اسے ہنری کے اکیلے پن کا بہت زیادہ احساس رہنے لگا تھا۔ اس کے بار بار کے اصرار پر ہنری نے بھی اس معاملے میں دلچسپی لی اور خود سے سترہ سال چھوٹی کیتھی سے رشتہ جوڑ بیٹھا۔ عمر کا یہ فرق اس لیے معنی نہیں رکھتا تھا کہ کیتھی کے بیان کے مطابق اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن کیتھی کا ساتھ اس کے لیے خوشگوار ثابت نہیں ہوا۔ وہ اسے بس اتنی اہمیت دیتی تھی کہ وہ ہر وقت اس کی فرمائشیں پوری کرتا، جذباتی اور جسمانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کے بے شمار دوست موجود تھے۔ ان حالات میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنری کے بیٹے کی ماں بن گئی تو اس میں سارا کمال قدرت کا تھا۔ بیٹے کے بعد اس نے اپنے غصے اور جھنجلاہٹ کا اظہار ایسے کیا کہ جیک کو ہنری کے پاس چھوڑ کر خود اس کی زندگی سے نکل گئی۔ ہنری کو اس دو سالہ پُر اذیت ساتھ کے ختم ہو جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا لیکن وہ اس بات پر ضرور دکھی تھا کہ اس کی دوسری اولاد کو بھی ماں کی محبت کے بغیر ہی پلنا ہے۔ اس دکھ میں مزید اضافہ اس وقت ہو گیا جب اس کی میڈیکل رپورٹس نے اسے بتایا کہ اس کی اس دوسری اولاد کو ماں ہی نہیں، باپ کے بھی بغیر پلنا ہے۔ وہ جو اپنی دن بہ دن گرتی صحت کو کیتھی کے پُر اذیت ساتھ کی دین سمجھ کر بھی توجہ نہیں دیتا تھا، یہ

جان کرشا کڈ رہ گیا تھا کہ وہ کینسر کی لاسٹ اسٹیج پر ہے۔ اس انکشاف کے بعد اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا اور وہ بہت جلد اسپتال کے اس بستر پر پہنچ گیا جہاں سے اسے اب شاید اپنی آخری منزل تک ہی جانا تھا۔

''جیک واقعی میرے لیے اس دنیا کی سب سے بڑی خوشی ہے ڈینڈ۔ میں اور ایڈ ریو اسے بہت محبت سے پالیں گے اور وہ کبھی اپنی زندگی میں ماں باپ کی کمی محسوس نہیں کرے گا۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ کے ہوتے ہوئے میں نے اپنی زندگی میں کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں کی تھی۔'' کیٹ اسے یقین دلا رہی تھی اور اسے اس کے ہر لفظ پر یقین تھا۔

ادھر کیٹ اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ اس کے باپ جیسے پیارے اور نفیس انسان کو جانے ساتھ نبھانے والی عورت کا ساتھ کیوں نہ مل سکا۔ پہلی نے اسے اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ اس بچے کو پالنے پر مصر تھا جسے وہ ایک بوجھ سمجھتی تھی جبکہ دوسری اس لیے ساتھ چھوڑ گئی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک بچے کی ماں بنا گیا تھا۔ شاید خدا آزمائشوں کے لیے ہمیشہ اچھے لوگوں کو ہی چنتا ہے۔

☆☆☆

''مار ڈالوں گی۔ نہیں چھوڑوں گی اس منحوس کو۔ کمینی میری ساری خوشیوں کو کھا گئی ہے۔'' صدف غصے سے بے قابو ہوتی، فراٹے سے گالیاں دیتی ماں کی گرفت سے نکلی جا رہی تھی۔ اس کے غصے کا ہدف اس سے چھ سال چھوٹی قمی تھی جو اس کی اترن پہنے صحن کے ایک کونے میں شرمسار سی کھڑی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں ہی اس نے خوب قد کاٹھ نکال لیا تھا اور صدف کا لباس، شاہدہ کے ڈھیلا کر کے پہنائے جانے کے باوجود اس کے جسم پر پھنس رہا تھا۔

''شکل دیکھو، کیسے مسکینوں کی طرح بنائے کھڑی ہے جیسے اس کا تو کوئی قصور ہی نہ ہو۔'' صدف کو اس وقت اس کا شرمسار چہرہ بھی نہیں بھا رہا تھا۔

''تو کیا قصور ہے اس بے چاری کا؟'' شاید وہ ماں تھی۔ اس سے قمی کی اتری ہوئی شکل نہ دیکھی گئی اور صدف کے بگڑے ہوئے مزاج کے باوجود اس کی حمایت کر گئی۔

''اس کا قصور یہ ہے کہ یہ ہماری خوشیوں کو کھانے کے لیے اس گھر میں پیدا ہوگئی ہے۔ جب تک یہ منحوس زندہ ہے، اس گھر میں کسی کو سکون نصیب نہیں ہوگا۔'' صدف نے سیدھا شاہدہ کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس بار اس سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے صدف کو دھموکا جڑ دیا۔

''کچھ سوچ کر منہ سے بات نکال کم بخت! کیوں معصوم کو بددعائیں دے رہی ہے۔''

''نہیں دیتی تمہاری لاڈلی کو بددعائیں۔ تم دعا کرو کہ اس کے سوا تمہارے باقی بچے مر جائیں۔ تمہیں تو اس کے سوا کسی اور سے محبت ہی نہیں ہے۔'' صدف رنجور سی ہو کر ہچکوں ہچکوں رونے لگی۔ شاہدہ نے بے بسی سے سر تھام لیا۔ وہ ماں تھی، کس کو بددعا دیتی۔ اپنے سب ہی بچے اسے پیارے تھے لیکن قمی کو اس کی مظلومیت کی بنا پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔

''جا، تو جا کر لہسن چھیل۔ تیرے ابا گوشت لے کر آتے ہی ہوں گے۔ اسے بھی دھو دھلا کر تیار کرنا ہوگا۔'' اس نے سہمی ہوئی قمی کو منظر سے غائب کیا اور خود روتی ہوئی صدف کو پچکارنے لگی۔ صدف اور قمی کے درمیان موجود باقی دو بیٹیاں اس سارے تماشے کے دوران خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی تھیں۔ انہوں نے معاملہ نمٹتا دیکھا تو فوراً وہاں سے کھسک گئیں کہ مبادا قمی کی طرح ماں ایک آدھ کام انہیں بھی نہ سونپ دے۔

''آپ کا بلڈ پریشر تو قابو میں ہی نہیں آ کر دے رہا۔ کسی اور ڈاکٹر سے دوا لے کر دیکھیں۔'' اسی رات شاہدہ، شوہر کو دوا اور پانی کا گلاس پیش کرتے ہوئے تشویش سے کہہ رہی تھی۔

''ڈاکٹر بدلنے سے کیا ہوگا نیک بخت! ڈاکٹر دوا بدل سکتا ہے، میری پریشانی تو نہیں۔ تین جوان بیٹیوں کا بوجھ دھرا ہے میرے سینے پر اور میں ابھی تک ایک کا بھی فرض ادا نہیں کر سکا۔ صدف اور میرا کی عمر کی تو خاندان کی ساری ہی لڑکیاں اپنے گھروں کی ہوگئی ہیں۔'' تقی محمد نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ شاہدہ اس کی بات پر چور سی بن گئی۔ آج کا صدف کا رویہ پہلے ہی اس کے دل پر بوجھ تھا۔

''لوگ بڑے کم ظرف ہیں۔ ایک معصوم مخلوق کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کتنی سادہ اور محنتی ہے میری قمی۔ آپ کا بھی کتنا بوجھ بانٹ لیا ہے اس نے۔ گھر بیٹھے بیٹھے آپ کے دسیوں کام نمٹا دیتی ہے۔ بہنوں کو بھی کسی کام سے انکار نہیں کرتی اور مجھے تو اتنا سکھ دے رکھا ہے کہ باقی تینوں مل کر بھی اس کے جتنا نہیں کر پاتیں۔ پھر بھی معصوم سب کے لیے بوجھ ہے۔ آج صدف نے اسے مارا اور گالیاں بھی دیں۔'' وہ شوہر کو دن میں بیتے واقعے کے بارے میں بتانے لگی۔

''وہ بھی کیا کرے۔ یہ کوئی ساتواں آٹھواں رشتہ ہے جو قمی کی وجہ سے لوٹا ہے۔'' جواب میں تقی محمد نے مختصر تبصرہ کیا اور سونے کے لیے تکیہ درست کرنے لگا۔

''اگر تم وقت پر ہمت کر کے اپنا دل مضبوط کر لیتیں تو آج ہم اس پریشانی سے نہ گزر رہے ہوتے۔'' بستر پر چت لیٹے چھت کو دیکھتے ہوئے وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا تو شاہدہ تڑپ کر رہ گئی۔ وہ ایک ماں کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا کہ اس نے اپنا جگر گوشہ کسی کے حوالے کیوں نہیں کر دیا تھا۔ کسی ایسے کے حوالے جو اس سے عمر بھر بھیک منگواتا یا سجا بنا کر ڈھول کی تھاپ پر...... اذیت اتنی تھی کہ وہ آگے سوچ بھی نہیں سکی اور شوہر پر ایک شکوہ کناں نظر ڈال کر رہ گئی۔

☆☆☆

''لکنگ بیوٹی فل۔'' اینڈریو نے خوبصورت اسکرٹ میں نہایت اسمارٹ دکھائی دیتی کیٹ کو سراہا تو وہ دھیرے سے مسکرائی اور کار کا پچھلا دروازہ کھول کر جیک کو وہاں رکھی بے بی چیئر پر بٹھانے لگی۔ اس کام کو تسلی بخش طور پر انجام دینے کے بعد خود اس نے اینڈریو کے برابر میں فرنٹ سیٹ سنبھال لی۔

''کہاں کا پروگرام ہے؟'' اینڈریو نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو اس نے اس سے دریافت کیا۔

''پہلے فن لینڈ چل کر جیک کو انجوائے کرواتے ہیں پھر کہیں ڈنر کرنے چلیں گے۔'' اس نے آگاہ کیا۔ جب سے ہنری دنیا سے گیا تھا، وہ کیٹ کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگا تھا اور اس خیال رکھنے میں جیک پر خصوصی توجہ دینا بھی شامل تھا۔

''تم بہت اچھے ہو اینڈریو۔ تم مجھے نہیں ملتے تو میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی۔'' اس نے اپنا سر اینڈریو کے بازو سے ٹکا دیا۔

''لگتا ہے تمہیں اپنا وہ پاکستانی دوست یاد آرہا ہے۔'' اینڈریو نے اندازہ لگایا۔

''ہاں۔ وہ بے چارہ بہت تنہا ہے۔ کاش اسے بھی کوئی ایسے مل گیا ہوتا جیسے میں اور تم ملے ہیں۔''

''ان کا معاشرہ ہمارے معاشرے سے بہت مختلف ہے کئی۔ ہمیں جن باتوں کے لیے یہاں قانونی تحفظ حاصل ہے، ان کے ہاں انہیں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے دور لکیر کے فقیر بنے رہنے والے لوگ ہیں۔ انہیں کسی انسان کی نفسیاتی اور جذباتی ضروریات سے زیادہ اپنی اخلاقی اقدار پیاری ہیں۔ جب تک وہ اپنا مائنڈ سیٹ نہیں بدلیں گے، تمہارے فرینڈ جیسے لوگ تنہائی کا عذاب جھیلتے رہیں گے۔'' اینڈریو نے تنقیدی انداز میں تبصرہ کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جب بھی میں اسے اس کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کرتی ہوں، وہ اپنے ہاں کے قانون اور اخلاقی اقدار کا حوالہ دے کر بات ختم کر دیتا ہے۔ لیکن وہ ہے بہت اچھا انسان۔ اس نے اپنی زندگی کو ضائع نہیں کیا اور اپنے وسائل اور حالات کے مطابق جو کچھ بھی اچھا کر سکتا ہے وہ کر رہا ہے۔'' کیٹ، اینڈریو کی طرح اپنے دوست پر کڑی تنقید نہیں کر سکتی تھی کیونکہ سوچ کے فرق کے باوجود وہ اس کی انسان دوستی سے متاثر تھی۔

''پتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ثمرہ، خیام اور سیف کو کامیاب انسان بنا کر وہ اپنے والدین جیسے بہت سے ماں باپ کو سکھانا چاہتا ہے کہ اولاد کو صرف انسان سمجھیں اور ان سے انسانوں والا برتاؤ کریں تو وہ دیکھ لیں گے کہ خدا نے انہیں ایک بھی کھوٹا سکہ نہیں دیا۔ خدا صرف ہیرے دیتا ہے۔ بغیر تراشے ہوئے ہیرے جن کی آپ جتنی اچھی تراش خراش کریں گے، وہ اتنے ہی چمک جائیں گے۔'' اب وہ اینڈریو کو کاکا کے خیالات سے آگاہ کر رہی تھی۔

''گڈ تھنکنگ لیکن شاید ابھی ان کے ہاں اس بات کو سمجھنے میں سو سال مزید لگ جائیں۔'' مغرب کے عمومی لوگوں کی طرح اینڈریو کی مشرق کے بارے میں اچھی رائے نہیں تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے اینڈریو! اب وہاں بھی لوگ تبدیل ہو رہے ہیں۔ بس ضرورت ہے کہ انہیں اس سلسلے میں ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارے ہاں بھی تو سو فیصد لوگ اتنے براڈ مائنڈڈ نہیں ہیں۔ میری ماما کو ہی دیکھو۔ جب میں اس دنیا میں آئی تھی تو انہوں نے ڈیڈ سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ بچے اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ میری خوش قسمتی کہ ڈیڈ نے مجھے چنا اور پھر کسی جوہری کی طرح مجھے تراشا۔ ڈیڈ اتنے مستقل مزاج نہ ہوتے تو میری زندگی میں بھی ایسے کئی لوگ آئے تھے جنہوں نے مجھے ہرٹ کیا۔ میرا حوصلہ توڑنے کی کوشش کی لیکن ڈیڈ نے ہر بار مجھے تھام لیا اور دوبارہ کھڑا کر کے زندگی کی ریس میں دوڑا دیا۔ ڈیڈ نہ ہوتے تو آج میں ایسی نہ ہوتی۔'' آج بھی ہنری کا خیال اس کی آنکھیں نم کر دیتا تھا۔

''اس کے لیے میں تمہارے ڈیڈ کا احسان مند ہوں۔'' اینڈریو مسکرایا۔

''ڈیڈ نے ہمیشہ مجھ پر اعتماد کیا جب ہی تو میں اس قابل ہو سکی کہ خود کو پرکھ کر یہ فیصلہ کر سکوں کہ میرے لیے جیک بن کر جینے کے مقابلے میں کیٹ کی حیثیت سے سروائیو

کرنا آسان ہوگا۔ تھینکس ٹو میڈیکل سائنس کہ اس نے میرے فیصلے کو آسان بنانے میں میرا ساتھ دیا اور آج میں آسانی سے خود کو کیٹ کی حیثیت سے متعارف کرواسکتی ہوں۔'' اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور آج وہ اس بچے سے بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی جو اپنے ٹرانس جینڈر ہونے پر دوسروں کی طرف سے مذاق اڑائے جانے پر باپ کے سامنے آکر رو دیا کرتا تھا۔

''میں اس حساب سے خوش قسمت تھا کہ میرے ماں اور باپ دونوں نے ہی مجھے بوجھ نہیں سمجھا اور اپنے باشعور انسان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بہت قرینے سے میری پرورش کی۔ وہ مسلسل ڈاکٹرز سے ٹچ میں رہے اور مجھے اینڈریو بنانے میں میری پوری پوری مدد کی۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب بھی مکمل نہیں ہوں لیکن مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ مجھے اطمینان ہے کہ میں ایک کارآمد انسان ہوں اور ایک اچھی لائف گزار رہا ہوں۔'' اینڈریو اپنے بارے میں یہ سب دہراتے ہوئے کسی احساسِ کمتری کا [illegible]ر نہیں تھا اور ایسا صرف اس لیے تھا کہ اس کی پرورش محفوظ ہاتھوں میں ہوئی تھی۔

''مون...... مون......'' بچے بے بی چیئر پر موجود جیک نے اچانک قلقاری ماری اور تالیاں بجا بجا کر اس جھولے کی طرف اشارہ کرنے لگا جسے آدھے چاند کی شکل میں بنایا گیا تھا اور جو اپنی بلندی کی وجہ سے دور سے ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی اس معصومانہ خوشی نے گاڑی میں پچھلے سے ور آنے والے پوجھل پن کو از خود کر دیا اور کیٹ اور اینڈریو بیک وقت مسکرائے۔ جنری نے اب تک انہیں جو کچھ دیا تھا، جیک ان سب سے زیادہ قیمتی بلکہ انمول تحفہ تھا۔ اس کے آنے سے ان دو ادھورے انسانوں کی زندگی مکمل ہوگئی تھی۔ دنیا کے مذہبی اور اخلاقی پیمانے اپنی جگہ، ان کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اپنے اپنے شعبوں میں کامیاب، ایک دوسرے کے سنگ ایک پیارے سے بچے کے والدین کی حیثیت سے انتہائی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔

☆☆☆

تحی محمد کا مستقل ہائی بلڈ پریشر فالج کے اٹیک کی صورت رنگ لایا۔ گھر کے دوسرے مسائل ہی کم نہیں تھے کہ واحد کمانے والا بھی اسپتال میں جالیٹا۔ شاہدہ کی جمع جوڑ اور کفایت شعاری نے اس برے وقت میں بڑا ساتھ دیا۔ تھی، جو باپ کے اچھا ہوتے گھر بیٹھے ان کی معاونت کیا کرتی تھی اس طور کام آئی کہ آرڈر کی ایک آدھ دیگ گھر کے صحن میں ہی تیار کرکے روز کے دال دلیے کا آسرا ٹوٹنے نہیں دیا لیکن جب تک تحی محمد اسپتال سے چھٹی ہو کر گھر آیا، سب جمع جوڑ ختم ہو چکا تھا اور دکان مسلسل بند رہنے کی وجہ سے ان کے پاس کوئی نیا آرڈر بھی موجود نہیں تھا۔ ویسے بھی اس دور میں بھی ان سینٹروں سے تیار شدہ کھانا منگوانے کا اتنا رواج نہیں تھا۔ لوگ تقریبات کے موقع پر اپنے گھروں کے قریب دیگیں چڑھوا کر اپنی نگرانی میں کھانا تیار کروانا ہی زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ تحی محمد کی بھی گھر کے بائیں جانب نکالی گئی دکان زیادہ تر دیگیں اور کھانا پکانے سے متعلق دیگر سامان رکھنے کے علاوہ بس بکنگ کے کام میں ہی استعمال ہوتی تھی۔ البتہ چھوٹی تقریبات کے لیے وہ جا کر پکانے کے بجائے اپنی جگہ رہ کر ہی پکانا پسند کرتا تھا اور اسی طفیل تھی نے اس سے کھانا پکانا سیکھا تھا۔ مطلب پیشہ ور باورچیوں والا کھانا...... ورنہ گھر کے جملہ امور کے ساتھ گھر میں پکنے والا عام سا کھانا تو وہ ماں کی نگرانی میں اتنے عرصے سے پکا رہی تھی کہ اسے لگتا تھا ماں نے پنگھوڑے سے نکلتے ہی اسے چولہے چوکی کے آگے لا بٹھایا تھا۔

تو بات ہو رہی تھی تحی محمد کی بیماری میں گھر کی کل بچت ختم ہونے کی۔ بچت ختم ہوئی اور نوبت صدف، سمیرا اور آسیہ کے جہیز کے لیے بنوائے گئے زیوروں کو بیچنے تک آپہنچی تو تھی نے ایک نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ اس نے اپنے جسم پر پھنسے صدف اور سمیرا کے زنانہ لباس اتار کر پھینکے اور بالوں کی پتلی سی چٹیا کاٹ کر باپ کے ایک خاکستری رنگ کے شلوار قمیص میں ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''ہائے ہائے تھی! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟'' شاہدہ نے اسے اس حال میں دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔

''دیکھ اماں! ابا کے کپڑے مجھے پورے آرہے ہیں۔'' ماں کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ہونٹوں سے اوپر موجود گہرے روئیں کو مونچھوں کی طرح بل دینے کی کوشش کی۔

''پر تو نے یہ پہنے کس لیے ہیں اور تیری چٹیا کہاں گئی؟'' بے شک سولہ سال کی عمر میں ہی اس کے چوڑے چکلے وجود پر باپ کے کپڑے پورے آرہے تھے لیکن شاہدہ جو اسے شروع سے لڑکیوں والے کپڑے پہناتی رہی تھی، اس تبدیلی کو قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ بستر پر نیم دراز تحی محمد کی آنکھوں میں بھی بہت سے سوال تھے جبکہ دروازے، کھڑکی سے چھپ چھپ کر جھانکتی اور منہ دبا کر کھی کھی کرتی بہنیں بھی اصل ماجرا جاننے کو بے تاب تھیں۔

"بات یہ ہے اماں کہ تم نے مجھے بیٹی بنا کر پالنے کی بہت کوشش کر لی اور اس کوشش میں ناکام ہو کر بھی دیکھ لیا، اس لیے اب مجھے وہ مان لو جو میں ہوں۔ میں ابا کو ایک بیٹے کا فخر چاہے نہ دے سکوں لیکن ان مشکل حالات میں ان کا سہارا بننے کی خواہش ضرور ہے۔" شاہدہ اسے بے شک اسکول نہیں بھیج سکی تھی لیکن اپنی استعداد کے مطابق اسے گھر میں ہی تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا ضرور سکھایا تھا اور اس تھوڑے بہت کی بنیاد پر ہی اسے فرصت کے اوقات میں کتابیں پڑھنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ کم گوئی کی عادت کی وجہ سے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کتابوں نے اس پر کیا اثر ڈالا تھا لیکن آج اس نے اپنی بات کرنے کے انداز سے سب کو حیران کر ڈالا تھا۔

"گھر کے حالات آپ کے سامنے ہیں ابا!" اب وہ باپ کے پلنگ کے قریب فرش پر گھٹنے ٹکائے ان کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

"ان حالات کو سنبھالنے کے لیے مجھے اور آپ دونوں کو ہمت کرنی ہوگی۔ اللہ کا شکر ہے کہ بیماری میں صرف آپ کا دایاں ہاتھ مفلوج ہوا ہے اور آپ اب بھی سہارے سے چل پھر سکتے ہیں۔ ہمت کر کے دکان پر بیٹھیے اور آرڈر لیجیے۔ کھانا پکانے کا فن میں نے آپ سے ہی سیکھا ہے اور الحمدللہ اس عرصے میں جس کو بھی دیگ تیار کر کے دی ہے، اس نے کھانے کی تعریف کی ہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر بکنگ لیجیے اور جہاں بھی کھانا پکانا ہے مجھے اپنے ساتھ لے کر چلیے۔ آپ کو بس چارپائی پر بیٹھ کر نگرانی کا کام کرنا ہوگا باقی میری ذمے داری۔" گی کی زبان سے ایسی پُراعتماد گفتگو گھر والوں نے پہلی بار سنی تھی۔

"کیسی پاگل پن کی باتیں کر رہی ہے گی۔ تُو اکیلی کیسے سنبھالے گی سب؟" پہلے شاہدہ نے ہی اسے ٹوکا۔

"اکیلے کیوں اماں! ابا کے ہیلپر انور بھائی بھی تو ساتھ ہوں گے۔ دکان بند ہونے سے وہ بے چارے بھی آج کل مشکل میں ہیں۔"

"لیکن گی......"

"اس لیکن کو چھوڑ دو اماں۔" اس نے شاہدہ کو اگلا اعتراض ہونٹوں پر لانے کی مہلت نہیں دی۔

"یہ لیکن، اگر مگر جیسے لفظ انسان کی راہ کھوٹی کرتے ہیں اور لوگوں کی باتوں پر کان دھرنے سے انسان کا حوصلہ ٹوٹتا ہے۔"

"گھر بیٹھ کر ایسی بڑی بڑی باتیں کرنا آسان ہے۔ باہر نکلے گی اور زمانے کی دل چھلنی کرنے والی باتیں سنے گی تو پور پور زخمی ہو جائے گا، میری بچی۔" شاہدہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"مجھے معلوم ہے اماں اور یہ بھی پتا ہے کہ باہر میرے لیے کوئی آسان نہیں ہے لیکن گھر میں فاقے ہوتے دیکھنا، ابا کو دوائیاں نہ ملتے دیکھنا اور بہنوں کے جہیز کے زیور بکتے دیکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ جب بھی مجھے لگے گا کہ مشکل بڑھ رہی ہے، میں ان مشکلوں کو یاد کر لوں گی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے پیاروں کی تکلیف کا احساس مجھے اپنی تکلیف سہنے کا حوصلہ دے دے گا۔" اس کے لہجے کا خلوص نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی بہنیں جو پہلے اس کی ہیئت کذائی پر ہنسی کر رہی تھیں، اب کچھ شرمساری انگشت بدنداں تھیں۔ ماں تو پہلے ہی سراپا آنسو بنی بیٹھی تھی، اس بار باپ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا اور آنکھوں میں نمی لیے اپنا بایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

گی محمد کا ہاتھ اس کے سر پر کیا آیا، اس کے حوصلے بھی جوان ہو گئے۔ مردانہ لباس اس نے پہلے ہی پہن لیا تھا، اب مردانہ وار دنیا کا مقابلہ بھی کرنے لگا۔ ہاں...... اب اس نے خود کو گی کہلوانا ترک کر دیا تھا اور اپنے لیے مؤنث کے بجائے مذکر کا صیغہ استعمال کرنے لگا تھا۔ اس کی سخت ہدایت پر گھر میں اسے شمیم پکارا جانے لگا تھا۔ ابا اور انور بھائی کو بھی کام کی جگہ پر گی پکارنے کی سخت ممانعت تھی۔ ہاں ابا البتہ کبھی کبھی اسے شمو کہہ کر پکار لیتے تھے۔ اب وہ ان کی سب سے کارآمد اولاد بن چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایسا ذائقہ تھا کہ لوگوں کو گی محمد کے ہاتھوں کا ذائقہ بھول گیا تھا۔ رفتہ رفتہ کام بڑھنے لگا تھا اور ہیلپرز کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑا تھا۔ پہلے جو گی محمد دور بیٹھا اسے ہدایات دیتا رہتا تھا، اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سب کچھ اچھا ہوتا جا رہا تھا سوائے اس کے کہ گی محمد کی بیٹیاں اب بھی بن بیاہی تھیں۔ لوگوں کو کسی "ہیجڑے" کی بہنوں سے رشتہ جوڑتے شرم آتی تھی اور کوئی کوئی تو خواہ مخواہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ کہیں اس گھر کی بیٹی بیاہ لانے سے ان کے اپنے گھر میں کوئی شمیم جیسا نمونہ پیدا نہ ہو جائے۔

بیٹیوں کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی لیکن برادری میں کم عمری کی شادی کے رواج کے باعث ایسا لگتا تھا کہ جیسے گی محمد کی بیٹیاں بن بیاہے ہی بوڑھی ہو چلی ہوں اور یہ ایسا بوجھ تھا جسے گی محمد بڑھتی ہوئی مالی آسودگی کے بعد بھی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کا فشار خون ایک بار پھر بہت بلند رہنے لگا اور اس بار نتیجہ برین ہیمرج کی صورت نکلا۔ اس بار

تجمل اسپتال گیا تو زندہ واپس نہ آسکا۔ اس کی موت نے گھر والوں پر جو قیامت ڈھائی سو ڈھائی، قسیم کی سوچ نے بھی ایک کروٹ لی۔ شاہدہ کی عدت ختم ہونے سے چند دن قبل وہ اپنے دل میں آئی بات زبان پر لے آیا۔

”میں آپ کو اور تینوں بہنوں کو چھوٹے ماموں کے پاس لاہور بھجوا رہا ہوں۔ ماموں نے اپنے گھر کا اوپر والا پورشن کرائے داروں سے خالی کروالیا ہے۔ اب آپ چاروں وہاں رہیں گی۔ ماموں سے میں نے کہہ دیا ہے کہ تینوں بہنوں کے لیے اچھے رشتے تلاش کرنے میں آپ کی مدد کریں۔ اللہ نے چاہا تو جلد آپ اپنے فرض سے فارغ ہوجائیں گی۔“ اس نے سارے فیصلے خود ہی کرلیے تھے۔ شاہدہ ہکابکا سی اس کی صورت دیکھتی رہی۔

”یہ ضروری ہے اماں۔ یہاں ان کے لیے اول تو رشتے آتے نہیں۔ جو کوئی بھولے بھٹکے آجائے تو وہ کسی لائق نہیں ہوتا۔ تینوں کے اچھے مستقبل کے لیے آپ کو یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ آپ کو اپنی اس چوتھی اولاد کو بھولنا ہوگا۔“ اس بار اس نے جو کہا اس نے شاہدہ کے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔

”قسم...... قسیم۔“ وہ تکلیف کی شدت سے اس کا نام بھی ڈھنگ سے نہ لے سکی۔

”ضروری ہے اماں۔ بالکل ویسے ہی ضروری ہے جیسے گھر والوں کو فاقوں سے بچانے کے لیے میرا گھر سے نکلنا ضروری تھا۔ اس وقت کیا ہوا تھا؟ بس کچھ دن ہمیں لوگوں کے طعنے اور ہنسی ٹھٹھا برداشت کرنا پڑا تھا، پھر سب معمول پر آگیا تھا۔ اب بس تم اتنا کرنا کہ کسی کے سامنے میرا ذکر نہ کرنا۔ میری ماموں سے بات ہوگئی ہے۔ انھیں میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ اپنے آس پاس والوں سے کہیں گے کہ بہن بیوہ ہوگئی تھی اور جوان بیٹیوں والے گھر میں رکھوالی کے لیے کوئی مرد نہیں رہا تھا اس لیے میں انھیں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ گزارے کے لیے کراچی میں موجود مکان اور دکانوں کا کرایہ آتا ہے۔ میں پابندی سے ماموں کو پورشن کا کرایہ اور تم لوگوں کو خرچے کی رقم بھجواتا رہوں گا۔ بس تم بھولے سے بھی کسی کے سامنے میرا ذکر مت کرنا۔“ وہ انھیں بڑی نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”جیتے جی تجھے ماردوں؟“ شاہدہ بڑے کرب سے کراہی۔

”بس تیرے دل میں زندہ رہوں، میرے لیے اتنا کافی ہے۔ کبھی کبھی کرایہ وصول کرنے کے بہانے یہاں کا چکر لگا کر مجھ سے مل جایا کرنا۔“ درد اس کے دل میں بھی تھا لیکن

لاہور کا تانگا

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو بک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگا کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے کی سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کے بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل وصورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے اور اس ضبطِ نفس سے اپنی رفتار میں ایک دم سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہوسکے۔

پطرس۔ ”لاہور کا جغرافیہ“

مرسلہ: آصف شیخ، ملتان

ماں پر ظاہر نہیں کیا اور اس سے تسلی دلاسے کی باتیں کرتا رہا۔

”اور تو...... تیرا کیا ہوگا؟ تو کیسے یہاں اکیلے رہے گا؟“ ماں کیسے اپنی اولاد کی فکر سے آزاد ہوجاتی۔

”میں گھر کے دو حصے کرکے آدھا گھر کرائے پر دے دوں گا۔ باقی خیال رکھنے کو انور بھائی ہیں نا۔“ اس کے پاس گویا ہر سوال کا جواب تھا۔ انور کے حوالے پر شاہدہ کو بھی تھوڑی ڈھارس ہوئی۔ انور فطرتاً اچھا آدمی تھا اور شروع سے تجمل کے ساتھ کام کرنے کے باعث ان کے خاندان کا خاصا لحاظ بھی کرتا تھا۔ کچھ تسلیوں اور دلاسوں کے سہارے اور کچھ اپنے مسائل کے حل کے لیے شاہدہ کو دل پر صبر کی سل رکھ کر یہ ہجرت قبول کرنا پڑی۔ لاہور میں مقیم بے اولاد بھائی بھاوج نے بھی اس موقع پر بڑا ساتھ دیا اور چھ ماہ کے اندر اندر شاہدہ، صدف کا رشتہ طے کرکے اسے اس کے گھر کا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

شادی والے دن قسیم کے پاس صدف کا فون آیا تھا

اور وہ سسکیاں لے لے کر اپنی شادی میں اس شخص کی غیر موجودگی پر روتی رہی تھی جس کے بھی دنیا میں آنے پر ہی اسے شدید اعتراض ہوا کرتا تھا اور جسے بھی وہ بڑی نفرت اور حقارت سے "ہیجڑا" پکارتی تھی۔ آج وہ ہیجڑا اس کے لیے بھائی بن چکا تھا کیونکہ اس نے ایک بھائی ہی کی طرح اس کی شادی کے کل اخراجات ایسے اٹھائے تھے کہ صدف کو احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ بن باپ کی بچی ہے۔

☆☆☆

کرب حد سے سوا تھا۔ درد روم روم میں ٹھاٹھیں مارتا پھر رہا تھا لیکن آنکھیں بالکل خشک تھیں اور یوں سپاٹ سے انداز میں کمل چھت کو تک رہی تھیں جیسے اب کچھ دیکھنے کی خواہش نہ ہو۔

"شمو....." انور بھائی نے اسے پکارا بھی تو اس نے ان کی طرف نہ دیکھا۔

"کچھ تو بول شمو ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں تو تجھے خود گھر تک چھوڑ کر گیا تھا پھر کیسے یہ سب....." انور بھائی دکھ کی شدت سے اپنی بات مکمل نہیں کر سکے۔

"کسی کو کچھ مت بتانا انور بھائی! اماں کو تو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔ میں تھوڑے دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس نے انور بھائی کو ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے ان سے درخواست کی اور پھر یوں آنکھیں موند لیں جیسے کچھ کہنے کی خواہش نہ رہی ہو لیکن اندر کہاں خاموشی تھی۔ اندر تو شور ہی شور تھا۔

صدف کی رخصتی کا دن اس کے لیے بہت درد لے کر آیا تھا۔ اپنوں سے جدائی کا غم بہت شدت سے عود کر آیا تھا۔ ان چھ ماہ میں اماں صرف دو بار اس سے ملنے کے لیے آسکی تھیں۔ اس نے ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن اسے ہی خبر تھی کہ وہ ان سے جدا ہو کر کتنی تکلیف میں تھا اور یہ تکلیف خوشی کے موقع پر اپنوں سے الگ بالکل تنہا ہونے نے مزید بڑھا دی تھی۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا کرتا تھا۔ پرائی محلے داری اور اس کی ذاتی شرافت کا اتنا فائدہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں خود کو بالکل محفوظ سمجھتا تھا اور شاہدہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اکیلے کہیں دور جانے سے گریز کرتا تھا لیکن اس روز گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا سو وہ ہر نصیحت اور احتیاط کو بھول کر گھر سے نکل کھڑا ہوا اور اکیلا ہی ساحل سمندر پر پہنچ گیا۔ اپنی ہی طرح تنہا سمندر کے آگے آنکھوں سے سمندر بہا کر دل کا بوجھ ہلکا اور اندھیرا گہرا ہوا تو اس نے واپسی کا قصد کیا۔ گھر واپسی کے لیے رکشے میں بیٹھتے ہوئے وہ محسوس نہ کر سکا کہ اس کے مردانہ لباس اور حلیے کے باوجود رکشے والے کی بدقماش نگاہیں اس کی حقیقت کو تاڑ چکی ہیں۔ اپنی سوچوں میں گم اسے خبر ہی نہ ہو سکی اور رکشا انجان راستوں پر چلتا اسے ایک ایسے مقام پر لے گیا جہاں زندگی کا سب سے بھیانک تجربہ اس کا منتظر تھا۔ رکشے والے نے بس اتنی مہربانی کی کہ اپنے ہی جیسے بدکردار اور بدقماش دوستوں کے ساتھ اسے روندنے کے بعد اسے ایک اسپتال کے سامنے پھینک گیا۔

وہ سخت جان تھا یا قدرت کو اس سے کچھ کام لینے مقصود تھے جو وہ زندگی کا یہ ستم بھی بالآخر جھیل گیا اور جھیل کر ٹوٹنے بکھرنے کے بجائے خود کو مزید مضبوط بنانے کا فیصلہ کیا۔ سیلف ڈیفنس کی تربیت اور لائسنس یافتہ ہتھیار کی اپنے پاس مستقل موجودگی نے اسے ایسا اعتماد بخشا کہ پھر کبھی دوبارہ کسی کے ہاتھوں پامال ہونے کی نوبت نہ آئی۔ اگلے تین سال کے عرصے میں جہاں اس نے اپنے کام کو مزید وسعت دی، وہیں باقی دونوں بہنوں کے فرض سے بھی فارغ ہو گیا۔ ان ہی دنوں انور بھائی کے ساتھ کبھی کبھی آنے والے ان کے چھوٹے سے بیٹے اختر نے اسے کاکا کہہ کر پکارنا شروع کیا اور پتا ہی نہیں چلا کہ کیسے وہ رفتہ رفتہ جگت کاکا بن گیا۔ کاکا..... جس کی ایک ساکھ تھی اور جس کا اب مذاق اڑانے کے بجائے مثال دی جاتی تھی کہ اس نے خود کو گلیوں اور سڑکوں پر رلنے اور تماشا بنانے کے بجائے قدرت کی دی کمی کو حوصلے سے سہا اور اپنے لیے ایک باعزت زندگی کا انتخاب کیا۔

بہنوں کی شادی کے بعد شاہدہ کی خواہش تھی کہ وہ اس کے پاس واپس لوٹ آئے لیکن اس نے ماں کو اجازت نہیں دی۔ اس کی تینوں بہنوں کے سسرال لاہور میں ہی تھے اور وہ چاہتا تھا کہ ماں کے دم سے لاہور میں ان کا میکا آباد رہے۔ بہنوں کی شادیوں کے مسئلے سے نمٹنے کے بعد وہ ان کے سسرال والوں پہ اپنا آپ ظاہر کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جس بات پر پردہ پڑا ہے اب وہ ساری عمر پڑا ہی رہے۔ ویسے بھی بقول شاعر

جھوٹ بولا ہے تو اس پر قائم بھی رہو ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

اس کے انکار کے بعد شاہدہ نے وہی ماہ دو ماہ بعد اس سے ملاقات کے لیے آنے کے معمول پر اکتفا کر لیا۔ زندگی کی گاڑی روانی سے چلتی رہی اور ایک ایک کر کے ثمرہ، خیام اور سیف اس کی زندگی میں شامل ہو گئے۔ وہ تینوں اسی کی طرح ادھورے انسان تھے لیکن اس سے زیادہ بدقسمت تھے

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

شہر	نمبر	شہر	نمبر	شہر	نمبر
کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیر آباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈگمہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفر آباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والا	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	شمن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

[illegible]

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

کہ انہیں ان کی ماؤں نے بھی سینے سے لگانے کے بجائے زمانے کے ڈر سے دھتکار دیا تھا۔ اس نے اپنی آسودگی کا فائدہ اٹھا کر ان تینوں کی بہترین تعلیم کا بندوبست کیا اور بیک وقت ماں اور باپ کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کی تربیت کرنے لگا۔ یہ اس کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ وہ تینوں دم بہ دم کامیابی کی منازل طے کرتے جا رہے تھے۔ ثمرہ نے ہوم اکنامکس میں بی ایس سی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور ادارے سے شیف کا کورس کیا تھا۔ خیام ایل ایل بی میں داخلہ لے چکا تھا اور سیف کا اسکول کا آخری سال تھا۔

پرانے گھر کو تڑوا کر اس کی جگہ جدید اور باسہولت گھر تعمیر کروا لیا گیا تھا جہاں وہ تینوں اپنے کاکا کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ شاہدہ کا چند سال قبل انتقال ہو چکا تھا اور اس کے بعد اس کا اپنی بہنوں سے رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس عید بقرعید پر یا ان کی کسی خوشی کے موقع پر وہ ماموں کی معرفت انہیں نقد تحائف بھجوا دیتا تھا۔ مکان اور دکان میں ان کے حصے کی رقم بھی اماں کے انتقال کے فوراً بعد ادا کر دی گئی تھی اس لیے ان کے شوہروں کو بھی ضرورت پیش نہیں آئی کہ بیویوں کی چھوٹی سی جائداد کا کھوج لگانے کراچی آتے اور شمی سے کاکا تک کا سفر کرنے والے قسیم تک پہنچ پاتے۔

☆☆☆

"کاکا....." ماضی کے پچھلے پچاس سالوں کا سفر طے کرتے ہوئے کب شام اتر آئی، انہیں خبر نہ ہو سکی۔ سیف نے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر انہیں پکارا تو حال میں واپس آئے۔

"اختر بھائی کا فون آیا ہے۔ کہہ رہے تھے کسی خاص دوست نے دعوت رکھی ہے۔ ٹھیک سات بجے سپنا بینکوئٹ ہال میں پہنچ جائیں۔"

"کیسی دعوت؟ صبح ہی تو اختر سے بات ہوئی تھی تب تو اس نے کسی دعوت کا ذکر نہیں کیا تھا۔" وہ سیف کے دیے پیغام کو سن کر حیران ہوئے۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اختر بھائی کو ہی پتا ہوگا۔ میں نے آپ کے کپڑے استری کر دیے ہیں، آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ سوا چھ تو ہو ہی چکے ہیں۔"

دوپہر کے مقابلے میں اب سیف کا موڈ خاصا بدل چکا تھا۔

"یہ اختر بھی نا بس عجیب ہی ہے۔ لگتا ہی نہیں انور بھائی جیسے ذمے دار آدمی کا بیٹا ہے۔" وہ بڑبڑائے لیکن جگہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"یہ ثمرہ اور خیام کیا آج ابھی تک گھر نہیں آئے؟" یکدم ہی انہیں یاد آ گیا۔

"وہ دونوں تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے۔ ان کا فون آ گیا تھا۔" سیف عجلت میں جواب دے کر باہر نکل گیا لیکن وہ مطمئن ہو گئے کہ ان کی غیر موجودگی میں اسے رات کے وقت تنہا نہیں رہنا پڑے گا۔ سیف کی خوبصورتی کبھی کبھی انہیں خائف کر دیا کرتی تھی۔ انہوں نے سیف سمیت ان تینوں کو سیلف ڈیفنس کی تربیت دلوائی تھی اور ایک الیکٹرک ٹیزر بھی ان کے پاس رہا کرتا تھا پھر بھی اپنی زندگی کا وہ ایک بار کا تجربہ کبھی کبھی خوف میں مبتلا کر دیتا تھا۔

"یہ میرا نیا سوٹ کون لایا تھا؟" تیار ہو کر باہر نکلتے ہوئے انہوں نے سیف سے دریافت کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔ ثمرہ یا خیام میں سے کوئی لایا ہوگا۔ مجھے تو آپ کی الماری میں نیا نظر آیا تو میں نے نکال کر استری کر دیا۔" سیف نے بے نیازی سے شانے اچکائے تو وہ اسے گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وقت کم تھا اور انہیں تجسس تھا کہ اختر نے کس دعوت میں بلایا ہے اس لیے رک کر اس سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ دعوت کی نوعیت کا اندازہ نہ ہونے کے سبب تحفے کے طور پر بھی احتیاطاً ایک لفافے میں معقول رقم رکھ لی تھی۔ عجلت میں گھر سے روانہ ہوتے ہوئے انہیں علم نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے نکلتے ہی ایک ٹیکسی گھر کے دروازے پر آ کر رکی ہے اور گیٹ سے چپکا کھڑا سیف جھٹ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا ہے۔

☆☆☆

"ہاں بھئی اختر! یہ کیا چکر ہے؟ کہیں اپنے حاجی صاحب نے تو دعوت نہیں رکھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر انہیں وہ بلدیہ والا ٹھیکا مل گیا تو بڑی دعوت رکھیں گے۔" اختر انہیں بینکوئٹ ہال کے دروازے پر ہی کھڑا مل گیا تھا اور انہوں نے وہیں اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"ارے نہیں۔ تو نے کہا تھا آج کوئی آرڈر نہیں ہے اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ حاجی صاحب دعوت رکھیں اور کھانا ہمارے پکوان سینٹر کے سوا کہیں اور سے تیار کروالیں۔" انہوں نے فوری طور پر خود ہی اپنے اندازے کی تردید کر دی۔

"آپ اندر تو چلیں کاکا۔ سب پتا چل جائے گا۔" اختر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ اندر کافی سارے مہمان تھے لیکن عجیب بات تھی کہ عام دعوتوں کے معمول کے خلاف وہاں روشنیاں بہت مدھم تھیں۔ اتنی مدھم کہ

وہ یہ تو محسوس کر سکتے تھے کہ دیواروں پر آرائش کے لیے کچھ لگایا گیا ہے لیکن وہ اسے صحیح سے دیکھنے کے لائق نہیں تھے۔

"یہ کیسی دعوت ہے یار! کیا کھانا گم پکا ہے جو اندھیرے میں ہی مہمانوں کو نمٹانے کا فیصلہ کیا ہے میزبانوں نے؟" اختر ان کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور ان کی باتوں پر کچھ بھی کہنے کے بجائے بس زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔

"یہ ناہنجار میزبان آخر ہے کون؟" جواب نہ پا کر وہ تھوڑا جھنجلا گئے۔

"یہ تُو مجھے اسٹیج پر کہاں لے جا رہا ہے۔ کیا میں اس تقریب کا دلہا ہوں؟" سارا ہال پار کرنے کے بعد اختر انہیں اسٹیج تک لے گیا تو ان کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

"میزبانوں نے مجھے آپ کو اسٹیج پر ہی بٹھانے کی ہدایت کی ہے، کاکا۔" اختر نے انہیں نرمی سے جواب دیا اور ایک بار پھر انہیں اسٹیج کی طرف کھینچا۔

"ہے کون یہ عجوبہ میزبان.....؟" وہ بادلِ ناخواستہ اوپر تو چڑھ گئے لیکن اپنا سوال نہیں روک سکے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کاکا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیئر کاکا!" اس بار سوال کے جواب میں اختر کی آواز کے بجائے انہیں تین مشترکہ آوازیں سنائی دیں اور پھر ان آوازوں میں ڈھیروں دوسری آوازیں شامل ہو گئیں۔

انہوں نے عجیب سے احساسات کے ساتھ سامنے کی طرف دیکھا۔ ایک ٹرے میں کیک رکھے ثمرہ ان کے بالکل سامنے تھی۔ اس کے دائیں بائیں خیام اور سیف بھی موجود تھے۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے اسٹیج کی جانب آ رہے تھے۔ کیک پر پچاس کے ہندسے کی شکل میں موجود موم بتی کے روشن شعلے کا عکس ان تینوں کے چہروں پر پڑ کر ان کی جگمگاہٹ میں اضافہ کر رہا تھا۔ ان تینوں کے اسٹیج تک پہنچنے تک ہال کی ساری بتیاں ایک ایک کر کے روشن ہو چکی تھیں اور وہ اس روشنی میں کسی بچے کے سے استعجاب سے اپنے سامنے موجود منظر دیکھ رہے تھے۔ اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے لوگ اور سالگرہ کی مناسبت سے کی گئی ہال کی سجاوٹ ان کے تصور سے بھی بڑھ کر کوئی چیز تھی۔

"زندگی کی پچاسویں بہار مبارک ہو کاکا!" وہ تینوں اسٹیج پر چڑھ آئے اور کیک کی ٹرے میز پر رکھ کر سب سے پہلے ثمرہ ان کے کانوں میں گنگناتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔ سیف اور خیام بھی پیچھے نہیں رہے۔

"اچھا تو یہ سرپرائز تھا اور میں بے وقوف سمجھا کہ تم تینوں اپنی مصروفیت میں میری سالگرہ کا دن بھول گئے ہو۔" انہوں نے بانہوں کو پھیلا کر تینوں کو ایک ساتھ خود سے لپٹا لیا۔

"ہم اپنے گولڈن پرسن کی زندگی کی گولڈن جوبلی کو بھول جاتے، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔" خیام نے شوخی سے ان کی بات کا جواب دیا۔

"مجھے لگتا ہے فریج کو تالا لگا کر اس میں یہ کیک ہی چھپایا گیا تھا۔" اب وہ میز پر رکھے خوبصورت سے کیک کو دیکھ رہے تھے۔

"جی ہاں۔ میں صبح گھر سے نکلنے سے قبل اسپیشل آپ کے لیے تیار کر کے رکھ گئی تھی۔ صحت کے اصولوں کے عین مطابق۔" ثمرہ نے انہیں اطلاع دی تو انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

"تجھے تو میں ابھی بتاتا ہوں۔ تُو ان کی سازش میں پورا پورا شامل تھا اس لیے آرڈر نہ ہونے کا بہانہ بنا کر آنے سے روک دیا۔" وہ تینوں ان سے الگ ہوئے تو ان کی نظر قریب کھڑے اختر پر پڑی اور فوراً اس کا کان پکڑ کر کھینچا۔

"کیا کر رہے ہیں کاکا! میڈیا والے سب ریکارڈ کر رہے ہیں۔" اختر نے دہائی دیتے ہوئے اشارہ کیا تو ان کی نظر کیمرا مین پر پڑی۔ اس نے اسی چینل کے لوگو والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس کے مارننگ شو میں آج صبح ثمرہ نے شرکت کی تھی۔

"یہ ادھر کیٹ بھی ہے۔" خیام نے انہیں ایک اونچی میز پر دھرے لیپ ٹاپ کی اسکرین کی طرف متوجہ کیا۔ انہیں متوجہ دیکھ کر کیٹ نے ہاتھ ہلایا۔

"یہ تو تم نے کمال ہی کر دیا بچو۔" وہ خود کسی بچے کی طرح خوش ہوئے۔

"آپ کی برتھ ڈے آپ کی بیسٹ فرینڈ کے بغیر کیسے سیلیبریٹ کی جا سکتی تھی؟" سیف مسکرایا۔ اب اس کے چہرے پر اس ڈپریشن کا نام و نشان نہیں تھا جسے دوپہر میں وہ اسکول سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

"بس اب جلدی سے کیک کاٹ لیجیے کاکا! مہمانوں کو مزید انتظار کروانا ٹھیک نہیں ہے۔" اختر بہت زیادہ پُرجوش تھا۔

انہوں نے کیک کاٹا تو مہمانوں نے ایک بار پھر تالیاں بجا کر اور گیت گا کر انہیں وش کیا۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ مہمانوں کی اس کثیر تعداد میں شہر کے معززین کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے جیسے بھی کئی لوگ شامل ہیں۔ شوخ لباس اور بھدے میک اپ میں خود کو تماشا بنا کر پیش کرنے والے

نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح ڈیسنٹ سے لک کے ساتھ اپنے باتہذیب ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔

دعوت کا انتظام بہترین تھا۔ کیک کاٹے جانے کے بعد ہال میں ہر طرف ان کے پکوان سینٹر میں تیار کردہ لذیذ کھانوں کی خوشبو چکرا رہی تھی۔ ایک بڑی ٹرالی پر جہازی سائز خوب کریم اور چاکلیٹ والا کیک بھی مہمانوں کی خاطر کے لیے موجود تھا۔ اس کیک کے بارے میں اختر نے انہیں بتایا کہ یہ بھی ثمرہ کی کاوش ہے۔ اسٹوڈیو سے واپس آنے کے بعد اس نے کچھ معاونین کے ساتھ اپنے کئی گھنٹے اس کیک کی تیاری میں صرف کیے تھے۔

''بہت شکریہ۔ بڑی نوازش۔ مہربانی۔'' وہ اب بھی اسٹیج پر موجود ایک ایک کرکے اسٹیج پر آکر تحفہ پیش کرنے اور وش کرنے والوں کا عاجزی سے شکریہ ادا کر رہے تھے۔ اسٹیج کا ایک حصہ انہیں ملنے والے ڈھیروں تحائف سے بھر چکا تھا۔ ان مہمانوں میں سے کسی سے بھی ان کا خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ ان کے بچوں کے دوست، ان کے والدین اور اساتذہ تھے جنہوں نے اپنے وسیع النظر اور باشعور ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے خلوص سے اس تقریب میں شرکت کی تھی۔

''آپ اس موقع پر کچھ کہنا چاہیں گے کاکا۔'' مہمانوں کا رش چھٹا تو ٹاک میں بولنے والی ثمرہ کی ناپسندیدہ مارننگ شو کی میزبان کیمرامین کے ساتھ مائک لیے مسکراتے ہوئے ان کے سامنے آکھڑی ہوئی (ویسے اب وہ ثمرہ کے لیے ناپسندیدہ نہیں رہی تھی کیونکہ اس نے یہ جان کر کہ ثمرہ اور اس جیسے مزید دو افراد کو سہارا دینے اور کچھ بنانے کا بیڑا اٹھانے والے کاکا کی آج سالگرہ منائی جا رہی ہے تو از خود اس سالگرہ کی کوریج کی پیشکش کی تھی۔)

''کہنا بس اتنا ہے کہ ہم تھوڑے سے مختلف اور ادھورے ہی سہی، ہیں تو اسی رب العزت کی مخلوق جس نے آپ نارمل انسانوں کو تخلیق کیا ہے۔ خدارا ہمیں انسان سمجھیے اور ہم سے انسانوں والا برتاؤ کیجیے۔ آپ کے نزدیک ہم کتنے ہی کمتر سہی لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم ناکارہ نہیں ہوسکتے کہ میرے رب نے اس کائنات میں ایک ذرے کو بھی بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ شاید ہمیں آپ کی آزمائش کے لیے ہی بنایا گیا ہو اور وہ رب دیکھنا چاہتا ہو کہ وہ کون لوگ ہیں جو اپنے آنگن میں ہم جیسے وجودوں کے اترنے پر شکوے کے بجائے صبر کرتے ہیں اور اس کی طرف سے اس صبر کا اجر پاتے ہیں۔ میری ایسے والدین سے درخواست ہے کہ خدارا اپنے آنگن میں اگنے والے ان ننھے پودوں کو اکھاڑ کر زمانے کی ٹھوکروں میں رُلنے کے لیے نہ پھینکیں۔ مالی کے سوا بھلا اور کون ان ننھے پودوں کو پیار اور خیال سے سینچ کر پروان چڑھا سکتا ہے۔ ایسے ہر پودے کو کاکا نہیں ملتا۔'' بولتے بولتے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے لیکن سچ یہ تھا کہ آج زندگی میں پہلی بار وہ بہت خوش تھے اور انہیں لگ رہا تھا کہ ان کی پچاس سالہ زندگی کے ہر دکھ کا مداوا ہو گیا ہے۔

''آپ نے بہت اچھا پیغام دیا۔ لوگوں کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں تبدیلی آرہی ہے اور ثمرہ، خیام اور سیف جیسے گنتی کے چند ہی سہی لوگ اب عام لوگوں کی طرح اپنا کیریئر بنا رہے ہیں۔ آپ اس تبدیلی کے بارے میں کیا کہیں گے؟'' اینکر نے نیا سوال داغا۔

''مجھے اس تبدیلی پر خوشی ہے لیکن میں کہوں گا کہ اس تبدیلی کی رفتار بہت کم ہے۔ یہ رفتار اس وقت تک نہیں تیز ہوگی جب تک ٹرانس جینڈر بچوں کے والدین ان کی سرپرستی نہیں کریں گے۔ خدارا اپنے ان معصوم بچوں کی اچھی زندگی گزارنے میں مدد کیجیے اور انہیں بدھائی کے نام پر تماشا بن کر لوگوں سے بھیک مانگنے کے لیے تنہا مت چھوڑیے۔ جو رب کی طرف سے ہے اسے بدلنے پر چاہے آپ قدرت نہیں رکھتے لیکن اسے سنبھالنے اور سنوارنے کی طاقت تو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ایک بار ہمت کرکے دیکھیے، رب نے چاہا تو دنیا اور آخرت کی کامیابیاں آپ کے قدم چومیں گی۔ میں ان لوگوں سے بھی درخواست کروں گا جو اس آزمائش میں مبتلا نہیں کیے گئے لیکن جن کی زبانیں اور کردار ہم جیسوں کے لیے آزمائش بن جاتی ہیں کہ ہمارے وجود کو رب کا فیصلہ جان کر ہمیں اپنے معاشرے میں قبول کرلیں اور ہم جیسوں کے والدین کا حوصلہ توڑنے کے بجائے ان کی ہمت بندھائیں۔ ہوسکتا ہے اس ذرا سے عمل کے بدلے میں اللہ نے آپ کے لیے اتنا اجر کثیر رکھا ہو کہ آپ کے دوسرے گناہ بھی بخش دیے جائیں۔'' جھلملاتی آنکھوں سے کیمرے کی طرف دیکھ کر یہ سب کچھ کہتے ہوئے کاکا کو علم تھا کہ اب بھی بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جو ان کی التجا پر کان نہیں دھریں گے لیکن وہ ان چند لوگوں کے لیے بول رہے تھے جن کے دلوں پر مہر نہیں لگی اور وہ تبدیلی کے عمل سے گزرنے کے لیے تیار تھے۔ یہ چند دل بھی نہ سہی بڑی تبدیلی بھی لا سکتے تھے۔ کیا آپ میں سے ہے کوئی ایسا......؟

×××

مسٹر گوفی

احمد صغیر صدیقی
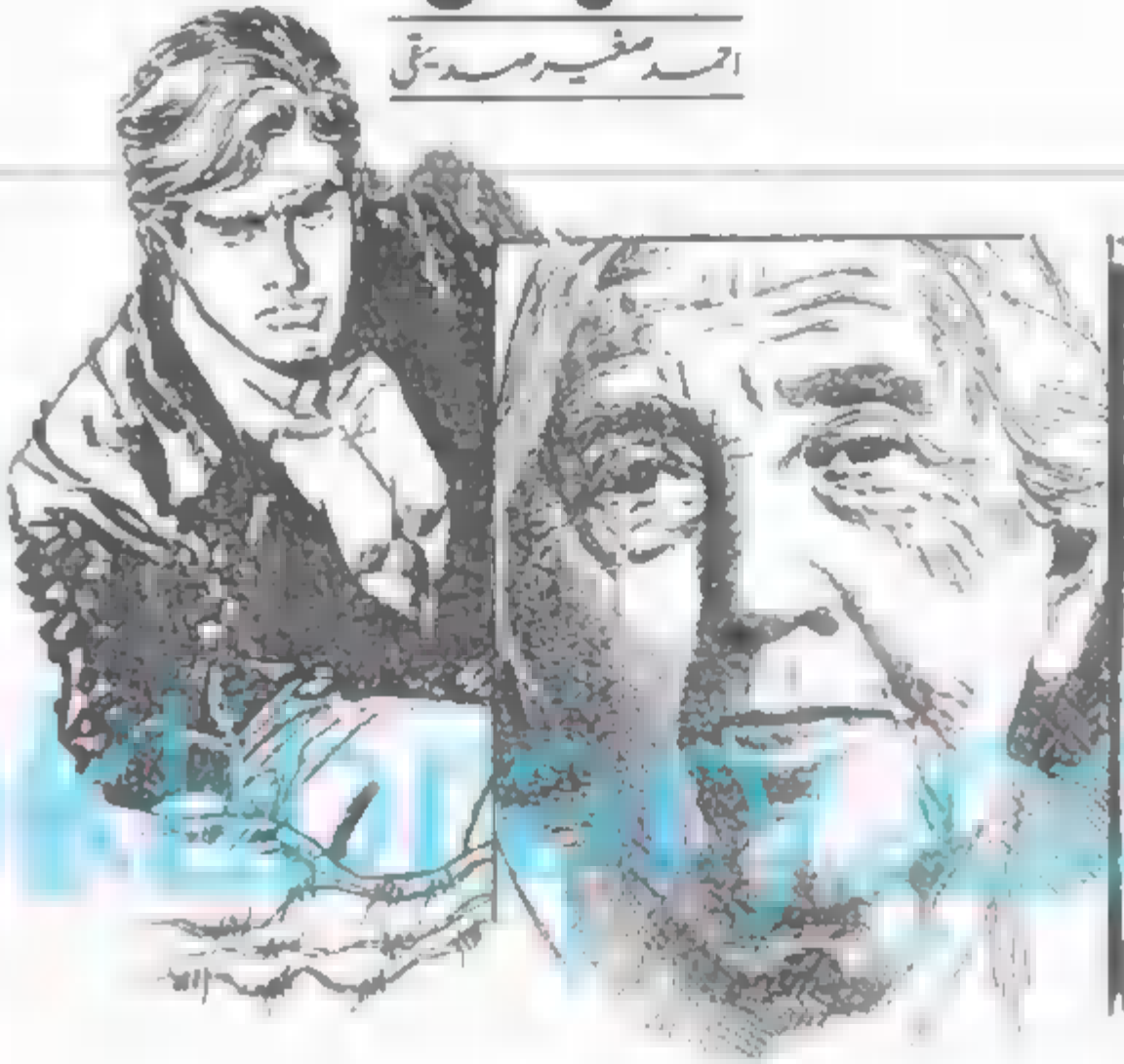
خستہ حالی اس کی پہچان تھی مگر آنکھوں کی ذہانت اس کا ایسا ہتھیار کہ چلتے راہی بھی چونک جائے... اگرچہ اس نے زندگی کا جو لباس زیبِ تن کیا ہوا تھا وہ معززین کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہ تھا مگر اس کی تنہائی میں ایک ایسا جہان آباد تھا جسے تعلیم یافتہ طبقہ پالینے کی محض آرزو ہی کرسکتا ہے۔

چہروں کے پیچھے بھی کئی چہرے ہوتے ہیں...... لوگ اندر سے کتنے گہرے ہوتے ہیں کی عملی تفسیر

یہ اب سے کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔ اس دن میں نے پہلی بار مسٹر گوفی کو دیکھا تھا۔ وہ یقیناً ایک عجیب اور دلچسپ سا شخص تھا ورنہ بھلا مجھ جیسے معروف شخص کے لیے کسی کو دیکھ کر یاد رکھنا آسان کام نہ تھا۔ میں اس بار میں کاؤنٹر پر بیٹھتا ہوں۔ عام طور سے میرے بار میں خاصی بھیڑ رہتی ہے اور طرح طرح کے اشخاص روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسے میں میرے لیے یہ بے حد مشکل کام ہے کہ میں کسی کو پہلی بار دیکھ کر یاد رکھ سکوں۔ لیکن مسٹر گوفی کا معاملہ دوسرا ہی تھا۔ وہ مجھے شروع ہی سے عجیب لگا تھا اور اسی لیے مجھے یاد بھی رہ گیا۔

وہ ایک خاموش سی دوپہر تھی۔ اس دن بار میں زیادہ لوگ موجود نہ تھے۔ پھر یکایک میری نظر اس پر پڑی تھی۔

وہ سیدھا چلتا ہوا میرے کاؤنٹر کے قریب والے کیبن میں جا بیٹھا تھا لیکن یہ کوئی عجب خیز بات نہ تھی۔ عجیب چیز تو یہ تھی کہ میں نے اس سے پہلے کسی ایسے آدمی کو نہ دیکھا تھا جو بار میں اپنے ساتھ کوئی پندرہ سولہ پاؤنڈ کا آہنی کباڑ بھی لے کر گھسا ہو۔ جی ہاں، اس کے ہاتھ میں استعمال شدہ لوہے کا ایک بڑا وزن دبا ہوا تھا جسے اس نے بڑی احتیاط سے اپنی کرسی کے نزدیک ہی رکھ دیا تھا۔ یہ کباڑ بھی کچھ عجیب ہی تھا۔ اس میں کچن کا کچھ سامان بھی تھا۔ چند ٹیڑھے میڑھے تار تھے اور اس میں ایک ٹوٹا پھوٹا انجن بھی شامل تھا۔

یقیناً مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ آدمی قد میں پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ البتہ اسے دبلا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے بدن پر جنگِ عظیم کے کسی مُردہ سپاہی کی پرانی وردی لٹکی ہوئی تھی۔ ویسے یہ وردی صاف ضرور تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے بیرے کو ایک گلاس ٹھنڈے مشروب کا آرڈر دیا تھا پھر بیرے کے رخصت ہوتے ہی اس نے جیب سے ایک پنسل اور ایک چھوٹی سی کاپی نکالی اور خدا جانے اس پر کیا کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اندازے سے سوچا کہ شاید وہ حساب کتاب کر رہا ہے۔

اس عرصے میں کچھ اور لوگ بھی اندر آ گئے تھے اور میں ان کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ مجھے کتنا وقت لگا ہوگا۔ ویسے دو گھنٹے تو ہو ہی گئے تھے پھر میں ادھر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا کیونکہ وہ اب بھی اپنی جگہ بیٹھا ہوا بدستور حساب کتاب لگانے میں غرق تھا۔ حد تو یہ ہے کہ بار میں ہونے والی ریکارڈنگ بھی اسے کچھ پریشان نہیں کر رہی تھی۔ میری نگاہیں اس پر ہی جاری تھیں۔ یکایک اس نے میری جانب دیکھا اور اشارے سے مجھے بلایا۔ میں جب اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے...... کیا آپ لاؤڈ اسپیکر ذرا مدھم نہیں کر سکتے؟''

''اوہ...... کیوں نہیں جناب۔'' میں اس کے عجیب و غریب لہجے سے متاثر ہوتے ہوئے بولا اور آواز مدھم کر دی۔ اسی لمحے اسٹاکوسکی بھی وہاں آ پہنچا۔ اسٹاکوسکی کوئی اچھا آدمی نہ تھا۔ اس کے پاس دو عمارتیں موجود تھیں جو بار کے نزدیک ہی واقع تھیں۔ انہیں اس نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ انہی میں کی ایک عمارت کے ایک کمرے میں وہ خود بھی رہا کرتا تھا۔ اسٹاکوسکی میرے بار کا پرانا گاہک تھا اور یہاں بیٹھ کر کافی وقت اور رقم خرچ کرتا تھا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اسٹاکوسکی بھی اسی وقت آ پہنچا اور مجھ پر گرجنے برسنے لگا کہ آخر میں نے ریکارڈنگ مدھم کیوں کر دی ہے؟

اس سے قبل کہ میں کوئی جواز پیش کر سکتا، سامنے کے کیبن سے نکل کر میرے عجیب و غریب گاہک نے اسے اپنی سمت متوجہ کر لیا۔ ''دیکھیے جناب! یہ کام انہوں نے میرے کہنے سے کیا تھا۔''

''اچھا......'' اسٹاکوسکی نے کہا اور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''اور تم کون ہو؟''

''میں......'' گاہک نے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ تو مجھے جانتے ہی ہیں۔ ابھی کل ہی تو میں نے آپ کی بلڈنگ کی سب سے اوپری منزل کرائے پر لی ہے۔''

اسٹاکوسکی نے اسے دوبارہ گھورا۔ ''اچھا تو وہ تم ہو اور تم نے بلڈنگ کا ایک ماہ کا کرایہ پیشگی دے دیا ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں ریکارڈنگ سننا چاہتا ہوں۔''

''لیکن......'' اس عجیب شخص نے کہا۔ ''دیکھیے جناب! میں حساب کا ایک انتہائی پیچیدہ مسئلہ حل کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ شور سے میرے خیالات بٹ جاتے ہیں۔''

مگر اسٹاکوسکی کوئی شریف آدمی نہ تھا۔ اس نے ضد کرنی شروع کر دی کہ میں تو ریکارڈنگ بلند آواز ہی سے سنوں گا۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے؟

پھر اس نے آگے بڑھ کر آواز بلند کر دی۔ جواب میں میرا عجیب گاہک واپس مڑ کر کیبن میں چلا گیا لیکن جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کوئی فٹ بھر لمبا چھرا دبا ہوا تھا۔ یہ قدرے مختلف قسم کا چھرا تھا۔ اس کی نوک اور دھار دونوں تیز لگتی تھیں۔ اسے بھی غالباً اس نے اپنے کباڑ میں سے ہی برآمد کیا ہوگا۔ چاقو دیکھتے ہی اسٹاکوسکی گھبرا گیا۔ اس نے پیچھے کھسکتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے...... اچھی بات ہے۔''

پھر یہ تماشا آگے نہیں بڑھا کیونکہ اس کے بعد میرا عجیب گاہک وہاں نہیں رکا۔ اس نے اپنا کباڑ سنبھالا اور باہر نکل گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اسٹاکوسکی نے شور کرنا شروع کر دیا اور درشت لہجے میں بولا۔

''یہ کون تھا...... میرا اپنا کرائے دار۔ ابھی کل ہی اس نے چھت کرائے پر لی ہے۔ معلوم نہیں کیسا شخص ہے۔ میرے خیال میں تو یہ کم بخت پاگل ہی ہے۔ کل سارا دن اس نے طرح طرح کا آہنی کباڑ ڈھو ڈھو کر اوپر پہنچایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ جواب میں اس نے کہا تھا کہ وہ کوئی اہم چیز بنا رہا ہے لیکن اپنے نام سے

اس نے آگاہ نہیں کیا تھا اور اس کا نام کوئی نہیں ہے۔ یہ نام تو میں نے اپنے ذہن سے اس کے پاگل پن کے پیش نظر دے دیا ہے۔ خدا جانے اس کا نام کیا ہے۔ یقیناً یہ شخص کریک ہے، بالکل سڑی!''

استاکوسکی دیر تک بکتا جھکتا رہا اور انہی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی میرا پڑوسی ہے کیونکہ جس بلڈنگ کا ذکر ہو رہا تھا اس میں خود میں بھی مقیم تھا۔ میں نے چھت پر جانے والے زینے دیکھے ضرور تھے لیکن کبھی اوپر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ اطلاع میرے لیے قطعاً نئی تھی۔

اس روز کے بعد سے میں اس کوئی نامی شخص کی کھوج میں رہنے لگا۔ بس نہ جانے کیوں لیکن میں نے اسے نہ تو بار ہی میں دیکھا اور نہ گھر پر، البتہ راتوں میں مجھے اپنے کمرے کی چھت پر سے اکثر ایسی آوازیں ضرور سنائی دیں جیسے کوئی کسی شے کو بار بار ٹھونک یا پیٹ رہا ہو۔ کبھی یوں لگتا جیسے کسی وزنی شے کو گھسیٹا جا رہا ہو۔ کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی انجن یا مشین آہستہ آہستہ آوازوں کے ساتھ چل رہی ہو۔ غالباً وہ ساری رات کام میں مصروف رہتا تھا کیونکہ جب بھی میری آنکھ کھلتی، مجھے یہ آوازیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور سنائی دیتیں۔ خدا جانے وہ آہنی کباڑ کس مصلحت سے لا لا کر اوپر ڈھیر کر رہا تھا اور نہ جانے وہ کون سی چیز تھی جو وہ بنا رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہ تھا کہ آخر وہ یہ کباڑ لاتا کہاں سے ہے؟

تقریباً ایک ہفتے غائب رہنے کے بعد وہ مجھے اکثر و بیشتر نظر آنے لگا۔ وہ اب ریستوران میں روز کھانا کھانے آیا کرتا تھا۔ وہ وقت پر آتا اور کھانے کے دو تین گھنٹے بعد تک وہیں جما، کاغذ پر نہ جانے کیا کچھ جوڑتا گھٹاتا رہتا۔ اس عرصے میں اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو چکی تھیں۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک روز میرے گھر کے کمرے پر استاکوسکی نے دستک دی پھر اندر آ کر اس نے مجھے بتایا۔

''کوئی کہیں گیا ہوا ہے اور میرا پروگرام ہے کہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر دیکھا جائے کہ آخر یہ شخص چھت پر کیا کرتا رہتا ہے۔''

میں طوعاً و کرہاً ساتھ ہولیا۔ چھت خاصی وسیع تھی۔ ایک جانب سائبان تھا اور بس۔ اوپر کا ماحول بے حد عجیب سا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی ورکشاپ میں آ کھڑے ہوئے ہوں۔ ہر طرف لوہے کا ڈھیر، تار، ڈبے، ڈبریاں، پرزے، پلاس اور نہ جانے کیا کچھ بکھرا پڑا تھا۔ سامنے کی میز پر ایک کاغذ کا پلندا سا دھرا تھا جس میں خدا معلوم کیسی کیسی تحریر میں کیا کچھ لکھا تھا۔ کہیں ہندسے درج تھے، کہیں عبارت، کہیں فارمولے۔ پاس ہی ایک ریک پر بہت سی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ سب کی سب انجینئرنگ اور الیکٹرانک کے موضوع سے متعلق تھیں۔ یہ کتابیں کافی بوسیدہ لگ رہی تھیں۔

اس لمحے ہماری نظریں ادھر اٹھ گئیں جدھر ایک کونے میں ایک خاصی بدہیئت سی مشین کھڑی تھی۔ یہ مشین خاصی بڑی تھی۔ اتنی بڑی کہ اس کی لمبائی 30 فٹ سے کم نہ تھی۔ ایک آدمی کے قد سے بھی زیادہ اونچی تھی۔ اس کے جال، تار اور انجنوں کے درمیان اچھی خاصی جگہ موجود تھی جس میں ایک کرسی رکھی تھی۔ اس کرسی کے سامنے ایک بڑا سا سوئچ بورڈ نصب تھا جس میں بہت سے بٹن جڑے ہوئے تھے۔ اس کے چاروں طرف پسٹن کوائل اور گلاس ٹیوب بکھرے ہوئے تھے۔ یہ مشین بے حد بدہیئت اور عجیب سی تھی۔ البتہ دیکھنے پر یہ خاصی متاثر کرتی تھی۔

برنارڈ شا

مشہور آئرش ڈراما نویس برنارڈ شا جو اپنی خداداد فنی صلاحیتوں کے باعث انیسویں صدی کے آخر میں، دنیا کا مقبول ترین ڈراما نگار تھا۔ اس کی تحریریں آج بھی نصاب تعلیم میں شامل ہیں اور انہیں دنیا کی بہترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ برنارڈ شا کو انسانیت سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اس کی تحریریں ہمیشہ انسانیت کے حقوق کی حفاظت کرتی رہیں۔ یہی حال اس کے افعال کا تھا۔ وہ سخت مذہبی انسان تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی شراب نوشی نہیں کی۔ وہ جانوروں کو بھی انسانوں جیسے حقوق کا محتاج تصور کرتا تھا۔ اس کے نزدیک جانور اور انسان دونوں جاندار تھے۔ اسی خیال نے اسے جانوروں کا گوشت کھانے سے باز رکھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی سبزیوں پر گزاری۔ برنارڈ شا کا قول ہے۔

''انگریز بہت اصول پرست ہوتے ہیں۔ لڑتے ہیں تو حب الوطنی کے اصولوں کے تحت، لوٹتے ہیں تو تجارتی اصولوں کے تحت، محکوم بناتے ہیں تو سامراجی اصولوں کے تحت۔''

(حوالہ: برنارڈ شا کی خودنوشت سوانح عمری
(My Heart Aches)

مرسلہ: شاہدہ عظیم، سرگودھا

"کمال ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
"ایک مہینے میں اتنی بڑی مشین تیار کرلینا آسان نہیں۔ خوب آدمی ہے یہ کوئی بھی۔"
"ہوں۔" استاکوکی نے ناک سکیڑ کر جواب دیا۔ "مجھے بھی ہو۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی۔ مہینا کل ختم ہونے والا ہے۔ ادھر یہ ختم ہوا اُدھر میں نے اس کوئی کو چلتا کیا...... ہونہہ...... بالکل پاگل آدمی ہے۔ میں اسے فوراً نکال باہر کروں گا۔"
"مگر بھلا اتنی بڑی مشین زینوں سے نیچے کیسے اترے گی؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"یہ وہ جانے۔ میں اسے یہاں ٹھہرنے نہیں دوں گا۔" استاکوکی نے غصے سے کہا۔ "میں کل ہی اپنے آدمیوں کے ذریعے اسے نکال باہر کروں گا۔"
میں اس دن، رات گئے تک مشین ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کوئی دس بارہ بجے رات کو مجھے کوئی کی شکل دکھائی دی۔ اس بار وہ کیبن میں جانے کے بجائے سیدھا کاؤنٹر پر میرے پاس آیا تھا۔
"آج کوئی اچھی سی برانڈی پلاؤ۔" اس نے کہا۔
"کیوں...... آج کوئی خاص بات؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔ آج میں کافی خوش ہوں۔"
"مجھے بھی تو بتاؤ۔" میں نے دلچسپی ظاہر کی۔
"آج میرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور میں اب تیار ہوں کہ ساری دنیا کو اس کارنامے سے روشناس کرادوں۔"
"کون سا کارنامہ؟" میں نے منہ کھول کر کہا۔
"ٹھیک ہے۔" اس نے جام کو منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم اچھے آدمی ہو اس لیے میں تمہیں بتاؤں گا۔ ابھی تک میں کام میں لگا تھا اور لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے لیکن اب کوئی نہیں ہنسے گا۔ امریکا کے بڑے بڑے لوگ جو خود کو پروفیسر اور سائنس داں کہتے ہیں اور جنہوں نے میری تھیوری کو دیوانے کی بڑ قرار دیا تھا، اب مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ایک ایک لفظ کو کان لگا کر سنیں گے۔ میری وہ تھیوری جو کل تک بے معنی تھی، اب اہم قرار دی جائے گی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں صحیح خطوط پر کام کررہا ہوں لیکن انہیں خبر نہ تھی۔ اب میں اپنا کام ختم کرچکا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میرے منصوبے کا ایک حصہ مشین بھی ہے لیکن اس سے بھی اہم چیز ایک دوسری ہی ہے اور وہ دوسری شے ہے انسانی دماغ۔ انسانی مغز۔ بس یہ انسانی بھیجا مل جائے تو میں وہ سب کچھ کرسکتا ہوں جو میں نے تھیوری میں پیش کیا تھا۔" اس نے رک کر شراب کی چسکی لی اور بولا۔ "جب میں نے انسانی مغز کے حصول کا ذکر کیا تھا تو سب نے میرا مذاق اڑایا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ دماغ کو قابو میں کرکے اسے مشینی سازوسامان سے لیس کرکے سب کچھ کیا جاسکتا ہے مگر انہوں نے نہیں سنا تھا۔ خیر...... اب وہ دیکھیں گے کہ کون سچا تھا اور کون غلطی پر۔" اس نے ٹھہر کر میری جانب دیکھا اور پھر سلسلۂ گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرے دوست! سچی بات تو یہ ہے کہ آج میں نے کامیابی کے ساتھ دنیا کا پہلا عجیب وغریب خلائی جہاز تیار کرلیا ہے۔"
میں دل ہی دل میں اس کے پاگل پن پر ہنسا۔
"اے کوئی، واقعی تم رہے کوئی کے کوئی ہی!"
"اور اب یہ مشین چاند کی سمت پرواز کرنے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اگر میں چاہوں تو آج ہی اس سفر پر روانہ ہوسکتا ہوں۔ مجھے اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ صرف دماغی توانائی کی ضرورت ہے اور بس۔ تم یقین کرو، انسانی دماغ لاانتہا توانائی کا مخزن ہے۔ ایسی توانائی کا جسے ابھی تک دریافت ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے سامنے جوہری توانائی کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔"
میں نے اس کی باتیں اوپری دل سے سنیں۔ بے چارہ کوئی، واقعی پاگل ہی ہے۔ میں نے سوچا اور مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ استاکوکی تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ کل صبح ہی صبح تمہیں بے دخل کرنے کا منصوبہ بناچکا ہے، مجھے۔ اسے تمہاری مشین ذرا اچھی نہیں لگی ہے۔"
"مشین......؟" اس نے جام رکھ کر مجھے گھورا۔ "لیکن اسے مشین کے بارے میں کیا معلوم؟"
"وہ اوپر گیا تھا، تمہاری عدم موجودگی میں۔" میں نے اسے بتایا۔
"لیکن اگر اس نے نکال دیا تو میں مشین کیسے بنا سکوں گا۔ اسے سوچنا چاہیے.. میں تو لوگوں کو بلانے والا تھا کہ وہ اسے دیکھ سکیں۔ میں اپنی مشین کی پرواز کا مظاہرہ کرنے والا ہوں۔"
"کچھ بھی ہو۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "استاکوکی بہت خراب انسان ہے۔ وہ اپنے غنڈوں کو بلانے گیا ہے۔ وہ تمہیں صبح ہی صبح نکال دے گا۔"
"ہوں......" وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر اداسی سی چھا گئی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

پھر وہ جیب سے کاغذ قلم نکال کر حسب دستور کاغذ پر کچھ جوڑنے گھٹانے لگا۔ پندرہ منٹ بعد اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ مجھے کچھ تبدیلی کرنا ہوگی۔ صرف چند منٹ کی محنت اور پھر دنیا کو میری مشین کی کارکردگی کا عملی ثبوت مل جائے گا...... لیکن افسوس یہ بات میرے پلان کے مطابق نہ ہوگی...... افسوس! اچھی بات ہے۔“ یکایک وہ اٹھ گیا۔ ”خدا حافظ۔“

میں اسے باہر جاتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے بار بند کرنے کا حکم دیا۔ رات زیادہ ہوچلی تھی اور میں گھر جانا چاہتا تھا۔

بار بند ہوتے ہوتے رات کے کوئی دو بج گئے۔ باہر گلی سنسان پڑی تھی۔ یہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر استا کوسکی کی بلڈنگیں تھیں جس میں ایک کمرا خود میرے تصرف میں بھی تھا۔ میں گلی میں کوئی سو دو سو گز چلا ہوں گا کہ یکایک عجیب سی آواز فضا میں ابھری...... ہوں، ہوں۔ یہ ایک ہلکی سی گونج تھی پھر فضا جیسے تھرا اٹھی۔ رات اندھیری اور منجمد سی تھی اس لیے میں کچھ دیکھ تو نہ سکا لیکن اوپر آسمان میں پھیلنے والی یہ آواز میں نے صاف سنی تھی۔

پہلے مجھے خیال ہوا کہ غالباً میرے اپنے کمرے میں اندر ہی کوئی دھماکا ہوا ہے۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا بلڈنگ تک پہنچا۔ پوری عمارت سر اٹھائے اندھیرے میں کھڑی تھی۔ تبھی میرے دماغ میں مسٹر گوفی کا تصور ابھرا۔ میں وقت ضائع کیے بغیر سیڑھیوں سے اوپر کی سمت لپکا اور اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر پہنچ کر مجھے بجز مایوسی کے کچھ نہ ملا۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا لہٰذا میں بہ آسانی چھت تک پہنچ گیا۔ وہاں مسٹر گوفی کا کوئی پتا نہ تھا۔ وہ رخصت ہوچکا تھا۔ وہاں جا بجا مختلف قسم کی آہنی اشیا ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ کاغذ بھی جلائے گئے تھے۔ شاید مسٹر گوفی نے جاتے جاتے اپنے نوٹس جلائے ہوں گے۔ سب سے تعجب کی بات تو یہ تھی کہ کونے میں کھڑی ہوئی وہ عظیم الجثہ مشین جسے میں نے کل دیکھا تھا اب اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر روشنی کرتے ہوئے دیکھا۔ جس جگہ مشین رکھی تھی وہاں چاروں طرف فرش پر تیل کے بڑے بڑے دھبے موجود تھے اور اس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ایک وسیع گول دائرے میں اس جگہ چھت پر ایک بڑا سا سوراخ بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں؟ پھر میں نے اس واقعے کی اطلاع استا کوسکی کو دینا مناسب سمجھتے ہوئے اس کے کمرے کی راہ لی۔ اس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے تھپتھپانے کے لیے ہاتھ مارا تو وہ کھلتا چلا گیا...... اس کے بعد کے واقعات کچھ خوشگوار نہ تھے۔

پولیس آئی اور خواہ مخواہ میرے گلے پڑ گئی۔ وہ تو کیسے بار کا مالک میرے کام آگیا اور اس نے میری گلوخلاصی کرادی۔

میں نے مسٹر گوفی، اس کے خلائی جہاز اور چاند کے سفر کے بارے میں جتنا کچھ کہا، پولیس نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ پھر میرے باس نے آکر مجھے رہا کرایا۔ اس دن کے بعد سے میں نے مسٹر گوفی، استا کوسکی اور اس دہشت ناک منظر کو بھولے سے بھی یاد نہیں کیا جو میں نے دیکھا تھا۔

جی ہاں...... اس رات میں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا تھا۔ جب میں استا کوسکی کے کمرے میں پہنچا تھا تو مجھے دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔ میں جب اندر گھسا تو اس وقت وہ یقیناً اندر موجود تھا لیکن وہ زندہ نہ تھا۔ اس کی لاش کے نزدیک ہی مسٹر گوفی کا وہ لمبا سا عجیب وضع کا چھرا ابھی پڑا ہوا تھا جو میں نے ایک روز جھگڑے کے دوران اس کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

مسٹر گوفی رات میں مجھ سے رخصت ہو کر یقیناً سیدھا استا کوسکی کے پاس ہی آیا ہوگا۔ آگے کی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ یقیناً اس نے استا کوسکی کو ہلاک کردیا ہوگا لیکن اس کے بعد...؟

اس کے بعد...... جی ہاں آپ کا اندازہ درست ہے۔ پولیس والے آج تک اس معاملے میں کوئی سراغ نہیں پاسکے۔ حتیٰ کہ وہ مسٹر گوفی کے اتے پتے سے بھی واقف نہیں ہوسکے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا؟ اس نے واقعی مشین بنائی تھی یا نہیں اور اگر بنائی تھی تو کیا وہ واقعی چاند کی طرف پرواز کرچکی تھی......؟ ان سارے رازوں پر پردہ ہی پڑا رہا البتہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔

مسٹر گوفی نے استا کوسکی کو صرف قتل ہی نہیں کیا تھا بلکہ جاتے جاتے وہ اس کا بھیجا بھی نکال کر لے گیا تھا۔

جی ہاں... استا کوسکی کے سر میں ایک بڑے گول سوراخ کے سوا اندر کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے اندر جو کچھ بھی تھا وہ گوفی اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا پھر شاید اس نے اپنی مشین میں کچھ تبدیلیاں کی ہوں گی جس میں اس کے چند منٹ خرچ ہوئے ہوں گے...... اور پھر باقی مرحلے اپنے آپ آسان ہوگئے ہوں گے کیونکہ بقول مسٹر گوفی اس کے خلائی جہاز کو اڑانے کے لیے سب سے اہم شے انسانی دماغ ہی تو تھی!

×××

شام کا تارا

طاہر جاوید مغل

آس کی ٹوٹی کلیوں اور...... پیار کی سونی گلیوں میں ساجن کا رستہ تکنے والی حسینہ کی اذیتوں کا احوال

جب کسی ایک محاذ پر خاموش جذبوں کا شور... حالات کی ستم ظریفی اور مفاد پرست رشتوں کا سنگم ہوجائے تو ڈھلتی شاموں میں شکستہ گام ہوکر بھی آبلہ پائی کا سفر حوصلوں کو مہمیز عطا کرتا ہے۔ اس کے بھی چاروں جانب ایک دھند پھیلی تھی جس میں کئی سائے آسیب بن کر اس سے لپٹ جاتے تھے مگر... ہر شام ایک تارا اسے آواز دیتا تھا۔ اس کی ڈھارس بندھاتا تھا کہ اسے اپنی گمشدہ منزل کو ہر حال میں پانا ہے۔

صبح کا قاصد اپنا پیغام دے کر کب کا جا چکا تھا۔ سورج افق سے خاصا اونچا ہو چکا تھا پر آج شدید جاڑے اور دھند میں لپٹے ہوئے اس نارنجی گولے کا زور چلتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈسکے سے سات آٹھ کلومیٹر دور سندر پور نامی اس گاؤں کے کھیتوں کھلیانوں نے اب تک دھند کی دبیز چادر اوڑھ رکھی تھی اور بڑی یاس سے سورج کی بے بسی کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچے پکے سبھی مکانوں میں ایندھن جلائے جا رہے تھے اور ان کا گاڑھا سیاہی مائل دھواں دھند کی چادر چیرتا ہوا آسمان میں بلند ہو رہا تھا۔ کچے راستوں پر بھاری بھاری چادریں لپیٹے ہوئے اکادکا راہ گیر سائیکلوں پر سوار جاتے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے ہی ایک کچے راستے کے سرے پر وہ کاندھے پر بستہ لٹکائے ٹھٹھری ہوئی کھڑی تھی۔ دلکش تیکھے نقش، گندمی رنگت پر بڑی بڑی آنکھیں، جن میں بڑے قرینے سے سرمہ ڈالا گیا تھا۔ خوبصورت چھوٹی سی ناک کے سیدھی طرف نشیب میں ایک چھوٹا سا تل جو اس کے تیکھے پن کو مزید ابھار رہا تھا۔ پیچھے کی طرف کھینچ کر باندھے گئے شہد رنگ ریشمی بال سفید اور ہلکے نیلے رنگ کی وردی نے اس کے چہرے کو مزید معصوم اور نکھرا ہوا کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تیرہ چودہ سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ نیلے رنگ کی جرسی کی پاکٹ میں ڈالا ہوا تھا جبکہ دوسرا مضبوطی سے اپنے گرد باندھ رکھا تھا۔ یہ والا ہاتھ آج صبح ہی روٹیاں بناتے ہوئے جل گیا تھا اور اب اسے پاکٹ میں ڈالتے ہوئے اسے مزید جلن ہونے لگتی تھی۔ جرسی اور کپڑوں پر ہلکی پھلکی پیوند کاری نمایاں ہو رہی تھی۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔ نظریں بار بار سیدھی طرف نکلتے ہوئے ایک تنگ سے کچے رستے کی طرف اٹھ رہی تھیں جو دور دھند میں لپٹے ہوئے، دھواں چھوڑتے ہوئے کچے پکے مکانوں میں گم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے وحید عرف ویدو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ بھی اسی رنگ کی وردی میں تھا۔ نیلے رنگ کی پتلون، جرسی اور سفید قمیص۔ وہ سیکڑوں میں اسے دور ہی سے پہچان سکتی تھی۔ نکلتا ہوا قد، کشادہ شانے، سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے سیاہ بال جو پیشانی پر ہلکے سے جھکے ہوئے تھے اور باوقار چال۔ اس میں کچھ ایسا تھا جو دوسروں سے اسے ممتاز کرتا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اونی مفلر کی بانٹ بنا کر اس نے گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

"آج تو سردی نے حد کر دی۔" ویدو نے اپنے سرخ ہوتے ہاتھ ایک دوسرے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

"ویدو! آج تو میرا رضائی سے باہر نکلنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ بس امتحانوں کا سوچ کر ساری ہمت کی ہے میں نے ورنہ تو آج چھٹی کا پکا ارادہ تھا میرا۔" فوزی بولی۔

"ہاں...... دل تو میرا ابھی نہیں کر رہا تھا۔" ویدو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ابھی نیند کا ہلکا سا خمار تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے۔ واپس ہی نہ چلیں؟" فوزی نے پرجوش انداز میں ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں رک گئے۔ ان کے ارادوں نے ایک دوسرے کو سراہا پھر اچانک ویدو کی نظر فوزی کے ہاتھ پر پڑی جس پر جلنے کی سرخی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

"اوئے فوزی! یہ ہاتھ پر کیا ہوا ہے تیرے؟" ویدو نے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔ اس کے اندر کی تڑپ چہرے پر ایک دم واضح ہو گئی تھی۔

"ہاں ویدو بھائی! یہ صبح جل گیا تھا، روٹی پکاتے ہوئے۔ ہاتھ پر پھونک پڑ گئی تھی روٹی کی۔" فوزی نے اچٹتی سی نظر ہاتھ پر ڈالی جیسے اسے اس کی کچھ خاص پروا نہیں تھی۔

"تو کچھ لگایا نہیں تو نے اس پر؟" ویدو نے اس کا ہاتھ ہلکے سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"نہیں۔ اسکول سے دیر ہو رہی تھی تو ایسے ہی آ گئی۔" فوزی نے سادگی سے جواب دیا۔ اکادکا راہ گیر اسکول جاتے ہوئے بچوں کی ٹولیوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔

ویدو، جو واپس جانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا، یکایک کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ دونوں بدستور کچے رستے کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا...... چلیں گھر اب؟" فوزی کے چہرے پر بچپن کی ساری معصومیت خوشی بن کر چمک رہی تھی۔

"آں...... نہیں فوزی! ہم اسکول جائیں گے۔ ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ ایک چھٹی بھی اسٹوڈنٹ کو کئی دن پیچھے لے جاتی ہے اور ہم نے پیچھے نہیں جانا فوزی، آگے بڑھنا ہے، بہت آگے۔" ویدو نے اپنی عمر سے بڑی بات کرتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا اور دونوں دھند آلود صبح میں آگے بڑھنے لگے۔

"ویدو! پتا ہے کل میں نے اللہ سے مانگا ہے کہ میرا دسویں کے امتحان میں بڑے سوہنے نمبروں سے پاس ہو تو میں

تین دن کے روزے رکھوں گی۔'' فوزی نے بڑے مان اور بڑی محبت سے اپنے ساتھ چلتے ہوئے ویدو کو دیکھ کر کہا۔

''اوئے...... تو نے میرے لیے منت مانی ہے؟'' ویدو نے ہنستے ہوئے حیرت سے فوزی کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو بھلا بہنیں اپنے ویروں کے لیے منت نہیں مانیں گی تو کس کے لیے مانیں گی۔'' وہ اور گھر کے دوسرے بچے اسے بڑی سادگی سے ویر (بھائی) کہتے تھے۔ اس ویر کو وہ بھولی، ہمدرد اور خیر خواہ کے طور پر لیتے تھے۔

اسکول کا بوڑھا چوکیدار رحیم لوئی کی بکل مارے گٹھڑی بنا، ٹین کے ڈبے میں جلائی ہوئی آگ تاپ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے اشارہ کیا اور بلند آواز میں بولا۔

''آج دونوں ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے، چھٹی کرو۔''

اسکول جانے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ اس خاص لمحے کی روایتی خوشی سے سرشار ہوئے۔ ویدو نے واپسی پر کرموں بابا کی دکان سے آدھ درجن انڈے اور ایک ٹیسی مرہم لیا۔ ''چل میں بھی ''آپا باجی'' کی طرف ہی چلتا ہوں۔ انڈے ابال کر کھاتے ہیں اور گپ شپ کرتے ہیں۔ قسیم وغیرہ بھی خوش ہو جائیں گے۔'' ویدو نے فوزی کے جلے پر مرہم لگاتے ہوئے کہا اور مرہم دوبارہ لگانے کی ہدایت کرتے ہوئے ڈبی اسے تھما دی۔

ایسے ہر موقع پر فوزی کو لگتا تھا کہ جلتی بھی دوپہر میں کسی بادل نے اس کے سر پہ سایہ کر دیا ہے۔ ایسے لمحوں میں وہ سرشار ہو جایا کرتی تھی۔ سارے دکھ اور پریشانیاں کہیں پس منظر میں چلے جاتے تھے۔

دیگر بچے بھی اسکول میں چھٹی ہونے کی وجہ سے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ چھوٹے بچے گاؤں کی گلیوں میں کھیل رہے تھے اور ان کی دادیاں، نانیاں ادھ کھلے دروازوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ کہیں کہیں بڑے بوڑھے بیٹھے آگ سینک رہے تھے اور حقے گڑگڑا رہے تھے۔

''فوزی! پتا ہے نا اگلے مہینے گھوڑ شاہ کا میلا لگ رہا ہے۔'' ویدو اور فوزی اب گھروں کی طرف جاتے ہوئے کچے راستے پر چل رہے تھے جس کی ایک طرف کھیتوں میں پالک لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف کیکر اور ٹاہلی کے درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ انہی درختوں کے نیچے، اسی دھوپ چھاؤں میں ویدو، فوزی، قسیم، زینو اور فاروق کی سردیوں کی کئی دوپہریں اور گرمیوں کی کئی شامیں گزری تھیں۔

ویدو کی ماں نہیں تھی جبکہ فوزی کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ ان کی ماں بھی ان کے لیے مری چکی تھی۔ فوزی اپنی بہنوں قسیم، زینب اور چھوٹے بھائی فاروق کے ساتھ اپنی سوتیلی بہن یاسمین کے پاس ہی رہتے تھے جس کو وہ ''آپا باجی'' کہہ کر بلاتے تھے۔ یاسمین شادی شدہ اور تین بچوں کی ماں تھی اور وہ فوزی کے مرحوم والد کی پہلی بیوی سے سب سے بڑی اولاد تھی۔ ویدو کی ماں اور آپا باجی کی گہری دوستی تھی۔ پھر اپنی ماں کی وفات کے بعد بھی ویدو، آپا باجی کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور یہاں کے لوگ آپس میں رشتے داروں کی طرح رہتے تھے۔

ویدو، فوزی، قسیم، زینب اور فاروق ایک دوسرے سے دلی طور پر جڑے ہوئے تھے اور ان کی دنیا بھی ایک دوسرے کے ساتھ چلتی تھی۔ گاؤں کی مٹی ان کے چھوٹے چھوٹے دکھوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی گواہ تھی۔ کھٹی میٹھی بے شمار یادیں تھیں۔ آسمان ان کے صبح شام کے کھیلوں، معصوم شرارتوں اور ایک دوسرے کے لیے بے پناہ لگاؤ اور فکر کا چشم دید تھا۔ ویدو ان کے لیے جیسے ایک سورج تھا اور وہ چاروں ستارے۔

☆☆☆

''ہاں میں تو ہر صبح یاد کرتی ہوں کہ اب کتنے دن رہ گئے ہیں اور ہاں... ویدو! کل میں نے آپا رخو سے بات کی تھی۔ اس نے میلے پر میک اپ کا اسٹال لگانا ہے۔ اس کو میری مہندی بڑی اچھی لگتی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تو بھی میرے ساتھ اسٹال پر بیٹھنا اور تھوڑے بہت پیسے بنا لینا۔'' فوزی نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... یہ تو اچھا خیال ہے بھئی۔ مہندی تو تو واقعی بہت اچھی لگاتی ہے۔ خاص طور پر وہ بیل والا ڈیزائن۔ اس کی تو کیا ہی بات ہے۔'' ویدو نے ستائشی نظروں سے فوزی کا معصوم چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنی باریکیاں دکھا دیتی ہو اس ڈیزائن میں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ اور ہاں...... تجھے پتا ہے اس دفعہ میلے میں تیری ایک دیرینہ خواہش بھی پوری ہونے جا رہی ہے۔ اس دفعہ میلے میں موت کے کنویں کی جگہ کوئی ایرانی سرکس لگے گا۔'' ویدو کی یہ بات سن کر فوزی تو جیسے اچھل پڑی۔

''ارے ... وہی والا سرکس نا جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ تم شہر میں دیکھ کر آئے تھے؟'' فوزی کی بڑی بڑی آنکھیں تجسس بھری خوشی سے چمکنے لگیں۔ ویدو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''واہ — اس دفعہ تو بہت مزہ آئے گا۔ ہم سارے مل کر خوب جھولے لیں گے، کوئی ایرانی سرکس دیکھیں گے

اور بن کباب بھی کھائیں گے۔" وہ باتیں کرتے ہوئے گھر کی جانب بڑھے چلے جارہے تھے۔ معصوم دلوں میں پنپنے والی خوشی اور معصوم ارادوں نے انہیں اب ٹھٹھرتی ہوئی سردی سے بے پروا کر دیا تھا۔

☆☆☆

ویدو کا باپ نذیر احمد سفید تہ بند، کاسنی رنگ کی قمیص اور سفید پگڑی سر پر جمائے اپنے کام پر جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ شہر میں مقیم چودھریوں کی ایک زمین پر رکھوالی کرتا تھا۔ اسی زمین کے ایک حصے پر اس نے سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ بس اسی کام سے اس کے گھر کا خرچہ پانی اچھے طریقے سے چل رہا تھا اور ویدو کے پڑھائی کے اخراجات اٹھانے میں بھی اسے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اپنا ذہن بھی یہی تھا کہ ویدو پڑھ لکھ کر کسی اچھے مقام پر پہنچے۔ نذیر احمد نے جانے کے لیے گھر کا دروازہ کھولا تو سامنے فوزی اپنی چھوٹی بہن قسیم کے ساتھ کھڑی تھی اور ہاتھ میں کتاب تھی۔

"سلام چاچا!" فوزی نے مسکراتے ہوئے نذیر احمد کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! کیا حال ہیں دھی رانیوں کے؟" نذیر احمد نے شفقت سے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔

"ٹھیک ہیں چاچا...... چاچا! ویدو بھائی گھر پہ ہی ہیں؟ مجھے حساب کا ایک سوال سمجھنا ہے۔" اس نے قسیم سے انگلی چھڑا کر اپنی عمر اور قد کے مقابلے میں بڑی چادر سر پہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں پتر...... وے تیرا اندر ہی ہے۔ وہ بھی پڑھائی کررہا ہے۔ پوچھ لے جاکر، جو پوچھنا ہے۔" چاچا نذیر نے بڑی اپنائیت سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ فوزی چھوٹی قسیم کو انگلی لگائے اندر آگئی اور چارپائی پر ایک کنارے پہ بیٹھ گئی۔ رسمی باتوں کے بعد ویدو اس کا مطلوبہ سوال اس کو سمجھانے لگا۔ سوال سمجھ کر وہ بولی۔

"ویدو بھائی! یہ پیسے آپ اپنے پاس رکھ لو۔" اس نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی مٹھی ویدو کے آگے کھولتے ہوئے کہا جس میں دس دس والے چند نوٹ نظر آرہے تھے۔

"یہ کیا ہے فوزی؟" ویدو نے کچھ نہ سمجھ آنے والے انداز میں اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویدو بھائی! میں روزانہ کا جیب خرچ جوڑ رہی ہوں، میلے کے جھولے لینے کے لیے۔ قسیم اور فاروق بڑے ہوگئے ہیں۔ وہ بھی اس دفعہ میرے ساتھ لیں گے جھولے۔ اگر آپا باجی نے یہ پیسے دیکھ لیے تو اسے پتا چل جائے گا کہ میں جیب خرچ جوڑ رہی ہوں۔ وہ مجھ پر سخت غصہ ہوگی اور جیب خرچ بھی بند کردے گی۔ ایک دفعہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔" فوزی نے ایک ہی سانس میں اپنی ساری پریشانی ویدو کے گوش گزار کردی۔ ویدو خاموش رہا۔

"بس آپ رکھ لو نا۔ میلے والے دن میں لے لوں گی بلکہ ہم اکٹھے ہی تو جاتے ہیں میلے میں تو یا آپ اپنے پاس ہی رکھنا۔"

"چل ٹھیک ہے، رکھ لیتا ہوں۔" ویدو بولا اور پیسے اس کے ہاتھ سے لے لیے۔

"ویسے میں بھی تھوڑے پیسے جوڑ رہا ہوں اور اس دفعہ بن کباب تجھے میں کھلاؤں گا اور قسیم اور زینو کو جلیبیاں لے دوں گا۔" ویدو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور منصوبے ایسے ہی ہوتے تھے۔

"چل ٹھیک ہے۔ آپا باجی انتظار کررہی ہوں گی۔ تو گھر جا اب اور اس سوال کی خود بھی مشق کرنا۔ امتحانوں کی تیاری اچھی جارہی ہے نا تیری؟" ویدو نے ایک ذمے دار بڑے بھائی کی طرح پوچھا۔

"ہاں ویدو...... بس رات کی روٹیاں بنا کر اور سب کو کھانا دے کر میں بس چپ کرکے پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتی ہوں۔" فوزی نے پھر قسیم کا ہاتھ تھاما اور گھر کی طرف بڑھ گئی۔

"فوزی! اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ اکیلے گھر سے نہ نکلا کرو۔ فاروق یا قسیم کو ساتھ لے لیا کرو۔" ویدو نے ایک دفعہ فوزی کو تنبیہ کی تھی اور فوزی نے تب سے اس بات کو اپنے پلے سے باندھ لیا تھا۔ وہ اس منع کرنے کی اصل وجہ فوزی کو نہیں بتا پایا تھا۔ فوزی اکثر پڑھائی میں مدد لینے کے لیے اس کے گھر آتی تھی۔ وہ اپنے اور اس کے رشتے کی پاکیزگی کی خود تو گواہی دے سکتا تھا لیکن لوگوں کی سوچوں اور زبانوں پر پہرا نہیں بٹھا سکتا تھا۔ وہ یہ چیزیں اب سمجھنے لگا تھا۔

☆☆☆

"کدھر گئی تھی تو؟" فوزی گھر آئی تو آپا باجی پیسے پہلے سے پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ وہ ہنڈیا بنانے کے لیے لکڑیاں جلارہی تھی اور اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ کچھ دھوئیں سے اور شاید کچھ غصے سے۔

"سوال تو سمجھ آتی ہے۔ پر میری بات تیرے پلے نہیں پڑتی، نہ ہی تو سمجھنا چاہتی ہے، مرن جوگی۔" یاسمین نے وہ ڈنڈا گھما کر اس کی طرف پھینکا جس سے وہ آگ کے شعلے تیز کرنے کے لیے لکڑیوں کو ہلارہی تھی۔ فوزی نے اپنے ساتھ کھڑی قسیم کو ایک طرف دھکا دیا اور خود بھی بچنے کی

کوشش کی پر ناکام رہی اور ڈنڈے کا کنارا پورے زور سے اس کی پنڈلی پر لگا۔ فوزی نے ''سی'' کی آواز کے ساتھ اپنی پنڈلی پکڑی اور بیٹھ گئی۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے پاؤں کے پاس گری۔

''پڑھائی شوھائی کے چونچلے چھوڑ دے تو اب۔ باپ چلتی ہوئی فیکٹری نہیں چھوڑ گیا جو تیری پڑھائی کے خرچے ہوتے رہیں۔ گھر میں روٹی سالن کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور تجھے کتابوں پنسلوں کی پڑی ہوئی ہے......''

آپا باجی بری طرح بھڑک اٹھی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں کچھ مزید پھیل گئی تھیں اور سرخ ہو کر خوفناک دکھ رہی تھیں۔ فوزی کو آپا باجی کی ایسی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا تھا اور وہ اسے اس کے ماں باپ کی یاد میں تڑپا دیتی تھیں۔

''وہ...... آپا باجی...... میں بس ویدو بھائی سے سوال پوچھنے گئی تھی۔'' اس نے نظریں اٹھا کر آپا باجی کو دیکھا اور اس کی شعلہ بار نگاہیں اور بھنچے ہوئے جبڑے دیکھ کر نظریں پھر سے جھکالیں۔

''کتنی دفعہ تجھے سمجھایا ہے کہ اب بڑی ہوگئی ہے تو، کوئی بچی نہیں رہی ہے جو جہاں دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر چل پڑتی ہے۔ نہ گھر بار کا خیال، نہ کوئی اپنی ذمے داری۔'' آپا باجی کے تیور یکدم مزید بھیانک ہوگئے۔

''نہیں! ایسے نہیں تجھے پتا چلے گا...... اندازہ ہے نا تجھے کیا گل تیری ماں نے کھلایا تھا...... تیرے چال چلن بھی کچھ ایسے ہی لگ رہے ہیں مجھے۔ ایسے نہیں پتا چلے گا تجھے۔'' اس نے عجیب خونخوار لہجے میں کہا۔

''تجھے پتا تب چلے گا جب تجھے لگ پتا جائے گا۔'' وہ کچھ دیر بیٹھی ہوئی فوزی کو ایسی خون آشام نظروں سے دیکھتی رہی۔ چولہے میں بالن پوری طرح بھڑک اٹھا تھا۔

''چل آ ادھر۔ بالن جل گیا ہے۔ ہانڈی چڑھا آ کر...... یہ جو پڑھ لکھ رہی ہے، کیا کرے گی اس کے بعد، پتا ہے تجھے؟ روٹیاں ہی پکائے گی۔ چولہے ہی بالے گی۔'' یاسمین نے روٹیاں بنانے والے انداز میں تھپ تھپ کر کے فوزی کو دکھایا اور اٹھ کر چلی گئی۔ فوزی چپ چاپ آنسو پونچھتی ہوئی ہانڈی بنانے لگی۔

آپا باجی کے بگڑتے ہوئے رویے کو وہ دیکھ رہی تھی اور اس کی اصل وجہ بھی جانتی تھی۔

یاسمین اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ساتھ ان یتیم بچوں کا بھی خیال رکھتی تھی جن کے سر پہ نہ باپ کا سایہ تھا اور نہ ہی ماں کا۔ ان بے چارے بچوں کے لیے ساری دنیا میں یہ سوتیلی بہن ہی رہ گئی تھی۔ ان کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی اسی بہن کے طفیل پوری ہو رہی تھیں لیکن بہرحال یہ بچے اس کی اپنی اولاد نہیں تھے۔ یہ بچے اس کی سوتیلی ماں کے بچے تھے۔ وہ اس عورت کے بچے تھے جس کو اس کا باپ اس کی اپنی ماں کے مرنے کے بعد گھر لے آیا تھا۔ یاسمین ان لوگوں میں سے تھی جو چھوٹوں کا خیال تو رکھتے ہیں، ضرورتیں بھی پوری کرتے ہیں مگر...... وہ ان کو پوری طرح سے اپنے تسلط میں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جن پر وہ احسان کر رہے ہیں، وہ سانس بھی ان کی مرضی سے لیں۔ وہ اپنی زندگیوں کو ان کی منشا اور حکم کے تابع کریں۔ فوزی اور اس کے بہن بھائی بھی ایسے ہی حالات کا شکار تھے۔ البتہ ان کی اندھیر نگری میں اگر کوئی روشنی کی کرن تھی تو وہ ویدو ہی تھا۔ وہ اس کی سنگت میں ہمیشہ خوش رہتے اور انہیں محسوس ہوتا کہ اس دنیا میں کوئی ہے جس کے لیے ان کی خوشی اہم ہے۔ ویدو خود بھی ایک بچہ ہی تھا پر ان بچوں کی محبت نے بڑے ہونے کا احساس بچپن سے ہی اس کے دل میں بٹھا دیا تھا۔ وہ ان بچوں کے لیے ان کا بڑا بھائی بھی تھا اور دوست بھی۔ تقریباً روز ہی شام سے کچھ پہلے وہ سب بچے سامنے کیکر کے درختوں والے میدان میں چلے جاتے تھے۔ یاسمین کے دونوں بچے بھی ان کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ ان کے پسندیدہ کھیل باندر کلا اور اونچ نیچ تھے۔ اونچ نیچ میں کیکر کے درختوں کو انہوں نے اونچ بنا رکھا تھا۔ پکڑنے والے سے نظر بچا کر انہیں جگہیں تبدیل کرنا ہوتی تھیں۔ پر اب کچھ عرصے سے ویدو ان بچوں کے کھیلنے کے ذوق میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہا تھا اور انہیں بیٹھ کر کھیلنے والے کھیلوں کی طرف لا رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ ایک بڑی سی لوڈو بھی لے کر آیا تھا۔ وہ بڑے غیر محسوس انداز میں فوزی کے حوالے سے اپنے تعلق میں ضابطہ اور حدود قائم کر رہا تھا۔ اسے اپنے بارے میں فکر نہ تھی پر فوزی...... اس کی طرف کوئی انگلی اٹھاتا، یہ اسے گوارا نہ تھا۔

☆☆☆

آج اسکول سے واپسی پر فوزی خلاف معمول خاموش تھی جبکہ ایسا ہوتا نہیں تھا۔ گھر میں چاہے وہ کتنی ڈانٹ ڈپٹ سن کر آئی ہو، وہ سارے رستے ویدو سے باتیں کرتی رہتی۔ آج کل وہ رستے میں ایک جگہ رک کر کالے شہتوت بھی توڑ رہے تھے۔ پر آج تو جیسے اس کی آنکھیں بس اپنے قدموں پر جمی ہوئی تھیں۔

''کیا بات ہے، چپ چپ کیوں ہو؟'' اس نے آج صبح

اسکول آتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ وہ کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ وہ سارا دن سوچتا بھی رہا تھا۔ اسے یہی لگا کہ شاید آپا باجی نے کوئی مار پیٹ کی ہے اس کے ساتھ۔ فوزی، ویدو کے سوال پر چونکی لیکن خاموشی برقرار رہی۔

''بتانا فوزی! کیا بات ہے۔ آپا باجی نے کچھ کہا ہے کیا؟''

''ہاں اکل اس نے مجھے بہت ڈانٹا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کھانے کا خرچہ پورا نہیں ہوتا تو تمہارے اسکول کا خرچہ کیسے دیں۔'' فوزی کی آواز رندھ گئی۔ بڑی مشکل سے بولی۔

''ویدو بھائی! مجھے لگتا ہے بہن مجھے اسکول سے اٹھالے گی۔'' یہ کہہ کر وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

ویدو اور فوزی دونوں چلتے چلتے اب رک گئے تھے۔

''او پگلی! ایسے کیوں سوچتی ہو؟'' اس نے فوزی کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور سفیدے کے ٹوٹے ہوئے تنے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا جس پر آتے جاتے راہ گیر تھوڑی دیر ستانے کے لیے بیٹھ جاتے۔ اس نے فوزی کو بٹھایا اور تھوڑا ہٹ کر خود بھی بیٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر چاچا نوردین کے کپاس کے کھیت میں بڑے زور و شور سے ہل چل رہا تھا۔

''دیکھ فوزی! پہلے اپنے آنسو صاف کر۔'' ویدو نے بہت کم فوزی کو روتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کا دل بری طرح دکھنے لگا تھا۔ وہ گھر میں بڑی سختیاں برداشت کرتی تھی لیکن ویدو پر اپنا دکھ کم ہی ظاہر کرتی تھی۔ فوزی اپنے ہلکے نیلے رنگ کے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ اندر کے درد نے یکدم اس کی آنکھوں کو سرخ کردیا تھا۔

''دیکھ فوزی! آپا باجی جیسی بھی ہے، وہ تم بچوں سے ہمدردی رکھتی ہے۔ خیال رکھتی ہے۔ وہ غصے میں کچھ بول گئی ہوگی لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ اسکول سے تمہیں اٹھوالے گی.....'' ویدو کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ فوزی بول پڑی۔

''پر ویدو، ابا وہاں ورکشاپ پر جو آٹو مکینک کا کام کرتا تھا وہ چھوڑ کر اب کسی اور گاؤں چلا گیا ہے اور اب دو مہینے ہوگئے ہیں وہاں سے کوئی پیسا گھر نہیں آیا۔ اسی سے تو آپا باجی ہمارا خرچہ کرتی تھی۔ پر اب شاید پیسے نہیں آرہے تو آپا باجی ہر وقت ہم پر غصہ کرتی رہتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اچھا بس فوزی! ایسے نہ کر۔'' ویدو نے ایک مرتبہ پھر فوزی کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

''دیکھ اگر ایسی بات ہوئی بھی نا تو میرا یقین رکھ، تیرے اسکول کی فیس میں خود ادا کروں گا اور باقی خرچوں کو بھی دیکھ لیں گے۔ اپنے بھائی کو بھول گئی ہو کیا؟'' ویدو کی آنکھوں میں صرف اور صرف سچائی تھی۔

''آنسو پونچھ اچھے۔ اب ایک آنسو نہ نکلے تمہارا۔'' ویدو نے فوزی کو سختی سے رونے سے منع کیا۔

''دیکھ، ابا کو بھی تم سب بچے بہت اچھے لگتے ہو۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ بھی تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ ضرور مدد کریں گے ہماری۔'' ویدو کی باتوں میں جو اپنائیت کی جھلک تھی، وہ بالکل سچی اور کھری تھی۔ سچ اثر چھوڑتا ہے۔ فوزی کا اترا ہوا چہرہ یکدم ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ تنہا نہیں ہے بلکہ ایک بہت مضبوط چٹان کی اوٹ میں کھڑی ہے۔ وہ چٹان اس کو اور اس کے بہن بھائیوں کو تند و تیز آندھیوں کے سپرد نہیں ہونے دے گی۔ دور چاچا نوردین کے کھیت میں کپاس کا بیج پھینکا جارہا تھا۔ اس کھیت پر بہت محنت ہوتی تھی۔ بے شمار مرحلوں سے گزرنے کے بعد پھر محنت کا پھل ملتا تھا۔

ویدو نے فوزی کو اپنی پتلون کی جیب میں سے کاغذ میں لپٹی ہوئی گڑ کی ڈھیلی نکال کر دی جس میں بادام کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔

''یہ لے..... یہ کھا۔ جتنے آنسو بہائے ہیں نا تُو نے، دماغ کی طاقت آدھی رہ گئی ہوگی تیری اور چل اب اٹھ شاباش! گھر جاکر جلدی سے اپنے حصے کے کام کر اور پھر اگلے امتحان کی تیاری کرنے بیٹھ جا۔ انگریزی کا پیپر ہے نا تیرا اب!'' ویدو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ فوزی نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ گئی۔

''آخری پیپر ڈرائنگ کا ہے۔'' فوزی بولی۔

''ہاں بھئی ڈرائنگ تو تیرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تُو ماسٹر ہے اس میں۔'' بس وہ اسی طرح گھر کی طرف چلتے رہے اور ویدو اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے ہلکی پھلکی گفتگو کرتا رہا۔ بیلے کا ''چان'' بھی گفتگو میں سرفہرست رہا۔

سندر پور کے صبح و شام ایسے ہی گزرتے چلے جارہے تھے۔ وہاں کے کھیتوں کی آنکھوں میں اپنے اپنے سپنے سجے رہتے تھے۔

''ویدو! واقعی شہر میں کھلی کھلی سڑکیں اور چمکیلی گاڑیاں ہوتی ہیں؟'' فوزی نے کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھی تسیم، زینو اور فاروق سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ویدو اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ٹوٹی ہوئی سوکھی ٹہنیوں سے کچی زمین پر نقش و نگار بنانے میں مصروف تھا۔ وہ پچھلے مہینے اپنے ابا کے ساتھ لاہور شہر گیا تھا اور پانچ چھ دن رہ کر کل ہی واپس لوٹا تھا۔ شہر کے مضافات میں جن چودھریوں کی زمین پر

ویدو کا ابا رکھوالی کرتا تھا، وہ ویدو کے ابا کو تین مہینے کی اکٹھی تنخواہ دیتے تھے۔ کبھی وہ پیسے اپنے کسی بندے کے ذریعے گاؤں پہنچا دیتے، کبھی نذیر احمد کو خود شہر جانا پڑتا۔ وہ لوگ گاؤں میں "چوہدریوں" کے نام سے مشہور تھے لیکن اصل میں وہ لوگ بڑے سلجھے ہوئے، تعلیم یافتہ اور اچھے اخلاق کے لوگ تھے۔ ان کے ایک چھوٹے بیٹے سے ویدو کی خاص طور پر بڑی پکی دوستی تھی۔

"ہاں فوزی! بہت بڑی بڑی سڑکیں ہیں، بڑے بڑے گھر اور چمکیلی گاڑیاں...... اور پتا ہے وہاں کی ٹافیاں بڑی نرم اور شہد والی ہوتی ہیں۔" ویدو اپنے تصور میں ان چمکیلے کاغذ والی ٹافیوں کی لذت کو تازہ کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا...... ہم لوگ بھی شہر جا کر نہیں رہ سکتے؟" فوزی نے کھوئے کھوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ابا کہتے ہیں کہ ادھر بڑے پیسے والے لوگ ہی رہ سکتے ہیں کہ یہاں تو تم دس روپے میں کرمو بابا کی دکان سے ڈھیروں کھانے پینے کی چیزیں لے لیتے ہو، وہاں جاؤ گے تو اتنے پیسوں میں بس ایک ٹافی ہی ملے گی۔"

"اچھا، پھر تو ہم ادھر ہی ٹھیک ہیں۔" فوزی نے اٹھ کر اپنا گھگھا سا فراک جھاڑا اور بکھری ہوئی سنہری مائل بالوں کی لٹیں اپنے کانوں کے پیچھے اڑس لیں۔

"نہیں فوزی...... دیکھنا ہم زیادہ زیادہ پڑھائی کریں گے اور بہت آگے جائیں گے اور پھر تمہیں شہر گھماؤں گا پکا...... شہر میں گھر بنا کر دوں گا اور وہ جو نرم شہد والی ٹافیاں ہیں نا، ان کے ڈبے لے کر دوں گا۔" ویدو نے اس عمر کی تمام تر معصومیت سمیٹتے ہوئے کہا۔ وہاں کے مناظر وہ کیکر کے درخت اور ڈوبتا سورج یہ بات نہ جان سکے کہ ویدو کے معصوم ذہن میں بڑے بڑے ارادوں کی بھرمار چل رہی تھی۔ تناور درخت کی طرح اس نے چپکے چپکے اس کی روح میں اپنی جڑیں گاڑ دی تھیں اور یہ تھی اسی معصوم چھوٹی سی فوزی کی محبت...... جس کے سنگ اس کے بچپن کے یادگار لمحے بیتے تھے۔ یہ محبت ہر گزرتے دن کے ساتھ کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر اس کے اندر پروان چڑھتی گئی۔ وہ اب اس محبت کی نوعیت اچھی طرح جان چکا تھا پر اس سے آنکھیں چراتا تھا۔ اسے تسلیم نہیں کرتا تھا جبکہ وہ محبت اپنی منہ زور طاقت اور حقیقت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی۔ وہ کبھی کبھی پشیمان سا بھی ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

فوزی کے خدشے نے یکدم ہی حقیقت کا روپ دھار لیا جب آپا باجی کے نیم تاریک کمرے میں اس کے شوہر سے ہونے والی گفتگو کے آخری جملے کھڑکی کے کھلے پٹ سے ہوتے ہوئے اس کے کانوں تک پہنچے۔

"بھاڑ! میں نے تو کہہ دیا ہے جو کہنا تھا اور یہی میرا ارادہ ہے۔ بس کل کا دن یہ اسکول چلی جائے پھر میں نے اسے اسکول نہیں بھیجنا۔ ہاں...... بڑے ہو گئے چونچلے۔ بس اب ہانڈی چولہا سنبھالے۔"

فوزی بے بسی کے درد سے بلک اٹھی جیسے ایک معصوم بچے سے کسی طاقتور نے اس کا کھلونا چھین لیا ہو۔ آنسوؤں نے حلق میں گرہ سی ڈال دی۔ فوزی کتنی ہی دیر اپنے کمرے میں آ کر روتی رہی۔

"آج اگر ابا زندہ ہوتے تو وہ کبھی بھی مجھے ایسے اسکول سے اٹھانے کا نہ سوچتے۔" آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دبے دبے الفاظ سسکیوں میں گونجنے لگے۔

اگلے دن وہی ہوا جو اس نے سنا تھا۔ آپا باجی نے اسے کہہ دیا کہ وہ آج آخری دن اسکول جا رہی ہے۔ اپنی دوستوں وغیرہ سے بھی مل آئے اور ماسٹر کو بھی بتا آئے۔ فوزی کی آہ و بکا کا آپا باجی نے کوئی اثر نہ لیا اور اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"آج ویدو کے ساتھ نہ آنا، میں خود لینے آؤں گی۔" آپا باجی بولی اور اپنے کام میں لگ گئی۔

آج بھی موسم بڑا سرد تھا۔ دھندلایا ہوا سورج اور برف میں لگے ہوئے کھیت کھلیان، پر آج باہر کے موسم سے کہیں زیادہ فوزی کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ اسکول کی جانب جاتے ہوئے اس کے راستے پر آنسو گر رہے تھے اور امر ہو رہے تھے۔ ہونٹ بالکل خاموش تھے۔ ان پر آنسوؤں کی نمی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

"آپا باجی نے کہہ دیا ہے کہ آج تو آخری دن اسکول جا رہی ہے۔ اب تو ہانڈی چولہا سنبھالے گی۔" فوزی، ویدو کو اپنی پڑھائی کے متعلق ہونے والے فیصلے کے متعلق بتا چکی تھی۔ فوزی اس بات کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ رہی تھی۔ اس بات کے بعد ویدو سارے رستے خاموش رہا تھا۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ ویدو نے کسی پریشانی پر اس کی ہمت نہ بندھائی ہو، دلاسا نہ دیا ہو۔ ویدو کی دور اندیش نظریں آپا باجی کے اس اچانک کیے گئے فیصلے کے پیچھے کسی زیادہ بڑے اور ناخوشگوار فیصلے کی جھلک دیکھ رہی تھیں۔ اسے ایک شبہ سا تھا۔

☆☆☆

"آپا باجی کدھر جانا ہے ہمیں؟" اسکول سے واپسی پر گھر جانے والے راستے کے بجائے یاسمین نے کھیتوں کے

بیچ میں سے جانے والا ایک اور راستہ لیا تو فوزی نے جھجکتے جھجکتے لہجے میں سوال کر ڈالا۔

"نذیراں درزن کے پاس۔" آپا باجی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

فوزی نے مزید کوئی سوال جواب نہ کیا اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد آپا باجی خود ہی بولی۔ "تجھے رلایا ہے تو تجھے تھوڑا خوش بھی کر دوں نا۔" آپا باجی نے بڑی گہری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی بڑا راز اس پر فاش کرنا چاہ رہی ہو۔

درزن کے گھر پہنچ کر بہن نے اسے اپنی شادی کا ایک سوٹ تھمایا اور بولی کہ اس کو فوزی کے ناپ کا کر دو۔

"خیر ہے بھرجائی! لگتا ہے کہ فوزی کی کوئی خوشخبری ہے۔" درزن نے اپنی چالاکی سے بھرپور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے فوزی کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں نذیراں! ہم نے رشتہ طے کر دیا ہے اس کا۔ شادی کر رہے ہیں اس کی۔" آپا باجی نے ایک مرتبہ پھر فوزی کو گہری مگر سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور فوزی کو لگا جیسے کسی نے گرم سلاخ اس کے سینے کے اندر گھونپ دی ہے۔

"اچھا! مبارکاں ہو بھئی۔ ہاں..... اب باقی تھوڑی رہی ہے، جا کر اب اپنا گھر بسائے۔" درزن نے کپڑوں کو الٹا سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

آپا باجی نے فوزی کا چہرہ دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ ابھی یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے گی یا پھر بے ہوش ہو جائے گی۔ فوزی نے آپا باجی سے بڑی سخت ماریں کھائی تھیں لیکن جو درد اس نے اس وقت فوزی کے چہرے پر دیکھا، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

فوزی کا دھیان بٹانے کے لیے آپا باجی بولی۔ "ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہے ہماری طرف ..... ابھی ساری بات بتاؤں گی تو تیری تسلی ہو جائے گی۔"

درزن نذیراں بولی۔

"جا فوزی! کچن سے چائے پیالوں میں ڈال کر لے آ۔ میرا خیال ہے بن گئی ہوگی۔"

"ویسے خیر سے رشتہ کہاں کیا ہے؟" نذیراں نے چارپائی پر آپا باجی کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ..... اپنی یاسمین کا بڑا بیٹا نہیں ہے بالا..... اسی سے طے کیا ہے۔" آپا باجی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"بالا.....؟" نذیراں کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے کچھ بڑی ہو گئیں۔ "پر وہ تو عمر میں فوزی سے کافی بڑا ہے۔ اس کی تو پہلے بھی شادی ہوئی تھی نا..... پھر طلاق دے دی تھی شاید اس نے۔"

آپا باجی نے انگلی کے اشارے سے نذیراں کو آہستہ بولنے کے لیے کہا۔ "ہاں نذیراں..... پر اس میں بالے کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ عورت مرن جوگی خود ہی اچھی نہیں تھی۔ بدزبان تھی۔ بندہ کچھ کہہ دیتا تو بدزبانی کرتی تھی۔"

نذیراں دھیمی آواز میں بولی۔ "ویسے یاسمین بھرجائی..... تو چنگا ہی کر رہی ہے۔ جتنی جلدی ایسی کڑیوں کا ویاہ ہو جائے اتنا ہی ٹھیک ہے۔ ہمیں تو پتا ہی ہے نا اس کی ماں نے جو کچھ کیا تھا....."

اتنے میں فوزی کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی اور وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ ان کی نظروں کی تیزی اور یکدم خاموش ہو جانے پر فوزی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے کو نہیں آ رہے تھے اور اب وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ یاسمین جان چکی تھی کہ نذیراں پوری طرح سے اس معاملے میں اس کی ہم خیال ہے۔ وہ نذیراں کو یہ بھی بتا چکی تھی کہ شادی کے بعد بالا ان کے مرحوم ابا کی ورکشاپ پر بیٹھے گا اور ان کا خرچہ پانی بھی آسان ہو جائے گا۔ یاسمین نے وہیں بیٹھے بیٹھے نذیراں کے سامنے فوزی سے کھل کر بات کی۔ ان دونوں نے مل کر فوزی کو بری طرح ہراساں اور قائل کیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے یہ موقع گنوا دیا تو اس کی اور اس کے بہن بھائی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ کھانے پینے کو ترس جائیں گے اور اگر وہ یہ قربانی دے دے تو ساری زندگی گھر بیٹھ کر کھائے گی اور اپنے بہن بھائیوں کے خرچے بھی پورے کرے گی۔ فوزی یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور گڑگڑاتے ہوئے اپنی آپا باجی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"آپا باجی! مجھے شادی نہیں کرنی۔ مم..... مجھے پڑھنا ہے ابھی۔ خدا کے لیے میرے ساتھ ایسا نہ کریں۔ میں نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسکول نہیں جاؤں گی پر..... میری شادی نہ کریں۔" فوزی کا معصوم دل شادی کے نام پر کسی جاں بہ لب پرندے کی طرح پھڑکنے لگا۔

اب کی بار یاسمین کا تنا ہوا چہرہ یکدم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ترس کھانے والی نظروں سے فوزی کی طرف دیکھا، اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے سہارا دے کر اپنے پاس بٹھایا۔

"دیکھ فوزی! ابا کا اب ٹھیک نہیں رہتا۔ بھٹی پر بھی کبھی کبھار ہی جاتا ہے۔ حالات بہت تنگ ہیں۔ تیری

شادی ہو جائے گی تو بالا ورکشاپ پر کام کرے گا۔ اس نے سیکھا ہوا ہے ورکشاپ کا کام۔ وہ ابا کی ورکشاپ چالو کرے گا پھر تیرے بہن بھائی کا خرچہ بھی آنے لگے گا اور پھر بالا...... بڑا اچھا لڑکا ہے۔ دیکھنا ہاتھ کے چھالے کی طرح رکھے گا تجھے۔ ہر خواہش پوری کرے گا۔ ہمارے پنڈ کا ہر چھوٹا بڑا تعریف کرتا ہے اس کی میٹھی زبان کی۔ وہ پہلی بیوی تو نصیبوں جلی تھی جو ایسے بندے کے دل پر راج نہ کر پائی۔'' آپا باجی نے بڑے پیار سے اس کے بکھرے ہوئے شہد رنگ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور بے بسی کے سارے رنگ فوزی کے معصوم چہرے پر آ کر جمنے لگے۔

سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ جیسے چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ اسی دن بالے سمیت اس کے کچھ دوست اور اس کے گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آئے جنہیں وہ اپنے رشتے داروں کے طور پر لے کر آیا تھا۔ وہ لوگ اگلے ہفتے شادی کے لیے جمعے کا دن مقرر کر کے چلے گئے۔ اس دن پہلی بار اس نے بالے نامی اس بندے کو دھیان سے دیکھا تھا۔ کچھ رعایت دے کر درمیانہ قد، گہرا سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، آدھے سے زیادہ سفید سر جس کو اس نے مہندی لگا کر چھپانے کی کوشش کی تھی اور اس پر جب اس پینتیس چھتیس سال کے فربہ اندام بندے نے مسی زدہ دانتوں سے مسکرا کر فوزی کو دیکھا تو اس کا کلیجا کٹ کر رہ گیا۔

دن رکھنے کی تقریب میں ویدو نے بھی اس بالے نامی شخص کو پہلی دفعہ دیکھا تھا اور اس کے دل کی جو حالت تھی وہ چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ اس نے آپا باجی کو ایک طرف لے جا کر بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن آپا باجی نے خونخوار نظروں سے دو تین بڑے سخت جملے بول کر اسے اپنی زبان بند رکھنے کو کہا۔ ویدو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر اس عورت سے پوچھے کہ ایک یتیم، مسکین، بے سہارا بچی سے وہ کون سا بدلہ لینا چاہ رہی ہے۔ فوزی نے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے ایک دو مرتبہ ویدو کو دیکھا تھا۔ اس کا چارہ گر، اس کی دلجوئی کرنے والا آج خود بہت دلبرداشتہ اور تھکا ہوا دکھ رہا تھا۔ مہمانوں کے جاتے ہی ویدو بغیر کسی سے کوئی بات کیے گھر سے نکل گیا۔ فوزی اسے خالی خالی نظروں سے بند کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی رہی۔ اس نے جاتے ہوئے بھی ویڑھے کا دروازہ اچھا خاصا زور سے بھیڑا تھا۔

وہ ساری رات فوزی نے جاگتے ہوئے گزاری۔ کبھی دل میں بغاوت کا خیال پیدا ہوتا کہ یہاں سے بھاگ جائے۔ کہیں ایسی جگہ چلی جائے جہاں اس تک اس کی مجبوریاں یا سوتیلی بہن کی زور زبردستی نہ پہنچ سکے۔ وہ اپنی مرضی سے جیے پر پھر اس کے کانوں میں آپا باجی کے الفاظ گونجنے لگتے۔

''کیا گل کھلایا تھا تیری ماں نے۔ تیرے چال چلن بھی مجھے کچھ ایسے ہی لگتے ہیں۔'' بس انہی سوچوں اور کشمکش میں رات کا چاند ڈھلنے لگا۔ اپنے چھوٹے سے اندھیرے کمرے کی کھڑکی سے اس نے تھکے ہارے چاند کو سامنے ساتھ والے کے گھر کی منڈیر پر بیٹھے دیکھا۔ ساتھ میں سوتی شمیم نے کروٹ لی تو اس کا معصوم کمزور سا چہرہ اس کی آنکھوں کو بھگو گیا۔ اس کے نحیف بازو اس کو اپنے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ وہ میچے بند آنکھوں سے بھی اپنی بہن کو دیکھ رہی تھی۔ آپا باجی کے الفاظ ایک مرتبہ پھر کانوں میں گونجے۔

''اگر یہ موقع گنوا دیا تو تم اپنے ساتھ ان بچوں کی زندگیاں بھی برباد کرو گی۔ روٹی کپڑے کو ترس جائیں گے یہ۔''

رات کے چاند کی طرح اس کے معصوم ذہن کے خواب اور جذبات بھی تھک ہار کر دل کے کسی اندھیر خانے کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

☆☆☆

اس دن صبح سے ہی گاؤں کے گھروں سے دودھ کی گڈویاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ رواج کے مطابق شادی کے دن سے ایک دن پہلے گاؤں کے باقی گھر اپنے تعاون کی نشانی کے طور پر دودھ کی گڈویاں شادی والے گھر پہنچاتے تھے۔ خاص طور پر تب جب شادی گاؤں کی بیٹی کی ہوتی تھی۔ لڑکی یا لڑکے کے قریبی دوستوں کے گھروں سے وہ گڈویاں عموماً سجی سجائی آتی تھیں۔ رنگ بھر کر یا چمکیلے فیتے لگا کر انہیں سجایا جاتا تھا۔

''بابا! آپ تو بھاء سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ کیسا ظلم ہے۔ کس نے ہمیں اختیار دیا ہے کہ ہم کسی کی زندگی کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیں۔ صرف اس وجہ سے کہ دوسرا ناتواں ہے، کمزور ہے۔ اپنے پر ہونے والی زیادتی پر کھل کر احتجاج نہیں کر سکتا۔ فوزی کا کیا قصور ہے؟ بس اتنا کہ وہ ایک لڑکی ہے، یتیم ہے، تو بس ڈھور ڈنگر کی طرح جہاں چاہا باندھ دیا۔'' صحن میں جلتے لکڑیوں کے الاؤ کے گرد بیٹھے باپ بیٹے کے درمیان گفتگو چل رہی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں ویدو کا تنا ہوا چہرہ اور آنکھوں کے سرخ ڈورے کچھ اور بھی واضح ہو رہے تھے۔ بے بسی کا درد آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

نذیر احمد آگ کی روشنی میں اپنے بیٹے کی آنکھوں میں وہ کچھ دیکھ رہا تھا جو اب تک ویدو خود نہیں دیکھ پایا تھا۔ یکدم فکر کی لکیریں اس کے چہرے پر ابھریں۔

''او پتر...... بیٹیاں جب جوان ہونے لگیں تو جتنی جلدی ہو سکے شادی کر دینی چاہیے ان کی۔ پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے انہوں نے۔ چاہے مٹی پڑھے، چاہے سولہ...... کرنا اس نے ہانڈی چولہا ہی ہے۔ اب فوزی کو ہی دیکھ لو۔ اچھے گھر کی ہونے جا رہی ہے۔ پڑھائی کہاں کام آئے گی اس کے۔ بس اپنے سر کے سائیں کی فرماں بردار رہے تو ڈھیروں خوشیاں پائے گی۔'' نذیر احمد نے یوں کر حقے کا لمبا کش بھرا۔

''دیاہ کے دو دن بعد تو میلا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میلے پر اپنے بھینسے کی بھی قیمت لگوا لیں۔'' نذیر احمد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ میلے کا سن کر ویدو کے سینے میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس نے ہلکے سے سر ہلایا اور خاموشی سے اندر کمرے میں آ گیا۔

ویدو نے اس رات بیٹھ کر دودھ کی گڈوی کو سجایا جو اگلے دن اسے آپا باجی کے گھر پہنچانی تھی۔ اس نے اپنی سیاہ دوات اور قلم سے اس پر وہی ڈیزائن بنایا جو فوزی اپنی مہندی میں بناتی تھی۔ ایک چھوٹے پتوں والی لمبی بیل جس کے درمیان سے باریک گول ہوتی ہوئی پھولدار شاخیں نکلتی ہیں اور اس بیل کے شروع اور آخر میں ایک ستارہ تھا۔ یہ ڈیزائن فوزی کو بہت پسند تھا۔ وہ جب بھی مہندی لگاتی تھی، یہ ڈیزائن ضرور بناتی تھی۔ ویدو بھی اسے مذاق سے کہتا۔ ''یہ جو تمہاری پسندیدہ بیل ہے نا، یہ تو میں بھی آنکھیں بند کر کے اب بنا سکتا ہوں۔'' پھر وہ توقف سے کہتا۔ ''دنیا فنا ہو جائے، تمہاری یہ بیل کبھی نہیں سوکھے گی۔ ہمیشہ اپنا رستہ ڈھونڈ لے گی۔ یہ بالکل دکھری ٹائپ کی بیل ہے۔''

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تو فوزی فوراً چارپائی سے اٹھی۔ آپا باجی ابھی کچھ دیر پہلے ہی گاؤں کے گھروں میں شادی کا سندہ دینے گئی تھی۔ فوزی، نسیم وغیرہ کو نہلا دھلا کر ان کے بال سنوارنے میں مصروف تھی۔ وہ اس دستک کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس نے سر پر دوپٹا درست کیا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ویدو ہی تھا۔

''السلام علیکم۔'' ویدو بولا۔ فوزی کو آج کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، اس کے چہرے پر یا پھر لہجے میں...... وہ سمجھ نہیں پائی۔

''وعلیکم السلام، ویدو بھائی!! اندر آؤ۔'' فوزی نے اپنی متورم آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

''نہیں فوزی!! ابھی جلدی ہے۔ پھر چکر لگاؤں گا۔ یہ تمہارے لیے۔'' ویدو نے گڈوی فوزی کو پکڑائی۔ اس وقت ایک پُرنم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو رہی تھی۔

فوزی نے گڈوی پر بیل والا ڈیزائن دیکھا اور ہنس پڑی۔ وہی جھرنوں جیسی ہنسی جو ویدو کے دل کو ٹھنڈا کرتی تھی پھر اچانک آنکھوں میں سیاہ سائے سے لہرانے لگے، جیسے کوئی بچہ چلتے چلتے اچانک رستہ بھول جائے۔ اسی لمحے اسے اپنے سر پر ویدو کا ہاتھ محسوس ہوا۔

''خدا کرے کہ میری فوزی کی مسکراہٹ اس بیل کی طرح رہے۔ تر و تازہ، کبھی نہ مرجھانے والی اور ہمیشہ اپنا رستہ ڈھونڈ لینے والی۔'' اس کے بعد ویدو کے حلق میں گرہ سی پڑ گئی۔ وہ کوشش کے باوجود اسے خدا حافظ نہ کہہ سکا۔

شادی اور اس سے پہلے کا کچھ وقت آندھی طوفان کی طرح گزرا اور جنوری کی ایک ابر آلود سہ پہر میں فوزی بابے نامی شخص کے ساتھ بیاہ کر چک انیس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آ گئی جو سندر پور سے نو دس میل کے فاصلے پر تھا۔

☆☆☆

وہی کچا رستہ، وہی کیکر کے درخت، پالک کا کھیت اور وہی چاچا نور دین کے کھیت میں چلتے ہوئے ٹریکٹر کی آواز پر...... ویدو کے لیے جیسے یہ سب چیزیں بے رنگ ہو گئی تھیں۔ اس کا ساتھی کھو گیا تھا۔ وہ بوجھل دل اور قدموں کے ساتھ اسکول سے واپسی کا رستہ طے کر رہا تھا۔

''او ئے ویدو...... آج پان مسالا نہیں لینا۔'' کرمو بابا نے اپنی دکان کے باہر کرسی پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

''پیسے نہیں ہیں تو کل دے دینا۔'' اس نے مزید کہا۔

ویدو نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ چاچا پیسے تو ہیں پر دل نہیں کھانے کا اور دل تو شاید سینے میں ہی نہیں۔ پھر ایک خیال آتے ہی وہ رک گیا۔ واپس پلٹ کر کرمو بابا کی دکان سے کچھ بسکٹ اور ٹافیاں خریدیں اور آگے بڑھ گیا۔ بھاؤ امتیاز اور آپا باجی کا گھر دیکھتے ہی دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے بڑی ہمت کر کے دروازے پر دستک دی۔ چھوٹی نسیم نے اپنے چھوٹے چھوٹے پنجوں پر کھڑے ہو کر کنڈی کھولی تھی۔ اس کے ہاتھ اور منہ بالن کی راکھ سے کالے ہو رہے تھے۔ ویدو کو کچھ دور صحن میں بیٹھی زینب بھی دکھائی دی جو کوئلے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے ان کتابوں پر آڑی ترچھی لکیریں لگا رہی تھی جو فوزی باقاعدگی سے انہیں پڑھاتی تھی۔ نسیم کے ہاتھ میں برتن دھونے والا مانجھا تھا۔ آج سے پہلے اس نے اس کے ہاتھ یا منہ پر راکھ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنے حلیے سے بے پروا

ویدو پر نہال ہوئے جا رہی تھی۔ ویدو نے اس کے سر پر پیار کیا اور اسے چیزوں کا شاپر تھمایا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

شادی کو تین دن گزر چکے تھے اور آج میلے کا دن تھا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد ہی بڑے میدان میں تمبو لگنا شروع ہو گئے تھے۔ ویدو فجر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر میدان کی تیاری دیکھتا رہا پھر واپسی کے لیے اس نے چھوٹا رستہ اختیار کیا جو چاچا نور دین کے کھیت کے بیچوں بیچ جاتا تھا۔ کچھ فاصلے پر دو عورتیں جا رہی تھیں۔ سردی سے بچنے کے لیے انہوں نے مردانہ لوئیاں لپیٹ رکھی تھیں۔ ان کی آوازوں کی بھنبھناہٹ ویدو تک پہنچ رہی تھی۔ تھوڑا فاصلہ اور طے ہوا تو باتیں صاف سمجھ آنے لگیں۔

"کل چوڑیاں چڑھانے والی مائی اپنی فوزی کے گاؤں سے ہو کر آئی تھی۔" فوزی کے ذکر نے ویدو کے تن بدن میں کرنٹ سا چھوڑا۔ اس کی ساری توجہ ان کی باتوں کی طرف ہو گئی۔

"آپا باجی کے گھر کا پوچھ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ فوزی کا کوئی بہت ضروری پیغام دینا ہے۔"

"اچھا! کیا پیغام تھا، تو نے پوچھا نہیں؟" دوسری عورت نے مزید رازداری سے پوچھا۔

"ہاں پوچھا تھا پر اس نے بتایا نہیں۔ کہہ رہی تھی کہ آپا باجی سے ہی بات کرنا ہے۔"

ویدو کو ان عورتوں کی باتوں نے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ آخر ایسی کیا بات ہے جس کے لیے اسے پیغام بھیجنا پڑا؟ ویدو کو بڑی امید تھی کہ فوزی اپنے شوہر کے ہمراہ آج میلا دیکھنے ضرور آئے گی۔ پھر میلا شروع ہو گیا۔ ویدو نے فہیم، زینب اور فاروق کو خوب جھولے لے کر دیے۔ ان کو بن کباب کھلائے۔ ویدو کی نگاہیں سارا وقت گرد و نواح میں گردش کرتی رہیں، فوزی کو تلاشتی رہیں۔ گوشاہ کے میلے پر اردگرد کے گاؤں سے بھی بے شمار لوگ آتے تھے۔ تھوڑی پر ہلکا سا رواں، تیکھے نقوش، ذہانت سے بھرپور روشن آنکھیں اور کچھ بکھرے بکھرے بال...... کتنی ہی نظریں ویدو کی نوعمری کی مردانہ وجاہت کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں پر اس کے لیے تو جیسے اس دفعہ میلا اجنبی تھا اور وہ میلے کے لیے۔ شوروغل اور رنگ برنگی بھیڑ میں وہ چپ چاپ چلتا رہا۔ بچے بھاؤ اور آپا باجی کے ساتھ گھر جا چکے تھے۔ ویدو میلے کے میدان سے دور تنہا ایک پیڑ کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ اپنا آپ کیوں کھو رہا ہے؟ اس کا دل اور اس کی حسیات ان رنگوں، خوشبوؤں اور خوشی میں ڈوبے قہقہوں کو محسوس کیوں نہیں کر پا رہے؟ بارہا اس نے خود سے سوال کیا۔ اچانک دور سے اسے سائیکل سوار اور اس کے پیچھے بیٹھی چادر میں لپٹی ایک لڑکی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ دل کی دھڑکنیں ایک ایسے انداز میں متحرک ہو گئیں جس میں آج سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ وہ تقریباً آدھ فرلانگ تک دوڑتا ہوا ان کے قریب گیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ فوزی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ میلا دیکھنے کے لیے آ رہی ہے لیکن قریب پہنچ کر اس کا اندازہ غلط نکلا تھا۔ "تو فوزی نہیں آئی۔"

نارنجی گولے کا آدھا وجود افق پر بہتے ان دیکھے دریا میں ڈوب چکا تھا۔ پرندے ٹولیوں کی صورت میں اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ میلے والا میدان بھی خالی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اچانک اسے اپنی پتلون کی جیب میں الگ سے پڑے ہوئے پیسوں کا خیال آیا۔ اس نے انہیں نکالا۔ یہ دس دس کے کتنے ہی نوٹ تھے۔ ہاں یہ وہی پیسے تھے جو چند دن پہلے اس کی فوزی نے اسے دیے تھے۔ فوزی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"ویدو بھائی! یہ پیسے میں میلے کے لیے جوڑ رہی ہوں۔ اس دفعہ جی بھر کر جھولے لینے ہیں ہم نے۔" اندر کے درد نے یکدم ضبط کے سارے بندھن توڑ دیے۔ دل پر چھائے سیاہ بادلوں سے پانی ٹوٹ کر برسنے لگا۔ یہ سب اس کے اختیار سے باہر تھا۔

"فوزی...... پلیز آ جاؤ۔" کتنی ہی دیر اس کے آنسو اس کا گریبان بھگوتے رہے۔ اچانک اسے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ وہ تڑپ کر پلٹا۔ اس کے والد نذیر احمد پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے پتر تجھے ....؟ چل گھر چل۔" نذیر احمد نے اپنے بیٹے کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وحید احمد عرف ویدو اپنے باپ کی آنکھوں میں اپنے دل کی حالت سے شناسائی کے سارے رنگ دیکھ چکا تھا۔ اسے کچھ بولنے، کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

آج ویدو نے دوسری دفعہ وہی خواب دیکھا تھا۔ وہ صحن میں چارپائی ڈالے پڑھ رہا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور فوزی اندر آتی ہے۔ وہ ویدو سے اپنے دیے ہوئے پیسے طلب کرتی ہے اور اپنی ہتھیلی اس کی طرف بڑھاتی ہے تو ویدو یہ دیکھ کر کانپ جاتا ہے کہ اس کی ہتھیلی پر بہت بڑا کٹ

قلم کار دوست

لاہور سمن آباد کی ایک اندرونی سڑک پر کتابوں اور رسالوں کی ایک دکان ہے میں جب بھی اس دکان کے سامنے سے گزرتا ہوں چند لمحوں کے لیے ٹھٹک جاتا ہوں۔ اس دکان سے ایک بہت سنہری یاد وابستہ ہے۔ جب 1990ء کے لگ بھگ میں نے اپنی پہلی کہانی ''انجان'' کے عنوان سے سسپنس کے لیے ارسال کی تو مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ شائع ہوگی یا نہیں۔ میں بے تابی سے سسپنس کی اشاعت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کاؤنٹر پر سسپنس جھلکتا ہوا نظر آیا۔ میں رک گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سسپنس اٹھا کر اس کی ورق گردانی کی اور پھر نہال ہو گیا۔ کہانی موجود تھی۔ اس کہانی کی اشاعت سے ایک ایسا دروازہ کھلا جس نے آنے والے ماہ و سال میں مجھے سسپنس کے لیے کئی یادگار کہانیاں لکھنے کی ہمت اور توانائی دی۔ یوں تو جاسوسی اور سرگزشت کے لیے بھی میں نے بہت کچھ لکھا اور اب بھی لکھ رہا ہوں مگر سسپنس کے لیے لکھتے ہوئے میرے قلم کو ہمیشہ ایک خاص قسم کی آزادی اور روانی ملی۔ خاص طور سے مختصر کہانیاں لکھتے ہوئے مجھے ایک وسیع کینوس میسا ہوا۔ یقیناً میری طرح دوسرے قابل احترام مصنفین بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ کشادہ سینے والے سسپنس نے ہر طرح کے خیالات کو اپنے اندر سمویا ہے۔

میری مختصر کہانیوں سے متاثر ہونے کے بعد جب محترم معراج رسول صاحب نے مجھے نسبتاً طویل کہانیاں لکھنے کا کہا تھا تو پرستش، انوکھا لاڈلا، اداس بھیس، اداس شامیں اور ہم سفر جیسی کہانیاں وجود میں آئیں جنہیں قارئین کی طرف سے خصوصی پذیرائی ملی۔ مجھے یاد ہے اسی ہی ایک کہانی ہم سفر تھی جس میں سردیوں کی طویل ترین رات میں ایک بوڑھے گھوڑے اور اس کے عمر رسیدہ مالک کا ذکر ہے۔ معراج صاحب نے یہ کہانی نہیں چھاپی تو مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ پھر ایک دن ان کا فون آیا۔ کہنے لگے ''طاہر! یہ ایک یخ بستہ رات کی کہانی ہے اس لیے میں نے یخ بستہ موسم

لگا ہوا ہے اور خون ہتھیلی سے بہہ کر قطروں کی صورت میں نیچے گر رہا ہے۔ ویدو تڑپ کر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور اس سے استفسار کرتا ہے کہ یہ زخم کیسے لگا؟ بس تبھی اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس کو اپنی دھڑکنیں کانوں میں سنائی دے رہی تھیں اور دل میں اٹھنے والی ٹیس آنکھ کھلنے پر بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا اور منہ ہاتھ دھو کر آپا باجی کے گھر کا رخ کیا۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ شمیم، زینب اور فاروق تینوں دوڑتے ہوئے آئے اور اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ وہ ان سے باتیں کر رہا تھا اور ایک ہاتھ سے ان کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھا رہا تھا۔ آپا باجی چارپائی پر اس کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔

''آپا! سب ٹھیک جا رہا ہے نا؟'' ویدو کے لہجے میں فکر صاف ظاہر تھا۔

''ہاں پتر...... سب چنگا ہونے جا رہا ہے۔ بالے کو ابھی پندرہ دن نہیں ہوئے ورکشاپ پر بیٹھتے ہوئے اور کل ہی اس نے پندرہ سو بھجوایا ہے۔'' آپا باجی کے پچکے، لمبے چہرے میں چھپے بتیس کے بتیس دانت باہر آ گئے تھے۔ ویدو نے خشک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ گڑبڑا گئی اور بولی۔

''چل تو بیٹھ، میں لسی لے کر آتی ہوں۔''

''نہیں آپا! لسی نہیں پینی مجھے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ فوزی خیریت سے ہے؟ آپ کا چکر نہیں لگا اس کی طرف؟''

''ہاں پتر! خوش ہے اپنے گھر میں وہ۔ فون پر بات ہوتی رہتی ہے اس سے۔ آئے گی، چکر لگائے گی۔ ابھی مہینا تو ہوا ہے ویاہ کو۔ ویسے بیٹیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔'' آپا باجی نے بڑے اعتماد اور ہوشیاری سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''ویسے پتر تو پڑھائی کے لیے شہر کب جا رہا ہے؟'' آپا باجی نے اب اپنے مطلب کی بات کی تھی۔ ویدو نے آپا باجی کے سوال کو نظرانداز کیا اور پوچھا۔

''اور وہ چوڑیوں والی اماں کیا پیغام لائی تھی فوزی کا؟''

ویدو کے اس سوال پر آپا باجی ایک دفعہ سرتاپا لرز گئی پھر قدرے قابو پا کر بولی۔

''آں...... ہاں...... وہ فوزی کے کچھ کپڑے پڑے تھے، وہی اس نے منگوائے تھے۔ یہی پیغام تھا۔'' ارتعاش اور گھبراہٹ اس کے لہجے میں واضح ہو رہی تھی۔ ''پر تجھے کیسے پتا چلا کہ کوئی پیغام آیا تھا؟''

''بس اڑتی اڑتی سی بات سنی تھی۔'' ویدو نے گول

کے لیے روک لی ہے۔ سردیوں میں اس کا زیادہ لطف آئے گا۔“
معراج صاحب کا ہاتھ ایک طرف کہانیوں کی نبض پر اور دوسری طرف قارئین کی نبض پر رہتا تھا۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ میں سسپنس کے لیے زیادہ لکھوں کیونکہ میری کہانیوں کی ”رومانیت“ اس بات کی متقاضی ہے۔

الحمدللہ آج سسپنس اس آن بان کے ساتھ اپنے پچاس سال مکمل کر رہا ہے۔ یہ اشاعت اور مطالعے کی تاریخ کے پچاس سنہری ابواب ہیں۔ ان ابواب کو سجانے سنوارنے میں ادارے کی انتظامیہ، کارکنان اور مصنفین کی انتھک کوشش شامل ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ آج بھی سسپنس کے ہم سفر ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو اب موجود نہیں اور جو موجود ہیں یقیناً وہ بھی آج سسپنس کی کامرانی اور کامیابی کے اس پچاسویں سنگ میل کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتے ہوں گے۔

وقت کا پہیا ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ دنیا میں تغیر کے سوا کسی چیز کو ثبات نہیں ...... اشاعت کے جو قلم اٹھانے والے، لکھنے والے اور پڑھنے والے بدلتے رہیں گے لیکن سسپنس اپنا سفر جاری و ساری رکھے گا۔ انشاء اللہ۔ میری طرف سے سسپنس کو یہ گولڈن جوبلی مبارک ہو۔

طاہر جاوید مغل

سوال جواب دیا۔

بچوں سے کچھ دیر باتیں کر کے وہ وہاں سے اٹھا اور گھر کا رخ کیا۔ کل اس کا میٹرک کا آخری پرچہ تھا اور اسے ابھی تیاری کرنا تھی۔ رستے میں اسے بھاؤ، سبزی ترکاری پکڑے آتا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس پہنچا اور بالے کا فون نمبر مانگا تاکہ اس کی اور فوزی کی خیریت دریافت کرے۔ اس پر بھاؤ بیزاری سے بولا۔

”او نئی چترا! اس کے پاس تو موبائل ہی نہیں ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ کوئی چھوٹا سا موبائل لے لے۔ چل بچی گھر بہن بھرا سے بات کر لیا کرے گی پر ابھی تک کوئی فون تو نہیں آیا اس کا۔“

وید و گھر پہنچا تو اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر اس کی فوزی کے ساتھ کچھ غلط ہو رہا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی۔

☆☆☆

”او اماں! جا رہا ہوں میں۔ اس چھنک چھلو کو کم میں جت کے رکھو اور نظر بھی رکھو اس پر۔ ڈنگر کی جگہ اسے ہل میں جتا جائے نا تو پھر دماغ ٹھیک ہو گا اس کا۔ جاہل گنوار اٹھ کر آ گئی ہے ...... عقل تمیز نہیں اس کو۔ شوہر کے مقام کا ہی نہیں پتا......“

اقبال عرف بالا اپنے کندے حلیے، بکھرے بالوں اور سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ بولتا چلا جا رہا تھا۔ شاید اس کے نشے کو دیر ہو رہی تھی۔ یونہی اول فول بکتا وہ گھر سے نکل گیا۔ فوزی اپنے کمرے میں پلنگ کے پاس نیچے فرش پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور ہچکیوں کے ساتھ روئے چلی جا رہی تھی۔ شادی کے بعد اس ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر بالے نے اسے یہ تیسری دفعہ مارا تھا اور اس شدت سے مارا تھا کہ لاتوں اور ٹھوکروں سے اس کے نازک سے جسم کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ ناک سے بہتا ہوا خون گریبان اور آستین پر جم رہا تھا۔ چہرہ، گردن اور کلائیاں سرخ ہو رہی تھیں اور ان سرخ ہوتی جگہوں نے چند گھنٹے بعد گہرے نیل کا روپ دھارنا تھا۔ آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر اس نے سوجی ہوئی آنکھوں سے گردونواح کا جائزہ لیا تو کچھ فاصلے پر اسے اپنا سنہری فیتا لگا دوپٹا اور پھر پلنگ کے رنگین پائے اس کا منہ چڑاتے محسوس ہوئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسی حالت میں رہی پھر دروازے کی جگہ لگا ہوا ایک بھاری سے کپڑے کا پردہ ہلا اور مائی مندری اندر آئی۔ اس نے اپنے لاغر کپکپاتے ہاتھوں سے ایک لسی کا

پیالہ اور ادھ جلی ہوئی چھوٹی سی روٹی فوزی کے سامنے رکھی۔ (مائی مندری اس کی ساس تھی)۔

"لے پتر کھالے۔" اس نے فوزی کے سر پر ہاتھ رکھا جسے فوزی نے فوراً جھٹک دیا۔

"پتر اس کا دماغ خراب ہے۔ نشے میں رہتا ہے اس لیے ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ دل کا برا نہیں ہے۔ جب سے پہلی شادی ختم ہوئی ہے، زیادہ غصیلا ہو گیا ہے۔ دیکھنا...... تو اسے پیار دے گی نا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ مم...... مجھ پر بھی کئی دفعہ ہاتھ اٹھایا ہے اس نے۔" اماں کی بات پر فوزی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا دل لرزنے لگا۔

"دیکھ میں تو ماں ہوں اس کی۔ پہلے میں اس سے ناراض ہو کر اپنے بھرا کے گھر چلی جاتی تھی پھر اس ساری دنیا میں وہ اکیلا میرا ہمدرد بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔"

"ہاں تو بس پھر تو نے بدلحاظ کو میرے پلے باندھ دیا تاکہ تیرا پیچھا چھوٹے اور یہ میرے درپے ہو۔" فوزی کی اندر کی اور رنج اس کے لہجے میں واضح ہو رہا تھا۔ یہ سنتے ہی حیرت انگیز طور پر مائی مندری کی بوڑھی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو چمکنے لگے اور اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھ اس کے آگے جوڑتے ہوئے کہا۔

"پتر... مجھے معاف کر دے۔ میرا تو بس یہ ذہن تھا کہ ہو سکتا ہے اس کی شادی ہو جائے تو یہ ٹھیک ہو جائے۔ اس کا بھٹکا ہوا ذہن ٹھکانے آ جائے۔" اتنا کہہ کر وہ اپنا گہرا سانولا، جھریوں بھرا چہرہ سفید ململ کے دوپٹے میں چھپا کر رونے لگی۔ فوزی کو وہ اس وقت صرف ایک لاچار بوڑھی، دکھی اور بیمار ماں نظر آئی۔ بے اختیار فوزی نے اپنا ہاتھ اس کے جھریوں بھرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے بازو کی کہنی میں ٹیس اٹھی جس نے چند دن پہلے کا منظر اس کی آنکھوں میں تازہ کر دیا۔ اس منظر کی ایک ایک تفصیل اس کے سامنے آ گئی۔

فوزی کو نزلے زکام کی وجہ سے تیز بخار ہو رہا تھا اور وہ گھر کے چھوٹے سے کچے صحن میں بان کی خستہ حال چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اچانک بالا دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ ورکشاپ پر ابھی کام نہیں تھا تو وہ گھر آ گیا ہے۔ فوزی نے گرتے پڑتے اسے کھانا لا کر دیا۔ کھانا وغیرہ کھا کر وہ فوزی پر زبردستی اپنے شوہر ہونے کا حق جتانے لگا۔ جب وہ فوزی کو بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا تو اس سہمی ہوئی بچی نے اپنے بیمار ہونے کا عذر دیا اور مزاحمت کی۔ اس پر بالا تو جیسے آپے سے باہر ہو گیا۔ گندی گالیاں بکتے ہوئے اس نے اسے اپنے بازوؤں میں، اٹھایا اور صحن کے ایک کونے میں لگے بالن کے ڈھیر پر کسی لکڑی کی طرح ہی اچھال کر پھینکا۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخ جیسے حلق میں ہی اٹک گئی۔ لکڑیوں نے کہاں کہاں ضرب لگائی، اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ بازو کی ہڈی سے اٹھنے والی درد کی تیز لہر نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ پہلے تو بالا، فوزی کو بالکل نظر انداز کر کے گالیاں بکتا رہا اور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ پھر جب اسے لگا کہ معاملہ خراب ہے تو ہلدی تک گرم کر کے فوزی کے بازو کی کہنی پر لگایا جہاں سے ہڈی باہر کی طرف نکل رہی تھی اور بازو ٹیڑھا ہو رہا تھا۔

"نہ غصہ چڑھایا کر مجھے۔ میں کوئی جان بوجھ کر تکلیف دینا چاہتا ہوں تجھے۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا جیسے نادم ہو۔ درد سے کراہتی فوزی کو اس نے اپنے ساتھ لگایا اور پھر گاؤں سے چھ سات کلومیٹر دور اسے ایک ہڈی جوڑ کے پاس لے گیا جس نے ہڈی کھینچ کر پٹی باندھ دی تھی۔ واپسی پر فوزی نے بالے کی منتیں کی تھیں۔

"خدا کے لیے مجھے آپا باجی کے پاس ایک دفعہ لے جاؤ۔ مجھے اپنے بہن بھائی سے بھی ملنا ہے۔ مجھے یاد آ رہی ہے ان کی۔" رو رو کر اس کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔

"چپ کر جا۔ تُو پاگل سمجھتی ہے مجھے۔ تجھے وہاں لے جاؤں تاکہ تو سب کو بتاتی پھرے کہ بالے نے مارا ہے مجھے۔" بالے نے چلتے چلتے ایک ہاتھ سے اس کی چوٹی کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں وعدہ کرتی ہوں کہ کچھ نہیں بتاؤں گی بلکہ...... بلکہ میں کہہ دوں گی کہ میں پھسل گئی تھی۔ بالا پٹی کرا کر لایا ہے میری۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔" فوزی نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"چل، میرا دماغ نہ کھا۔ مجھے نہ سکھا کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں۔" بالے نے اس کی کمر پر ایک اور زوردار ہاتھ مارا تو وہ درد سے کراہ اٹھی۔ دور سندر پور کی اکلوتی مسجد کا مینار نظر آ رہا تھا۔ فوزی ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی گئی، پکارتی گئی...... اس گاؤں میں وہ واحد مینار تھا جو اس وقت فوزی کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

گھر سے باہر جامن کے درخت کے نیچے چارپائی ڈالے فوزی دھوپ سینک رہی تھی۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے بخار میں تپ رہا تھا۔ درد سے آنکھیں ورم زدہ اور سرخ ہو رہی تھیں۔ اچانک کچھ فاصلے پر چھپڑ کے پاس اسے اللہ رکھی

مشہور چوڑیوں والی اماں گزرتی نظر آئی۔ اس کی نظر بھی فوزی پر پڑی اور وہ سر پر ٹوکری رکھے فوزی سے سلام دعا کے لیے آگئی۔ فوزی بھی کبھار اللہ رکھی کے ذریعے کوئی چھوٹا موٹا پیغام اپنے گھر تک پہنچادیتی تھی۔ اللہ رکھی نے باتوں باتوں میں فوزی کو بتایا کہ یہاں دو تین گھروں سے فارغ ہوکر اس نے تانگے پر مندر پور ہی جانا ہے۔ اللہ رکھی کی بات سن کر فوزی کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا۔ آس پاس سے نظر بچا کر اس نے اماں رکھی کے آگے ہاتھ جوڑے اور اس سے کہا کہ وہ آپا باجی سے کہے کہ وہ اسے آکر دیکھ لے۔ یہاں اس کی حالت بہت بری ہے۔

وہ ہولکا سا لے کر بولی۔ "اماں! اب تو چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ ان چھ مہینوں میں بس ایک بار میکے گئی ہوں اور وہ بھی صرف دو گھنٹے کے لیے۔ بالا تو مجھے گھر سے چار قدم دور جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ آپا اور بھائی سے کہو کہ مجھے آکر ایک دفعہ مل لیں۔" پھر وہ سسکی لے کر دبی آواز میں بولی۔ "بالے نے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ ایک ہفتہ پہلے میرا تین ماہ کا حمل ضائع ہوگیا......" یہ کہہ کر فوزی اس چوڑیوں والی اماں رکھی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بالے نے اب اس کا گھر سے نکلنا بالکل بند کردیا تھا۔ وہ سارا دن گھر میں رہتی، کام کرتی رہتی یا پھر اس بے چاری اپنی ساس بے بے مندری کی سوانح حیات سنتی رہتی۔ پڑھنا لکھنا اسے بھول چکا تھا۔ پڑھنا لکھنا تو دور کی بات ہے، اسے تو مہندی لگانا بھی بھول گئی تھی۔ اسے یہ یاد کرکے عجیب سا لگتا تھا کہ سارے مندر پور میں اس کی مہندی کے ڈیزائنوں کی تعریف ہوتی تھی۔ خاص طور سے وہ ڈیزائن جس میں ایک بل کھاتی بیل سے پھول اور پتے پھوٹتے تھے۔ بیل کے شروع اور آخر میں وہ پانچ کونوں والا دلکش ستارہ بناتی تھی۔

اس کی ساس اماں مندری کی دماغی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں اس کی گزشتہ زندگی جیسے ایک کیسٹ کی صورت میں فٹ ہوگئی تھی۔ فوزی کام کاج سے فارغ ہوکر اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی اور اماں کو دو تین باتوں میں ہی اس کیسٹ کو دوبارہ سے پلے کرنے کا بہانہ مل جاتا۔

اماں کی کہانی اور اس کے نام کے ساتھ مندری (انگوٹھی) کے لگنے کا ماجرا تھا بھی ترحم آمیز۔ بالے کے باپ اور اس کی ماں نے بہت ظلم کیے تھے اس بے چاری پر اور پھر یہ بے چاری اپنے اکلوتے بیٹے کی بداخلاقیاں دیکھنے کے لیے بچ گئی اور وہ دونوں باری باری اپنے وقت پر مر گئے۔ صدیقہ کا نام مائی مندری اسی وقت پڑ گیا تھا جب وہ جوان تھی اور اس کی گود میں بالا تھا۔ اس کے اس نام کے پیچھے بھی ایک چھوٹی سی کہانی تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اپنے بالے کے لیے سونے کی مندری خریدے۔ اس کا کرخت مزاج شوہر تو اس کو ایک پائی بھی دینا حرام سمجھتا تھا چنانچہ صدیقہ نے گاؤں کے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرکے پیسے جوڑنا شروع کردیے۔ سب لوگ جان گئے تھے کہ یہ اپنے بچے کو انگوٹھی پہنانے کے لیے پیسے جوڑ رہی ہے۔ بس تبھی سے اس کا نام مائی مندری مشہور ہوگیا تھا۔ پائی پائی جوڑ کر سال ڈیڑھ سال کے اندر اس نے بالے کے لیے ایک چھوٹی سی سونے کی مندری خرید ہی لی تھی...... اب وہی نافرمان تھا جس کی ستم ظریفیوں نے ماں کو بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔

چوڑیوں والی اماں نے آپا باجی کا جو جوابی پیغام فوزی تک پہنچایا، وہ فوزی کے لیے انتہائی غیر متوقع اور جگر پاش تھا۔ آپا باجی نے بڑے سخت الفاظ میں اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کی تھی اور الٹا ان حالات کا ذمے دار خود فوزی کو ہی ٹھہرایا تھا۔ اس نے کہا کہ پڑھائی لکھائی کے چکر میں وہ گھر بار سنبھالنا بھول گئی ہے۔ اصل بات، جس کی وجہ سے آپا باجی نے اس کے سر سے اپنا ہاتھ اٹھالیا تھا وہ یہ تھی کہ بالا بچوں کا خرچہ بھیج رہا ہے اور گھر کا راشن پانی بڑے اچھے طریقے سے چل رہا ہے اور اب اگر وہ بالے کی مرضی کے خلاف اس گھر میں آئی تو بچوں سمیت اس گھر سے باہر ہوجائے گی۔

فوزی کی نظروں میں جیسے ساری دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ اسے اپنا وجود، اپنی سانسیں بھی پرائی محسوس ہونے لگیں۔ ایسے میں...... اکثر ایک روشن پیشانی، اپنایت سے بھرپور شفیق آنکھیں اس کے ذہن کی تاریکیوں میں کسی جگنو کی طرح جگمگانے لگتیں۔ وقت تھوڑا اور گزرا پر فوزی کے لیے تو جیسے وقت کی اہمیت اور اس میں سانس لیتے زندگی کے لمحوں کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ وفا، پیار کے عہد باندھ کر جو اسے لے کر آیا تھا وہی اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتا تھا۔ ذہنی دباؤ اور مارکٹائی نے اسے ادھ موا کردیا تھا۔ صبح سے رات سونے تک کا اس کا سارا وقت اسی خوف اور دباؤ میں گزرتا کہ کچھ ایسا نہ ہوجائے کہ بالے کا غصہ آج پھر اس پر قیامت بن کر ٹوٹے۔ فوزی کے شاداب چہرے پر اب زردی کھنڈ آئی تھی۔ مستقبل کے روشن خواب دیکھنے والی خوبصورت آنکھیں سیاہ دائروں کی لپیٹ میں آچکی

تھیں۔ چہرے اور پسلی کی ہڈیاں دن بدن نمایاں ہوتی جارہی تھیں۔

ان سات آٹھ گھنٹوں میں وہ ایک دفعہ پھر اسے آپا باجی اور بچوں سے ملوانے کے لیے بھی لے گیا تھا پر سارا وقت ایک قیدی کی طرح اسے اپنے ساتھ رکھا۔

اس دن عرصے بعد ویدو نے فوزی کو دیکھا۔ اس کی ترسی ہوئی نگاہیں اپنے راز پوشیدہ رکھنے کی خاطر زیادہ دیر تک اس کے چہرے کا طواف نہ کرسکی تھیں۔ سلام دعا کے علاوہ وہ زیادہ بات نہ کرسکا تھا۔ اس کے گلے میں جیسے گرہیں سی پڑنے لگی تھیں۔ وہ جان گیا تھا...... وہ اس کے دل کی حالت اور اس کے حالات کو ایسے ہی سمجھ گیا تھا جیسے فوزی نے سب کچھ اسے زبانی بتادیا ہو۔ ہاں وہ ویدو تھا۔ وہی تو تھا..... جو اسے ایسے ہی سمجھ جایا کرتا تھا۔ بغیر کچھ سنے، بغیر کچھ پوچھے۔ ان چند گھنٹوں میں فوزی کے بارے میں جو خدشے ویدو کے ذہن میں کلبلا رہے تھے آج ان کی حقیقت اس نے فوزی کے مرجھائے ہوئے چہرے اور ویران آنکھوں میں دیکھ لی تھی۔ فوزی کس جال میں پھنس گئی ہے، وہ اچھی طرح جان چکا تھا۔ فوزی سے کہیں بڑی عمر کا شوہر فوزی کو بدترین حالات سے گزار رہا تھا۔

اماں مندری کا کردار اس کی زندگی میں ماں سے محرومی اور اس کی طلب کی تسکین کرنے لگا تھا۔ وہ دونوں اکٹھے بیٹھتے، اکٹھے کھانا کھاتے۔ اماں گھر کے کام کاج میں جہاں تک ہوسکتا اس کی مدد کرتی۔ فوزی بھی ساس سے زیادہ ماں سمجھ کر اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور مجبوریوں کا خیال رکھتی۔

یہی کیسٹ کہانی سنتے سنتے اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور اس گاؤں میں فوزی کی واحد سہیلی نازو کی آواز آئی۔ ''فوزی! دروازہ کھول، تجھے ایک چیز دکھانی ہے۔'' فوزی اس کی آواز پر کھل اٹھی اور دروازہ کھولا۔

نازو کے ہاتھ میں ایک ڈائجسٹ تھا۔ وہ ایک دو دفعہ پہلے بھی کوئی رسالہ یا ڈائجسٹ لے کر آئی تھی۔ صاف ستھری کہانیاں ہوتی تھیں۔ وہ دونوں پڑھنے بیٹھ جاتی تھیں۔ نازو کو ایک خوبصورت کہانی پسند آئی تھی اور وہ فوزی کو بھی پڑھانا چاہتی تھی۔ نازو، فوزی کی ہم عمر ہی تھی بلکہ شاید کچھ بڑی ہوگی۔ وہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔ صاف ستھرے کپڑے، بال سلیقے سے بنے ہوئے اور ماں کا سایہ سر پر۔ یہاں ماں تھی، نہ کپڑے تھے۔ بس زخمی زخمی سے ہاتھ تھے اور بجھا بجھا سا دل۔

گھر کا سارا کام کاج ہوچکا تھا۔ فوزی اور نازو چارپائی پر بیٹھ گئیں اور کہانی پڑھنے لگیں۔ ساتھ ساتھ وہ بھنے ہوئے چنے کھارہی تھیں جو نازو ساتھ لے کر آئی تھی۔ انہیں بیٹھے ہوئے بس تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ بالا اپنی سائیکل سمیت دروازے سے اندر داخل ہوتا نظر آیا۔ آج وہ جلدی آگیا تھا۔ فوزی کو نازو کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کالے سائے سے پڑنے لگے۔ فوزی اب اس کے تاثرات سے واقف ہوتی جارہی تھی۔ اس نے فوراً نازو کو جانے کے لیے کہا۔

''یہ کیوں آئی تھی ادھر؟'' بالا غصے میں بولا تو فوزی کا دل جیسے سینے کے اندر کسی اندھیرے کنوئیں میں گرگیا۔ حواس باختگی کا ایک پردہ سا ذہن پر چھانے لگا۔ آگے کے متوقع خطرات نظر آرہے تھے۔ یہ دوسری مرتبہ تھا کہ وہ نازو کو دیکھ کر ایک دم آگ بگولا ہوا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ فوزی اس کو خود سے ہونے والے سلوک کی باتیں بتاتی ہے۔ اس بات کی اسے چڑ تھی۔

وہ ہکلا کر بولی۔ ''وہ...... وہ ویسے ہی آئی تھی ملنے کے لیے۔ میں نہیں جاتی باہر...... تو وہ آجاتی ہے کبھی کبھی......''

''لسی نہیں بنائی تو نے ابھی۔ آٹا بھی نہیں گوندھا ہوگا؟'' بالا چنگھاڑا۔

''نن...... نہیں، لسی بنالی ہے۔ میں آٹا ابھی گوندھتی ہوں۔'' فوزی یہ کہہ کر تیزی سے اٹھی اور تانبے کی پرات لے کر نلکے کے پاس آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔ بالے کی طرف سے پھر مزید کچھ نہ سن کر اسے تسلی ہوئی کہ اس کا غصہ زیادہ بڑھنے نہیں پایا۔ ابھی پانی کا پیالہ بھر کر اس نے ہاتھ سے پانی سوکھے آٹے میں ڈالنا شروع کیا تھا کہ جیسے اس کے سر پر منڈیر سے کوئی اینٹ ٹوٹ کر گری ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ پھر اسی اندھیرے میں اسے تارے ناچتے نظر آئے اور پھر جب تارے چھٹ گئے تو اسے پرات میں پڑا آٹا نظر آیا جس میں اب پانی سے زیادہ خون شامل ہوچکا تھا۔ یہ کوئی اینٹ نہیں گری تھی بلکہ یہ بالے کی ''کرم فرمائی'' تھی جو اس کے پیچھے بالن کے ڈھیر میں سے ایک موٹا سا ڈنڈا نکال کر کھڑا ہوا تھا۔ درد کی شدید ٹیسیں اس کے دماغ سے ہو کر اس کے پاؤں کے آخری ناخن تک پہنچنے لگیں۔

فوزی کو اردگرد کی کوئی سدھ بدھ نہ تھی۔ بس اس کا دماغ اور کان بالے کی گندی گالیوں سے گونج رہے تھے۔ پھر وہ اسے بازو سے کھینچتا ہوا چولہے کے پاس لے آیا۔

اسے دھکا دے کر زمین پر بٹھایا اور ایک گندا کپڑا اس کے سامنے پھینکا۔

"جلا اس کپڑے کو اور اپنے زخم میں بھر ورنہ سر پہ ایک اور ڈنڈا مار کر تیرا کام ختم کر دوں گا۔" وہ کسی وحشی درندے کی طرح دہاڑا۔ بے حال فوزی اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگی۔

"نہ کیا کر اتنا ظلم بالڑی پر۔ تیری اس مار کٹائی سے ہی تو وہ دفعہ باپ بنتے سے رہ گیا ہے۔" اس کی بے چاری ماں کی جذبات اور دکھ میں رندھی ہوئی آواز اندر کمرے سے آئی۔ پھر وہ دوبارہ بولی۔

"کیا نہیں کرتی یہ۔ تیرا ابھی ہر کام کرتی ہے مجھے بھی......"

"چپ کر جا۔ چپ کر جا مائی...... بہتی چیلی نہ بن اس کی۔ باقی کا غصہ تو نے اپنے پر نکلوا لینا ہے......" بالا کسی وحشی سانڈ کی طرح دھاڑا۔ اس کے بعد اماں مندری کی آواز فوزی کے کانوں میں نہ پڑی اور وہ آنسو بہاتی رہی۔ ہچکیاں لیتی رہی۔ کپڑے کی راکھ ٹھنڈی کر کے اندازے سے سر کے بالائی حصے پر آئے ایک گہرے گھاؤ میں بھرتی رہی۔ اس کی گردن اور گریبان خون میں بھیگ چکے تھے۔

سورج افق کی جانب اپنا واپسی کا سفر شروع کر چکا تھا۔ گھر کے چھوٹے سے کچے صحن کی دیوار کے سائے میں چارپائی ڈالے فوزی نہ جانے کب سے بے سدھ پڑی تھی۔ بے ترتیب بال پسینے سے گردن اور گالوں پر چپکے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹے سے کٹ سے خون رس کر ہونٹ پر جما ہوا تھا۔ جسم بخار میں تپ رہا تھا اور نقاہت اسے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ مائی مندری بے چاری کرتی پڑتی اس کے سرہانے روٹی رومال میں لپیٹ کر رکھ گئی تھی۔ چارپائی کے نیچے پانی جیسی چائے کی پیالی بھی پڑی تھی جس پر آئی جھلی اس کے ٹھنڈا برف ہونے کا پتا دے رہی تھی۔

"شمیم...... اپنی سلیٹ لے کر آ۔" غنودگی میں اس نے دو تین دفعہ یہ جملہ دہرایا۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے کہیں دور شاید چھجڑ کے اس پار سے کہیں کھیتوں سے ایک ایسی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی ہے جسے وہ ہزاروں میں پہچان سکتی ہے۔ وہ آواز جو اس کے سناٹوں کو رونق بخشتی تھی...... اسے حوصلہ دیتی تھی۔

"فوزی...... فوزی آنکھیں کھولو۔" تیسری چوتھی آواز پر اس کی لمبی پلکوں میں جنبش ہوئی اور ورم زدہ پپوٹوں میں خلا سا پیدا ہوا۔ اس کے سامنے ویدو کا چہرہ تھا۔ وہ کچھ دیر بے سدھ غنودگی کی حالت میں اسے دیکھتی رہی۔ یہ کیسا خواب ہے جو حقیقت لگ رہا ہے۔ اس نے سوچا لیکن پھر جب ویدو کی لہو ہوتی آنکھوں سے دو موتی گرتے ہوئے دیکھے تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

"ویدو...... یہ تم ہی ہو؟" اس کی آنکھوں میں جیسے دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی۔ اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"فوزی!" ویدو نے اس کے بے جان سے ہاتھ کو تھاما اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کی ہتھیلی میں ایک گہرا گھاؤ تھا جو اب کافی حد تک بھر چکا تھا۔ خواب والا منظر اس کی آنکھوں میں پوری طرح سے تازہ ہو گیا۔ ویدو نے اس کے جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے غمزدہ چہرے پر پریشانی کی لکیریں بھی ابھر آئیں۔

"فوزی...... میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ویدو باہر نکل گیا۔ فوزی کی آنکھیں بھی دوبارہ بند ہو گئیں۔ ویدو کی آواز پر فوزی نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ ویدو نے بازو کا سہارا دے کر اسے اٹھایا اور دوا پلائی۔ سر کے زخم پر مرہم لگایا۔ اس دوران اس نے فوزی سے کوئی بات نہیں کی اور فوزی کو بھی ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کے لیے کہا۔

"میں نے بالے کی ورکشاپ پر نوکری کر لی ہے۔ تم اکیلی نہیں ہو اب۔" ویدو نے جانے سے پہلے اس کے کان میں کہا اور اسے سو جانے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ حیران رہ گئی۔

ویدو ہمیشہ سے اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے ریگستان میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، جھلستی دوپہر میں کالی گھٹا کی آمد یا جیسے گھپ اندھیرے میں دیے کی روشنی اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

بالے کی ملازمت کے لیے ویدو نے اپنے آپ کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ میلے کچیلے کپڑے، اپنے حلیے کی طرف سے بھی جان بوجھ کر بے پروا ہو گیا تھا۔ اب ایسا ہونے لگا کہ وہ دوپہر کا کھانا لینے کے لیے ورکشاپ سے گھر آتا اور اس بہانے فوزی کی خیر خیریت بھی پوچھ لیتا۔ اسے دیکھ کر فوزی میں جیسے جان سی پڑ جاتی تھی مگر وہ یہاں ویدو کی موجودگی سے ڈر بھی بہت رہی تھی۔ مندر پور میں کسی کو پتا نہیں تھا کہ ویدو کہاں ہے۔ زیادہ لوگ یہی جانتے تھے کہ وہ آج کل کسی ورکشاپ میں کام سیکھ رہا ہے۔

ورکشاپ پر جب بالا چرس کے نشے میں ہوتا تھا تو

اکثر ویدو سے گھر کی باتیں کرنے بھی بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی باتوں کا لب لباب یہی ہوتا تھا کہ ایک پھوہڑ اور نا سمجھ بیوی اس کے پلے پڑ گئی ہے۔ پڑھائی لکھائی کے چکر میں رہنے کی وجہ سے اس کی عقل مت ماری ہوئی ہے۔

ویدو بس اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ وہ اس سے عمر میں کافی چھوٹی ہے۔ شاید وہ اسے پیار محبت سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرے تو وہ آجائے۔ ایسی باتیں بالے کو اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ تو بس اپنے رعب داب سے فوزی کو سیدھا کرنا چاہتا تھا۔ اس کا رویہ دیکھ کر ایک گہری مایوسی ویدو کے اندر اتر جاتی تھی۔ اس کا دل اب گواہی دینے لگا تھا کہ فوزی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، عارضی نہیں ہے۔ دن بہ دن اس کے حالات برے ہوتے جائیں گے۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اسے دکھی دیکھتا تھا تو اس کے دل کی گہرائی میں کہیں درد ہوتا تھا۔

اس تھوڑے عرصے میں ایک اور اہم بات جو ویدو جان گیا تھا وہ یہ کہ فوزی کے ساتھ مار پیٹ کرنا بالے کی عادت نہیں بلکہ ضرورت بنتا جا رہا تھا۔ وہ کام کی وجہ سے، یاروں دوستوں یا کسی بھی اور وجہ سے پریشانی کا شکار ہوتا تو کسی نہ کسی بہانے فوزی کو مار پیٹ کر خود کو ہلکا کرتا تھا۔ نشے کی عادت اسے جسمانی طور پر بھی توڑ پھوڑ رہی تھی اور دماغی طور پر بھی وہ دن بہ دن مفلوج ہوتا جا رہا تھا۔

ورکشاپ کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں سائیکل، موٹر سائیکل کے پنکچر لگانے، ٹائروں میں ہوا بھرنے، تھوڑی بہت مرمت اور ایسے ہی ایک دو چھوٹے موٹے کام ہوتے تھے۔ بوتلوں میں پیٹرول بھر کر بھی رکھا ہوا تھا جو آتے جاتے راہ گیروں کو فروخت کیا جاتا۔ بہرحال دکان ٹھیک منافع دے رہی تھی لیکن بالے کے پاس گھر میں دینے کے لیے بچی کھچی لسی، پتلی چائے اور کبھی کبھی سبزی ترکاری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اب چند ہفتوں سے بالے نے ایک اور کام پکڑا تھا۔ وہ مشکل سے ایک ڈیڑھ ماہ گزارتا پھر بھرپور طریقے سے عیاشی کرنے اپنے لفنگے دوستوں کے ساتھ شہر چلا جاتا۔ اس دوران ویدو ہی ورکشاپ کا کام دیکھتا۔ اس دن بھی شام سے ذرا پہلے بالا دوستوں کے ساتھ شہر گیا تھا۔

''فوزی! تمہاری حالت دیکھ کر مجھے دکھ سے زیادہ غصہ آتا ہے اب۔'' ویدو نے کسی قدر سخت اور شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم وہ والی فوزی نہیں لگتیں۔ کب تک ظلم سہو گی اس کا۔ تم تو شاید سہہ لو لیکن کبھی کبھار مجھے لگتا ہے کہ میرے ہاتھوں نہ ضائع ہو جائے وہ......'' ویدو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے چینی اور طیش ایک دم نمایاں ہو رہے تھے۔

''اس کا ظلم نہ سہوں گی تو پھر کہاں جاؤں گی ویدو؟ میں سب بتا چکی ہوں تمہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپا باجی مجھے میرے بھائی بہنوں کی پرورش کے لیے ہی لائی تھیں، اپنے گھر کا چولہا جلانے کے لیے بھی استعمال کر رہی ہے اور تمہیں بتایا تو تھا کہ اس نے چوڑیوں والی مائی کے ذریعے مجھے کتنا سخت جواب بھیجا تھا۔''

آج بڑے عرصے بعد انہیں اس طرح بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ ویدو اس کے لیے اس کے پسندیدہ بسکٹ اور چپس وغیرہ لے کر آیا تھا۔ ایک طرح سے اس نے پرانی یاد تازہ کی تھی۔ چاند کی روشنی میں چھت کے کچے بنیروں پر بازو ٹکائے وہ بھولی بسری باتیں کرتے رہے۔

وہ بولا۔ ''جب تم پنڈ آئی تھیں تو تم نے اپنی بول چال سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، پر تمہیں دیکھ کر میں سب کچھ سمجھ گیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہارے آس پاس رہوں گا۔''

''ایسا کیوں کر رہے ہو ویدو؟ تمہارے یہ کپڑے اور کالے ہاتھ پاؤں دیکھ کر میرا دل بہت دکھتا ہے۔ چاچا جی تمہارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور تم پڑھائی چھوڑ کر یہاں......'' وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی پھر ذرا توقف سے گلوگیر آواز میں بولی۔ ''اور یہ سب بہت خطرناک بھی ہے ویدو۔ کل بالے کا یار، وہ جو پٹواری کا پتر ہے، اماں (مندری) سے پوچھ رہا تھا کہ یہ لڑکا بار بار تمہارے گھر کیوں آتا ہے...... مجھے ایسی باتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے ویدو...... پتا نہیں کیوں میں تمہیں کسی مشکل میں دیکھوں تو...... تم...... میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔''

''اس طرح سے نہ سوچا کر فوزی۔''

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ کبھی بھی میرے بس میں نہیں تھا۔'' وہ عجیب لہجے میں کہہ گئی۔ ویدو نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی چھوٹی سی ناک کا کوکا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ سیاہ آنکھوں میں پانی تھا...... پتا نہیں کیا ہوا، یکایک ویدو کے لیے وہ بات کہنا بہت آسان ہو گئی جو وہ کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے، کچھ لمحے بہت کایا کلپ ہوتے ہیں۔

''پیار کرتی ہو نا مجھ سے؟'' اس نے کہہ دیا۔ آواز

بوجھل ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آئی نمی چاند کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ فوزی کی جھکی ہوئی آنکھوں میں لرزش ہوئی، لب تھرتھرا کر رہ گئے اور بھاری پلکوں سے بچے ہوئے آنسو اس دھرتی پر گر کر امر ہو رہے تھے جہاں دو بے لوث ''محبتیں'' آج پہلی بار اپنے ہونے کا اقرار کر رہی تھیں لیکن اس اقرار کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی شاید......

''اچھا چلتا ہوں۔'' ویدو نے ایک دم کہا اور سونے کے لیے ورکشاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

بالا اپنے کسی دوست کی شادی پر شہر گیا تھا۔ ویدو اور فوزی کو آج پھر شام کے بعد لمبی بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ باتوں میں فوزی نے اماں مندری کی بات شروع کر دی۔

''پتا ہے ویدو! اماں مندری چاہے اس عالم کی ماں ہے پر مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ ہمیشہ میرے بچاؤ کے لیے بولتی ہے۔ میرے حق میں بولتی ہے اور اس کے ماضی کی کہانی میں تمہیں بھی سنا چکی ہوں نا، بہت دردناک ہے۔ ان دو سالوں میں سیکڑوں دفعہ سن چکی ہوں میں۔ لگتا ہے کہ یہ میری اپنی کہانی ہے۔ دل کہتا ہے کہ اس معاشرے میں صرف ایک میں ہی نہیں ہوں جو اس طرح کا ظلم سہہ رہی ہوں۔ لاتعداد عورتیں ہیں...... شاید مجھ سے بھی زیادہ برے حالات میں......'' فوزی گہری سوچ میں عجیب سے جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔ وہ ویدو کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ اور تاثرات کو محسوس نہ کر سکی تھی۔

''بس کرو فوزی اب...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم جانتی ہو تم کیا بات کر رہی ہو؟'' ویدو کے لہجے میں غصہ واضح تھا۔ فوزی نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ویدو کی آنکھیں بھی اسی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان میں حیرت اور غصہ نظر آ رہا تھا۔ فوزی ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ ویدو کی بڑے بوڑھوں جیسی دانا باتیں کسی وقت اسے الجھا دیتی تھیں۔

''تم مجھے بتا رہی ہو کہ تم اس ظلم کی عادی ہوتی جا رہی ہو۔ تمہیں اب اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ وہ شخص کس طرح تمہاری عزت و وقار کی دھجیاں اڑاتا ہے......'' ویدو نے بمشکل اپنی آواز کو دبا رکھا تھا۔ اس کی گردن اور ماتھے کی رگیں پھول رہی تھیں۔

فوزی سہم سی گئی تھی۔ ''نہیں...... ویدو...... میرا مطلب......''

ویدو نے اس کی بات کاٹ ڈالی۔ ''تم اس ظلم کی عادی ہو رہی ہو فوزی اور یہ بات میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔

''تیری ویدے تسلی تو ہو نہ سکی ہماری''

یہ جو اماں مندری کی باتیں اور کہانیاں سنتی رہتی ہو ناں تم، یہ اصل میں تمہارے لیے چین کا کام کرتی ہیں۔ آج...... آج میں سمجھا تم کیسے سہہ رہی ہو۔ تم اتنی بے حس کیسے ہوتی جا رہی ہو......'' ان کے درمیان کچھ دیر گمبھیر خاموشی چھائی رہی۔ فوزی کو اپنی بات پر ویدو کے ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں موتی سے چمکنے لگے تھے۔ ویدو نے ایک لمبی سانس لی اور بولا۔

''ہمارے معاشرے کا المیہ ہی یہ ہے فوزی! مظلوم ظلم سہتے رہتے ہیں اور ظالم اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ مظلوم کا ضمیر اگر کبھی اس کو اپنے حق کے لیے کھڑا ہونے پر اکساتا بھی ہے تو اس کے امن پسند اپنے لوگ اسے تھپک کر سلا دیتے ہیں یا پھر وہ خود ترسی کے عالم میں اسے اپنی قسمت کا کھیل سمجھ کر خاموش ہو جاتا ہے اور یہ سمجھو تا، یہ خاموشی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ برائی کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے۔ فوزی...... میرے دل و دماغ میں تمہارا عکس ایک بہادر اور

ٹھوکروں کا ہے۔ تمہارا مستقبل، تمہاری منزل یہ ذلت والی زندگی نہیں ہو سکتی......" وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ فوزی اس دوران ٹھہری ہوئی نظروں سے کسی گہری سوچ میں تھی۔

"میں نے کتنی دفعہ تم سے یہ بات کی ہے کہ ہم یہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ خاموشی سے کسی دوسرے شہر چلے جاتے ہیں۔ آپا باجی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ایک دفعہ ہم نے ادھر قدم جما لیے تو نسیم، زینب اور فاروق کو بھی فوراً بلا لیں گے۔ ابا جان کو تمہارے میرے بارے میں اور ان حالات کے بارے میں پتا ہے اور وہ تو ویسے بھی چاہتے ہیں کہ ان کا کوئی روزگار کا سلسلہ بن جائے تو وہ مستقل طور پر شہر چلے جائیں......"

"ویدو! میں یہ نہیں کر سکتی۔" فوزی کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔ اس کی مٹھیاں مضبوطی سے آپس میں بھنچی ہوئی تھیں۔

"کیوں...... کیا اس کی وجہ وہی کم ہمتی ہے جس کا میں تمہیں بتا رہا ہوں؟" ویدو کے لہجے میں دکھ بھرا طنز تھا۔

"نہیں ویدو......!" فوزی نے تڑپ کر ویدو کی طرف دیکھا۔ اس کی بلوری آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں رہی کہ جیسے سوچ رہی ہو کہ اسے یہ بات ویدو کو بتانی چاہیے یا نہیں پھر گویا ہوئی۔

"ویدو! میں نے کبھی اپنی ماں کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ جب ہم جڑانوالا میں تھے تو میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور پھر بابا، آپا باجی اور ہم بچوں کو لے کر ادھر سندر پور آ گئے۔ پر ویدو...... میری ماں مری نہیں تھی بلکہ اس کے لیے ہم مر گئے تھے۔" ویدو دیکھ رہا تھا کہ فوزی اب اپنے آنسو چھپا کے بڑی مشکل سے بول رہی ہے۔ اس کے گلے میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں اور چہرے پر تاسف کی لکیریں واضح تھیں۔

"ابا اور اماں میں ہر وقت جھگڑا رہتا تھا۔ ابا جب گھر آتے تھے تو اماں نے ان سے جھگڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ پہلے سے ڈھونڈ کر رکھی ہوتی تھی۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ پر اب جب ان کی باتیں ذہن میں آتی ہیں تو ہر چیز واضح ہوتی ہے۔ اماں ہمیشہ ابا کو پہلی بیوی کے طعنے دیتی یا پھر ضرورتیں پوری نہ ہونے کا رونا ہوتا۔ ابا زیادہ تر خاموش رہ جاتے تھے پر اماں کا غصہ اتنا برا تھا کہ جب وہ زیادہ غصے میں آتی تو چیزیں توڑنا شروع کر دیتی۔ مجھے ہلکا سا یاد پڑتا ہے کہ جب شام ہوتی تھی تو میں سہم جاتی تھی کہ اب ابا کے گھر آنے کا وقت ہو گیا ہے اور آج نہ جانے کیا ہو گا۔ ایک دفعہ اماں نے حد سے زیادہ بدتمیزی کی تو ابا نے بھی ان کو تھپڑ مار دیا۔ اماں ہم بچوں کو چھوڑ کر نانی کے گھر چلی گئی اور بہت دنوں بعد واپس آئی۔ شاید پانچ چھ ماہ بعد۔ پھر کبھی کبھار ابا کی غیر موجودگی میں طفیل ماموں ہمارے گھر آنے لگے۔ وہ اماں کے چچا زاد کزن تھے۔ میں تب بہت چھوٹی تھی لیکن مجھے یاد ہے کہ ان کا آنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا......" ویدو انہماک سے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں افسوس تھا، حیرت تھی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے اس دن گندم کی کٹائی کا میلا لگ رہا تھا۔ ابا نے کہا تھا کہ میں شام گھر جلدی آ جاؤں گا اور سب مل کر میلا دیکھنے چلیں گے۔ انہوں نے اماں کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ "تم وہاں سے اپنے لیے چوڑیاں بھی خرید لینا اور جو تمہارا دل کرے گا تمہیں کھلاؤں گا۔" پر جب شام کو ابا گھر آئے تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اماں نے ابا پہ چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے پاس تو کوئی ڈھنگ کا کپڑا ہی نہیں جو پہن کر تمہارے ساتھ میلے پہ جاؤں۔ اماں نے ابا سے بہت زیادہ لڑائی کی۔ ابا سر جھٹکتے ہوئے ہم بچوں کو لے کر میلے کی طرف چل پڑے۔ ابا نے ہمیں جھولے لے کر دیے، کھلایا پلایا۔ زینب تب بہت چھوٹی تھی۔ ابا اسے گود میں اٹھا کر ہمیں میلے کی سیر کراتے رہے۔ انہوں نے خود اپنے لیے کچھ نہ خریدا تھا نہ کچھ کھایا تھا۔ بس اماں کے لیے چوڑیاں خریدیں اور ایک گلابی رنگ کا پھولوں والا جوڑا خریدا۔"

اندر اماں سندری کے کمرے سے کھانسی کی آواز آئی تو فوزی خاموش ہو گئی۔ رات اپنے جوبن پر تھی۔ چاندنی کی روشنی میں اس چھوٹے سے صحن اور اس سے ملحقہ باورچی خانے کی ہر چیز واضح ہو رہی تھی۔ فوزی نے بات جاری رکھی۔

"ہم گھر پہنچے تو اماں نہیں تھیں۔ چند ماہ کا بھائی فاروق چھوٹی پہ لیٹا بے کلی سے اپنی کمزور ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ رو رو کر اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے اماں کو سارے گاؤں میں ڈھونڈا۔ میں اماں کو اس کا تحفہ چوڑیاں اور خوبصورت جوڑا دینے کے لیے بے چین تھی۔ ہم گاؤں سے باہر میلے والے میدان تک دوبارہ گئے۔ پر...... اماں کہیں نہیں ملی......" فوزی اتنا کہہ کر باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

"پھر ایک دن آپا باجی نے مجھے بتایا کہ اماں نے اس "طفیل ماموں" کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اب کبھی نہیں آئے گی۔"

ویدو کے مضبوط بازو نے بے ساختہ فوزی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ فوزی کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ اس کے

آنسو ویدو کے سینے میں جذب ہوتے رہے تھے۔ فوزی کے ماضی کے تاریک باب نے ویدو کے دل کو لہو کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فوزی اپنے ظالم بندے سے چھٹکارا پانے کی یا اس کے گھر سے نکل جانے کی ہمت کیوں نہیں کر پا رہی۔ وہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی کہ بیٹی بھی ماں کی طرح بھاگ گئی ہے۔

☆☆☆

''بکواس کرتی ہے مجھ سے۔ کچھ نہ کچھ تُو نے ضرور کیا ہے جس کی وجہ سے بچہ نہیں ہو رہا۔'' بالے نے فوزی کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اس جھٹکے سے کھینچا کہ وہ الٹ کر چارپائی سے نیچے گری۔

''بتا کس ڈسپنسری سے دوا لے کر کھا رہی ہے؟'' فوزی گٹھڑی بنی ہوئی تھی اور بالا ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح اسے ٹھوکریں مارتا جا رہا تھا۔ فوزی کو مار۔ تڑپنے اس کا جسم اب جلدی جھکنے لگا تھا اس لیے اب آ کر وہ زیادہ تر ڈنڈے یا اماں مندری کی چھڑی کو استعمال کرتا اور اس کے نازک جسم پر اپنی بربریت کے نشان چھوڑتا۔ وہ اپنا کام کرتا رہا اور اماں مندری کی گھٹی گھٹی آہ و بکا فوزی کے کانوں میں پڑتی رہی۔

وہ ساری رات فوزی نے کراہتے ہوئے گزاری۔ اس کی کمر کے نیچے انگارے سے جلتے رہے۔ پو پھٹنے سے پہلے وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جائے گی اور پھر چاہے کچھ بھی ہو، وہ یہاں واپس نہیں آئے گی۔ اس وقت اس سوچ کے علاوہ کوئی اور سوچ اس کے ذہن کی دیواروں پر نہیں تھی۔ اس کا جسم رات بھر بخار میں تپتا رہا تھا۔ اس کے جسم کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جہاں بالے کی درندگی نے نیل نہ چھوڑے ہوں۔

بالے کے گھر سے جانے کے بعد اس نے اماں کے لیے روٹی بنائی۔ پھر لسی کا پیالہ اور روٹی چھابے میں ڈال کر اس کی چارپائی کے ساتھ پیڑھے پر رکھ دیے۔ اماں مندری دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا زیادہ وقت غنودگی میں سوتے ہوئے گزر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ شاید بے بسی کے عالم میں روتی رہی تھی۔ اس نے اماں کی ٹانگوں پر کھیس درست کیا۔ الجھے ہوئے سفید بالوں پر دوپٹا کھینچ دیا۔ وہ کچھ دیر گہری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے سیاہ مائل ماتھے پر جھک کے بوسہ دیا...... اور پھر وہاں سے نکل پڑی۔ اس نے اپنے جہیز میں دی گئی وہ بڑی سی سفید چادر لپیٹ رکھی تھی جو ابھی تک اس نے استعمال نہیں کی تھی۔ سندر پور جانے کے لیے پکے رستے کے بجائے اس نے ایک جنگلی کچا اور تنگ سا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر آپا باجی نے اس کے لیے گھر کا دروازہ نہ کھولا تو وہ بہن بھائی سمیت چاچا نذیر احمد کے گھر پناہ لے لے گی۔ ابھی وہ اس رستے پر چند فرلانگ ہی گئی تھی کہ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا اسے بڑی تیزی سے اپنی طرف دوڑتا دکھائی دیا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ یہ نازو کا چھوٹا بھائی عدیل تھا۔

''فوزی باجی...... فوزی باجی۔'' اس نے دور ہی سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کچھ اور آگے آیا اور جب اسے یقین ہوا کہ وہ فوزی ہی ہے تو اس نے تیزی سے بولنا شروع کیا۔

''فوزی باجی...... وہ...... بالا بھا ماسی مندری سے بری طرح جھگڑ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تُو نے فوزی کو کہاں بھیجا ہے۔'' وہ پھولی ہوئی سانس میں بہ مشکل بول رہا تھا۔

''اسے روکو جا کر۔ کہیں وہ اسے مار ہی نہ شروع کر دے۔'' یکلخت فوزی کی آنکھوں میں اماں کا جھریوں بھرا چہرہ، درد بھری بجھی ہوئی آنکھیں گھوم گئیں جن میں ہر وقت ایک بے نام سی کمی رہتی تھی۔ یہ وہ چہرہ تھا جو اس کے ذہن اور دل میں ماں کا کھویا ہوا احساس بحال کرتا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پلٹ پڑی۔

گھر کا صحن ایک اولاد کی جہالت اور بربریت کی بدترین مثال پیش کر رہا تھا۔ ایسا منظر جسے دیکھ کر آسمان اپنے ستونوں سے ڈگمگانے لگے اور زمین پھٹنے کو آ جائے۔ بالا نشے میں تھا اور بے دریغ اماں مندری پر چھتروں کی بارش کر رہا تھا۔ وہ دوزانو زمین پر گری پڑی تھی۔ اس کے سفید جھک بال جن میں کہیں کہیں مہندی کی سرخی بھی تھی، بری طرح سے بکھرے ہوئے تھے۔ اماں اپنے منہ میں نہ جانے کیا منمنائی تھی کہ بالا پھر سے کسی سانڈ کی طرح ڈکرایا۔

''اماں چپ کر جا...... میرے آگے بھونک نہ......''

اماں نے کپکپاتے ہوئے دونوں ہاتھ دوبارہ سے اپنے بچاؤ کے لیے ہوا میں بلند کر لیے۔ یہ وہ منظر تھا جس نے چند سیکنڈ کے اندر فوزی کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ دو برس کا دبا ہوا غصہ اور طیش لاوا بن کر اس کے سر کو چڑھ گیا اور اس نے بجھی ہوئی مفاہمت کی ماری، بربریت برداشت کرتی فوزی کو ایک سو اسی کے زاویے سے پلٹ کر رکھ دیا۔ اس نے اسی کونے میں پڑے بالن کے ڈھیر میں سے ایک گول تقریباً ڈھائی فٹ لمبا ڈنڈا اٹھایا اور کسی شیرنی کی طرح بالے پر پل پڑی۔ یہ منظر گاؤں کے بچوں اور عورتوں نے بھی دیکھا۔

وہیلے بالے نے اس پر جھپٹنے اور اسے قابو کرنے کی پوری کوشش کی، پر آج فوزی غم و غصے کا ایسا سیلابی ریلا بن چکی تھی جس کے آگے بالے کا ٹکنا ناممکن تھا۔ وہ خدا کا قہر بن کر اس پر برس رہی تھی۔ بالے نے بھاگ کر دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو فوزی نے اسے اس کے کالر کے پیچھے سے پکڑ کر ایسا زوردار جھٹکا دیا کہ وہ چھوڑا کر پیچھے زمین پر گرا۔

''ماں کو مارتا ہے...... بے غیرت انسان......'' فوزی کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کے بال کھل کر چہرے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ جس ہاتھ میں اس نے ڈنڈا پکڑا ہوا تھا، اس کی رگیں پھولی ہوئی تھیں جو اس کے عام عورتوں سے ہٹ کر زور آور اور سخت جان ہونے کا پتا دے رہی تھیں۔ بالا زمین پر مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور حیرت کا سمندر موجزن تھا۔

ہاں...... اس گزرے بے دم وقت نے فوزی کو نازک کلی سے ایک سخت جان لڑکی بنا دیا تھا اور دوسری طرف اس کے تشدد پسند شوہر بالے کا نشہ اس کے جسم کو تیزی سے ختم کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کئی موقعوں پر فوزی، بالے کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اس کی اذیت پسندی کی تسکین سے روک سکتی تھی۔ وہ اسے بتا سکتی تھی کہ وہ اسے روک دینے اور گردن سے پکڑ کر بٹھا دینے کے قابل ہو چکی ہے پر عورت ہونے کی فطرت کے تحت وہ ایسا نہ کر سکی لیکن آج معاملہ اس ہستی کا تھا جو اس کے دل میں ماں ہونے کا احساس جگاتی تھی۔

فوزی نے اپنا ہاتھ روکا۔

''معافی مانگ ماں سے!'' وہ کسی شیرنی کی طرح ہی دہاڑی تو بالے نے اونچی آواز میں آہ و بکا شروع کر دی۔ وہ روتا جا رہا تھا اور گاؤں والوں کو اکٹھا کر رہا تھا۔ ''دیکھو میری زنانی کو...... دیکھو اس بے حیا کو۔'' وہ پکار رہا تھا۔

☆☆☆

جو کچھ ہوا تھا وہ بالے تو کیا فوزی کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا۔ بات چک انیس اور ارد گرد کے گاؤں جن میں سعد پور بھی شامل تھا، کی مشترکہ پنچایت تک پہنچ چکی تھی۔ منظر، ارشد گجر کے ڈیرے میں لگی پنچایت کا تھا۔ پنچایت کا سرپنچ چک انیس کا چودھری باقر احمد سا گوان کی بنی بڑی سی کرسی پر براجمان تھا۔ دونوں اطراف میں لگے موڑھوں اور لکڑی کے بنچوں پر بالے اور فوزی کے گھر والے اور گاؤں کے کچھ بزرگ بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ڈیرے کے اطراف میں کھڑے تھے۔ اندر کے حالات دیکھنے کے لیے بچے بھی ڈیرے کی کچی دیواروں پر براجمان تھے۔

کچھ دیر بعد سرپنچ نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش ہونے کو کہا اور یاسمین عرف آپا باجی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ چند ثانیے بعد آپا باجی کی دبی دبی آواز ابھری۔

''چودھری جی! بالے نے جو کچھ بتایا ہے وہ یقیناً سچ ہی ہوگا...... بڑی بے شرم حرکت کی ہے جی اس لڑکی نے...... اپنے سر کے سائیں پہ ہاتھ اٹھایا ہے۔ بڑا گناہ کمایا ہے اس نے جی......'' وہ نفرت بھری نگاہوں سے فوزی کو بھی دیکھ رہی تھی جو اپنی چادر میں لپٹی ہوئی سہمی سمٹائی سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھی تھی پھر یکدم یاسمین ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''چودھری جی...... بالا اسے جو مرضی سزا دے لے...... اسے مار کٹ لے...... اس کا روٹی پانی بند کر دے پر اس سے دست بردار نہ ہو۔ یہ اس کا بڑا پن اور ہم پر بڑا احسان ہوگا جی......''

چودھری باقر نے پھر فوزی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بوڑھی، بھاری پپوٹوں والی آنکھوں میں تاسف اور غصے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

''ہاں بھئی...... تو کچھ بولنا چاہتی ہے؟ کیوں اتنا بڑا ظلم کیا ہے تو نے اپنی جان پر...... کہاں سے آئی تیرے اندر اتنی جرأت اور بے شرمی؟''

فوزی بدستور سر جھکائے کھڑی تھی۔ چودھری کچھ دیر فوزی کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر فیصلے میں مشاورت کی غرض سے اپنے دائیں ہاتھ بیٹھے بابا شمو کی طرف جھکا۔ بابا شمو، سرپنچ چودھری باقر کا دست راست تھا۔ پنچایت کے ہر فیصلے پر مکمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے چودھری کو بابا شمو کی بھرپور خدمات حاصل تھیں۔

اسی لیے جب بابا شمو اور چودھری میں فیصلے کے متعلق رازدارانہ گفتگو ہو رہی تھی، ایک دراز قد لڑکا ہجوم میں سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھا۔ یہ اور کوئی نہیں، وسیم ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے باکی تھی۔ تنا ہوا چہرہ اور ماتھے کی لکیریں اندر کے انتشار اور احتجاج کا پتا دے رہی تھیں۔ پچھلے ایک ڈیڑھ برس میں وہ کافی سیانا ہو گیا تھا۔ اس کی ہلکی مونچھیں اب صرف روئیں نہیں تھے، ان میں بالغانہ سیاہی آ چکی تھی۔ اس نے پہلے چودھری کو ادب سے سلام کیا پھر گویا ہوا۔

''میں چھوٹے منہ کے ساتھ بڑی بات کرنے آیا ہوں جی۔ آپ سب ہی مجھ سے بڑے ہیں...... اور آپ منصف بھی ہیں۔ آپ اس قانون کے رکھوالے ہیں جہاں

مرد اور عورت برابر ہیں۔ انصاف کی خاطر اگر علاقے کے
مرد آپ کی طرف دیکھتے ہیں تو مظلوم عورتوں کا سہارا بھی
آپ ہیں...... چاچے اختر کی بیٹی فوزی ایک عورت ہے ورنہ
وہ آپ کو دکھاتی کہ اس کے جسم کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جہاں
بالے کی مار کٹائی اور تشدد نے نشان نہ چھوڑے ہوں......"
پنچایت میں یکدم خاموشی سی چھا گئی۔ فوزی کا رنگ مزید
زرد ہو گیا۔ بالا بے چین دکھائی دینے لگا۔

ویدو نے عجیب سی جرأت کے ساتھ بات جاری
رکھی۔ "چاچے اختر کی یہ بیٹی ڈیڑھ سال سے اس شخص کا
شرمناک تشدد برداشت کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں
اپنے عورت ہونے کی سزا کاٹ رہی ہے۔ بڑی خاموشی سے
بڑی برداشت سے۔ چوہدری جی! اس بے چاری پر دن
رات ڈھائے جانے والے ظلم پر تو کوئی پنچایت نہیں لگی۔
آپ لوگ تو کیا اس کے اپنے گھر والے اس کو رخصت کر کے
اس سے اور اس کے حالات سے لاتعلق ہو گئے تھے اور اگر
آج اس شخص کو اپنی ہی ماں پر ظلم کرتا دیکھ کر اس لڑکی سے
برداشت نہیں ہوا اور ان ڈیڑھ دو سالوں میں اس نے پہلی
دفعہ ظالم کا ہاتھ روکا ہے تو اس پر سزا سنانے کے لیے یہ
پنچایت سج گئی ہے۔"

ویدو کی باتوں میں وزن تھا، سچائی تھی۔ لوگ یکدم
خاموش ہو گئے تھے مگر پنچوں کو یہ ناگوار لگ رہا تھا کہ کل کا
لڑکا ان کے سامنے اس طرح چٹر پٹر بولے۔ پنچوں اور کچھ
بڑے بوڑھوں کی ناگواری محسوس کر کے چوہدری باقر نے
ہاتھ اٹھا کر ویدو کو بولنے سے روکا اور بلند آواز میں کہا۔ "دیکھ
ویدو! تو کالجی لڑکوں کی طرح زیادہ پڑھی لکھی باتیں نہ سنا
ہمیں۔ ٹھیک ہے مرد اور زنانی دونوں کے اپنے اپنے حق ہیں
پر زنانی...... زنانی ہی ہے اور وہ اسی روپ میں اچھی لگتی ہے۔
وہ مرد بننے کی کوشش کرے گی تو سب کچھ گنوا دے گی۔"

سندر پور کے ماسٹر علی محمد کو یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں
آئی۔ شاید وہ اس بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے مگر
چوہدری باقر دوبارہ گرج کر بولا۔ "سیانوں کا یہ کہنا ہے کہ
بیوی اپنے شوہر کی رعایا ہوتی ہے، ماتحت ہوتی ہے۔ اسی
طرح گھروں کے نظام چلتے ہیں۔ شوہر ہاتھ اٹھائے تو بات
سمجھ میں آتی ہے لیکن بیوی ایسی حرکت کرے تو سمجھ میں نہیں
آتا...... بالکل نہیں آتا۔"

سر جھکا کر بیٹھی ہوئی فوزی کا سر کچھ اور جھک گیا۔
یوں لگتا تھا جیسے اب وہ خود بھی حیران ہے کہ اس نے ایسا
کیوں کیا۔

اس سے پہلے کہ چوہدری مزید گرج برستا، ویدو فوراً
بول اٹھا۔ "آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے بزرگوار! عورت کی
حیثیت ہمارے لیے یہی ہے۔ وہ اپنے مرد کی رعایا ہے،
ماتحت ہے۔ بڑے اچھے طریقے سے پلو سے باندھ لیا ہے
اس بات کو ہمارے معاشرے نے لیکن اس بات کا ایک
دوسرا پہلو بھی ہے۔" لوگ حیرت سے ویدو کی جانب دیکھ
رہے تھے۔ اس کی باتیں، الفاظ کا چناؤ، اس کی سوچ اس
کے ہم عمر لڑکوں کے مقابلے میں کافی بلند تھی۔ وہ تعلیم کی راہ
پر گامزن تھا۔ اس کے سینے میں علم کی روشنی تھی اور یہ سب
اس کی باتوں سے عیاں ہو رہا تھا۔

"وہ پہلو یہ ہے کہ جب ہمارے پیارے نبی ﷺ
اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کی زبان مبارک پر
اس امت کے لیے جو آخری نصیحت تھی، وہ یہ تھی کہ میری
امت نماز نہ چھوڑنا اور غریبوں اور اپنے ماتحتوں سے اچھا
سلوک کرنا۔ عورت بھی مرد کے ماتحت ہے۔ چوہدری
صاحب! سرکار دو عالم ﷺ کی اس بات کے بعد جو
ہمارے لیے مبارک نصیحت کا درجہ بھی رکھتی ہے، کیا کوئی
مسلمان اپنے ماتحت، اپنی بیوی کو بے وجہ بدسلوکی، تشدد اور
غیظ و غضب کا نشانہ بنا سکتا ہے؟"

چوہدری کی نظریں اب جھک گئی تھیں۔ رکن پنچ بھی
اب خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
اس خاموشی کو اچانک ہی مائی مندری کی کمزور سی آواز نے
توڑا۔ وہ ہاتھ جوڑے چوہدری سے مخاطب تھی۔

"سرکار! فوزی بچی ہے۔ اس سے غلطی ہوئی ہے
جناب۔ بالا میرا پتر ہے۔ مجھے اس کے غصے کا پتا ہے۔ اس کو
جب غصہ آتا ہے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔" مائی
مندری نے خشمگیں نگاہوں سے بالے کی طرف دیکھا جو
اب بھی ایک ہاتھ سے اپنا بازو دبا رہا تھا اور ہلکی آواز میں
"ہائے ہائے" کر رہا تھا۔ مائی مندری کی نگاہوں میں جیسے
زمانے بھر کا درد سمٹ آیا۔

"فوزی کو معاف کر دیں جی۔" سب لوگ اس منظر
پر حیران تھے۔ ایک عورت اپنے بیٹے کے بجائے اپنی بہو
کے حق میں بول رہی تھی۔ پنچایت نے قریباً آدھا گھنٹا مزید
صلاح مشورہ کیا۔ بالآخر فیصلہ یہی ہوا کہ میاں بیوی آپس
میں صلح کریں اور ایک دوسرے کی غلطی کو معاف کر دیں۔
پنچوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ حالات کو معمول پر لانے کے
لیے بالا فی الحال فوزی کو اپنے میکے جانے اور کچھ دن وہاں
رہنے کی اجازت دے گا۔ پنچایت ختم ہونے کے بعد پنچوں

نے بالے کو علیحدہ لے جا کر سمجھایا کہ وہ اپنی بیوی اور ماں سے اس طرح کا سلوک نہ کرے۔

☆☆☆

فوزی کو سندر پور آئے اب ایک ماہ ہونے والا تھا۔ یہ ایک ماہ آپا باجی نے پتا نہیں کس طرح کاٹا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے سسرال واپس پہنچ جائے۔ دوسری طرف بالا بھی پچھلے دو ہفتوں میں دو تین چکر لگا چکا تھا۔ وہ ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے فوزی کو جلد از جلد گھر لے جانا چاہتا تھا۔ ایک دفعہ تو اسی سلسلے میں اس نے فوزی سے ٹھیک ٹھاک تلخ کلامی بھی کی تھی۔

فوزی کو اپنے مستقبل قریب کا نقشہ بڑی اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بالے کے تیور دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بمشکل دو چار دن ہی شرافت سے گزارے گا اور ایک بار پھر اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دے گا۔ چوڑیوں والی مائی اللہ رکھی کی زبانی فوزی نے اڑتی اڑتی بات یہ بھی سنی تھی کہ بالے نے ورکشاپ والا کام ٹھپ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اس کا ارادہ یہ بھی ہے کہ وہ چک انیس سے کہیں اور شفٹ ہو جائے۔ کہاں؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں فوزی کے دل میں یہ ڈر بھی بیٹھ گیا تھا کہ وہ اسے سندر پور اور چک انیس سے کہیں بہت دور لے جائے گا۔ کسی ایسی جگہ جہاں اس کے ظلم وستم کا ہاتھ روکنے والا اور کوئی نہ ہوگا۔

ایک روز بالا اپنے کسی پھوپھڑ کو لے کر پھر آ گیا۔ وہ ابھی اور اسی وقت فوزی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر فوزی مزید سہم گئی۔ اس نے بخار کا عذر کر کے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ آپا باجی، بالے کی پوری حمایت کر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ فوزی کو باندھ کر، اس کی مشکیں کس کر اسے بالے اور اس کے پھوپھڑ کے حوالے کر دیتی۔ گھر میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ بچے بھی سہمے ہوئے تھے۔ جب بالے نے فوزی کو بازو سے پکڑ کر کھینچنا چاہا تو زینب اور فاروق وغیرہ فوزی کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ نشے میں وحشت بالا اول فول بکنے لگا۔ جب وہ چرس کی ترنگ میں ہوتا تھا تو بہت نڈر اور منہ زور لگنے لگتا تھا...... جب نشہ اترتا تھا تو اس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہو جاتا تھا۔ درحقیقت یہ نشہ ہی تھا جو بڑھتی عمر کے ساتھ اسے اندر سے کھوکھلا کرتا جا رہا تھا۔

معاملہ بگڑنے لگا تو آپا باجی بیچ میں پڑ گئی۔ اس نے فوزی کی نظر بچا کر بالے کو آنکھ سے اشارہ کیا اور پھر بلند آواز میں کہا۔ "بالے! تو ابھی جا...... ہم نے تماشا نہیں لگانا ہے یہاں۔ میں اسے سمجھاتی ہوں۔ تو ایسا کر کہ...... جمعے کے روز آ جانا۔"

☆☆☆

یہ جمعے کا دن تھا۔ ویدو مسجد میں جمعہ پڑھنے کے بعد دیر تک دعا مانگتا رہا۔ اس کی دعاؤں میں فوزی اور اس کے بہن بھائی ہمیشہ پیش پیش ہوتے تھے۔ مسجد سے گھر آ کر اس نے کھانا کھایا اور پڑھنے بیٹھ گیا۔ ورکشاپ میں بالے کی نوکری چھوڑنے کے بعد اس نے انٹر کا امتحان پرائیویٹ دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ابھی وہ کتابیں کھول ہی رہا تھا کہ فوزیہ کی بہن شمیم ہانپتی کانپتی ہوئی پہنچی۔ اس نے ویدو کو بتایا کہ آپی فوزی کا بندہ آیا ہے۔ وہ آپی کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہا ہے۔

ویدو کو پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ بات بڑھ جائے گی۔ وہ اسی وقت اٹھا۔ کبھی تیز چلتا اور کبھی بھاگتا ہوا فوزی کے گھر جا پہنچا۔ وہاں صحن کے اندر واقعی تماشا لگا ہوا تھا۔ آج بالا اکیلا بھی نہیں تھا۔ اس کا چوڑا چکلا پھوپھڑ تو پچھلی دفعہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ آج چک انیس کے دو لڑکے بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے دہرے جسم کے، گھنی مونچھوں والے ایک لڑکے کے بارے میں ویدو کو بعد ازاں پتا چلا کہ وہ چک کے پٹواری کا بیٹا ہے۔ اس کا نام شاہنواز عرف شاہو تھا۔ کافی اتھرا مشہور تھا۔ صحن میں داخل ہونے کے بعد ویدو نے دیکھا کہ بالا اور اس کا پھوپھڑ بالکل آگ بگولا تھے۔ ساتھ آنے والے دونوں لڑکے باہر گلی میں ایک پرانی سوزوکی کار کے پاس کھڑے تھے۔ بالا، فوزی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا اور آپا باجی اسے عقب سے دھکیل رہی تھی۔ فوزی ننگے سر اور ننگے پاؤں تھی...... وہ بے چارگی کے عالم میں کرلا رہی تھی۔ آپا باجی کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

ویدو نے آج تک بہت برداشت کیا تھا لیکن آج جو منظر وہ دیکھ رہا تھا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس منظر نے جیسے پلک جھپکنے میں اس کے اندر کسی بارودی فلیتے کو آگ دکھا دی۔ ساری مصلحتیں، سارے اندیشے کسی انجانے تاریک غار میں اوجھل ہو گئے...... ہاں وہ پیار کرتا تھا اس سے...... وہ اس کے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اس کی چھوٹی سی تکلیف دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا...... لیکن یہاں تو اس پر ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ ہر آنے والا دن اس کے لیے اذیتوں کے نئے نئے تحفے لا رہا تھا اور یہ تحفے اس کے بدبخت نشئی شوہر کے ہاتھوں اس تک پہنچ رہے تھے۔

وہ دو قدم آگے آکر نہایت گمبھیر لیکن ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ”بھا بالے! چھوڑ دے اس کا ہاتھ۔ وہ تیرے ساتھ جانا نہیں چاہ رہی۔“

نشے کی اکڑ میں بالا گرجا۔ ”اوئے ہٹ جا میرے آگے سے ورنہ ناکیں توڑ کے رکھ دوں گا تیری..... مجھے پہلے ہی بڑا غصہ ہے تیرے اوپر۔“

”کس بات کا غصہ ہے تجھے؟“ ویدو اسی گمبھیر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

”اوئے، میرا منہ نہ کھلوا۔ یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے۔ میرا گھر برباد کرنے میں سب سے زیادہ تیرا ہاتھ ہے۔ تو بھیڑا (خراب) ہے اس کے ساتھ۔ بھیڑا ہے..... بھیڑا ہے۔“ وہ چلایا۔

ویدو کا ہاتھ بے ساختہ گھوما اور بالے کے منہ پر اتنی زور کا تھپڑ لگا کہ آواز گھر سے باہر تک گئی۔ مہینوں کا دبا ہوا غیظ و غضب آگ کی طرح بھڑک اٹھا۔ بالے نے اس کے پیار کو گالی دی تھی۔ یہ گالی برداشت کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ بالے پر پل پڑا۔ بالے کے بھونپڑ نے باہر کھڑے لڑکوں کو آوازیں دیں۔ وہ تند بگولوں کی طرح اندر آئے اور گالیاں بکتے ہوئے ویدو پر جھپٹے۔ گھر میں آپا باجی اور بچوں کے چلانے کی آوازیں گونجیں۔ ایک دم طوفان سا آ گیا۔ ویدو اکیلا تھا اور وہ تین تھے۔ ادھیڑ عمر بھونپڑ بھی ان کی تھوڑی بہت مدد کر رہا تھا مگر ویدو کے اندر تو جیسے کوئی اور ہی طاقت کام کر رہی تھی۔ یہ شاید اس کے پیار کی طاقت تھی۔ اس بے لوث جذبے کی طاقت تھی جو بچپن سے بُور بُور اس کے اندر پروان چڑھا تھا اور اب اس کی شاخیں اس کے پورے بدن میں موجود تھیں۔ اس کو خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ ان تینوں پر حاوی آ جائے گا اور انہیں اس بری طرح مارے گا کہ ان کو دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیلچا آ گیا تھا۔ اس نے ایسے جنونی انداز میں وہ بیلچہ گھمایا کہ بالا اور اس کے دونوں ساتھی چوٹیں کھا کر اور خوفزدہ ہو کر کونوں میں سمٹ گئے۔ پھر ایک تو بھاگ نکلا۔ بالا اور پٹواری کا پتر شاہو کوئی اینٹ پتھر ڈھونڈنے کے بہانے گلی میں آ گئے۔ دونوں زخمی تھے۔ بالے کے کپڑے لہو رنگ ہو رہے تھے۔

اسی دوران میں محلے کے کئی بڑے بوڑھے درمیان میں پڑ گئے۔ کچھ نے ویدو کو سنبھالا، کچھ بالے اور شاہو کو دور ہٹا کر لے گئے۔ ویدو کی دہاڑوں نے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ سا لڑکا جو کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا، شعلہ جوالا بنا ہوا تھا۔ پٹواری کے پتر شاہو نے بالے کو ساتھ لیا اور دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ آپا باجی فوزی کو کوس رہی تھی۔

شام سے پہلے ایک اے ایس آئی ■ کانسٹیبلوں کے ساتھ ویدو کے گھر آ دھمکا۔ ویدو کے باپ محمد نذیر نے بہت ترلا منت کیا لیکن وہ لوگ ویدو کو دنگے فساد کے الزام میں پکڑ کر چوکی لے گئے۔

☆☆☆

رات ٹھنڈی تھی لیکن فوزی کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ آنسو لگاتار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ بالے کے نکاح میں تھی۔ مقامی رسم و رواج کے مطابق وہ اسے زبردستی بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ اب تو شاہو جیسا غنڈا بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ کئی گھنٹے سے مسلسل ایک سوچ میں تھی۔ آخر کار یہ سوچ اسے ایک حتمی فیصلے تک لے آئی۔ وہ یہ گھر چھوڑ رہی تھی...... ابھی اور اسی وقت...... گوجرانوالا میں اس کی ایک دور کی خالہ رہتی تھی۔ اس کا اتا پتا اسے معلوم تھا۔ وہ وقتی طور پر اسے پناہ دے سکتی تھی پھر بعد میں سوچا جا سکتا تھا کہ کیا کرنا ہے؟ فوزی کو یہ تسلی بھی تھی کہ ویدو حوالات میں ہے۔ اس کے گھر سے بھاگنے کا الزام ویدو پر نہیں آ سکتا تھا۔ فجر کی اذانیں ہونے میں بس ایک آدھ گھنٹہ ہی باقی تھا۔ سامان کی پوٹلی اس نے رات پہلے پہر ہی باندھ لی تھی۔ سامان بھی کیا تھا، بس تھوڑے سے کپڑے، ایک اونی جرسی، ایک جوتی اور ساڑھے چھ سو روپے نقد جو اس نے اپنے ویاہ والے چلیلے لیکن ادھڑے ہوئے بٹوے میں رکھے ہوئے تھے۔

بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے ساتھ والی دونوں چارپائیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ”ماں جائے“ سو رہے تھے۔ اس نے فہیم، زینب اور فاروق کے ماتھے چومے اور خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

وہ خاموشی کی زبان میں بولی۔ ”اللہ سوہنے! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میری سمجھ بس اتنی ہی ہے۔ کوئی سمجھانے والا، کوئی ہاتھ پکڑنے والا بھی نہیں ہے۔ خود کو بالے کی سختیوں سے بچانے کے لیے جو دماغ میں آ رہا ہے، وہ کر رہی ہوں۔ اگر یہ غلط ہے تو مجھے معاف کر دینا۔“

کھیتوں کھیت چلتی، ٹھنڈ اور کہرے کے اندر سے گزرتی ہوئی وہ سندر پور سے تین چار میل دور چلی آئی۔ اس نے ایک گرم لوئی میں اپنا منہ سر اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ

بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں دن کی روشنی گھلنا شروع ہوئی تو وہ دین پورہ کے تانگوں کے اڈے پر پہنچ چکی تھی۔ تانگا اسے اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں سندر پور اور سندر پور کے خطروں سے دور لے گیا۔ اسے پتا تھا کہ پکی سڑک پر پہنچ کر اسے کون سی بس پکڑنی ہے اور پھر آگے کہاں جانا ہے۔

یہ سردیوں کا ایک چھوٹا سا دن تھا۔ وہ سارا دن ہی سفر میں رہی تھی۔ پہلے تانگا پھر بس، پھر ویگن اور ایک بار پھر بس۔ جب سرد شام کے سائے لمبے اور گہرے ہوئے تو وہ اپنی چھوٹی سی پوٹلی کے ساتھ چھوٹے سے بس اڈے پر اتری۔ یہ گوجرانوالا کے قریبی قصبے کا بس اڈا تھا۔ یہاں سے خالہ نوراں کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ پچھلی مرتبہ وہ دوپہر کے وقت آئی تھی اور تانگے نے آدھے گھنٹے میں اسے اور بھاؤ کو منزل پر پہنچا دیا تھا لیکن اب شام ہو چکی تھی اور شام بھی سردیوں کی۔ اسے کیکر اور بیری کے ٹنڈوں کے بیچ کوئی بھی تانگا دکھائی نہیں دیا۔ انتظار فضول تھا۔ دیر ہو جاتی تو اندھیرا گہرا ہو جاتا۔ وہ بوکھلائی ہوئی سی پیدل ہی چل پڑی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اسے اکیلا دیکھ کر اڈے سے ہی دو لوفر اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ کچے پکے راستے کی دونوں اطراف کیکر، ٹاہلی اور بیری کے درخت تھے۔ شام گہری ہوتے ہی گہرا بھی اتر آیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ کل سہ پہر ماسے نے اس کے ساتھ جو کھیچا تانی کی تھی، اس کے نتیجے میں آنے والی خراشیں اپنا پتا دے رہی تھیں۔ راستے میں اسے بس اِکا دُکا سائیکل سوار ہی نظر آئے تھے۔ جونہی وہ ایک خم پر مڑی اس کا یہ شک پختہ ہوا کہ کوئی اس کے عقب میں آ رہا ہے۔ اس نے خوفزدہ انداز میں مڑ کر دیکھا۔ یہ شلوار قمیص میں ملبوس دو لڑکے تھے۔ ایک تھوڑا سا فربہ تھا اور اس نے کانوں کے گرد مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ تیزی سے چند قدم چل کر آگے آیا اور بے باکی سے بولا۔ ”کہاں جانا ہے بادشاہو؟“

”کون ہو تم؟“ وہ لرزتی آواز میں بولی۔

دائیں طرف والے لڑکے نے اسے کندھے کے قریب سے پکڑ لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی فوزی اسے دھکا دے کر وحشی ہرنی کی طرح بھاگ نکلی۔

اگلے دو تین منٹ بڑے تہلکہ خیز تھے۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے تھے۔ ”بھاؤ...... بھاؤ۔“ وہ بھاگتے ہوئے پکاری۔

یوں لگا کہ اس ٹھٹھرے ہوئے اندھیرے میں کوئی اس کی آواز سننے والا نہیں...... اسے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان دور اندھیرے میں ہلکی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اسی جانب بڑھ رہی تھی...... یکا یک اسے لگا کہ وہ دونوں اس کے پیچھے نہیں ہیں یا پھر وہ کچھ فاصلے پر رہ گئے ہیں مگر یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ہیں یا نہیں...... وہ رک نہیں سکتی تھی...... اس نے بھاگتے بھاگتے ہی مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور اس کا اسے نقصان اٹھانا پڑا۔

وہ ایک تناور درخت کے تنے کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ پھر اس نے خود کو کسی نشیب میں گرتے محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے سفید روشنی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا پھر دھیرے دھیرے یہ روشنی مدھم ہوئی تو اسے ایک مہربان سا نسوانی چہرہ خود پر جھکا ہوا دکھائی دیا۔ فوزی بولنا چاہ رہی تھی، جاننا چاہ رہی تھی مگر نقاہت کی وجہ سے قوتِ گویائی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر اور کندھوں میں شدید ٹیسیں اٹھیں۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔

اسے یاد آیا کہ وہ نامعلوم افراد کے ڈر سے بھاگی تھی اور پھر کہیں گر گئی تھی۔ وہ جیسے تڑپ گئی اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک کشادہ کمرے میں تھی۔ پینتیس چالیس سال کی ایک خاتون اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ اصرار کر کے انہوں نے اس ہلدی ملے دودھ کے چند گھونٹ فوزی کو پلائے۔

انہوں نے کہا۔ ”دھی رانی! پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ تم اس وقت میرے گھر میں ہو اور ہر طرح سے حفاظت میں ہو۔“

اگلے آدھ گھنٹے میں فوزی کو اپنے کئی سوالات کے جواب مل گئے۔ وہ گوجرانوالا کے قریب ہی ایک گاؤں میں تھی۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ مہربان چہرے والی عورت کا نام نفیس تھا۔ وہ یہاں اپنے شوہر حاجی انور اور ایک ملازم کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ حاجی انور زرعی بیجوں کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے۔ وہ سرخ و سپید چہرے والے ایک باریش شخص تھے۔ عمر پچاس سے کچھ کم رہی ہوگی۔ انہوں نے بھی بڑی شفقت سے فوزی کو دلاسا دیا اور اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچی ہے اور کس سے ڈر کر بھاگ رہی تھی؟“

فوزی ابھی کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے گول مول جواب دیتے اور اپنے مددگار میاں بیوی کو بتایا کہ وہ اپنے ایک عزیز کو ڈھونڈتی ہوئی ڈسکہ سے یہاں آئی ہے۔ اڈے سے دو بندے اس کے پیچھے لگ گئے تھے جن سے ڈر کر وہ بھاگی اور پھر گر گئی۔

بلقیس بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ انہیں اپنے گھر کے سامنے ہی ایک بارش کے گڑھے میں گری ہوئی ملی ہے۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا اور خشک بھی تھا اس لیے وہ محفوظ رہی ہے۔ اس کی پوٹلی سامنے ہی ایک تپائی پر رکھی تھی۔

فوزی کو اندازہ ہوا کہ وہ خوفزدہ ہونے کے بعد جس روشنی کی طرف بھاگی تھی، وہ انہی حاجی انور صاحب کی حویلی کی روشنی تھی۔

دو تین روز تک حاجی انور اور ان کی بیوی بلقیس نے غیر ضروری سوالات کر کے فوزی کو پریشان نہیں کیا۔ اس دوران میں فوزی کو اندازہ ہو گیا کہ دونوں بڑے اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔ ارد گرد کے گھروں میں بلقیس بیگم کی بہت عزت تھی۔ ان کو ایک خدا ترس اور نیک خاتون سمجھا جاتا تھا۔ حاجی انور بھی اپنے کام سے کام رکھنے والے شخص لگتے تھے۔ وہ بڑی دھیمی اور حلیم طبع کے مالک تھے۔ گھنی داڑھی ہموار تھی۔ سر پر گول ٹوپی اور ہاتھ میں صبح کے وقت چھوٹی تسبیح بھی دکھائی دیتی تھی۔ میاں بیوی بے اولاد تھے۔

ایک روز بلقیس آنٹی نے فوزی کو بڑی محبت سے پاس بٹھایا اور اس کے حالات اس سے پوچھے۔ آنٹی جان کی باتوں میں اتنا خلوص تھا کہ فوزی کچھ بھی چھپا نہ سکی۔ اس نے تقریباً سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ اپنی بے جوڑ شادی سے لے کر اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم تک اور پھر پنچایت سے لے کر اپنے گھر سے فرار ہونے تک کچھ بھی بلقیس آنٹی سے پوشیدہ نہیں رکھا۔

وہ بولی۔ ''آنٹی جی! میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے بڑی پریشان ہوں۔ ابا بھی بہت ڈاڈھا ہے ان کے لیے۔ مجھے ویدو کی بھی بڑی فکر ہے۔ میں جب نکلی تو وہ حوالات میں تھا۔ پتا نہیں اس پر کیا گزری ہے۔ میری ہمدردی میں اس نے خود کو بڑی مصیبت میں ڈالا ہے۔''

بلقیس آنٹی نے سب کچھ بڑی ہمدردی سے سنا پھر کہا۔ ''یہ حاجی صاحب کا ملازم ہے نا سلیم۔ یہ بڑے کام کا بندہ ہے۔ یہ بھی ڈسکہ کا ہی رہنے والا ہے۔ تو فکر نہ کر، ہم اس کے ذریعے تیرے گھر کی خیر خیریت معلوم کر لیں گے۔''

فوزی کانپ گئی۔ ''لیکن اگر پنڈ میں کسی کو میرے بارے میں پتا چل گیا......؟''

''نہیں نہیں دھیئے۔ یہ فکر نہ کر۔ تو جب تک نہ چاہے گی کسی کو تیرے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''آنٹی جی! بالا بہت برا ہے۔ وہ غصے میں بھرا ہوا ہے۔ جب سے میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے وہ اور بھی زہریلا ہو گیا ہے۔ میں...... میں اس کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ مجھے کسی اور علاقے میں لے جائے گا پھر پتا نہیں کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔''

بلقیس نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا سر چوما اور ہر طرح سے اسے تسلی دی۔

چار پانچ روز بعد بلقیس نے اپنے ملازم سلیم کے ذریعے بڑی رازداری سے سندر پور کے حالات کا پتا کرا لیا۔ معلوم ہوا کہ ویدو کے والد نے بھاگ دوڑ کر کے اور پنڈ کے نمبردار کی منت سماجت کے ذریعے ویدو کو حوالات سے چھڑا لیا تھا۔ ملازم نے بتایا کہ فوزی کے گھر سے غائب ہونے کا ذمے دار خود فوزی کو ہی قرار دیا گیا ہے۔ اس کو ڈھونڈا جا رہا ہے اور پولیس میں بھی رپورٹ بھی درج کرائی گئی ہے۔ سلیم کی اطلاعات کے مطابق فوزی کی دونوں بہنیں اور بھائی خیریت سے ہی تھے۔

☆☆☆

فوزی کو اب حاجی انور اور آنٹی بلقیس کے ساتھ رہتے قریباً ڈیڑھ مہینا ہو گیا تھا۔ وہ گھر کے کام کاج میں آنٹی کا دل کھول کر ہاتھ بٹاتی تھی۔ حاجی انور کو انکل جی کہتی تھی اور ان کے بیشتر کام بھی بغیر ان کے کہے کر گزرتی تھی۔ کبھی کپڑے استری کر رہی ہے، کبھی برتن دھو رہی ہے، کبھی گھر کی صفائی کر رہی ہے۔ انکل انور کے پاس پرانے ماڈل کی ایک کالی جیپ تھی جس پر وہ اکثر گندم کی بوریاں وغیرہ بھی لاد لیتے تھے۔ یہ جیپ رات کو گھر کے کشادہ صحن میں کھڑی رہتی تھی۔ وہ اکثر صبح سویرے جیپ کے ٹائر دھوتی نظر آتی تھی۔ آنٹی کہتی تھیں۔ ''فوزی! تو نے مجھے سست اور موٹا کر دیا ہے۔ جب تو چلی جائے گی تو مجھ سے کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔''

ایسی بات پر وہ ایک دم چونک سی جاتی اور سوچتی کہ واقعی اسے ہمیشہ تو یہاں نہیں رہنا۔ آخر سندر پور میں جو مسئلے ہیں، ان کا کیا حل ہو گا؟ اپنے بھائی بہنوں اور ویدو کا خیال بھی اسے اکثر بری طرح ستاتا تھا۔

وہ ایک ٹھنڈی ٹھار دوپہر تھی۔ ایک کمزور سی زرد دھوپ کسی وقت بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑوں میں سے

اپنی شکل دکھاتی تھی اور پھر ہر طرف دسمبر کا راج دیکھ کر جلدی سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ آنٹی ساتھ والے گاؤں میں ایک فوتگی پر گئی ہوئی تھیں۔ فوزی آج پانچ چھ روز بعد نہائی تھی اور اب اپنے بال کھولے صحن میں دھوپ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں انکل انور گھر واپس آ گئے۔ انہوں نے فوزی کو صحن میں دیکھ کر پیار بھرے غصے سے کہا۔ ”نہا کر یہاں ویہڑے میں بیٹھی ہو۔ یہ دھوپ نکلنے والی نہیں ہے۔ ایویں ٹھنڈ لگوا لو گی۔ چلو تھوڑی سی چائے بناؤ۔ خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔“

”جی اچھا“ کہتی ہوئی وہ جلدی سے اٹھی اور دوپٹا درست کر کے چوکڑی بھرتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

چولہے کی حدت نے اسے واقعی سکون پہنچایا۔ اسے لگا کہ اس کے گال تپ کر سرخ ہو رہے ہیں۔ وہ چائے لے کر برآمدے میں پہنچی۔ انکل انور نواڑی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ وہ بھی پاس ہی رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ وہ اچھے موڈ میں تھے۔ بے تکلفی کے ساتھ اس سے باتیں کرنے لگے...... باتوں کے دوران میں ایک موقع پر سرد آہ بھر کر بولے۔ ”اس گھر میں بڑی ویرانی ہے فوزی۔ بچوں کے نہ ہونے نے اس حویلی کو اور بھی بڑا اور سنسان کر دیا ہے۔ کئی دفعہ تو تمہاری آنٹی نے بھی کہا ہے کہ میں دوسری شادی کر لوں...... پر پتا نہیں کیوں اس بارے میں، میں بس سوچتا ہی رہ جاتا ہوں۔“ وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

انہوں نے عادتاً اپنے سر پر گول ٹوپی کو درست کیا اور فوزی کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ویسے تمہارا کیا خیال ہے فوزی! مجھے شادی کر لینی چاہیے؟“

ان لمحوں میں فوزی نے محسوس کیا کہ انکل انور کی نگاہیں اسے سر سے پاؤں تک بے حد توجہ سے دیکھ رہی ہیں۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ ”انکل! میں بھلا اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“

جواب میں انہوں نے ایک ایسی بات کی جس نے فوزی کو سکتہ زدہ کر دیا۔ وہ بولے اور ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”فوزی! تم کہہ سکتی ہو۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم یونہی یہاں ہمارے گھر میں نہیں آئی ہو۔ اس کے پیچھے ضرور قدرت کی کوئی مرضی ہے۔“

ایک ہی لمحے میں فوزی کو لگا کہ اس کے جسم سے جان نکل گئی ہے۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے حاجی انور کو بے ساختہ دیکھا۔ پچاس کے قریب سن، قمیص کے اندر سے ابھری ہوئی توند، چوڑے جبڑوں کے نیچے لٹکتی ہوئی چربی اور نیم گنجا سر۔ ایک دو مرتبہ پہلے بھی اسے کچھ عجیب سا شک محسوس ہوا تھا۔ ایک مرتبہ آنٹی کی غیر موجودگی میں انکل انور نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور اس کے بالکل قریب بیٹھ کر ایک فوٹو البم میں سے اسے اپنی جوانی کی تصویریں دکھاتے رہے تھے...... وہ اکثر اس سے اپنی بائیں آنکھ میں کوئی دوائی بھی ڈلواتے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے اسے اپنا چہرہ ان کے چہرے کے قریب لانا پڑتا تھا اور اسے بڑی جھجک محسوس ہوتی تھی۔

پھر ایک مرتبہ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے تھے۔ ”تم مجھے انکل جی کہتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی عمر سے ایک دم آٹھ دس سال بڑا ہو گیا ہوں۔“

انکل انور گرم چائے کی چسکی لے کر اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فوزی نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ وہ اوڑھنی درست کرتی ہوئی جلدی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ یہاں چولہے کی حرارت موجود تھی اور در و دیوار بھی گرم تھے اس کے باوجود اس کا سارا جسم کانپتا چلا جا رہا تھا۔ اسے انکل انور سے اس طرح کی بات کی بالکل توقع نہیں تھی۔

اگلے چوبیس گھنٹے اس نے عجیب کشمکش اور ہراس کے عالم میں ہی گزارے تھے۔ دوسرے روز پھر انکل انور کو اپنی بات زیادہ واشگاف طریقے سے کہنے کا موقع مل گیا۔ فوزی کل خاموش ہو گئی تھی، شاید اس خاموشی کی وجہ سے ان کی رہی سہی جھجک بھی ختم ہو گئی تھی۔ آنٹی آج مرنے والے کے قل پر چلی گئی تھیں۔ انکل انور خرابی طبیعت کا کہہ کر گھر میں ہی تھے۔ انہوں نے فوزی سے دودھ پتی بنوائی پھر اسے قریب بٹھا کر اس سے باتیں کرنے لگے۔ فوزی کی عمر اب سولہ برس کے لگ بھگ تھی لیکن پکی عمر کے واہیات بابے کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد اسے بہت کچھ سمجھ میں آ چکا تھا۔ انکل حاجی انور نے بے باک لہجے میں کہا۔ ”دیکھو فوزی! نکاح کرنا کوئی جرم نہیں اور یہ نکاح ایک طرح سے میری مجبوری بھی ہے۔ میں اپنا وارث چاہتا ہوں۔ دوسری طرف...... تم جس طرح کی زندگی گزار رہی ہو، اس نے مجھے اندر سے بہت دکھی کر دیا ہے۔ میں...... میں بڑے خلوص سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں اور تمہارے بھائی بہنوں کو اس دلدل سے نکال سکتا ہوں...... اور نکالنا چاہتا ہوں۔“

”میں...... آپ کا...... مطلب نہیں سمجھی ہوں۔“ وہ ہکلائی اور اپنی انگلیوں کو بری طرح مروڑا۔

وہ واشگاف انداز میں فرمانے لگے۔ ''فوزی! میں تمہیں بالے سے نجات دلا کر تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا بھاری ہاتھ فوزی کے کومل ہاتھ پر رکھ دیا۔

وہ جیسے تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور دوسرے کمرے میں جا کر بان کی تنگ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ جاتی۔ چند لمحوں بعد انکل انور بھی وہاں آ دھمکا۔ وہ فوزی کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ اسے سمجھانے بجھانے لگا اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کا مشورہ دینے لگا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ فوزی کے شانے پر رکھا تو دفعتاً فوزی کا دم گھٹ سا گیا۔ وہ ایک دم انکل انور کو پیچھے دھکیل کر اٹھی اور اس کمرے میں آ گئی جہاں اس کا مختصر سا سامان دھرا تھا۔ وہ اب کسی صورت یہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ جب اس نے انکل انور کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا تھا تو انکل کا چہرہ ایک دم سرخ انگارہ ہو گیا تھا۔ وہ فوزی کے پیچھے ہی اس کمرے میں بھی پہنچ گیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ تڑخ کر بولا۔

فوزی نے روتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرے باپ کی عمر سے زیادہ عمر کے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ ایسی بات کریں گے۔''

''یہ گٹھڑی کیوں باندھ رہی ہو، کہاں جاؤ گی تم؟''

''کہیں بھی، مگر یہاں نہیں رہوں گی۔''

''یہ مت بھولو فوزی کہ تم گھر سے بھاگی ہوئی ہو۔ تمہارا شوہر اور تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ بالے کے ہتھے چڑھو گی تو وہ اگلے پچھلے سارے بدلے چکا دے گا۔ اپنے یاروں کے ساتھ مل کر تمہیں کسی ایسی جگہ لے جائے گا جہاں کوئی تمہاری آواز سننے والا بھی نہیں ہو گا۔''

''میں سب کچھ سہہ لوں گی لیکن یہاں نہیں رہوں گی۔'' وہ بپھر کر بولی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

اچانک ہی حاجی انور کو محسوس ہوا کہ معاملہ زیادہ ہی بگڑ گیا ہے۔ وہ ابھی فوزی کے دھکے والی ذلت ہی نہیں بھولا تھا۔ اب اگر وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا اور وہ شور مچا دیتی یا باہر بھاگ جاتی تو کتنی رسوائی ہوتی۔ اس نے ایک دم پینترا بدلا اور اپنے لب و لہجے کو نرم کر لیا۔ بڑی حکمت کے ساتھ وہ نہ صرف فوزی کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوا بلکہ اس کی آدھی باندھی ہوئی گٹھڑی بھی کھلوا دی۔

اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''فوزی! اگر تمہیں میری بات پسند نہیں آئی تو وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی ایسی بات میری طرف سے نہیں سنو گی۔''

☆☆☆

حاجی انور کی عزت کی خاطر فوزی بالکل خاموش رہی تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں اب اس کا دل بے چین سا رہتا تھا۔ گھر کے کام کاج اور ہانڈی روٹی میں بھی اسے پہلے جیسی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ آنٹی بلقیس نے کئی بار اس کے بدلے ہوئے رویے کی وجہ پوچھی لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔

چوتھے پانچویں روز کی بات ہے، فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ برآمدے میں آ گئی۔ آنٹی بلقیس چاٹی میں دہی ڈال رہی تھیں۔ اس نے انہیں پیچھے ہٹایا اور خود ہی لسی رڑکنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کے بازوؤں میں نوجوانی کا زور تھا۔ چند منٹ میں ہی لسی کے اوپر مکھن کی پھٹکیاں بننا شروع ہو گئیں۔ آنٹی بلقیس قریب ہی موڑھے پر بیٹھی اسے لاڈ سے دیکھ رہی تھیں۔

اچانک انکل انور کمرے کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلے۔ آنٹی کو مخاطب کر کے بولے۔ ''بلقیس! پیسے تم نے کہاں رکھے ہیں؟''

''کون سے پیسے؟'' آنٹی نے پوچھا۔

''وہی گول ڈبے والے۔'' انکل کی آواز میں ہیجان تھا۔

''نہیں..... نہیں..... میں نے کیوں رکھنے تھے۔ میں نے تو پرسوں سے الماری کھولی بھی نہیں۔''

انکل اپنی توند ہلاتے ہوئے جلدی سے اندر گئے اور ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبا آنٹی بلقیس کے سامنے پھینکا۔ ''یہ تو خالی پڑا ہے۔''

''ہائے میں مر گئی۔'' بلقیس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

فوزی کو اندازہ ہوا کہ ڈبے میں یقیناً کوئی بڑی رقم تھی۔

چند منٹ میں گھر کے اندر ہلچل مچ گئی۔ الماری کھول کر اس کا ایک ایک خانہ دیکھا گیا۔ سارے کپڑے الٹ پلٹ کیے گئے۔ پھر ملازم سلیم اور اس کے چھوٹے بھائی کو بھی بلا لیا گیا۔ وہ دونوں بھی گھر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کے رنگ بھی زرد ہو گئے۔ انہوں نے صاف انکار کیا کہ وہ ڈیڑھ دو ہفتے سے برآمدے تک بھی نہیں آئے ہوں گے۔ ستر ہزار کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ یہ پانچ پانچ ہزار کے چودہ نوٹ تھے جو ربر بینڈ میں رکھے گئے تھے اور ٹین کے ڈبے میں محفوظ تھے۔

فوزی کا حلق خشک ہو رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میاں بیوی کے علاوہ صرف وہی تھی جو چھ میں

گھٹنے گھر میں رہتی تھی۔ وہ سب سے زیادہ مشکوک ٹھہر سکتی تھی...... اور پھر یہی کچھ ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں حاجی انور کی غصیلی نظریں فوزی کے جسم کو چھیدنے لگیں۔ حاجی انور، بلقیس کو لے کر کمرے میں چلا گیا۔ اندر سے دونوں کے تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک دو فقرے ذرا سی فوزی کے کانوں تک بھی پہنچے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ حاجی انور کا شک فوزی پر جا رہا ہے اور آنٹی بلقیس فوزی کا دفاع کرنے میں مصروف ہیں۔

کچھ دیر بعد آنٹی بلقیس ہانپتی کانپتی باہر نکلیں اور فوزی سے بولیں۔ ''فوزی! حاجی صاحب تجھ پر شک کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی غلطی تجھ سے ہوگئی ہے تو صاف صاف بتادے۔''

فوزی نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''آنٹی جان! آپ مجھ کو ایسا سمجھتی ہیں؟''

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی حاجی انور بولا۔ ''کبھی کوئی چور بھی مانتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے؟''

پاس پڑوس سے بھی اکادکا لوگ گھر میں آچکے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی چودھرانی ٹائپ عورت بولی۔ ''اس کا سامان دیکھو، کہاں ہے؟''

حاجی انور فوراً اس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں فوزی کا بستر اور مختصر سامان تھا۔ محلے کے دو تین افراد بھی کمرے میں پہنچ گئے۔ فوزی ہکا بکا کھڑی تھی۔ اس کی گٹھڑی کھولی گئی۔ الماری میں جھانکا گیا، بستر کو جھاڑا گیا لیکن کچھ نہیں ملا۔ ایک شخص کو بستر کے تکیے پر کچھ شک ہوا۔ اس نے تکیے کی زپ کھول کر غلاف کے اندر ہاتھ گھمایا تو اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں پانچ پانچ ہزار کے چند سرخی مائل نوٹ نظر آرہے تھے۔ یہ کل چھ نوٹ تھے یعنی تیس ہزار روپے۔

حاجی انور کا بھرپور تھپڑ فوزی کے گال پر پڑا اور اس کا سر گھوم کر رہ گیا۔ ''حرام زادی، نمک حرام...... جس تھالی میں کھاتی ہے اسی میں چھید کرتی ہے۔''

وہ دہائی دینے لگی۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔ مجھے کچھ نہیں پتا یہ...... یہ روپے یہاں کیسے آئے ہیں۔''

حاجی انور کے دو تین اور طمانچے فوزی کے گالوں پر پڑے۔ پھر بھی کسی پڑوسن نے اس کی کمر پر دوہتڑ مارا اور دھاڑی۔ ''حاجی صاحب کی باقی رقم کہاں ہے...... کس یار کو دی ہے؟ جلدی بتا، نہیں تو ابھی بلاتے ہیں پولیس کو۔''

وہ ہچکیوں سے رونے لگی اور فریادی نظروں سے آنٹی بلقیس کی طرف دیکھنے لگی۔ روپے برآمد ہونے کے بعد اب وہ بھی بالکل گم صم کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ انھوں نے فوزی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

''بتا باقی رقم کہاں ہے...... بتا کہاں ہے؟'' حاجی انور فوزی کو جھنجوڑ رہا تھا اور اس کی آواز ساری حویلی میں گونج رہی تھی۔ پھر وہ بلقیس کی طرف دیکھ کر دہاڑا۔ ''پچھلے مہینے میرا جو سونا گم ہوا تھا، اب لگتا ہے کہ وہ بھی گم نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی اسی نے چرایا ہے۔''

اس نے فوزی کو اس کے لمبے بالوں سے کھینچ کر اس طرح گھسیٹا کہ وہ گھٹنوں کے بل گر گئی۔ وہ اس کے نازک جسم پر مزید ضربیں لگانا چاہتا تھا لیکن ایک پڑوسی نے اسے روک دیا۔

''چھوڑو حاجی صاحب! اس نے ایسے کچھ نہیں ماننا۔ اس کو سیدھا سیدھا پولیس کے حوالے کرو۔ اللہ نے چاہا تو اور بھی کئی چوریاں کھلیں گی۔''

☆☆☆

دیہی علاقوں میں قانون کی عملداری مزید کمزور پڑ جاتی ہے۔ پولیس والوں نے فوزی کی گرفتاری نہیں ڈالی تھی اور اسے تھانے سے ملحق ایک کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بہت روئی پیٹی تھی۔ پولیس والوں کے ہاتھ پاؤں جوڑے تھے مگر اس کی سنی نہیں گئی تھی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل سے اسے معلوم ہوا تھا کہ ایس ایچ او صاحب کسی تاریخ پر لاہور گئے ہوئے ہیں۔ وہی آکر اس سے پوچھ گچھ کریں گے اور اس کی رہائی کا یا اسے زنانہ جیل میں بھیجنے کا فیصلہ ہوگا۔

وہ اس چھوٹی سی ٹھنڈی ٹھار کوٹھڑی میں کمبل میں لپٹی ہوئی بیٹھی رہی تھی۔ ایک حوالدار اسے سلاخ دار کھڑکی میں سے گاہے بگاہے واہیات نظروں سے گھورتا تھا اور کھنگورے مارتا تھا۔ رات جیسے پہاڑ جیسی ہوگئی تھی۔ ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سر شام اسے جو دال روٹی دی گئی تھی، وہ اسی طرح کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑی تھی۔ حوالدار چکر کاٹ کر آیا اور پھر کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں مرغ پلاؤ کی پلیٹ تھی۔ لگاوٹ کے لہجے میں بولا۔ ''چاول کھانے ہیں تو لے کر آؤں اندر؟''

''نہیں، میں نے نہیں کھانے۔'' اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا اور اپنی بوسیدہ گرم چادر میں کچھ اور بھی سمٹ گئی۔

وہ کھنگورا مار کر بولا۔ ''کھاؤ گی نہیں تو طاقت کیسے آئے گی تیرے جسم میں۔ تفتیش کس طرح سہے گی تو؟ ایس ایچ

او صاحب کو صبح سویرے منہ بتا (چہرہ دکھانا) ہے تو نے۔"

وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔ حلق بالکل خشک ہو گیا۔

اس نے سر گھٹنوں میں دے لیا اور دل ہی دل میں پکارنے لگی۔ "یا اللہ میری مدد کر...... تیرے سوا میرا کوئی آسرا نہیں ہے۔ تو جانتا ہے میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

حوالدار کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا پھر کھڑکی کے سامنے والے کمرے میں جا کر بنچ کا میز کھینچنے لگا اور چاول کھانے لگا۔ ساتھ ہی وہ موبائل فون پر کسی قسم کے ویڈیو گانے بھی سن رہا تھا۔

خدا خدا کر کے رات گئی...... آٹھ بجے کے قریب ہیڈ کانسٹیبل نے اسے بتایا کہ وڈے صاحب تھانے میں آ گئے ہیں اور اس سے پوچھ گچھ کے لیے آ رہے ہیں۔ اس کا چھوٹا سا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ دعا کرنے لگی کہ آنے والا کوئی معقول بندہ ہو۔ دل میں خدا خوفی رکھتا ہو۔

قریباً دس پندرہ منٹ بعد بھاری قدموں کی آواز آئی اور جو شخص اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر وہ مزید سہم گئی۔ کم و بیش چھ فٹ کا قد، سرخی آمیز گندمی رنگ، خضاب لگی گھنی مونچھیں اور ایسی ہی گھنی بھویں، سیاہی مائل موٹے ہونٹ، آنکھوں میں ویسی ہی سرخی جھلکتی تھی جیسی نشے کی ترنگ میں آنے کے بعد اس کے کچی عمر کے شوہر بالے کی آنکھوں سے جھلکا کرتی تھی۔ فوزی نے اٹھ کر سلام کیا اور پھر سے فرشی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ وہ سامنے رکھی بید کی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

بھاری آواز میں بولا۔ "کیا چن چڑھایا ہے کڑیے تو نے؟"

وہ لرزی۔ "میں نے کچھ نہیں کیا جناب! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر حاجی انور کے گھر سے جو چیزیں چوری ہوئی ہیں، وہ کوئی جن بھوت اٹھا کر لے گیا ہے؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں سر جی! مجھ پر یہ الزام بالکل جھوٹا ہے۔ دراصل......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی اور دروازے پر کھڑے حوالدار اور کانسٹیبل کو دیکھنے لگی۔

ایس ایچ او اس کی جھجک کی وجہ سمجھ گیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلے گئے۔ "ہاں بتا اب۔ کیا بات ہے جو تیری سنگھی (گلے) میں اٹک گئی ہے؟"

شدید کشمکش اور تذبذب میں رہنے کے بعد فوزی نے وہ واقعہ تھانے دار کے گوش گزار کر دیا جو چند روز پہلے حاجی انور کے گھر پیش آیا تھا...... فوزی کا خیال تھا کہ حاجی انور کی بدنگی اور دست درازی کا سن کر تھانے دار حیران رہ جائے گا

لیکن یہ جان کر وہ خود حیران ہوئی کہ تھانے دار نے اس کا کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ اپنی اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔ "تم کوئی نئی بات نہیں کر رہی ہو۔ تمہارے جیسی جوان نوکرانیاں جب چوری چکاری میں پکڑی جاتی ہیں تو گھر کے مرد مالکوں پر ایسے ہی الزام لگاتی ہیں۔ شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ باقاعدہ تمہاری عزت لوٹ لی گئی ہے۔"

فوزی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ تھانے دار نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ تو ڈسکہ کے کسی چنڈ سے بھاگ کر آئی ہے۔ وہاں بھی ضرور کوئی کارنامہ انجام دے دیا ہو گا تو نے؟"

"نہیں صاحب جی! ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ رونی صورت بنا کر بولی۔ "میرا شوہر بڑا سخت اور نکھٹو تھا۔ بہت مارتا تھا مجھے۔ اسی سے جان بچا کر نکلی تھی۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو نا۔ وہ یہاں ہو تو پتا چلے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کیا خیال ہے، بلا لیں اسے بھی یہاں؟"

وہ کانپ گئی۔ "نہیں جی! ام...... مجھ پر رحم کریں۔ میں اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔"

تھانے دار نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "تم کہتی ہو کہ وہ وحشی ہے، ظالم ہے۔ تم معصوم سی لڑکی ہو۔ وہ تمہیں مارتا کوٹتا ہے لیکن مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم بھی اسے مارتی ہو۔"

"نن...... نہیں جی۔ میں نے بس اس کی مار ہی کھائی ہے۔ بب...... بس ایک بار ایسا ہوا ہے کہ میرا ہاتھ اس پر اٹھا تھا۔ پتا نہیں کہ اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا اور وہ بھی میں نے اپنے لیے نہیں کیا تھا، اپنی ساس کے لیے کیا تھا۔ وہ بے شرم اپنی بڑھی بیمار ماں کو مار رہا تھا۔ بس مجھ سے برداشت نہ ہو سکا......" اس نے روتے ہوئے سارا واقعہ تھانے دار کے گوش گزار کیا۔

تھانے دار بے پروائی سے سگریٹ پھونکتا رہا اور دھواں چھوڑتا رہا۔ آخر بولا۔ "اچھا اب چنگی بکی بن جا۔ سیدھی سیدھی بات کر۔ حاجی کے باقی پیسے اور موبائل وغیرہ کہاں ٹھکانے لگائے ہیں؟"

"نہیں سر جی! میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس انکل نے میری باتوں کا غصہ کھا کر مجھے پھنسایا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے انہوں نے خود میرے تکیے میں وہ نوٹ رکھے ہیں......" وہ سسکنے لگی۔

وہ بولا۔ "ہم تجھے زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ تجھے عدالت میں پیش کریں گے۔ وہاں سے تیرا جوڈیشل ریمانڈ ہو گا۔ جیل چلی جائے گی۔ جیل میں جو "طوا پوری"

تجھے کمانا پڑے گی اس کا سود ساری حیاتی یاد رہے گا تجھے۔"

وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس نے تھانے دار کے پاؤں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔ "خدا کے لیے...... میں بے آسرا ہوں۔ مجھ پر ترس کھائیں۔"

وہ پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "ابھی تیرے پاس وقت ہے۔ کل تک ٹھنڈے دماغ سے سوچ لے...... میں بھی کچھ سوچتا ہوں۔" وہ باہر نکل گیا۔

وہ رات فوزی نے پھر حوالدار کی تیکھی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے اور اس کی غلیظ باتیں سنتے ہوئے گزاری۔ رات کے آخری پہر وہ کچھ دیر کے لیے سوئی۔ اگلا دن بھی سخت تناؤ میں گزرا۔ رہ رہ کر اس کے دل میں خیال آتا رہا کہ شاید آنٹی بلقیس اس کے لیے کچھ کریں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اگلی رات نو بجے کے لگ بھگ تھانے دار پھر اس کی کوٹھری میں آیا۔ عملے کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ اس کا نام شوکت ہے۔ وہ کچھ دیر فوزی کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "چل اٹھ۔"

"کک...... کہاں جانا ہے؟" وہ ہکلائی۔

"تجھے لیڈی پولیس کی مار کٹائی اور جیل سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ چل اٹھ ورنہ ماری جائے گی۔"

تھانے دار شوکت کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ لرز کر کھڑی ہو گئی۔ تھانے دار شوکت آج سادہ لباس میں تھا۔ تھانے کے احاطے میں ایک پرائیویٹ کار کھڑی تھی۔ کار میں ڈرائیور موجود تھا۔ شوکت، فوزی کو کار میں لے آیا۔ خود ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا اور کار تھانے کے عقبی گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔

قریباً آدھے گھنٹے کے خاموش اور تناؤ بھرے سفر کے بعد فوزی کو اندازہ ہوا کہ کار گوجرانوالا شہر کی حدود میں داخل ہو رہی ہے۔

☆☆☆

فوزی کو تھانے دار شوکت کے شہری گھر میں رہتے ہوئے پانچواں روز تھا۔ یہ ایک رہائشی کالونی میں آٹھ دس مرلے کا سنگل اسٹوری گھر تھا۔ یہاں شوکت کے ساتھ پچپن ساٹھ سال کی ایک فربہ اندام عورت رہتی تھی جسے شوکت اماں تاج کہہ کر بلاتا تھا۔ چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا مشو بھی اس گھر میں تھا۔ یہ گونگا تھا اور اس کی ایک کنپٹی پر چوٹ کا گہرا نشان تھا۔ اس مشو کے بارے میں فوزی کو معلوم ہوا تھا کہ یہ جیب کترا تھا۔ اماں تاج کا کہنا تھا کہ شوکت نے اسے سدھارنے کے لیے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ دو تین ماہ پہلے اس لڑکے نے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تھی جس کے بعد شوکت نے اسے بڑی سخت مار لگائی تھی۔ لڑکے کی کنپٹی پر چوٹ کا نشان اسی مار پیٹ کا نتیجہ تھا۔ یہ لڑکا گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا اور سودا سلف بھی لے آتا تھا۔

اماں تاج کے بارے میں پتا چلا کہ وہ مدتوں پہلے زنانہ پولیس میں تھی پھر حوالدار کے طور پر ریٹائر ہوئی اور اب تھانے دار شوکت کے ساتھ رہتی تھی۔ اماں کی زبانی فوزی کو پتا چلا کہ تھانے دار شوکت کا آبائی گھر وزیر آباد کے قریب ایک گاؤں میں ہے۔ وہاں اس کی بیوی اور دو بچے ہیں۔ ہفتے دو ہفتے بعد وہاں کا چکر لگاتا ہے۔

فوزی کے دل میں مسلسل ایک خوف سا جما ہوا تھا...... تاہم ابھی تک تھانے دار شوکت کی طرف سے کوئی ناروا بات نہیں ہوئی تھی۔ تاہم ایک روز جب وہ چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ رہی تھی، اس نے نہایت کڑے لہجے میں فوزی کو وارننگ دے دی تھی کہ وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی اور اس کا برا نتیجہ اسے بھگتنا پڑے گا۔

شوکت کی یہ بات سن کر فوزی کی نگاہوں کے سامنے مشو گونگے کی کنپٹی کا گہرا زخم آ گیا تھا اور وہ اپنی چادر کی بکل کے اندر جھرجھری سی لے کر رہ گئی تھی۔

فوزی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی یہاں آمد سے قبل اماں تاج ہانڈی روٹی کے علاوہ گھر کے اکثر کام کر لیتی تھی لیکن جب سے فوزی آئی تھی، اس نے اپنے گوڈوں کو پکڑ کر مسلسل ہائے ہائے شروع کر دی تھی۔ سارا دن فوزی کو سخت مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ تھک کر ذرا دم لینے کے لیے بیٹھتی تو اماں تاج اس کے لیے کوئی نہ کوئی کام نکال لیتی۔ اس کی نگران نگاہیں ہر وقت فوزی کا احاطہ کیے رہتی تھیں اور کسی وقت تو فوزی کو لگتا تھا کہ اسے واقعی جیل ہی ہو گئی ہے۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب جب وہ تھک کر بستر پر لیٹتی تو ایک دم بہت سے خیالات ابھر ابھر کر اس کے دماغ میں گھس آتے۔ اسے اپنے ماں جائیوں شمیم، زینب اور فاروق کا خیال آتا۔ نہ جانے وہ کس حال میں تھے۔ اسے پتا تھا کہ بابے خبیث نے آپا باجی کو خرچہ دینے سے ہاتھ کھینچ لیا ہوگا۔ نتیجے میں پتا نہیں کہ بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی ملتی تھی یا نہیں۔ آپا باجی کے لالچ اور خود غرضی سے فوزی بڑی اچھی طرح واقف تھی۔ وہ ایک سخت گیر سوتیلی بہن کی تمام "تعریفوں" پر پوری اترتی تھی...... پھر نہ چاہنے کے باوجود اسے ویدو کا خیال آ جاتا۔ وہ جانتی تھی کہ ویدو نے صرف اور

صرف اس کی خاطر بالے جیسے کمینے کی نوکری کی، مشکلات سہیں اور اسی کی خاطر گاؤں میں دشمنی مول لی۔ اسے وہ منظر یاد آجاتا جب وہ طیش میں بپھر کر بالے اور اس کے یاروں پر جھپٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے عام سے جسم کے اندر اس کی اپنی طاقت نہیں کوئی اور طاقت ہے۔ اگر گاؤں کے بڑے بوڑھے درمیان میں آکر بالے اور چوہدری کے پتر کو بچا نہ لیتے تو شاید وہ ان کو مار ہی ڈالتا۔ یہ کیا طاقت تھی اس کے اندر...... شاید...... ہاں شاید یہ اسی پیار کی طاقت تھی جس کا اظہار چک انیس کی ایک چاندنی رات میں ہوا تھا۔ اس رات کا عکس آج تک فوزی کی آنکھوں میں جما ہوا تھا۔ وہ دونوں چھت کے کچے بنیرے پر کہنیاں لگائے کھڑے تھے۔ باتوں کے دوران میں اچانک ویدو کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اس نے فوزی کی طرف دیکھ کر عجیب لہجے میں کہا تھا۔ ''پیار کرتی ہونا مجھ سے؟'' جواباً فوزی سکتہ زدہ رہ گئی تھی اور اس کی پلکوں سے دو موٹے آنسو ٹپک کر چھت کی مٹی میں جذب ہو گئے تھے۔ وہ سارا منظر آج تک اس کے پردہ تصور پر نقش تھا۔ ویدو آج کل پتا نہیں کس حال میں تھا۔ اس نے اب بھی ویدو کو دیکھنا تھا یا نہیں۔ وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی پھر ایک عجیب سے خیال نے اسے کچھ سکون دیا۔ اسے ایک بات کا یقین تھا۔ ویدو اس کے تینوں بہن بھائیوں کا خیال رکھے گا۔ ان کے آنسو ویدو کی نظروں سے اوجھل نہیں رہیں گے۔

تھانے دار شوکت عموماً نو بجے کے لگ بھگ اپنے مضافاتی تھانے سے واپس آجاتا تھا۔ اب بھی وہ کھانا کھا کر اور دو تین سگریٹ پھونک کر اپنے کمرے میں لیٹ چکا تھا۔ اچانک اس کی بھاری آواز آئی اور فوزی بری طرح چونک گئی۔ ''او کڑیے! ادھر آ ذرا میرے کمرے میں۔''

فوزی کا دل دھک سے رہ گیا۔ انجانے اندیشے جو وہ رہ کر سینے میں کروٹ لیتے تھے پھر سر اٹھانے لگے۔ دوسری آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ساتھ والی چارپائی پر سوئے ہوئے مٹھو کو دیکھا۔ پرسوں تھانے دار کی کار سخت سردی میں دھوتے ہوئے مٹھو کو ٹھنڈ لگ گئی تھی اور کل سے اسے بخار تھا۔

فوزی اوڑھنی درست کرتے ہوئے کمرے میں پہنچی تو شوکت بستر کے بجائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک موٹی سی فائل تھی۔ فوزی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اوئے زیادہ تھکی ہوئی تو نہیں ہے تو؟''

''ہاں...... نن...... نہیں جی۔''

''ایک بات کر۔'' وہ سخت انداز میں بولا۔

شاعر: قابل اجمیری

عشق نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

حسن ہی حسن جلوے ہی جلوے
صرف احساس کی ضرورت ہے

اس کے وعدے پہ ناز تھے کیا کیا
اب در و بام سے ندامت ہے

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

رات کٹ ہی جائے گی قابل
شوق منزل اگر سلامت ہے

☆☆☆

''نہیں جی۔''

''چل ذرا میرے سر کی تھوڑی سی مالش کردے۔ وہ سامنے شیشی میں تیل پڑا ہے۔''

وہ جانتی تھی کہ اسے وہی کرنا ہے جو شوکت کہہ رہا ہے۔ یہ سوچ کر اسے تھوڑی تسلی ہوئی کہ وہ سونے سے پہلے تقریباً روزانہ ہی سر کی مالش کراتا تھا۔ اس سے پہلے یہ کام گونگا مٹھو کرتا تھا لیکن آج وہ بخار میں تھا شاید اسی لیے فوزی سے کہا گیا تھا۔

شوکت کے عقب میں کھڑے ہو کر اس نے لرزاں ہاتھوں سے اس کے کلف لگے سر میں تیل کے چند قطرے ڈالے اور ہولے ہولے انگلیاں چلانے لگی۔

وہ پندرہ بیس سیکنڈ خاموش رہا پھر بلند آواز میں بولا۔ ''اوئے کیا کشیدہ کاری کررہی ہے۔ زور نہیں ہے تیرے ہاتھوں میں؟''

وہ تیز تیز ہاتھ چلانے لگی۔ وہ کھنگورا مار کر بولا۔ "وہاں جیل میں بھی پھنسی پڑتی تو ایسے پولے پولے ہاتھ نہیں چلتے تھے۔ مار مار کر چھوڑی ادھیڑ دیتی ہیں جیل والیاں۔"

کچھ دیر بعد اس کی کوئی فون کال آ گئی اور اس نے اسے جانے کا کہا۔ وہ اطمینان کی سانس لیتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ کل تک مشو ٹھیک ہو جائے اور اسے پھر سے بلاوا نہ آ جائے مگر یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔

اگلے روز دوپہر کو مشو پھر بخار میں تپنے لگا تھا۔ فوزی کو پھر مالشن کا کردار ادا کرنا پڑا۔ آج مشقت تھوڑی سی زیادہ ہوئی کہ فوزی کو سر کی مالش کے علاوہ کندھے بھی دبانا پڑے۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے مزے سے آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا پھر بولا۔ "گھر یاد تو نہیں آ رہا تجھے؟ کتنے بھائی بہن ہیں؟"

"جی دو بہنیں ایک بھائی۔"

"عمریں کیا ہیں؟" فوزی نے عمریں بتائیں۔ وہ بولا۔ "اگر کہتی ہے تو انہیں یہاں لانے کا انتظام کر دیتا ہوں۔"

وہ لرز سی گئی۔ وہ یہاں خود کو جیل میں محسوس کر رہی تھی۔ انجانے خدشے ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتے رہتے تھے۔ وہ اپنی بہنوں اور بھائی کو اس جیل میں کیسے لا سکتی تھی۔

"نن...... نہیں جی۔ میں اب پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"چنگی بات ہے کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا جائے...... ویسے...... میرے کانوں میں یہ بات پڑی ہے کہ وہاں کوئی منڈا بھی تھا جس نے تیری خاطر تیرے سسرالیوں سے پنگا کیا تھا۔ وہ کون تھا تیرا؟"

"کوئی نہیں تھا جی۔ بس محلے دار تھا۔"

"کوئی نانکا شانکا تو نہیں تھا تیرا اس سے؟"

"نن...... نہیں جی۔"

"اوئے کیا کر رہی ہے کم بختے۔ میں نے کندھے دبانے کو کہا ہے تو میرے سر کو جھٹکے دے رہی ہے۔"

"سوری...... سوری جی۔" وہ مزید گھبرا کر بولی۔

اتنے میں کچن کی طرف سے اماں تاج نے کسی کام سے فوزی کو آواز دی۔ "جی چلی جاؤں؟" اس نے سہمی آواز میں پوچھا۔

"اچھا جا۔" وہ اکھڑ لہجے میں بولا اور اپنے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دن گزر رہے تھے اور فوزی جیسے ایک تنے ہوئے رستے پر چل رہی تھی۔ ہر رات خوفناک اندیشے اسے گھیر لیتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ شوکت چنگا بندہ نہیں ہے لیکن ابھی تک تو خیریت ہی گزر رہی تھی۔ مشو اب ٹھیک ہو چکا تھا اس کے باوجود شوکت روزانہ اسے کندھے وغیرہ دبوانے کے لیے بلا لیتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا تھا۔ "تیرے ہاتھوں میں زور نہیں پر مشاس ہے۔"

کسی وقت فوزی کو لگتا تھا کہ یہ چوہے بلی کا سا کھیل ہے۔ کس وقت بلی جھپٹ پڑے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے ردعمل کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ ایک دو بار تو اس کے دل میں یہاں تک آیا تھا کہ اپنی چوڑیاں توڑ کر اور پیس کر پانی کے ساتھ پی جائے۔ یہ چوڑیاں چند روز پہلے اسے شوکت نے ہی لا کر دی تھیں، اس کے علاوہ دو جوڑے کپڑوں کے بھی تھے۔

انہی دنوں زیادہ سردی اور زیادہ تھکاوٹ کی وجہ سے فوزی کو بھی بخار ہو گیا۔ پہلے تو وہ گھر میں پڑی وہی دوا کیں استعمال کرتی رہی جو مشو کرتا تھا مگر جب بخار بگڑنے لگا تو شوکت اسے اپنی نگرانی میں جی ٹی روڈ کے قریب ایک کلینک میں لے گیا۔

اسے چار پانچ دفعہ کلینک جانا پڑا۔ دو مرتبہ وہ اماں تاج اور شوکت کے ڈرائیور کے ساتھ گئی۔ تین مرتبہ خود شوکت ساتھ گیا۔ ایک دن جب شوکت اور فوزی کلینک میں سے نکل رہے تھے، یکدم ایک رکشا نے بڑے زور سے بریک لگائی اور لہرا کر چند فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ فوزی یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ اس میں سے اس کی سوتیلی بہن آپا باجی نکل رہی ہے۔ اس کا چہرہ تانبے کی طرح دہک رہا تھا۔ لال پیلے کپڑوں اور نیاسے رنگ کی وجہ سے وہ عجیب سی شے نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے فوزی کا شوہر بالا بھی رکشے سے اتر رہا تھا۔

آپا باجی نے آتے ہی فوزی کو دو چتر مارنے شروع کر دیے۔ "مرن جوگی، مٹ وہنی، تیرا ککھ نہ رہے۔ ہمارے منہ پر کالک مل کر بھاگ آئی۔ بے حیا، بے شرم۔"

بالے نے بھی آتے ساتھ ہی فوزی کو چوٹی سے پکڑ لیا۔ "کہاں کہاں جھل ہوئے ہیں تیرے لیے۔ کہاں کہاں ڈھونڈا ہے۔ اب چل ہاں ذرا گھر...... تیرے سارے وٹ نکالتے ہیں۔"

بال کھینچے جانے پر فوزی درد سے کراہ اٹھی۔ اس نے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے شوکت کو دیکھا۔ وہ اس وقت وردی کے بجائے سادہ لباس میں تھا اور کار کا لاک کھول رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

دو چار راہ گیر اکٹھے ہو گئے۔ ”کیا بات ہے بھئی؟“ کسی نے بلند آواز میں بالے سے پوچھا۔

بالے کے بجائے آپا باجی گرجی۔ ”یہ بندہ ہے اس کا۔ یہ بھاگ کر آئی ہے گھر سے...... روپے پیسے بھی لے آئی ہے۔ میں سگی بہن ہوں اس کی بلکہ ماں ہوں پر اسے ”اپنی“ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔“ اس نے ایک اور دو ہتڑ فوزی کے سر پر مارا۔

بالے اور یاسمین (آپا باجی) کو معلوم نہیں تھا کہ فوزی یہاں اکیلی نہیں ہے اور جو اس کے ساتھ ہے وہ ایک کرخت، وجیہہ چھٹ تھانے دار ہے۔ وہ آگے آیا اور اس نے بالے کو گھما کر دیوار سے دے مارا...... پھر دھکا دے کر یاسمین کو پیچھے ہٹایا۔ وہ دہائی مچانے لگی۔ ”ہائے میں مر گئی۔ ہائے میرا گٹا (ٹخنا) توڑ دیا...... کوئی پولیس کو بلاؤ...... پولیس کو بلاؤ۔“

شوکت دانت پیس کر بولا۔ ”پولیس آگئی ہے رانی صاحبہ! اور تیرے سامنے کھڑی ہے۔ ڈاکٹر بھی بلا لیتے ہیں ابھی تمہارا گٹا جوڑنے کے لیے۔“

بالا ہکا بکا کھڑا تھا۔ شوکت نے اسے گریبان سے پکڑ لیا اور سڑک پر ہی اس کی درگت بنادی۔ اسی دوران میں اتفاقاً ایک پولیس موبائل بھی وہاں پہنچ گئی...... شوکت کے اشارے پر بالے اور آپا باجی دونوں کو کھینچ گھسیٹ کر موبائل میں ڈال دیا گیا۔

☆☆☆

شوکت خود تو پس منظر میں چلا گیا تھا مگر اس کی ہدایت پر قریبی پولیس اسٹیشن پر بالے اور یاسمین کی طبیعت بہت اچھی طرح صاف کروی گئی تھی۔ بالا یہاں فوزی کی تلاش میں ہی آیا ہوا تھا۔ وہ نکاح نامہ ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا لیکن اس نکاح نامے کی رو سے نکاح کے وقت فوزی کی عمر بمشکل چودہ سال بنتی تھی۔ جب اس نکتے پر پولیس والوں نے بالے اور آپا باجی کو دھمکایا اور سنگین دفعات کے تحت کیس کی خوشخبری سنائی تو وہ معافی تلافی پر اتر آئے۔ پھر دم دبا کر یوں بھاگے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اب فوزی کی طبیعت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ فوزی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ شوکت اسے حاصل تو کرنا چاہتا ہے لیکن طریقے اور رضامندی سے۔ اس رات شوکت نے فوزی سے سر کی مالش کروائی اور کندھے دبوائے۔ پھر رات تک اسے پاس بٹھا کر باتیں کرتا رہا۔ کہنے لگا۔ ”اگر تو چاہتی ہے تو اس کنجر سے تجھے نجات دلا دیتا ہوں۔ طلاق مل جائے کی تجھے اس سے۔“

وہ بڑی کوشش کر کے بولی۔ ”پر...... میں نہیں چاہتی کہ میں پھر سے ان لوگوں کے متھے لگوں۔ وہاں میرے تین بھائی بہنوں کے سوا کوئی میرا سگا نہیں ہے۔“

”تجھے متھے لگنے کو کون کہتا ہے۔ بغیر اس کمینے سے ملے ہی تجھے خلع مل جائے گا۔ خلع سمجھتی ہے نا۔ سمجھ لو کہ عورت کی طرف سے طلاق۔“

ظالم بالے سے نجات کے خیال نے فوزی کے زخمی دل میں ایک خوشگوار احساس پیدا کیا...... مگر وہ جانتی تھی، شوکت یہ سب کچھ بے وجہ نہیں کر رہا۔ اس کے پیچھے اس کی غرض تھی...... وہ غرض جس کی تپش وہ ہر وقت اپنے آلے دوالے محسوس کرتی تھی اور جو بڑھتی جارہی تھی۔

اسے ویدو کی کہی ہوئی ایک بات یاد آنے لگی۔ گرمیوں کی ایک چمکیلی صبح جب وہ اپنے اپنے بستے سنبھالے گندم کے سنہری کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اسکول جارہے تھے...... ویدو نے کہا تھا۔ ”فوزی! اب تم اور شمیم بڑی ہوتی جارہی ہو۔ اپنے آپ سے بڑی ہوشیار رہا کرو۔ لوگ اوپر سے کچھ اور ہوتے ہیں اندر سے کچھ اور۔“ وہ ایسے ہی وڈے وڈیروں والی باتیں کیا کرتا تھا۔

ویدو کی اس بات کی تصدیق حاجی انور کے گھر میں بڑی اچھی طرح سے ہوئی تھی...... سرخ و سپید نورانی چہرہ، نماز روزے کی پابندی، نیک نامی۔ فوزی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ اس طرح کی نیت رکھ سکتا ہے۔ وہ اس کے گھر میں رہ جاتی تو بڑی بات نہیں تھی کہ وہ کسی دن ویسے ہی اس پر ہاتھ ڈال دیتا۔ اپنی غرض میں ناکام ہونے کے بعد اس نے جس طرح فوزی سے بدلہ لیا تھا، وہ اس کے کردار کی ساری قلعی کھول دیتا تھا۔ یہ تو تھانے دار شوکت کا اثر رسوخ اور عہدہ کام آیا تھا جو چوری کے اس کیس سے فوزی کی جان چھوٹی تھی ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا...... لیکن یہ بھی تو آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات تھی۔ اب یقیناً شوکت اس سے اپنے احسانوں کا صلہ وصول کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

☆☆☆

شوکت کے ہاتھ لمبے تھے۔ وہ جو کہتا تھا کر گزرتا تھا۔ قریباً ایک مہینے کے وقفے سے اس نے ایک وکیل کے ذریعے فوزی کو دو بار عدالت میں بھجوایا جہاں اس نے حلفیہ بیان دیا کہ اس کا نشئی شوہر اسے بری طرح مارتا پیٹتا ہے اور ایسی حالات میں دو بار اس کا حمل بھی ضائع ہو چکا ہے...... فوزی سمجھتی تھی کہ اب بالے اور آپا باجی وغیرہ کو بھی عدالت

میں بلایا جائے گا اور سوال جواب ہوں گے مگر شوکت نے کہا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ان کمینوں کے آئے بغیر ہی اسے خلع مل جائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک دن شوکت نے بڑے آرام سے آزادی کا پروانہ فوزی کے ہاتھ میں تھما دیا اور گونگے مٹھو سے کہا کہ بازار سے مٹھائی لے کر آئے۔

شام کو شوکت بازار سے اس کے لیے ویلوٹ کے دو سوٹ بھی لے کر آیا۔ رات کو جب وہ گرم دودھ دینے کے لیے اس کے کمرے میں گئی تو اس نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اس کی مونچھیں فوزی کو معمول سے زیادہ سیاہ اور گھنی نظر آرہی تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک دن پہلے ہی سر اور مونچھوں کے بال خضاب میں رنگے تھے۔ وہ ہمیشہ کرخت لہجے میں بولتا تھا لیکن آج اس کا لہجہ نسبتاً نرم تھا۔ بولا۔ ''دیکھ فوزی! زنانی جوان ہو اور کلّی ہو تو اس کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ تجھے اب شادی کر لینی چاہیے۔ بے شک گلے وار ڈرتے ہیں مجھ سے پر میں اس طرح زیادہ دیر تجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

فوزی اس کی بات کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں جس جنگل میں ہے اس کا جیلر تھانے دار شوکت ہے اور وہ اسے ایک ایسا مشورہ دے رہا ہے جس کو ماننے سے وہ انکار کر ہی نہیں سکتی۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنی زبان کھولی اور ہارے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ ''میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے.....''

''کہو..... کہو۔'' اس نے مونچھ کو مروڑ دیا۔

''.....کیا..... کسی طرح..... ایسا نہیں ہوسکتا کہ سندر پور سے میرا بھائی اور بھتیجی یہاں..... میرا مطلب ہے..... یہاں آسکیں؟''

اس نے بھاری بھرکم کھنکورا مارا اور بولا۔ ''ہوسکتا ہے..... ہو کیوں نہیں سکتا۔'' اس کے چوڑے چکلے سانولے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

''لل..... لیکن..... کسی کو پتا نہ چلے کہ وہ کہاں اور کس کے پاس ہیں۔'' وہ منمنائی۔

''تمہارا کسی کو پتا چلا ہے کہ تم کہاں ہو..... ؟ ان کا بھی نہیں چلے گا۔ پر یہ کام سوکھا نہیں ہے۔ کوئی جو گھاڑ لگانا پڑے گا مجھے.....'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا اور سگریٹ پھونکنے لگا۔

عین اسی وقت گاؤں سے اس کی بیوی کی کال آگئی..... بیوی بچوں سے باتیں کرتا وہ بالکل عام سا بندہ لگ رہا تھا۔ ایک نارمل شوہر اور بچوں سے محبت کرنے والا باپ۔ ان کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس وقت کمرے میں اس کے پہلو میں فوزی موجود ہے (اس نے اماں تاج کو سختی سے ہدایت کررکھی تھی کہ یہاں فوزی کی موجودگی کا پتا اس کے گھر میں نہ چلے)۔

سردیاں جارہی تھیں لیکن ابھی بہار پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی۔ ہاں دھوپیں چمکیلی ہوگئی تھیں اور شامیں کچھ لمبی محسوس ہونے لگی تھیں۔ پتا نہیں کیوں آج کل ویدو اسے بہت یاد آرہا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ کیا خبر کہ اس کے دل میں اب بھی پرانی یادیں اسی طرح ہلکورے لیتی ہوں۔ وہ اب بھی فوزی سے ملنے کے لیے کسی انہونی کا انتظار کررہا ہو لیکن انہونیاں آسانی سے کہاں ہوتی ہیں؟ اور اب تو فوزی نے ویسے بھی اپنے من کو مار لیا تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ دل میں سوچ چکی تھی کہ اگر شوکت اس کے بھائی بھتیجی کو اس دوزخ سے نکال لائے..... تو وہ اپنی قربانی دے دے گی۔ خوشی خوشی اپنی ذات کو شوکت کے حوالے کردے گی اور دیکھا جاتا تو اس میں فوزی کے لیے چوائس بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ جانتی تھی شوکت کو انکار کے نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج کل اسے ویدو بہت یاد آرہا تھا۔ سندر پور کے صبح و شام اور گلی کوچے یاد آرہے تھے۔ وہ رستے، وہ پیڑ، وہ کھیتیاں، وہ اونچ نیچ جہاں اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا، جہاں ان پا گلوں کی بے شمار یادیں رچی بسی ہوئی تھیں۔

اچانک شوکت کی سرکاری جیپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے دوپٹا درست کیا اور چارپائی سے اٹھ گئی۔ شوکت آج وردی میں ہی گھر آیا تھا۔ موڈ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی ٹی وی دیکھتے مٹھو کو زوردار ڈانٹ پلائی پھر وہ فوزی کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''تیرے لیے کوئی چنگی خبر نہیں ہے۔'' ایک لمحے میں فوزی کا منہ لکڑی کی طرح خشک ہوگیا۔ وہ بولا۔ ''کوئی ڈیڑھ مہینا ہوگیا ہے، تیری دونوں بھتیجی اور بھائی گھر میں نہیں ہیں۔''

''کہاں..... گئے ہیں..... جی؟'' وہ ہکلائی۔

اس نے اپنی کانٹے دار ڈاڑھی کھجائی۔ ''پنڈ میں تو یہی بات مشہور ہے کہ وہ تیرا گلے دار..... کیا نام ہے اس کا، ویدو..... ان تینوں کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ بات ٹھیک ہے یا غلط، پر کہا یہی جاتا ہے کہ وہ تجھ سے چھوٹی بہن شمیم کے ساتھ خراب ہوگیا تھا۔ اس کی عمر میں ہی

قسیم کا سل ٹھہر گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی مشہوری ہوتی، وہ اسے دوسرے بچوں سمیت بھگا کر لے گیا۔'' شوکت نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

فوزی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ وہ بمشکل بول پائی۔ ''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا...... یہ قسیم والی بات بالکل غلط ہوگی۔ وہ ایسا نہیں تھا۔''

''واہ بھئی۔ بڑا پکا یقین ہے اس پر۔'' شوکت نے اس کی کمر پر ایک دھپا لگایا۔ وہ ساری کی ساری ہل ہوگئی۔ وہ غصے سے بولا۔ ''وڈی کسی نجومی کی پتر، چل اٹھ جا...... دودھ پتی بنا کر لا...... سر میں پیڑ ہو رہی ہے دوپہر سے۔''

وہ سکتہ زدہ سی اٹھی اور کسی روبوٹ کی طرح باورچی خانے میں آ گئی جہاں اماں تاج نے اس کے لیے گندے برتنوں کا ڈھیر بھی لگا رکھا تھا۔ یہ غلط ہے...... بالکل غلط ہے...... وہ ایسا نہیں ہو سکتا...... اس کا دل رو رہا تھا اور پکارتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

فوزی کچھ دن سے بہت گم صم تھی۔ گھر کے کام کاج میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ اماں تاج ویسے تو کم بولتی تھی مگر جب بولتی تھی منہ سے انگارے ہی برستے تھے۔ گوگا بھی ایک خرانٹ تھا۔ عین کام کے وقت ادھر ادھر کھسک جاتا تھا اور اکثر اس کے حصے کا کام بھی فوزی کو کرنا پڑ جاتا تھا۔

ایک دن شوکت اچھے موڈ میں گھر آیا۔ فوزی سے کہنے لگا۔ ''موسم بدل رہا ہے۔ چل تجھے کچھ گرمیوں والے کپڑے لے دوں۔ اماں تاج کو بھی ساتھ لے لے۔''

''جی اچھا'' کے سوا فوزی بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔ شوکت غالباً یہ چاہتا تھا کہ فوزی کا دھیان سندر پور کی طرف سے ہٹے۔ اس نے فوزی کو بتایا تھا کہ وہ اس کے بھائی بہنوں کو تلاش کرانے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کر کے لے گیا۔ فوزی اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اماں تاج پیچھے تھی۔ اس روز فوزی کو اندازہ ہوا کہ تھانے دار کیا چیز ہوتا ہے۔ ایسے بااختیار لوگوں کی دنیا ہی دوسری ہوتی ہے۔ ہر کوئی ان کے سامنے بچھ بچھ جا رہا تھا۔ دکاندار قیمت خرید سے بھی کم ریٹ پر اشیا دے رہے تھے۔ بوتلیں، آئس کریم وغیرہ علیحدہ سے آفر کی جا رہی تھیں۔ راستے میں ایک جگہ سے انہوں نے کھانا پیک کروایا تو ریسٹورنٹ والے نے پیسے لینے سے صاف انکار کیا۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ ابھی وہ گھر سے ڈیڑھ دو کلومیٹر دور تھے تو فوزی کو یوں لگا جیسے زوردار پٹاخہ چلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی چیز ٹھک سے کار کی باڈی میں لگی۔ شوکت ایک دم بدحواس نظر آیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار یکایک تیز کر دی۔ ''سر نیچے کر لو۔'' وہ زور سے چلایا۔

فوزی کو اندازہ ہوا کہ گاڑی پر فائر ہوا ہے۔ پھر دو فائر اور ہوئے۔ ان میں سے ایک نے گاڑی کی ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ شوکت نے گاڑی کو تیزی سے موڑا اور ایک تنگ سڑک پر ڈال دیا۔ راہ گیر گھبرا کر دائیں بائیں دوڑے۔ گاڑی کچھ آگے گئی اور پھر لہراتی ہوئی بجلی کے ایک کھمبے سے جا ٹکرائی۔ یہ کافی زوردار ٹکر تھی۔ کچھ دیر کے لیے فوزی کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے خود کو ایک بستر پر پایا۔ وہ ایک اسپتال میں تھی۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک کندھے پر بھی پٹیاں تھیں اور درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کچھ یہی کیفیت پاؤں کی بھی تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے پاؤں میں فریکچر ہوا ہے اور کندھا اتر گیا ہے۔ اماں تاج کے بارے میں پتا چلا کہ اسے بس کچھ خراشیں آئی ہیں لیکن شوکت کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا اور وہ بھی اسی اسپتال میں تھا۔ گاڑی پر ہونے والی فائرنگ تھانے دار شوکت کے کسی پرانے دشمن نے کی تھی اور وہ اپنے ساتھی سمیت پکڑا بھی گیا تھا۔

شوکت تو اسی روز اسپتال سے فارغ ہو گیا تاہم فوزی کو دو دن مزید رہنا پڑا۔ یہ ٹخنے سے ذرا اوپر پنڈلی کا فریکچر تھا۔ پہلے ڈاکٹر آپریشن کرنا چاہتے تھے لیکن پھر صرف پلاستر پر اکتفا کیا گیا۔ بہرحال اسے کم از کم ایک ماہ تک مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا گیا۔

وہ شوکت کے گھر واپس آ گئی۔ شوکت کے دائیں بازو پر کلائی سے کہنی کے اوپر تک پلاستر چڑھا ہوا تھا تاہم ویسے وہ چاق و چوبند ہی نظر آتا تھا۔ فوزی بستر پر آ لگی تھی۔ اس کا کندھا چڑھ تو گیا تھا مگر وہ اسے حرکت نہیں دے سکتی تھی۔ سر پر بھی سات آٹھ ٹانکے آئے تھے۔ اس کے بستر پر پڑ جانے سے گھر کے کام کا سارا بوجھ اماں تاج اور گوگے منو پر آ گیا تھا۔ وہ سارا دن آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ زیادہ کام منو کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی ہڈ حرامی کو بھگانے کے لیے تمباکو والا پان منہ میں دبا تا تھا اور کام میں جت جاتا تھا۔ ویسے اچھے کھانے کھا کھا کر وہ کافی تگڑا ہو گیا تھا۔ بے شک وہ عجیب گزار رہا تھا پر اس کے چہرے پر ایک

پیدائشی معصومیت سی اب بھی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے فوزی کو کیوں اپنے چھوٹے بھائی فاروق کا خیال آجاتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ چار پانچ سال بعد وہ بھی اس سے ملتا جلتا ہی نظر آئے گا۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا جس کی فوزی کو ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس دن کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور گاہے بگاہے گرج چمک کے ساتھ بارش ہونے لگتی تھی۔ شوکت علی الصباح ہی اپنے مضافاتی تھانے میں چلا گیا تھا۔ اماں تاج کی ایک بھتیجی لاہور میں کہیں بیوٹی پارلر چلاتی تھی۔ وہ سیڑھیوں سے گر کر سخت زخمی ہوئی تھی۔ اماں اس کی خبر گیری کے لیے لاہور گئی ہوئی تھی۔ گھر میں خاموشی سی تھی کیونکہ گونگے منشو اور اماں کا جھگڑا نہیں تھا۔ فوزی کے کندھے میں شدید درد تھا۔ اس نے دوا کھائی تو سخت غنودگی محسوس ہونے لگی، پھر وہ سوگئی۔

فوزی کی آنکھ ایک سرسراہٹ سے کھلی تھی۔ یہ سرسراہٹ اسے اپنے پیٹ پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل اپنی پلکیں اٹھائیں۔ غنودگی میں اسے جو دھندلا سا منظر نظر آیا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ گونگے کے ہاتھ میں چارپائی کی ایک ادوائن (رسی) تھی جسے وہ فوزی کے گرد لپیٹ رہا تھا بلکہ لپیٹ چکا تھا۔ فوزی نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر جسم ایک دھچکا کھا کر رہ گیا۔ کندھے سے شدید ٹیسیں اٹھیں۔ ادوائن کی رسی کے دو تین بل اسے چارپائی کے ساتھ باندھ چکے تھے۔ اس نے گونگے منشو کا چہرہ دیکھا اور لرز گئی۔ وہ اس کا چہرہ ہی نہیں لگتا تھا۔ اس کے کلے میں نشیلا پان دبا ہوا تھا۔ کسی اندرونی ہیجان کے سبب نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں شعلے سے لپک رہے تھے.... بادلوں کی وجہ سے سہ پہر میں ہی شام کا سا سماں تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

"منشو" وہ چلائی۔

وہ کسی عقاب کی طرح فوزی پر جھپٹ پڑا۔ فوزی نے ایک بار اٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ منشو کا سارا بوجھ اس پر آن پڑا تھا۔ اس کی جسامت ایسی تھی کہ سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی اچھا خاصا جوان نظر آتا تھا۔ "بچاؤ...... بچاؤ۔" فوزی پکاری۔ اس کے بازو آزاد تھے۔ رسی کے بل بس اس کی کمر اور ٹانگوں کے گرد تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے گونگے کے تمتماتے ہوئے چہرے پر تھپڑ مارا۔ جواب میں اس نے بڑی وحشت سے فوزی کی گردن پر اپنا گھٹنا رکھ دیا۔ بے حد دباؤ کی وجہ سے فوزی کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔

گونگے منشو نے حیران کن پھرتی سے ایک کپڑا فوزی کے منہ میں گھسیڑ دیا اور اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ جنس کے دیو نے اس کے اندر بے پناہ توانائی پیدا کر دی تھی۔ وہ فوزی کو بھنبھوڑنے لگا۔ فوزی کے کندھے اور ٹوٹی ہوئی پنڈلی سے درد کی ناقابل برداشت لہریں اٹھ رہی تھیں۔ تاہم ان لہروں سے بھی زیادہ اذیت ناک لہریں وہ تھیں جو اس کے دماغ سے اٹھ رہی تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ گونگا اس پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کھلی آنکھوں سے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔

شکار اور شکاری کے درمیان پتا نہیں کتنی دیر یہ خوفناک کشمکش جاری رہی۔ کسی وقت وہ فوزی پر غالب آنے لگتا، کسی وقت وہ اسے پسپا کرنے میں کامیاب رہتی۔ اس کا بالائی لباس دھجیوں کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"اوئے او دروازہ کھولو" ایک بھاری آواز فوزی کے کانوں تک پہنچی۔ یہ شوکت کی آواز تھی۔

یہ آواز سنتے ہی گونگے کی وحشت کا چڑھا ہوا دریا ایک دم اتر گیا۔ اس نے فوزی کو چھوڑا۔ چند لمحے تک ٹھٹکا ہوا سا دھڑ دھڑ بجتے دروازے کو دیکھتا رہا، پھر کمرے کی کھڑکی کی طرف لپکا اور اس کے پٹ کھول دیے۔ وہ اب بھاگنے کی فکر میں تھا۔ دروازے کے باہر شوکت کی گالیاں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

فوزی کو ایک بار پھر اسپتال جانا پڑا تھا۔ اس کے کندھے کا جوڑ پھر "ڈس لوکیٹ" ہو گیا تھا۔ جسم پر جابجا خراشیں آئی تھیں۔ گونگے کو اس کے کیے کی اچھی سزا ملی تھی۔ جب وہ کھڑکی کی جالی توڑ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، شوکت نے دروازہ توڑ دیا تھا اور اندر گھس آیا تھا۔ بے شک شوکت کی ایک بانہہ پلاستر میں جکڑی ہوئی تھی مگر اس نے گونگے کو ٹھیک ٹھاک مار لگائی تھی۔ پھر اس کا ڈرائیور بھی آگیا تھا۔ اب گونگا یقیناً لمبی قید کاٹنے کے لیے حوالات میں بند تھا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ بدترین جارحیت تھی۔ فوزی کی حالت کی پروا کیے بغیر وہ دیوانوں کی طرح اس پر پل پڑا تھا۔

اس واقعے کے آٹھ دس روز بعد کی بات ہے۔ فوزی اپنی ٹانگ کا پلاستر بچا کر احتیاط سے نہائی تھی اور اس نے شوکت کا دلایا ہوا نیا جوڑا پہنا تھا۔ دوپہر کو شوکت نے کہا تھا کہ وہ رات کو اس سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔

اس "ضروری بات" کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ رہی

تھی۔ شوکت نے پے در پے اس پر کئی احسان کیے تھے اور سب سے پہلا احسان یہ تھا کہ چوری والے الزام کے بعد اس نے اسے پوچھ گچھ کی سختی اور جیل جانے سے بچایا تھا۔ اب وہ یقیناً ان احسانوں کا بدلہ چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تو کسی بھی وقت اس کے ساتھ زور زبردستی بھی کر سکتا تھا مگر اب تک وہ اس سے باز ہی رہا تھا...... وہ اسے بالے کے خبیث پنجے سے آزادی دلا چکا تھا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ قسیم، زینب اور فاروق کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ ان حالات میں فوزی کو اپنی قربانی دینے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ قربانی کے لیے قصداً آمادہ ہو چکی تھی۔

اماں تاج طبیعت کا بہانہ کر کے لیٹی ہوئی تھی...... ہاں ہانڈی روٹی اس نے کر دی تھی...... فوزی لنگڑاتی ہوئی باورچی خانے میں گئی۔ پہلے کھانا نکال کر شوکت کو دیا...... پھر اس کے لیے دودھ گرم کر کے لائی۔ اب وہ شلوار قمیص پہنے گدی پر چوکڑی مارے بیٹھا تھا اور کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔

”بیٹھ جا۔“ اس نے سامنے موڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور فائل بند کر دی۔

وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ٹیوب لائٹ کے چانن میں فوزی کو اپنا پرچھاواں کانپتا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔

وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”دیکھ فوزی! میں زیادہ دیر تجھے اس طرح اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میرے تھانے دار ہونے کی وجہ سے آنے والے والے چپ ہیں پر وہ اب زیادہ دیر چپ نہیں رہیں گے۔ اب شادی تو کرنی ہی پڑے گی۔“ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے وہ بولی۔ ”جی۔“

اس نے سگریٹ بجھا کر اپنی کالی مونچھوں کو مروڑا دیا اور کہنے لگا۔ ”اگر تیرے دماغ کے کسی کونے میں یہ بات ہے کہ دیدو سے تیرا میل پھر ہو جائے گا تو یہ بہت مشکل ہے اور اگر ایسا ہو بھی گیا اور کسی ویلے وہ تیرے سامنے آ بھی گیا تو مجھے لگتا ہے اب وہ تیرے کسی کام کا نہیں۔ میری بات سمجھ رہی ہے نا؟“

”جی۔“ اس نے ڈری ہوئی سوالیہ نگاہوں سے شوکت کو دیکھا۔

”دیکھ، جو بات اس طرح لوگوں کے منہ پر چڑھتی ہے نا وہ ایویں نہیں ہوتی۔ یہ بات سندر پور میں بھی مشہور ہے کہ دیدو اور تیری چھوٹی بہن قسیم کے درمیان ”معاملہ“ ہو گیا تھا اسی لیے وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ بات اب تجھے بھی سمجھ لینی چاہیے۔ کیا خیال ہے؟“

وہ آدھے گھونگھٹ کی اوٹ میں اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔

وہ کھنگورا مار کر بولا۔ ”دو تین مناسب لڑکے میری نظر میں ہیں۔ ایک منڈا تو یہیں گوجرانوالا کا ہے۔ موٹر سائیکلوں کے اسپیئر پارٹ کی دکان ہے۔ پانچ مرلے کا اپنا گھر بھی ہے۔“ فوزی چونک کر شوکت کو دیکھنے لگی۔ اسے جیسے کرنٹ سا لگ گیا تھا۔ شوکت نے اپنا نیم گنجا سر کھجایا اور اپنی ہی رو میں بولتا گیا۔ ”...... لیکن میں تیری مرضی کے بغیر کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ پہلے بھی تیرے ساتھ کچھ چنگا نہیں ہوا ہے۔ اب اللہ کرے چنگا ہو جائے۔ گوجرانوالے کے منڈے کو تو خود بھی دیکھ لے۔ آخری فیصلہ تُو نے ہی کرنا ہے......“

فوزی جیسے زمین آسمان کے درمیان معلق ہو گئی تھی۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر غور سے شوکت کا چہرہ دیکھا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ یہ جملے شوکت نے ہی بولے ہیں یا کسی اور نے۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ وہ اس کے رشتے کی بات کر رہا تھا لیکن...... اپنے لیے نہیں...... کسی اور کے لیے...... وہ ان لڑکوں کا ذکر کر رہا تھا جو اس کی نظروں میں تھے اور فوزی کے لیے اچھا جوڑ ثابت ہو سکتے تھے۔

یہ دنیا کا کیسا روپ تھا؟ وہ دنگ رہ گئی...... ان لمحوں میں پتا نہیں کیوں اسے ایک بار پھر دیدو کی کہی ہوئی بات یاد آئی...... ”فوزی! لوگ اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں اوپر سے کچھ اور......“ تو وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ شکلیں دیکھ کر تو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ بندہ اندر سے کیا ہے؟ نورانی چہرے اور دھیمی ملائم آواز والا حاجی انور اندر سے کیا نکلا تھا...... اپنی پناہ میں آئی ہوئی فوزی پر اس نے للچائی ہوئی نگاہ ڈالی تھی...... اور یہاں کرخت چہرے والا یہ بظاہر تند مزاج تھانے دار اندر سے کچھ اور نکلا تھا۔ فوزی یہاں کئی ماہ سے اس کی دسترس اور اس کے قبضے میں تھی۔ وہ ہر گھڑی خود کو ایک سنگین خطرے میں محسوس کرتی رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ گوجرانوالا کے اس گھر میں ہر رات ایک تلوار سی اس کے سر پر لٹک جاتی تھی اور آج اسے پتا چل رہا تھا کہ وہ سب کچھ نہیں تھا جو وہ سمجھتی رہی تھی۔

وہ ذرا جھنجلا کر بولا۔ ”اوئے اسے کیا بڑ بڑ دیکھ رہی ہے میری طرف۔ میں نے کوئی انہونی گل کہہ دی ہے۔ شادی نہیں کرنی تجھے؟“

فوزی کی آنکھوں میں گرم آنسو امڈ آئے اور وہ ان کی حرارت اپنے سرد رخساروں پر محسوس کرنے لگی۔ پتا نہیں کہ

ایک دم اسے کیا ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے نیچے بیٹھ کر شوکت کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا سر شوکت کے گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''اوئے کیا ہوا ہے تجھے۔ میں نے کوئی ڈانگ ماردی ہے تیرے سر پہ...... میں تجھے کوئی بوجھ نہیں سمجھتا ہوں اپنے اوپر۔ پر سچی بات یہی ہے کہ اس وقت تیری عمر ہے شادی کی۔ چھکے سے چنگا منڈا مل جائے گا......''

وہ بولتا جا رہا تھا اور وہ روئے جارہی تھی۔

☆☆☆

یہ گھر جو فوزی کو جیل کی طرح لگتا تھا، یکا یک ہی گھر لگنے لگا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ بظاہر ایک سخت گیر اور منہ پھٹ شخص کے اندر ایک اچھا، دردمند انسان بھی موجود ہے۔ ہوسکتا تھا کہ اس میں اور کچھ برائیاں ہوں مگر کم از کم وہ ہوس کار تو نہیں تھا۔ وہ پناہ لینے اور پناہ دینے کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ شوکت کے تمام سوالات کے جواب میں اس نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ وہ ابھی اس گھر سے جانا نہیں چاہتی اور شادی کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہتی ہے۔

اس نے ایک دو بار ڈرتے ڈرتے شوکت کو انکل کہہ کر بلایا تھا۔ وہ برا مان گیا تھا۔ بھنا کر بولا تھا۔ ''او کڑیے! یہ رشتے وغیرہ نہ جوڑ مجھ سے اور یہ انکل شنکل کا کیا مطلب ہے۔ کیا میں بڈھا کھوسٹ ہو گیا ہوں۔ تیرے جیسی کو ایک لپڑ پڑ جائے نا میرا تو سیدھا جی ٹی روڈ پر جا کر گرے گی۔''

اس کے بعد ایک دن جب صبح کے وقت وہ اپنا موبائل فون گھر میں بھول کر تھانے جارہا تھا، وہ اس کے پیچھے لپکی تھی اور اسے ''بھائی جان'' کہہ کر پکارا تھا۔ وہ رک گیا تھا۔ واپس آکر اس نے فوزی کو بہت غصیلی نظروں سے دیکھا تو تھا لیکن کچھ نہیں کہا۔ اس واقعے سے ہمت پا کر وہ کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے اسے بھائی جان کہہ دیتی تھی۔ اماں تاج کا خیال تھا کہ وہ کسی دن بری طرح ڈانٹ کھائے گی لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں تھا۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب وہ باورچی خانے میں شوکت اور اماں تاج کے پسندیدہ مٹر چاول پکا رہی تھی، اسے پتا چلا کہ شوکت مر گیا ہے...... ہاں تھانے دار شوکت مر گیا تھا۔ پولیس والوں کی زندگیوں پر کبھی کبھی موت ایسے ہی چھاپا مارا کرتی ہے۔ وہ چار پانچ روز سے گھر نہیں آیا تھا۔ جیسا کہ فوزی کو پتا چلا تھا، وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ چند روز کے لیے مری گیا تھا۔ آج اس کی واپسی تھی۔ وزیر آباد کے قریب ایک موڑ پر اس کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی۔ وہ اسپتال پہنچتے پہنچتے زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ بیوی بھی زخمی ہوئی تھی مگر اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ دونوں بچے معجزانہ طور پر محفوظ رہے تھے (یہ وہی دیرینہ دشمن تھے جنہوں نے پہلے بھی ایک دفعہ اس پر فائرنگ کروائی تھی)۔

اس روز فوزی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا تھا کہ باپ کا سایہ ایک بار پھر اس کے سر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ بے آسرا ہو گئی ہے۔

وہ اماں تاج اور شوکت مرحوم کے ڈرائیور حنیفا کے ساتھ گاؤں پہنچی تھی۔ اپنے محسن کا آخری دیدار کیا تھا اور اس کی میت پر آنسو بھی بہائے تھے پھر وہ دوبارہ گوجرانوالا آگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس گھر کی دیواریں غائب ہو گئی ہیں اور بس چھت معلق رہ گئی ہے جو کسی بھی وقت مکینوں کے سر پر آن گرے گی۔

وہ غم کے گھیرے میں تھی۔ آنسو گاہے بگاہے آنکھوں سے رسنے لگتے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل ڈرائیور حنیفا...... حافظ بھی تھا۔ وہ عام پولیس والوں سے خاصا مختلف تھا۔ ایک دن فوزی کے پاس بیٹھ کر اپنے مرحوم صاحب کی یادیں تازہ کرنے لگا۔ اس نے رازداری کے لہجے میں ایک بات فوزی کو بتائی اور اس نے فوزی کو حیران کیا۔ اس نے بتایا۔ ''شوکت صاحب نے اپنے ایک اے ایس آئی کی مستقل ڈیوٹی اس کام پر لگا رکھی تھی کہ وہ آپ کے بھائی بہنوں کو تلاش کرے۔ وہ تقریباً ہر روز ہی اس اے ایس آئی سے رپورٹ لیتے تھے۔'' پھر وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ''صاحب جانتے تھے کہ آپ...... ویدو کے بارے میں بہت پریشان ہیں...... ان کو پتا تھا کہ آپ ویدو کو پسند کرتی ہیں...... کم از کم وہ یہی سمجھتے تھے کہ آپ پسند کرتی ہیں...... وہ آپ دونوں کو ملانا چاہتے تھے...... سچ کہتا ہوں وہ آپ دونوں کو ملانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے بہت کوشش کی ہے پر شاید آپ کو ابھی اس بھاگ دوڑ کے بارے میں زیادہ بتایا نہیں کہ کہیں آپ کے اندر آس امید نہ پیدا ہو جائے۔'' وہ اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ فوزی گم صم اس کی باتیں سنتی رہی۔

ہاں اس گھر کی دیواریں تقریباً غائب ہو چکی تھیں اور چھت ہوا میں معلق تھی۔ یہ گھر اب رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اس بات کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ یہ گھر بھی کسی وقت اسی دیرینہ دشمنی کی زد میں آجائے جس نے شوکت صاحب کی جان لی تھی۔ اماں تاج بھی اب یہاں خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنی بھانجی شکیلہ کے پاس لاہور چلے جانا چاہتی

تھی۔ یہ وہی بھانجی تھی جو وہاں کوئی بیوٹی پارلر چلاتی تھی۔ اماں تاج ہر وقت فوزی سے اٹ کھڑکا کرتی تھی اور ڈانٹتی ڈپٹتی بھی تھی لیکن یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ فوزی اپنی ہمت سے زیادہ کام کرنے والی لڑکی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے لاہور شفٹ ہونے کا ارادہ کیا تو فوزی سے کہا کہ وہ بھی اگر جانا چاہے تو اس کے ساتھ جا سکتی ہے۔ فوزی کے سر پر سے چھت کھسک رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس نے اماں تاج کے ساتھ جانا قبول کرلیا۔ اس گھر کے مالک کی اور اس کے علاوہ اپنے بھائی بہنوں کی یادیں سمیٹ کر وہ گوجرانوالا سے اپنی نئی منزل لاہور کی طرف روانہ ہوگئی۔ جب وہ اماں تاج کے ساتھ بس میں بیٹھ کر اپنے مختصر سامان سمیت لاہور کی طرف رواں دواں تھی، اس نے عقب میں دیکھا گوجرانوالا اس سے دور جا رہا تھا۔ ڈسکہ اس سے دور جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے بچپن کا گاؤں سندر پور بھی دور جا رہا تھا۔ وہی سندر پور جس کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر صبح کا سورج سونا بکھیرتا تھا۔ وہ اپنے بھائی بہنوں اور ویدو کے ساتھ گلے میں بستہ لٹکائے اسکول کی طرف دوڑتی چلی جاتی تھی۔ ہاں وہی سندر پور جس کی سنسان دوپہروں کو وہ اپنے شور کے ساتھ درہم برہم کرتے تھے اور جس کی سرمئی شاموں میں وہ سرسبز کھیتوں کے پار ڈوبتے سورج کو دیکھ کر آنے والی رات کے سپنے اپنی آنکھوں میں سجاتے تھے۔ ویدو اس کی مٹھی میں گرم گرم مونگ پھلی دے کر کہتا تھا— ''کل چھٹی ہے۔ رات کو تمہارے گھر آؤں گا، دیر تک کھیلیں گے......'' آہ...... کل چھٹی ہے...... ان تین لفظوں میں کتنی خوشی سمٹ آتی تھی ان چاروں کے لیے۔ ان کے ننھے سینے بے نام ترنگ اور مسرت سے بھر جاتے تھے......

''کہاں ہو ویدو؟ اب بھی ملو گے یا نہیں؟'' اس نے بڑے درد سے سوچا۔

کیا سندر پور کا وہ میلا اب کبھی نہیں آئے گا جس میں ہم نے ایرانی سرکس دیکھنا تھا۔ جھولے جھولنے تھے اور بن کباب کھانے تھے......کیا وہ میلا اور وہ سارا ماضی ہمیشہ کے لیے گم ہو چکا ہے؟ بس میں پنجابی کا گیت پرسوز آواز میں گونج رہا تھا۔

لگ لگ دنیا توں اسی روندے رہے
تیریاں جدائیاں والے داغ دھوندے رہے

اماں تاج کی بھانجی راجی شکیلہ، اماں تاج سے کافی مختلف تھی۔ کام تو بہت لیتی تھی مگر بے جا روک ٹوک نہیں کرتی

تھی۔ اس کا میاں کام کے سلسلے میں دبئی میں تھا۔ گھر میں بس دو بچے اور ایک دیور تھا جو میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ یہ دو منزلہ گھر تھا۔ پارلر گھر کی نچلی منزل پر تھا۔ شروع میں تو فوزی گھر کی صفائی ستھرائی اور کچن تک ہی رہی تاہم پھر اس کی ہمت اور کام کی لگن دیکھتے ہوئے شکیلہ نے اسے پارلر میں بھی چھوٹی موٹی ذمے داری سونپنا شروع کر دی۔ یہ ایک چھوٹا پارلر تھا مگر علاقے میں اس کی ساکھ تھی۔ ماحول بھی بہت اچھا تھا۔ مسلم ٹاؤن کی خواتین بلاجھجک یہاں آتی جاتی تھیں۔

"تمہارے اندر سیکھنے کا ٹیلنٹ ہے فوزی۔ تھوڑا وقت پارلر میں دیا کرو، تمہارا فائدہ ہوگا۔" ایک دن شکیلہ نے ایک کسٹمر کے ہاتھ پر فوزی کی لگائی ہوئی مہندی دیکھ کر کہا تھا۔

یہ ایک بیل بوٹوں اور دو ستاروں والا وہی ڈیزائن تھا جو وہ بچپن اور لڑکپن میں بھی بڑی خوبصورتی سے بنایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کے اسکول کی ٹیچر نے یہ ڈیزائن دیکھ کر کہا تھا۔ "فوزی! تم ڈرائنگ کیا کرو۔ تمہاری لکیروں میں بڑی صفائی ہے۔ آگے چل کر مصوری کر سکتی ہو۔"

شکیلہ کی حوصلہ افزائی کے سبب فوزی تقریباً روزانہ ہی تھوڑا وقت پارلر میں گزارنے لگی۔ گھر کا کام کاج اس کے علاوہ تھا۔ اماں تاج بھی اپنے احسان کے عوض اس سے خدمتیں کراتی رہتی تھی۔ وہ رات تک تھک کر چور ہو جاتی تھی لیکن یہ تھکاوٹ اور مصروفیت اسے بری نہیں لگتی تھی۔ اسی مصروفیت کی وجہ سے تو وہ اپنی جانکاہ سوچوں سے محفوظ رہتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال بھی آتا کہ خود کو مزید مصروف کرنے کے لیے پڑھائی دوبارہ شروع کر دے مگر عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔

گرمیاں عروج پر تھیں۔ لاہور کی دوپہریں تپی ہوئی اور راتیں حبس زدہ تھیں۔ فوزی اور اماں تاج اکثر پیڈسٹل فین لگا کر گھر کی چھت پر سو جاتی تھیں۔ ایسے میں سیاہ آسمان پر تاروں کو دیکھتے دیکھتے کبھی فوزی کی آنکھوں میں بھی تارے جھلملانے لگتے تھے۔ وہ بڑے درد کے ساتھ سوچتی۔ اس کی بہنیں کہاں ہوں گی؟ اس کا ننھا بھائی فاروق ان ڈھائی تین برسوں میں کتنا قد نکال چکا ہوگا اور وہ ویدو...... جس نے چک انیس میں ایک رات گھر کی چھت پر کھڑے کھڑے بڑی حسرت سے یہ سوال پوچھا تھا...... مجھ سے پیار کرتی ہو نا فوزی؟ وہ ویدو کہاں ہوگا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے اس کی چھوٹی بہن قیمہ سے شادی کر لی ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا سوال بھول گیا ہو اور فوزی کا خاموش جواب بھی...... اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہو اور اس کا نام نہ لیتا ہو۔

اگر وہ دعاؤں میں اس کا نام نہیں بھولی تھی تو وہ بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اسے بھی نہیں بھولنا چاہیے تھا۔ اس نے ایک آہ بھری اور آنکھیں بند کر کے خاموشی کی زبان میں کہا۔ "میرا دل کہتا ہے تم مجھے ڈھونڈتے ہو ویدو...... اور میرا دل یہ اس لیے کہتا ہے کہ میں بھی تمہیں ڈھونڈتی ہوں۔"

اور وہ واقعی اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ صرف اپنی دعاؤں میں نہیں، اپنے راستوں میں بھی...... لاہور کے گلی کوچوں میں بھی، شہر میں یا شہر سے باہر کہیں آتے جاتے بھی اس کی نگاہیں کسی کی متلاشی رہتی تھیں۔ یہ بے چین نگاہیں ویدو کو تلاش کرتی تھیں اور ان تینوں کو بھی جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سندر پور سے اس کے ساتھ گئے تھے۔

مرحوم تھانے دار شوکت کا ڈرائیور حنیفا اب بھی کبھار اماں تاج اور فوزی سے ملنے لاہور آتا تھا۔ وہ فوزی کے دکھ کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا اور فوزی کے کہے بغیر ہی اس نے اپنے مرحوم صاحب کا کام جاری رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے طور پر ڈسکہ اور ارد گرد کے علاقے میں ویدو اور قیمہ، زینب وغیرہ کا کھوج لگاتا رہتا تھا۔ کبھی یوں لگتا تھا کہ ویدو اور فوزی کے بہن بھائی اس ایریا میں ہیں ہی نہیں شاید وہ کہیں دور نکل چکے ہیں۔

ایک بار حنیفا کو کچھ شک ہوا تھا اور فوزی کی التجا پر اس نے دفتر سے دو ہفتے کی طویل چھٹی لے کر کراچی کا چکر بھی لگایا تھا۔ یہ لمبا پھیرا بھی بے کار گیا تھا۔

...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فوزی پارلر پر زیادہ وقت دینے لگی۔ پارلر میں مردوں کا داخلہ قطعی بند تھا پھر بھی وہ پارلر میں ہوتی تو اپنا چہرہ حجاب میں رکھتی۔ میک اپ میں اس کا ہاتھ صاف ہو گیا تھا لیکن اس کی اصل پہچان مہندی ڈیزائننگ کی تھی۔ ہاتھوں، بازوؤں اور پاؤں پر وہ اتنی خوبصورتی سے نقش و نگار بناتی تھی کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ خاص طور پر وہ بیل والا ڈیزائن تو دل موہ لیتا تھا۔ اب تو کبھی کبھی پوش علاقے سے بھی خواتین اس سے مہندی لگوانے آ جاتی تھیں۔ شکیلہ آپی اس سے بہت خوش تھی۔ اسی خوشی میں کبھی کبھی اسے مشورہ دے ڈالتی کہ وہ اپنی خوبصورتی اور جوانی کو یوں ضائع نہ کرے، شادی کے بارے میں سوچے۔ ایسی کسی بھی بات کا جواب فوزی کے پاس ایک خاموشی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے محسوس ہوتا تھا کہ اسے ازدواجی زندگی سے ہی نفرت ہو گئی ہے اور یہ سب کیا دھرا اس جنگلی بالے کا تھا۔ وہ منتقم خالف

سے اپنے تعلق میں بے حد محتاط ہوگئی تھی۔ شکیلہ کا دیور سعید بڑا معصوم سا لڑکا تھا مگر وہ اس سے بھی کھل کر بات نہیں کرتی تھی۔ اسے گونگا یاد آجاتا تھا۔ اس کی کیا عمر تھی اور اس نے کیا ستم ڈھانا چاہا تھا اس پر۔ لاہور میں شب و روز اپنی مخصوص رفتار سے حرکت میں تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، امیدیں کم ہورہی تھیں اور مایوسی بڑھتی جارہی تھی۔ کسی وقت تو فوزی یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوجاتی کہ سندر پور میں جو بات مشہور تھی شاید وہ ٹھیک ہی تھی۔ ویدو، شمیم سے شادی کر کے کہیں پر ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔

☆☆☆

سندر پور کے ویدو کی زندگی ایک مسلسل تلاش اور انتظار کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ تقریباً ڈھائی سال پہلے وہ پٹواری کے پتر شاہو اور اس کے بچوں کے خوف سے شمیم، زینب اور فاروق کو بچا کر سندر پور سے نکل آیا تھا۔ اس کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی ہمت اور دانائی بڑوں جیسی تھی جیسے مرغی اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو چھپاتی ہے۔ اس نے بھی ان بچوں کو چھپایا تھا اور ڈسکے کو چھوڑ کر پنجاب کے دوسرے کنارے ملتان جا پہنچا تھا۔ یہاں اس کے اسکول کے ایک پرانے ٹیچر عارف حسین صاحب کی رہائش گاہ تھی۔ وہ ویدو سے بہت محبت کرتے تھے۔ علم کے لیے ویدو کے اندر جو قدرتی پیاس تھی، وہ عارف صاحب کو بہت بھاتی تھی۔ پانچ چھ سال پہلے وہ ریٹائر ہو کر ملتان چلے گئے تھے تاہم ان کے اور ویدو کے درمیان بھی کبھار خط کتابت ہوجاتی تھی۔ بچوں سمیت سندر پور سے نکلنے کے بعد ویدو سیدھا ملتان کی اس مضافاتی آبادی میں پہنچا تھا۔ عارف صاحب، ویدو کے سارے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ عارف صاحب یہاں ایک اکیڈمی کامیابی سے چلا رہے تھے۔ ان کی بیوی مریم بھی پڑھی لکھی تھیں اور اکیڈمی میں عارف صاحب کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔

دو تین ماہ میں ہی ویدو نے ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنا اور تین بچوں کا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ عارف صاحب کی اکیڈمی میں آٹھویں تک کے بچوں کو پڑھانے لگا تھا بلکہ اس کو ایک کمپیوٹر شاپ پر سیلز مین کی مناسب جاب بھی مل گئی تھی۔ شمیم، زینب اور فاروق کو اپنی پڑھائی جاری رکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ اسی اکیڈمی میں پڑھنے لگے۔ چار پانچ ماہ بعد ویدو کے والد نذیر صاحب بھی آبائی گھر اونے پونے بیچ کر راولپنڈی چلے گئے اور پھر راولپنڈی سے بڑی خاموشی کے ساتھ ویدو کے پاس ملتان شفٹ ہوگئے۔ تقریباً ایک سال پہلے عارف حسین صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی بیوی مریم کو ویدو چچی جان کہتا تھا اور وہ اس سے سگے بیٹوں کی طرح ہی پیار کرنے لگی تھیں۔ انہوں نے اکیڈمی اور اسکول کی ساری ذمے داری ویدو کے حوالے کردی تھی۔

ویدو نے کسی نہ کسی طور اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی ہوئی تھی اور بی سی ایس میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ شمیم اب سیکنڈ ایئر، زینب میٹرک اور فاروق ساتویں کلاس میں تھا۔ وہ تینوں اسے سگے بھائی کی سی حیثیت دیتے تھے اور اس کے ہر حکم پر سر خم کرتے تھے۔ ان ساڑھے تین برسوں میں زندگی نے انہیں بہت کچھ دیا تھا لیکن وہ جو ایک کمی تھی وہ ہر چیز پر حاوی تھی۔ فوزی کے لیے ان چاروں کے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے۔

ویدو نے آج تک وہ مڑے تڑے نوٹ سنبھال کر رکھے ہوئے تھے جو سندر پور کے اس میلے سے چند روز پہلے فوزی نے اسے مٹھی میں تھمائے تھے اور معصومیت سے کہا تھا۔

"ویدو بھائی! یہ میلے میں خرچنے کے لیے جمع کیے ہیں......!"

وہ میلا تو آیا تھا۔ وہاں سرکس بھی تھا، جھولے بھی تھے، بن کباب بھی تھا، قلفی، گول گپے اور چاٹ بھی تھی...... لیکن وہاں فوزی نہیں تھی۔ کسی وقت ویدو کو لگتا تھا کہ وہ آج بھی میلے کے بیچوں بیچ کھڑا چند نوٹ مٹھی میں دبائے فوزی کا انتظار کررہا ہے۔

ویدو کو وہ دن بھی کبھی نہیں بھولا تھا جب لڑائی کے بعد سندر پور کا نمبردار اور اس کے ابا جان اسے حوالات سے چھڑا کر گھر لائے تھے۔ اس کو ابا جان کی زبانی پتا چلا تھا کہ فوزی کل رات سے گھر سے غائب ہے۔ وہ کہیں چلی گئی ہے۔ وہ دن تھا اور آج کا دن، ایک طرح سے ویدو مسلسل اس کی تلاش میں رہا تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ کسی نہ کسی طور ہر اس جگہ پہنچا تھا جہاں اس کے ملنے کا امکان ہوسکتا تھا۔ پھر ایک موقعے پر اسے پتا چلا تھا کہ فوزی کو کہیں گوجرانوالا شہر میں دیکھا گیا ہے۔ اسے دیکھنے والے آپا باجی اور بالا تھے۔ فوزی کے ساتھ کاروالا کوئی امیر بندہ تھا۔ اس نے آپا باجی اور بالے کو بری طرح پٹوا کر بھگا دیا تھا اور وہ دونوں گھر میں کئی دن اپنی چوٹوں پر ٹکور کرتے رہے تھے۔ اس اطلاع پر وہ ماسٹر جی اور ابا جان کو بتائے بغیر ملتان سے گوجرانوالا آیا تھا اور اس امیر بندے کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

اب تین ساڑھے تین سال گزر چکے تھے اور ایک ایک کر کے ساری امیدیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ پچھلے چند ماہ سے ویدو کے لیے ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے اباجی کو دل کا عارضہ تو سات آٹھ سال سے تھا لیکن اب ان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ ان کی سب سے بڑی حسرت اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا تھا۔ وہ بارہا ویدو سے اس کا اظہار کر چکے تھے تاہم دوسرے ایک کے بعد سے تو ان کی یہ خواہش مسلسل آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ کب تک باپ کو دکھ دے سکتا تھا، کب تک ان کی آنسوؤں سے تر داڑھی کی طرف سے آنکھیں بند کر سکتا تھا۔ چچی مریم نے بھی اس پر بہت زور ڈالا تھا پھر ایک روز اس نے بند کمرے کے اندر تکیے میں منہ دے کر دیر تک آنسو بہائے تھے اور اپنی آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ ایک بار اس نے کہیں پڑھا تھا...... محبت بہت دل پذیر چیز ہے مگر اس کے انجام پر رونا آتا ہے۔ شاید لکھنے والے نے ٹھیک ہی لکھا تھا۔

☆☆☆

چچی مریم نے دو تین رشتہ کرانے والیوں سے رابطے کیے۔ جلد ہی ایک گھرانہ انہیں اور ویدو کے اباجی کو پسند آ گیا۔ لڑکی ویدو کی تقریباً ہم عمر ہی تھی۔ ایک اسکول میں ٹیچنگ کرتی تھی۔ دیکھنے میں اچھے لوگ لگتے تھے۔ دو چار بار ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوا اور پھر بات منگنی تک پہنچ گئی۔ لڑکی کا نام عالیہ تھا۔

ہاں یہ کہانی ختم ہو رہی تھی...... لیکن شاید کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ نومبر کی ایک سرد شام تھی۔ سندر پور میں ایسی ٹھٹھری ہوئی سی شامیں ویدو کو بہت بھاتی تھیں۔ ان طویل شاموں میں کرنے کو بہت کچھ ہوتا تھا۔ کورس کی کتابیں پڑھنا، ڈائجسٹ پڑھنا، ٹی وی دیکھنا، کہانیاں کہنا اور سننا، آگ تاپتے ہوئے ایک دوسرے کے سرخ چہرے دیکھنا اور گرم لحافوں میں ہولے ہولے مونگ پھلی وغیرہ ٹھونگنا۔ ایسے ماحول میں اگر "کل چھٹی ہے" والا فقرہ بھی جگمگا جاتا تھا تو زندگی اور خوبصورت لگنے لگتی تھی۔

آج بھی ویسی ہی شام تھی۔ کل چھٹی بھی تھی لیکن ویدو کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آج اس کی منگنی تھی۔ یہ تقریب گھر میں ہی ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے بس بیس پچیس مہمان تھے...... یا شاید تھوڑے سے زیادہ۔ لڑکی والوں کی رہائش زیادہ دور نہیں تھی۔ نو بجے کے قریب مہمان پہنچ گئے۔ تقریب شروع ہوئی۔ ڈھولک بجنے لگی۔ زرق برق آنچل لہرانے لگے۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایک عجیب واقعہ رونما ہونے والا ہے...... ایک ڈرامائی صورت حال پیدا ہونے والی ہے۔ زندگی کبھی کبھی ایسے ہی انہونی کروٹ لیتی ہے اور حضرتِ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ لڑکی والوں کے کچھ مہمان لاہور سے بھی آئے تھے۔ ان میں لڑکی کی دو بہنیں اور ایک کزن شامل تھی۔ تقریب جاری تھی، گیت گائے جا رہے تھے۔ جب سرخ فراک اور شرارے میں ملبوس چودہ پندرہ سالہ زینب ویدو کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

"بھائی جان! آپ نے عالیہ باجی کی بہنوں کو دیکھا جو لاہور سے آئی ہیں؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ دیکھیں۔ ان میں سے ایک ڈھولک بجا رہی ہیں، دوسری چچی جان کے بائیں طرف بیٹھی ہیں۔ آپ ان کی مہندی دیکھیں...... فوزی باجی بھی اسی طرح کی مہندی لگایا کرتی تھیں نا......"

ویدو نے ذرا آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ پچیس چھبیس سال کی جو جواں سال لڑکی ڈھولک بجا رہی تھی، اس کے بازوؤں پر ویسا ہی بیل والا دلکش ڈیزائن تھا جیسے کبھی فوزی بڑی نفاست سے بنایا کرتی تھی۔ ایک بل کھاتی ہوئی بیل، اوپر تلے پھول اور دونوں اطراف میں نکلی ہوئی نوک دار پتیاں۔ بیل کے شروع اور آخر میں ایک ستارہ ہوتا تھا۔

وہ دیکھتا رہ گیا۔ بہت سی یادیں آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھنے لگیں۔ اس نے لڑکی کی طرف سے دھیان ہٹا لیا اور اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ زینب نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔ "بالکل ایسے ہی اوپر نیچے تین پھول اور پھر دو دو پتیاں بنایا کرتی تھیں فوزی باجی!"

تقریب جاری رہی۔ انگوٹھی وغیرہ پہنائی گئی۔ پھر کھانا ہوا اور مہمان چلے گئے مگر پتا نہیں کیوں وہ مہندی والی بات ویدو کے دماغ میں اٹک سی گئی تھی۔ شروع میں اس نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن بعد میں اس نے اپنے تصور کو مہندی کے اس خاص ڈیزائن پر مرکوز کیا اور اس کے دماغ میں کھد بدی شروع ہو گئی۔ واقعی وہ ڈیزائن ہو بہو وہی تھا جو سندر پور میں صرف فوزی بناتی تھی۔

ویدو کے کہنے پر شمیم نے تھوڑی سی ٹوہ لگائی اور اسے پتا چلا کہ عالیہ کی وہ دونوں بیاہتا بہنیں لاہور سے آئی تھیں۔ منجھلی بہن کا نام نادیہ تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ویدو کے اندر ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہوتی جارہی تھی۔ شمیم نے تھوڑی سی اور کوشش کی اور نادیہ کا فون نمبر بھی حاصل کرلیا۔ خواتین باتیں کریں اور کپڑوں جیولری اور سنگھار کی باتیں نہ ہوں، یہ کیسے ممکن تھا۔ (عالیہ کے گھر والے ویسے بھی خودنمائی کے شوق میں مبتلا دکھائی دیتے تھے)۔ شمیم کو معلوم ہوا کہ نادیہ اور اس کی بڑی بہن نے وہ مہندی فیروز پور روڈ کی ایک مہنگی ایجنٹر سے لگوائی تھی۔ مہندی کے خوبصورت ڈیزائن بنانے میں اس لڑکی کا شہرہ ہے۔

ویدو نے اب تک فوزی کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ بے شک یہ ایک موہوم سی امید تھی، ایک خام سا خیال تھا لیکن وہ اس امید اور خیال کو بھی ایسے ہی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا...... ایک دن وہ لاہور جا پہنچا...... اور پھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس پارلر کے دروازے پر بھی جہاں فوزی کام کرتی تھی۔ وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ شام تھی۔

☆☆☆

...... وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ شام تھی۔ گلابی جاڑے نے لاہور کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا تاہم پارلر کے اندر گیس ہیٹر کی خوشگوار حرارت موجود تھی۔ فوزی نے اپنی ہائی نیک سیاہ جرسی کی آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور ایک دلہن کے گورے چٹے پاؤں پر مہندی کے نقش و نگار بنانے میں مصروف تھی۔ سبز حجاب کے اندر فوزی کا چہرہ کھلے گلاب کی طرح نظر آتا تھا۔ اتنے میں باجی شکیلہ کی اسسٹنٹ نے اندر آکر اسے اطلاع دی۔

”فوزی آپی! آپ سے کوئی بندہ ملنے آیا ہے۔ اپنا نام نہیں بتارہا اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ آپ سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔“

فوزی کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔ وہ مہندی کی کون رکھ کر ذرا سٹپٹائی ہوئی سی باہر نکلی۔ ویٹنگ روم کے دروازے پر جو شخص کھڑا تھا وہ فوزی کو جاگتی آنکھوں کا خواب لگا۔ وہ دو تین سیکنڈ تک سکتہ زدہ کھڑی رہی۔ اس وقفے میں شاید اس کا دل بھی تھم گیا تھا۔ تب جیسے ایک دھچکے کے ساتھ اس کے دل نے دوبارہ دھڑکنا شروع کردیا۔ اس کی ساری حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئیں۔ وہ اسے کیسے نہ پہچانتی۔ وہ اس کے رگ و پے میں بستا تھا۔ ہمیشہ سے اس کے لہو میں شامل تھا۔ کبھی وہ اس کے لیے بچپن کا ہم جولی تھا...... کبھی ایک بھائی اور کزن کی طرح تھا اور پھر...... بڑی خاموشی سے وہ اس کے لیے کچھ اور بن گیا تھا...... وہ بھی نمناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔ پھر نہ جانے یکایک فوزی کو کیا ہوا، وہ انتظار گاہ میں موجود لوگوں کی پروا کیے بغیر لپکی اور ویدو سے لپٹ گئی۔ درمیان کے کئی سال دفعتاً وقت کی کتاب میں سے حذف ہوگئے تھے۔ وہ سندر پور کے کچے پکے راستوں پر قلانچیں بھرنے والی فوزی تھی اور وہ اسکول بیگ گلے میں ڈال کر جامن کے درختوں پر چڑھنے والا ویدو تھا۔

”ویدو...... ویدو...... مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آرہا۔ کہاں تھے تم؟ کہاں گم ہوگئے تھے؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”گم تو تم بھی ہوگئی تھیں۔ مجھے تو اب بھی بھروسا نہیں ہورہا کہ تم کو دیکھ رہا ہوں۔“

وہ جیسے اپنے حواس میں آکر ایک دم اس سے علیحدہ ہوئی پھر اس کی دونوں کلائیاں مضبوطی سے پکڑ کر بولی۔ ”شمیم کہاں ہے ویدو...... اور زینب...... اور فاروق؟ وہ سب خیریت سے ہیں نا...... بولو خیریت سے ہیں نا؟“

ویدو کی سیاہ آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ یوں لگتا تھا کہ فرطِ جذبات میں وہ ایک بار پھر اس کے گلے لگ جانا چاہتی ہے...... لیکن اب اس کے حواس تھوڑا بہت کام کرنے لگے تھے لہٰذا وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی مگر اس نے اس کی دونوں کلائیاں بڑی مضبوطی سے تھامے رکھیں جیسے ڈر رہی ہو کہ وہ پھر نظروں سے اوجھل ہوجائے گا۔ کسی سپنے کی طرح ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ اردگرد کھڑے لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

زندگی بڑی انوکھی چیز ہے۔ کبھی کبھی وہ بڑی عجیب کروٹ لیتی ہے۔ ایسی ہی کروٹ فوزی، ویدو اور ان کے اہلِ خانہ کی زندگیوں میں بھی آئی تھی۔ وہ جنوری ہی کچھ عجیب تھا۔ سنسناتا ہوا، کڑک اور ٹھٹھرا ہوا لیکن اس گلابی جنوری میں جذبوں اور آرزوؤں کی آنچ اتنی تیز تھی کہ اس نے بہت کچھ پگھلا دیا۔ سب سے پہلے فوزی، ویدو کے ساتھ ملتان پہنچی۔ اپنے بچھڑے بھائی بہنوں سے اس کے ملنے کا منظر بے حد جذباتی اور رقت آمیز تھا۔ وہ ان کے منہ چوم چوم نہ تھکتی تھی۔ نذیر چاچا (ویدو کے ابا جی) بھی فوزی کو دیکھ کر جیسے پھر سے جی اٹھے تھے۔ اس گلابی جنوری کی طویل راتوں میں بیٹھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو اپنی روداد یں سنائیں، اپنے دکھ درد بیان کیے۔ فوزی کو ویدو سے پتا چلا کہ بالا اور آپا باجی مکافاتِ عمل کا شکار ہوئے

تھیں۔ ان کے درمیان جھگڑا خستہ حال ورکشاپ کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ بالے نے فوزی کی "ملکیت" سے محروم ہونے کے بعد یاسمین (آپا باجی) کو ماہانہ دینا بند کر دیا جس کے بعد دونوں میں پہلے منہ ماری اور پھر مار ا ماری ہوئی۔ نشئی بالے نے لالچی آپا باجی کے سر پر ایسی اینٹ ماری کہ وہ وہ ہفتے اسپتال میں بے ہوش پڑی رہی۔ ہوش میں آئی تو اس کی آنکھوں کی بینائی نوے فیصد ختم ہو چکی تھی۔ بالا اب بھی جیل بھگت رہا تھا۔ اماں سندری کے بارے میں پتا چلا کہ وہ لقوہ زدہ بستر کی سختیاں سہتے سہتے بالآخر دنیا کے دکھوں سے آزاد ہو چکی تھی۔

فوزی نے بھی ویدو اور بھائی بہنوں کو اپنی ساری کہانی سنائی...... اس نے ان دو چہروں کا ذکر بھی کیا جن کے اندر اور باہر میں زمین آسمان کا فرق نکلا تھا۔ ایک سرخ و سپید چہرہ حاجی انور کا تھا جو اندر سے بہت کالا تھا اور ایک کرخت بھدا چہرہ تھانے دار شوکت کا تھا...... وہی تھانے دار جو اندر سے مہربان اور ظرف مند تھا۔ کسی اخروٹ کی طرح جو اوپر سے بہت سخت اور اندر سے بہت نرم ہوتا ہے۔ اس کے ذکر پر فوزی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

سندر پور والوں کا خیال تھا کہ ویدو کا دل فہیم پر آ گیا تھا اور وہ دونوں اسی لیے زینب اور فاروق سمیت گاؤں سے غائب ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی خود فوزی بھی اس شک کا شکار ہوئی تھی مگر آج وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی آواز کے عین مطابق تھا۔ بھائی جان، بھائی جان کہتے ہوئے فہیم کا منہ سوکھتا تھا اور اس کے لیے کچھ ایسی ہی کیفیت ویدو کی آنکھوں سے بھی جھلکتی تھی۔ ویدو سے ملنے کے بعد فوزی کا یہ یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں...... ان کی روحیں ازل سے ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ روحیں ملی ہوئی ہوں تو پھر جسموں کا ملنا یا نہ ملنا کوئی معنی نہیں رکھتا...... فوزی بھی اب خود کو ویدو کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ بے شک اسے ویدو کی انکھوں میں اپنے لیے ایک خاموش حسرت اور بے پناہ تڑپ نظر آتی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس کی راہیں اور ہیں، ویدو کی اور۔ چند ہفتے پہلے ویدو کی منگنی بھی ہو چکی تھی (یہی منگنی تھی جس کے نتیجے میں ایک ڈرامائی صورت حال پیدا ہوئی تھی...... اور مہندی کے کچھ خاص نقش و نگار پر چلتے چلتے ویدو فوزی تک جا پہنچا تھا)۔ ہاں وہ جنوری کچھ دکھرے ہی رنگ ڈھنگ کا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ گلابی شب و روز فوزی کی حیاتی کے سارے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے آئے تھے۔

حالات آپوں آپ ہی ایک خوش آئند رخ کی طرف مڑنا چاہ رہے تھے۔ فوزی اور ویدو کے رستے کی ایک رکاوٹ یوں دور ہوئی کہ ویدو کی منگنی آگے نہ چل سکی۔ منگنی ختم ہونے کا سبب لڑکی والوں کی طرف سے ہی پیدا ہوا۔ لڑکی کی ہیڈ مسٹریس والدہ نے ویدو کی چچی مریم بی بی کے ساتھ کچھ تلخ ترش باتیں کیں جس کے بعد حالات بگڑ گئے اور آناً فاناً انگوٹھیاں اور دیگر اشیا ایک دوسرے کو واپس ہو گئیں۔

دوسری رکاوٹ خود فوزی اور اس کا گریز تھا۔ سر تا پا ویدو کی محبت میں ڈوبی ہونے کے باوجود وہ اس کی زندگی میں آنا نہیں چاہ رہی تھی...... لیکن وہ جنوری انوکھا جنوری تھا۔ زندگی کے سارے مثبت اور خوش رنگ امکانات اس کی سنہری دھوپوں اور نرم گرم شاموں میں سمٹ آئے تھے۔

ایک روز چاچا تنویر نے فوزی کو اپنے گلے سے لگایا اور دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ انہوں نے بار بار فوزی کا سر چومتے ہوئے کہا۔ "میری پتری! میں نے تجھے گودی میں کھلایا ہے۔ تجھے کاندھوں پہ بٹھا کر سندر پور کی گلیوں میں گھوماتا رہا ہوں۔ حیاتی کے اس حصے میں مجھے ایسا دکھ نہ پہنچا کہ میں مرنے سے پہلے ہی مر جاؤں...... ویدو میرا پتر ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ بچپن سے تیرا تھا اور تیرا ہی رہے گا...... اب تو آ گئی ہے۔ اب وہ تیرے سوا کسی سے ویاہ نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں کرے گا اور میں اسی طرح اس کے سر کا سہرا دیکھنے کی حسرت لے کر قبر کے ہنیرے میں اتر جاؤں گا۔"

پھر انہوں نے آنسوؤں سے تر ڈاڑھی کے ساتھ اپنی ٹوپی سر سے اتار کر فوزی کے قدموں میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔ فوزی نے تڑپ کر انہیں روک دیا تھا اور پھر نیچے بیٹھ کر ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ بے شک وہ ایسا ہی مہربان جنوری تھا۔ شاید وہ برسوں پہلے کے اس کہر آلود اور دلدوز جنوری کا مداوا تھا جس میں فوزی کی شادی پکی عمر کے بالے سے ہوئی تھی اور ویدو کے لیے سندر پور کا میلا ویران ہوا تھا۔

اس رات نکھری ہوئی چاندنی میں گھر کی چھت پر ویدو اور فوزی نے دیر تک باتیں کی تھیں۔ یہ کمن کی باتیں تھیں۔ یہ آنے والے حسین دنوں اور راتوں کی باتیں تھیں...... اور یہ ان چند مڑے تڑے نوٹوں کی باتیں تھیں جو اب بھی ویدو کے پاس محفوظ تھے اور جو چند روز بعد سندر پور کے اس خوبصورت سالانہ میلے میں خرچ ہونا تھے...... ہاں، وہ بڑا انوکھا جنوری تھا۔

✖✖✖